جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

احمد اقبال

11

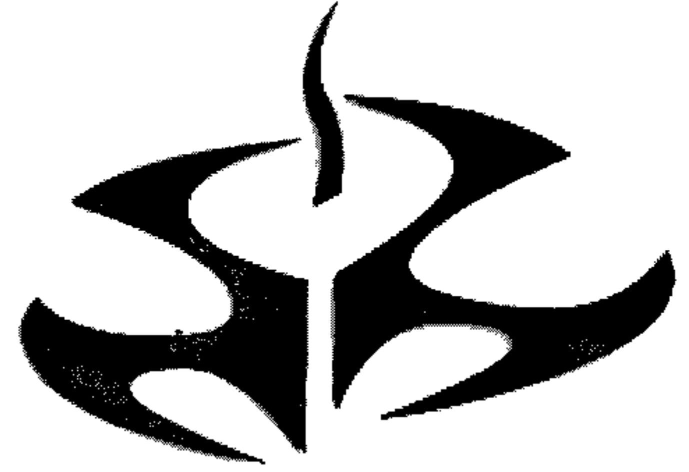
وطن عزیز کے پُر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

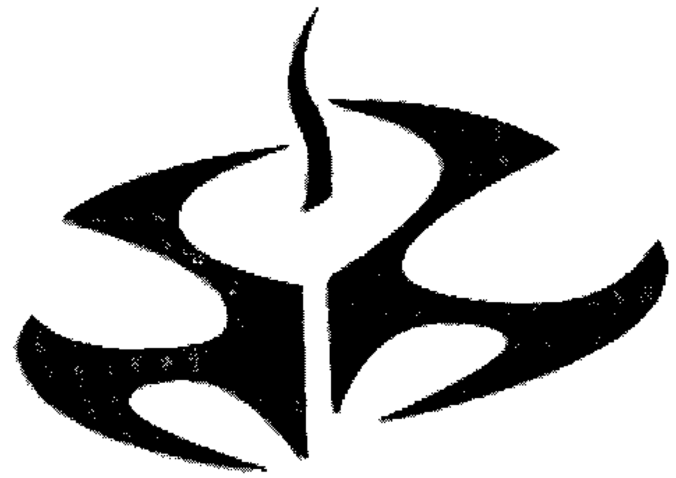
گیارہواں حصہ

احمد اقبال

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز
۲۰۔عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴



بار اول ــــــــــ ۲۰۰۴ء
مطبع ــــــــــ یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ ــــــ صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور
قیمت



ISBN 969-517-186-9

اسٹاکسٹ
علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال لاہور

اپنی فسوں گری سے بے خود کر دینے والی اور ہر لحظہ چونکانے والی کہانی

مداری

شیکسپیئر کے اس خیال کو بڑی شہرت حاصل ہے کہ "یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب فانی انسان وہ اداکار جو اپنے اپنے وقت میں اپنا اپنا کھیل دکھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اچھا اداکار وہ ہے جو تماشائیوں سے خراج تحسین وصول کر سکے اور برا وہ جس کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات کا ردعمل خود اس کے کردار کی نفی کرے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اچھا یا برا خود اداکار ہوتا ہے یا وہ کردار جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاتا ہے۔ ہیرو کے لئے تالیاں اس لئے بجتی ہیں کہ ہدایت کار نے اسے مثبت پہلو رکھنے والے کردار کے لئے منتخب کیا اور ولن اس لئے برا بنتا ہے کہ اس کا انتخاب ہی منفی کردار کے لئے ہوتا ہے۔ مصنف نے اسی خیال کو تاریخی حقائق کے تناظر میں یوں پیش کیا ہے کہ یہ دنیا تماشا گاہ ہے۔ یہاں کچھ لوگ مداری ہیں، کچھ بچہ جمہورا، جن کو اپنا کھیل پیش کرنے کے لئے مداری استعمال کرتے ہیں اور باقی سب تماشائی۔

ایک ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد میں نے عاقل کے اپارٹمنٹ میں پیش آنے والے سانحے کے امکانات پر غور کیا تو مجھے پھر خود پولیس اسٹیشن جا کے رپورٹ لکھوانے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ اس کی متعدد وجوہات تھیں۔ میں نے پولیس کو فون کرتے ہوئے یہ بتا دیا تھا کہ حملہ آوروں کا تعلق نارتن پارسے اور جمی سے تھا۔ بے شک میں نے اپنا نام نہیں بتایا تھا مگر پولیس بہرحال سمجھ جائے گی کہ گزشتہ حالات کے تناظر میں جمی کا ہدف کون ہو سکتا ہے۔ جب عاقل رپورٹ لکھوائے گا تو وہ بھی میری اور جمی کی کاروباری رقابت کا حوالہ دے گا اور اس وقت پولیس ضرور سوال کرے گی کہ آخر مسٹر شاہ عالم نے ایک گمنام کال کرنا کیوں کافی سمجھا۔ وہ جمی کے خلاف رپورٹ لکھوانے کے لیے پولیس کے پاس کیوں نہیں آئے؟ انہیں ڈر کس کا تھا؟

یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ عاقل رشتے میں میرا بہنوئی ہو گیا تھا اور میں سالا۔ مذاق میں وہ مجھے ایکٹنگ سسر کہتا تھا۔ بعد میں پولیس یہ سوال عینی سے بھی پوچھے گی کہ آخر تمہارے بھائی صاحب اتنے پراسرار طریقے پر کیوں بی ہیو کرتے ہیں۔ مجرم اور بدمعاش تو پولیس کے سائے سے بھی دور رہنا چاہتے ہیں مگر شاہ عالم تو مظلوم ہے۔ وہ فریاد سے کیوں ڈرتا ہے۔ اور ظاہر ہے عینی کے پاس اس سوال کا جواب کوئی نہیں ہوگا۔

آدھے راستے سے میں نے ٹیکسی کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف کرا لیا۔ خود شک سے محفوظ رہنے اور عینی کو محفوظ رکھنے کے لیے میرا نارمل طریقے پر قانونی راستہ اختیار کرنا ضروری ہی نہیں ناگزیر ہو گیا تھا۔ میں نے سن گلاسز، رین کوٹ اور فلیٹ ہیٹ ٹیکسی میں ہی چھوڑ دیے مگر میری بدقسمتی کہ پولیس اسٹیشن پر میرا واسطہ ایک انتہائی تنگ مزاج، متعصب اور خبیث قسم کے افسر سے پڑا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بولا "تمہارا نام اتنا فنی کیوں ہے؟"

میں نے کہا "یہی سوال میں تمہاری صورت کے بارے میں بھی کر سکتا ہوں مگر میں پرسنل ریمارکس کو اچھا نہیں سمجھتا۔"

"اوہ۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل یہ نام میرے دماغ میں گھنٹی بجا رہا ہے۔ ذرا مجھے چیک کرنے دو" اس نے ایک کمپیوٹر میں میرا نام ڈالتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا "میرا نام مطلوب مجرموں کی فہرست میں بہرحال نہیں ہوگا۔"

اس نے مانیٹر پر ملنے والی تفصیلات پر غور فرماتے ہوئے سیٹی بجا کے اپنی حیرت کا اظہار کیا "تم وہی ہو جس کو تین لاکھ پاؤنڈ چھن جانے کے باوجود دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ تم۔۔۔ جمی اور لارڈ پرائس۔ یہ ایک پراسرار مثلث ہے۔ تم اتنے مسٹر

کلین نہیں ہو جتنے نظر آتے ہو یا ظاہر کرتے ہو؟"

میں نے کہا "اب اگر تم نے ایک بھی ناجائز ذاتی ریمارک دیا تو مجھے تمہارے خلاف ہوم سیکریٹری کو شکایت بھیجنی پڑے گی۔"

وہ ہنس پڑا "ہوم سیکریٹری کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے' میں سوری کہہ دیتا ہوں۔"

میں نے اپنا پاسپورٹ اس کے سامنے رکھ دیا "جو تم نہیں جانتے وہ جان لو کہ یہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے۔ میں پاکستان کی ایک سیاسی جماعت کا لیڈر اور اسمبلی کا ممبر تھا۔ چنانچہ ہوم سیکریٹری سے میرا بات کرنا صرف تمہارے لیے تکلیف کا سبب بن سکتا ہے۔"

اس کے بعد وہ محتاط ہوگیا "آل رائٹ مسٹر شا علام۔ واٹ از یور پرابلم!"

میں نے کہا "آج صبح مجھ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔"

وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے اس کے سامنے کوئی شرابی بیٹھا اِدھر اُدھر کی ہانک رہا ہے۔ "یس۔ پھر کیا ہوا' تم تو زندہ ہو۔"

میں نے بھنا کے کہا "نہیں۔ میں قتل ہوگیا تھا اور اب عالم ارواح سے میری روح فریاد لے کر آئی ہے۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ میرا قانونی بیان ہے۔ اگر تم لکھو گے نہیں اور ایسے ہی بیہو کرتے رہو گے جیسے میں بھونک رہا ہوں۔"

"ٹھہرو!" اس نے دراز میں سے پین اور ایک نوٹ بک نکالی۔ ایک ٹیپ ریکارڈر آن کیا اور بولا "یس۔ اب بتاؤ؟"

میں نے اسے سب بتادیا تو اس نے رپورٹ میرے سامنے رکھ دی "اس پر دستخط کرو۔"

میں نے دستخط کردیے "تھینکس۔ کیا اب میں جاؤں؟"

"نہیں۔ مجھے کچھ سوالوں کے جواب چاہئیں" وہ بولا "سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم نے گمنام فون کیوں کیا تھا؟"

میں نے کہا "وہ میری غلطی تھی۔"

"بڑی سوچی سمجھی غلطی تھی" وہ بولا "خیر' پھر اب تمہیں کس بات نے مجبور کیا کہ تم رپورٹ لکھوانے آگئے؟"

میں نے کہا "پہلے میں بہت اَپ سیٹ تھا۔ جب میری عقل ٹھکانے آئی۔"

اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی "تمہاری عقل کو ٹھکانے آنے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ ان دو گھنٹوں میں تم کہاں رہے؟"

"میں اپنے گھر گیا اور سامان پیک کرتا رہا۔ پھر میں نے کرائے کے مکان کی چابی بروکر کے حوالے کی کیونکہ آج رات کی فلائٹ سے مجھے پاکستان جانا تھا۔"

"ناممکن" اس نے بڑی قطعیت کے ساتھ کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"ہر کیس میں تمہاری گواہی کی بنیادی اہمیت ہے۔ مثال کے طور پر آج کے کیس میں حملہ آوروں کو صرف تم نے دیکھا۔ تم ہی انہیں شناخت کرسکتے ہو۔"

میں نے کہا "وہ انکار کرسکتے ہیں۔ ہر ملزم انکار کرتا ہے۔"

"وہ الٹا تم کو ملزم بناسکتے ہیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم پیٹرول بم پھینک کے فرار ہو رہے تھے اور انہوں نے تمہیں روکا تو تم نے ان کو مارا۔"

میں نے کہا "واٹ نان سنس۔ وہ میرا اپنا ہی گھر تھا۔ وہاں میری چھوٹی بہن اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی اور دیکھ لو' میں ہی رپورٹ لکھوانے بھی آیا ہوں۔ کیا کسی اور نے اعتراف کیا ہے کہ فون اس نے کیا تھا؟"

وہ کچھ خفیف ہوا "یہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن تمہاری گواہی کے بغیر کیس کیسے چل سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "اگر کسی کیس میں عدالت نے مجھے پھر طلب کیا تو میں حاضر ہوجاؤں گا۔ صرف اس لیے کہ میں استغاثہ کا سب سے اہم گواہ ہوں' تم مجھے گرفتار کرکے نہیں رکھ سکتے۔"

"عدالت تمہیں حاضری کا پابند کرسکتی ہے۔ اور تمہیں پرواز سے روکنے کے لیے تمہارا پاسپورٹ رکھ سکتی ہے۔"

"میں ایک بزنس مین ہوں۔ اکثر لندن آتا ہوں لیکن صرف کاروبار کے سلسلے میں۔ مجھے پابند کرنے سے جو نقصان ہوگا اس کا ذمے دار کون ہوگا؟ کیا عدالت میرا مالی نقصان پورا کرے گی؟"

"میں یہ سب نہیں جانتا۔ تم میرے ساتھ جائے واردات پر چلو۔ اس کیس کی تفتیش میں نہیں کررہا ہوں۔ میں تمہیں متعلقہ پولیس آفیسر کے حوالے کردیتا ہوں۔ ہوسکتا ہے اس تحریری بیان کے علاوہ بھی وہ تم سے کچھ پوچھے" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

میں اس کے ساتھ پولیس کار میں ایک بار پھر جائے واردات پر پہنچا۔ آگ بجھائی جاچکی تھی اور پولیس' جس نے عمارت کو محاصرے میں لے لیا تھا' اب معمول کے مطابق اپنی کارروائی میں مصروف تھی۔ دوسرے اپارٹمنٹس میں رہنے والے خوف زدہ مکین اب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ

آئے تھے۔ پولیس نے ان سے عاقل کے بارے میں پوچھا تھا اور ان میں سے دو افراد نے بتایا تھا کہ جس اپارٹمنٹ میں پیٹرول بم سے آگ لگائی گئی' اس میں ایک پاکستانی رہتا تھا جو کچھ رپورٹر اور رائٹر وغیرہ تھا لیکن انتہائی معقول اور بے ضرر شخص تھا۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کام کرتا ہے اور کہاں مل سکتا ہے۔

مجھے ساتھ لے جانے والے نے بیان کے ساتھ مجھے تفتیشی افسر کے سپرد کردیا۔ تم اس سے جو پوچھ سکتے ہو پوچھ لو۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ آج ہی رات کو وطن واپس جارہا ہے۔

تفتیشی افسر سارجنٹ اسمتھ انتہائی معقول اور ذہین شخص تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "مجھے یقین ہے کہ آپ قانون سے تعاون کریں گے۔"

میں نے کہا "اگر میں چاہتا تو خاموشی سے بھی پرواز کرسکتا تھا۔"

"دونوں ملزمان پولیس کی تحویل میں ہیں۔ ایک زندہ اور ایک مردہ۔ کیا تم ہمارے ساتھ چل کے انہیں شناخت کرسکتے ہو؟"

پولیس اسٹیشن پر ایک بار پھر سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک سینئر سراغ رساں کیپٹن آرچر نے مجھ سے پوچھا "مسٹر شاہ علام' آپ ایک تعلیم یافتہ اور ذمے دار شخص ہیں۔ آخر آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اتنی بہادری سے مجرموں کو جائے واردات پر روک کے آپ خود بھاگ گئے؟"

میں نے کہا "دراصل۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ پولیس کے چکر میں نہ پڑوں۔ مجھے آج رات کی فلائٹ سے ہر حال میں واپس جانا تھا۔ میں خاموشی سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ پولیس میری بہن اور اس کے شوہر سے ہر بات معلوم کرلے گی۔ ہوسکتا ہے' میرے جانے سے ان کے لیے قانونی مسائل کی الجھن بڑھ جائے۔ جمی خواہ مخواہ ان کا دشمن ہوجائے۔"

"اب میں آتا ہوں بنیادی مسئلے کی طرف۔ آخر جمی کے اور آپ کے درمیان کاروباری اختلافات دشمنی کی اس انتہا تک کیسے آگئے کہ اس نے آپ کی جان لینے کی کوشش کی؟"

میں نے کہا "اس کی وجہ کاروباری اختلاف نہیں ہے۔ یوں' ہم پرانے بزنس پارٹنر تھے۔ حال ہی میں نامعلوم مجرموں نے ہم سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لیے تھے۔ اس رقم کی ادائیگی مجھے لارڈ پرائس نے کی تھی۔ میں نے جمی کی معرفت اسے تقریباً چھ لاکھ پاؤنڈز مالیت کے نوادرات فروخت کیے تھے۔ اس نے نوادرات کی ڈلیوری لے لی تھی مگر باقی تین لاکھ کی ادائیگی جمی کو ہونا باقی تھی چنانچہ نوادرات ان دونوں کی مشترکہ تحویل میں تھے۔"

"وہ کیس مجھے معلوم ہے۔ تم نے شک کا اظہار دونوں پر کیا تھا' لارڈ پرائس پر اور جمی پر۔"

"جس وقت یہ ڈکیتی ہوئی' اس وقت میں جمی کے ساتھ اس کی گاڑی میں تھا۔ مجھے شک تھا کہ ڈاکو لارڈ پرائس کے اپنے آدمی تھے جو اس کے گھر سے ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔"

"لیکن یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ وہ ایک خاندانی آدمی ہے اور بہت دولت مند ہے۔ اب خود جمی کی بیوی نے یہ بیان دیا ہے کہ اس واردات کی ساری پلاننگ اس کے شوہر نے کی تھی۔"

"رائٹ۔ جس رات میں اسپتال میں داخل تھا۔ جمی بھی میرے ساتھ تھا' اسی رات جمی کے لوگوں نے نوادرات بھی اٹھا لیے۔ ان کی آدھی قیمت میں وصول کرچکا تھا۔ لارڈ پرائس اسے باقی نصف رقم کی ادائیگی ضرور کردیتا مگر جمی ایک بدنیت اور بے ایمان شخص ثابت ہوا۔ اس نے میرے تین لاکھ بھی ہتھیا لیے اور ڈکیتی کا ڈراما خود رچایا۔ پھر چھ لاکھ کے نوادرات غائب کردیے۔ اسے نو لاکھ مل گئے۔ نقصان ہوا میرا یا لارڈ پرائس کا" میں نے کہا۔

کیپٹن اسمتھ نے کہا "جمی کے خلاف شک کا اظہار تم نے بھی کیا تھا مگر اصل ثبوت خود اس کی بیوی نے فراہم کیے۔ وہ تمہیں اپنے آفس لے جاکے ڈکیتی کا ڈراما کرتا۔ ڈاکو اس کے اپنے آدمی تھے۔ وہ گن پوائنٹ پر تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لیتے اور ساتھ ہی دو چار ہزار پاؤنڈز سے جمی کو بھی محروم کردیتے۔ وہ جولی کی جیولری بھی لے جاتے اور جولی کو بھی یرغمال بنالیتے۔ جولی کو وہ نارتھن بار سے کچھ فاصلے پر چھوڑ دیتے۔ ظاہر ہے بعد میں جمی کو اپنی تمہاری سب رقم واپس مل جاتی اور جیولری بھی مگر اس کی بدقسمتی کہ راستے میں اصل ڈاکو آگئے۔"

میں نے کہا "یہ کہانی تمہیں کیسے معلوم ہوئی؟"

"جولی کے بیان سے۔ ہم نے بعد میں انہیں بھی پکڑلیا جو ڈکیتی کے ڈرامے میں ڈاکو کا کردار ادا کرنے کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ انہوں نے بھی اعترافِ جرم کرلیا ہے لیکن جمی کے خلاف سب سے بڑا ثبوت تو وہ وڈیو کیسٹ ہیں جن میں تین افراد واردات کی پوری پلاننگ کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے واردات کے منصوبے پر اے سے زیڈ تک بحث

کی۔ اور کتنی ناقابل یقین سی بات ہے کہ خود جمی کی بیوی نے سب ریکارڈ کرکے رکھ لیا اور بعد میں پولیس کے حوالے کردیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر کیوں؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ظاہر ہے وہ شوہر سے چھٹکارا چاہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ خوش نہیں تھی۔"

"سوال پھر وہی ہے کہ کیوں؟"

"کیونکہ جولی نے پیسے کی خاطر جمی سے شادی کی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ جمی زیادہ دن نہیں جئے گا۔ وہ مرجائے گا یا ماردیا جائے گا۔ یو سی' اس کا نچلا دھڑ مکمل طور پر مفلوج ہے۔ وہ عورت کے قابل نہیں ہے۔ یہ بات جولی جانتی تھی مگر لالچ میں اس نے خود پر جبر کیا۔"

"یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے یہ سب جولی نے بتایا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ جمی نے اسے بتادیا تھا کہ کبھی اس نے یہ راز فاش کیا یا اس کو وجہ بنا کے علیحدہ ہونے کی کوشش کی تو وہ اسے قتل کردے گا۔ چنانچہ جولی نے خود جمی کو الگ کردیا۔ اس نے جمی کے خلاف تحقیقات کرنے والوں کو ٹیکس چوری' عورتیں ناجائز طور پر اسمگل کرنے اور ان سے زبردستی پیشہ کرانے کے ثبوت بھی فراہم کردیے تاکہ وہ طویل عرصے کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا جائے۔"

"ایک منٹ" کیپٹن اسمتھ بولا "کیا یہ تمہارا قانونی بیان ہے؟"

میں نے کہا "آف کورس۔ میں سمجھتا ہوں کہ پولیس کے سامنے جو بھی کہا جائے اس کی حیثیت قانونی بیان کی ہوجاتی ہے۔"

"اوکے۔ تم وہ سب پھر بتاؤ' جو ابھی بتایا" اس نے ایک نوٹ شیٹ اور پین نکالا اور ایک کیسٹ ریکارڈر آن کردیا۔

میں نے ساری باتیں دہرا دیں۔

سب سننے اور لکھنے کے بعد اسمتھ نے سوال کیا "مسٹر شاہ علام۔ جولی جانتی تھی کہ اس نے اپنا راز کسی پر افشا کیا اور یہ بات جمی تک پہنچ گئی تو وہ ماری جائے گی۔ اس کے باوجود جولی نے تمہیں اپنی پلاننگ تک بتادی' آخر کیوں؟"

"یہ اس کی بے وقوفی تھی لیکن اس بے وقوفی کی وجہ تھی محبت۔ وہ مجھے چاہنے لگی تھی۔"

"آئی سی۔ اور تم... کیا تم بھی...؟"

میں نے کہا "تو۔ یہ میں نے اس کے عزائم دیکھتے ہوئے شروع میں ہی واضح کردیا تھا کہ وہ میرا خیال دل سے نکال دے۔"

"یہ ایک عام سی لو اسٹوری لگتی ہے جس میں نامرد شوہر نے حسد اور احساس محرومی کا انتقام لینے کے لیے ہیرو کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ کیا ہیروئن کی باتوں سے یا اس کے رویے سے ولن شوہر کو شک ہوگیا تھا کہ بیوی اس سے بے وفائی کی مرتکب ہورہی ہے؟"

"یس۔ ایسا ہی ہوا تھا غالباً۔ جمی مجھ سے جیلس ہوگیا تھا اور دشمنی پر اتر آیا تھا۔ لیکن معاملات اب اس سے بھی زیادہ خطرناک اور سنگین ہوگئے ہیں۔ وہ جولی کو بھی قتل کرنا چاہتا ہے بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنا کام شروع کرچکا ہے۔"

"وہ کیسے؟"

میں نے جواب میں اسے جمی سے ہونے والی پوری گفتگو بتادی اور یہ بھی کہ میں نے بیک گراؤنڈ میں چلانے والی جولی سے کیا سنا تھا۔ "مجھے یہ شک بلکہ یقین ہے کہ اس نے جولی کو بھی اسی تہ خانے میں پہنچادیا ہوگا۔ جہاں پہلے سے دو ڈھانچے موجود ہیں۔ اس کی پہلی بیوی اور اس کے آشنا کے۔"

"او مائی گاڈ! تم یہ سب کچھ جانتے تھے اور اس کے باوجود تم نے کچھ نہیں کیا" کیپٹن اسمتھ نے برہمی سے کہا "تم ایک پڑھے لکھے آدمی ہو۔ خود کو اسمبلی کا ممبر اور ایک سیاسی پارٹی کا سربراہ کہتے ہو۔ تم قانون کو نہیں سمجھتے' اپنی قانونی ذمے داری نہیں جانتے؟"

میں نے کہا "اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ جس دن مجھے جولی نے یہ سب باتیں بتائی تھیں۔ مجھے اسی دن پولیس کو رپورٹ کرنا چاہیے تھا۔ تو میرا جواب ہے کیپٹن کہ میرے ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ آج بھی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے جولی نے میری ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ایک دردناک کہانی سنائی ہو۔ خود جولی کس حد تک قابل اعتبار ہے' یہ میں نہیں جانتا۔ اپنے فائدے کے لیے وہ کسی بھی انتہا تک جاسکتی ہے۔ لیکن جو بات اہم ہے وہ میرا یہاں آنا ہے۔ میں نے دیر سے سہی مگر بالآخر پولیس کو سب بتادیا۔ جیسے جولی نے بتایا انت بھلا سو بھلا۔ اب تم میرا بیان لینے کے بعد مگر بالآخر مجھے بھی فرد جرم تھماؤ گے یا جولی کو بچانے کے لیے اور اس کے قاتل شوہر کو گرفتار کرنے کے لیے اگلا قدم اٹھاؤ گے۔"

اس نے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ وہ تہ خانہ کہاں ہے؟"

"نہیں' میں گیس بھی نہیں کرسکتا۔ لیکن پولیس بہرحال اس کا سراغ لگاسکتی ہے۔"

"آل رائٹ' ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

پانچ منٹ بعد میں پولیس کی ایک چھاپا مار پارٹی کے ساتھ جا رہا تھا۔ یہ چھاپا مار پارٹی چار افراد پر مشتمل تھی جو سراغ رسی کے اپنے اپنے شعبے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ دو گاڑیاں تھیں جو بالکل نئے ماڈل کی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ کچھ خصوصی آلات بھی لے گئے تھے مگر ریڈیو کنٹرول پر انہوں نے خصوصی کیمرے منگوا لیے تھے جن سے سونوگرافی ممکن تھی اور کسی تہ خانے' سرنگ یا پوشیدہ خلا کا سراغ لگایا جاسکتا تھا۔ ان کی مدد کے لیے ایک پولیس ڈاگ بھی طلب کیا گیا تھا جو کپڑوں کی بو سے گمشدہ شخص کا پتا چلا سکتا تھا بشرطیکہ جو زیادہ پرانی نہ ہو۔ ایمبولینس کے ساتھ ایک ڈاکٹر الگ بلایا گیا تھا۔

ان انتظامات کے مکمل اور موثر ہونے کی حقیقت نے پھر مجھے خود اپنی نظر میں شرمسار کیا کیونکہ میرے اپنے ملک میں اول تو پولیس کسی کے مفروضے' شک یا خیالی امکان پر حرکت میں ہی نہیں آتی۔ حرکت میں آئے تو مشترکہ مفادات کے مسائل پہلے طے کرتی ہے۔ پھر سواری کا مسئلہ ہوتا ہے اور پولیس کی نفری کے دستیاب ہونے کا۔ اگر "دباؤ" زیادہ ہو تو کوئی ایک یا دو پھول والا تھانے دار سائل سے سوال کرتا ہے کہ سواری ہے؟ نہیں ہے تو لاؤ۔ اور اس کی ذاتی کار یا بیگار میں کوئی ٹیکسی پکڑ کے چھاپا مار جائے واردات پر پہنچتے ہیں تو واحد کارروائی یہ ہوتی ہے کہ جتنے بھی بندے ہاتھ آئیں' سب کو پکڑ لاتے ہیں۔ تفتیش کا عمل تھانے میں بذریعہ "آلات تفتیش" شروع ہوتا ہے تو ملزم خود بتادیتا ہے کہ اس نے پیدا ہونے سے اب تک کتنے جرائم کیے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ جو کام برطانوی پولیس نے جدید آلات اور عقل و ذہانت کی مدد سے کیا وہی کام اگر صرف تیرہ نمبر کے چھتر سے لیا جاتا تب بھی جمی بتادیتا کہ اس نے جولی کو کہاں قید کیا ہے اور کیوں؟ مگر اس کا کیا علاج کہ گورے مشکل مگر قانونی طریقہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پولیس نے نارتن بار کا محاصرہ نہیں کیا۔ انہوں نے داخلے کے راستے پر زرد رنگ کی ایک پٹی باندھ دی جس کا مطلب ہوتا ہے "داخلہ منع ہے" اور دروازے کے باہر ایک کانسٹیبل کو مامور کردیا۔ نہ وہاں کوئی سنسنی پھیلی' نہ مجمع لگا اور نہ کسی نے دخل اندازی کی۔

نارتن بار کے اندر دوپہر کا منظر وہی تھا جو میں اس سے پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ صفائی کا عملہ اپنے کام میں مشغول تھا اور انہوں نے پولیس کو واجبی سی دلچسپی کے ساتھ دیکھا اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔

میں گھر کا بھیدی تھا اور لنکا ڈھانے آیا تھا۔ میں نے اسٹیج کے پیچھے والے راستے پر پولیس کی راہنمائی کی۔ ہر قدم پر موجود محافظوں نے پولیس کا راستہ اس بے خوفی کے ساتھ روکا جو قانون پر اعتماد سے آتی ہے۔ پوشیدہ کلوز سرکٹ کیمروں نے یہ سارے مناظر پہلے ہی جمی تک پہنچادیے ہوں گے۔ ہمارے پہنچنے تک وہ پولیس کا استقبال کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

اس نے بڑی منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "یہ کیا ہے شاہ علام؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

جمی نے کیپٹن اسمتھ سے کہا "کیپٹن۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے پاس اس کارروائی کا کیا جواز ہے؟"

کیپٹن اسمتھ نے قانونی زبان میں ایک مختصر تقریر کی اور جمی سے کہا کہ وہ زیر حراست ہے اور اب جو بھی وہ کہے گا اس کے خلاف قانونی عدالت میں استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اپنے قانونی مشیر کو بلوا سکتا ہے۔

جمی نے فون اٹھا کے ایک نمبر ملایا اور بولا "ہنری۔ تم

کہاں ہو۔ یہاں پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ وجہ میں نہیں جانتا مگر وہ کہتے ہیں کہ تم زیر حراست ہو۔ تم فوراً یہاں آسکتے ہو؟ تھینکس!"

کیپٹن نے کرسی پر بیٹھ کے کہا "مسٹر جیمس پونڈ۔ جولی آپ کی وائف کا نام ہے؟"

"یس!"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟"

جمی نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "وہ مجھے بتا کے نہیں گئی۔"

اسمتھ نے میری طرف اشارہ کیا "مسٹر شا علام کا کہنا ہے کہ آج صبح جب تم نے انہیں فون کیا تو پیچھے کہیں تمہاری بیوی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ تم اسے قتل کرنے جارہے ہو؟"

"یہ مسٹر شا علام کے تخیل کا کرشمہ ہے۔ اس کے کان ہی نہیں' دماغ میں بھی خرابی معلوم ہوتی ہے۔"

کیپٹن اسمتھ نے اسے ایک کاغذ تھمادیا "میں شک کی بنا پر اس جگہ کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔"

جمی کا سپاٹ چہرہ کچھ پھیکا پڑگیا۔ "جولی کو برآمد کرنے کے لیے یا اس کی لاش۔؟"

"یہ ہم دیکھیں گے کہ کیا ملتا ہے" کیپٹن اسمتھ نے کہا اور ساتھ آنے والوں کو اپنا کام شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب اپنے آلات کے ساتھ اِدھر اُدھر پھیل گئے۔

کیپٹن اسمتھ نے کلوز سرکٹ ٹیلی وژن' ڈبل سرکٹ پیغام رسانی کے آلات اور الیکٹرانک سیکیورٹی سسٹم کو شک آمیز دلچسپی کے ساتھ دیکھا "مسٹر جیمس! یہ صرف ایک بار اور نائٹ کلب ہے؟"

"تمہیں اور کیا لگتا ہے؟"

"سیکیورٹی سے یہ سیکرٹ سروس کا ہیڈ کوارٹر لگتا ہے؟" وہ بولا۔

"کیا اپنی حفاظت کے خیال سے سیکرٹ سروس والوں جیسے انتظامات رکھنے میں کوئی بات خلاف قانون ہے؟" وہ بولا۔

"بالکل نہیں مگر سیکرٹ سروس والوں کے پاس تو بڑے سیکرٹ ہوتے ہیں۔ تمہارے پاس کیا ہے آخر چھپانے کے لیے؟ ناجائز اسلحہ' منشیات' غیر قانونی کرنسی؟"

"مجھے یقین ہے تمہارے ماہرین کچھ ضرور تلاش کرلیں گے" جمی نے طنز سے کہا۔

کیپٹن اسمتھ نظروں کو چاروں طرف سرچ لائٹ کی طرح گھماتا رہا "ایک بات اور ہوسکتی ہے۔ تم نے دنیا میں دوست کم بنائے ہیں' دشمن زیادہ اور یہ دشمن طاقتور بھی ہیں' تم ان سے ڈرتے ہو۔"

"کیا تمہارے دشمن نہیں ہیں" جمی بولا۔

"بہت ہیں۔ تم جیسے۔ میرا تو واسطہ دن رات ایسے ہی لوگوں سے پڑتا ہے۔ میرا مقصد اپنے کارناموں سے تم کو متاثر کرنا نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ انڈر گراؤنڈ ورلڈ میں میری دہشت ہے۔ میں نے ایسے بہت سے گینگ BUST کیے ہیں جو بہت طاقتور تھے۔ اس کے باوجود میں عام لوگوں کی طرح رہتا ہوں' عام لوگوں کی طرح پھرتا ہوں۔"

"تم بہادر آدمی ہو؟" جمی نے پھر طنز کیا۔

"ہاں۔ تمہارے مقابلے میں۔" اسمتھ ایک دم پلٹا "تم بزدل ہو کیونکہ تم مرد نہیں ہو۔"

"شٹ اپ!" جمی چیخا۔

"یس۔ خود تمہاری بیوی ایسا کہتی ہے۔ پوچھو اس جنٹلمین سے؟"

"جنٹلمین! ہی از اے باسٹرڈ۔ اس نے میری بیوی کو ورغلایا۔ تم اس کے کالے کرتوتوں سے واقف نہیں ہو۔"

"مگر تمہارے کالے کرتوتوں سے واقف ہوں میں۔"

اسمتھ نے دھاڑ کے کہا "کتنے مقدمات ہیں اس وقت تمہارے خلاف؟ اور کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہر کیس میں پولیس کو جو ثبوت فراہم کیے' تمہاری بیوی نے کیے۔"

"یہ جھوٹ ہے" جمی پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔ "وہ ایسا کرہی نہیں سکتی۔ وہ ایک وفادار عورت ہے۔ وہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔"

اسمتھ نے افسوس سے سر ہلایا "تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

جمی تھکے ہوئے لہجے میں تردید کی "میں نے اسے قتل نہیں کیا؟"

"پھر تم نے اسے کیا سزا دی؟ کسی تہ خانے میں ڈال دیا زنجیروں سے باندھ کے۔ تاکہ وہ بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کے مرجائے۔"

"ایسا کوئی تہ خانہ نہیں ہے۔ یو سن آف اے بچ۔"

کیپٹن اسمتھ پھر کرسی پر میرے ساتھ بیٹھ گیا "جیمس پونڈ۔ جولی تمہاری دوسری بیوی تھی' پہلی کون تھی؟"

"ایلزا!" جمی نے کہا مگر وہ نروس ہوگیا تھا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اب وہ کہاں ہے؟"

جمی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "مجھے نہیں معلوم۔

وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی تھی۔"

"اس نے تم سے قانونی شادی کی تھی؟"

"یس۔ غیر قانونی شادی کون سی ہوتی ہے؟"

"پھر اس نے قانونی طور پر طلاق کیوں نہیں لی۔ وہ تم سے خاصی دولت وصول کرسکتی تھی۔ کہیں وہ بھی تو اسی تہ خانے میں نہیں۔ اپنے آشنا کے ساتھ؟"

جمی نے کہا "کون سا تہ خانہ!" مگر اس کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔

"اگر تم خود بتادیتے تو اچھا تھا' خیر... ہم تلاش کرلیں گے۔ یہ دروازہ کہاں کھلتا ہے؟"

"یہ... میرا پرائیویٹ بیڈ روم ہے۔"

کیپٹن اسمتھ اندر چلا گیا اور دروازہ بند کرلیا۔

جمی نے مجھے خون آشام نظروں سے دیکھا "شا علام! اب میری زندگی کا واحد مقصد تمہیں قتل کرنا رہ گیا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن اب تمہاری زندگی' جو پہلے ہی اس آدھے دھڑ کی وجہ سے آدھی تھی' ختم ہورہی ہے۔"

"اگر تم میں سچ بولنے کا حوصلہ ہے تو بتاؤ۔ کیا تم میری بیوی سے محبت کرتے تھے؟"

"سچ تو یہ ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی" میں نے کہا۔

"بکو مت کتے تمہارے اس کے ساتھ ناجائز مراسم تھے۔"

کیپٹن اسمتھ اندر سے نمودار ہوا "یہ لباس تمہاری بیوی کا ہے؟"

"نو..." جمی نے جھوٹ بولا۔

"مگر میں نے گزشتہ شام جولی کو اسی لباس میں دیکھا تھا" میں نے کہا "یہ لباس جولی کا ہے کیپٹن۔ کل رات میں اسے ڈنر پر لے گیا تھا تو اس نے یہی کپڑے پہن رکھے تھے۔"

"ابھی کچھ دیر میں بو سے سراغ لگانے والا کتا آجائے گا۔ یہ لباس اسے بہترین راہنمائی فراہم کرے گا" کیپٹن بولا۔

اس کے ایک ماتحت نے کہا "کیپٹن۔ کیا تم ایک سنسنی خیز سین دیکھو گے' جو تم نے پہلے نہیں دیکھا ہوگا؟"

"میں نے تو آج تک نارتھ بار کا وہ لیٹ نائٹ شو نہیں دیکھا جو اتنا مشہور ہے۔ دراصل میری بیوی بہت مذہبی خیالات کی ہے اور سخت گیر ہے۔"

ماتحت ہنسا "یہ اس سے بھی زیادہ سنسنی خیز شو ہے۔ اسٹیج کے پیچھے یہاں کیا ہوتا ہے' کم اینڈ سی!"

میں نے دیکھا کہ جمی کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑگیا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوجائے گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے آگے جھکا اور جھکتا ہی چلا گیا۔

کیپٹن نے کہا "مسٹر جیمس! آر یو اوکے؟"

لیکن جمی اس وقت تک بے ہوش ہوچکا تھا۔ پانچ منٹ بعد ایک ایمبولینس پولیس کی نگرانی میں اسے لے کر اسپتال کی طرف دوڑ رہی تھی۔ قانونی طور پر وہ اب زیر حراست تھا اور اب اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ اپنی زندگی میں وہ پھر کبھی جیل سے باہر کی دنیا کو ایک آزاد انسان کی حیثیت سے دیکھ پائے۔

دس منٹ کے ناگزیر التوا کے بعد کیپٹن اسمتھ پھر اس تماشے کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے بے حد EXCITED ماتحت کے مطابق کسی بھی بیک اسٹیج شو سے زیادہ سنسنی خیز تھا۔ اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ آنے کی دعوت دی اور ہم اسٹیج کے پیچھے گئے جہاں فنکاروں کے لیے تین ڈریسنگ روم تھے۔ اگرچہ فنکار ساری پرفارمنس ڈریس کے بغیر دیتے تھے مگر یہاں ڈانسر میک اپ کرتی تھیں۔ میک اپ کے معنی ہیں کمی کو پورا کرنا۔ وہ لباس کی کمی کو سرخی پاؤڈر ٹپ اسٹک اور آتش فشانی کے دوسرے اسباب سے پورا کرتی تھیں۔

ایسا لگتا تھا کہ وہاں پہلے چار میک اپ روم تھے۔ بعد میں آخری کیبن کو واش روم میں تبدیل کروایا گیا جو سائز میں قدرے چھوٹا تھا لیکن پولیس نے اس تبدیلی کے نظر فریب پردے کے پیچھے حقیقت دیکھ لی تھی۔ واش روم اس لیے چھوٹا لگتا تھا کہ میک اپ روم نمبر دو اور واش روم کی درمیانی دیوار ایک طرف سے ڈبل تھی۔ پہلے ڈریسنگ روم میں ایک اور دیوار اٹھانے کا نتیجہ نکلا تھا کہ اس کی چوڑائی کم ہوگئی تھی اور یہ اس قابل نہ رہا تھا کہ میک اپ کے لیے استعمال ہوسکے چنانچہ کچھ ضرورت کے تحت لیکن اصل میں ایک بھیانک حقیقت کی پردہ پوشی کے لیے اسے واش روم بنادیا گیا تھا۔

درمیانی ڈبل دیوار کے وجود کا کسی کو احساس نہیں ہوسکتا تھا۔ غالباً ڈریسنگ روم کو واش روم بنانے کے تخریبی اور تعمیری عمل کے دوران میں اسے بند رکھا گیا تھا اور "کاریگر" اندر اطمینان سے اپنا کام کرتے رہتے تھے۔ جب دوبارہ اسے فنکاروں کے استعمال کے لیے کھولا گیا تو کسی نے یہ نوٹ نہیں کیا کہ پرانا ڈریسنگ روم جب واش روم بنا تو چوڑائی میں ڈیڑھ فٹ کم کیسے ہوگیا۔ واش روم کی تنگی کی وجہ سے یہ فرق چھپ گیا تھا۔

تاہم پولیس کے ایکس رے کرنے والے سونوگرافک

کیمرے نے ایک بھیانک حقیقت پر پڑا ہوا پردہ اٹھادیا تھا۔

دہری دیوار کے درمیان ایک ڈھانچا سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ کیمرے نے اس کا عکس اسکرین پر ایسے دکھایا جیسے سیاہ ایکس رے فلم پر ہڈیوں کا پنجر دکھائی دیتا ہے۔ کیپٹن اسمتھ تجربہ کار آدمی تھا اور اس نے FORENSIC سائنس میں اسپیشل کورس کیا تھا۔ اس نے کیمرے کا عکس دیکھتے ہی بتادیا کہ ڈھانچا کسی نوجوان لڑکی کا ہے۔

اس بدقسمت لڑکی کو جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، دو سال قبل انارکلی کی طرح دیوار میں زندہ یا مرنے کے بعد چن دیا گیا تھا۔

اسمتھ ابھی اس مدفون رقاصہ کا جائزہ لے رہا تھا کہ ایک ساتھ دو جاندار بھونکتے ہوئے اندر آگئے۔ ان میں سے ایک پولیس کا سراغرساں کتا تھا، دوسرا جمی کا وکیل۔ دونوں ایک جیسا شور کررہے تھے۔

"میں پوچھتا ہوں یہاں کیا ہورہا ہے؟" وکیل نے کہا۔

اسمتھ ایسے وکیلوں کے جارحانہ طرزِ عمل کا عادی تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم ایک تاریخی ڈھانچا دیکھ رہے ہیں جو بہت جلد کھدائی میں برآمد ہوگا۔"

وکیل رک گیا "واٹ از دس؟"

اسمتھ نے کہا "میری ناقص عقل یہ کہتی ہے کہ ڈھانچا ایک لڑکی کا ہے، صحیح فیصلہ ماہرین کا ہوگا لیکن یہ بہت واضح ہے کہ اس قتل کا الزام براہِ راست تمہارے موکل پر آئے گا۔"

وکیل نے زبردستی بحث کی "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے یہ ڈھانچا پرانا ہو۔ جب یہ عمارت میرے موکل کی ملکیت نہیں تھی۔"

اسمتھ نے اس سے اتفاق کیا "اگر ماہرین یہ کہیں گے کہ عمارت ڈھائی سو یا ڈھائی ہزار سال پرانی ہے تو بلاشبہ اس کا الزام سکندرِ اعظم کے زمانے کے کسی قاتل پر آئے گا۔ لیکن ایک تو تم اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتے کہ نارتن بار کو خود جمی نے نئے نقشے کے مطابق ڈیزائن کرا کے بنوایا تھا۔ دوسرے میڈیکل رپورٹ سے اس لڑکی کی صحیح تاریخ وفات بھی معلوم ہوجائے گی۔ اور یہ بھی کہ اسے کیسے مارا گیا تھا؟"

وکیل نے ہاتھ کے اشارے سے ایسے ظاہر کیا جیسے اسمتھ کی بات محض افسانہ طرازی یا خیال آرائی ہے "جمی کہاں ہے؟"

"آئی ڈونٹ نو۔ یا وہ مردہ خانے میں ہوگا یا اسپتال میں؟ جب اسے ایمبولینس میں لے جایا گیا تو وہ ہارٹ اٹیک ہوجانے سے بے ہوش تھا۔"

"اس کے ذمے دار تم ہو۔" اس نے دھمکی کے انداز میں اپنا مکا لہرایا۔ "میں پولیس پر ہرجانے کا کیس کردوں گا۔ تم سب ایک شریف اور قانون پسند شہری کو اذیت دے کر مار ڈالنا چاہتے ہو۔"

اسمتھ کے ایک ماتحت نے کہا "ہمیں ایک اور اہم سراغ ملا ہے۔ ایک وارڈ روب کے پیچھے خلا تھا۔ وہاں ہم نے دروازہ دریافت کرلیا ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے تہ خانہ ہوگا۔"

"جو اندر جائے، وہ محتاط رہے۔ اس کا واسطہ مسلح محافظوں سے پڑ سکتا ہے؟" کیپٹن نے کہا۔

میں نے کہا "میں ان کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جولی اسی تہ خانے میں ہوگی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں" وہ بولا۔

"ہم نے کتے کو جولی کے کپڑے سونگھنے کے لیے دیے تھے" ماتحت نے میرے خیال کی تائید کی "وہ بھی وارڈ روب میں گھسنے کے لیے زور لگا رہا ہے۔"

"پھر تو شک کی گنجائش ہی نہیں" کیپٹن نے کہا "اسے جولی کی خوشبو آرہی ہوگی۔"

دو مسلح پولیس مین ہاتھ میں گن لیے فائر کرنے کے لیے تیار اور محتاط انداز میں اندر داخل ہوئے۔ آگے وہ پولیس مین تھا جس نے کتے کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ کتا بھونکتا، شور مچاتا پوری قوت سے زنجیر کو کھینچ رہا تھا۔ وہ یقیناً تہ خانے میں جولی کی بو کا سراغ لگا چکا تھا۔

میں سب کے پیچھے کپڑوں کی اس الماری میں گھسا جو آفس کے پیچھے والے بیڈ روم کی ایک دیوار میں بنی ہوئی تھی۔ بظاہر اس میں شک پیدا کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ سامنے والے نصف حصے میں جمی کے اور جولی کے کچھ پریس کیے ہوئے ڈریس ہینگرز میں لٹکے ہوئے تھے۔ بائیں طرف کے دو خانے جوتوں کے لیے مخصوص تھے۔ ایک خانے میں اعلیٰ قسم کی شرابوں کا ذخیرہ تھا جو وہ اپنی اور مہمانوں کی تواضع کے لیے استعمال کرتا تھا۔

وارڈ روب کا پچھلا حصہ بڑی مہارت سے بنایا گیا تھا۔ اس کے انتہائی دائیں جانب ایک لاک تھا جو نظر نہیں آتا تھا۔ لاک کھولنے کے بعد پورا پچھلا حصہ عین مرکز پر گھوم جاتا تھا۔ نمودار ہونے والے خلا سے گزر کے میں نے خود کو ایک زینے پر پایا۔ دو زینے اترنے کے بعد ایک اور دروازہ تھا

جو مضبوطی سے بند تھا مگر پولیس والوں نے ٹکریں مار مار کے اس کے قبضے ڈھیلے کردیے اور بالآخر اسے کھولنے میں کامیاب رہے۔

دروازہ تیز آواز کے ساتھ پیچھے جا گرا۔ تہ خانے کے خلا میں اس کے دھماکے سے گونج سی پیدا ہوئی۔ آگے تاریکی تھی مگر پولیس والوں نے لائٹ کے سوئچ تلاش کرلیے۔ میرے سامنے ایک پورا زینہ آگیا جو نیچے تیسرے دروازے تک جا رہا تھا۔

پولیس نے آخری دروازے کو بھی گرادیا اور تہ خانے میں داخل ہوگئے۔ اندر قدم رکھتے ہی میں نے جولی کو دیکھا۔ وہ سراپا برہنہ اور ایک زنجیر کے ساتھ بندھی ہوئی بے ہوش پڑی تھی۔ جمی نے اس کے ہاتھوں کو رسی سے کمر کے پیچھے باندھ دیا تھا اور زنجیر کو پیروں میں ڈال کے اس کا دوسرا سرا اس فولادی پنجرے کے ساتھ مقفل کردیا تھا جس میں پہلے سے دو محبت کے مجرموں کے ڈھانچے مقید تھے۔

اگرچہ جولی نے مجھے سب کچھ بتا رکھا تھا مگر اس کے باوجود میرے جسم کو خوف کی سرد لہر نے مفلوج کردیا۔ تہ خانے میں ایک کم طاقت والے بلب کی زرد بیمار روشنی اس ماحول کو مزید آسیب زدہ بنا رہی تھی۔ وہاں ایک عجیب سی ڈراؤنی بو تھی اور مجھے ایسا لگا جیسے یہ برسوں پہلے ڈی کمپوز ہونے والی دو لاشوں کی بو ہے جو ابھی تک اس تہ خانے میں ٹھہری ہوئی ہے۔

آدھا انچ چوڑے چوکور سریے سے بنا ہوا پنجرہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی پانچ فٹ تھی اور اونچائی اس سے بھی کم۔ اس پنجرے کو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ جمی کی پہلی بے وفا بیوی اور اس کے چاہنے والے کو اسی درمیانی دیوار کی سلاخوں کے ساتھ باندھ کے زنجیروں سے جکڑ دیا گیا تھا اور وہ اسی حالت میں ایک دوسرے کے ساتھ مگر الگ الگ بیٹھے ہوئے مرگئے ہوں گے۔

میں نے ان کی موت سے پہلے کی اذیت کا تصور کیا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے کیا کہا ہوگا۔ کیا باتیں کی ہوں گی۔ وہ ایک دوسرے کو جھوٹی تسلی دیتے رہے ہوں گے کہ کوئی ان کی مدد کے لیے ضرور آئے گا۔ پولیس پہنچ جائے گی یا ممکن ہے خود جمی کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہوجائے۔ بالکل مایوس ہوجانے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کی ہوگی۔ یہ عہد کیا ہوگا کہ وہ پیار کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے جان دیں گے۔ ان کے ہاتھوں کی ایک دوسرے تک رسائی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو چھو سکتے تھے شاید سلاخوں کی موجودگی کے باوجود ان کے لب بھی مل سکتے تھے۔

لیکن موت بڑی سفاک اور بھیانک چیز ہے۔ بالآخر موت کی اذیت کے ساتھ خوف نے انہیں مغلوب کرلیا ہوگا اور پچھتاوے تھے۔ انہیں بہت دیر سے احساس ہوا ہوگا کہ ایسی پرخطر محبت کا جان لیوا کھیل کھیلنا ان کی کتنی بڑی جذباتی حماقت تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بغیر دکھی ہوتے مگر زندہ تو رہ سکتے تھے اور جدائی کا صدمہ بھی انجام کار ایک زخم کی طرح مندمل ہوجاتا ہے جس کا داغ بھی نہ رہے۔ کوئی اور مرد کوئی دوسری عورت سب کو مل جاتی ہے۔

شاید آخری وقت میں عورت خوف سے پاگل ہوگئی ہو۔ مرد کو غصے اور بے بسی کے خیال نے عورت سے نفرت پر مجبور کردیا ہو۔ وہ ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہوئے قریب رہ کے بھی بہت دور ہوگئے ہوں۔

لیکن ان ڈھانچوں کی جسمانی قربت اور موت کے وقت یکجائی سے تو یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک عہدِ وفا میں پر استقامت رہے۔

کیپٹن نے میرے کندھے کو چھوا "مسٹر شاہ علام!"

میں چونک پڑا "آئی ایم سوری!"

"میں سمجھتا ہوں کہ یہ محویت ایک ذہنی صدمے کی شدت کو ظاہر کرتی ہے مگر ہم یہاں ایسے نہیں کھڑے رہ سکتے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ جمی زنجیروں کے تالوں کی چابی کہاں رکھتا تھا؟ اپنے پاس یا کہیں اور۔۔۔ جولی نے کچھ بتایا تھا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نو۔ اس بارے میں جولی کچھ نہیں جانتی تھی۔"

"پھر تو ہمیں تالے توڑنے پڑیں گے۔ فی الحال ہم جولی کو آزاد کراتے ہیں تاکہ اسے اسپتال شفٹ کیا جائے" کیپٹن نے کہا۔

سراغ رساں کتے کی مدد کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ پولیس کے سراغ رسانوں نے اپنی مہارت اور سونوگرافی سے دیواروں کے اندر باہر جھانک کے سب دیکھ لیا تھا اور یہ سارا کام صرف آدھے گھنٹے میں مکمل کرلیا گیا تھا۔ پولیس ایک ڈسپلن کے ساتھ ترجیح کی بنیاد پر اس کام کو آگے بڑھا رہی تھی۔ انہوں نے اسٹیج کی دیوار کے پیچھے دیوار کھود کے ڈھانچا برآمد کرنے کے کام کو موخر کردیا تھا۔ ایسے ہی انہوں نے پنجروں میں قید ڈھانچوں کو فوری طور پر آزادی دلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ برسوں پرانے اجل

کے اسیروں کو اب رہائی میں تاخیر سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا لیکن جمی کو پولیس نے سب سے پہلے اسپتال روانہ کردیا تھا۔

اب جولی مل گئی تھی تو اس کی جان بچانے اور صحت کی بحالی کے مقصد نے تمام قانونی معاملات پر فوقیت حاصل کرلی تھی۔ ایک سارجنٹ نے بڑی احتیاط کے ساتھ نشانہ لیا اور زنجیر پر فائر کرکے تالے والا حصہ الگ کردیا۔ تالا اور زنجیر کا چند انچ لمبا حصہ جولی کے ایک پیر سے منسلک رہے۔ اس حصے کو اسپتال میں کسی ماہر قفل ساز سے چابی بنوا کے الگ کیا جاسکتا تھا۔

اب نارتن بار کا مکمل طور پر سیل ہوجانا لازمی تھا۔ پولیس نے اس کو اندر باہر سے اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور تفتیشی عمل قاعدے قانون کے مطابق آغاز ہوچکا تھا.... فی الحال شام کے وقت بار کھلنے یا نائٹ شو ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا چنانچہ ان سب لوگوں کے کوائف لے لیے گئے جو اس وقت بھی بار میں موجود تھے اور انہیں پابند کردیا گیا کہ وہ ضرورت پڑنے پر خود کو پولیس کے سامنے پیش کردیں گے پھر انہیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ پولیس نے سارا ریکارڈ بھی سیل کردیا تھا اور اب کسی کو بھی اجازت کے بغیر نہ اندر آنے کا اختیار تھا نہ کوئی چیز باہر لے جانے کا۔

واپس آفس میں آنے کے بعد کیپٹن اسمتھ نے میرا شکریہ ادا کیا "تم نے بہت اہم اور سنگین جرم کا سراغ لگانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اور یقیناً جولی کی جان صرف تمہاری ہمت اور کوشش سے بچائی گئی۔"

میں نے کہا "کیا اب میں اسپتال جاسکتا ہوں۔ جولی کے ساتھ۔"

"آف کورس۔ تاہم مجھے افسوس ہے کہ شاید آج رات تم اپنے وطن نہ جاسکو۔"

میں نے مایوسی سے کہا "مگر یہ ناگزیر ہے۔"

"یہ انتہائی ضروری ہے۔ پولیس کو تمہاری مدد کی ضرورت ہوگی۔ سب سے اہم تمہارا بیان ہے اور تمہاری گواہی ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ پھر میں اپنی روانگی کل تک کے لیے ملتوی کردیتا ہوں۔"

ایمبولینس کے ساتھ آنے والی میڈیکل ٹیم کے دو ارکان ایک اسٹریچر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ جولی اس پر کسی لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔

ساتھ ساتھ چلتے ہوئے میں نے ڈاکٹر سے پوچھا "کیا یہ ٹھیک ہے!"

اس نے سرہلایا "اس پر خاصا تشدد کیا گیا ہے لیکن جسم سے زیادہ نقصان اس کے اعصاب کو پہنچا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ زندہ تو رہے گی نا؟"

"آف کورس۔ لیکن اسے آرام اور سکون کی ضرورت ہوگی۔"

ایمبولینس میں ہنگامی ضرورت کے سارے انتظامات تھے مثلاً ہر گروپ کا خون۔ گلوکوز کی ڈرپ اور آکسیجن لگانے کا انتظام لیکن ڈاکٹر نے جولی کو سکون آور انجکشن لگانے کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں نے ڈاکٹر سے اجازت لے لی کہ ایمبولینس میں جولی کے ساتھ رہوں۔ پچھلے حصے میں نرس کے ساتھ صرف میں تھا۔ ڈاکٹر آگے بیٹھ گیا اور پولیس کی ایک گاڑی ہمارے پیچھے چلتی رہی۔

نرس اپنے کام میں منہمک رہی۔ وہ چالیس سال سے زیادہ عمر کی قبول صورت اور شفیق عورت تھی "تمہارا اس عورت سے کیا رشتہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے کہا "دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں۔"

وہ مسکرانے لگی "فکر مت کرو۔ یہ ٹھیک ہوجائے گی چند دن میں۔ لیکن مجھے بتاؤ اس کا یہ حال کس نے کیا ہے؟"

"خود اس کے شوہر نے۔"

"کیا وہ نفسیاتی مریض ہے؟ خطرناک قسم کا؟" وہ چادر ہٹاکے اس کے جسم کے زخموں کو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"کچھ ایسا ہی مسئلہ ہے" میں نے تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کی۔

جولی کسی لاش کی طرح سفید ہورہی تھی اور گردوپیش سے بے خبر آنکھیں بند کیے ساکت لیٹی تھی۔ اس کے بے داغ اجلے بدن پر جگہ جگہ بدنما داغ اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کی پوری داستان سناتے تھے۔ زنجیر سے باندھنے کے بعد جمی نے اسے چمڑے کی بیلٹ سے مارا ہوگا' جلد کے گورے رنگ پر ابھرے ہوئے نیل ایک انچ چوڑی پٹیوں کی طرح نظر آرہے تھے اور کہیں کہیں کھال پھٹنے سے خون بھی رس رہا تھا۔ یہ پراذیت داغ اس کے پیٹ' اس کی کمر اور اس کے سینے پر بڑی بدنمائی کے ساتھ پھیلے ہوئے تھے۔ جمی نے اس کے جسم کو جگہ جگہ جلتی ہوئی سگریٹوں سے بھی داغا تھا۔

یکلخت' ظلم اور بربریت کی بے دردی سے معمور گزر جانے والے وقت کا وہ بدہیت اور قابل نفرت حصہ میرے تصور میں ابھر آیا جب جمی کے جلاد صفت حکم کے

غلاموں نے مچلتی چلاتی جولی کو اپنے طاقتور ہاتھوں سے دبوچ کے تہ خانے میں پہنچایا ہوگا اور اس کی جسم سے لباس کو نوچ کر پھینکنے کے بعد اسے زنجیر سے جکڑ کر بے بس کردیا ہوگا۔ پھر غصے سے پاگل ہوجانے والے اس ادھورے انسان نما عفریت نے کوڑے مار مار کے جولی سے پوچھا ہوگا کہ بتا تیرے اس پاکستانی یار سے مراسم تھے یا نہیں۔ تو اس کے ساتھ سوتی تھی یا نہیں؟ وہ میرے بارے میں کیا جانتا ہے؟ کیا تو نے اس سے شادی کا وعدہ کیا ہے؟ پولیس کو میرے خلاف سارے ثبوت فراہم کرنے کا مقصد کیا تھا؟ مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا۔ تو اور تیرا یار میری دولت پر قبضے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ جولی کتنا چیخی چلائی ہوگی' کتنا تڑپی ہوگی۔ کیا اس نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہوگا؟ جمی کو بتادیا ہوگا کہ شاہ عالم سب جانتا ہے۔ شاید جولی کی جان بھی اس لیے بچ گئی تھی کہ جمی کو ڈر ہوگا کہ جولی اچانک اور پراسرار انداز میں غائب ہوئی تو میں پولیس کو سیدھا اس کے پاس لے آؤں گا۔ اور ایسا ہوا بھی تھا۔ اگر جولی نے مجھے نہ بتایا ہوتا تو میں اس تہ خانے کے راز سے کیسے واقف ہوتا اور اس کی جان کوئی نہ بچاسکتا۔

نرس نے آہستہ سے میرے بازو پر ہاتھ رکھا تو مجھے احساس ہوا کہ ایمبولینس اسپتال کے دروازے پر رک گئی ہے۔ اسپتال کے دو کارکن جولی کو اسٹریچر پر ڈال کے ایک کوریڈور میں غائب ہوگئے۔ مجھے یا پولیس کو اس ہال سے آگے جانے کی اجازت نہیں تھی جو انتظار گاہ بھی تھا۔ جب پولیس کاغذی کارروائی مکمل کرکے چلی گئی تو میں اپنے خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے لیے اکیلا رہ گیا۔

وقت کیسے انسان کے ساتھ اپنا رویہ بدلتا ہے۔

اس کی ایک چال آدمی کو ہتھیار سے مجبور کردیتی ہے۔ فتح کے غرور کو شکست کی ذلت بنادیتی ہے اور اپنی تدبیر کی کامیابی پر یقین کا سارا اعتماد چھین کر بدبختی اور مایوسی کے عذاب سے بھرے ہوئے آنسو عطا کردیتی ہے۔

جولی کی زندگی کا ایک دن گزرے ہوئے سیکڑوں دنوں کی طرح جمی کی پرتشدد غلامی کا سارا آزار رکھتا تھا۔

پھر اس سے اگلے دن کو جولی نے اپنا مطیع بنالیا اور جمی کی طاقت کے قلعے کو مسمار کرکے اس کے اختیار کی مملکت پر قابض ہوگئی۔

لیکن تیسرے دن نے بساط پھر الٹ دی اور مستقبل کے ہر خواب کی تعبیر پالینے کی سرمست خوشی کو اچانک عذاب ناک اسیری اور اذیت ناک موت کا عنوان کردیا۔

وقت کی ایک چال نے میرے جذبات کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ میں اس عورت سے اتنی نفرت کرتا تھا کہ آسان ہوتا تو میں اسے قتل کردیتا کیونکہ حسین ہونے کے باوجود اس نے حسن سے نہیں عیاری اور مکاری سے میرے پندار کے حفاظتی حصار پر شب خون مارا تھا اور مجھ سے مجھے چھین کر خود اپنی نظر سے گرادیا تھا لیکن اس وقت میں پھر جولی کے ساتھ تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ اپنی پرہوس محبت میں وہ حیوانی حد تک سفاک' خودغرض اور بے شرم ہوگئی تھی لیکن دوسری طرف یہ بھی سچ تھا کہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر اپنے جان و تن کے مالک اور آقا کے دشمن کی مدد کی تھی اور اس نے مجھے ایک کینہ پرور سانپ جیسے زہریلے' خوں خوار اور فنا کردینے کی طاقت رکھنے والے عفریت کے خوف سے محفوظ اور مامون کردیا تھا۔ اگر آج جمی پس دیوار زنداں تھا اور میں تمام خطرات سے آزاد تو یہ جولی کے عزم اور حوصلے کے طفیل تھا۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ میں فون پر اس کی مدد کی پکار سن کے بے حسی کے ساتھ کان بند کرلیتا اور اسے مرتا دیکھ کے ایسے نظر پھیرلیتا جیسے آدمی سڑک پر مرنے والے کتے کو دیکھ کر بھی نہیں پھیرتا۔

مجھے یقین تھا کہ ابھی کم سے کم ایک گھنٹا مجھے جولی کے پاس جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اسپتال میں لگے ہوئے ایک فون بوتھ سے میں نے عاقل سے بات کی۔

فون یمنی نے اٹھایا "آپ کتنی دیر میں آرہے ہو بھیا!"

میں نے کہا "مجھے کچھ دیر لگے گی۔ میں کہیں پھنس گیا ہوں۔"

"آپ کو تو شوق ہے خود کو کہیں نہ کہیں پھنسانے کا۔" وہ خفگی سے بولی "کیا آپ بھول گئے کہ رات کو آپ کی رخصتی ہے۔ چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔"

میں نے کہا "بک بک مت کر۔ دولھا میاں کو بلا۔"

"وہ اندر سامان اٹھاکے رکھ رہے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آخر ہیں کہاں؟" یمنی نے کہا۔

"میں ایک اسپتال میں ہوں۔ جولی کے ساتھ۔"

"کیوں؟"

میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں ساری صورت حال سمجھانے کی کوشش کی "یہ قانونی مسائل بعد میں تمہارے گلے پڑجاتے۔"

یمنی نے کہا "اور اب آپ کے گلے پڑگئے ہیں۔ بات تو ایک ہی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں، مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ بعد میں تمہیں پریشانی ہو۔ اگر میں ایک دو دن کے لیے پاکستان جانا موخر کردوں گا تو قیامت نہیں آجائے گی۔"

"وہ تو آپ اگر یہاں جولی سے شادی کرلیں تب بھی نہیں آئے گی۔ مگر بھیا! اس عورت کے جنجال سے نکل آؤ۔"

میں نے کہا "جیسا آپ کا حکم خاتون! کیا اب آپ عاقل کو بلائیں گی؟"

"ہرگز نہیں۔ میں اسے اسپتال بھیج دیتی ہوں" عینی نے کہا اور فون بند کردیا۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے اسپتال کے کیفے ٹیریا کا راستہ معلوم کیا۔ وہاں کافی کے ساتھ سینڈوچ کھائے اور واپس آیا تو عاقل اندر آرہا تھا۔ ہم ایک گوشے میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

عاقل نے کہا "عینی نے تھوڑا بہت مجھے بتایا، مگر وہ بہت غصے میں تھی۔ کہنے لگی کہ میرا سر مت کھاؤ۔ اسپتال جاکے بھیا سے پوچھ لو۔"

میں نے کہا "عینی کا خفا ہونا بھی بے جا نہیں۔ میں.... خوامخواہ کے مسائل میں الجھ جاتا ہوں۔ نہ چاہنے کے باوجود۔"

"یہ جولی کا کیا چکر ہے؟" عاقل بولا۔

"یہ تقدیر کا چکر ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے سب کچھ بتادیا۔ وہ بھی جو میں نے ابھی تک چھپا رکھا تھا لیکن عاقل واقعی عاقل اور بہت پریکٹیکل تھا۔ اس نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا "افسوس مجھے تمہارے گھر کی تباہی کا ہے" میں نے کہا۔

عاقل نے سرسری لہجے میں کہا "اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ انشورنس کمپنی سب دے دے گی۔"

"عینی کو ایک جذباتی صدمہ تو ہوگیا کہ گھر بسنے سے پہلے ہی اجڑ گیا۔"

"حادثات بھی زندگی کا حصہ ہیں؟" وہ بولا "اب جمی جیل چلا جائے گا تب بھی اس کا گینگ باقی رہے گا۔"

میں نے کہا "نہیں جولی کنٹرول کرلے گی۔ جمی کے پاس بدمعاشی کی طاقت تھی۔ جولی کے پاس عقل وذہانت اور حسن وشباب کی زیادہ خطرناک طاقت ہے۔ وہ دلوں پر حکومت کرنا جانتی ہے اور کرتی رہی ہے۔ لوگ جمی سے ڈرتے ضرور تھے، اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ جولی کو سب چاہتے ہیں۔"

"تم نے روانگی پھر ملتوی کردی ہے" وہ کچھ دیر بعد بولا۔

میں نے کہا "مجبوری ہے۔ پولیس چاہتی ہے کہ میں اپنی قانونی ذمے داری پوری کیے بغیر کہیں نہ جاؤں اور یہ ٹھیک بھی ہے۔"

"لیکن تمہاری بکنگ تھی آج۔"

میں نے کہا "بکنگ کینسل کرادو اور پرسوں کی لے لو۔ مجھے یقین ہے اس وقت تک ساری رکاوٹیں دور ہوجائیں گی۔"

"اب مجھے بھی کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنی پڑیں گی۔"

"تم جانتے ہو کسی وکیل کو؟"

"ہاں۔ ایک سیالکوٹی شیخ صاحب ہیں۔ وہاں قانون کی ڈگری لے کر خوار پھرتا تھا۔ میں نے اسے یہاں بلوالیا۔ اس نے محنت کی اور یہاں کا قانونی امتحان بھی پاس کرلیا۔ اب زیادہ تر غیر قانونی تارکین وطن کے مسائل حل کرتا ہے یا پاکستان سے لندن آنے کے خواہش مندوں کی قانونی راہنمائی کرتا ہے۔ میرا بہت احسان مند ہے۔"

میں نے کہا "احسان کو رہنے دو۔ زیادہ فیس دے کر کوئی اچھا وکیل کرلو۔"

وہ ہنسنے لگا "میں پیسے بچانے کی نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کیس میں مجھے کوئی قانونی مسئلہ درپیش نہیں۔ سیالکوٹی شیخ ذاتی دلچسپی لے گا تو سارے معاملات سے نمٹ لے گا جن میں انشورنس بھی شامل ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں میرے کچھ کام نمٹانے ہیں۔ ہوائی جہاز سے ریزرویشن کرالو پہلے۔ پھر ڈھائی لاکھ پاؤنڈز کی منتقلی کا انتظام کرو۔ اتنی بڑی رقم میں ساتھ لے گیا تو ائرپورٹ پر ہی کرنسی اسمگل کرنے کے الزام میں دھرلیا جاؤں گا۔ پچاس ہزار پاؤنڈز کے ٹریولر چیک حاصل کرلو۔ امریکن ایکسپریس سے۔ اتنی ہی رقم کے چار بینک ڈرافٹ بنوالو۔ رئیس، ڈاکٹر کمال، قمر اور چندا کے نام پر۔ ان کے بینک اکاؤنٹ نمبر مجھے یاد نہیں۔ عینی فون پر پوچھ سکتی ہے۔"

"میرا مشورہ ہے کہ ڈاکٹر کمال کو رہنے دو۔ اس کے اسپتال کا معاملہ ایسا ہے کہ کوئی بدخواہ بلاوجہ کا ایشو کھڑا کرسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب غیر ملکی امداد لیتے ہیں اور حکومت سے ایک پیسہ وصول نہ کرنے کا ڈھول پیٹتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ! ڈاکٹر کمال کی جگہ نیلم کا اکاؤنٹ نمبر لے لو۔ پھر میرے جانے کے بعد ان نوادرات کو بھجواتا ہے۔"

"وہ بہت دور کی بات ہے۔ میں کرلوں گا سب بندوبست۔"

ایک نرس نے مجھے دور سے اشارہ کیا "مسٹر شاہ علام!"

میں نے کہا "یس۔۔۔ جولی کیسی ہے؟"

"تم خود جاکے دیکھ سکتے ہو" وہ مسکرائی۔

"میں اب چلتا ہوں سر جی!" عاقل بولا "آپ بھی ایزی ہوجاؤ۔ ایسی کی تیسی ان لنگور کے منہ والے فرنگیوں کی۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

میں نرس کی راہنمائی میں جولی کے کمرے تک گیا۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم گردن تک سرخ کمبل کے نیچے تھا۔ اس کے ڈارک براؤن ریشمی بال تکیے پر پھیلے ہوئے تھے۔

اس نے سر گھما کے مجھے اجنبی نظروں کی بے یقینی کے ساتھ دیکھا۔ میں اس کے قریب کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ میں شاہ عالم ہوں۔"

شناخت کے جذبات مسکراہٹ بن کے اس کے ہونٹوں پر عیاں ہوئے "تم واقعی شاہ عالم ہو۔"

میں نے کہا "نہیں۔ میں اس کی روح ہوں۔"

وہ آہستہ سے کراہی "تم بھی عالم ارواح میں پہنچ گئے میرے ساتھ؟"

میں نے ہنس کے کہا "یہ بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟"

وہ بولی "نہیں، پہلے تم بتاؤ۔ تم یہاں کیسے آگئے؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟"

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ میں یہاں کیسے آگئی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تمہیں پولیس لائی ہے۔ میں نے پوچھا کہ پولیس مجھ تک کیسے پہنچی تو اس نے کہا کہ یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ اس سے پوچھ جو تمہیں لایا تھا۔"

میں نے کہا "پولیس کو میں لایا تھا۔"

اس کی آنکھوں میں یکلخت نمی اتر آئی "تم سچ کہتے ہو؟"

میں نے کہا "کیا تم نے آواز نہیں دی تھی مجھے؟"

"اور تم نے سن لی تھی میری آواز" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"دیکھو۔ میں تمہیں رلانے نہیں آیا ہوں اور تمہیں روتا دیکھ بھی نہیں سکتا۔ تم مسکراتی رہوگی تو میں بیٹھا رہوں گا ورنہ چلا جاؤں گا۔"

اس کی آنکھیں آنسوؤں کے ساتھ مسکرانے لگیں "تم نے مجھے بچالیا شاعلام۔ ورنہ وہ درندہ مجھے اور پھر تمہیں بھی ہلاک کردیتا۔"

میں نے کہا "وہ گیا جیل ساری عمر کے لیے۔ بھول جاؤ اسے۔"

"شاعلام! وہ پھر باہر آجائے گا" وہ خوف سے کانپنے لگی۔

"نہیں۔ اب اس کا کوئی امکان نہیں۔ پولیس نے تہ خانے سے دونوں ڈھانچے اٹھوالیے ہوں گے۔ ایک ڈھانچا اسٹیج کے پیچھے واش روم سے ملا تھا، دیوار میں چنا ہوا۔"

اس کی آنکھیں خوف اور حیرانی سے پھیل گئیں "دیوار میں چنا ہوا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ پولیس نے تہ خانے کا سراغ بھی سونگرانی کیمروں کی مدد سے لگایا تھا۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگالیا "میرا خیال تھا، تم مجھ سے ناراض ہو۔"

"ناراض تو واقعی ہوں۔"

"میں بہت بری عورت ہوں شاعلام۔ اور تم بہت اچھے آدمی ہو۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرسکتے؟"

"معاف نہ کرکے میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں جارہے ہو؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "تم کو زیادہ باتیں نہیں، آرام کرنا چاہیے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور پھر مجھے بٹھالیا "میں جانتی ہوں کہ تم گئے تو پھر کبھی نہیں آؤگے۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

میں پھر بیٹھ گیا۔ "مجھے بھی کچھ کہنا ہے تم سے۔ جولی، دیکھو جو کام جمی کرتا تھا، شاید وہ تمہارے بس کا نہ ہو۔ کیونکہ تم ایک عورت ہو۔"

"عورتیں دنیا میں کون سا کام نہیں کررہی ہیں؟ حالانکہ یہ تمہاری دنیا ہے۔۔۔ مردوں کی۔"

"میں اس وقت یہ ثابت کرنا نہیں چاہتا کہ عورت برتر ہے مرد سے یا کمتر۔ اصل بات یہ ہے کہ جمی کے سارے دھندے غیر شریفانہ تھے۔۔۔ وہ بدمعاش تھا۔"

"میں بھی بدمعاشی میں کم تو نہیں ہوں" وہ مجھے آنکھ مار کے مسکرائی۔

"کیا ضرورت ہے تمہیں آخر بدمعاشی کرنے کی۔ تم اتنی حسین ہو، نوجوان ہو اور ذہین ہو۔ چلو مانا کہ تم جمی کے کاروبار کو کنٹرول کرسکتی ہو۔ تم ان بدمعاشوں سے بھی نمٹ سکتی ہو جو جمی کے اشاروں کے غلام تھے۔ لیکن کیا فائدہ ایسے غیر قانونی، غیر شریفانہ اور غیر اخلاقی کام سے دولت کمانے کا،

کیا اس میں کوئی خوشی ہے' کوئی تحفظ ہے۔"

"تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"مجھے یقین تو نہیں کہ تم مانو گی۔ پھر بھی نیک مشورہ دینا میرا فرض ہے۔ تم یہ کاروبار بیچ دو۔ اس کی ساری گڈول' یعنی بدنامی کی شہرت کے ساتھ آج تم اس کی اچھی قیمت وصول کر سکتی ہو۔ تمہارے پاس اتنا پیسا ہو گا کہ تم کچھ بھی کر سکتی ہو' جس میں خطرہ کوئی نہ ہو۔ برائی کا کوئی پہلو نہ ہو۔ قانون کی گرفت کا خوف نہ ہو۔ خود میں نے وہ سب دھندے چھوڑ دیے ہیں جن میں جی میرا پارٹنر تھا۔"

"اگر تم میرا ساتھ دو۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کاش یہ ممکن ہوتا لیکن ایک دو دن بعد میں پاکستان چلا جاؤں گا۔ کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔ اور اگر آیا بھی تو تمہیں نہ میرے آنے کا پتا چلے گا نہ جانے کا۔"

"میرے کاروبار کے' میرے دل کے اور میری زندگی کے دروازے ہمیشہ تمہارے لیے کھلے ہوں گے شاعلام۔"

میں نے کہا "لیکن میرا دل پاکستان میں ہے۔ میری زندگی پاکستان کے لیے ہے اور میرا کاروبار کچھ اور ہے۔"

"تم یہاں سیٹل ہو سکتے تھے۔"

میں نے کہا "میرے پاس برطانوی شہریت ہے۔"

"اگر تم میرا ساتھ دو۔ تو میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گی۔ ہم مل کے کاروبار کو سنبھالیں گے۔ میرا پیسہ تمہاری تحویل میں ہو گا۔"

میں نے کہا "اس فراخ دلانہ پیشکش کا شکریہ مگر مجھے جانا ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری "تم میری زندگی بدل سکتے تھے۔"

میں نے کہا "لیکن میری زندگی کسی اور کی امانت ہے۔"

"تم نے کبھی بتایا نہیں کہ وہ خوش قسمت کون ہے؟"

میں نے کہا "شاید ابھی میں خود بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہمارے اور تمہارے عقیدے میں ایک یقین مشترک ہے کہ جوڑے آسمانوں میں بنائے جاتے ہیں۔"

"میرا جوڑا HEAVENS میں نہیں HELL میں بنا ہو گا۔"

میں نے کہا "ایسی مایوسی کی باتیں مت کرو۔ آنے والے اچھے وقت کے لیے اچھی امید رکھو۔ مجھے یقین ہے ایک دن آئے گا جب تمہیں زندگی کی وہ خوشیاں بھی مل جائیں گی جو تم سے دور بھاگتی رہیں۔"

"شاعلام!" اس نے میرا ہاتھ چوما "تم میری خوش قسمتی ہو سکتے تھے۔"

میں پھر کھڑا ہو گیا "اپنی حفاظت کے خیال سے غافل مت رہنا۔ جی کا کوئی خیر خواہ تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ ہمارا اب ایک دوسرے پر کوئی قرض باقی نہیں رہا۔ تم نے جی سے میری گلوخلاصی کرائی۔ میں نے اس سے تمہاری جان بچائی' حساب برابر۔"

"اتنے بے مروت اور اجنبی مت بنو۔ ہم لائف یا بزنس پارٹنر نہ سہی۔ ایک دوسرے کے اچھے دوست تو رہ سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ایک بار تمہاری دوستی کا فریب کھا چکا ہوں۔ دوبارہ دھوکا نہیں کھا سکتا۔"

"اگر کبھی میں پاکستان آؤں؟"

میں نے کہا "شاید میں تمہیں نہ ملوں' خدا حافظ!"

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر میں پلٹا اور دوسری بار اس کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے سینے پر ایک بوجھ تھا جو اب نہیں رہا۔ وہ زنجیر جس نے مجھے شاہ عالم کے ماضی میں محصور کر رکھا تھا ٹوٹ چکی ہے۔

میں نے گھر پہنچا تو عینی سر پر اسکارف باندھے جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھی اور لینڈلیڈی کے ساتھ ویسی ہی انگلش بول رہی تھی جیسی اردو انڈیا آنے والے انگریز حاکم بولتے تھے۔ بڑی بی مجھے دیکھ کے خوش ہوئیں "اب تم ہی اس لڑکی کو سمجھاؤ۔ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اور یہ میری بات سمجھنا نہیں چاہتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "کہیں آپ لوگوں کے درمیان ساس بہو کا رشتہ تو قائم نہیں ہو گیا؟"

"او نو۔ خدا کا شکر ہے' میری زندگی اس عذاب سے محفوظ ہے۔ صرف ایک لڑکی کبھی کبھی ملنے آجاتی ہے۔ باقی کے بارے میں تو مجھے یہ بھی علم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ ہر سال مجھے ان کے کرسمس کارڈز مل جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ آج کل وہ کہاں ہیں اور ان کے کتنے بچے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ میرے بڑے بیٹے کے دو لڑکے ہیں۔ اس سے چھوٹے والے کے چار بچے ہیں۔ دو لڑکیاں' دو لڑکے۔ تیسرے کے بھی چار اولادیں ہیں۔ تین لڑکیاں اور ایک لڑکا' جیسے میرے تھے۔ دیکھا جائے تو میرے دس پوتے پوتیاں ہیں۔ اگر گیارہ یا بارہ ہو چکے ہیں تو مجھے علم نہیں۔ اب کے کرسمس پر کارڈز پر نئے نام دیکھنے سے معلوم ہو گا۔ ان سب کے پہلے بچے کی پیدائش کی تاریخ دن اور وقت تک مجھے معلوم ہے کیونکہ اس وقت وہ یہاں میرے ساتھ تھے۔ ایک

سال بعد سب چلے گئے۔ ان تینوں کو میں برتھ ڈے کارڈ بھیج سکتی ہوں مگر اس لیے نہیں بھیجتی کہ ان کے دوسرے بھائی بہن سوچیں گے' دادی ہم سے پیار نہیں کرتیں۔ بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جیلس ہو جانے والے۔ انہیں کون بتائے۔۔۔" اچانک انہیں احساس ہوا کہ جذبات کی رو۔۔۔ میں بہہ کے وہ بہت زیادہ بول گئی ہیں "لو' میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ اپنا رونا لے کر بیٹھ گئی۔"

میں نے عینی سے کہا "بڑی بی کو کیا شکایت ہو گئی۔"

وہ بولی "شکایت کوئی نہیں بھیا۔ میرا خیال تھا کہ نیچے والا بیڈ روم اپنے پاس رکھوں' بڑی بی کا خیال ہے۔۔۔"

میں نے کہا "بڑی بی کا خیال ٹھیک ہے۔ تمہیں اوپر ہی رہنا چاہیے۔ وہ بھی اکیلی ہیں۔ اور تمہیں بھی کسی خیال رکھنے والے کی ضرورت تو پڑے گی۔"

وہ میری بات کا مطلب سمجھ کے شرمائی "یہ تو ہے۔"

بڑی بی نے کہا "یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ میں تمہاری زبان نہیں سمجھتی۔"

میں نے کہا "یہ مسئلہ نہیں مجبوری ہے۔ اس لڑکی کو انگریزی نہیں آتی ورنہ میں اتنا بدتہذیب نہیں ہوں۔"

وہ شفقت سے مسکرائی "شاید ساتھ رہ کے ہم دونوں ایک دوسرے کے ہم زبان ہو جائیں۔ یہ مجھے اردو سکھا دے۔ میں اسے انگلش بولنا سکھا دوں۔ پڑھنا تو آتی ہو گی اسے۔"

میں نے کہا "ویسے تو ماشاءاللہ بڑی عالم فاضل ہے۔ میٹرک کیا ہے۔"

عینی سمجھ گئی۔ اس نے اردو میں کہا "بھیا۔ آپ مجھے ایم اے پاس بتاتے تو کیا تھا۔ اردو فارسی میں ایم اے پاس بھی انگریزی نہیں بول سکتا۔"

میں نے کہا "ایم اے کے لیے گریجویٹ ہونے کی شرط ہے اور گریجویٹ اتنا جاہل نہیں ہوتا جتنی تو ہے۔ خیر چھوڑ' یہ بتا چائے کافی کچھ مل سکتا ہے۔"

"ابھی سے کہاں بھیا! میں تو صفائی میں لگی ہوئی ہوں۔ اس گھر میں تو جو تھوڑا بہت سامان تھا سب جل گیا۔ عاقل کے ساتھ جا کے دیکھوں گی کیا بچا ہے۔ وہ کہہ رہے تھے انشورنس کمپنی سارا نقصان پورے کرے گی۔"

میں نے کہا "بہت دکھ ہوا ہے تجھے؟"

"دکھ کی بات تو ہے نا بھیا! سارا سامان ہی نیا تھا۔ پرانا تو میں نے سب پھنکوا دیا تھا" وہ بولی "اب پھر کچھ نہیں گھر لے لیا ہے' سامان ندارد۔"

میں نے کہا "فکر مت کر۔ تجھے نیا مل جائے گا یا دلوا دیا جائے گا۔"

"نہیں بھیا۔ یہ سب بھی آپ ہی کا تھا۔ اب ہم خود اپنا گھر بنائیں گے۔"

میں نے کہا "میں خود کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ میری نیلم سے بات ہوئی تھی۔ تو نے بات کی نیلم سے؟"

"کی تو تھی۔"

"مجھ سے اس نے کہا کہ عینی کو جہیز میری طرف سے دیا جائے گا۔ چنانچہ تو بس اتنا کر کہ مجھے ایک فہرست بنا دے سامان کی' کیا کیا چاہیے؟"

"میری فہرست تو بہت لمبی ہے" وہ خوش ہو گئی۔

میں نے کہا "فہرست مختصر ہوتی تو میں خود اسے بڑھا لیتا۔ یہ نیلم کے جذبات کا معاملہ ہے۔"

بڑی بی نے دیکھا کہ ہم آپس میں باتیں کرنے میں مصروف ہیں تو انہوں نے جانے کا بہانہ سوچ لیا "میں تم دونوں کے لیے چائے بناتی ہوں' چائے پیو گے یا کافی کا موڈ ہے؟"

BEGGERS CAN'T BE CHOOSERS" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی "تانی بوائے' میں کافی لے آتی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا "بڑی بی کیا نمونہ ہیں اس ملک کی تہذیب کا۔ تمام عمر کی ریاضت کا حاصل ہے ایک مسلسل تنہائی کا آزار۔ حالانکہ عادت و اطوار سب اچھے ہیں۔ مگر بیٹے سب بھول گئے ہیں کہ ان کی ایک ماں بھی تھی جس کے بغیر وہ ایک لمحہ نہیں جی سکتے تھے۔ آج وہ ان کے بغیر جینے پر مجبور ہے۔"

"یہ تو اب پاکستان میں بھی ہو رہا ہے" عینی نے کہا "ساس بہو کی بنتی نہیں اور لڑائی جھگڑے کا انجام بالآخر وہی ہوتا ہے' علیحدگی۔"

"لیکن پاکستان میں اولاد ایسے لاتعلق تو نہیں ہو جاتی۔ خیر' یہ بتا تو خوش اور مطمئن رہے گی نا' عاقل کے ساتھ؟"

وہ حیران ہوئی "یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ اب شادی کی ہے تو نبھانی بھی ہے۔"

"میرا مطلب تھا۔۔۔ یہاں تو اکیلی ہو گی۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ اور لڑنا نہیں ورنہ میں کیسے آؤں گا بار بار صلح کرانے۔ عاقل تو بے چارہ بہت سیدھا ہے۔ مگر تو بہت لڑاکا ہے' مجھے معلوم ہے۔"

"کیا معلوم ہے؟" وہ منہ پھلا کے بولی۔

"دیکھا۔ سچ کڑوا تھا نا۔ تجھے کون بہتر سمجھ سکتا ہے مجھ سے زیادہ۔ لیکن اب وہ پہلے والی بات نہیں ہے ___ ہم تو سن لیتے تھے۔"

اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں "آپ جذباتی ہورہے ہو بھیا۔ فکر مت کرو۔ آپ نے تو دیکھا ہوگا کہ میں کتنی بدل گئی ہوں۔ پہلے میں کیا تھی' اب کیا ہوں۔ عاقل کو مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آپ بتاؤ' جولی کیسی ہے؟"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا "بس ٹھیک ہے۔ پولیس نے اسے بچالیا۔ آگے اس کی اپنی زندگی ہے۔ جیسے چاہے گزارے۔ میں تو خدا حافظ کہہ کے آگیا ہوں۔ صاف بتا دیا ہے کہ اب ہم اجنبی ہیں۔ جیسے پہلے تھے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا ورنہ اس عورت کا کچھ بھروسا نہیں' پاکستان بھی پہنچ جاتی تمہارے پیچھے پیچھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "تجھے بہت خوش فہمی ہے اپنے بھیا کے بارے میں کہ وہ بڑا پرنس چارمنگ ہے۔"

"خوش فہمی کیسی؟" وہ اترا کے بولی "یہ تو حقیقت ہے' اسے دیکھو روشنی کو' خواہ مخواہ گلے کا ہار ہو رہی تھی۔"

میں نے کہا "وہ بے چاری تو اسپتال میں ہے۔"

"اونہہ' بے چاری۔" عینی نے خالص نند والے لہجے میں کہا "شکر کریں کہ مردہ خانے میں نہیں پڑی ہے۔"

میں نے کہا "تو بڑی سنگدل ہوگئی ہے عینی۔ تجھے پتا ہے اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں۔"

عینی نے کہا "پاگل ہوگئی؟ خاندانی اثر ہے۔ ماں بھی تو تھی۔"

میں نے اسے ڈانٹا "مت کر ایسی باتیں۔ اس کی یادداشت صرف اس حد تک متاثر ہوئی ہے کہ اسے میری کوئی بات یاد نہیں۔ نہ میرا نام' نہ اس وقت کی کوئی بھی بات جو اس نے میرے ساتھ گزارا ___ باقی سب یاد ہے۔"

عینی ہنسنے لگی "تم بھی بڑے بھولے ہو بھیا۔ بھلا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے۔ وہ ڈراما کررہی ہے ڈراما۔ آخر ہے نا ایکٹریس۔"

میں نے برہمی سے کہا "جس بات کا پتا نہ ہو آدمی کیوں اس کے بارے میں غلط بات کرے' خود کو جاہل ثابت کرنے سے فائدہ۔ مجھے یہ بات ڈاکٹروں نے سمجھائی ہے۔ اسے تو ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں آیا۔"

عینی کچھ نہیں بولی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف لگتا تھا کہ اس نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔

عاقل میرے اور اپنے کاموں کے چکر میں باہر کہیں مصروف تھا۔ بڑی بی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی مزے دار کافی پیتے پیتے شام ہونے لگی۔ وہ کافی کے ساتھ بسکٹ اور پیسٹری قسم کی کوئی چیز بھی لائی تھیں جسے انہوں نے COOKY کا نام دیا۔ ہمارے آنے سے ان کی تنہائی کے روگ کا علاج ہوگیا تھا چنانچہ جواب میں وہ اپنی ساری شفقت اور عنایت ہم پر نچھاور کررہی تھیں۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ بوڑھی عورت جانتی ہے کہ کرائے دار کسی اولاد کا نعم البدل نہیں ہوسکتے۔ پھر بھی وہ ان کا دل جیتنے کی کوشش کرتی ہے۔ تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ عرصہ اس کے ساتھ رہ لیں۔ اس کے باوجود کرائے دار کبھی نہ کبھی گھر خالی کرجاتے ہیں۔ کسی بڑے گھر میں شفٹ ہوجاتے ہیں یا اپنا گھر بنا لیتے ہیں۔ وہ پھر تنہا ہوجاتی ہے اور پھر نئے کرائے داروں کو خوش رکھنے کی کوشش میں لگ جاتی ہے۔

گھر بیٹھ کے عاقل کا انتظار کرتے رہنا لاحاصل تھا۔ میں نے پہلے پولیس اسٹیشن جاکے جی کے کیس کی پروگریس دیکھنے کا سوچا۔ پھر روشنی کو دیکھنے اسپتال چلا گیا۔ شیری مجھے باہر ہی مل گئی۔ وہ سگریٹ پینے کے لیے باہر آئی تھی۔

میں نے کہا "ہیلو' کیا حال ہے۔"

وہ چونک کے پلٹی "حال ___ کس کا ___ میرا یا روشنی کا؟"

میں نے کہا "چلو پہلے اپنا بتادو۔"

"میں ابھی کچھ دیر میں اسے اپنے ساتھ لے جارہی ہوں۔ کل میں نے جذباتی ہوکے ڈے آف لے لیا۔ کسی کو بتائے بغیر۔ خیر روشنی کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا۔" اس نے ایک پاؤں برآمدے کی دیوار پر رکھ لیا۔

میں نے کہا "خدا کے لیے سیدھی کھڑی ہوجاؤ۔"

وہ ہنسی "اتنے شرماتے ہو تو ادھر ادھر دیکھتے کیوں ہو؟"

میں نے کہا "تم روشنی کی دیکھ بھال کیسے کروگی۔ میرا مطلب ہے تمہاری مصروفیات ___؟"

وہ بولی "مجھے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرنا۔ بس اسے اپنے اپارٹمنٹ میں جگہ دینی ہے۔ میں اپنی روم میٹ کو نکال دوں گی۔ اس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ وہ بالکل تمہارا زنانہ ایڈیشن ہے۔ ہر وقت وعظ اور نصیحت' یہ برا ہے' یہ گناہ ہے' یہ غیر اخلاقی ہے۔ اُلو کی پٹھی' پہلے ٹھیک تھی۔ آج کل کسی چرچ کے پادری کی سیکریٹری ہے تو خود بھی نن بنتی ہے۔ کسی دن وہ پادری خود ___"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔"

اس نے سگریٹ بجھادی "میرا اپارٹمنٹ دیکھا ہے تم نے۔ خاصا بڑا ہے۔ میں اکیلی اس کا کرایہ ادا نہیں کرسکتی۔ آدھا کرایہ روشنی دے گی۔ میں نے سمجھا دیا ہے اسے کہ اپنے کام سے کام رکھے تو سب ٹھیک ہے۔ بلاوجہ میری اماں نہ بنے۔ نائٹ کلب میں ایک کیشئر کی جگہ ہے۔ چاہے تو نوکری کرلے۔ ضمانت میں دے سکتی ہوں' بس ایک پرابلم ہے۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کے جڑواں بچے ہوئے تھے۔ عاشق نمبر دون کا تحفہ؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "ہاں۔ انہیں وہ کسی چرچ میں چھوڑ آئی تھی؟"

"اب اسے نہ جانے کیوں ماتا کا دورہ پڑا ہے۔ انہیں واپس لانا چاہتی ہے۔ خود پالنے کے لیے۔ کہتی ہے وہ لوگ انہیں عیسائی بنالیں گے۔"

"اس میں پرابلم کیا ہے؟"

"پرابلم کوئی نہیں۔ تم بھی ایسا سمجھتے ہو یعنی وہ عیسائی بنالیں؟"

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ میرا مطلب تھا کہ اگر وہ اپنے بچوں کو واپس حاصل کرنا چاہتی ہے تو تمہیں کیوں اعتراض ہے؟"

"مجھے ایک نہیں' کئی اعتراضات ہیں" شیری نے کہا "دل تو دوبارہ اپنے بارِ گناہ کو اٹھانے کی خواہش کرنا ہی پاگل پن ہے۔ ارے بابا' گند پھینک دی تو بس پھینک دی۔ بچوں کا کیا ہے' جب چاہوگی جتنے چاہوگی ہوجائیں گے لیکن ان کے لیے ماتا پھٹی پڑ رہی ہے ان بچوں کے باپ کو بھی پکڑو جو ذمے دار ہے ساری خرابی کا۔ اس پر بھی ذمے داری ڈالو۔ اسے کہو کہ انہیں پالنے پوسنے کا خرچہ دے۔ صرف بچوں کے نہیں ماں کے اخراجات بھی برداشت کرے۔"

میں نے کہا "تم کیسی اصول پرستی کی باتیں کرتی ہو۔ یہاں تو خیر ٹھیک ہے' مگر پاکستان میں ایسی بات کون سنتا ہے۔ وہ مانے گا جوان بچوں کا باپ تھا؟"

"اس کا تو باپ بھی مانے گا۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔ تم جانتی ہو' وہاں صنعت کار کیا ہوتا ہے' اس کی طاقت کے سامنے قانون سر جھکاتا ہے۔"

"میں سب جانتی ہوں مگر یہاں رہ کے میں نے سارے داؤ پیچ سیکھ لیے ہیں۔ کمزور کے پاس اگر داؤ پیچ ہوں تو طاقتور یوں گرتا ہے قدموں میں' یوں" اس نے چٹکی بجائی۔

"ذرا میں بھی تو سنوں' ایسا کون سا دھوبی پٹخا مار سکتی ہے روشنی؟"

"ڈی این اے ٹیسٹ۔ آج کل سائنسی کرشمہ۔ پھل خود گواہی دیتا ہے کہ وہ کس درخت میں تھا۔"

"پاکستان میں ڈی این اے کا نام پولیس نے بھی نہیں سنا۔"

"مگر یہاں تو سب ہوسکتا ہے۔ روشنی ایک رپورٹ لکھوادے اس صنعت کار کی اولاد کے خلاف کہ یہ حرام زادہ ان دو بچوں کا باپ ہے۔ ان کے ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹ لے لی جائے اور باپ کی رپورٹ پاکستان سے منگوائی جائے یا بچوں کے باپ کو ٹیسٹ کے لیے طلب کیا جائے۔ اگر وہ ہوم ڈیپارٹمنٹ کو لکھے' اخبارات میں دے۔ ہائی کمشنر کے آفس کے سامنے مظاہرہ کرے تو ہوگا یہ کہ کیس رجسٹر ہوجائے گا۔ ملزم کو نوٹس جاری ہوجائے گا۔ اور وہ نہ آیا تو اس کا نام مطلوب مجرموں کی فہرست میں شامل ہوجائے گا۔ وہ جب بھی برطانیہ آیا' پکڑا جائے گا۔ وہ بزنس مین ہے۔ برطانیہ آنا چھوڑ سکتا ہے مگر فرانس' جرمنی' ہالینڈ' امریکا۔ کہاں کہاں نہیں جائے گا۔ ہر ملک کے ساتھ برطانیہ کا تحویلِ مجرماں کا معاہدہ ہے۔"

میں نے کہا "اگر اتنی ہمت ہے روشنی میں ___"

شیری نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہی تو ساری خرابی ہے کہ وہ خود اب برطانیہ میں بلا اجازت مقیم ہے۔ اس کی اپنی حیثیت غیر قانونی ہوگئی ہے تو وہ خاک قانونی کارروائی کرے گی۔ چنانچہ میرا آخری اعتراض یہ ہے کہ وہ بچوں کو وہیں رہنے دے یا اپنے رہنے کا بندوبست کہیں اور کرے۔ تم اس سلسلے میں کچھ کرسکتے ہو؟"

میں اس سوال کے لیے تیار نہ تھا "میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"تم ان بچوں کو پاکستان لے جاؤ۔"

"کس حیثیت میں؟"

"روشنی تمہیں گارجین بنادے یا ___ یا تم کہہ دو میرے بچے ہیں۔"

میں بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "یا تم پاگل ہوگئی ہو یا مجھے پاگل سمجھتی ہو۔"

"وہاں لے جاکے انہیں کسی یتیم خانے میں داخل کرا دینا۔"

مجھے جیسے بھڑ نے کاٹ لیا "یتیم خانے میں۔ شیری تمہیں کچھ پتا نہیں تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم نے دیکھے ہیں یتیم

خانے؟"

"دیکھے تو نہیں۔"

"اسی لیے یہ بات سوچ رہی ہو۔ لیکن میں نے دیکھے ہیں اور اپنے تجربے۔ میرا مطلب ہے مشاہدے کی بنا پر میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا۔ انہیں تمام عمر کے لیے ذہنی اور جسمانی عذاب کے جہنم میں ڈالنے سے بہتر ہوگا اگر تم خود انہیں اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کے مار ڈالو۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی "لیکن اچھے یتیم خانے بھی تو ہوں گے وہاں؟"

"میرے علم میں کوئی نہیں۔ یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کوئی پوچھے کہ جہنم تو خیر سب برے ہوتے ہیں مگر کوئی بہتر جہنم بھی ہوگا۔ میری مانو تو ان بچوں کو انہیں کے پاس رہنے دو' چرچ میں۔"

"روشنی اب کسی قیمت پر ایسا کرنے کو راضی نہیں۔ اس نے بچوں کو واپس لانے کا تہیہ کرلیا ہے۔ وہ الگ رہنے پر بھی آمادہ ہے۔"

"کیا چرچ انہیں اتنی آسانی سے واپس کردے گا۔"

"نہیں۔ یہ ایک قانونی جنگ ہوگی۔ جس میں بالآخر روشنی جیت جائے گی۔ کیا تم کل صبح دو گھنٹے کے لیے فارغ ہو؟"

"کام کیا ہے؟"

"ابھی تو میں روشنی کو گھر لے جا رہی ہوں۔ رات کو میرا شو ہوگا۔ اگر تم بارہ ایک بجے کہیں مل جاؤ مجھے۔ تو ہم اس چرچ میں جاسکتے ہیں۔ اور کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں ہمارا بچہ واپس چاہیے۔"

"ہمارا... ؟ کیا مطلب؟" میں نے ہڑبڑا کے کہا۔

"یار' میں کون سی بچے کی ماں ہوں۔ تم بھی جھوٹے باپ بن جاؤ۔"

"شٹ اپ شیری!"

"ہم صرف ان کا سراغ لگائیں گے۔ دیکھیں چرچ والے اب کیا کہتے ہیں۔ پلیز' روشنی کے لیے تم اتنا بھی نہیں کرسکتے؟"

"روشنی کے لیے مجھے جتنا کرنا تھا' کرچکا۔"

"نہیں۔ اس نے وہ سب کیا جو تم چاہتے تھے۔"

میں نے کہا "بلامعاوضہ نہیں' اس کی پوری قیمت وصول کی تھی روشنی نے۔"

"مگر اس کے بعد تم نے اسے دھوکا دیا۔"

میں نے کہا "کیا دھوکا دیا میں نے اسے؟"

"تم نے اسے شادی کا پروپوزل دیا تھا۔ دیا تھا یا نہیں' اور جب وہ تمہاری محبت کے جال میں پھنس گئی تو تم نے اسے ہری جھنڈی دکھادی۔ یہ دھوکا نہیں تو اور کیا تھا۔ تم خود بھی جانتے تھے کہ یہ دھوکا ہے۔ شادی تم کسی اور سے کروگے۔ محبت تم کسی اور سے کرتے ہو۔ بولو' کیا یہ غلط ہے؟"

میں خاموش رہا کیونکہ میں مزید جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا۔

"اسے ڈپریشن میں مبتلا کرنے کے ذمے دار تم ہو۔ تمہاری وجہ سے اس نے اپنی جان لینے کی کوشش کی لیکن ابھی تک میں نے یہ بات کہی نہیں ہے۔"

میں نے اسے نفرت سے دیکھا "تم مجھے دھمکی دے رہی ہو؟"

"اس لیے کہ پہلے میں نے درخواست کی تھی جسے تم نے ٹھکرا دیا۔"

میں نے کہا "تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میں ایسے بلیک میل ہونے والا نہیں ہوں شیری!"

"میں تم پر ہرجانے کا کیس کرسکتی ہوں۔ پولیس کے سامنے میرا ایک بیان تمہیں مشکل میں ڈال سکتا ہے۔"

"تم کچھ بھی ثابت نہیں کرپاؤگی۔ اس معاملے میں کوئی ڈی این اے ٹیسٹ بھی تمہاری مدد نہیں کرے گا۔" میں نے حقارت سے کہا۔

"لیکن ایسے لوگ بہت ہیں جن کے سامنے تم نے روشنی کو اپنی بیوی کہا۔ یہ بات کس سے چھپی ہوئی ہے کہ تم ایک ساتھ رہتے تھے۔ تم نے اسے ہاتھ لگایا یا نہیں' اس کا مرحلہ تو بعد میں آئے گا۔ یہ سوچو کہ تمہاری نیک نامی کتنی متاثر ہوگی۔ تمہارا سیاسی کیریئر خراب ہوگا۔"

میں نے دانت پیس کے کہا "تم ایک ذلیل بلیک میلر ہو۔"

وہ ہنسی "شریف بلیک میلر کون ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم خبروں میں بتاتے ہیں کہ سفاکانہ بمباری سے اتنے لوگ شہید ہوگئے۔ کیا رحمدلانہ بمباری ہوتی تو وہ بچ جاتے۔ میرے ایک بیان سے تم پھنس جاؤگے۔"

"اگر میں تمہارے ساتھ گیا تو میں زیادہ پھنس جاؤں گا۔ تم بعد میں یہ بھی بتادوگی سب کو کہ میں نے چرچ میں پادری کے سامنے کیا کہا تھا لیکن میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں کسی دھمکی سے نہیں ڈرتا۔"

اس نے ایک دم میرے گال کو چٹاخ سے چوم لیا "اوہ ڈیئر۔ تم واقعی موٹی چور کے لڈو ہو۔"

میں نے اسے دھکا دیا "ایسی بدتمیزی پر میں جھانپڑ مار دیتا ہوں۔ بے حیا۔"

وہ ہنسی "روشنی واقعی سچ کہتی تھی۔ تم میں مردوں والی کوئی بات نہیں' مرد ہونے کے باوجود۔ تمہارا تو چہرہ لال ہوگیا ہے لڑکیوں کی طرح۔ ارے ہاں یہاں سب چلتا ہے۔ کوئی اسے بے حیائی نہیں سمجھتا۔"

"میں سمجھتا ہوں۔"

"اوکے' اوکے! آئندہ میں بری نظر سے دیکھوں گی بھی نہیں۔ چلو اب غصہ تھوک دو۔ آؤ" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "میں جا رہا ہوں۔"

وہ حیرانی سے بولی "روشنی کا حال پوچھنے آئے تھے۔ اسے دیکھے بغیر چلے جاؤگے؟"

میں نے کہا "اس کے لیے میں ایک اجنبی ہوں" میں نے کہا۔

روشنی تکیے کے سہارے نیم دراز ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ریموٹ اٹھا کے ٹی وی آف کردیا تاہم اس کا رویّہ نہ مکمل پہچان کا تھا نہ دانستہ غیریت کا۔ وہ اس حد تک معقول تھا جتنا اسپتال کے عملے یا کسی ڈاکٹر کے لیے ہوسکتا تھا۔

میں نے کہا "کیسا لگ رہا ہے اب مس روشنی؟"

وہ بولی "میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر!"

شیری نے کہا "یہ ڈاکٹر نہیں ہیں۔ یہ شاہ عالم ہیں۔ تم نے کبھی ان کا نام سنا ہے؟"

وہ سوچ میں پڑگئی "نام سنا ہوا لگتا ہے۔"

"یہ پاکستان کے ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ یہ جمی کے بھی دوست ہیں۔ تم جمی کو جانتی ہو؟"

"میں کسی جمی کو نہیں جانتی۔"

"ان کی چھوٹی بہن ہے قرۃ العین' جسے سب عینی کہتے ہیں۔ اس کی شادی عاقل سے ہوئی ہے۔"

روشنی کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے "یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہی ہو؟"

میں نے کہا "شیری' جب یہ مجھے نہیں پہچان پا رہی ہیں تو باقی لوگوں کو کیسے پہچان سکتی ہیں۔ مس روشنی' ہم صرف ایک بار ملے ہیں پہلے۔ ایک تقریب میں' البتہ شیری مجھے جانتی ہے۔"

"میں کسی کو نہیں جانتی؟" روشنی نے کہا۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کے باہر آگیا۔ اسپتال کے گیٹ پر بہت سی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ شام اب ڈھلنے لگی تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ وہ مجھے کاروں کے شوروم کی طرف لے چلے۔ وہ مجھے ایک ایسے علاقے میں لے گیا جہاں نئی پرانی کاروں کے درجنوں شوروم تھے۔ میں نے سب میں جاکر دیکھنے کے بجائے ایک ایسے شوروم کا انتخاب کیا جہاں سیکڑوں کاریں تھیں۔

قطار میں آگے پیچھے کھڑی ہوئی گاڑیوں کے درمیان بہت سے لوگ گھوم پھر کے اپنی پسند کے مطابق گاڑیاں دیکھ رہے تھے۔ شوروم کے مستعد سیلزمین ان کی خدمت پر مامور تھے اور جو خریدار کسی گاڑی میں تھوڑی بہت دلچسپی ظاہر کرتا تھا' وہ اسے گاڑی کھول کے اسٹارٹ کرکے یا چلا کے بھی دکھاتے تھے۔ ان کی چرب زبانی اور قائل کرنے کی مہارت کے سامنے عام گاہک اتنے بے بس ہوجاتے تھے کہ یا تو کوئی گاڑی خرید لیتے تھے یا اتنی مشکل سے جان چھڑا کے نکلتے تھے اور بلاوجہ شرمندہ ہوتے تھے جیسے انہوں نے کار نہ خرید کے اور سیلزمین کا وقت ضائع کرکے بڑا سنگین اخلاقی جرم کیا ہے۔

ایک سیلزمین میرے پیچھے بھی لگ گیا تھا مگر میں نے اسے شرافت سے دور رہنے کے لیے کہہ دیا "اگر مجھے کوئی گاڑی پسند ہوگی تو میں خود تمہیں بلالوں گا ورنہ چلا جاؤں گا۔ تم بول کے اپنی انرجی اور میرا ٹائم ضائع مت کرو۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ "میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔"

وہاں پرانی' نئی جیسی پرانی اور بالکل نئی گاڑیاں ہر ماڈل رنگ اور قیمت میں دستیاب تھیں۔ جاپانی کاریں اب یورپ اور امریکا جیسے ممالک کی مارکیٹ پر چھا چکی تھیں۔ ٹویوٹا' ہنڈا اور متسوبیشی نے فورڈ اور جنرل موٹرز کا بیڑا غرق کردیا تھا۔ جاپانی کاریں نہ صرف یہ کہ قیمت میں کم تھیں بلکہ ان کی خوبصورتی اور کارکردگی بھی بہت بہتر تھی۔

عاقل کے پاس ابھی تک ایک فورڈ کورٹینا تھی جو اس نے بہت کم پیسوں میں کسی سے راہ چلتے لے لی تھی۔ گاڑی زیادہ پرانی نہیں تھی اور چلنے میں بھی ٹھیک تھی لیکن اس کے پرانے مالک نے گاڑی کے ساتھ محبت اور توجہ سے کام نہیں لیا تھا۔ جرمن ایک بات کہتے ہیں کہ عورت اور مشینری دونوں کو توجہ اور دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ بگڑ جاتی ہیں۔ عاقل کی گاڑی بھی عدم توجہی کے باعث خراب حالت میں نظر آتی تھی۔

اب میں نے نیلم کے کہنے کے مطابق عاقل کو سلامی میں دینے کے لیے ایک نئی ہنڈا سوک کا انتخاب کیا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے منیجر سے رجوع کیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس وقت میرے پسند کردہ ماڈل میں کیا کیا OPTIONS ہیں۔

میں نے کہا "گاڑی فلی لوڈڈ چاہیے۔"

"یس سر۔ اور رنگ۔؟" منیجر نے مجھے کسی وی آئی پی کی طرح ٹریٹ کرتے ہوئے پوچھا "اس میں پانچ کلر ہیں۔ اس وقت سفید دستیاب نہیں ہے مگر کل مل سکتا ہے۔"

میں نے کہا "میں نے میرون کا انتخاب کیا ہے۔ یہ بتائیں کہ گاڑی کتنی دیر میں ڈلیور ہو جائے گی؟"

"اگر آپ ابھی پے منٹ کر دیتے ہیں تو چابی حاضر ہے۔"

میں نے کہا "کیش پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"نو پرابلم سر!" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایک پرابلم اور ہے۔ میرے پاس ایک فورڈ کورٹینا ہے۔ تقریباً چار سال پہلے کی۔ اس کی ظاہری حالت بہت اچھی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں گاڑی کو اس سے ایکس چینج کر لوں۔"

"نو پرابلم!" وہ اٹھ کھڑا ہوا "چلیں، مجھے گاڑی دکھا دیں۔"

میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا "میں گاڑی اپنے ساتھ نہیں لایا ہوں۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کو ایڈریس دے دوں۔ آپ گاڑی وہاں بھجوا دیں۔ کارٹینا لے آئیں اور باقی رقم بھی؟"

"نو پرابلم مگر اس میں تقریباً دو گھنٹے لگ جائیں گے؟" وہ بولا۔

"ٹوٹل پرائس میں سے کورٹینا کی قیمت نکال کے آپ مجھے بتا دیں، میں وہیں ادائیگی کر دوں گا۔"

"DOCUMENATION کس نام سے ہوگی سر!"

اس نے ایک پیڈ اور قلم نکال کے کہا۔

میں نے اسے تفصیلات بتا دیں۔ ایک ہزار پاؤنڈ ادا کیے جو ایک طرح سے ڈیل کنفرم کرنے کے لیے تھے۔ ٹیسٹ ڈرائیو کے لیے شوروم کا ایک شوفر مجھے باہر لے گیا اور میں نے گاڑی کو چلا کے دیکھا۔ یہ صبا رفتار، برق رفتار اور خوش رفتار گاڑی بلاشبہ لاجواب تھی۔ گاڑی کو میں اپنے گھر کی طرف لے گیا اور گلی کے موڑ پر شوفر کے حوالے کر دیا۔

عاقل کی فورڈ کورٹینا دروازے کے سامنے موجود تھی۔

وہ اندر جوتوں سمیت بیڈ پر دراز تھا۔ "میں ابھی ابھی آیا ہوں" اس نے مجھے مطلع کیا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "سارا دن کیا کرتے رہے؟"

"پہلے تو میں گیا تھا اپنا اجڑا ہوا آشیاں دیکھنے۔ گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو۔ مگر وہ اپنا ہی خراب خانہ تھا۔ ہر چیز بالکل تباہ ہو گئی ہے۔ کچھ بھی نہیں بچا۔" وہ افسوس سے سہلانے لگا "وہ میرا گھر نہیں، ہیروشیما تھا۔"

میں نے اسے تسلی دی "دیکھو جاپان تباہی کے بعد کیسا بنا ہے۔ خدا نے چاہا تو تمہارا اپنا گھر زیادہ اچھا بنے گا۔"

عینی فوراً نازل ہو گئی "یہ دیکھو بھیا!" اس نے مجھے چار فل اسکیپ سائز کے صفحات پر مشتمل ایک فہرست تھما دی۔ "یہ سب مجھے چاہیے۔"

"یہ کیا ہے؟" عاقل نے حیرانی سے پوچھا۔

"میرا جہیز اور کیا؟" عینی نے جواب دیا "فرنیچر۔ فریج، ٹی وی اور ڈیک الیکٹرانک کا سب سامان، گھر کے استعمال کے برتن، کراکری۔ قالین، پردے۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟" عاقل بولا۔

"پاگل ہوں، مجھے پاگل کہنے والے یہ ہمارے گھر کے معاملات ہیں۔ تم بیچ میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ جہیز مجھے دے رہی ہیں نیلم باجی!"

"مگر تم کیوں لے رہی ہو؟" عاقل چلا کے بولا۔

"میری مرضی۔ تم کون ہوتے ہو مجھے منع کرنے والے؟" عینی لڑنے کے لیے کمر پہ ہاتھ رکھ کے کھڑی ہو گئی "ابھی یہ فہرست نامکمل ہے۔ جلدی میں بنائی تھی نا۔"

عاقل بگڑنے لگا "جب میں نے منع کر دیا تھا۔"

میں نے کہا "تمہارے منع کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ میں مانوں گا نہیں۔"

"ادھر لاؤ، مجھے دو یہ فہرست" عاقل بھنا کے بولا۔

میں نے کہا "برخوردار، ذرا صبر اور ضبط سے کام لو۔ یہ مسئلہ ہے ہمارے خاندانی رسم و رواج کا۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے بے ہودہ رسم و رواج پر۔"

میں نے کہا "اس معاملے میں تمہاری ایک نہیں چلے گی۔ جہیز دیا جاتا ہے لڑکی کو۔"

عینی فاتحانہ لہجے میں بولی "لڑکے کو ملتا ہے ٹھینگا۔"

میں نے کہا "نہیں عینی۔ لڑکے کو سلامی دی جاتی ہے۔ وہ عاقل کو ملے گی۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں لوں۔"

عینی میرے کندھے سے لگ کر بیٹھ گئی "سلامی کیا دے رہے ہو بھیا!"

میں نے کہا "تجھے کیوں بتاؤں، دوں گا تو دیکھ لینا۔ رہی بات لینے کی تو عاقل اتنا بداخلاق بہرحال نہیں ہے کہ میرے پرخلوص تحفے کو میرے منہ پر مار دے۔ وہ مجھے ذلیل نہیں کر سکتا کیونکہ وہ خود ذلیل، کمینہ، الو کا پٹھا نہیں ہے۔"

عاقل ہنسنے لگا "گالیاں پہلے ہی دے لیں سالے صاحب!"

میں نے کہا "یہ بتاؤ، آج رات کے کھانے کا کیا ہوگا؟"

عینی نے کہا "گھر میں کیا ہے جو میں پکاؤں۔ اور کیسے پکاؤں؟ مجھے تو پکانا آتا نہیں۔"

عاقل نے کہا "ڈرامے بازی مت کرو۔ یہ چالاکی سب لڑکیاں کرتی ہیں۔ پہلے ہی اعلان کر دیتی ہیں کہ ہمیں تو کچھ آتا نہیں۔ نہ پکانا، نہ سینا پرونا۔ جھاڑو برتن۔ ماں باپ نے بڑے ناز سے رکھا۔ کچھ نہیں کرنے دیا۔ مقصد ہوتا ہے سسرال میں کام سے بچنا۔ یہاں حرام خوری نہیں چلے گی۔"

"کیا مطلب ہے حرام خوری کا؟"

"مطلب یہ کہ کام نہیں آتا تو سیکھو۔ کھانا بغیر پکائے تو آنے سے رہا۔ یہاں نوکر نہیں ہیں اور تمہارے ابا نے خانساماں نہیں بھیجا ہے ساتھ۔"

"دیکھو ابا تک مت جاؤ۔"

میں نے کہا "بس، لڑائی بند۔ ہم ابھی باہر جائیں گے کھانے کے لیے۔ دعوتِ ولیمہ ہوگی دولھا کی طرف سے۔ ہم رسم و رواج کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ عینی، تو اوپر جا اور دو کپ چائے بنا۔"

"دو کیوں؟ میں نہ پیوں" وہ جاتے جاتے بولی۔

میں نے کہا "اب تم فرماؤ کہ آج کیا مصروفیت رہی۔"

"دو گھنٹے تو پولیس کے ساتھ سر کھپانے میں لگ گئے۔ میں نے اس سیالکوٹی وکیل کو بلا لیا تھا۔ اس نے جلدی گلوخلاصی کرا دی۔ پھر میں گیا انشورنس کمپنی" وہ پولیس اور انشورنس کلیم کی روداد سنانے لگا۔

پھر عینی چائے لے کر آ گئی "مجھے تو بڑی شرم آتی ہے بار بار انہیں کہتے ہوئے، بھی چائے، کبھی کافی!"

عاقل بولا "بھئی یہاں تکلف نہیں چلتا۔ ان سے کہہ دو صاف کہ ہم آپ کا کچن استعمال کریں گے تو معاوضہ ادا کریں گے۔ آخر وہ پے انگ گیسٹ بھی رکھتی ہیں۔"

میں نے کہا "کل کر لیں گے سب انتظام انشاءاللہ۔"

عاقل بولا "آج بینک ڈرافٹ اور پے آرڈر نہیں بنوا سکا۔ ٹائم نہیں ملا اور میرے پاس اکاؤنٹ نمبر بھی نہیں تھے۔ عینی تم نے معلوم کیے؟"

"آج سب سے فون پر بات ہوئی۔ اکاؤنٹ نمبر میں نے تمہاری ٹیلی فون ڈائری میں لکھ دیے ہیں۔"

"ٹیلی فون ڈائری میں؟ تم بھی بڑی عقلمند ہو۔"

"اور کہاں لکھتی" عینی چیں بہ جبیں ہو کے بولی۔

"ہر دیوار پر لکھ دیتیں، موٹے مارکر سے۔ لینڈ لیڈی بہت خوش ہوتی۔ اب یہ ہوگا کہ میں لاہور کسی کو فون کروں گا تو پتا چلے گا اس کا اکاؤنٹ نمبر ملا رہا ہوں۔"

میں نے کہا "کس کس سے بات ہوئی، یہ بتا۔"

"سب سے۔ پہلے رئیس سے۔ وہ پوچھنے لگا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ تمہارے جعلی دستخط کرنا سیکھ گئی ہوں۔ جعلی چیک بک بھی بنالی ہے۔ تمہارے اکاؤنٹ میں سے سارا پیسہ نکالنا ہے۔ تم شک کر رہے ہو مجھ پر۔ وہ بولا کہ تم پر جو شک کرے کافر، میں تو ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ چھوٹے منہ شادی کی مبارک باد تو دی نہیں۔ وہ بگڑنے لگا کہ لو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ وہاں جا کے چپکے سے شادی کر لی۔ ولایت جاتے ہی میموں کی طرح تمہارا خون بھی سفید ہو گیا، بھول گئیں اپنوں کو۔ کل رات سب فون کرتے رہے۔ کہاں مر گئے تھے سب۔ میں نے کہا کہ ہاں ہم کہیں اور چلے گئے تھے۔ بھیا عادت کے مطابق ایک چکر میں پڑ گئے تھے۔ رات بھر اسپتال میں رہے۔ وہ گھبرا گیا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ خود انہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ میں بھی پشاور گیا ہوا تھا۔ وہاں ایک انٹرنیشنل مرغ بازی مقابلہ ہونے والا ہے۔"

"انٹرنیشنل؟" میں نے ہنس کے کہا "کیا غیر ملکی مرغ بھی آ رہے ہیں؟"

"ہاں۔ انڈیا، بنگلا دیش کے مرغے ہوں گے۔"

"وہ پھر پڑ گیا اس چکر میں؟"

"اس نے رئیس خانہ، بلکہ اس کا ملبہ بیچ دیا ہے" عینی بولی۔

"اور خود کہاں رہتا ہے؟"

"آج کل نیلم کے ساتھ ہے۔ اس کا جو سیکریٹری تھا، اسے نیلم نے نکال دیا ہے۔ نیلم سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ موصوف نے پانچ لاکھ کا غبن کیا تھا۔ ویسے بہت بھروسے کا آدمی تھا۔ دس سال سے نیلم کے ساتھ تھا اور لوگ جانتے تھے کہ ایڈوانس یا معاوضے کی رقم وہی وصول کرتا ہے اور نیلم کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتا ہے۔ کبھی ایک پیسے کی

ہیرا پھیری نہیں کی تھی۔"

"پھر ایمان کیوں خراب ہو گیا؟" عاقل بولا۔

میں نے کہا "بعض اوقات ضرورت انسان کو مجبور کر دیتی ہے۔"

"وہ پڑ گئے تھے ایک ایکسٹرا کے چکر میں۔ اسے دلاسے دیتے رہے کہ نیلم سے کہہ کے انشاء اللہ تمہیں کسی فلم میں بڑا رول دلا دوں گا۔ خیر یہ کوئی انوکھی بات نہیں، ایکسٹراز کو سب ہی استعمال کرتے ہیں۔"

"EXPLOIT کرتے ہیں" عاقل بولا۔

"وہ لڑکی ذرا ہوشیار اور پروفیشنل ثابت ہوئی۔ سیکریٹری صاحب نے اس پر دل ہی نہیں لٹایا، اپنا اور پھر نیلم کا مال بھی لٹانے لگے۔ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی" عینی نے کہا۔

"نیلم نے بہت صحیح فیصلہ کیا۔ رئیس سے بہتر اسے کون مل سکتا تھا۔"

"خود رئیس کو ایک ٹھکانا مل گیا۔" عینی نے کہا "نیلم باجی تو بہت خوش بھی تھیں اور اداس بھی۔ بہت دعائیں دیں اور کہنے لگیں کہ میں آؤں گی انشاء اللہ اسی ہفتے تم سے اور تمہارے دولھا میاں سے ملنے، رئیس کے ساتھ۔"

عاقل بولا "اجی کہاں کا دولھا اور کیسی دلہن۔ ملاحظہ ہو آج ہماری شادی کا دوسرا دن ہے۔ پاکستان میں شادی سے اگلے دن ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ لڑکی والے باضابطہ جلوس بنا کے دلہن کو لینے آتے ہیں۔ دولھا کے گھر میں ولیمے کا ہنگامہ ہوتا ہے۔ مہمان بھرے پڑے ہوتے ہیں گھر میں۔ یہاں دلہن گھر میں بھتنی بنی پھر رہی ہے۔ دولھا باہر جھک مارتا پھر رہا ہے تھانہ کچہری کے چکر میں۔ اور حجلۂ عروسی جل کے راکھ ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "عاقل۔ بہتر یہی ہے کہ تم اب ساری رقم کے دو بینک ڈرافٹ بنوا لو اور انہیں دونوں کے نام بھیج دو ۔۔۔ رئیس اور نیلم کے نام۔ ایک ہی جگہ۔"

باہر سے کسی نے کال بیل بجائی تو میں اٹھ کے گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید شوروم والا گاڑی لایا ہوگا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ باہر میرون کلر کی برانڈ نیو ہونڈا سوک عاقل کی گاڑی کے پیچھے کھڑی جگمگ کر رہی تھی۔ اس نے مجھے گاڑی کے کاغذات دیے۔ "یہ دو سیٹ ہیں۔ ایک نئی گاڑی کے ٹرانسفر پیپرز ہیں۔ رجسٹریشن ہم کل کرا دیں گے یہ دوسرے کاغذات اس گاڑی کے ہیں جو آپ ہمیں دے رہے ہیں۔" اس نے مجھے بتایا کہ ان کاغذات پر کہاں کہاں میرے دستخط ہوں گے۔

میں کاغذات اندر لے گیا اور عاقل کے سامنے رکھ دیے۔ میں نے پین اس کے ہاتھ میں تھما دیا "یہاں دستخط کرو۔"

اس نے کاغذات کو بغور دیکھا "یہ کیا ہے؟"

"سوال کرنے کی اجازت نہیں ہے" میں نے کہا۔

اس نے دستخط کر دیے "میں قائم مقام سسر کے آمرانہ اختیارات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تعمیل کرتا ہوں۔"

"اب اپنی گاڑی کی چابی لاؤ" میں نے کہا۔

اس نے چابی میرے حوالے کی تو غالباً وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کارروائی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ عینی نے سخت تجسس آمیز بے چینی کا اظہار کیا۔ "بھیا۔ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی، آخر چکر کیا ہے؟"

میں نے اسے ڈانٹا "چپ کر چکر کی بچی!" اور کاغذات کے ساتھ چابی باہر لے کر آ گیا۔ اس وقت تک عاقل اور عینی بھی باہر آ گئے تھے۔ شوروم کا نمائندہ ان کے سامنے پرانی گاڑی لے کر چلا گیا۔

میں نے نئی گاڑی کی چابی عاقل کے ہاتھ پر رکھ دی "یہ ہے تمہاری سلامی!"

وہ حیرت اور فرط جذبات سے ایسا گنگ ہو گیا کہ چپ کھڑا مجھے دیکھتا رہا لیکن عینی ایک چیخ مار کے مجھ سے لپٹ گئی "او بھیا ۔۔۔ بھیا ۔۔۔ بھیا!"

میں نے کہا "تجھے کیا ہو گیا، پاگل۔"

"ہاں، میں پاگل ہو گئی ہوں خوشی سے۔ اتنی شاندار کار ۔۔۔!"

"دس از ٹو مچ!" عاقل بولا۔

میں نے کہا "دیکھو ہماری کچھ تہذیبی روایات ہیں۔ ہم بیٹیوں اور بہنوں کے لیے ساری عمر کرتے ہیں اور ہمیشہ یہ سمجھتے ہیں کہ کم کیا۔"

عاقل نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اینی وے۔ تھینکس اے لاٹ!"

عینی کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے تھے "مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے اپنی خوش قسمتی کی اس انتہا سے۔ مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے آپ نے؟"

"زیادہ افلاطون مت بن۔ تیری اپنی تقدیر ہے ورنہ کوئی کسی کے لیے کیا کر سکتا ہے؟"

وہ رات بڑی پر مسرت تھی۔ ہم نئی گاڑی میں ڈنر کے لیے باہر گئے۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ لینڈ لیڈی مسز تھامسن بھی ہمارے ساتھ چلیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ

میں نوجوانوں کی محفل میں شامل ہو کے کباب میں ہڈی بننا پسند نہیں کرتی۔ عاقل بھی خوش تھا مگر اس نے کچھ پر تکلف انداز میں جھینپتے ہوئے نئی گاڑی کو ڈرائیو کیا۔ سونی کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

اگلا دن بڑی مصروفیت کا تھا۔ ہم نے سارا دن عینی کی فہرست کے مطابق خریداری کی۔ عین بارہ بجے مجھے خیال آیا کہ میں نے شیری کے ساتھ چرچ جانے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے اسے فون پر مطلع کیا کہ ناگزیر مصروفیت کی بنا پر میں ابھی نہیں آ سکتا۔ "لیکن میں شام چھ سات بجے کے بعد آ جاؤں گا۔"

"شام کو میں فارغ نہیں ہوتی، تم جانتے ہو۔"

"پھر کل صبح۔"

"تم مجھے چکر تو نہیں دے رہے ہو؟"

میں نے کہا "کیا میں صاف انکار نہیں کر سکتا، اگر چاہوں؟"

وہ ہنسی "اس وقت کس کے ساتھ ہو تم اور کہاں ہو؟"

میں نے کہا "میں عینی کے ساتھ شاپنگ کر رہا ہوں۔ کوئی اعتراض؟"

"نہیں، چلو عیش کرو" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

لندن میں عین پاکستانی اسٹائل کا گھر بسا کے رہنا اتنا ہی آسان ہے جتنا لاہور میں یا پاکستان کے کسی بھی شہر میں مگر چیزیں دروازے پر نہیں ملتیں۔ گلی میں سبزی فروش اور چھان بورے والا آواز لگاتے نہیں آتے اور کچھ چیزیں مخصوص پاکستانی دکانوں سے لینے کے لیے دور بھی جانا پڑتا ہے۔ ورنہ ہر جگہ گروسری اسٹور ہیں جہاں حلال گوشت بھی مل جاتا ہے اور ہوم سروس اسٹور ہر چیز ایک فون پر گھر لے آتے ہیں۔ تاہم لندن میں گھرداری کا سو فیصد پاکستانی تصور نہیں ہے کہ بیوی صبح سے شام تک بلکہ رات تک ہانڈی چولہے کے چکر میں پڑی رہے۔ عام طور پر وہاں عورتیں بھی کام کرتی ہیں یا ان کی سوشل مصروفیات ہوتی ہیں چنانچہ ریڈی میڈ کھانے چلتے ہیں یا فاسٹ فوڈ، جسے جہاں جو ملا، کھا لیا۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا مصروفیات کے باعث غیر اہم ہو جاتا ہے۔ ہاں رات کے کھانے میں اہتمام ہوتا ہے۔

ایک دن میں گھر کا اسباب ہی خریدا جا سکتا تھا۔ کچن کے مرچ مسالے اور کھانے پکانے کا سامان، روزمرہ کی خریداری بھی جو عینی کو خود کرنی تھی۔

عاقل نے کہا "میرا خیال ہے کوئی چھوٹی موٹی گاڑی عینی کے لیے لے لوں۔"

"چھوٹی موٹی گاڑی لوا اپنے لیے، میں یہی چلاؤں گی۔"

عاقل ہنسنے لگا "یعنی اس شاہانہ کار میں آپ جائیں آلو پیاز لینے۔ میں کام کے سلسلے میں سارے شہر کی خاک چھانوں گا۔"

"خاک دھول جو چاہو چھانو۔"

عاقل نے کہا "خاتون، آپ مجھے حق گوئی و بے باکی پر مجبور نہ کریں۔ یہ گاڑی آپ کو نہیں ملی۔"

"میری وجہ سے ہی تو ملی ہے" عینی خفیف ہونے کے باوجود اپنی بات پر ڈھٹائی سے اڑی رہی "اور تم کیا میری جہیز کی ہر چیز استعمال نہیں کرو گے؟"

"تم بھی بیٹھ جانا گاڑی میں، ابھی تو تمہیں گاڑی چلانی بھی نہیں آتی۔"

"آ جائے گی، مگر میں کوئی کھٹارا لے کر نہیں پھروں گی۔ جیسے وہ تھی تمہاری۔"

عاقل نے آنکھیں نکالیں "اتنی جلدی دماغ خراب ہو گیا نئی گاڑی ملتے ہی۔ کل تک اسی کھٹارے میں رولز رائس سمجھ کے پھرتی تھیں۔"

"کل تک تمہیں میرے شوہر کے منصب پر فائز ہونے کا اعزاز بھی حاصل نہیں تھا۔"

میں نے کہا "یار عاقل، جھگڑا کیسا ۔۔۔ عینی جیسی گاڑی کہے اسے دلا دینا۔"

"یہ تو کہے گی مرسیڈیز!"

میں نے اسے آنکھ ماری "تو مرسیڈیز دلا دینا۔"

وہ ہنسنے لگا "عینی تمہارے بھیا مجھے آنکھ مار کے یہ سمجھا رہے ہیں کہ اس بے وقوف لڑکی کے ساتھ مغز کھپائی مت کرو، ابھی ٹال دو۔"

خلاف توقع عینی مجھ سے خفا نہیں ہوئی "ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میرے بھیا نے مرسیڈیز کہا ہے تو تمہیں مرسیڈیز ہی دلانی پڑے گی۔"

حالات اب خوشگوار انداز میں پر سکون ہوتے جا رہے تھے۔ اسی شام میں نے پولیس سے رابطہ کیا تو مجھے بتایا گیا کہ صبح نو بجے اپنے قانونی معاملات کے سلسلے میں مجھے مقامی جج کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔ عاقل کے دوست سیالکوٹی وکیل نے وعدہ کیا کہ وہ میری پیروی کے لیے عدالت میں حاضر ہو جائے گا۔

"جج بندہ بڑا اخروٹ ہے۔" اس نے مجھے مطلع کیا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اندر سے نرم باہر سے بڑا سخت۔ اس کی کسی بات پر بحث مت کرنا۔ بس یہی کہتے جانا 'یس یور آنر'

آپ کی مہربانی ہے۔"

"خواہ وہ کہے کہ مسٹر شاہ عالم! آپ کو الیکٹرک چیئر پر بٹھا کے سزائے موت کا حکم سنایا جاتا ہے۔"

سیالکوٹی ہنسنے لگا "آپ بھی بڑے مخول ہو۔ آپ نے کون سا جرم کیا ہے۔ مجرم کو اندر کرایا ہے تو قانون کی مدد کی ہے۔"

میں نے کہا "اصل مسئلہ ہے گواہی کے لیے حاضری کا۔ میں اس کے لیے رک نہیں سکتا۔"

"اگر اس نے کہہ دیا کہ کہیں نہیں جانا تو آپ بولنا یس' یور آنر۔"

میں نے کہا "لیکن مجھے تو جانا ہے 'کل۔"

"او شاہ جی' وہ بندہ بڑا اخروٹ ہے۔ آپ نے انکار کیا تو وہ قانونی طور پر روک دے گا۔ اس سے کہو یس یور آنرز اور بیٹھ جاؤ جہاز میں۔ ورنہ اس نے کہنا ہے کہ نکالو اپنا پاسپورٹ' عدالت میں جمع کرا دو۔ دوسرا پاسپورٹ ہے۔"

میں نے کہا "دوسرا پاسپورٹ ــــ نہیں۔"

"تیرے تے بڑی گڑبڑ ہے۔ اپنے پاس اسی لیے دو ہیں۔ ایک میں نام ہے فضل دین بن۔ دوسرے میں ایف ڈی بن۔ کیسی رہی؟" اس نے قہقہہ مار کے ہاتھ آگے بڑھایا اور مجھے مجبوراً اتفاق کرتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا پڑا۔

میں نے کہا "پاسپورٹ تو خیر میں ہرگز نہیں جمع کراؤں گا۔ کہہ دوں گا ساتھ نہیں لایا۔ وہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے۔"

"خیر' وہ بولے گا ضامن لاؤ۔"

میں نے کہا "تم ضامن بن جانا" آخر وکیل ہو میرے۔"

اس کے چہرے پر بارہ بج گئے "تو جی وکیل ہر موکل کی ضمانت کیسے دے سکتا ہے؟"

میں نے کہا "پھر میں پاکستان کے سفارت خانے سے کہوں گا کہ میری طرف سے ضمانت نامہ داخل کرے۔"

"یہ ہوئی نا لکھ پونڈوں دی گل۔" وہ بولا اور ہمیں رخصت ہونے کے لیے تیار ہوتے دیکھ کر بولا "میں اپنی فیس ایڈوانس لیتا ہوں۔"

"یار سیالکوٹی۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ یہ میرے محسن ہیں۔"

"یار' آکل خان بالغ۔ برا مت مناتا۔ تو میرا محسن ہے۔ بس اتنی مروت کافی ہے۔ اب تو اپنے محسن کو لے کر آجائے۔ پھر یہ اپنے محسن کو پکڑلائیں۔ تو سیالکوٹی اخروٹ کا کیا بنے گا۔ وہ تو مفلسی کے ہتھوڑے سے ٹوٹ جائے گا۔ گھوڑا یاری کرے گا گھاس سے تو کھائے گا کیا۔ کیوں شاہ جی!" اس نے پھر ایک قہقہہ مارا اور میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔

میں نے اس کی صاف گوئی کو سراہا "کتنی فیس ہے تمہاری؟"

"زیادہ نہیں۔ ایک پیشی کے سو پاؤنڈز۔ اس کے بعد ہر پیشی پر ففٹی پرسنٹ ڈسکاؤنٹ۔ پچاس پاؤنڈ دیتے جاؤ' تاریخیں لیتے جاؤ۔"

میں نے اسے سو پاؤنڈز دے دیے "میں صبح پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک نو بجے۔ ورنہ جج غیر حاضری لگا کے وارنٹ نکال دے گا۔ وقت کی پابندی کے معاملے میں وہ بڑا اخروٹ ہے۔"

جج واقعی اخروٹ تھا۔ اس نے ٹھیک نو بجے مجھے بیان کے لیے طلب کرلیا۔ اس کیس میں مدعی جولی تھی۔ اس کے اور میرے وکیلوں نے اپنا اپنا وکالت نامہ پیش کیا۔ جولی کی طرف سے وکیل نے اس کا تحریری بیان داخل کیا۔ پھر میرا تحریری بیان پیش کیا گیا۔ جج نے مجھ سے تصدیق مانگی کہ بیان پر میرے ہی دستخط ہیں۔ پھر جمی کو حاضر کیا گیا اور میں نے اسے شناخت کیا۔ جمی کے وکیل نے زبردستی کے کچھ اعتراضات دائر کیے مگر بقول سیالکوٹی' جج بڑا اخروٹ تھا۔ اس نے سب مسترد کردیے۔ جمی نے ذاتی دشمنی کا...... نکتہ اٹھایا مگر یہ ڈکیتی یا نوادرات کی چوری کا کیس نہیں تھا۔ اس عدالت میں ایک سے زیادہ قتل عمد کا معاملہ زیر سماعت تھا اور پولیس ابھی تفتیش کررہی تھی چنانچہ جمی کی درخواست ضمانت پہلے ہی مرحلے میں مسترد کردی گئی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جج نے میری عدالت میں دوبارہ پیشی کے معاملے کو نہیں اٹھایا۔ "مسٹر شاہ عالم! کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کیس میں آپ کی گواہی بنیادی اہمیت کی حامل ہے؟"

میں نے طوطے کی طرح رٹایا جانے والا جملہ بولا "یس یور آنر۔"

"عدالت آپ کو ہدایت کرتی ہے کہ آپ تفتیش میں پولیس سے تعاون کو یقینی بنائیں۔"

میں نے کہا "یس یور آنر۔"

"سماعت ملتوی کی جاتی ہے" جج نے ہتھوڑا میز پر مار کے اعلان کیا۔

میں باہر آیا تو میں نے جمی کو پولیس کی تحویل میں دیکھا اور مزاج پرسی کے بہانے اس کے زخموں پر نمک پاشی کے لیے آگے بڑھا "ہیلو جمی! کیا بات ہے' آج تم اکیلے نظر آرہے ہو؟"

اس نے غرا کے کہا "یہاں شادی نہیں تھی میری کہ برات لے کر آتا اور یہ فرشتے کیا تمہیں نظر نہیں آرہے ہیں جو میرے ساتھ ہیں۔"

"فرشتے واقعی نظر نہیں آتے۔ میری مراد تمہارے وفاداروں' حکم کے غلاموں اور جاں نثاروں سے تھی۔ وہ کہاں غائب ہوگئے۔ تمہارے ساتھ کوئی بھی نہیں رہا وقت بدلتے ہی۔"

"کون کہتا ہے میرا وقت بدل گیا ہے؟"

"وہ تو نظر آرہا ہے۔ برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ تمہاری دولت تمہیں رہائی نہیں دلا سکی۔ تمہاری بدمعاشی کی طاقت کا بڑا شہرہ تھا مگر یہ جج اس سے متاثر نہیں ہوا۔ واقعی بڑا اخروٹ ہے۔"

"مقصد کیا ہے آخر اس بکواس کا۔"

میں نے کہا "تمہیں یہ بتانا کہ زندگی کی جنگ میں تمہیں شکست فاش ہوچکی ہے۔ تمہارا سارا غرور خاک میں مل گیا ہے۔ تمہارے لیے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ تمہاری ذاتی بیوی خود تمہارے خلاف مدعی بن گئی۔"

وہ گالیاں بکنے لگا "وہ کتیا کبھی میری بیوی نہیں تھی۔"

"ہاں۔ اس لیے کہ تم کبھی اس کے شوہر نہیں تھے۔ یہ شرمناک حقیقت اب جولی کے بیان میں عدالت کے سامنے آئے گی تو تمہارے لیے پھر ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔"

"تم جیسے حرام زادے کتوں کی طرح بھونکتے رہ جائیں گے۔ میں باعزت طور پر رہا ہو جاؤں گا۔ تم نہیں جانتے کہ میں کتنے بڑے وکیل کرسکتا ہوں پھر میں تم سے نمٹ لوں گا۔"

میں نے کہا "تم پولیس کی موجودگی میں مجھے دھمکیاں دے رہے ہو۔ جاؤ جاکے الیکٹرک چیئر پر بیٹھنے کی پریکٹس کرو۔"

اس نے مجھے انگریزی میں نصف درجن ایسی بھاری بھرکم گالیاں دیں جن کا اردو ترجمہ دستیاب ہے مگر پیش نہیں کیا جاسکتا۔

عاقل مجھے کھینچ کے دور لے گیا "مسٹر محترم! گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔ یہ رقیب کے بارے میں کہا گیا تھا۔ آپ کچھ اور کھالیں مثلاً ـــ سینڈوچ کافی کے ساتھ۔"

یمنی نے بھی کہا "اس کمینے کے منہ مت لگو بھیا' چلو۔"

میں نے کہا "اب تم لوگ جاؤ خرید و فروخت کرو' مجھے کام ہے۔"

"کیا کام ہے؟" یمنی نے کہا۔

میں نے اسے گاڑی میں بٹھا دیا "آج میں نے حلف اٹھانے کے باوجود عدالت میں جھوٹ بولا کہ پولیس سے تعاون کروں گا۔ اب بغیر حلف کے تم سے سچ بول رہا ہوں کہ مجھے روشنی کو دیکھنے جانا ہے اور اس کے معاملات فائنل کرنے ہیں۔"

عاقل نے کہا "ہم بھی ساتھ چلتے ہیں۔"

مگر میں نے اسے گاڑی کے پاس کھڑا چھوڑا اور خود ایک گزرتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے دیکھا تو وہ مخالف سمت میں جارہے تھے۔ انہوں نے میرے پیچھے آنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ شاید یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی کہ میں اپنے کام کی نوعیت انہیں بتانا نہیں چاہتا۔

شیری کا اپارٹمنٹ تلاش کرنے میں مجھے زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ معمول کے مطابق صبح دم تھکی ہاری لوٹی تھی چنانچہ ابھی تک سورہی تھی۔ دروازہ روشنی نے کھولا اور کچھ دیر مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی۔

"آپ تو ڈاکٹر ہیں' اسپتال سے آئے ہیں؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔"

وہ دروازے سے ہٹ گئی "اندر تشریف لائیے۔"

میں نے کہا "اب کیا حال ہے تمہارا؟"

"ماضی حال مستقبل۔ اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہیں۔ آپ اسپتال سے کیا مجھے دیکھنے آئے ہیں؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے۔ آپ کی بہن نے اصرار کیا تھا۔"

"کیا آپ ایسے ہی ہر مریض کے گھر پہنچ جاتے ہیں یا یہاں بطور خاص شیری کے حکم کی تعمیل میں آئے ہیں؟"

میں نے سوچ کے اس سوال کا جواب گول کردیا "آپ کی بہن کو بہت فکر ہے آپ کی۔"

روشنی ہنسنے لگی "وہ اپنی فکر نہیں کرتی۔ زمانے کی پروا نہیں کرتی تو میری کیا کرے گی۔ مگر خیر' میں اسے جگا کے بتادیتی ہوں ڈاکٹر صاحب حاضر ہوئے ہیں۔"

روشنی کے الفاظ اور لہجہ دونوں بامعنی تھے مگر میں نے برا نہیں مانا۔ چند منٹ بعد شیری عادت کے مطابق انتہائی قابلِ اعتراض حلیے میں نمودار ہوئی۔ اس نے جو نائٹ ڈریس پہن رکھا تھا جیسے چادر کو دوہرا کرکے اوپر سر کے لیے سوراخ بنادیا جائے اور چادر کو لمبائی کے رخ بیلٹ سے باندھ دیا جائے۔

اس نے جماہی لیتے ہوئے مجھے آنکھ ماری "آپ آگئے ڈاکٹر صاحب!"

میں نے کہا "بارہ بج گئے ہیں اور تم ابھی تک سورہی

ہو؟"

"میں نہا کے اور کپڑے بدل کے آتی ہوں دس منٹ میں۔" وہ بولی "روشنی تم نے ناشتا کرلیا؟"

"بہت دیر ہوئی۔"

"تو پھر میرے لیے بنا دو بہنا۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی کافی پلاؤ۔"

کچن وہیں لاؤنج کے ایک حصے میں بنا ہوا تھا۔ روشنی نے الیکٹرک کیتل لگا دی "ڈاکٹر صاحب' آپ پاکستانی ہیں؟"

میں نے کہا "الحمدللہ۔"

وہ بولی "کیا آپ پاکستان جاتے رہتے ہیں؟"

میں نے کہا "ہاں' اکثر۔"

"آپ کی فیملی وہاں ہے یا یہاں؟"

"فیملی سے تمہاری مراد ہے بیوی بچے۔۔۔ تو وہ نہ یہاں ہیں نہ وہاں۔ لیکن تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"دراصل مجھے۔۔۔ چار سال ہوگئے ہیں یہاں۔۔۔ اور میں اکیلی ہوں۔ ایک ماں تھی جو یہاں مرگئی۔ ایک بھائی تھا وہ افغانستان چلا گیا تھا جہاد کرنے۔ لوٹ کے نہیں آیا۔ میرا پاکستان میں کوئی بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم پاکستان واپس جانے کی خواہش مند ہو؟"

"نہیں۔ کوئی خاص نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ پاکستان کے یتیم خانے بہت خراب ہیں عام طور پہ۔"

"ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ وہاں یتیم بچوں پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ ان سے ہر طرح کا کام لیا جاتا ہے۔ انہیں مارا پیٹا جاتا ہے۔ کھانے کو پورا نہیں ملتا۔ ان سے بھیک بھی منگوائی جاتی ہے اور بعض اوقات انہیں بیچ بھی دیا جاتا ہے۔"

وہ کچھ مایوس ہوئی "کیا ایک بھی اچھا یتیم خانہ نہیں؟"

میں نے کہا "ہوگا۔۔۔ ضرور ہوگا۔۔۔ لیکن میرے علم میں نہیں۔"

"دراصل دو بچوں کو داخل کروانا تھا۔ کسی ایسی جگہ جہاں ان کی اسلامی طریقے سے تعلیم و تربیت ہوجائے۔"

میں نے محتاط ہوکے پوچھا "اس وقت دو بچے کہاں ہیں؟"

"یہاں ایک مشنری ادارے میں' انہیں وہاں سے نکالنا ہے" وہ بولی۔

"آپ سے کیا تعلق ہے ان بچوں کا؟" میں نے پوچھا۔

وہ بولی "تعلق۔۔۔ تعلق تو کوئی نہیں مگر وہ میری ذمے داری ہیں۔"

"اور ان کے ماں باپ کیا وہ مرگئے ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ مرے تو نہیں مگر انہوں نے بچوں کو چھوڑ دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں انہیں عیسائی بنا دیا جائے گا۔ جبراً نہیں' بچے تو ماحول کا اثر قبول کرتے ہیں۔ جن بچوں کی پرورش مسلمانوں میں نہ ہو وہ کیسے مسلمان بنے گا؟"

روشنی نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ بات ڈاکٹر نے مجھے سمجھادی تھی کہ اس کی میموری سے صرف وہی یادیں ختم ہوئی ہیں جن کا کسی طرح بھی مجھ سے تعلق تھا۔ زندگی کے دیگر واقعات اس کو پوری طرح یاد ہوں گے۔ اسے یہ اچھی طرح یاد ہوگا کہ ان بچوں کا باپ کون تھا اور ماں کون ہے؟

میں نے کہا "میں نے سنا ہے کہ بہت جلد لاہور میں ایک یتیم خانہ قائم ہو رہا ہے جو ایک مثالی ادارہ ہوگا اور جہاں بچوں کو گھر جیسا ماحول' توجہ' تعلیم اور تربیت' سب فراہم ہوگا۔"

اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی "کب قائم ہوگا یہ یتیم خانہ۔ کون بنا رہا ہے؟"

میں نے کہا "کب کا تو مجھے علم نہیں مگر لاہور کے ایک بزنس مین ہیں ناصر عظیم' وہ بنا رہے ہیں۔"

روشنی نے کافی میرے سامنے رکھ دی "پلیز' مجھے اس کے بارے میں ضرور بتائیں۔ میں ان بچوں کو وہاں بھجوا دوں گی۔"

میں نے کہا "میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

وہ میرے سامنے بیٹھی اپنے دانتوں سے ناخنوں کو کترتی رہی اور قالین کو پیر کے انگوٹھے سے کریدتی رہی۔ یہ سب اعصابی دباؤ اور کشیدگی کو ظاہر کرنے والی حرکات و سکنات تھیں۔ میں اس کے لیے اجنبی تھا لیکن ایک ہمدرد ثابت ہو رہا تھا۔ اس حد تک کہ ڈاکٹر ہونے کے باوجود اس کی خیر خبر لینے گھر پہنچ گیا تھا۔ میری یہ غیر معمولی دلچسپی اس کی ذات میں امید کے نئے شگوفے کھلا رہی تھی اور لاشعور سے بھی نیچے تحت الشعور میں خوابیدہ حسرتیں اور میرے لیے پسندیدگی کے جذبات پھر بیدار ہو رہے تھے مگر وہ اس بے چینی اور خلش کو کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔

شیری دس منٹ میں تیار ہوکے آگئی۔ اس نے پانچ منٹ میں کھڑے کھڑے ناشتا کیا اور میرے ساتھ چل پڑی "کم آن۔ لیٹ اس گو۔"

میں نے کہا "تمہیں یاد ہے وہ جگہ؟"

"یاد کیوں نہیں ہوگی۔" وہ بولی "روشنی بعد میں بھی وہاں جاتی رہی ہے۔ چوری چھپے بچوں کو دیکھنے۔ اور مجھے اس

کے ساتھ جانا پڑتا تھا لیکن بچے اسے دوبارہ دکھائی نہیں دیے۔"

میں نے کہا "وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔"

شیری نے میری بات کاٹ دی "میں سب سن رہی تھی۔ وہ کل بھی مجھ سے تمہارے بارے میں سوال کررہی تھی۔ اس کے دماغ میں الجھن ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شیری' اسپتال میں اس ڈاکٹر کو دیکھ کے ایسا کیوں لگتا تھا جیسے میں نے اسے پہلے بھی دیکھا ہے۔ آج تمہیں اپنے گھر میں دیکھ کر اس کا ذہنی خلفشار اور بڑھ گیا ہوگا۔"

میں نے کہا "یادداشت اسی طرح رفتہ رفتہ بحال ہوتی ہے۔ پرانی یادوں کے عکس ذہن میں جلنے بجھنے لگتے ہیں۔ پہلے پہل تاریکی میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ پھر روشنی کا وقفہ طویل سے طویل تر ہوتا جاتا ہے اور پہچان کے ٹکڑے آپس میں فٹ بیٹھنے لگتے ہیں۔"

"ہوسکتا ہے تمہارے جانے کے بعد اسے سب یاد آنے لگے۔"

"مگر تب تک میں جاچکا ہوں گا" میں نے کہا۔

شیری نے ایک آہ بھری "تم اس کی یادداشت کی بحالی میں سب سے اہم کردار ادا کرسکتے تھے مگر تم تو پہلے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ تمہیں بھول جائے۔ پتا نہیں بعد میں اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیا وہ اپنی ماں کی طرح پاگل خانے جائے گی۔"

میں نے کہا "اگر تم چاہو تو وہ ایک نارمل لائف گزار سکتی ہے۔ تم اسے سنبھال سکتی ہو۔"

"میں؟" وہ تلخی سے ہنسی "میں خود کو نہیں سنبھال سکتی۔ خود ایک نارمل لائف تو نہیں گزار رہی ہوں۔"

میں نے اس مسئلے پر مزید بات چیت سے گریز کیا۔ ہم ایک ٹیکسی میں ساتھ ساتھ اجنبی بن کے بیٹھے رہے۔ خلاف معمول شوخ اور بے باک شیری آج خاموش اور افسردہ تھی۔

چرچ کے گرد وسیع و عریض باغ اور احاطہ تھا جس کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ مرکزی عمارت تک جانے والے راستے پر بہت سی گاڑیوں کے ساتھ ایک سجی سجائی گاڑی کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے ایک جوتا لٹک رہا تھا اور "جسٹ میریڈ" لکھا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہاں کوئی شادی ہو رہی ہے۔

ہم ہال میں داخل ہوئے اور شادی میں شریک لوگوں کے پیچھے ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا چرچ تھا۔ صاف ستھرا اور ایک پرتقدس فضا سے معمور۔ ہال میں پادری کی آواز گونج رہی تھی۔ اس نے دس منٹ میں اپنا خطبہ ختم کیا اور لڑکے لڑکی کو میاں بیوی قرار دے دیا۔ دولھا نے ازدواجی زندگی کی سند پر اپنی پہلی مہر تصدیق یوں ثبت کی کہ جملہ حاضرین کے سامنے دلہن کو بڑے والہانہ اور جذباتی انداز میں لپٹا کے چوما۔

جب برات رخصت ہوگئی تو پادری ہماری طرف متوجہ ہوا "میں آپ دونوں کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

شیری نے جھجکتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔ وہ غور سے سب سنتا رہا مگر اس نے ہمیں شرمندہ کرنے کے لیے لعن طعن نہیں کی "میں ان بچوں کی ماں ہوں۔ یہ ان کا باپ ہے۔"

اس نے مجھ سے مصافحہ کیا "مجھے وہ بچے یاد ہیں۔ اس دن میں ہی صبح کسی کام سے چرچ میں داخل ہوا تو ان دونوں کی ٹوکریاں دروازے کے سامنے رکھی تھیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ انہیں یہاں چھوڑ کر جانے کے اسباب کیا تھے اور اب انہیں واپس لے جانے کی کیا مجبوری ہے۔"

شیری نے کہا "ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ اس کے علاوہ اب ہم نے شادی بھی کرلی ہے۔ بچے ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

اس نے کہا "یہ سب آج کی بے راہ رو زندگی کا شاخسانہ ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی خداوند یسوع مسیح کی اخلاقی تعلیمات کے مطابق گزاریں تو ایسی صورتِ حال پیدا بھی نہ ہو۔"

میں نے کہا "فادر۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہر مذہب کی تعلیم کا سارا زور اخلاقی اقدار پر ہے مگر انسان مادی ضروریات کی دوڑ میں خدا اور اس کے رسول کے احکامات کو بھول گیا ہے۔"

"میرے بچو!" وہ چونکا "تم عیسائی نہیں ہو؟"

میں نے کہا "ہم مسلمان ہیں۔"

اس کے انداز اور لہجے میں آنے والی تبدیلی کو میں نے واضح طور پر محسوس کیا "مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اب یہ کام اتنا آسان نہیں رہا۔"

"کیا مطلب؟" شیری نے پوچھا۔

"بچے اب ہمارے پاس نہیں ہیں۔ یوسی' چرچ میں کوئی نرسری نہیں ہے۔ جہاں ایسے چھوڑے ہوئے بچے پالے جائیں۔ ہم انہیں عام طور پر اسپتال والوں کے حوالے کردیتے ہیں۔ وہاں بے اولاد بھی آتے ہیں' اکثر اوقات علاج سے اولاد نہیں ملتی۔ پھر وہ کسی بچے کو گود لے لیتے ہیں۔ خود اسپتال والے انہیں قائل کرسکتے ہیں کہ اس میں ثواب بھی ہے لیکن اس کیس میں معاملہ کچھ اور ہوگیا ہے۔"

شیری نے کہا "کیا انہیں کسی نے گود لے لیا ہے؟"

"صرف گود لیا ہوتا تب بھی تمہارے لیے ایک لمبی قانونی جنگ لڑے بغیر ان کو واپس حاصل کرنا دشوار ہو جاتا۔ میں تو یہ بھی نہیں کہتا کہ ثابت کرو تم ہی ان کے ماں باپ ہو۔ میں تم پر اعتبار کر رہا ہوں مگر قانونی معاملات میں اعتبار کا سکہ نہیں چلتا۔"

"آپ اسپتال کا نام بتا دیں' ہم ان سے بات کرلیں گے۔"

"میرے بچو۔ کبھی کبھی مشکلات کا کوئی حل ممکن نہیں ہوتا۔ کیا ایک خرابی کا علاج دوسری زیادہ بڑی خرابی ہو سکتی ہے؟ اسپتال والے تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا "آپ کھل کے بات کریں۔"

اس نے قدرے تامل سے کہا "ہم اسپتال میں تبلیغ کے لیے جاتے ہیں اس لیے مجھے معلوم ہے۔ یہ بالکل اتفاق ہے اور اسپتال والوں نے بھی جھوٹ بول کے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے دو زندگیوں کو بچایا تھا۔ وہاں ایک عورت نے مردہ بچے کو جنم دیا۔ اس کے شوہر نے بتایا کہ ان کا یہ بچہ شادی کے دس سال بعد بڑی منت مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ انہوں نے سوئزرلینڈ جا کے علاج بھی کرایا تھا۔ لیکن دوران حمل ہی ڈاکٹرز نے عورت کو بتا دیا تھا کہ بچے کی پیدائش نارمل نہیں ہوگی اور یہ ہو سکتا ہے کہ آخری وقت میں بھی کوئی پیچیدگی پیدا ہو جائے۔ ڈاکٹر نے شوہر کو صاف کہہ دیا تھا کہ وہ طے کرلے۔ اگر آخری وقت میں اسے فیصلہ کرنا پڑا تو وہ کیا کرے گا۔ ماں کو بچانا چاہے گا یا بچے کو۔ اور اس عقلمند شخص نے پہلے سے سب طے کر رکھا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھے اپنی بیوی کی زندگی چاہیے۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ عورت کو مردہ بچے کی پیدائش کے بارے میں نہ بتایا جائے اور ہمیں کوئی نوزائیدہ بچہ دے دیا جائے جسے ہم اپنا سمجھ کے پالیں۔ قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ جس دن وہ عورت ڈلیوری کے لیے اسپتال پہنچی' اسی دن تم اپنے بچوں کو یہاں چھوڑ گئے تھے۔ اسپتال کی میٹرن نے شوہر کو بتایا کہ اتفاق کہو یا خدا کی رحمت کہ آج دو نوزائیدہ بچے ملے ہیں۔ شوہر نے ایک کو لینے پر آمادگی ظاہر کی مگر میٹرن نے کہا کہ خدا نے انہیں ایک ساتھ دنیا میں بھیجا تھا۔ وہ جڑواں بہن بھائی ہیں۔ تم دونوں کو لے جا سکتے ہو یا دونوں کو چھوڑ کے جا سکتے ہو۔ شوہر نے دونوں کو لے لیا۔ یہ سب خداوند یسوع مسیح کا کرشمہ ہے۔ اس نے دو ضرورت مندوں کو یکجا کر دیا۔ بچوں کو ایک گھر مل گیا اور والدین مل گئے۔ عورت کی خوشی کا تو ٹھکانا مت پوچھو۔ جب ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ آئندہ اس کے ماں بننے کے امکانات اب صفر ہو گئے ہیں تو اس نے کہا کہ مجھے یہ دو کیا کم ہیں۔ خدا نے بیٹا بھی دے دیا اور بیٹی بھی دے دی۔ اب اور کیا میں کیا خواہش کروں۔ چنانچہ اب وہ دونوں بچے اس گھر میں پرورش پا رہے ہیں اور جس محبت سے تم نے ان کو محروم کرنا چاہا تھا وہ کئی گنا ہو کے ان کو مل رہی ہے۔ مجھے بتاؤ' کیا تم انہیں واپس لے سکو گے۔ قانونی مشکلات کو چھوڑو' اگر ایسا برا وقت آ گیا کہ مجھے ایک تباہ کن سچ عدالت میں بولنا پڑا تو میں بائبل پر ہاتھ رکھ کے جھوٹ بہرحال نہیں بول سکتا لیکن اس سچ سے ہونے والے ناقابل تلافی نقصانات کا اندازہ کرو۔ اس عورت پر کیا گزرے گی' یہ اس کی ماتا کا قتل ہوگا۔ قتل عمد۔ اس کے اور شوہر کے درمیان علیحدگی بھی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ کہے گی کہ شوہر نے اس سے اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

شیری نے کہا "ہولی فادر۔ ہمیں معاف کر دیں۔ ہم نے پہلے غلطی کی لیکن دوسری بار اس سے بڑی غلطی کرنے جا رہے تھے۔"

میں نے کہا "ان بچوں کو اب وہیں رہنا چاہیے۔ وہی ان کے اصل والدین ہیں جو ان کو پال رہے ہیں۔"

"خدا تمہیں خوش رکھے۔ اور تم پھر والدین بنو" پادری نے کہا "آمین!"

ہم خاموشی سے چرچ سے نکل آئے۔ ڈرائیو وے پر اب صرف ایک ہی گاڑی کھڑی تھی۔ شیری کی گاڑی۔ وہ چپ چاپ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی' میں اس کے ساتھ جا بیٹھا۔

شیری نے بالآخر کہا "اب تم کیا کہتے ہو؟"

میں نے کہا "کہنے کو اب کیا بچا ہے۔ تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا۔"

"لیکن ہم روشنی کو کیا بتائیں گے؟"

میں نے کہا "یہ مشکل کام ہوگا۔"

"ہم روشنی کو سچ نہیں بتا سکتے اور بتا بھی دیں تو وہ اسے قبول نہیں کرے گی۔"

"میں اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اس نے قدرے تامل سے کہا "تم جانتے ہو وہ بچوں کے اور یتیم خانے کے بارے میں تم سے کیوں بات کر رہی تھی؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیوں بات کر رہی تھی؟"

"میں نے اسے بتایا تھا کہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ بچے اب کہاں ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس میں نے سوچا کہ تمہارے گھر آنے کی کوئی وجہ بنا لوں۔"

"تم نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ چرچ جاؤں گا؟"

شیری نے اقرار میں سر ہلایا "تاہم میں نے اسے قانونی مشکلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ اندازہ تو مجھے بھی تھا کہ بچوں کو واپس لینے کے لیے کوئی بھی جائے' اسے عدالت میں ثابت کرنا پڑے گا کہ بچے اسی کے ہیں۔"

"پھر اب تم روشنی سے کیا کہو گی؟"

"میں نہیں' ہم اسے بتائیں گے کہ بچے... مر گئے۔"

"یہ کیا بے وقوفی اور بے رحمی کی بات ہے" میں نے کہا۔

"مجبوری میں سب جائز ہے۔ ابھی پادری نے کیا ثابت کیا۔ یہی کہ جان بچانے والا جھوٹ اس سچ سے افضل تر ہے جو کسی کی جان لے لے۔"

میں لاجواب ہو گیا "وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"

"کیا مگر... روشنی چرچ اور اسپتال پر کیس کر سکتی ہے۔ اچانک اسے اپنے بچے واپس حاصل کرنے کا جنون ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم جیسا مناسب سمجھو کرو۔ میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تم میرے ساتھ روشنی کو یہ بتاؤ گے۔"

"ہرگز نہیں۔ میں یہاں سے واپس جا رہا ہوں" میں نے کہا۔

"تم پھر مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں تمہیں بلیک میل کروں۔"

"تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکو گی۔"

وہ بولی "میں تمہاری پاکستان روانگی کو ناممکن بنا دوں گی۔ وقتی طور پر... میں ہائی کمیشن کو مطلع کر دوں گی۔"

میں نے ہاتھ جوڑے "اچھا بابا... چلو' میرے اعمال کی سزا بن گئی ہو تم۔"

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی "شاہ جی۔ سزا تو ملی ہے مجھے یا میری بہن کو۔ تمہاری زندگی تو بڑی اچھی ہے۔ پرسکون' باعزت' خوشحال... اور صحت مند۔"

میں نے کہا "اپنی زندگی کا راستہ تم نے خود متعین کیا تھا۔"

"بالکل غلط۔ زندگی کے راستے اور منزل' سب تقدیر طے کرتی ہے جو پہلے سے دست قدرت لکھ دیتا ہے۔ اپنے اختیار میں ہو تو ہر لڑکی کے خواب پورے ہو جائیں۔ وہ ڈاکٹر بن جائے' اسے ایک لازوال حسن و شباب کی گارنٹی حاصل ہو جائے اور ہر لڑکا کسٹم افسر یا ڈپٹی کمشنر بن جائے۔"

"تم کوشش اور صلاحیت کے عنصر کو نظرانداز کر رہی ہو؟"

وہ بولی "تم یقیناً بہت خفا ہو لیکن دیکھو' تم نے روشنی کی مدد کی۔ غلطی روشنی کی تھی کہ وہ تمہارے ساتھ کاروباری نہیں رہی۔ جذباتی ہو گئی۔ تم نے میری ماں کی مدد کی۔ اب تم میری مدد کر رہے ہو۔ جہاں اتنا کیا ہے' وہاں ایک آخری نیکی اور سہی۔ ایک گھنٹا اور لگے گا تمہیں۔"

میں نے کہا "ایک جھوٹ اور بولنا پڑے گا۔"

"چلو تم کچھ مت بولنا' جھوٹ میں بولوں گی' سارا گناہ میرے سر۔"

میں واقعات اور حادثات کی ایک دلدل میں پھنس گیا تھا اور اب اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر میری ہر کوشش ایک نئی مشکل کھڑی کر دیتی تھی۔ شیری کے اپارٹمنٹ پہنچنے تک میں طے کر چکا تھا کہ یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد میں ہر نقصان برداشت کرلوں مگر بلیک میلنگ کے دباؤ میں نہیں آؤں گا۔

حسب توقع روشنی کے لیے اپنے بچوں کی موت کی خبر بھی غم کا ایک پہاڑ ثابت ہوئی جو اس پر اچانک ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ پہلے بھی نیم جاں تھی۔ اس صدمے نے روشنی کے کشیدہ اعصاب کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے چلا چلا کے رونا اور خود کو کوسنا شروع کیا۔ پھر وہ دروازے سے سر ٹکرانے لگی۔ میں نے اسے روکنے اور قابو کرنے کی بڑی کوشش کی مگر وحشت اور جنون میں اس کی جسمانی مزاحمت کئی گنا زیادہ ہو گئی تھی۔ اس نے شیری کو ایسا دھکا دیا کہ وہ دیوار سے ٹکرائی تو اسے چکر آ گئے۔

اس جدوجہد میں روشنی کے کپڑے بھی پھٹ گئے اور مزید غضب یہ ہوا کہ پاس پڑوس کے کچھ لوگ یہ پوچھنے آ گئے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو مجھے بڑی ملامت آمیز شک بھری نظروں سے گھور رہی تھیں۔ ایک منحوس بڑھیا نے تو یہ کہہ دیا کہ میں زبردستی روشنی کی عزت لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے فوراً پولیس کے

حوالے کر دینا چاہیے۔ دوسری عورت نے نسلی تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایشیائی ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کے لیے عورت ذاتی پراپرٹی یا جنسِ تجارت ہے۔ انسان نہیں ہے۔

ایک بار پھر شیری نے ایمبولینس طلب کی اور میں روشنی کو ریوچ کے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ یہ "وحشیانہ" سلوک دیکھ کے ایک عورت نے چیخ ماری اور دوسری پولیس کو فون کرنے بھاگ گئی۔ میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔

جب ایمبولینس آئی تو اس کے ساتھ پولیس بھی آئی مگر وہاں پولیس زبردستی کی کارروائی نہیں ڈالتی۔ شیری کی وضاحت نے پولیس آفیسر کو مطمئن کر دیا اور وہ ایمبولینس کے ساتھ ہی واپس چلے گئے۔ ایک بار پھر روشنی اسپتال پہنچ گئی۔ جب میڈیکل اسٹاف نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا تو میں نے شیری سے کہا "مجھے اب چلنا چاہیے۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "تھینک یو ویری مچ۔ لیکن ایک آخری مسئلہ۔"

میں نے برہمی سے کہا "اب کیا ہے؟"

"تم نے روشنی کے لیے اضافی رقم کا وعدہ کیا تھا۔"

میں نے اسے چالیس ہزار کا چیک تھما دیا جو عاقل کے اکاؤنٹ کا تھا۔ میں بھولا نہیں تھا "اب مجھے اجازت ہے۔"

"ایک منٹ!" اس نے کہا اور سر اٹھا کے میرے گال کو چوم لیا۔ "پھر بد تمیزی کی ہے میں نے۔ تم نے کہا تھا کہ تھپڑ مارو گے۔"

میں مسکرانے پر مجبور ہو گیا۔ کس کرنا اس سوسائٹی میں قطعاً معیوب نہیں سمجھا جاتا جس کا اثر شیری قبول کر چکی تھی بلکہ بعض اوقات یہ شکر گزاری اور احسان مندی کے جذبات کے اظہار کا پسندیدہ طریقہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم صرف محاورے کی حد تک ایسا کہتے ہیں کہ جی چاہتا ہے 'تمہارا منہ چوم لوں۔ وہاں عملاً یہی کیا جاتا ہے۔ اور اس میں گالوں کی تخصیص نہیں۔ زیادہ جذباتی ہو کے کوئی ہونٹوں کو بھی چوم لے تو اس میں برا منانے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔

"روشنی ٹھیک ہو جائے گی" میں نے دوستانہ انداز میں شیری کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ بھری بیٹھی تھی۔ اس نے میرے سینے پر سر رکھ کے سسکنا شروع کر دیا "شاہ جی، تم جتنے اچھے بندے ہو۔ ہم اتنی ہی بری ثابت ہوئیں لیکن کیا کریں' سب کی اپنی اپنی مجبوری ہے۔ ہمیں معاف کر دینا۔"

میں نے اسے تھپک کے چمکار کے الگ کیا "مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔"

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرانے لگی "اگر ہمیں تم جیسا کوئی پاکستانی مرد اپنا لیتا تو خود بھی بڑے فائدے میں رہتا۔ اور ہم بھی وہ نہ ہوتے 'جو ہم ہیں۔"

اس شام کا باقی حصہ میں نے یمنی اور عاقل کے ساتھ باقی ماندہ شاپنگ میں صرف کیا۔ میں اب بہت خوش اور مطمئن تھا۔ لندن میں میرے قیام کے سارے مقاصد پورے ہو گئے تھے۔ ان تمام قانونی مسائل سے جو لندن میں پیش آئے' مجھے مقامی اخبارات میں مناسب پبلسٹی ملی لیکن پاکستان میں شبنم کی کوشش سے تمام اخباروں نے شاہ عالم کو نمایاں کوریج دی اور اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ شاہ عالم نہ صرف یہ کہ لندن میں موجود ہے بلکہ پھر ایکٹو ہو گیا ہے۔

پاکستان کے کچھ اخباروں نے جن میں شبنم کا اخبار پیش پیش تھا۔ مستقبل میں میرے سیاسی عزائم کا خوب چرچا کیا۔ شبنم ایڈیٹر تھی اور اس کے شاہ عالم سے مراسم کی نوعیت بھی کسی سے پوشیدہ نہ تھی چنانچہ اخبار نویس تو اس پروپیگنڈے کی اہمیت کو سمجھتے تھے لیکن رائے عامہ بھی دوبارہ شاہ عالم کا تذکرہ سن رہی تھی۔ گمنامی میں رہنے والا شاہ عالم پھر پہلے جیسی شہرت پانے لگا تھا اور مجھے یقین تھا کہ اس کے پاکستان پہنچنے پر سیاسی منظر میں کچھ ہلچل ضرور پیدا ہو گی۔

ضرورت اب اس بات کی تھی کہ ناصر عظیم کی بقا کے لیے شاہ عالم کو فنا کر دیا جائے۔ یہ کام آسان نہیں تھا۔ لاہور جیسے شہر میں شاہ عالم کی سیاسی پارٹی پی جے ایف کے کارکن عہدے دار اور ممبر بہت تھے۔ وہاں کسی بھی شخص کو شاہ عالم قرار دے کر دفن کرا دینا تقریباً ناممکن تھا لیکن یہ کام کراچی میں کیا جا سکتا تھا۔

رات کو میں نے رئیس سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے آدھی رات کے بعد نیلم کے گھر میں ملا۔ "کیا حال اینڈ چال ہے پیارے' تو ایسا گیا کہ بالکل ہی گو وینٹ گون ہو گیا۔"

میں نے کہا "بس اب ایک دن کی بات ہے۔ پرسوں میں پاکستان پہنچ رہا ہوں۔ تو مجھے کراچی میں وصول کر۔"

"کراچی میں کیوں؟"

میں نے کہا "یہ میں کراچی پہنچ کے بتاؤں گا۔"

"لیکن یار! میں نہیں آسکتا" وہ بولا۔

"بکواس مت کر۔ میں نے اسے گالیاں دیں' تجھے آنا پڑے گا۔"

"ابے بات کو سمجھا کر بھوتنی کے۔ میں سیکریٹری ہوں اب نیلم کا۔"

"ایسی کی تیسی سیکریٹری کی۔ اور اس کی جس کا تو سیکریٹری ہے۔ نیلم نے تو اعلان کر دیا تھا کہ وہ فلموں سے ریٹائر ہو جائے گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پیارے۔ اپن بھی اس سے یہی کہتے ہیں کہ یہ کام چھوڑ دے مگر جو فلمیں زیرِ تکمیل ہیں۔"

"زیرِ تکمیل۔ جاہل کی اولاد!"

اس نے جھینپ کے کہا "ابے ہاں وہی۔ وہ تو پوری ہوں گی نا۔"

میں نے کہا "تو استعفیٰ دے دے۔ چھوڑ دے نیلم کی نوکری۔"

"ابے یار۔ نوکری کہاں' ہم تو بادشاہی کر رہے ہیں۔ اتنا خیال رکھتی ہے وہ میرا۔ کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔ ایک وہ پہلے والا سیکریٹری تھا' رحمانی۔ سالا پانچ لاکھ کھا گیا۔ اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک تھا نیلم کا۔ مگر اپنے ساتھ تو وہ ایسے ہی رہی ہے جیسے تیرے ساتھ۔"

"وہ بڑی نیک اور فراخ دل عورت ہے۔"

"ہاں یار۔ صبح ناشتا ہم ساتھ کرتے ہیں۔ اسٹوڈیو میں لنچ بھی ساتھ کرتے ہیں۔ بڑی باتیں بناتے ہیں لوگ۔ اخبار والے تو سالے ایک نمبر کے حرامی ہیں۔ پتا نہیں کیا کچھ چھاپ رہے ہیں۔"

میرا ماتھا ٹھنکا "کیا چھاپ رہے ہیں؟"

"ابے یہی۔ اُدھر اُدھر کی ... بے تکی باتیں کہ ان کے رومان ہے یہ 'وہ ہے۔"

میں نے کہا "بیٹے۔ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔"

وہ ہنسنے لگا "آگ کہیں نہیں ہے پیارے!"

"جھوٹ بول رہا ہے مجھ سے۔ کیا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی؟"

"دیکھ پیارے۔ دونوں طرف کا تو پتا نہیں۔ پر اپنا دل سالا قابو میں نہیں رہا۔ اس کی مہربانیاں دیکھ کے دماغ خراب ہو گیا ہے اپنا۔" وہ ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "دماغ اچھا کب تھا۔ لیکن تجھے کراچی آنا

پڑے گا۔"

"کتنے دن کے لیے؟"

"ہفتہ دس دن بھی لگ سکتے ہیں۔۔۔ مہینہ بھی۔"

"ناممکن۔ اتنی لمبی چھٹی نہیں ملے گی مجھے۔"

میں نے کہا "لعنت بھیج چھٹی پر۔ میں جو کہہ رہا ہوں کہ استعفیٰ دے کر آجا۔ میں تجھے اپنا سیکریٹری مقرر کرتا ہوں۔"

"ابے نہیں یار۔ وہ مجھے نہیں چھوڑے گی۔"

"پھر تو چھوڑ دے اسے۔ اور نیلم کی فکر مت کر۔ اس سے میں بات کرلیتا ہوں" میں نے کہا۔

"یہ بات نہیں یار۔ اپنے لیے بھی مشکل ہے۔"

"کیا مشکل ہے؟"

"اتنے دن نیلم سے دور رہنا" وہ بولا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ "اچھا تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ بھوتنی کے۔ تجھے عشق ہوگیا ہے اس سے۔ سالے صورت دیکھی ہے اپنی؟"

"ابے یار۔ محبت کیا صورت دیکھ کے کی جاتی ہے؟"

میں نے کہا "محبت کے گھوڑے۔ پہلے تو وزن دیکھ کے محبت ہوتی تھی تجھے۔"

وہ ہنسنے لگا "وہ محبت کہاں تھی یار۔ یہ بات اب سمجھ میں آئی۔ بس ایسے ہی دل لگی تھی۔"

میں نے کہا "کیا نیلم کا دماغ خراب ہوگیا ہے؟"

وہ بولا "وہ کیا شعر پڑھتا تھا تو۔ کہتے ہیں جسے پیار، وہ دماغ کی خرابی ہے۔ تو یار ے، ایسا ہی ہوتا ہے واقعی۔ صرف فلموں میں نہیں، زندگی میں بھی ہوتا ہے۔"

میرے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ نیلم جیسی سپر اسٹار جس کا ایک عالم دیوانہ تھا اس نے رئیس جیسے معمولی شکل و صورت کے بے نسب اور کسی حد تک بدنام اور جاہل شخص کو پسند کرلیا ہے مگر رئیس خود مجھے اس کی اطلاع دے رہا تھا تو یقین کیے بنا چارہ نہ تھا۔ دوسری طرف مجھے خوشی بھی تھی کیونکہ مجھ سے بہتر رئیس کو بھلا کون سمجھ سکتا تھا۔ اپنی طبعی سادگی، نیک نیتی اور فراخ دلی کے باعث وہ کسی بھی عورت کے لیے مثالی شوہر ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابتدا میں وہ دل لگی کے لیے دل لگاتا رہا اور دو سو پاؤنڈز وزن کی ایسی حسیناؤں کے جال میں الجھتا رہا جن کو وہ مذاق میں رس ملائی، بنی، امرتی اور جلیبی جیسے نام دیتا تھا۔

میں نے کہا "رئیس! میں آخری بار کہہ رہا ہوں، کراچی پہنچ جانا۔"

"ابے بات سن میری۔ دراصل۔۔۔ وہ نیلم کا پروگرام کچھ اور تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ اچانک لندن پہنچ جائیں۔ اپنی سونی کو مبارک باد دیں۔"

"اس کا نام اب عینی ہے، الّو کے پٹھے!"

"ابے ہاں وہی، عینی اور عاقل کی شادی میں شریک نہ ہونے کا بہت صدمہ تھا نیلم کو۔ ہم کل پرسوں میں روانہ ہونے کا سوچ رہے تھے۔"

میں نے کہا "اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔"

"پیارے تو بھی رک جا دو چار دن اور۔"

میں نے کہا "میں رک جاتا لیکن مجھے پتا ہے کہ میں پھر کسی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ میں اب روانگی ملتوی نہیں کرنے والا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ تم کراچی پہنچو، تم دونوں۔۔۔ تو میں ریسیو کروں۔ پھر تم لندن جا کے واپس کراچی آجاؤ۔ میں کراچی میں تمہیں دوبارہ ریسیو کروں۔ تو نیلم سے بات کرلے اور میری فلائٹ کا نمبر اور ٹائم بھی نوٹ کرلے۔"

عینی اور عاقل مجھے سی آف کرنے ائرپورٹ تک گئے۔ عینی میری توقع کے برعکس ذرا بھی پریشان یا اداس نہیں ہوئی "پھر کب آؤ گے بھیا!"

"جب تو بلائے گی" میں نے کہا۔

"اچھا؟ پھر تم یوں کرو، کل پاکستان پہنچ کے پرسوں واپس" وہ ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "آنا جانا تو لگا رہے گا پگلی!"

وہ بولی "صرف تم آؤ گے بھیا۔ میں تو پاکستان جا نہیں سکتی۔"

عاقل نے ایک کارٹن میرے حوالے کیا "اس میں چاکلیٹ ہیں قمر کے لیے۔ ہیرڈز سے لایا ہوں منتخب کر کے، کافی ہیں؟"

"ویسے تو کافی ہیں مگر قمر کو ہمیشہ ناکافی رہتے ہیں۔"

عینی نے کہا "بھیا۔ اس صندوقچی میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "چندا کی امانت ہے۔"

اسپیکر کے پبلک ایڈریس سسٹم پر فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہونے لگا "مسافروں سے درخواست ہے کہ وہ ٹرانزٹ لاؤنج میں چلے جائیں۔"

میں آگے بڑھا اور رک گیا۔ ٹرانزٹ لاؤنج کے راستے میں ہوگر کا بھائی برٹ، اس کا باپ اور کچھ دوسرے بدمعاش دیوار بنے ہوئے تھے۔

جہنم رسیدہ ہوگر کے بھائی برٹ اور ان کے مہا حرامی والد ماجد سمیت وہاں پانچ افراد کا ٹولہ اپنی بدمعاشی کی طاقت سے میرا راستہ روکنے کے لیے مستعد تھا۔ معلوم نہیں انہیں کس طرح یہ علم ہوگیا تھا کہ میں آج اس فلائٹ سے فرار ہو رہا ہوں اور وہ قبل از وقت میرے ارادے کو ناکام بنانے کے لیے لندن ائرپورٹ پر جمع ہوگئے تھے۔

وہ سب ٹرانزٹ لاؤنج کو جانے والے راستے کی طرف منہ کیے کھڑے تھے چنانچہ ابھی تک ان کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی لیکن یہ بات یقینی تھی کہ مجھے دیکھتے ہی وہ شکاری کتوں کی طرح لپکیں گے اور قانونی یا غیر قانونی طور پر مجھے مجبور کریں گے کہ میں ہوگر کے خون بہا کی رقم ادا کروں۔ پھر میں ان کی طرف سے جہنم میں جاؤں یا اپنے وطن۔ یا میں پرواز چھوڑ دوں اور ان کے ساتھ چل کر فیصلہ کن مذاکرات کروں کہ مجھے قانون کے مطابق قتل کے الزام کا سامنا کرنا منظور ہے، ان کا مطالبہ ماننا یا ان کے ہاتھوں قتل ہونا۔

فلمی ہیرو کی طرح ان سب کو مار مار کے پانچ منٹ میں لمبا لٹایا جا سکتا تھا مگر اس کے بعد میرے اس پرواز سے پاکستان جانے کے امکانات صفر ہو جاتے۔ ائرپورٹ پر ہنگامہ ہوتے ہی قانون ہر سمت سے صورتِ حال کو کنٹرول میں کرنے کے لیے حرکت میں آجاتا۔ برٹ اینڈ برادرز کمپنی کے ساتھ میں بھی گرفتار ہو جاتا اور پھر قانونی طور پر باعزت رہائی سے پہلے میرے واپس پاکستان جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

میرے خلاف ہوگر کے قتل کا الزام ثابت ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا مگر یہ کیس کھلتا تو گویا پنڈورا کا باکس کھل جاتا۔ گزشتہ دو ماہ میں نہ چاہنے کے باوجود میں کئی بار پولیس کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہو چکا تھا۔ تازہ ترین واقعہ گزشتہ روز پیش آیا تھا جب میں شیری کے ساتھ اس کی بہن روشنی کو اسپتال لے گیا تھا۔ فی الحال میں قتل جیسے سنگین الزام میں بلاوجہ ملوث ہونے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ قانون سے مدد مانگنے کا مطلب بھی وہی تھا جو غیر قانونی طور پر اپنا راستہ بنانے کی کوشش کا ہوتا۔ پولیس بہرصورت دخل انداز ہوتی اور فریقین کا موقف سن کے ہی فیصلہ کرتی کہ معاملات کی صحیح صورتِ حال واضح ہونے تک مجھے روک لیا جائے۔

میں نے عاقل اور عینی کو کچھ دور بلا کے سچویشن سمجھائی "اب میں ٹرانزٹ لاؤنج تک کیسے جاؤں؟"

عینی نے مشورہ دیا "آپ وی آئی پی گیٹ سے اندر چلے جائیں۔ آخر آپ کے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے اور آپ ایک اہم سیاسی شخصیت ہیں۔"

عاقل نے نفی میں سر ہلایا "خاتون۔ یہ پاکستان نہیں ہے۔ یہاں وزیرِ مشیر بھی عام لوگوں کی طرح رہتے ہیں۔ بس اور ٹرین میں سفر کرتے ہیں اور یہاں بھی عام راستے سے آتے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "وقت بہت کم ہے ورنہ میں ان سب سے نمٹ لیتا۔"

"کیسے نمٹ لیتے آپ؟ سب کا مار مار کے بھرکس نکال دیتے۔ مانا کہ آپ بڑے تیس مار خان ہیں مگر یہاں کوئی فلمی شوٹنگ نہیں ہو رہی ہے کہ ہیرو درجن بھر دشمنوں کو مار کے مسکراتا ہوا نکل جائے" عاقل نے خفگی کا اظہار کیا۔

"یار یہی تو میں نہیں چاہتا۔ پھر پولیس کے چکر میں پڑا تو وہ کہیں گے کہ آخر پرابلم کیا ہے تمہیں؟"

"وہ تمہیں نفسیاتی معائنے کے لیے بھیج دیں گے کہ یہ شخص جب تک مار پیٹ نہ کرے اسے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "تم تو جانتے ہو کہ مصیبت خود میرے گلے پڑتی ہے۔"

"مگر پولیس یہ بات نہیں جانتی۔"

میں نے کہا "مسئلے کا حل سوچو یار!"

عینی نے کہا "میرا تو خیال ہے کہ تم کو سیدھا پولیس کے پاس جانا چاہیے۔"

"اور کیا بتانا چاہیے انہیں؟"

عینی بولی "یہی کہ ائرپورٹ پر کچھ خطرناک لوگ موجود ہیں اور مجھے خطرہ ہے ان سے۔ براہ مہربانی مجھے بحفاظت جہاز تک پہنچا دیں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میری بھولی بہن۔ کاش، یہ سب اتنا ہی آسان ہوتا۔ کیا پولیس مجھ سے پوچھے گی نہیں کہ آخر کون ہیں یہ خطرناک لوگ اور آپ کی جان کے دشمن کیوں ہو رہے ہیں؟ کیا جواب دوں گا میں انہیں؟"

عاقل بولا "اور فرض کرو تمہارے بھیا کی شکایت پر پولیس نے برٹ کو اس کے باپ کو اور باقی سب لوگوں کو پکڑ لیا تو ان سے بھی پوچھا جائے گا کہ آخر اس شریف آدمی نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ تم لوگ کیوں اس کا راستہ روکے کھڑے ہو، جانے کیوں نہیں دیتے اسے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہی ہے اصل پرابلم۔ پولیس میرے بیان پر انہیں جیل نہیں بھیج سکتی۔ یہ معاملہ پیش ہوگا عدالت میں۔ مگر اس سے پہلے ہوں گی تحقیقات تو شاہ عالم کا سارا کچا

چھٹا سامنے آجائے گا۔ ہوگر کے بھائی اور باپ کو ہوگر کے ہلاک ہونے کا اتنا صدمہ نہیں ہے جتنا لالچ ہے کہ مجھ سے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز وصول کریں۔"

"برٹ خود قاتل ہے اپنے بھائی کا" عینی بولی۔

"یہ تو تم کہہ رہی ہو نا۔ سوچو' برٹ کیا کہے گا اور ہوگر کا باپ کیا کہے گا۔ انہیں ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز ملنے کی امید نہ رہی تو پھر وہ اتر آئیں گے کھلی دشمنی پر۔ وہ مجھ پر ہوگر کے قتل کا الزام عائد کردیں گے۔ یہی نہیں' برٹ ڈکیتی کے ڈرامے کا سارا راز فاش کردے گا۔"

"برٹ خود ڈکیتی میں شامل تھا۔"

عاقل نے کہا "یار عینی' کیا ضروری ہے سوچے سمجھے بغیر بولنا؟"

"میں نے کیا غلط کہا؟" عینی بگڑ کے بولی۔

میں نے کہا "سچ تو یہی ہے کہ برٹ بھی واردات میں شریک تھا مگر ایک تو عدالت میں سچ کوئی نہیں بولتا۔ دوسرے یہ سچ کا پھندا بالآخر میرے ہی گلے میں پڑے گا۔ برٹ کہے گا کہ اس شخص نے میرے بھائی ہوگر کو بے وقوف بنایا۔ اس سے کہا کہ دس ہزار پاؤنڈز دوں گا۔ تم فلاں جگہ جی کی گاڑی روک لو اور یہ گاڑی فلاں جگہ میرے ساتھی کے حوالے کردو۔ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ گاڑی میں تین لاکھ پاؤنڈز کیش ہے۔ جب یہ بات اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں سے ہوگر کو معلوم ہوئی تو اسے سخت طیش آیا۔ اس نے شاہ عالم سے کہا کہ مالِ غنیمت میں سے آدھا تیرے حوالے کرو۔ شاہ عالم نے انکار کیا۔ اس پر ان کی لڑائی ہوئی جس میں ہوگر مارا گیا۔ ذرا سوچو' یہ سب عدالت میں کہا گیا تو میرا انجام کیا ہوگا؟ ان کے پاس تو چشم دید گواہ بھی بہت ہیں۔ سارے کالے جو وہاں رہتے ہیں' ہوگر فیملی جیسے۔ ہر شخص بائبل پر ہاتھ رکھ کے کہہ دے گا کہ اس نے خود مجھے لوہے کی سلاخ سے ہوگر پر وار کرتے دیکھا تھا۔"

عینی متفکر و پریشان نظر آنے لگی۔ "پھر کیا کریں بھیا!"

عاقل نے کچھ سوچ کے کہا "ایک آئیڈیا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے کہا۔

"تم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جاؤ۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا "دھول یہاں کہاں ہے برادر اِن لا۔"

وہ بولا "دیکھو' آدھے گھنٹے کے بجائے اگر پون گھنٹا لگ جائے تب بھی تمہیں فلائٹ مل جائے گی۔ تھوڑا بہت تاخیر کا مارجن ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ ایک گھنٹے بعد بھی میں بورڈنگ کارڈ لے لوں گا۔ میں انفارم کرسکتا ہوں کہ ٹریفک جام میں پھنس گیا ہوں لیکن میں پرواز سے پہلے یقیناً پہنچ جاؤں گا۔"

"ایک ترکیب ہے میرے ذہن۔ ہم یہاں سے نکلتے ہیں ایک ساتھ۔ پھر ایک دو کلومیٹر کے فاصلے پر میں ایمبولینس طلب کرتا ہوں۔ ہم تمہیں یہاں لاتے ہیں اسٹریچر پر لٹا کے۔ پھر شفٹ کردیں گے وہیل چیئر پر۔ تم کہہ سکتے ہو کہ کمر کی ایک چوٹ کے باعث فی الحال تمہاری ٹانگیں کام نہیں کررہی ہیں۔ تمہیں ائرلائن کا نرسنگ اسٹاف خود ٹرانزٹ لاؤنج سے جہاز تک پہنچائے گا۔"

"لیکن وہیل چیئر بھی گزرے گی اسی راستے سے۔ جہاں میرے دشمن دیوار بنے کھڑے ہیں۔"

"ایمبولینس میں ہم تمہیں چادر سے ڈھانپ کے لائیں گے۔ وہ چادر تم وہیل چیئر پر اوڑھ کے بیٹھ سکتے ہو۔ صرف امیگریشن والے تمہیں مجبور کریں گے کہ اپنا چہرہ دکھاؤ۔ اور کوئی یہ مطالبہ نہیں کرسکتا۔ تم دشمنوں کی نظروں کے سامنے سے بحفاظت گزر جاؤ گے۔ انہیں شک بھی نہیں ہوسکتا۔"

میں نے اس پلان پر غور کیا تو کامیابی کے امکانات خاصے روشن نظر آئے۔ وقت کم تھا اور میرے یا عینی کے ذہن میں کوئی متبادل منصوبہ بھی نہیں تھا چنانچہ میں نے فوری طور پر اپنی رضامندی کا اظہار کردیا۔ "یہ ہے تو مشکل مگر فی الحال اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"WE CAN AT LEAST TRY" عاقل بولا۔

عینی تذبذب کا شکار رہی "ٹھیک ہے۔ مگر سوچ لو' اچھی طرح۔"

"لڑکی' وقت کہاں ہے سوچنے کے لیے" میں نے کہا۔

ہم افراتفری میں باہر نکلے۔ لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ کا رقبہ بھی کئی کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ وقت کی کمی کے باعث ہمارا باہر جانے کے لیے پارکنگ ایریا تک پہنچنا اور گاڑی لے کر باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔ ہم نے سب سے پہلے سامنے آجانے والی ٹیکسی کو روک لیا اور ائرپورٹ کی حدود کے باہر ایک بس اسٹینڈ پر پہنچ کے کرایہ ادا کردیا۔ عاقل نے وہیں موجود ایک فون بوتھ سے معلومات حاصل کیں تو پتا چلا کہ ایمبولینس سروس ائرپورٹ کے اندر ہی موجود ہے۔ دس منٹ میں ایمبولینس عین ہمارے سامنے آکے رک گئی۔

ایک نرس نے باہر آکے پوچھا "مریض کون ہے؟"

میں نے بیماروں والی صورت بنالی "مریض میں ہوں۔ میں چل نہیں سکتا۔"

"پھر تم یہاں تک کیسے پہنچے؟" نرس نے سوال کیا۔

میں نے کہا "یہ پرابلم عارضی ہے۔ کبھی کبھی اچانک میرا نچلا دھڑ بے جان ہوجاتا ہے۔ یہاں تک میں گاڑی خود ڈرائیو کرکے لایا تھا۔"

"تم نے بڑا خطرہ مول لیا۔ تم کسی حادثے سے دوچار ہوسکتے تھے۔"

میں نے کہا "دراصل چھ مہینے سے میں بالکل ٹھیک تھا۔ مجھے ایک بھی فالج کا اٹیک نہیں ہوا تھا۔ میری کمر میں دو سال پہلے چوٹ آئی تھی' اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوا۔ کسی وجہ کے بغیر اچانک ٹانگیں بے جان ہوجاتی تھیں۔ کبھی ہفتے میں ایک بار' کبھی دو بار پھر علاج سے اتنا فائدہ ہوا کہ فالج کا حملہ مہینے دو مہینے بعد ہونے لگا۔ اب چھ مہینے گزر گئے تو ڈاکٹر نے بھی کہا کہ تم ٹھیک ہو۔"

"تمہیں اب کہاں جانا ہے؟" نرس نے کہا "اسپتال؟"

"تو... میری فلائٹ ہے ایک گھنٹے میں۔ مجھے ائرپورٹ پہنچنا ہے۔ ائرپورٹ تو خیر سامنے ہے' مجھے جہاز تک پہنچنا ہے۔"

نرس نے پوچھا "تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ پہلے کئی بار میں اکیلا آیا ہوں۔"

"اور تمہاری گاڑی کہاں ہے؟"

میں نے سڑک کے دوسری طرف کھڑی ہوئی ایک کار کی طرف اشارہ کردیا۔ "وہ سامنے۔ اسے میری بیوی لے جائے گی بعد میں۔ لیکن تم اگر اس طرح مدد کے بجائے جرح کرتی رہیں تو میری فلائٹ ضرور مس ہوجائے گی۔"

"دراصل میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ خیر' یہ ائرلائن والوں کا دردِ سر ہے کہ وہ تمہیں لے جاسکتے ہیں یا نہیں" وہ بولی۔

اس نے ایمبولینس کے ڈرائیور کو بلایا۔ پھر انجان بن کے ایک طرف کھڑے ہوئے عاقل کو اشارہ کیا "پلیز' ان کی مدد کریں۔"

مجھے ایک طرف سے ڈرائیور نے سپورٹ کیا اور دوسری طرف سے عاقل نے۔ وہ مجھے ایمبولینس تک لے گئے اور اندر لٹادیا۔ میں نے عاقل سے ہاتھ ملا کے کہا "تم لوگ اب جاؤ' خدا حافظ!"

مگر عاقل نے کہا "ہم اس وقت تک دیکھیں گے جب تک تم اندر نہیں چلے جاتے۔"

"واٹ از دس!" نرس نے برا مان کے کہا "ابھی تم نے بتایا تھا کہ تمہارے ساتھ کوئی نہیں ہے۔"

میں نے فوراً وضاحت کی "یہ اجنبی مجھے صورت سے اپنا ہم وطن پاکستانی لگا۔ اس لیے میں نے اردو میں شکریہ ادا کردیا۔"

"اور اس نے جواب میں کیا کہا؟"

"اس نے کہا کہ یہ اس کا اخلاقی فرض تھا جو اس نے پورا کیا۔"

نرس مطمئن ہوگئی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا "چلو" اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "تمہیں کون سے گیٹ پر جانا ہے؟ ڈرائیور کو بتادو۔"

میں نے کہا "نمبر ٹو ٹنٹی سیون پلیز!"

نرس نے کہا "تمہیں یقین ہے کہ اس حالت میں تم سفر کرسکتے ہو؟"

میں نے کہا "یہ اثر وقتی ہوتا ہے۔ ابھی آدھے پونے گھنٹے میں میری حالت بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔"

"تمہیں ائرلائن والوں کو بھی مطمئن کرنا پڑتا ہوگا۔"

میں نے کہا "وہ جانتے ہیں مجھے۔ یو تی' میں ایک ڈپلومیٹ ہوں۔ اکثر آتا جاتا رہتا ہوں۔ کیا مجھے ایک چادر مل سکتی ہے' اوڑھنے کے لیے۔"

نرس نے مجھے ایک صاف دھلی ہوئی چادر اوڑھادی۔ "کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"لیس... اس کیفیت میں کچھ سردی بھی محسوس ہوتی ہے۔ اب اگر میں یہ چادر خریدنا چاہوں؟"

"اوہ نو۔ میں اسے بیچنے کا اختیار نہیں رکھتی" وہ بولی۔

میں نے کہا "تم میری مدد کرنے کے لیے اتنا تو کہہ سکتی ہو کہ چادر تم سے گم ہوگئی اور اس کی قیمت جو بھی ہو' میری طرف سے ادا کرسکتی ہو۔ یہ کچھ نوٹ ہیں۔"

اس نے نوٹوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا "میں یہ نہیں لے سکتی۔"

میں نے کہا "لیکن مجھے چادر کی سخت ضرورت ہے۔"

وہ کچھ سوچ کے بولی "آل رائٹ' ابھی تم چادر رکھ لو۔ آگے جہاز والے تمہیں کمبل بھی فراہم کرسکتے ہیں۔"

"تھینکس!" میں نے کہا "جہاز تک پہنچ کے میں چادر واپس کردوں گا۔"

ایمبولینس اس راستے کے مقابل جا کھڑی ہوئی جو مریضوں کے آنے جانے کے لیے مخصوص تھا۔ عاقل کی ترکیب کام کرگئی تھی۔ میں اب اس جگہ سے بہت دور تھا

جہاں برٹ' اس کا باپ اور ان کے حمایتی میری آمد کے منتظر تھے۔ یہ بات میرے لیے ناقابلِ فہم تھی کہ آخر انہیں میری اس فلائٹ سے روانگی کا علم کیسے ہوا؟ شاید انہوں نے کسی جان پہچان والے کی مدد سے یا ناجائز ذرائع سے پاکستان جانے والی پی آئی اے کی ہر فلائٹ کے بارے میں انفارمیشن حاصل کی ہوگی اور جیسے ہی میرا نام اس فلائٹ کے مسافروں میں دیکھا ہوگا' وہ میرے استقبال کے لیے پہنچ گئے ہوں گے۔

مجھے ڈرائیور نے ایک اور شخص کی مدد سے اتارا اور ایک وہیل چیئر پر بٹھا دیا۔ کسی دشواری کے بغیر نرس وہیل چیئر کو دھکیلتی ہوئی آگے بڑھی۔ میں نے چادر کو پورے جسم پر اچھی طرح لپیٹ لیا تھا اور چہرے کو بھی پوری طرح چادر میں چھپا لیا تھا۔ لوگ خود بخود وہیل چیئر کے لیے راستہ چھوڑتے جا رہے تھے۔ جیسے جیسے میں داخلی دروازے کے قریب پہنچ رہا تھا' میرا دل کچھ تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ خوف ایک خلش بن کے مجھے پریشان کرتا تھا کہ کہیں برٹ اینڈ کمپنی نے چادر میں چھپا ہونے کے باوجود میرا چہرہ دیکھ لیا یا انہیں شک بھی ہوگیا تو وہ کیا کریں گے۔

لیکن میرے اندیشے بے بنیاد ثابت ہوئے۔ برٹ اور اس کے ساتھی وہیل چیئر دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہوگئے۔ میں کسی پردہ دار خاتون کی طرح چادر میں لپٹا ہوا ان کے درمیان سے گزر گیا۔ اس وقت تک میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ کے بہنے لگا تھا۔ خطرے کی حدود سے گزرتے ہی میں نے سکون کا گہرا سانس لیا اور چادر کو اپنے چہرے سے ہٹا دیا۔ آگے راستہ صاف اور محفوظ تھا۔ مجھے مفلوج نظر آنے کی اچھی خاصی اداکاری کرنی پڑی لیکن میرے ڈپلومیٹک پاسپورٹ نے میری بہت مدد کی۔ میرا سامان پہلے ہی کلیئر ہوگیا تھا۔ مجھے کسی دشواری کے بغیر بورڈنگ کارڈ بھی مل گیا۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں پہنچ کے میں نے نرس کا شکریہ ادا کیا اور چادر بھی اسے واپس کردی۔ آگے مجھے پی آئی اے کے مستعد اسٹاف نے سنبھال لیا اور جہاز میں پہنچا دیا۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بحری یا ہوائی جہاز کسی ملک کا نمائندہ ہو تو اس کے اندر کی جگہ کو اصل ملک تصور کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنے وطن کی نمائندہ پاکستان انٹرنیشنل ائرلائنز کے اندر قدم رکھنے کے بعد میں نے تصور میں اپنے وطن کی مانوس فضا کو اس کے وجود کو اور اس احساس کی خوشبو کو محسوس کیا جو پاکستان کے نام سے منسوب اور معنون ہے۔

وہاں بیشتر پاکستانی تھے اور چند ایک کو چھوڑ کے سب پاکستان کی زبانیں بول رہے تھے۔ انگریزوں کے ملک کی پُرتعصب' پُرتصنع اور پُرتکلف اجنبیت کا ماحول یکلخت ختم ہوگیا تھا۔ میں جیسے لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ سے اچانک لاہور کی گوالمنڈی یا کراچی کے لالوکھیت پہنچ گیا تھا جہاں سب اپنے تھے' پاکستانی تھے۔

میں ایک نئے نویلے پاکستانی جوڑے کے قریب سے گزرا۔ دولھا ابھی اپنی "فتح" پر خوش تھا۔ دلہن روایتی انداز میں اپنے مفتوح ہونے کے خیال سے شرما رہی تھی۔ اس نے گورے ہاتھوں پر کہنی سے ذرا نیچے تک بڑے دلآویز انداز میں مہندی کے پھول کھلا رکھے تھے اور اس کے ماتھے پر جھومر یوں چمک رہا تھا جیسے برکھا رت میں کسی نکھرے ہوئے' دھلے دھلائے آسمان پر چودھویں کا چاند۔

میں نے دو صحت مند پنجابیوں کو روایتی زندہ دلی اور بے تکلفی کے ساتھ کسی لطیفے پر قہقہہ مار کے ہنستے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے دیکھا۔ میرے پیچھے دو سندھی میاں بیوی شاہ عبداللطیف بھٹائی پر بڑی عالمانہ گفتگو میں مصروف تھے۔ کہیں سے تین چار پٹھانوں کے بیک وقت بولنے کی آواز بھی مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ لیکن کچھ لوگ کانونٹ کے لہجے میں زبان کو تکلیف دے کر انگریزی میں بھی باتیں کررہے تھے۔

مجھے میری سیٹ تک پہنچانے والے فضائی میزبانوں نے کمال شائستگی کا مظاہرہ کیا "آپ اب COMFORTABLE ہیں سر!"

میں نے کہا "یس۔ تھینکس۔ میں کچھ دیر میں نارمل ہوجاؤں گا۔"

"ہمارے لیے اور کوئی خدمت؟"

میں نے ان کا پھر شکریہ ادا کیا اور کھڑکی سے باہر اس لندن کو دیکھنے لگا جس نے مجھے دو مہینے اپنا قیدی بنا کے رکھا تھا۔ مجھے میری مرضی کے خلاف آخری وقت تک روکنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن میں بالآخر لندن سے بھاگ آیا تھا۔ مجھ سے چند سو گز کے فاصلے پر اس وقت بھی برٹ اینڈ کمپنی قاتلانہ عزائم کے ساتھ میری راہ دیکھ رہی تھی اور آتے جاتے ہجوم میں شاہ عالم کے چہرے کو تلاش کررہی تھی۔

اس سے پرے لندن میں کہیں ایک لڑکی روشنی تھی جس نے میرے ساتھ زندگی بھر شریکِ سفر رہنے کے خواب دیکھے تھے مگر اس کے ارمانوں کے آشیانوں پر ایسی بجلی گری تھی کہ اب نہ راکھ تھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا۔ روشنی کے ساتھ ہی دوسری لڑکی شیری تھی۔ بدکردار اور بدنام مگر صاف گو اور نیک دل۔ وہیں لندن کے ایک اسپتال میں جولی لیٹی ہوئی تھی اور شاید دل ہی دل میں اپنی فتوحات کا شمار کرکے مسکرا رہی تھی۔ اسے اپنے حسن وشباب کی ایک قیمت وصول کرنی تھی اور اس نے کی۔ اسے اپنے دولت مند مالک و آقا شوہر کو ٹھکانے لگانا تھا۔ اس نے لگا دیا۔ اسے ایک پاکستانی شاہ عالم کے غرور کو شکست دینی تھی کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ اس نے دی۔ اب یہ کیا سوچنا کہ ہر جیت کے لیے اس نے اخلاق وکردار کے کتنے ضابطوں کو پامال کیا۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔

وہیں کہیں دوسرے اسپتال میں لارڈ پرائس لیٹا ہوا تھا جس نے پچاس سال تک ایک دوست کی امانت کو سنبھال کے رکھا تھا اور بالآخر یہ امانت اس کے وارثوں تک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا۔ ایک جیل خانے میں جمی بند تھا جس نے زندگی بھر سب کو اپنی عیاری اور بدمعاشی سے دھوکا دیا تھا مگر آخر تقدیر نے اسے دھوکا دیا اور اب وہ ایک بزنس پارٹنر اور ایک لائف پارٹنر پر اعتبار کی سزا کاٹ رہا تھا۔

بالآخر جہاز نے پرواز شروع کی۔ چشمِ تصور سے میں نے دو پیار بھرے چہروں کو دوری کی دھند میں تحلیل ہوتے دیکھا۔ ان میں ایک چہرہ عاقل کا تھا جس نے عینی کی محبت کے ساتھ میری ذمے داریوں کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر لے لیا تھا۔ دوسرا عینی کا چہرہ تھا جو اچانک لندن کے بھرے پُرے شہر میں خود کو اکیلا محسوس کرکے رو رہی تھی اور سات سمندروں کی وسعت کے خیال سے دل زدہ تھی جو اس کے اور اسے چاہنے والوں کے درمیان حائل ہوچکی تھی۔

جہاز کے کچھ مسافروں نے شاہ عالم کو پہچان لیا تھا ان میں میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تیس بتیس سال کی وہ خوش مزاج' خوش اطوار اور خوش شکل خاتون بھی تھی جو بعد میں ایک ڈاکٹر ثابت ہوئی۔ جہاز لندن کے افق پر پہنچا تو فضائی میزبانوں نے مسافروں کی خاطر تواضع شروع کی۔ مجھے فرمائش پر بلیک کافی مہیا کی گئی۔ خاتون نے کریم کے ساتھ کافی لی۔ سلسلۂ کلام بھی خاتون نے شروع کیا "اگر میرا خیال غلط نہیں تو آپ غالباً شاہ عالم ہیں۔"

میں نے مسکرا کے کہا "میں یقیناً شاہ عالم ہوں۔"

"میرا نام شبانہ ہے اور میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں لندن کے ایک اسپتال میں پریکٹس کرتی تھی" اس نے رسماً اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

میں نے اس سے مصافحہ کیا "آپ سے مل کے خوشی ہوئی لیکن یہ کرتی تھی کا کیا مطلب؟ کیا آپ نے یہ جاب چھوڑ دی ہے؟"

"یس۔ میں پاکستان جارہی ہوں" وہ بولی "دو سال بعد۔"

"وہاں آپ کو زیادہ اچھی جاب مل گئی ہے؟"

وہ ہنس پڑی "یہی سمجھ لیجیے۔ میری شادی ہورہی ہے۔"

میں نے اس سے پھر ہاتھ ملایا "میری طرف سے پیشگی مبارک باد۔"

"تھینکس!" وہ کچھ شرمائی۔

میں نے کہا "اگر اسے آپ پرسنل معاملات میں دخل اندازی نہ سمجھیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کے ہونے والے شوہر کیا کرتے ہیں؟ کیا وہ بھی ڈاکٹر ہیں؟"

وہ مسکرائی "یہ اندازہ کیسے کیا آپ نے؟"

میں نے کہا "عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔ میڈیکل کالج میں پڑھنے والے لڑکے اور لڑکیاں زمانۂ طالب علمی کے پانچ سالوں کے دوران میں اپنے اپنے شریکِ حیات کا انتخاب کرلیتے ہیں۔"

"دراصل انہیں بہت وقت ملتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے' سمجھنے اور پرکھنے کا۔ وہ صرف کلاس روم میں ہی ساتھ نہیں ہوتے۔ "پریکٹی کلز" اور اسپتال کے مختلف شعبوں میں ڈیوٹی کے دوران میں انہیں دن رات ایک ساتھ رہنے کا موقع ملتا ہے۔ پانچ سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے کسی کو جج کرنے کے لیے اور سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنے کے لیے۔"

میں نے کہا "گویا آپ نے بھی ایسا ہی کیا تھا؟"

"یس۔ پانچ سال تک دن رات ایک دوسرے کی رفاقت میں گزارنے کے بعد ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہم تمام زندگی ایک دوسرے کے ساتھ گزار سکتے ہیں۔ ہم شادی سے پہلے ہی ایڈجسٹ ہوگئے تھے۔ ذہنی طور پر لیکن۔۔"

"لیکن کیا؟"

"چھوڑیے۔ آپ بھی کہیں گے کہ کیا لڑکی ہے' اپنی زندگی کی الف لیلہ کھول کے بیٹھ گئی۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں۔ اس کے برعکس مجھے ایک پُرتجسس دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اس بے حد پریکٹیکل رومانس میں۔ کوئی اچھی باتیں کرنے والا' ہمسفر ہو تو سفر آسان ہوجاتا ہے۔ ایک بات ضرور جاننا چاہوں گا میں۔"

اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں "وہ کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "دورانِ تعلیم پانچ سال تک تم نے یقیناً صبرواستقامت کا ثبوت دیا لیکن ڈاکٹر بن جانے کے بعد بھی تم نے دو سال گزار دیے؟"

وہ بولی "دو سال نہیں' تین سال۔ ایک سال میں نے بھی ہاؤس جاب میں لگایا اور عمران نے بھی۔"

"یعنی آٹھ سال ہو گئی اس رومانس کی عمر؟"

"تقریباً' لیکن ہمارے ساتھ بھی وہی فلمی قسم کے مسائل تھے" وہ ہنسی "بیچ میں ظالم سماج آگیا تھا۔"

"پھر تو کوئی ولن بھی ہو گا اس لو اسٹوری میں؟"

"ولن بھی تھا ایک مگر اس بے چارے نے کچھ نہیں کیا۔ ایک فلمی مثلث بنی ہوئی تھی۔ لیکن بازی بالآخر عمران نے جیت لی۔ اس کے بعد وہ مسائل اٹھ کھڑے ہوئے جن کی ہمارے نزدیک تو کوئی اہمیت نہیں تھی مگر خاندان والوں نے طوفان کھڑا کر دیا۔ ایک تو میں سنی وہ شیعہ۔ دونوں طرف کے علما نے فتوے جاری کر دیے کہ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔ ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ میرا سیدوں کا خاندان تھا' وہ کسی غیر سید کی بیٹی تو لے آتے ہیں مگر اپنی بیٹی نہیں دیتے۔ بس اسی چپقلش میں گزر گئے تین سال۔ مجھے اسکالر شپ مل گئی تھی۔ دو سال میں انگلینڈ میں رہی۔ ایک ڈپلوما لے لیا۔ وہ ہماری ایم بی بی ایس کی ڈگری پر بھاری ہے۔ عمران یہاں لاہور کے ایک سرکاری اسپتال میں ہے۔ شام کو پرائیویٹ کلینک میں بیٹھتا ہے۔"

"کسی بڑے ڈاکٹر کے ساتھ؟"

"نہیں۔ کلینک اس کا اپنا ہے۔ اتفاق سے اس کو ایک موقع کی جگہ مل گئی۔ وہاں پہلے بھی ایک ڈاکٹر کا کلینک تھا اور اچھا چلتا تھا۔ وہ ڈاکٹر کینیڈا چلا گیا اور جاتے جاتے کلینک عمران کو بیچ گیا۔ عمران صاحب کا یہ ہے کہ متوسط بلکہ نچلے متوسط طبقے سے تعلق ہے۔ کلینک خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ بینک سے لون لینا چاہتے تھے۔ مجھ سے مدد لینے میں انا مجروح ہوتی تھی۔ بہت سمجھایا' بڑی منت سماجت کی کہ چار سال دو سال کی بات ہے۔ جب شادی ہو جائے گی ہماری تو کیا میرا کیا تیرا۔ اسی کلینک میں مجھے بھی بیٹھنا ہے۔ بالآخر بات سمجھ میں آگئی۔"

میں نے کہا "اب ظالم سماج نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں؟"

وہ ہنسی "عمران نے بڑی مستقل مزاجی سے اکیلے ہی یہ معرکہ سر کیا۔ میں تو بیٹھ گئی تھی انگلینڈ جا کے۔"

"اگر تمہاری عدم موجودگی میں گھر والے تمہارا رشتہ کہیں طے کر دیتے؟"

وہ بولی "گھر والے جانتے ہیں میرے مزاج کو بہت اچھی طرح۔ آخر ہوں تو انہی کی بیٹی۔ میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو میری شادی ہو گی عمران سے ورنہ نہیں ہو گی۔ میں لندن سے واپس ہی نہیں آؤں گی۔ عمران نے اپنے گھر والوں کو راضی کیا۔ پھر میرے والدین کو قائل کیا۔ قائل کہاں ہوتا ہے کوئی۔ بس مجبور دیکھتے ہیں خود کو تو عزت بچاتے ہیں اپنی۔"

وہ بہت باتونی لڑکی تھی۔ اس کی ذات میں ایک متاثر کرنے والی خود اعتمادی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر تھی اور دوسری یہ کہ وہ دو سال سے برطانیہ میں خود مختاری کی زندگی گزار رہی تھی لیکن تیسری سب سے بڑی وجہ وہ محبت تھی جس پر وہ خدا کے بعد سب سے زیادہ بھروسا رکھتی تھی۔

کراچی پہنچنے تک نو دس گھنٹے کے سفر میں ہماری شناسائی میں ایسی دوستانہ بے تکلفی آگئی کہ میں نے اس کے پوچھنے پر اسے چندا کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا اور شبنم کے بارے میں۔ لیکن میری گفتگو میں میرے سیاسی یا کاروباری معاملات کا کوئی حوالہ نہیں آیا۔

ان چند مسافروں میں سے جنہوں نے مجھے شناخت کر لیا تھا ایک کسی اخبار کا سیاسی تجزیہ نگار بھی تھا جو کسی جلاوطنی کی پُرتعیش زندگی گزارنے والے لیڈر کا انٹرویو لینے لندن گیا تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور پہلے ائر ہوسٹس کے ہاتھوں اپنا کارڈ بھجوایا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے بڑی خوشامدانہ مسکراہٹ اور عاجزی کے ساتھ مجھے سلام کیا۔ میں نے جواب میں سہلا کے کارڈ جیب میں رکھ لیا تو اسے مایوسی ہوئی۔ وہ کچھ دیر بعد خود آگیا۔

"شاہ عالم صاحب' ۔۔۔ میں۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "آپ کے کارڈ سے تعارف ہو گیا تھا۔"

"جی ۔۔۔ مگر وہ ۔۔۔ دراصل میں کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا" وہ بولا "اگر آپ کی شریکِ حیات کچھ دیر کے لیے میری سیٹ پر چلی جائیں۔"

میں نے کہا "سوچے سمجھے بغیر بولنا بڑی غیر ذمے دارانہ حرکت ہے۔ ڈاکٹر شبانہ صرف میری شریکِ سفر ہیں۔"

وہ سخت خفیف ہوا "آئی ایم سوری' ڈاکٹر شبانہ!"

میں نے کہا "اچھا ہوا کہ غلط فہمی یہیں رفع ہو گئی ورنہ آپ تصویر چھاپ دیتے بعد میں تو ہم دونوں کے لیے مسائل پیدا ہو جاتے۔"

اس نے جھینپ کے کہا "شاہ صاحب' نہ میں ایسا صحافی ہوں اور نہ میرا اخبار اسکینڈلز پر چلتا ہے۔ دراصل آپ لندن سے وطن واپس جا رہے تھے اور آپ کے بارے میں یہ

تو سب ہی جانتے ہیں کہ وہاں آپ نے تیسری شادی کی تھی لیکن آپ کی تیسری وائف کبھی پبلک میں نظر نہیں آئیں۔"

"اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"صحافی کیا چاہے گا؟ ایک ایکس کلوسو انٹرویو۔"

میں نے کہا "سوری۔ فی الحال میں کسی انٹرویو کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"آپ جیسے پرانے لوگوں کو تیاری کی کیا ضرورت ہے؟" وہ ڈھٹائی کے ساتھ کھڑا رہا "صرف چند سوالات ۔۔۔"

میں نے کہا "بڑی مہربانی آپ تشریف لے جائیں۔ ایسے میرے سر پر سوار نہ ہوں۔ میں ایک سوال کا جواب بھی نہیں دوں گا۔ لاہور میں جب میری پریس کانفرنس ہو گی تو آپ کے ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔"

اس نے کچھ سبکی محسوس کی کیونکہ وہ ایک بڑے اخبار کا بڑا نامور صحافی تھا۔ "آپ میری توہین کر رہے ہیں۔"

"توہین کرانے کے لیے آپ خود تشریف لائے تھے۔ میں نے آپ کو زحمت کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ الٹا آپ نے میری پرائیویسی کو ڈسٹرب کیا۔"

وہ تلخی سے بولا "آپ جہاز میں بیٹھے ہیں۔ اپنے بیڈ روم میں نہیں ہیں۔"

میں نے کھڑے ہو کے کہا "اب آپ جاتے ہیں یا میں اسٹیورڈ سے کہوں کہ آپ کو راستہ دکھائے۔"

میری اس کی گفتگو بہت لوگوں نے سنی تھی اور کچھ زیرِ لب مسکرانے لگے تھے۔ صحافی سخت جز بز ہوا اور پیر پٹختا دھمکی دینے کے انداز میں گھورتا ہوا واپس چلا گیا۔ اسے میں نے ہر پریس کانفرنس میں دیکھا تھا۔ وہ سب سے اگلی صف میں ہوتا تھا اور خود کو بڑا طرم خاں سمجھتا تھا۔

ڈاکٹر شبانہ نے کہا "اب یہ آپ کے خلاف لکھے گا۔"

"لکھا کرے۔ اس جیسے بہت ہیں جنہوں نے بہت لکھا میرے خلاف مگر کتے بھونکتے رہتے ہیں قافلہ چلتا رہتا ہے۔ اب یہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ میں سیاست کے میدان میں کوئی نو آموز نہیں ہوں۔ میرے مخالفین سے میرے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

جہاز کراچی کے ائرپورٹ پر اترنے لگا تو شبانہ نے مجھے اپنا کارڈ دیا اور میں نے اسے اپنا "ویسے تو آپ بہت مصروف ہوں گے۔ الیکشن سر پر ہیں لیکن کبھی ضرورت پڑے خدانخواستہ ہماری۔"

میں نے کہا "خدانخواستہ مت کہیں۔ آپ کی کمپنی اچھی رہی۔ اگر میں آیا تو علاج کرانے نہیں آؤں گا۔"

وہ ہنسی "میں اتنی بری ڈاکٹر بھی نہیں ہوں۔ میں نے نیورولوجی میں اسپیشلائز کیا ہے۔"

میں نے کہا "آپ ڈاکٹر کمال کو ضرور جانتی ہوں گی۔"

"وہ کمال کلینک والے؟"

میں نے کہا "کمال کلینک اب کمال کا اسپتال ہے۔ کمال میرا بچپن کا دوست ہے اور میں اس کے ساتھ اسپتال کی توسیع کے پروگرام میں پوری طرح شریک ہوں۔ ہم اسے ایک مثالی اور بہت بڑا ویلفیئر اسپتال بنانا چاہتے ہیں۔ میری بہن قمر کی شادی بھی ڈاکٹر کمال سے ہوئی تھی۔ چندا بھی کمال کے مشن میں شریک ہے۔"

وہ بولی "خواہش تو میری بھی ہے کہ ایسے ہی کسی پروجیکٹ کے لیے کام کروں لیکن ۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"شادی کے بعد مجھے عمران کو ESTABLISH کرنے کے لیے اس کے ساتھ کام کرنا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ میں خود مالی دباؤ سے آزاد ہوں۔ میرے والد اچھے بڑے بزنس مین ہیں اور میں ان کی بیٹی ہی نہیں پارٹنر بھی ہوں۔ عمران کا خیال نہ ہوتا تو میں ایک ویلفیئر اسپتال میں بلامعاوضہ کام کر سکتی تھی۔"

میں نے کہا "یہ آپ نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ اسپتال میں جو ڈاکٹر ہیں انہیں ہم کچھ نہیں دیتے۔ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ ہم انہیں سرکاری اسپتالوں کے گریڈ سترہ اٹھارہ سے زیادہ ہی دیتے ہیں اور ان کے پرائیویٹ پریکٹس کرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ اس سے اسپتال کا شیڈول خراب نہ ہو۔ بات یہ ہے مس شبانہ کہ زندگی کے حقائق بالآخر جذباتی اندازِ فکر پر غالب آجاتے ہیں۔ باعزت طور پر اور آسائش کی زندگی کے لیے پیسے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

اس نے سر ہلایا "یہ بات ہے تو میں سوچوں گی۔"

"آپ کو کہنا چاہیے کہ ہم سوچیں گے۔"

وہ مسکرائی "میں عمران کی بات نہیں کروں گی۔ اس کی سوچ الگ ہے۔ وہ اس پیشے میں لاکھوں کمانا چاہتا ہے۔ دولت اس کے لیے مقصدِ حیات' منتہائے نظر اور ایک چیلنج ہے۔ تو یہ اس کے حالات کا ردِعمل ہے۔ دولت میرے لیے کوئی ضرورت نہیں۔ بس ایک عادت ہے بچپن سے۔ میں ابھی COMMIT نہیں کر رہی ہوں لیکن میں آؤں گی آپ سے ملنے اور کمال کا اسپتال دیکھنے۔"

میں نے اس سے مصافحہ کیا "نائس میٹنگ یو۔ ہم

اسپتال کے توسیعی منصوبے میں تمہیں خوش آمدید کہنے کا انتظار کریں گے۔ تمہاری فلائٹ کب ہے؟"

وہ بولی "دو گھنٹے بعد۔"

میں نے کہا "مجھے چھ گھنٹے انتظار کرنا ہے۔ خدا حافظ!"

باہر نکلنے میں مجھے بالکل دیر نہیں لگی۔ ہر غیر اہم مسافر کو قواعد و ضوابط کی مار سے پریشان کرنے اور مشکل میں ڈالنے والے امیگریشن اور کسٹم کے حکام پوری طرح مستعد تھے اور مشکل کو آسان بنانے کی پوری قیمت وصول کر رہے تھے لیکن میرے پاس ڈپلومیٹک پاسپورٹ تھا۔ میں سارے سامان کے ساتھ گرین چینل سے گزرتا چلا گیا اور کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

باہر آنے والے راستے کے مقابل ریلنگ کے دونوں طرف سیکڑوں مرد، عورتیں اور بچے جمع تھے۔ کچھ لوگ لندن سے آنے والے اجنبی مسافروں کو پہچانتے نہیں تھے اور ان کے لیے بلے کارڈ اٹھائے کھڑے تھے جن پر مسافروں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ یہ زیادہ تر کمپنیوں کے نمائندے اور ہوٹلوں کے ایجنٹ تھے۔

مجھے کسی دوست آشنا کے ملنے کی بالکل امید نہیں تھی چنانچہ میں چشم براہ لوگوں کی قطار کے درمیان سے سیدھا گزرتا چلا گیا۔ میں باہر نکلا ہی تھا کہ اچانک کسی نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا اور میں نے ایک برسوں کی جانی پہچانی آواز میں ایک گالی سنی۔

"سالے بھوتنی کے۔ کانا ہے یا اندھا؟"

اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو رئیس کو دیکھ کے بھونچکا رہ گیا "ابے تو۔ الو کے پٹھے۔ قسم خدا کی میں نے پہچانا نہیں تجھے۔" میں نے اس کے گلے لگ کے کچھ اور گالیاں دیں۔

"یہی ہوتا ہے ولایت سے لوٹ کے۔ آنکھوں میں فرق آجاتا ہے پیارے!" رئیس ہنسنے لگا "خون سفید ہوجاتا ہے۔"

میں نے کہا "بکواس مت کر۔ تیرا تو حلیہ بدل گیا ہے۔ یہ سب کیا ہے آخر؟"

رئیس شرمانے لگا "ابے یار۔ بس ایسے ہی، ہمیں تو جانتا ہی ہے تو۔ کبھی پروا نہیں کی۔ جو ملا پہن لیا اور یہ سالا ولایتی لباس پہننے کا تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔"

میں نے اس کے ایک مکا رسید کیا "لیکن نیلم نے کہا کہ اب یہی پہننا پڑے گا تو پہن لیا تو نے کوٹ پتلون۔ ٹائی بھی باندھ لی۔ وہ کہتی ننگے پھرو تو ننگا پھرتا تو؟"

اس نے مجھے اپنے ساتھ کھینچ لیا "یار کیوں تماشا بنا رہا ہے یہاں سب کے بیچ میں۔ یہاں سے چل، سب لوگ ہنس رہے ہیں۔"

میں نے کہا "نیلم کہاں ہے؟"

"وہ اوپر بیٹھی ہے، ریسٹورنٹ میں۔ یہاں آتی تو مجمع لگ جاتا" رئیس نے سامان کی ٹرالی لے جانے والے پورٹر کو روک لیا۔

میں نے کہا "اچھا میری بات سن۔ میری لاہور کی کنکٹ کرنے والی فلائٹ ہے چھ گھنٹے بعد۔ میں ائرپورٹ ہوٹل چلتا ہوں۔ یہاں ٹرانزٹ لاؤنج میں تو چھ گھنٹے گزار نہیں سکتا تھا اس لیے باہر آگیا تھا۔ مگر تو بتا، تو کیسے آگیا یہاں؟"

"ابے تو نے خود ہی تو کہا تھا۔"

"مگر میں نے تو کسی کو فلائٹ نمبر نہیں بتایا تھا" میں نے کہا۔

"وہ سوئی نے بتادیا۔"

میں نے اسے گالی دی "پھر سوئی۔ تو مروادے گا، ابھی وہ بیٹی ہے 'قرۃ العین... مسز عاقل!"

"ہمیں ویسے بھی کراچی آنا تھا۔ آج رات کی فلائٹ پکڑنے کے لیے۔"

میں رک گیا "تم دونوں لندن جا رہے ہو؟"

رئیس نے سرہلایا "ہاں یار۔ پروگرام پہلے سے تھا۔ تو رک جاتا وہاں دو چار دن۔"

میں نے کہا "نہیں رئیس! ایک ایک دن بھاری تھا مجھ پر۔ میں آیا نہیں فرار ہوا ہوں لندن سے ورنہ اندر ہوجاتا بیٹے۔"

وہ بولا "اچھا تو چل۔ میں [illegible] کے ساتھ ہوٹل آتا ہوں۔"

میں رئیس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ دو مہینے میں اس کی شخصیت ایک ناقابلِ یقین انقلاب سے دوچار ہوئی تھی۔ اس کی صحت بہتر ہوئی تھی اور رنگ بھی کچھ صاف ہوگیا تھا لیکن سب سے بڑی تبدیلی گیٹ اَپ کی تھی۔ اس کو میں نے زندگی میں کبھی پتلون پہنے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شلوار قمیص بھی بہت خراب انداز میں پہنتا تھا مگر اس وقت وہ ٹراپیکل سوٹ میں تھا اور لائٹ براؤن سوٹ کے ساتھ اس نے لائٹ بلیو شرٹ پر ڈارک براؤن ٹائی بڑی نفاست سے باندھ رکھی تھی۔ اس کی قربت میں ہمیشہ پسینے اور میل کی بو آتی تھی مگر آج وہ شینل نمبر فائیو کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

یہ انقلاب بڑا نظر فریب لگتا تھا مگر یہ محبت کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ محبت سب کچھ کرسکتی ہے اور کرا سکتی ہے۔ وہ فرہاد سے پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکلوا سکتی ہے تو رئیس کو بھی فیشن میں اَپ ٹو ڈیٹ کرا سکتی ہے۔ وہ قیس کو خاک بسر مجنوں بنا سکتی ہے تو رئیس جیسے گاؤدی کو جنٹلمین بنا سکتی ہے۔

جتنی حیرانی مجھے رئیس کی حالت کے ظاہری تغیر پر تھی اس سے کہیں زیادہ نیلم کے جذباتی انقلاب پر تھی۔ کہاں وہ عورت جس کے آستانۂ حسن پر سجدہ ریز ہونے کے لیے ایک عالم خوار ہوتا تھا۔ جس کے پرستاروں میں ایک سے بڑھ کر ایک وجیہہ و شکیل، صاحبِ کمال اور دولت مند مرد شامل تھے مگر جس کی نگاہِ انتخاب پر ایک بھی پورا نہ اترپایا تھا، اس کی نظر نے بالآخر کسے پسند کیا۔

میری حیرت میں حسد کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ افسوس کے جذبات نہیں تھے اور کسی کے لیے ترحم کے احساس کو دخل نہیں تھا۔ یہ بڑی خوش آئند اور پُرمسرت خیالات کی حامل حیرت تھی۔ رئیس کے ساتھ میری رفاقت کی عمر کچھ زیادہ تھی [illegible] نیلم کو بھی دس سال سے اسی طرح جانتا تھا جیسے [illegible] کو۔ دس سال پہلے جب دیوانگی اور خود فراموشی کے [illegible] میں، میں اس کی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا تو میں ایک [illegible] زمانے کا ٹھکرایا ہوا اور بے نام و نمود نوجوان تھا اور [illegible] وقت بھی فلمی دنیا کا ایک درخشندہ ستارہ ہونے کی وجہ [illegible] لاکھوں دلوں پر حکومت کرتی تھی مگر اسے میری بے ریا اور بے طلب خلوص نے اتنا متاثر کیا تھا کہ اس نے مجھے [illegible] لیا تھا۔ آج برسوں بعد یہی رئیس کے ساتھ ہوا تھا۔

[illegible] نانو نے مرتے وقت مجھے وصیت کی تھی کہ میں اسے [illegible] نیلم سے شادی کرلوں اور اپنی دانست میں اس نے [illegible] مستقبل کو بھرپور تحفظ فراہم کرنے کا سوچا تھا لیکن جذبات کے دھارے کا رخ بدلنا میرے بس کی بات نہ [illegible] اور یہ بات نیلم بھی اچھی طرح سمجھتی تھی۔ نیلم سے محبت میں ہوس کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ اس محبت میں عزت [illegible] عقیدت تھی۔ میں نے کبھی اسے اس نظر سے دیکھا [illegible] تھا جس نظر سے مرد کسی عورت کو دیکھتا ہے اور اس [illegible] لاکھوں چاہنے والے اسے دیکھتے تھے۔ وہ میرے لیے ایک [illegible] دوست تھی۔ غم گسار تھی، خیر خواہ تھی۔ جائے پناہ تھی [illegible] تحفظ کی ضمانت تھی۔ اس کا گھر میرا گھر تھا اور میں کامل [illegible] کے ساتھ اس کی ہر چیز کو اپنا سمجھ سکتا تھا۔

میں آج بھی یہ طے کرنے سے قاصر ہوں کہ اگر میں [illegible] کی خواہش کے احترام میں نیلم سے شادی کی درخواست [illegible] تو اس کا ردعمل کیا ہوتا لیکن وہ مجھے اپنا لیتی تو میری زندگی میں سکون ہی سکون ہوتا۔ عافیت ہی عافیت ہوتی اور ایک انمول، لازوال اور مکمل محبت ہوتی۔ پھر وہ سب نہ ہوتا جو میری اس سرگزشت کا باعث ہوا۔

اب اس نے رئیس کو قبول کرلیا تھا تو جیسے مجھے اپنا لیا تھا۔ میں یہ محسوس کرسکتا تھا کہ نیلم کی زندگی کے ادھورے پن کی تکمیل رئیس اسی انداز میں کرے گا جیسے رئیس کی نامکمل شخصیت کی تکمیل نیلم سے ہوگی۔ انہیں دستِ قدرت نے ایک دوسرے کے لیے ناگزیر کردیا تھا مگر آشنائی کے مراحل سے گزر کے اپنائیت کی منزل تک پہنچنے کے لیے انہیں اسی طرح برسوں ساتھ چلنا تھا۔ اس وقت کی طرف جو بالآخر انہیں ملانے والا تھا۔ اور وقت کا وہ ناگزیر لمحہ بالآخر آگیا تھا۔

مجھے چند گھنٹوں کے لیے ائرپورٹ ہوٹل کا ایک کمرا دے دیا گیا جہاں میں نہا دھو کے آرام کرسکتا تھا اور لنچ کرسکتا تھا۔ ابھی میں نے جوتے اتارے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور نیلم اندر آگئی۔

میں آگے بڑھا اور اس نے مجھے گلے لگالیا "تم آگئے بالآخر!"

رئیس مسکراتا رہا "نہ آتا تو سالا کہاں جاتا؟"

نیلم نے اسے پلٹ کے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ میں نے اسے اپنے مقابل ایک صوفے پر بٹھادیا "کیسی ہو تم؟"

"تمہیں کیسی لگ رہی ہوں؟" وہ مسکرائی۔

"بہت اچھی۔ جیسی ہمیشہ لگتی ہو۔ ویری بیوٹی فل!"

"مگر تم نے اپنا حلیہ کچھ بدل لیا ہے۔ یہ مونچھیں اور یہ خشخشی داڑھی، یہ ہیئر اسٹائل!"

میں نے کہا "یہ لندن سے وطن واپس آنے والے شاہ عالم کا گیٹ اپ ہے۔ مگر جو تم نے کیا ہے، وہ واقعی کمال ہے۔"

وہ حیرانی سے بولی "میں نے کیا کیا ہے؟"

میں نے رئیس کی طرف اشارہ کیا "تم [illegible] کیا ہے کہ اس جانور کو انسان بنادیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تم نے مجھے بنایا تھا۔"

وہ ہنسنے لگی "رئیس اب میرا سیکریٹری ہے۔"

میں نے شرارت سے پوچھا "صرف سیکریٹری؟ سیکریٹری تو پہلے بھی ایک تھا۔"

نیلم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا "ہاں، میں نے بتایا تو تھا تمہیں کہ اس نے کیسے دھوکا دیا مجھے۔ اتنا اعتبار تھا مجھے اس پر۔"

میں نے کہا "اب تم اس پر اعتماد کی غلطی کر رہی ہو؟"

رئیس ہنسنے لگا "یہاں تو کچھ بھی کہہ لے پیارے۔ سب کے سامنے کچھ مت کہنا اور زیادہ فری بھی مت ہونا۔ اپن گھاس نہیں ڈالتے کسی کو۔"

نیلم نے کہا "سفر کیسا رہا؟"

میں نے کہا "بہت اچھا۔ اب یہ بتاؤ کہ چائے پیو گی یا کافی؟"

وہ بولی "ریسٹورنٹ میں کافی منگوائی تھی میں نے مگر پی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا تم روم سروس کو آرڈر دو۔ میں ذرا نہا کے کپڑے بدل لوں۔ بس پانچ منٹ۔ کھانے میں تو ابھی دیر ہے۔"

"مگر مجھے بھوک لگی ہے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "بھوکا تو میں بھی ہوں۔"

"میں سینڈوچ منگوالیتی ہوں" نیلم نے کہا اور فون کرنے اٹھی۔

میں نے کہا "تم کیوں تکلیف کرتی ہو۔ یہ سیکریٹری حرام خور کیا مفت کی روٹیاں توڑنے کے لیے رکھا ہے۔" میں نے جاتے جاتے کہا۔

نیلم نے صوفے پر نیم دراز رئیس کی طرف دیکھا اور زیرِ لب مسکرانے لگی۔ مگر وہ اک نظر جو بظاہر نگاہ سے کم تھی بہت کچھ کہہ گئی.... کہ سیکریٹری تو یہ دنیا کے سامنے ہے' یہاں رئیس کی حیثیت کیا ہے' یہ میرے دل سے پوچھو۔ یہاں وہ میری محبت بھی ہے اور میرا محبوب بھی ہے۔ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد۔ یہی تو محبت کی کرشمہ سازی ہے۔

نہاتے ہوئے میں حالات کی اس کروٹ پر حیران ہوتا رہا۔ ایک وقت تھا جب رئیس اسی طرح مجھ پر رشک کرتا تھا کیونکہ شارو مجھ سے محبت کرتی تھی جو اس کے لیے معبود نہ سہی کسی آسمانی مخلوق سے کم تر نہ تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ شارو جیسی شاہزادی مجھ فقیر پر فریفتہ ہے۔ آج صورتِ حال پھر ویسی ہی تھی لیکن رئیس کی جگہ میں نے لے لی تھی۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ایک نگاہِ التفات کے طلب گار' سیکڑوں ہزاروں پرستاروں میں جو وصل کی ایک ساعتِ نایاب کے عوض نذرانۂ جان دینے کے لیے تیار تھے' اسے ایک بھی گلفام خوابوں کا شاہزادہ نہ ملا کہ اس نے سب ہیرے موتی ٹھکرا کے سنگِ راہ جیسے رئیس کا انتخاب کرلیا مگر جیسا کہ شاعر نے فرمایا ہے۔ شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ۔ میں نے اپنے آپ سے اعتراف کیا کہ میرے جذبات میں رشک کا پہلو غالب ہے۔ مجھے چندا کی محبت ملی تھی۔ شبنم نے چاہا تھا' جولی مجھ پر مرمٹی تھی اور اپنے آپ کو بھولنے کے لیے پہلے روشنی نے مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھ لیا تھا مگر ان میں ایک بھی نیلم کی حیثیت' عزت اور شہرت کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی اور پھر خود میں کیا کسی سے کم تھا۔ رئیس کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ صورت' نہ سیرت۔ نہ عزت اور رتبہ' نہ تعلیم اور نہ تہذیب مگر اسے نیلم نے عقل کی کسی دلیل کے بغیر صرف چاہت کی کسوٹی پر پرکھا تھا اور پسند کرلیا تھا مگر یہ پسند پہلی نظر کا اعجازِ محبت نہیں تھی۔ نیلم نے جو کچھ کیا وہ دنیا کے نزدیک ایک جذباتی حماقت ہوسکتی تھی مگر خود نیلم کے لیے یہ ایک سوچا سمجھا فیصلہ تھا۔ وہ رئیس کو بھی اس وقت سے جانتی تھی جب سے مجھے اور دس برس تک اسے بہت قریب سے دیکھنے کے بعد اگر نیلم نے خود کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو یہ فیصلہ عقل کی ساری تائید رکھتا تھا۔

رئیس کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ وہ میرا دوست تھا اور مجھے اس کی دوستی پر ناز تھا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ دربدری میں تمام عمر بھٹکتے رہنے کے بعد بالآخر اسے اپنے خوابوں کی منزل مل گئی ایک زمانہ تھا کہ وہ راہ چلتی ہر دو سو پاؤنڈ کی لڑکی پر ہزار جان سے فریفتہ ہو جاتا تھا اور ان کے عشق میں اس مقام تک پہنچ جاتا تھا جہاں لگتا تھا کہ وہ جان سے گزر جائے گا لیکن یہ لڑکیاں جن کے نام وہ دل لگی میں بالوشاہی' رس ملائی' برفی اور چم چم رکھ دیتا تھا' کچھ عرصہ اس کی منگیتر کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد اسی طرح غائب ہوجاتی تھیں جیسے اس کی زندگی میں نمودار ہوئی تھیں۔

صرف سونی وہ واحد لڑکی تھی جس کے عشق میں وہ بے حد سنجیدہ ہوگیا تھا اور خود سونی نے جواب عینی بن چکی تھی' اس کے جذبات کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی لیکن سونی کی زندگی میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ وہ اپنے وجود میں ایک بے قرار اور تغیر پسند روح رکھتی تھی اور اس کی نظر ستاروں سے آگے دیکھتی تھی۔ وہ ہر منزل کو سنگِ میل کی طرح پیچھے چھوڑ سکتی تھی اور عاقل کو پانے تک اسی خیال پر عمل پیرا تھی کہ ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔

چنانچہ رئیس کو جو میری طرح لاوارث اور بے نسب تھا اور جو یتیم خانے کا پروردہ تھا۔ جو جیب تراش' چور اور جرائم پیشہ رہا تھا۔ جو ہسٹری شیٹر تھا اور بدمعاشی میں اپنے کام پر فخر کرتا تھا۔ جو تہذیب' تعلیم اور شائستگی کے آداب سے

نابلد تھا۔ جس کی اعلیٰ سوسائٹی میں نہ پہنچ تھی اور نہ عزت۔ جو صورت شکل کے معاملے میں ہمیشہ احساسِ کمتری کا شکار رہا۔ اسے نیلم نے ذلت کی پستی سے اٹھا کے اپنی چاہت کے آسمان کی بلندی تک پہنچادیا تھا۔ اسی نیلم نے جو حسن میں یگانۂ روزگار تھی۔ جس کے شباب کی کشش لاکھوں دلوں کی دھڑکن کو گرماتی تھی' جو فلمی افق کا سب سے درخشندہ ستارہ تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باذوق تھی لیکن ایسا تو شاید نوشتۂ تقدیر تھا اور اٹل تھا۔ اور جیسا کہ عقیدہ ہے زن کا جوڑا آسمانوں پر ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا گیا تھا چنانچہ اب دنیا کا واویلا کرنا یا اسکینڈل بنانا اور نیلم کی عقل پر ماتم کرنا اور رئیس کی قسمت پر حسد محسوس کرنا لاحاصل تھا اور بے سود۔ مگر متوقع تھا۔

میرے باتھ روم سے برآمد ہونے تک کافی آگئی تھی اور رئیس خان نے سینڈوچ کی پلیٹ میں صرف ایک میرے لیے چھوڑا تھا۔ اس نے کوٹ ٹائی اور جوتے اتار کے پھینک دیے تھے اور اب ایک صوفے کے بازو پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا۔

میں نیلم کے سامنے بیٹھ گیا "تم نے کافی نہیں پی۔"

"میں تمہارا انتظار کر رہی تھی" وہ بولی۔

میں نے سینڈوچ اٹھالیا "تمہاری فلائٹ کب ہے؟"

"آج رات بارہ بجے" وہ کافی بنانے لگی۔

میں نے کہا "اور ٹھہری کہاں ہو تم؟"

"شیرٹن میں" اس نے مجھے کافی دی "تم اکیلے آئے ہو؟"

میں نے جانتے بوجھتے سرسری لہجے میں کہا "ہاں۔"

نیلم نے پُرسکون رہتے ہوئے کافی کا ایک گھونٹ لیا "تم ایک مدد بیوی کے ساتھ آرہے تھے۔"

میں نے کہا "کیا عینی نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"بے اس نے تو بتایا ہے سالے مگر تو بھی کچھ بول۔" رئیس نے بھنا کے کہا "جھک مارنے گیا تھا تو ولایت الو کے پٹھے۔ مصیبت ڈال دی سب کو۔"

نیلم خاموش ہوگئی۔ ہم سب ایک بوجھل خاموشی میں ڈوبے رہے اور روشنی کے بارے میں سوچتے رہے۔ پھر نیلم نے کہا "ناصر یہ ... سب اچھا نہیں ہوا۔ جو بھی لندن میں ہوا۔ مجھے اندازہ ہوتا تو میں تمہیں جانے ہی نہ دیتی۔"

میں نے خفگی سے کہا "اور مجھے معلوم ہوتا کہ یہ سب ہوگا تو کیا میں جاتا لیکن میرے جانے کا مقصد کچھ اور تھا۔"

نیلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں۔ تمہیں اب ثابت کرنا تھا کہ شاہ عالم زندہ ہے اور لندن میں ہے۔ خوب ثابت کیا تم نے۔"

میں نے کہا "طنز کر رہی ہو مجھ پر؟"

وہ بولی "کیا ملے گا مجھے تم پر طنز کرکے۔ تمہاری لندن کی مصروفیات کا سارا کچا چٹھا یہاں کے اخباروں نے بڑھا چڑھا کے شائع کیا۔ میں نے سب پڑھا۔"

"وہاں جو کچھ بھی ہوا' اس میں میری مرضی کو دخل بہرحال نہیں تھا۔"

رئیس بولا "یہاں تو ایسا لگتا تھا پیارے جیسے وہاں تیرے سوا کوئی ہیرو ہی نہیں' ہر واردات میں تیرا نام ... ہر جگہ تو موجود!"

میں نے کہا "ایسی بات نہیں ہے رئیس۔ لندن میں سیکڑوں جرائم ہوتے ہیں روزانہ مگر ان کی خبر پاکستان کے کسی اخبار میں شائع نہیں ہوتی۔ ہو بھی نہیں سکتی مگر مجھ سے منسوب خبریں وہاں سے بطورِ خاص ارسال کی جاتی تھیں اور یہاں شبنم اپنے مراسم کی مدد سے انہیں تمام اخبارات میں نمایاں طور پر شائع کراتی تھی۔"

"بڑی شہرت ہوئی شاہ عالم کے نام کی۔ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا" نیلم نے کہا۔

"میں بھی نیک نامی نہیں چاہتا تھا۔ اور بدنامی کی تشہیر ہوئی تو برا کیا ہوا۔ اب شاہ عالم پہلے سے زیادہ مردودِ خلائق ہے۔ وہ مرجائے گا تو لوگ کہیں گے خس کم جہاں پاک۔ وہ نیک نامی کما کے آتا تو اسے پرانے پارٹی ورکر اور مفاد پرست پھر گھیر لیتے اور اس کی سیاست کی دکان پھر چمک اٹھتی لیکن اب کوئی اسے کیوں خوش آمدید کہے گا۔ الیکشن سر پر ہیں۔ اس کے مخالفین شاہ عالم کی بدنامی کو EXPLOIT کرسکتے ہیں۔ ملکی سیاست سے وہ پہلے ہی باہر تھا۔ اب اس کے آنے سے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوگی۔"

"مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ بتاؤ' اب تم کیا کروگے؟" نیلم نے پوچھا۔

میں نے کہا "وہی جو پہلے سے طے تھا۔ شاہ عالم کے وجود کو لوحِ جہاں سے حرفِ مکرر کی طرح مٹانے کے بعد باقی رہے گا صرف میرا نام۔ ناصر عظیم کے مستقبل کو شاہ عالم کے آسیب سے نجات مل جائے گی۔"

اس نے افسوس سے سرہلایا "یہ تو پتا نہیں کہ کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ مگر ناصر' خدا کے لیے اب یہ منحوس شیطانی کھیل ختم کرو۔ بس ایک

زندگی جیو جو تمہاری اپنی ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں یہ دہری زندگی اپنی مرضی سے نہیں جی رہا تھا۔ میں ناصر عظیم تھا اول و آخر۔ مجھے کوئی شوق نہیں تھا شاہ عالم بننے کا۔ لیکن کچھ لوگوں نے میری اور شاہ عالم کی صورتوں میں ایک ناقابلِ یقین مشابہت دیکھی تو انہوں نے مجھے ڈپلی کیٹ کے طور پر استعمال کرنے کے لیے اغوا اور بلیک میل کیا۔ اپنا مطلب نکالنے کے بعد وہ ڈپلی کیٹ کو ضائع کردیتے لیکن میری اور ان کی بدقسمتی کہ نقل کے دھوکے میں اصل کو ضائع کردیا گیا۔ میں شاہ عالم کا کردار ادا کرنے پر مجبور ہوا تو ناصر عظیم نہ رہا۔ اس سے مجھے دہرا نقصان ہوا۔ میں ایک طرف ان سب حقیقی رشتوں سے محروم ہوگیا جو میرے اپنے تھے اور شاہ عالم کی ساری رسوائیاں اور اس کی زندگی کے سارے خطرات میرا مقدر ہوگئے۔ شاہ عالم مرچکا تھا مگر میں مجبور تھا کہ اسے جھوٹ سے زندہ ثابت کروں۔ کتنا سخت' پُرعذاب وقت گزارا ہے میں نے... کہ ایک طرف خان جی' چندا' قمر مجھ سے برگشتہ ہوگئے۔ تو دوسری طرف نہ چاہنے کے باوجود مجھے وہ سب کرنا پڑا جو شاہ عالم کرتا تھا۔ اور میں شاہ عالم کے رول میں اس لیے ناکام رہا کہ میں شاہ عالم نہیں تھا پھر اپنی جان بچانے کے لیے میں نے روپوشی اختیار کی اور یہ مشہور کیا کہ شاہ عالم فرار ہو کے لندن چلا گیا ہے لیکن اس کے باوجود مجھے دوبارہ ناصر عظیم بننے کے لیے کیسی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ قدرت کا کیا عجیب کھیل تھا۔ جب شاہ عالم ماردیا گیا تھا تو ناصر عظیم کو زندہ رہنے کے لیے دنیا کو قائل کرنا پڑا کہ شاہ عالم زندہ ہے ورنہ اسے بھی ماردیا جاتا اور آج جب دنیا نے تسلیم کرلیا ہے کہ شاہ عالم مرا نہیں تھا تو مجھے' ناصر عظیم کو اپنی زندگی پر سے اس کا تسلط ختم کرنے کے لیے اور اپنی زندگی بے خوف و خطر جینے کے لیے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ شاہ عالم مرگیا ہے۔ لیکن میں پہلے بھی بے بس تھا اور آج بھی مجبور ہوں۔ میں ایسا نہ کروں تو کیا کروں؟ شاہ عالم زندہ رہے گا تو سمجھنے والے ناصر عظیم کو بھی شاہ عالم سمجھتے رہیں گے۔ میں کہاں کہاں کس کس کو قائل کروں گا کہ میں شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہوں۔ میں اس کے نام کی رسوائیوں سے' اس کے دشمنوں سے' اس کے غیر قانونی کاروبار سے اور اس کے ماضی کے سارے رشتوں سے نجات چاہتا ہوں۔ اس کا اور کوئی طریقہ نہیں نیلم۔ سوائے اس کے کہ جس شدومد کے ساتھ میں نے خود کو زندہ اور حقیقی شاہ عالم ثابت کیا تھا' اس سے زیادہ شور ہنگامے کے ساتھ میں شاہ عالم کو ماردوں۔ ایک بار پھر دفنادوں۔ تاکہ ناصر عظیم کے مستقبل کو تحفظ حاصل ہوجائے۔ پھر کوئی اسے دیکھے تو یہ خیال نہ آئے کہ وہ شاہ عالم ہے۔ دیکھنے والا خود مان لے کہ یہ کوئی اور ہے جس کی صورت میں اتفاق سے شاہ عالم کی مشابہت ہے۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد نیلم نے کہا "یہ کام کیسے ہوگا ناصر! میں تو سوچ سوچ کے پریشان ہوجاتی ہوں۔ یہاں شبنم نے خوب ڈھول پیٹا ہے کہ شاہ عالم واپس پاکستان آرہا ہے۔ وہ اپنی سیاسی جماعت کو پھر فعال کرے گا۔ الیکشن لڑے گا اور اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی کے ساتھ مل کے حکومت میں شامل ہوجائے گا۔ یہاں تمہارے پرانے وفادار ساتھی اور مطلب پرست دوست دونوں ہی تمہاری آمد کے منتظر ہیں۔"

"مگر یہاں تو مجھے ریسیو کرنے کوئی نہیں آیا؟"

"تم لاہور پہنچو گے تو پتا چلے گا کہ اب تمہارے ساتھ کتنے لوگ ہیں۔ لیکن ناصر بچ کے رہنا۔ پہلے کے مقابلے میں اب تمہارے دشمن بہت ہیں اور زیادہ خطرناک بھی ہیں۔"

میں نے کہا "چند دن میں شاہ عالم کا کھیل ختم ہوجائے گا۔"

"لیکن کیسے... مجھے بھی تو بتاؤ۔"

میں نے کہا "تم جان کے کیا کروگی۔ تم جاؤ لندن' عینی سے ملو۔ دیکھو وہ کتنی خوش ہے گھر بسا کے۔ وہ کتنی احسان مند ہے تمہاری کہ تم نے اسے ایک نئے نام کے ساتھ نئی زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیے۔"

"سب کہنے کی بات ہے۔ مواقع اس کو قدرت نے فراہم کیے۔"

"لیکن قدرت نے وسیلہ تمہیں بنایا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بار تم نے میری دستگیری کی تھی۔"

وہ ہنسنے لگی "کیسے الفاظ استعمال کرتے ہو تم۔ میں کیا دستگیری کروں گی کسی کی۔ ہاں ایک اخلاقی ذمے داری آگئی تھی مجھ پر۔ خدا نے مجھے نبھانے کی توفیق دی۔"

میں نے کہا "یہ حقیقت ہے نیلم کہ ایک اس وقت جب شادو سے جدائی کے غم نے مجھے پاگل کردیا تھا۔ اور میں تمہاری گاڑی سے ٹکرا گیا تھا' اس وقت تم نے مجھے سہارا نہ دیا ہوتا تو نہ جانے میرا انجام کیا ہوتا۔ پھر دوسرا موقع اس وقت آیا جب شادو ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ گئی تھی' تم نے مجھے مرنے نہیں دیا۔ اور دس سال بعد تم نے سونی کو وہی تحفظ فراہم کیا۔"

وہ بولی "چھوڑو پرانی باتیں ناصر' جو ہونا تھا ہوگیا۔"

میں نے کہا "لیکن تم نے پھر ایک یتیم کو گود لے لیا ہے۔"

"میں نے؟"

"ہاں' ایک ہی دوست تھا میرا' وہ بھی چھین لیا تم نے۔"

وہ مسکرانے لگی "بھئی چھینا کچھ نہیں ہے۔ تمہارا دوست سیکریٹری تو آج بنا ہے میرا لیکن اسے میں جانتی تو دس سال سے تھی۔ جب سے تمہیں جانتی ہوں' بڑی مشکل سے قابو کیا ہے اسے۔"

"یہ کوئی پاگل کتا ہے یا جن بھوت ہے؟"

رئیس سوتے سوتے اٹھ بیٹھا "یہ ٹھیک ہے پیارے۔ جنگلی جانور ہی تو ہیں ہم۔ انسانوں میں رہنا کب نصیب ہوا۔ نہ تمیز' نہ تہذیب۔ نیلم نے جب مجھ سے کہا کہ وہ حرامی عبدالرحمان بھاگ گیا ہے غبن کرکے اور تم میرے سیکریٹری بن جاؤ تو قسم اللہ کی' میں سمجھا نیلم مذاق کررہی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کیا کہہ رہی ہو۔ ہم نے اسکول کالج کی شکل نہیں دیکھی۔ بس یتیم خانے میں پڑھ لیا تھا ساتویں تک۔ روبیٹ کے بعد میں میٹرک کیا۔ ہم یہ کام کیسے کرسکتے ہیں؟"

"میں نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ یہ کام کرسکتا ہے۔ دراصل تمہارے دوست کی دس عادتیں بگڑی ہوئی ہیں تو دس ایسی خوبیاں بھی ہیں اس کی فطرت میں جو انمول ہیں۔ اس کی نیک نیتی' اس کا خلوص' ایمانداری۔"

"میری اس سے دوستی بے سبب تو نہیں۔"

رئیس شرمانے لگا "کام تو پیارے کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ جب نیلم نے اپنے معاملات ہمارے سپرد کردیے تو ہم نے بھی کہا کہ بس اب آپ کو کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اندر باہر کے سب کام میں نے سنبھال لیے۔ گھر میں ایک بانو خالہ ہیں۔ نوکر سالے ان کے قابو میں نہیں تھے۔ میں نے ایک ایک کا دماغ درست کردیا۔ سب حرام خوری بھول گئے۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ جب سے رئیس نے میرے معاملات کی ذمے داری قبول کی ہے میں بہت پُرسکون ہوگئی ہوں۔ آخر کیا فرق ہے تم میں اور رئیس میں۔ دونوں کی ایک ہی نیچر ہے۔"

"جیسی روح ویسے فرشتے" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی "میں نے کہا کہ جب تم نے اندر باہر کے کام سنبھال لیے تو اب میں تمہیں سنبھالوں گی۔ تمہاری ساری بُری عادتیں چھڑادوں گی۔ تمیز' تہذیب سب سکھادوں گی۔ تم نے فرق محسوس کیا۔ کتنے ڈھنگ کے کپڑے پہننے لگا ہے رئیس۔"

میں نے کہا "وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میں نے سنا ہے یہ تمہارے ساتھ ہی رہنے لگا ہے۔"

نیلم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے گلابی ہوا "میرے گھر میں تم بھی رہے ہو۔ عینی بھی رہی ہے اور بھی بہت لوگ ہیں۔ مجھے جگہ کی کمی تو نہیں اور پھر رئیس پر میں بہت زیادہ انحصار کرنے لگی ہوں۔ عبدالرحمان صرف ایک سیکریٹری تھا۔"

"اور رئیس کیا ہے؟"

"رئیس دوست ہے۔ پرانا ساتھی ہے۔"

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ لوگ کیا کہیں گے" میں نے کہا۔

رئیس بولا "یہ بات میں نے بھی کہی تھی۔"

"ایسی بے وقوفی کی بات کی مجھے تم سے امید نہیں تھی۔ لوگ کیا نہیں کہتے میرے بارے میں۔ کوئی بھی فلمی رسالہ یا اخبار اٹھا کے دیکھ لو۔ آئے دن مجھ سے بہت کچھ منسوب کرلیا جاتا ہے۔ ان دو ٹکے والے اخباروں کے فلمی رپورٹروں کو چھوڑو' ان معززین عالی نسب شرفا اور وی آئی پی قسم کے لوگوں نے میرے بارے میں کیسی کیسی داستانیں مشہور کی ہیں جو میرے آگے پیچھے کتوں کی طرح دُم ہلاتے آتے تھے اور میں انہیں دھتکار دیتی تھی۔ میرے اپنے ہم پیشہ ساتھیوں نے پیٹھ پیچھے کیا بکواس نہیں کی۔ اصل جرم میرا صرف یہ ہے کہ میں ایکٹریس ہوں۔ طے شدہ طور پر میں شریف اور پاکباز نہیں ہوسکتی۔ میں بے حیا اور بدکردار ہوں۔ بیسوا ہوں۔ صرف دولت کے رشتے پر یقین رکھنے والی۔"

میں نے کہا "ایسی باتیں میرے سامنے مت کرو۔"

"کیوں؟ تم نے ہی پوچھا تھا کہ دنیا کیا کہے گی۔ میں بتارہی ہوں کہ دنیا کی زبان نے مجھے کبھی اچھا نہیں کہا۔ تم میرے ساتھ تھے تب بھی بہت کچھ کہا اور لکھا گیا۔ آج رئیس میرے ساتھ ہے تو پھر واویلا ہے مگر میں پروا نہیں کرتی۔ جس کا جو جی چاہے کہے' میں سمجھتی ہوں کتے بھونک رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میں تمہاری جتنی عزت کرتا ہوں نیلم' کسی اور کی نہیں کرتا۔ یقین مانو مجھے تمہارے فیصلے سے دلی خوشی ہوئی۔ اگر رئیس نے تمہارے معاملات اور تم نے رئیس کے معاملات سنبھالنے کا تہیہ کرلیا ہے تو اس سے

اچھی بات بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ میرے لیے اس سے بڑی خوش خبری نہیں ہو سکتی' لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"تم اسے اپنے ساتھ لندن لے جا رہی ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ دن کے لیے اپنا سیکریٹری مجھے دے دو۔ مجھے اس کی اشد ضرورت ہے۔"

رئیس بگڑ گیا۔ "ابے کیسے دے جاؤ۔ میں کوئی استعمال کی چیز ہوں۔ پاؤں کی جوتی ہوں جو سب کے پیروں میں فٹ آجائے۔"

"میں نے کہا نا مجھے ضرورت ہے تیری۔"

"بھاڑ میں گئی تیری ضرورت سالے۔ مجھے بھی نیلم کے ساتھ ولایت جانے کی بڑی ضرورت ہے۔"

"ولایت کا کیا ہے' تو جب چاہے جا سکتا ہے۔"

"نہیں۔ میں نیلم کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اور اکیلا رہ بھی نہیں سکتا۔ میرا مطلب ہے۔ تو انتظار کر لے دو چار دن۔"

اس کا جو مطلب تھا وہ میں نے سمجھ لیا۔ خود نیلم اس کی بات پر کچھ نروس ہوئی تھی مگر حقیقت نے از خود اپنا وجود تسلیم کرا لیا تھا۔ اب مجھے ان کی زبان سے سننے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے کی محبت میں کتنا آگے نکل چکے ہیں۔ ابھی کوئی موقع نہیں تھا کہ میں واضح الفاظ میں ان کا اعتراف جرم سنوں اور ان سے پوچھوں کہ کون سی منزل پر ہے۔ عشق بلاخیز کا کاروانِ سخت جاں۔

میں نے کہا "تمہارا پروگرام کتنے دن کا ہے؟"

نیلم نے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ میرے پاس اب وہی فلمیں رہ گئی ہیں جو زیر تکمیل ہیں۔ میں نئی فلمیں سائن نہیں کر رہی ہوں۔ میں نے علالت کے عذر پر پندرہ دن کے لیے اپنی ساری ڈیٹس منسوخ کرا دی تھیں۔ اس دفعہ خیال یہ تھا کہ کچھ آرام کروں گی' کچھ تفریح ہوگی۔ جب کسی فلم یونٹ کے ساتھ جانا ہوتا ہے تو تفریح یا آرام کا کوئی وقت نہیں ملتا۔ صبح دوپہر شام پروڈیوسر تو چاہتا ہے کہ دن رات کے چوبیس گھنٹے کام کر کے شوٹنگ مکمل کر لی جائے۔ اس پر ایک ایک دن کا خرچہ بھاری ہوتا ہے۔"

"یار نیلم! ناصر سے مت چھپاؤ ورنہ یہ مارے گا بعد میں۔"

میں چونکا "کیا چھپا رہے ہو تم لوگ مجھ سے آخر؟ تم کیا سمجھتے ہو' میں آنکھوں کا اندھا ہوں کہ کچھ دیکھ نہیں سکتا یا عقل کا اندھا ہوں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ کیا تم دونوں نے شادی کر لی ہے؟ ہنی مون منانے جا رہے ہو لندن؟"

نیلم کا رنگ لال ہو گیا "نہیں بھئی ناصر! ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"رئیس تم ہی بتا دو نا" نیلم نے بڑی مشکل سے کہا۔

رئیس مجھے دیکھتا رہا "تیرا شک بے بنیان نہیں۔"

"بے بنیان۔ ابے جاہل کی اولاد' بے بنیاد۔"

وہ جھینپ کر مسکرانے لگا "ابے ہاں وہی۔ سالی زبان پھسل جاتی ہے۔ ہم لندن اسی لیے جا رہے ہیں' شادی کرنے۔"

میں اچھل پڑا "تم دونوں شادی کرنے لندن جا رہے ہو اور اتنی دیر سے بکواس کر رہے ہو۔ ابھی تک مجھے بتایا نہیں تھا رئیس خبیث۔ تیری تو ایسی کی تیسی!" میں نے رئیس کو ایک دم اٹھا لیا۔

وہ شور مچانے لگا "ابے بات سن۔ قسم اللہ کی' اف۔ ابے کیا مار ڈالے گا نیلم کے دولھا کو سؤر کے بچے۔ نیلم' تم دلہن ہو سمجھاؤ اس بھوت کو۔ یار قسم ہے تجھے' ہم دونوں کے سہاگ کی۔"

میں نے اسے اوپر ہی اوپر دو چکر دیے اور پھر بیڈ پر دے مارا۔ وہ ہنستے ہنستے مجھے گالیاں دیتا رہا "یار بڑا کمینہ ہے تو' ہم کیا تجھ سے چھپاتے۔"

نیلم کا چہرہ اب گلنار ہو گیا تھا مگر میرے ہاتھوں رئیس کی درگت بنتی دیکھ کے وہ گھبرا گئی "ناصر۔ بات تو سنو' یہ کیا کر رہے ہو؟"

میں نے اسے گلے لگا کے محبت سے پیشانی پر چوم لیا۔ "اب کیا رہ گیا ہے سننے کو۔ خدا تمہیں مبارک کرے' خدا ہم سب کو مبارک کرے۔"

نیلم کی آنکھوں میں فرطِ جذبات سے آنسو آگئے۔ وہ میرے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی "تم جانتے ہو۔ میں کتنی اکیلی تھی۔ لاکھوں چاہنے والوں کی بھیڑ سے کتنی خوف زدہ تھی۔ کیونکہ وہ سب بھوکے بھیڑیے تھے۔ ان میں سے ایک بھی مجھ سے مخلص نہیں تھا۔ میں خلوص اور محبت کی ترسی ہوئی بڑی مظلوم عورت ہوں ناصر۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔"

میں نے اس کے آنسو پونچھے "مجھے اندازہ ہے نیلم۔ بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں میں تمہارے دکھ کو۔ ہم سب ایک جیسے مظلوم' ایک جیسے تنہا اور پیار کے پیاسے لوگ ہیں۔ ہمارا درد مشترک ہے۔"

"میں نے تمہیں بھی بتا دیا تھا۔ رئیس سے بھی کچھ نہیں

چھپایا کہ زندگی میں دو بار ایسا ہوا۔ دو مرد ایسے تھے جن کو میں اپنا سکتی تھی۔ جو میرے مثالی شوہر کے معیار پر پورے اترتے تھے۔ جو میری حفاظت کر سکتے تھے اور مجھے اپنی زندگی میں وہ مقام دے سکتے تھے جس کی میں متلاشی تھی۔ لیکن ان دونوں کے نزدیک میں ان صفات سے محروم تھی جو وہ اپنی مثالی شریکِ حیات کے تصور میں دیکھتے تھے۔ وہ میرا آئیڈیل ضرور تھے مگر میں ان کا آئیڈیل نہیں تھی۔ پھر جب میرا سیکریٹری عبدالرحمان بھی ایک ایکسٹرا کے چکر میں مجھے دھوکا دے کر چلا گیا تو میں بہت مایوس ہوئی۔"

میں نے کہا "کیا ان دو مردوں میں سے ایک وہ بھی تھا؟"

"ہاں۔ اسے میں نے کئی سال بہت قریب سے دیکھا۔ بے شک اس کی عمر مجھ سے کافی زیادہ تھی مگر وہ اچھا آدمی تھا۔ میں اس کی بہت قدر کرتی تھی۔ اس نے کبھی میرے قریب ہونے کا فائدہ نہیں اٹھایا اور مجھے وہ عزت دی جو میں چاہتی تھی لیکن اس کا ظاہر اس کے باطن سے بہت مختلف تھا۔ وہ معاشرے کی روایتی سوچ کا قیدی تھا۔ میرے ایما پر بانو خالہ نے اس سے پوچھا تھا کہ میاں آخر اب تک شادی کیوں نہیں کی تم نے تو اس نے پہلے وہی کہا کہ "کیا کروں خالہ' کوئی اچھی لڑکی ہی نہیں ملی" بانو خالہ نے بات کا رخ تھوڑا سا میری طرف موڑا کہ "میاں تمہیں لڑکیوں کی کیا کمی۔ تمہارے آس پاس لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔ تم سب کو جانتے بھی ہو" اس پر وہ بھڑک گیا کہ جانتا ہوں خالہ اسی لیے تو ان لڑکیاں کہلانے والی بے کردار عورتوں کو اس قابل نہیں سمجھتا۔ کون کتنی فرشتہ ہے اور ظاہر کے پردے میں نظر آنے والی شرافت کے پیچھے کس کے چہرے پر کتنی کالک ہے' یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے" بانو خالہ نے سمجھایا کہ "بھئی' تمہاری نظر کو دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ اب اپنی نیلم کی مثال ہی لے لو۔ میں تو کہتی ہوں بڑے بڑے خاندانی گھروں میں مجھے ایسی ہمہ صفت لڑکی نظر نہیں آتی" تو کہنے لگا کہ "ویسے تو تمہاری بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں میں۔ نیلم کے مزاج اطوار اور کردار کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے لیکن خالہ' ایک تو وہ مجھے اس قابل کہاں سمجھیں گی۔ ان کے چاہنے والے لاکھوں ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک لوگ ہیں جو صورت شکل' مرتبے اور مقام میں مجھ سے ہزار گنا بہتر ہیں۔ دوسرے وہ عمر میں مجھ سے بہت کم ہیں۔ مجھے چاہیے کوئی چالیس سال کی خیردار اور عام سی شریف عورت۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی اور واجبی حد تک خوبصورت۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے خالہ کہ میں فلمی دنیا کی کسی عورت کو بیاہ کے گھر نہیں لے جا سکتا خواہ وہ کتنی ہی پارسا اور دنیا جہان کی خوبیوں سے مرصع ہو۔ آخر میری بھی تو کوئی عزت ہے معاشرے میں۔ لوگ کیا کہیں گے کہ اس عمر میں ایک ایکٹریس نے پھانس لیا یا آخر۔ نو سو چوہے کھانے والی عورت نے حج نہ کیا نکاح کر لیا۔"

میں نے غصے میں عبدالرحمان کو گالیاں دیں "حرام زادہ۔ عزت دار کا نطفہ۔ ایسا ہی شریف زادہ تھا تو ایک ایکسٹرا کے چکر میں کیوں پڑا۔ نجانے کیا ہوا مال اس پر کیوں لٹایا؟"

"چھوڑو ناصر۔ ایسے ہی مرد ہیں اس معاشرے میں' دوغلے۔ میں نے اتنے قریب سے دیکھا اسے اور پھر بھی اس کی سوچ کو نہ سمجھ سکی۔ اس کے جواب نے مجھے خود اپنی نظر میں بے آبرو کر دیا تھا۔ لیکن بعد میں جب وہ ایک بہت چالاک اور شکاری عورت کے جال میں پھنسا اور اس نے میرے پانچ لاکھ اس پر اڑائے تو جہاں مجھے دکھ ہوا' وہیں کچھ سکون بھی ملا۔ اس خیال سے کہ اچھا ہوا' میں اس کی قیدِ شریعت سے بچ گئی۔ ورنہ وہ نہ جانے میرا کیا حشر کرتا۔ میرے سامنے تو وہ بچھا جاتا تھا اور کہتا بھی تھا کہ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں مگر اس کے جواب نے میری عزتِ نفس کو سب سے زیادہ مجروح کیا تھا۔ خیر' اللہ جانے میری کون سی نیکی میرے کام آگئی۔"

"تم ایک کی بات کرتی ہو۔ بہت نیکیاں ہیں تمہارے نامۂ اعمال میں نیلم!" میں نے کہا "اور یہ جو فیصلہ کیا ہے نا تم نے۔ یہ سب سے بڑی نیکی ہے مگر یہ لندن میں شادی کرنے کا فیصلہ میری سمجھ میں نہیں آیا؟"

"اس کی روایت تو عینی نے ڈالی ہے" رئیس بولا۔

"عینی نے کچھ بھی پلان نہیں کیا تھا۔ یہ بس ایک اتفاق تھا کہ نیلم کا یونٹ وہاں شوٹنگ کے لیے آیا اور اس کا پی آر او تھا عاقل۔ اس کی عینی سے ملاقات ہی شادی کا بہانہ بن گئی۔ اس کے علاوہ عینی پاکستان آکے شادی نہیں کر سکتی تھی ورنہ اس کی شادی ایسے نہ ہوتی۔ بڑی دھوم دھام سے ہوتی۔"

"دھوم دھام سے کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ اور میں چاہتی بھی نہیں۔"

"اچھا۔۔۔ اب یہ فرما رہی ہیں آپ کیونکہ آپ خود چوری چھپے شادی کر رہی ہیں۔ ورنہ تم نے ہی سب سے زیادہ احتجاج کیا تھا کہ کیا شادی ایسے ہوتی ہے۔ عینی کی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھیں تم۔"

نیلم لاجواب ہوگئی "تم بھی تو کچھ بولو نا رئیس۔"

رئیس سر کھجانے لگا "وہ یار۔ دراصل معاملہ کچھ ایسا ہے کہ ہم عینی کی شادی میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اب ہم نے سوچا کہ چلو انہیں اپنی شادی میں شریک کرلیں۔ شادی ان کے گھر پر ہو۔"

"اور وہ سب جو یہاں بیٹھے ہیں، ہم جیسے گدھے؟"

"تو چل ہمارے ساتھ۔"

میں نے کہا "پاگل ہوا ہے۔ میں جان بچا کے فرار ہوا ہوں لندن سے اور تو مجھے واپس لے جانا چاہتا ہے۔"

"بات یہ ہے یار کہ ہم شادی کی خبر لندن سے جاری کریں گے اور پھر آئیں گے اس وقت جب سارا ہنگامہ ختم ہوجائے گا۔ یہاں آکے ایک دعوت دیں گے جس میں فلم انڈسٹری کے خاص خاص لوگوں کو اور سب صحافیوں کو بلالیں گے۔"

میں نے کہا "لیکن یار، یہ شادی کچھ دن کے لیے ملتوی تو کی جاسکتی ہے نا۔ ہفتہ دس دن بعد بھی ہوسکتی ہے۔"

نیلم نے کہا "میں نے پروڈیوسرز کو پندرہ دن بعد کی ڈیٹس دی تھیں۔"

"اب دونوں فیصلے کرلیے ہیں تم نے۔ فلمی دنیا چھوڑنے کا اور اپنا گھر بسانے کا تو گولی مارو پروڈیوسرز کو۔ ان کی کیوں فکر کرتی ہو۔ اپنے کیریئر کے دوران میں تم نے ہمیشہ سب سے تعاون کیا اور کسی کو کبھی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ اب اگر پندرہ دن کے بجائے تم ایک مہینے کے لیے غیر حاضر ہوجاؤ گی تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ فلمیں تو انہیں بہرحال پوری کرانی ہیں تم سے۔"

"کیا ایک ہفتے بعد تو آجائے گا؟" رئیس نے سوچ کے کہا۔

"وعدہ تو کر نہیں سکتا مگر ہفتہ دس دن میں شاہ عالم کا کام تمام ہوجائے گا تو تمہاری شادی میں شریک ہوگا ناصر عظیم۔ اور میں اپنے ساتھ لاؤں گا قمر کو، چندا کو اور ڈاکٹر کمال کو۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔" رئیس نے کہا "میں رک جاتا ہوں۔"

نیلم نے کہا "میں اکیلی جاکے کیا کروں گی۔"

میں نے کہا "دیکھو نیلم! ایک تو ہوتی ہے تقریب نکاح۔ اور ایک ہوتی ہے شادی۔ اگر تو تمہیں ڈر ہے کہ پندرہ دن میں رئیس کا دماغ نہ پھر جائے۔ یہ اپنا ارادہ نہ بدل دے یا کسی اور کے چکر میں نہ پڑجائے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہوسکتی۔"

نیلم ہنسنے لگی "کیسی باتیں کرتے ہو۔"

میں نے کہا "تمہارا نکاح تو میں ابھی ایک گھنٹے میں پڑھوا سکتا ہوں۔ رہی شادی یعنی رخصتی وغیرہ تو یہ پروگرام پندرہ دن بعد یہاں بھی ہوسکتا ہے اور لندن میں بھی۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ کیوں نہ میں بھی پندرہ دن کے لیے رک کے اپنی شوٹنگ ڈیٹس اور شیڈول کے مطابق جاری رکھوں۔ پندرہ دن بعد ہم سب ایک ساتھ چلے جائیں لیکن عینی کو بڑی مایوسی ہوگی۔ کل وہ ہمارا بہت انتظار کرے گی۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ نیلم باجی، جلدی سے آجاؤ۔ میں بھیا کے جانے کے بعد بہت اکیلا پن محسوس کررہی ہوں۔"

"کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔ عاقل کے ہوتے اکیلا کیوں محسوس کررہی ہے؟" رئیس بولا۔

میں نے کہا "یار، یہ احساس بھی عجیب چیز ہے۔ آدمی محفل میں تنہا ہوتا ہے۔ بھرے شہر میں اجنبی اور اکیلا محسوس کرتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار اپنے شہر سے اپنے ملک سے اور اپنوں سے دور گئی ہے۔ کچھ دن بعد عادی ہوجائے گی لیکن تم جاؤ۔"

"میں جاؤں؟" اس نے جیسے خود سے اور پھر رئیس سے سوال کیا۔

رئیس نے حکم صادر فرمادیا "ہاں تم جاؤ۔ اپنا پروگرام مت بدلو۔ اب اس معاملے کو ضرورت ہے ہماری اور ہم کہیں کہ ہماری تو شادی ہے اس لیے بھاڑ میں جائے تمہاری ضرورت۔ یہ تو بہت مشکل ہے۔"

لیکن نیلم اپنے ارادے پر قائم رہی "میں عینی سے فون پر بات کرکے اسے سمجھادیتی ہوں کہ ہم سب ایک ساتھ ہی آئیں گے۔"

"کیا اسے معلوم تھا کہ تم دونوں ایک ساتھ کیوں آرہے ہو؟"

نیلم مسکرائی "نہیں۔ ہم اسے سرپرائز دینا چاہتے تھے۔"

ہم نے دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھایا اور اس دوران میں اپنی ہی باتیں کرتے رہے۔ وہ باتیں جن کا تعلق عینی اور عاقل کے مستقبل سے تھا۔ فلمی دنیا سے علیحدگی کے بعد نیلم کے روز و شب کی مصروفیات کی باتیں۔ کمال کے اسپتال، قمر اور چندا کی باتیں اور ناصر عظیم کے پروگرام کی باتیں جن کی تکمیل اس لیے ممکن نہ ہوئی تھی کہ درمیان میں شاہ عالم اپنا کوئی وجود نہ رکھنے کے باوجود حائل تھا۔

کھانے کے بعد رئیس نے جماہی لی "یار اپن کو آرہی

ہے نیند!"

میں نے کہا "خبردار جو سونے کی کوشش کی۔ فریج میں سے نکال کے سارا ٹھنڈا پانی انڈیل دوں گا سر پر۔"

نیلم نے بھی کہا "سونے کے لیے وقت کہاں ہے رئیس۔ تم جاکے ابھی فوراً ریزرویشن کینسل کراؤ۔"

میں نے کہا "ہاں، اور میری فلائٹ ہے شام چھ بجے۔ اگر اس پر تجھے بھی سیٹ مل جائے تو اچھا ہے ساتھ ہی چلیں گے۔"

رئیس نے برا سا منہ بنایا "میں اکیلا جاؤں، تم بھی چلو نا ساتھ۔"

نیلم نے کہا "پندرہ دن بعد کی فلائٹ سے تمہیں بھی تو جنہیں بک کرانی ہیں لندن کے لیے۔"

تب شش و پنج میں پڑگیا "کرانی تو ہیں مگر۔۔۔"

"مگر کیا۔ تمہارے وعدے پر ہم نے اپنا پروگرام بدلا ہے" نیلم بولی۔

"میں ان سے پوچھ تو لوں۔ قمر سے چندا سے اور ڈاکٹر کمال سے۔"

"ابھی پندرہ دن ہیں۔ ہم انہیں راضی کرلیں گے" رئیس بولا۔

"ہوسکتا ہے وہ سب ایک ساتھ اسپتال چھوڑ کے جانے پر راضی نہ ہوں۔ کمال کو میں جانتا ہوں۔ وہ کہے گا کہ یا تو شادی رکھو پاکستان میں۔ عاقل اور عینی کو بلالو۔ ورنہ چندا اور قمر کو لے جاؤ۔ اسپتال کو دیکھنے والا کوئی تو ہونا چاہیے۔"

نیلم نے کہا "چلو تم سیٹیں بک کرالو۔ کمال نہ مانا تو ہم ایک سیٹ کینسل کرادیں گے۔ آج ہے جمعہ، دو ہفتے بعد پھر جمعہ ہوگا۔ ہم سنیچر کی کوئی فلائٹ لے سکتے ہیں۔"

مجھے ان کے اصرار کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ہم سہ پہر کے بعد پی آئی اے کے بکنگ آفس گئے جو شیرٹن کے قریب ہی تھا۔ میری وجہ سے نیلم اور رئیس کا پروگرام بھی ملتوی ہوگیا تھا لیکن انہیں واپس لاہور جانے کے لیے اسی فلائٹ پر جگہ نہ مل سکی جس سے میں جارہا تھا۔ انہوں نے ایک گاڑی کرائے پر لے رکھی تھی۔ اس میں ہم سب پانچ بجے ائرپورٹ پہنچے۔ میری فلائٹ چھ بجے تھی۔

ساڑھے سات بجے جہاز لاہور پہنچا۔ آٹھ بجے تک میں باہر نکل آیا۔ خلاف توقع وہاں کسی پارٹی ورکر یا صحافی کو موجود نہ پاکے مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ شاہ عالم کی سیاسی اہمیت کا گراف بہت نیچے آگیا تھا۔ اب اس کی واپسی کی خبر بھی غیر اہم ہوگئی تھی کہ پی جے ایف کے نائب صدر بھی اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔ میری نظریں اجنبی چہروں کے درمیان شبنم کو تلاش کررہی تھیں۔ اسے تو سب معلوم تھا بلکہ اسی نے شاہ عالم کی واپسی کی خبر سب کو دی ہوگی۔ وہ کیوں نہیں آئی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آٹھ بجے سے شبنم کے اخبار کے دفتر میں پہلی کاپی چھوڑنے کی اچھل شروع ہوجاتی تھی لیکن اس کے لیے ایک دو گھنٹے نکالنا کوئی ناممکن کام نہیں تھا۔ کئی بار اس نے آخری کاپی کی ذمے داری بھی اپنے معاونین پر چھوڑدی تھی۔ اور اب تو خود ابوبکر آزاد صاحب صحت مند ہوکے مدیر اعلیٰ کی کرسی پر واپس آبیٹھے تھے۔

میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے کسی نے میرے گلے میں اپنے بازو حمائل کردیے۔ میں چونک کے پلٹا تو مجھے شبنم کا چہرا اپنے مقابل نظر آیا۔

اس کے وجود کی حرارت اور ریشمی لمس کو میں نے اپنے جسم میں برقی رو کی طرح سنسنی بن کے اترتا محسوس کیا اور اس کے قرب کی جانی پہچانی خوشبو نشے کی طرح میرے حواس پر حملہ آور ہوئی۔

میں نے گھبرا کے خود کو اس سے الگ کیا "شبنم۔ یہ کیا بے ہودگی ہے۔"

وہ ہنسی "دل والے اس کو محبت کا نام دیتے ہیں۔"

"تمہیں احساس نہیں کہ لوگ دیکھ رہے ہیں؟"

وہ بولی "لوگوں کو کیا معلوم ہمارے درمیان کیا رشتہ ہے؟"

"بچھڑے ہوئے میاں بیوی بھی سرِعام ایسے نہیں ملتے۔"

"بہن بھائی تو مل سکتے ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ باہر چلو۔"

"بس یہی ہے تمہارا کل سامان۔ پورٹر" اس نے آواز دی "یہ ٹرالی لے کے چلو۔"

قریب کھڑے ہوکے تماشا دیکھنے والے پورٹر نے ٹرالی مجھ سے لے لی۔ میں نے شبنم کو غور سے دیکھا۔ دو مہینے میں اس کی صحت کچھ خراب ہوگئی تھی۔ وہ دبلی نظر آرہی تھی اور اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے نمودار ہورہے تھے۔ زیادہ تبدیلی اس کے گیٹ اپ میں آئی تھی۔ اس نے پھر اپنا پرانا انداز اختیار کرلیا تھا۔ میرے ساتھ رہ کے وہ شریفانہ طریقے سے شلوار قمیص پہننے لگی تھی اور عملاً نہ ہونے کے باوجود دوپٹے کو بھی شانے پر رکھنے لگی تھی مگر اس وقت وہ جینز پہن کے آئی تھی۔ جینز کے اوپر لمبا سا سیاہ مردانہ

اسٹائل کا کرتہ تھا جس کا اوپر والا بٹن وہ ہمیشہ ایسے کھلا رکھتی تھی کہ یہ بھی بے پروائی کی ایک ادا بن جائے مگر پُرشوق نگاہوں کو اسیر کرلے۔ اس کے شانے پر وہی بیگ تھا جس میں وہ اپنا صحافت کا سامان رکھتی تھی۔ کیمرا' ٹیپ ریکارڈر' نوٹ بک اور ذاتی استعمال کی کچھ اشیا۔ ڈائری' لپ اسٹک اور چیونگم وغیرہ۔ نازک اور خوبصورت زنانہ سینڈلوں کے بجائے اس نے جوگرز پہن رکھے تھے۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "تمہاری صحت یہ بتاتی ہے کہ تم بہت محنت کررہی ہو یا بہت جاگ رہی ہو۔"

وہ مسکرائی "دونوں باتیں ہیں۔"

"تم بہت کمزور لگ رہی ہو مجھے۔"

"تم تو بڑے شہ زور بن کے لوٹے ہو" وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی۔

میں نے کہا "تم نے میرے کارناموں کو خوب پبلسٹی دی۔"

"میں نے تمہارے جرائم کو کارنامہ بنا کے پیش کیا۔ لیکن افسوس کہ الٹی ہوگئیں سب تدبیریں۔ لوگ اب بہت سیانے ہوگئے ہیں۔ اس پبلسٹی سے الٹا نقصان ہی ہوا۔"

پورٹر رک گیا "آپ کی گاڑی ہے سر یا ٹیکسی۔"

میں نے شبنم کی طرف دیکھا "تم اپنی کھٹارا لائی ہو؟"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی "ہاں" اور پارکنگ ایریا کی طرف چلنے لگی "تمہاری پارٹی اب وہ نہیں رہی۔"

میں نے کہا "ہاں میں دیکھ رہا ہوں۔ کوئی ورکر یا عہدے دار مجھے ریسیو کرنے نہیں آیا۔"

"حالانکہ کچھ لوگوں کو میں نے ذاتی طور پر بتادیا تھا۔ آج صبح کے اخبار میں بڑی نمایاں جگہ پر ایک باکس بھی لگادیا تھا۔ لیکن لوگ شاید پی جے ایف کا نام بھول گئے ہیں اور شاہ عالم کو بھی۔"

"اس کا مطلب ہے آنے والے الیکشن میں پارٹی کو ایک بھی سیٹ نہیں ملے گی۔ میں نے تو شمس اور قریشی دونوں سے وعدہ کیا تھا۔"

"ان سے زیادہ موقع شناس کوئی نہیں ہے' ان دونوں نے سرکاری سرپرستی رکھنے والی پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی ہے۔ دونوں کنگ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنا چاہتے ہیں۔"

"اور ملک رب نواز!"

"وہ اپنے آبائی حلقے سے اپنے بیٹے کو کھڑا کررہا ہے۔ دلنواز کو' ان کی سیٹ پکی ہے۔ خود رب نواز شاید پیپلز پارٹی سے ٹکٹ لینا چاہتا ہے۔"

"ویری گڈ۔ ایک سرکاری پارٹی میں دوسرا حزب اختلاف میں۔ خوب انداز سیاست ہے یہاں بھی۔"

وہ ایک بالکل نئی چمکتی دمکتی مارگلہ سیڈان کی ڈکی کھولنے لگی "رکھو اس میں سامان" اس نے پورٹر سے کہا۔

میں نے کہا "یہ گاڑی۔"

"یہ میرا کھٹارا ہے" اس نے ہنس کے کہا۔

"یہ تو تم سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔" میں نے تعریفی نظروں سے گاڑی کو دیکھا۔

"یہ تعریف اور خوشامد سے موم نہیں ہوتی۔ اس کے جملہ حقوق ملکیت میرے نام پر ہیں' آؤ بیٹھو۔"

میں نے کہا "تمہاری وہ حق حلال کی کمائی والی ایف ایکس کہاں گئی؟"

"لے گیا اسے بھی کوئی غریب۔" اس نے گاڑی کو بڑی نزاکت سے نکالا۔

"یعنی تم اب امیر ہوگئی ہو؟"

"امیر ہونے کی کوشش ضرور کررہی ہوں۔" اس نے گاڑی کو ائرپورٹ سے باہر جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

"کتنے میں خریدی ہے یہ نئی گاڑی؟"

"میں نے۔؟ میں نے نہیں خریدی' مجھے کسی نے تحفے میں دی ہے" وہ ہنسی۔

"کون ہے وہ مہربان؟" میں نے طنز سے کہا۔

"یہ نہیں پوچھو گے کہ کیوں ہے مہربان۔"

میں نے کہا "تم پر کسی کے مہربان ہونے کے اسباب کیا ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہیں دیکھ کے کسی کی عقل گھاس چرنے چلی گئی اور تم نے اسے گھاس ڈال دی۔"

"اور دوسری وجہ؟"

"تمہارے مرتبے کا کوئی صحافی اگر بلیک میلر بن جائے تو کار کیا چیز ہے' کارخانہ حاصل کرسکتا ہے۔"

وہ ہنسی "پہلی وجہ پر تمہیں حسد محسوس نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "نہ تم لیلیٰ ہو نہ میں تمہارا مجنوں۔ نہ تم میری پراپرٹی ہو کہ میں اجارہ داری کا حق جتاؤں۔"

"ویسے تو وہ زمیندار ہے لیکن اس نے فلمسازی کے میدان میں قدم رکھ کے ایک فلم بنائی تھی۔ شیرا چتر۔ فلم تو فلاپ ہوئی تھی مگر فلمساز کو مزہ آگیا۔ ہیروئن اور سائڈ ہیروئن کے علاوہ بھی کچھ اچھی صورتیں دیکھنے کو ملیں۔"

"صرف دیکھنے کو؟"

"نہیں۔ مری کاغان میں لوکیشن پر سیر اینڈ تفریح سب

ہوا۔ دوسری فلم کے لیڈ رول کے لیے مجھے آفر دی ہے' کیا خیال ہے؟"

"خیال کیا' ایک کوٹھی لو ڈیفنس میں اور ایگری منٹ کرلو' اپنا فائدہ دیکھو" میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کی۔

"اندر سے تم جل بھن کے کوئلہ ہوگئے ہو۔ دھواں اٹھتا صاف محسوس ہورہا ہے مجھے" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "لعنت ہے جلنے والے پر۔ تم جیسی نہ جانے کتنی ہیں جو اپنے حسن و شباب کے بلینک چیک دن رات کیش کرا رہی ہیں۔ تم کو اچھا چانس مل رہا ہے۔ کیا رکھا ہے اس صحافت کے خوار کرنے والے پیشے میں۔ مجھے یقین ہے کہ فلموں میں تم نیلم کی جگہ لے لوگی۔"

"میں نے سنا ہے وہ فلمی دنیا چھوڑ رہی ہے؟" وہ بولی۔

"ٹھیک سنا ہے تم نے۔"

اس نے میری طرف نظریں اٹھائیں "تمہارے لیے؟"

میں نے کہا "نہیں۔ خدمتِ خلق کے لیے۔"

"خدمتِ خلق تمہارے ساتھ؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یہ کہہ سکتی ہو تم۔ وہ میرے یتیم خانے کے پروجیکٹ میں میرے ساتھ ہوگی۔ اسے فنانس بھی کرے گی۔ یا کمال کے اسپتال میں کام کرے گی۔"

"سبحان اللہ۔ کیا جذبہ ہے اس نیک دل خاتون کا اور کیا قربانی ہے؟" وہ طنزیہ اور پر تمسخر لہجے میں بولی "اگلے پچھلے سارے گناہ صاف ہوجائیں گے۔"

میں نے کہا "نیکی کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ ویسے گنہگار ہم سب ہیں اور ہماری نیتوں کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔ چندا بھی نیکی کام کررہی ہے۔"

"آخر تم اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتے شاہ جی!"

"کس سے' چندا سے؟"

"نہیں۔ نیلم سے' دس سال سے تم اور وہ۔؟"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ آف دی ریکارڈ ہے۔ وہ رئیس سے شادی کررہی ہے۔"

اس نے بے دھیانی سے میری بات سنی "چلو اچھا ہوا۔ بالآخر رئیس کے دل کی مراد بر آئی۔ تم نے بتایا تھا مجھے کہ وہ نیلم سے والہانہ محبت کرتا تھا اس سے مگر تمہارے آگے اس کی دال نہیں گلی۔"

میں نے کہا "تم کس خیال میں ہو۔ میں شادو کی بات نہیں کررہا ہوں اور شادو کو مرے ہوئے زمانہ ہوگیا' وہ میری بیوی تھی۔"

وہ چونکی "پھر۔ کون شادی کررہا ہے اس سے' چندا؟"

میں نے کہا "رئیس سے نیلم شادی۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے شبنم کو اپنا آپ قابو نہیں رہا۔ گاڑی تھوڑا سا لہرائی اور پھر سیدھی چلنے لگی۔ میں سوچ رہا "کیا تم مذاق کررہے ہو؟"

میں نے کہا "صبح خود نیلم سے تصدیق کرلینا۔ میرے حوالے سے بات کرنا تو وہ صحیح جواب دے گی۔ لیکن یہ کوئی EXCLUSIVE اسٹوری نہیں ہے تمہارے لیے۔ فی الحال یہ خبر میرے اور تمہارے درمیان راز کی طرح رہے گی۔"

وہ کچھ دیر بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہی "کیا نیلم پاگل ہوگئی ہے؟"

میں نے کہا "خاتون۔ جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی۔ تو آدمی پاگل ہی کہلاتا ہے۔ مجنوں کا مطلب معلوم ہے؟ جسے جنون ہوجائے۔"

اس نے برا سا منہ بنایا' جیسے میری بات کی حیثیت کسی دقیانوسی خیال' کسی احمقانہ مفروضے یا بے بنیاد یقین سے زیادہ نہیں "کب اور کہاں ہوگی یہ شادی۔"

میں نے کہا "دو ہفتے بعد۔ لندن میں' ایک مہینے بعد اس کا باقاعدہ اعلان کردیا جائے گا اور اس وقت میرا وعدہ ہے کہ پہلی خبر تم دوگی۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں فلمی اسکینڈلز میں پڑنے کا" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہ تم مجھے کہاں لے جارہی ہو آخر؟"

"اپنی ڈیفنس کی کوٹھی میں اور کہاں۔ تم نے دیکھا میں کتنی عقلمند ہوں۔ تم نے جو مشورہ دیا تھا' میں اس پر پہلے ہی عمل کرچکی تھی۔"

میں نے کہا "میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ۔ مجھے جانا ہے پی سی۔"

"آل رائٹ" اس نے کہا اور گاڑی کو ایک دم پرل کانٹی نینٹل کے گیٹ میں موڑ دیا۔

میں پی سی کے لاؤنج سے گزر کے استقبالیہ پر پہنچا تو ایک اسسٹنٹ منیجر نے مجھے خوش آمدید کہا "ویلکم ٹو پی سی مسٹر شاہ عالم۔" اور مجھے ایک چابی پکڑادی "سوئٹ نمبر نو از ریڈی فار یو۔"

میں نے حیرانی سے کہا "یعنی آپ کو پہلے سے معلوم تھا؟"

اسسٹنٹ منیجر نے میرے پیچھے کھڑی ہوئی شبنم کو دیکھا "ہمیں ہی نہیں سر' سارے شہر کو معلوم ہے۔ چاندنی لاؤنج میں آپ کی پریس کانفرنس کے سب انتظامات مکمل ہیں۔

اسٹائل کا کرتہ تھا۔ [illegible] صاحب وہاں پہلے سے موجود تھی۔

میں نے چابی لے لی اور زینے کے راستے سوئٹ نمبر دو کی طرف چل پڑا۔ شبنم مسکراتی ہوئی میرے ساتھ چلتی رہی۔ "تو سچ یہ ہے گویا...؟"

"جی... سچ یہ ہے کہ ہم آپ کے صحیح مزاج داں... قدر داں اور مہرباں... تم نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا مگر دیکھو، تمہارے لیے سب پہلے سے کردیا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "تھینک یو!"

"اس گاڑی اور ڈیفنس کی کوٹھی کے بارے میں نہیں پوچھو گے؟" وہ ہنسی۔

"وہ بھی سچ نہیں تھا لیکن تم نے بڑے اعتماد کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔"

"بڑا افسوس ہے شاہ جی کہ آپ بھی شبنم کو نہیں جانتے" اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "فلموں میں جانا ہوتا مجھے تو بہت پہلے چلی جاتی۔ کوئے صحافت میں قدم ہی کیوں رکھتی، وہ گاڑی ہوٹل کی تھی۔"

مجھے تیار ہونے کے لیے مشکل سے آدھا گھنٹا ملا جس میں ہاتھ منہ دھو کے میں نے کپڑے بدلے۔ شبنم نے اتنی دیر میں کافی اور کچھ سینڈوچ منگوائے جو ہم نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے جلدی جلدی کھائے۔

میں نے کہا "آزاد صاحب کا کیا حال ہے؟"

"وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ خود کچھ کرتے نہیں، مجھے کچھ کرنے نہیں دیتے۔ زمانہ کہاں جارہا ہے۔ آپ چلے جارہے ابھی تک اسی پرانے ڈھرے پر۔ پرنٹ میڈیا کا الیکٹرونک میڈیا سے اتنا سخت مقابلہ ہے کہ اخبار کو جدید خطوط پر چلائے بنا چارہ نہیں۔ اس کے لیے چاہیے وافر سرمایہ اور نیا خون۔ مگر آزاد صاحب کی قناعت پسندی اور درویشی میرے عزائم کی راہ میں دیوار بن گئی ہے۔ قرض لے کر انوسٹمنٹ کرنے کے قائل نہیں۔ کسی کو پارٹنر بنانے کے لیے تیار نہیں۔ نئے لوگوں کے بارے میں رائے بڑی خراب ہے کہ نوجوان نسل صحافت کو پیشہ سمجھتی ہے۔ بزنس کے اصولوں پر چلانا چاہتی ہے۔ یہ تو ایک مقدس مشن ہے۔"

"ان کی بات غلط تو نہیں ہے۔"

"میں جزوی طور پر ان سے اتفاق کرتی ہوں۔ اگر یہ مشن ہے تو اس کی تکمیل کے لیے بہتر مواقع اور زیادہ وسائل صرف اسی صورت میں دستیاب ہوسکتے ہیں جب آپ اسے بزنس کی طرح چلائیں۔ رفاہی اداروں کے ٹرسٹ آخر کس لیے بنائے جاتے ہیں۔ تاکہ کارِ خیر کا دائرہ محدود نہ رہے۔ اب کمال کی مثال لو۔ وہ پہلے ایک کلینک چلا رہا تھا، محدود وسائل کے ساتھ۔ اب وہ ایک اسپتال چلا رہا ہے جہاں پہلے سال بھر میں ہزاروں لوگ مستفید ہوتے تھے وہاں اب لاکھوں ہورہے ہیں۔ کیا وہ نہیں چاہے گا کہ اسپتال کی مزید توسیع ہو۔ اس میں آج دس امراض کا علاج ممکن ہے تو کل بیس قسم کے مریض آئیں۔ تم نے لیبارٹری ایم آر آئی کی سہولت فراہم کی ہے۔ اور سی ٹی اسکین کی۔"

"یہ دلائل مجھے کیوں دے رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"آزاد صاحب کے کان پر کسی دلیل سے جوں نہیں رینگتی۔ ان کا جو نعرہ یا نظریۂ حیات ہے، آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی۔ اخبار کی لوح پر نظر آتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ حق گوئی و بے باکی آپ کا مقصد اور مشن ہے تو بڑی اچھی بات ہے مگر آپ جو سچ لکھ رہے ہیں وہ آج پچاس ہزار کی اشاعت پر کتنے لوگوں تک پہنچ رہا ہے۔ یہ دس گنا لوگوں تک پہنچے گا اگر اشاعت پانچ لاکھ ہو۔ وہ اشاعت بڑھانے کے تو قائل ہیں مگر اس کے لیے سرمایہ کاری اور اشتہار بازی کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں اشتہار بازی جھوٹ بولنے اور مبالغہ آرائی کا فن ہے۔ حق و صداقت خود اپنا اشتہار ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "اس مسئلے پر پھر بات کریں گے۔ یہ بتاؤ، تم نے پریس کانفرنس میں کس کس کو بلایا ہے؟"

"میں نے بطور خاص کسی کو دعوت نہیں دی۔ تمہارے واپس آنے کی خبر کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی تھا کہ آج رات دس بجے وہ پی سی میں ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کریں گے۔"

"تمہاری شمس یا قریشی سے بات ہوئی تھی؟"

"صرف قریشی نے فون کیا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ میری اطلاع کس حد تک مصدقہ ہے۔ میں نے کہا کہ جناب میں افواہیں نہیں پھیلاتی۔ اور اپنے اخبار میں جھوٹ بھی نہیں لکھتی۔ وہ جو دوسرا ہے شمس، اس نے فون بھی نہیں کیا۔ ہاں تمہارے خاص دوست نے فون کیا تھا۔"

"رب نواز نے؟"

"ہاں۔ فلائٹ نمبر پوچھ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں تو خبیث کہنے لگا کہ جھوٹ بولتی ہو تم۔ میں نے کہا کہ چلیں جب آپ سچ معلوم کرلیں تو مجھے بھی بتادیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور میرے "یس" کہتے ہی قریشی اندر آگیا۔

وہ مجھ سے بڑے پُرجوش انداز میں گلے ملا اور مصافحہ کرکے بولا "میں مخل تو نہیں ہوا؟"

میں نے کہا "میں بس نکل رہا تھا۔ شبنم سے کچھ مقامی حالات کی رپورٹ لینے کے لیے رک گیا۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گیا "مقامی حالات تو سرجی بڑے خراب ہیں۔"

میں نے کہا "تم اتنے ناامید کیوں ہو؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "امید کس پر رکھیں۔ الیکشن میں صرف دو مہینے رہ گئے ہیں اور ابھی تک ہماری پارٹی کا کوئی نام و نشان نہیں۔"

میں نے کہا "اس میں قصور کس کا ہے۔ میری عدم موجودگی میں یہ ذمے داری آپ پر اور شمس پر عائد ہوتی تھی کہ پارٹی کو فعال رکھیں۔"

"شاہ جی کیسے فعال رکھیں۔ شمس کی تو بات ہی چھوڑیں۔ اس نے اپنا گروپ بنا کے سیاست کی دکان چلانے کی کوشش کی تھی مگر اس کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں ڈیڑھ نمازی بھی نہیں آئے۔ اس نے تو اب سیاست بھی چھوڑ دی ہے۔ ایک ریکروٹنگ ایجنسی بنالی ہے اور جعلسازی سے بندے باہر بھجوا رہا ہے۔ امریکا، کینیڈا اور آسٹریلیا۔ لاکھوں کی کمائی کررہا ہے۔ میں اکیلا کیا کرسکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جس پارٹی کا چیئرمین ہی غائب ہو اور باہر سے اس کے بارے میں جو خبریں مل رہی ہوں۔ وہ بھی اچھی نہ ہوں۔ تو کمپین کیسے چلائی جائے۔ عام ورکر اتنا بد دل ہے۔"

میں نے کہا "چلیں قریشی صاحب! اب تو میں آگیا ہوں۔ ہم مل کے دن رات ایک کردیں گے۔ کسی بڑی پبلسٹی فرم سے رابطہ کرتے ہیں جو دو ہفتے میں پی جے ایف کا نام کراچی سے لنڈی کوتل تک ایسے پھیلادے کہ الیکشن کی فضا میں اس کی گونج سب سے الگ سنائی دے۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں پی جے ایف کی گھن گرج سب سے بڑھ کر ہو۔"

"میں نے سنا ہے کہ بے نظیر نے سن چھیاسی میں پاکستان آنے سے پہلے کسی بین الاقوامی پبلسٹی فرم ساچی اینڈ ساچی کی خدمات حاصل کی تھیں۔"

"کی ہوں گی۔ اور دیکھیں اس نے کیسا ماس ہسٹریا پیدا کیا اور جلسے جلوس ریلی، پوسٹرز اور بینرز سے پیپلز پارٹی کی مہم کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔"

"کیوں نہ ہم بھی اسی سے رابطہ کریں" قریشی جوش سے بولا۔

میں نے سوچ کے کہا "وہ ذرا مہنگا کام ہے۔ میں سوچ رہا تھا کسی پاکستانی ایڈ ایجنسی کے لیے لیکن آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے، ہمیں الیکشن تو لڑنا ہے اور پوری تیاری کے ساتھ۔ ہم کل ایک پرسنل میٹنگ کریں گے اور اس کے بعد مجلس عاملہ کا اجلاس بلا کے آگے چلیں گے۔"

"مسئلہ یہ ہے شاہ جی کہ پارٹی کا نہ ریکارڈ ہے اور نہ کوئی آفس!"

میں نے کہا "ریکارڈ آپ کے پاس ہونا چاہیے۔"

وہ پہلو بدل کے بولا "ہاں کچھ ہے۔ کچھ شمس کے پاس ہوگا۔ آپ اس سے لے سکتے ہو مگر مسئلہ ہے آفس کا۔"

میں نے چٹکی بجائی "ارے قریشی صاحب! آفس بھی کوئی مسئلہ ہے۔ کل کوئی اچھی سی جگہ پکڑلیں گے۔ ایک دو دن میں بورڈ لگوادیں گے۔ فرنش کریں گی اور کام شروع، ورکر تو خود ہی آجائیں گے۔"

قریشی میں اگر ذرا سی بھی عقل ہوتی تو وہ سمجھ لیتا کہ میں اسے سبز باغ دکھا رہا ہوں۔ ایک وقت تھا جب پی جے ایف کے صوبائی اور ضلعی دفاتر تک موجود تھے مگر اب شاہ عالم کے خلاف سازشوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پارٹی کئی دھڑوں میں تقسیم ہوگئی اور دیکھتے دیکھتے اس طرح منتشر ہوگئی جیسے ایوب خان کی کنونشن لیگ اور ڈاکٹر خان صاحب کی ری پبلکن پارٹی تحلیل ہوئی تھی۔ اب پی جے ایف کو دوبارہ زندہ اور فعال کرنا کسی مردہ میں جان ڈال کر اسے ریس میں دوڑانے سے زیادہ مشکل تھا۔ اور اس مردہ گھوڑے ...... سے یہ امید رکھنا کہ وہ جیت جائے گا، ذہنی دیوالیہ پن کی انتہا تھی۔

پریس کانفرنس میں خلافِ توقع چالیس اخباری نمائندے پہنچ گئے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ رات کے وقت شہر میں کوئی اور اہم تقریب نہیں تھی چنانچہ پریس کانفرنس کے بہانے پی سی کے چاندنی لاؤنج میں ڈنر کا خیال خاصا پرکشش ثابت ہوا تھا۔

میں نے فرداً فرداً سب سے ہاتھ ملایا۔ ان میں سے ایک تہائی تو واقعی صحافی تھے جن کی رائے اور خبر دونوں کی اہمیت تھی۔ ایک تہائی غیر معروف اور محض نام کے اخباروں کے نمائندے تھے اور باقی ایک تہائی بن بلائے مہمان تھے جو کسی کے ساتھ آگئے تھے لیکن انہیں غیر متعلقہ فریق قرار دے کر نکالا نہیں جاسکتا تھا وہ کسی نامور صحافی کے چمچے تھے یا کسی کے نمائندے بن کر آگئے تھے۔

سلام دعا اور رسمی کلمات کے بعد میں نے کہا "حضرات

وخواتین پریس کے معزز اراکین۔ ایک سال بعد آپ سب سے مل کر بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ آپ لوگ یقیناً مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہوں گے۔"

ایک صحافی نے ہاتھ اٹھایا "شاہ عالم صاحب' میرا سوال یہ ہے۔"

قریشی نے اسے ٹوک دیا "پہلے شاہ صاحب ایک بیان دیں گے آپ لوگ اس کے بعد سوالات کریں گے۔"

میں نے کہا "جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں' میں نے ملک سے باہر تقریباً ڈیڑھ سال جلاوطنی میں گزارا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سازشی عناصر نے میرے لیے یہاں رہنا ناممکن کر دیا تھا۔ ان سازشی عناصر میں میرے سیاسی مخالفین تھے۔ میرے کاروباری حریف تھے اور شاہ عالم کے ذاتی دشمن بھی کم نہ تھے لیکن دکھ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کا ساتھ پارٹی کے کچھ ایسے سینئر عہدے داروں نے دیا جن کو میں اپنا دستِ راست سمجھتا تھا۔ مزید یہ کہ پی جے ایف کو سیاسی منظر سے ہٹانے کے لیے ملک کی خفیہ ایجنسیاں سرگرم عمل ہو گئیں۔ پی جے ایف ایک انقلابی جماعت تھی جس کا نعرہ تھا 'امن' انصاف اور آزادی۔ آپ سب لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس ملک کے عوام امن پسند ہیں۔ وہ جنگ نہیں چاہتے کیونکہ وہ جنگ کو افورڈ نہیں کر سکتے مگر عالمی طاقتوں کا مفاد اس خطے میں جنگ کے شعلوں کو ہوا دینے میں ہے۔ بین الاقوامی اسلحہ فروش اپنے ذاتی مفادات کے فروغ کے لیے دنیا میں ہر جگہ جنگ کے لیے حالات پیدا کرتے ہیں۔ پی جے ایف کا امن کا نعرہ ان کے مقاصد کی شکست کا سبب بن سکتا تھا۔ ہم انصاف کی بات کرتے تھے' آئین میں یہ ضرور لکھا ہے کہ امیر غریب ہر ایک کو بلا تفریق انصاف ملے گا مگر کیا عملاً ایسا ہوتا ہے۔ ہم انصاف کے دہرے معیاروں کو ختم کرنا چاہتے تھے اور یہ بات یہاں کے فیوڈل لارڈز اور بیوروکریٹس کے مفادات پر ضرب کاری لگاتی تھی۔ پھر ہم آزادی کی بات کرتے تھے۔ کہنے کو ہم نے انیس سو سینتالیس میں آزادی حاصل کر لی تھی مگر کیا واقعی ہم آزاد ہیں۔ کیا آج ہم پر گورے صاحب کی جگہ کالا صاحب زیادہ فرعونیت کے ساتھ حکمرانی نہیں کر رہا ہے۔ ہم اس نظام سے استحصال سے اور طبقاتی تفرقات سے آزادی کی بات کرتے تھے۔ پی جے ایف نے جو چند سال پہلے ایک چھوٹی سی جماعت تھی' دیکھتے دیکھتے اتنی مقبولیت اور طاقت حاصل کر لی تھی کہ اس کا وجود اس ٹرائیکا کے لیے خطرہ بن گیا تھا جس نے اپنے غیر جمہوری' غیر اسلامی اور غیر اخلاقی ہتھکنڈوں سے اس ملک کے بارہ کروڑ عوام کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ چنانچہ وہ سب پی جے ایف کے خلاف متحد ہو گئے جو عوام کو امن' انصاف اور آزادی دینا نہیں چاہتے تھے۔"

ایک صحافی نے بیزاری سے کہا "سر' یہ سب جانتے ہیں ہم۔"

میں نے کہا "لیکن اس وقت ان باتوں کو دہرانے کا ایک خاص مقصد ہے۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جو عناصر پی جے ایف کی قوت سے خائف تھے' وہ آج بھی اس کے خلاف متحد ہیں۔ کیا آپ کسی ملک کی سیاسی تاریخ میں ایسے گھناؤنے کھیل کا تصور کر سکتے ہیں جو میرے خلاف کھیلا گیا۔ میری پارٹی کی مقبولیت سے خوفزدہ سازشی ٹولے نے میرے وجود کو ختم کرنے کے لیے کیسا بھیانک کھیل کھیلا تھا۔ انہوں نے ایجنسیوں کی مدد سے میرے ایک ہم شکل کو میری جگہ لانے کی پوری پلاننگ کی۔ ان کا پروگرام یہ تھا کہ اس ہم شکل کو میری جگہ پارٹی کا چیئرمین بنا کے اس سے ایسے اقدامات کرائے جائیں جن سے پارٹی کا شیرازہ بکھر جائے۔ وہ مجھے مار کے اس جعلساز کو شاہ عالم بنانا چاہتے تھے جس کی صورت مجھ سے تھوڑی بہت ملتی ہوگی مگر میک اپ اور پلاسٹک سرجری سے اسے میرا ڈپلی کیٹ بنا دیا گیا تھا۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ یہ سازش کرنے والے خود اپنی سازش کا شکار ہو گئے۔ میرے بجائے میرے اس ہم شکل کا کام تمام کر دیا گیا اور اسے اصل شاہ عالم قرار دے کر بڑی دھوم دھام سے کسی شہید کی طرح اس کا جنازہ بھی اٹھایا گیا اور اس کا مزار بھی بنا دیا گیا۔ یہ بڑی افسوسناک اور لمبی کہانی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ پھر مجھے خود کو شاہ عالم ثابت کرنے کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں زندہ ہوں' کتنے پاپڑ بیلنے پڑے۔ جعلی شاہ عالم کی لاش کا قبر سے نکال کے پہلا پوسٹ مارٹم کیا گیا پھر دوسرا پوسٹ مارٹم ہوا۔ بالآخر ہائی کورٹ میں یہ ثابت ہو گیا کہ مرنے والا نقلی شاہ عالم تھا۔ اصلی شاہ عالم میں ہوں لیکن اس شرمناک شکست سے مخالف عناصر کے حوصلے کم نہیں ہوئے۔ انہوں نے میری پارٹی میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ پہلے مجھ پر دہرے قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ میرے خلاف پولیس نے خادم مرزا اور خالد عثمان کو قتل کرنے کا مقدمہ درج کیا۔ وہ دونوں میرے کاروباری رفیق تھے یہ سب الزامات جھوٹے ثابت ہوئے لیکن میرے مخالفین اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب رہے۔ پارٹی کئی دھڑوں میں بٹ گئی اور مجھے جان بچا کے ملک سے نکلنا پڑا۔ اس سے پارٹی کی مرکزیت ختم ہو گئی اور عوام سے اس کا موثر رابطہ ٹوٹ گیا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ میرے دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے تھے اور انہوں نے لندن میں بھی مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔ وہ یہاں کے اخبارات میں میرے خلاف بے بنیاد خبریں شائع کراتے رہے اور وہاں بھی میرے خلاف سازشوں میں مصروف رہے۔ میں اس وقت ان خبروں کی تفصیل میں نہیں جا سکتا جو یہاں کے اخباروں کو فراہم کی گئیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جھوٹ بہرحال جھوٹ ہوتا ہے۔ میرے بارے میں تو یہ بھی مشہور کر دیا گیا تھا کہ میں لندن میں کسی ٹریفک حادثے میں ہلاک ہو گیا ہوں۔ بفضلِ خدا میں بالکل صحیح سالم اور صحت مند' آپ سب کے سامنے موجود ہوں۔ میرے وہ دشمن اب پہلے سے زیادہ چوکنے اور سرگرم عمل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاہ عالم بہت کم وقت میں اپنی پارٹی کو پھر فعال کر سکتا ہے۔ وہ الیکشن سے پہلے اتنی طاقت حاصل کر سکتا ہے کہ ان کے بہت سے سیاسی پہلوان ہمارے نئے امیدواروں سے چت ہو جائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے پھر سازشوں کا جال پھیلا دیا ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ چند دنوں میں میرے خلاف نئے مقدمات کھڑے کر دیے جائیں۔ مجھے بدنام کرنے اور میری کردار کشی کے لیے مجھے بے بنیاد الزامات میں ملوث کر دیا جائے یا میرا وجود ہی ختم کرانے کے لیے مجھ پر ایک سے زیادہ قاتلانہ حملے کرائے جائیں۔ میں اپنی جان ہر طرف سے خطرے میں محسوس کرتا ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جس ملک میں سیاسی قتل روز کا معمول ہوں اور جہاں آج تک کوئی قاتل نہ پکڑا گیا ہو وہاں شاہ عالم کا قتل کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔ کوئی تحقیقاتی کمیشن اور کوئی تفتیشی ادارہ اس لہو کا سراغ نہیں لگا سکے گا۔ تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے تو پھر دست قاتل کی کیا پہچان۔ لیکن میں ان اندیشوں سے ڈر کے خاموش بیٹھنے والا نہیں ہوں۔ میں اپنی پارٹی کو پھر منظم اور متحد کروں گا اور آنے والے انتخابات میں ہم بھرپور طریقے سے حصہ لیں گے۔"

میری تقریر ضرورت سے زیادہ لمبی ہو گئی تھی مگر میں نے محسوس کیا کہ میرے اندازِ خطابت اور مدلل پیرایۂ اظہار نے سب کو متوجہ کر لیا ہے اور صرف انجوائے کرنے کے لیے پریس کانفرنس میں آنے والے میری بات بڑے انہماک سے سن رہے ہیں۔ یہ ایک خالص سیاسی موضوع کی تقریر تھی مگر میں نے اس میں شاہ عالم کی "مرگِ ناگہاں" کے امکانات اور اتفاقات کو بھی موثر طریقے سے شامل کر لیا تھا۔ یہ آنے والے وقت کے لیے احتیاطی پیش بندی تھی تاکہ شاہ عالم اچانک مر جائے تو کم سے کم اخبار والوں کو اس میں کوئی ڈراما نظر نہ آئے۔

آدھے گھنٹے تک حاضرین کی قوت برداشت کا امتحان لینے کے بعد میں نے تقریر ختم کی تو قریشی نے کہا "اب آپ لوگ سوال کر سکتے ہیں۔"

ایک مشہور اخبار کے کالم نویس اور ایک رپورٹر ساتھ ساتھ کھڑے ہوئے تھے مگر پھر رپورٹر نے کالم نویس کی سینیارٹی کا احترام کیا اور خود بیٹھ گیا۔ کالم نویس نے کہا "مسٹر شاہ عالم! آج جبکہ انتخابات کے انعقاد کی تاریخ میں پورے دو مہینے بھی نہیں' آپ یہ کیسے توقع رکھ سکتے ہیں کہ پورے پاکستان میں اپنی پارٹی کو منظم کر لیں گے۔ عملی طور پر تو آپ کی پارٹی ختم ہو چکی ہے۔"

میں نے کہا "پارٹی کے کارکن بڑے سخت جان اور وفادار ہیں۔ وہ آج بھی ملک کے طول و عرض میں ایک خاموش اکثریت رکھتے ہیں۔"

اکثریت کے لفظ پر ایک رپورٹر مسکرایا "مجھے تو اس میں بھی شک ہے کہ اتنے کم وقت میں آپ کو امیدوار مل سکیں۔"

میں نے کہا "ہم ہر سیٹ پر امیدوار کھڑے کرنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے لیکن جس حلقے سے پارٹی کے امیدوار پہلے کامیاب ہوئے تھے' وہاں ہم ضرور مقابلہ کریں گے اور کامیاب ہوں گے۔"

"کیا آپ کسی انتخابی اتحاد میں شامل ہوں گے؟"

میں نے کہا "ہم اس کے امکانات کو یکسر مسترد نہیں کر سکتے۔ ہمارے سیاسی نظریات سے کوئی اختلاف نہیں کر سکتا چنانچہ کسی ہم خیال جماعت کے ساتھ ہمارا انتخابی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔"

رفتہ رفتہ سوالات میں تندی آنے لگی۔ وہاں موجود تمام صحافی اس معاملے میں جائز طور پر متفق تھے کہ پی جے ایف کا کوئی سیاسی مستقبل نہیں ہو سکتا مگر میں بڑی ڈھٹائی سے اپنے موقف کو دہراتا رہا کہ دو مہینے میں پارٹی پھر پہلے کی طرح طاقتور ہو جائے گی اور وہ سب سیٹیں جیت لے گی جو پہلے اس کے لیے مخصوص تھیں۔ وہ سب پرانے اور تجربہ کار لوگ تھے جو آنکھ بند کر کے ہر سنی سنائی بات پر یقین نہیں کر سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کے سوالات کا انداز جارحانہ ہوتا گیا۔ ان میں سے ایک نے تو مجھے بالواسطہ طور پر شیخ چلی بھی کہہ دیا۔ کچھ لوگ اپنے غیر سنجیدہ رویے پر مُصر مسخر ہو گئے لیکن میں نے کسی پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ اس پریس کانفرنس کا مقصد انہیں

اپنے سیاسی عزائم کی کامیابی کا یقین دلانا ویسے بھی نہیں تھا۔ میں نے جس نکتے پر زیادہ زور دیا تھا' وہ شاہ عالم کی زندگی کو لاحق خطرات تھے۔ میں نے یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی کہ شاہ عالم جان ہتھیلی پر رکھ کے آیا ہے اور جو لوگ پی جے ایف کو پھر میدان میں دیکھنا نہیں چاہتے' وہ اسے ہلاک کرنے کے درپے ہیں۔

پھر ایک صحافی نے سوال کیا "سر کیا آپ نے لندن میں تیسری شادی کرلی تھی؟"

میں نے کہا "میری تین بیویاں نہیں ہیں" اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

"آپ نے دوسری شادی ایک ماڈل سے کی تھی؟"

میں نے کہا "میں نے یہ غلطی کی تھی اور اس کی سزا بھی بھگتی۔"

ایک صحافی بولا "سنا ہے آپ کی تیسری بیوی بھی ایکٹریس ہیں؟"

میں نے کہا "روشنی ایکٹریس تھی۔ اس نے کچھ ٹیلی وژن ڈراموں میں اور چند فلموں میں کام کیا تھا لیکن وہ ایک کیریکٹر ایکٹریس تھی۔ اس کی اداکاری کا معیار وہی تھا جو انڈیا کی شبانہ اعظمی اور پاکستان میں عظمیٰ گیلانی کا تھا۔ لیکن وہ زیادہ چل نہیں سکی۔"

"وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟"

میں نے کہا "وہ لندن میں اپنی بہن کے ساتھ مقیم ہیں۔"

ایک رپورٹر بولا "یہ چھ لاکھ پاؤنڈز کی ڈکیتی کا کیا قصہ تھا؟"

میں نے کہا "قصہ وہی تھا جو آپ نے پڑھا۔"

ایک سینئر صحافی نے کہا "شاہ صاحب۔ پاکستان سے جلاوطنی اختیار کرتے وقت آپ کے خلاف بہت سے مقدمات تھے۔"

"وہ سب جھوٹے تھے؟" میں نے کہا۔

"لیکن وہ سب پھر شروع ہوسکتے ہیں۔ خصوصاً عمر دراز کے قتل کا مقدمہ۔"

میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں کہ نگران وزیراعظم سیاسی بنیادوں پر کسی کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کرسکتے۔ تاہم عمر دراز کے قتل کی فائل پھر کھولی گئی تو میں اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"اس کیس میں آپ کو گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "میں گرفتاری سے نہیں ڈرتا۔"

ایک اخبار کے مدیر نے کہا "آپ نے اپنی پارٹی کے دو نائب صدور مسٹر شمس اور مسٹر قریشی پر الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے آپ کی پارٹی کو ہائی جیک کرلیا ہے لیکن مسٹر قریشی یہاں موجود ہیں؟"

میں نے کہا "ہمارے درمیان ہر غلط فہمی رفع ہوگئی ہے۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اتنے کم وقت میں اپنی پارٹی کے احیا اور اسے ملک بھر میں سیاسی طور پر فعال کرنے کے لیے آپ کے پاس کیا پلان ہے؟"

میں نے کہا "پلان بہت جلد آپ کے سامنے آجائے گا۔ میرا خیال ہے آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ اب ملاقاتیں ہوتی رہیں گی آپ سے۔ رات بہت ہوگئی ہے اور غالباً بھوک سے آپ کے سوالات بھی کمزور پڑ رہے ہیں اس لیے آیئے کلام کے بعد طعام کی طرف 'ڈنر از ریڈی'۔"

چند ایک کے سوا بیشتر صحافیوں کو نہ پریس کانفرنس سے دلچسپی تھی اور نہ شاہ عالم کے مستقبل سے۔ وہ دوسرے درجے اور تیسرے درجے کے کاغذی سیاست دانوں کی پریس کانفرنس میں اس لیے جاتے تھے کہ وہاں کھانے پینے کو بہت کچھ ملتا تھا۔ صفِ اول کے سیاست داں ایک کپ چائے پر ٹرخا دیتے تھے مگر وہاں جانا صحافت کے تقاضوں میں شامل تھا۔ ان جماعتوں کے سربراہ جو عام اصطلاح میں تانگا پارٹی کہلاتی ہیں (کیونکہ ان کے ممبران اور عہدے دار سب ایک تانگے میں سماجاتے ہیں) اور آزاد امیدوار صحافیوں کو کھینچنے کے لیے خاطر تواضع میں زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ یہ میری بھی مجبوری تھی۔

میرے اعلان کے ساتھ ہی بھوکے لوگ میزوں کی طرف لپکے جہاں بہترین بوفے ڈنر کے لیے انواع و اقسام کی ڈشز بہت دیر سے ان کی منتظر تھیں۔ پریس کانفرنس کے دوران میں ہی میں نے محسوس کرلیا تھا۔ وہاں کچھ لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو اپنی دلچسپی سے صحافی نظر آنے کی پوری کوشش کررہے ہیں مگر نہ وہ صحافی تھے اور نہ کسی کے ساتھ آئے تھے۔

کھانے کے دوران میں' میں ہر صحافی کے پاس گیا اور ان سے رسمی طور پر کہا کہ وہ تکلف نہ کریں اور کھانے کے ساتھ پورا انصاف کریں۔ ایسے ہی گھومتے پھرتے میں نے چار مشتبہ افراد سے بھی بات کی اور ان سے پوچھا کہ وہ کس اخبار کے نمائندے ہیں۔ دو نے پرسکون رہتے ہوئے قدرے اعتماد کے ساتھ دو نام لیے جو میں نے پہلے کبھی نہیں سنے

تھے۔ دو کچھ نروس ہوئے اور انہوں نے دو بڑے اخبارات کا نام لیا جن کے نمائندوں کو میں جانتا تھا۔

میرا شک تقویت حاصل کرگیا۔ میں نے شبنم کے پاس جاکے کہا "شبنم تم یہاں موجود تمام صحافیوں کو جانتی ہو؟"

"سب کو تو نہیں' کچھ غیر معروف اور نئے لوگ بھی ہیں۔"

میں نے کہا "نئے لوگوں میں مجھے کچھ مشکوک افراد نظر آرہے ہیں جو قطعی صحافی نہیں ہیں۔ ایسے اِدھر اُدھر مت دیکھو' انہیں شک ہوجائے گا۔"

شبنم نے سرہلایا "مجھے بتاؤ کون لوگ ہیں؟"

میں نے کہا "ایک تو ارشاد صاحب کے پیچھے کھڑا ہے۔ دراز قد اور تیکھی مونچھوں والا۔ سفید شلوار قمیص میں۔"

"میں نے دیکھ لیا' میں اسے نہیں جانتی۔"

"دوسرا قادر صاحب کی ٹیبل پر موجود ہے اور اس کی ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ وہ قادر حسین صاحب کے اخبار کی نمائندگی کا دعویٰ کررہا ہے۔"

"تمہاری اس سے بات ہوئی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ سفاری سوٹ میں ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ اس ٹیبل پر چار افراد ہیں۔ تین کو میں جانتی ہوں۔"

میں نے باقی دو کی نشاندہی بھی ایسے کی کہ کسی کو شک نہ ہو مگر میں اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ شبنم کے پہنچنے سے پہلے ہی ان میں سے دو غائب ہوگئے۔ پریس کانفرنس چاندنی لاؤنج کے ایک حصے میں ہورہی تھی۔ باقی حصے میں عام پبلک تھی۔ وہ خاموشی سے کھسک کر پبلک میں شامل ہوئے تو پھر نظر نہیں آئے مگر شبنم نے دو کو گھیر لیا۔

"ہوائے وقت کون سا اخبار ہے؟" شبنم نے کہا۔

"اگر نوائے وقت ہوسکتا ہے تو ہوائے وقت کیوں نہیں ہوسکتا؟ یہ ایک نیا اخبار ہے" وہ بے خوفی سے بولا۔

"شناختی کارڈ ہے آپ کے پاس اخبار کا؟"

"وہ اتفاق سے پریس میں رہ گیا۔"

"چلئے اپنا نام اور اخبار کا فون نمبر بتایئے" شبنم نے تیز لہجے میں کہا۔

"آپ ہوتی کون ہیں یہ سوال کرنے والی؟" وہ بگڑ گیا۔

مگر اتنی دیر میں چند اور صحافی ادھر آگئے تھے۔ انہوں نے اسے دھکے دے کر نکال دیا "چلو اب عزت کے ساتھ دفع ہوجاؤ۔ مفت خورے آجاتے ہیں ہر جگہ۔ جوتے پڑیں گے تو بھول جاؤ گے ساری صحافت کو۔"

شبنم نے کہا "اسے تو پولیس کے حوالے کرنا چاہیے۔"

دوسرا اس صورت حال سے بچنے کے لیے فرار ہونے لگا تھا کہ شبنم نے اسے بھی روک لیا۔ "ایک منٹ میری بات سنئے جرنلسٹ صاحب' کس اخبار سے تشریف لائے ہیں آپ' قضائے وقت سے یا صدائے وقت سے؟"

وہ بولا "جی نہیں۔ میرا نام جمال الدین ہے۔ میں نے اپنا نیا اخبار شروع کیا ہے' رفتار زمانہ!"

نسبتاً نوجوان صحافیوں کا ایک گروہ اس کے گرد جمع ہوگیا "کب سے شائع ہورہا ہے یہ اخبار۔" ایک نے کہا "کیا رفتار ہے اس کی ای زمانہ۔"

"میں نے ابھی اس کا ڈیکلریشن لیا ہے" وہ بولا۔

"اس کی ڈمی چل رہی ہے؟" شبنم نے پوچھا۔

یہ خالص ٹیکنیکل سوال سن کے وہ گھبرا گیا "ڈمی!"

ایک رپورٹر نے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی "تمہیں اس پریس کانفرنس کا دعوت نامہ کس الو کے پٹھے نے دیا تھا آخر؟"

دوسرے نے اسے دھکا دیا "حرام خور گدھے۔ چلو پھٹو ورنہ میں بلاتا ہوں پولیس کو۔"

شبنم نے کہا "ٹھہرو۔ ہوٹل کی سیکیورٹی کو بلاؤ۔"

میں نے کہا "کچھ لوگ پہلے ہی کھسک گئے ہیں۔ مجھے یہ صرف مفت خورے نہیں لگتے۔ یہ میرے دشمنوں کے بھیجے ہوئے لگتے ہیں۔"

آخری شخص کو فرار ہونے کا موقع نہیں ملا مگر وہ ذرا بھی پریشان نہیں ہوا اور اطمینان سے یا ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ چند منٹ میں ہوٹل کی سیکیورٹی والے آگئے اور اسے ساتھ لے گئے۔ اس نے جاتے جاتے ایک رپورٹر سے کہا "مفت کی تو تم بھی کھارہے ہو۔ ہم نیچے جاکے کھالیں گے اس سے اچھا۔"

اگر وہ سیکیورٹی کی تحویل میں نہ ہوتا تو شاید اس کی اچھی خاصی ٹھکائی ہوتی مگر اس کے اعتماد نے مجھے حیران کیا۔ میں نے شبنم سے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں اور سیکیورٹی والوں کے پیچھے چلا گیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب نیچے سیکیورٹی کے انچارج نے اس کے کاغذات چیک کیے اور پھر بڑے دوستانہ انداز میں مسکرا کے اسے چھوڑ دیا۔ وہ ہال کی ایک ٹیبل پر جا بیٹھا جہاں فرار ہونے والے تینوں صحافی پہلے سے موجود تھے۔ میں دور سے ان کی باتیں تو نہیں سن سکتا تھا مگر انہیں ہنستا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

میں نے سیکیورٹی انچارج کے پاس جاکے کہا "تم نے

اس شخص کو ایسے ہی چھوڑ دیا۔ اسے پولیس کے حوالے کرنا چاہیے تھا۔"

وہ بولا "سر جی۔ وہ تو خود پولیس مین ہے۔"

مجھے یقین نہ آیا "تم نے شناختی کارڈ دیکھا تھا؟"

"دیکھا تھا سر! وہ اے ایس پی دلاور شاہ ہے۔"

میں نے اس کی میز کی طرف دیکھا جہاں وہ اے ایس پی موجود تھا۔ وہ اب ویٹر کو بلا کے اپنا آرڈر لکھوا رہا تھا۔ اس کے باقی ساتھی کھانے میں مصروف تھے۔ میں نے غور سے ان کی صورتوں کو دیکھا۔ وہ شکل سے پولیس والے نہیں لگتے تھے۔ ان میں سے کسی کا ہیئر اسٹائل پولیس والا نہیں تھا۔ ان کے لمبے لمبے بال تھے جو کانوں کے اوپر آئے ہوئے تھے۔ ایک نے تو باقاعدہ پٹے کرا رکھے تھے۔ ان کا لباس بھی بہت شوخ اور فیشن ایبل تھا مگر میں سیکیورٹی انچارج سے بحث نہیں کر سکتا تھا اور کسی وجہ کے بغیر معاملے کو طول نہیں دے سکتا تھا۔ ابھی تک ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ وہ بن بلائے ایک پریس کانفرنس کے شرکا میں شامل ہو گئے تھے اور سب کے ساتھ دعوت عام میں شریک پائے گئے تھے۔

واپس ٹیرس پر پہنچ کے میں نے شبنم کو ساری بات بتائی "اس نے پولیس کا جعلی شناختی کارڈ دکھا کے سیکیورٹی والوں کو مطمئن کر دیا۔"

شبنم نے کہا "بعض اوقات سیاسی نوعیت کی میٹنگ یا پریس کانفرنس میں پولیس والے سادہ لباس میں رپورٹ لینے آجاتے ہیں۔"

میں نے کہا "شبنم' وہ پولیس والے نہیں ہیں۔ میں شرط لگا سکتا ہوں' وہ کسی خاص مقصد کے تحت یہاں آئے تھے۔"

"تم بلاوجہ ڈر رہے ہو۔"

میں نے کہا "اب وہ نیچے کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں' آخر کس لیے۔"

میں نے کہا "ممکن ہے وہ رب نواز کے آدمی ہوں۔ مجھے اغوا کر کے ساتھ لے جانا چاہتے ہوں۔"

"اس ہوٹل کے اندر سے' ناممکن۔ اغوا اور قتل کرنے والے تمہیں باہر سے اٹھا سکتے ہیں۔ انہیں پکڑے جانے کا رسک لینے کی کیا ضرورت ہے؟" شبنم نے کہا۔

میں نے برہمی سے کہا "خاتون' میں نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ میرا شک بے سبب نہیں ہے۔ جو شخص پولیس کا جعلی شناختی کارڈ لے کر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں جانے کی اور پریس کانفرنس میں شریک ہونے کی جرأت کر سکتا ہے وہ کوئی شریف آدمی نہیں ہو سکتا۔ اگر تم نے کچھ نہ کیا تو پھر۔۔۔"

"اوکے اوکے۔ میں قادر صاحب کو بتا رہی ہوں" شبنم نے کہا۔

اس وقت تک لوگ کھانا کھا کے فارغ ہو چکے تھے اور رخصت ہو رہے تھے۔ قادر صاحب نے شبنم کی بات واجبی سی دلچسپی کے ساتھ سنی اور پھر کسی جاننے والے پولیس آفیسر کو فون کیا مگر خود انہیں جانے کی جلدی تھی۔ سب مہمانوں کے رخصت ہو جانے کے آدھے گھنٹے بعد اس علاقے کے تھانے سے ایک سب انسپکٹر مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے اسے ساری صورت حال سمجھائی تو وہ لوٹ کر نیچے ہال میں گیا اور پندرہ منٹ بعد خاصا پریشان اور ناراض لوٹا۔

"آپ نے تو ہمیں مروا دیا تھا سر جی! یہاں سارے معززین آئے ہیں۔ ویسے ہی کسی پر شک ظاہر کرنا بڑی غلط بات ہے۔"

میں نے کہا "غلط بات کیا ہے۔ خود سیکیورٹی انچارج نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا تھا۔"

"سیکیورٹی انچارج تو خود مشکل میں پڑ گیا۔ اس نے اپنی جان چھڑائی کہ شاید غلط فہمی ہو گئی ہے کوئی۔ وہ بندہ کوئی اور تھا۔ جن کے پاس آپ نے مجھے بھیجا تھا' وہ سب تو کسٹم کے افسران تھے۔"

"کسٹم کے افسران اس حلئے میں نہیں ہو سکتے۔ وہ سب بدمعاش لگتے تھے" میں نے کہا۔

"چلو چھوڑو جی۔ میری تو نوکری خطرے میں ڈال دی آپ نے۔ انہوں نے منیجر سے بات کی کہ پولیس یہاں بھی شرفا کو تنگ کرتی ہے۔ ان میں سے ایک نے تو ڈی آئی جی صاحب سے فون پر بات کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا" اس نے جاتے جاتے بڑی ناگواری کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اسسٹنٹ منیجر سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ وہ میز اب خالی پڑی تھی جس پر میں نے ان چاروں جعلی صحافیوں کو اکٹھا بیٹھے دیکھا تھا۔ اسسٹنٹ منیجر نے میری بات بڑی توجہ سے سنی "لیکن سر! آپ نے محض شک کی بنیاد پر پولیس کو بلا کے غلطی کی' یہ شرفا کا ہوٹل ہے۔"

میں نے کہا "شہر بھر کے دو درجن صحافیوں نے ان کو دیکھا تھا۔ وہ صحافی نہیں تھے اور انہوں نے سب کے سامنے جھوٹ بھی بولا تھا۔ بعد میں ایک نے خود کو پولیس کا اے ایس پی ظاہر کیا اور جب پولیس آئی تو وہ کسٹم آفیسر بن گئے۔

آپ ایسے لوگوں کو شرفا اور معززین میں شمار کرتے ہیں؟"

"شاہ عالم صاحب! یہ ایک ہوٹل ہے۔ یہاں کوئی بھی آسکتا ہے خواہ وہ شرافت کی سند رکھتا ہو یا نہیں۔ ہم کسی کو شناخت کے لیے روک نہیں سکتے۔ اگر آپ نے انہیں پریس کانفرنس میں پکڑ لیا تھا تو وہیں پولیس کے آنے تک روکتے۔ ہم ہوٹل کے اندر نہ پولیس کی مداخلت پسند کرتے ہیں اور نہ بلاوجہ کا ہنگامہ" اسسٹنٹ منیجر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "دیکھیے' یہ بات میں نے ابھی پریس کانفرنس میں بھی بتا دی ہے کہ میری جان کو خطرہ ہے۔"

"لیکن ہم آپ کو اسپیشل سیکیورٹی فراہم نہیں کر سکتے اور محض آپ کی وجہ سے دس معزز کسٹمرز سے پوچھ گچھ نہیں کر سکتے۔ آپ اگر ہمارے حفاظتی انتظامات سے مطمئن نہیں ہیں تو پرائیویٹ سیکیورٹی لے لیں یا پولیس سے سیکیورٹی مانگیں" اس نے رکھائی سے کہا اور پلٹ کے اپنے آفس میں چلا گیا۔

انتظامیہ کا موقف غلط نہیں تھا۔ میں نے اپنے سوئٹ میں آکے ریلیکس کرنے کے بعد سوچا۔ لیکن میرا شک بھی بے بنیاد نہیں تھا۔

میں نے شبنم نے پوچھا "تمہارا اب کیا پروگرام ہے؟"

وہ صوفے پر جوتے اتار کے دراز ہو گئی "کچھ نہیں؟"

میں نے کہا "آج تمہیں اخبار کی آخری کاپی کی فکر نہیں ہے؟ اس پریس کانفرنس کی رپورٹ بھی فائل نہیں کی تم نے۔"

وہ مسکرائی "تم نے دیکھا نہیں؟ میرے اخبار کا چیف رپورٹر خود یہاں موجود تھا۔ میں بالکل فارغ ہوں۔"

"فارغ ہو تو گھر جاؤ۔ یہاں تمہارے سونے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔"

اس نے شوخی سے ڈبل بیڈ کو دیکھا "جگہ تو بہت ہے اگر دل میں جگہ ہو۔"

میں نے کہا "دیکھو میں پہلے ہی اپ سیٹ ہوں۔ مجھے پریشان مت کرو اور جاؤ شرافت سے۔"

وہ اسی طرح لیٹی رہی "اگر زبردستی نکال سکتے ہو دھکے دے کے تو نکال دو ورنہ میں لیٹی ہوں یہاں' تم سو جاؤ اپنے بیڈ پر۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "مجھے ابھی نیند نہیں آرہی ہے اور مجھے فون پر سب سے بات کرنی ہے' قمر سے اور کمال سے۔"

"اور چندا سے۔"

میں نے کہا "ہاں' چندا سے بھی۔"

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں کچھ نہ سنوں تو میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہوں" اس نے کانوں میں انگلیاں ڈال لیں۔

میں نے اپنی ہار مان لی۔ شبنم کی ضد کے آگے میری ایک نہ چلتی۔ اگر میں اسے زبردستی رخصت کرتا اور وہ سچ مچ ہنگامہ کر دیتی تو شاید ہوٹل کی انتظامیہ مجھ سے معذرت کر لیتی کہ شاہ عالم صاحب' آپ کی وجہ سے ماحول خراب ہو رہا ہے۔ آپ اپنی رہائش کا انتظام کسی دوسرے ہوٹل میں کر لیں۔ شبنم کو اپنی بدنامی کا کوئی ڈر نہیں تھا اور اسے ہنگامہ آرائی سے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔

پریس کانفرنس میں چار مشکوک افراد کی موجودگی بظاہر ایک معمولی واقعہ تھی مگر نہ جانے کیوں میری چھٹی حس مجھے خطرے کے وجود سے آگاہ کر رہی تھی۔ میں اس احساس سے نجات پانے میں ناکام تھا کہ وہ چاروں کسی خاص مقصد سے وہاں بھیجے گئے تھے۔ جھگڑا کر کے رخصت ہو جانے کے باوجود وہ ہوٹل کے کہیں آس پاس ہی موجود ہوں گے لیکن میں تصدیق کے لیے باہر جاتا تو یہ ہو سکتا تھا کہ واپس ہی نہ آؤں۔ وہ مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے بھی لے جا سکتے تھے اور شوٹ بھی کر سکتے تھے۔

میں نے پریس کے سامنے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا خوب رونا رویا تھا اور اپنے خدشات کو مبالغہ آرائی کے ساتھ بڑھا چڑھا کے پیش کیا تھا جبکہ خود میں اچھی طرح جانتا تھا کہ پاکستان میں میری جان کا دشمن صرف رب نواز ہو سکتا ہے مگر وہ بھی مجھے قتل کرا کے اپنا نقصان نہیں کرے گا۔ وہ پہلے مجھ سے معلوم کرے گا کہ اس کے چھ لاکھ پاؤنڈز کے نوادرات چوری ہو کے کہاں گئے اور جو تین لاکھ پاؤنڈز میں نے وصول کرنے تھے وہ اس تک کیوں نہیں پہنچے۔ پہلے میں اس کے دو لاکھ پاؤنڈز سے زیادہ کا مقروض تھا۔ اب یہ قرض بڑھ کے پانچ لاکھ پاؤنڈز سے بھی زیادہ کا ہو چکا تھا اور ملک رب نواز اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ پانچ لاکھ پاؤنڈز میں میری جان لے۔ وہ مجھے مجبور کرے گا کہ میں اس کا قرض ادا کرنے کے لیے چوری کروں' ڈاکا ڈالوں یا اس کے پاس خود کو گروی رکھ کے کاروبار کروں۔ میری جان اس کے لیے بے مصرف تھی۔

چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ رب نواز مجھے اغوا کرائے اور پھر مجھ سے پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟ اگر وہ چار آدمی مجھے رب نواز کے پاس لے جانے کے لیے آئے تھے تو انہیں مجھ

سے بات کرنی چاہیے تھی۔ اگر میں انکار کرتا تو زبردستی جائز ہوتی لیکن ابھی تو میں نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ میں نے ابھی تک رب نواز سے یہ نہیں کہا تھا کہ مستقبل میں اس کے اور میرے کاروباری مراسم نہیں ہوں گے۔ میں نے تو اسے پارٹی کا ٹکٹ دینے کا وعدہ کیا تھا اور میں لوٹ کے اسی لیے آیا تھا کہ الیکشن میں حصہ لوں۔ دوبارہ منتخب ہونے کی صورت میں میری ذات سے رب نواز کو زیادہ فوائد حاصل ہوسکتے تھے۔

سوال پھر یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ چار افراد کون تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اس مسئلے پر شبنم کی رائے لیتا' ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔"

دوسری طرف سے رب نواز بولا "شاہ جی۔ فارغ ہوگئے آپ پریس کانفرنس سے۔"

میں نے کہا "کیا تم نے بھی اپنا نمائندہ بھیجا تھا وہاں؟"

وہ بولا "لو جی ہم تو خود حاضر ہونے کا سوچ رہے تھے مگر اس لیے نہیں آئے کہ جلدی کیا ہے؟"

میں نے کہا "میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔"

"ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ اگر کچھ نہیں کر رہے ہو تو آجاؤ۔ یا کوئی مسئلہ ہے تو میں ملنے آجاتا ہوں۔"

میں نے کہا "مسئلہ کوئی نہیں۔ لیکن میں اتنے طویل سفر کے بعد بہت تھک گیا تھا۔ اس پر آتے ہی پریس کانفرنس گلے پڑ گئی۔"

"اس کے لیے تو تم خود بے تاب ہوگے۔"

"ہاں۔ مگر اب میں سونا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

وہ بولا "کس کے ساتھ؟" اور پھر ہنسا۔

میں نے کہا "تمہیں یہ بتانا ضروری ہے؟"

"نہ بتاؤ یار۔ ہم کیا جانتے نہیں۔ یہ بتاؤ لندن کی صورت حال اب کیا ہے؟" رب نواز نے کہا۔

میں نے کہا "لندن کی صورت حال کیا ہوسکتی ہے' جو تھی سو ہے۔"

"وہ — جی..." اس نے گالی بکی۔

میں نے کہا "وہ جیل میں ہے اور رہے گا مرتے دم تک۔"

وہ بگڑ کے بولا "میرا قرض ادا کرنے سے پہلے وہ کیسے مرسکتا ہے؟"

میں نے کہا "فرشتہ اجل جان لینے سے پہلے بالکل نہیں پوچھتا کہ بندے' دنیا میں تیرے کون سے کام ادھورے رہ گئے' وہ تو وقت پر آجاتا ہے۔"

"میں نے سنا ہے اسے دل کا دورہ پڑا تھا؟"

"ٹھیک سنا ہے تم نے۔ مفلوج وہ پہلے ہی تھا۔ اسے ہوگی لمبی قید کی سزا اور اتنی مہلت شاید زندگی اسے نہ دے کہ اپنی سزا پوری کاٹے۔ بائی دا وے' وہ تمہارا مقروض کیسے ہوگیا؟"

"میں نے چھ لاکھ کے نوادرات اسے ہی بھیجے تھے۔"

میں نے کہا "آہستہ بولو۔ ٹیلی فون پر ایسی باتیں کرنا ویسے بھی کوئی عقل مندی نہیں۔ اگر کسی نے سن لیا۔"

وہ بولا "میں کیوں ڈروں۔ جی اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ اس نے چھ لاکھ پاؤنڈز کے نوادرات اسے بھجوائے تھے کہ بیچ کے رقم تمہیں ادا کردے۔"

میں نے کہا "آدھی رقم اس نے ادا کردی تھی بلکہ خریدار یعنی لارڈ پرائس نے ادا کردی تھی۔ مگر تمہاری بدقسمتی کہ اسے ڈاکو لے اڑے۔ وہ رقم ابھی تک پولیس بھی بازیاب نہیں کرسکی۔ بعد میں نوادرات بھی چوری ہوگئے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ چوری ڈاکے سے مجھے کیا؟" وہ چلانے لگا "چھ لاکھ میں سے ایگری منٹ کے مطابق ایک لاکھ تمہارے تھے۔ ایک لاکھ جی کے۔ باقی چار لاکھ مجھے ملنے چاہئیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ چار لاکھ پاؤنڈز تم کیسے وصول کروگے۔ کیا تم جی کے خلاف کیس کروگے؟ اس کے لیے تمہیں لندن جاکے وکیل بھی کرنا پڑے گا اور تمہیں شاید علم نہیں کہ لندن میں قانونی مقدمات پر کتنے زیادہ اخراجات ہوتے ہیں۔ وصول تمہیں ایک پیسہ نہیں ہوگا۔ الٹا مقدمہ تمہارے گلے پڑجائے گا۔ تمہیں جان چھڑانی مشکل ہوجائے گی۔"

"میں جی کے اثاثے بکوادوں گا۔"

میں نے کہا "وہ کیسے۔ اس کے تمام مالی معاملات کی نگراں تھی اس کی بیوی' جس نے خود اپنے شوہر کو اندر کرایا ہے اور اس کے خلاف تین قسم کے مقدمات درج ہوگئے ہیں۔ ایک غلط آمدنی ظاہر کرنے اور ٹیکس چوری کے' دوسرے ناجائز طور پر غیر قانونی تارکین وطن لڑکیوں کو رکھنے کے اور زبردستی ان سے غیر اخلاقی کام کرانے اور تیسرے کم سے کم چار افراد کے قتل عمد کے۔ وہاں سزائے موت کا رواج ہوتا تو جی کی مشکل بہت جلد آسان ہوجاتی۔ اگر تم نے اس کے خلاف کوئی کیس کیا تو خود بہت سے قانونی معاملات میں الجھ جاؤگے۔ ان میں سرفہرست ہوگا نوادرات کی اسمگلنگ کا جرم۔ ایک مقدمہ تم پر برطانیہ میں قائم ہوگا۔

اس کے بعد دوسرا پاکستان میں۔"

"پاکستان میں ایسا کوئی قانون نہیں۔"

میں نے کہا "قانون سے لاعلمی کے عذر کو یہاں بھی عدالت قبول نہیں کرتی۔ کیا تم نے پاکستان ANTIQUITIES ایکٹ مجریہ ۱۹۷۵ء کا نام سنا ہے۔ اس کی دفعہ ۲۴ کے تحت پاکستان سے نوادرات کو باہر بھیجنا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس قانون کے سب سیکشن ۳ کے تحت ملک کے اندر بھی نوادرات کی نقل و حمل ممنوع ہے۔"

وہ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد بولا "لگتا ہے تم نے اس سلسلے میں خاصی قانونی معلومات حاصل کی ہیں۔"

میں نے کہا "اس کے علاوہ یونیسکو کنونشن منعقدہ ۱۹۷۰ء کے آرٹیکل سیون کے تحت ممبر ملکوں کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنے ممالک کے عجائب خانوں میں اسمگل شدہ آثار قدیمہ اور نوادرات نہ آنے دیں اور اگر کسی ملک کے نوادرات مجرمانہ طور پر دوسرے ملک پہنچ جائیں تو اس ملک کی وزارت ثقافت کو یہ قانونی حق حاصل ہے کہ وہ چوری ہوکے باہر پہنچ جانے والے نوادرات واپس طلب کرسکے۔"

"میرا ان قوانین سے کوئی تعلق نہیں۔"

"تعلق کیسے نہیں۔ تم کیسے ثابت کروگے کہ تم جائز طور پر ان آثار قدیمہ اور نوادرات کے مالک تھے جو پاکستان کی ملکیت ہیں۔"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے وہ سب کسی سے خریدے تھے۔"

"تم سے پوچھا نہیں جائے گا کہ کس سے؟ پھر تم کس کا نام لوگے۔ اس کے علاوہ ان آثار قدیمہ اور نوادرات کی نقل و حرکت تو ملک کے اندر بھی خلاف قانون ہے۔ ٹیکسلا کے آثار قدیمہ کو صرف حکومت وہاں سے منتقل کرسکتی ہے۔ اسی طرح ہڑپہ اور موہن جو ڈرو کے آثار کو ملک کے کسی میوزیم میں رکھنے کے لیے صرف حکومت مجاز ہے۔ تم پھنس جاؤگے رب نواز اور اگر برطانوی پولیس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں تمہارے چھ لاکھ پاؤنڈز کے نوادرات کا سراغ لگانے میں کامیاب رہے تب بھی تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ وہ سب حکومت پاکستان کے جائز دعوے کے مطابق واپس کردیے جائیں گے۔ رہی بات جی کے اثاثے بکوانے کی تو جی کی زندگی میں یہ ناممکن ہے۔ جولی نے اس کے اثاثوں پر قبضے کے لیے ہی اتنی بڑی قربانی دی تھی کہ اس ادھورے انسان اور مکمل نامرد سے شادی کرلی تھی۔ خدا نے اسے موقع دیا تو اس نے سب سے پہلے اپنے مجازی خدا کو ٹھکانے لگایا۔ جیل میں وہ خود نہ مرا تو جولی اسے مروادے گی۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ وہ کتنی خطرناک عورت ہے۔"

وہ تلخ لہجے میں بولا "پھر تم نے یہ اندازہ کیسے کرلیا؟"

"اس نے خود میرے سامنے یہ اعتراف کرلیا تھا کہ جی کے ساتھ اس کی شادی ایک قید بامشقت تھی۔ اس نے صرف اس امید میں جی کی بیوی بننا قبول کیا تھا کہ چند سال میں وہ طبعی موت نہ مرا تو کسی کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ غالباً چھ سات سال جولی نے خود پر جبر کرکے گزار دیے لیکن بالآخر اسے موقع مل گیا۔ شوہر کے سارے اثاثے اب اس کے ہیں اور اس سے تم ایک پاؤنڈز قانونی طور پر وصول نہیں کرسکتے۔"

وہ چلانے لگا "میرے پاس غیر قانونی طریقے بھی ہیں شاہ جی!"

میں نے کہا "وہ بھی جی کی بیوی تھی۔ اور وہ سارے دھندے جو جی کرتا تھا' اب جولی چلائے گی۔ تم اسے کوئی معمولی عورت نہ سمجھو۔"

"ایک بات کہوں شاہ عالم!"

"تمہاری زبان آزاد ہے۔"

وہ بولا "مجھے اس معاملے میں کوئی گہری سازش نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تم دونوں اس جرم میں برابر کے شریک ہو۔ ڈکیتی کا الزام تم نے بھی پہلے لارڈ پرائس پر عائد کیا تھا۔ وہ خاندانی آدمی ہے' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ سب کچھ ہوسکتا ہے مگر چور ڈاکو نہیں ہوسکتا۔"

"جی خود مجھے لوٹنا چاہتا تھا۔"

"ہاں۔ مگر اس سے پہلے وہ نامعلوم ڈاکو پہنچ گئے۔"

میں نے کہا "اس کی بیوی نے ڈکیتی کے پورے منصوبے کی تفصیلات پولیس کو فراہم کردی ہیں۔ وہ سودا کرانے میرے ساتھ گیا تھا اور اسی نے نقد ادائیگی پر زور دیا تھا۔ میں اس کی گاڑی میں واپس جارہا تھا جب ڈاکوؤں نے ہمیں روک لیا۔ اگر ہم خیروعافیت کے ساتھ جی کے آفس پہنچ جاتے تو جی کے منصوبے کے مطابق اس کے اپنے آدمی ڈاکو بن کے پہنچ جاتے اور سب کچھ چھین کرلے جاتے۔"

"مگر جب یہ بات تمہیں معلوم ہوئی تو تم نے جی کے ساتھ مل کر میرے خلاف سازش کی۔ جی نے تم سے کہا کہ رب نواز کا سارا مال میرے پاس پڑا ہے۔ ہم مل کے اسے غائب کردیتے ہیں۔ تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز تو گئے۔ آدھا مال بھی اتنی ہی مالیت کا ہے۔ وہ تم لے لو۔ باقی آدھا میں رکھ لیتا ہوں۔ نقصان ہوگا رب نواز کا تو وہ بیٹھا ہے پاکستان میں۔

وہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "جب وہ مال برآمد ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی وہ ضرور برآمد ہوگا۔ تو تمہارے سب مفروضات غلط ہو جائیں گے۔"

رب نواز نے کہا "وہ مال تم نے ٹھکانے لگا دیا۔ اب کہاں سے برآمد ہوگا۔ وہ ساری دنیا میں پھیل گیا۔"

میں نے کہا "صدمے سے متاثر ہو کے تمہارے ذہن میں ایسے خیالات آنا بالکل فطری ہے۔"

"میرا چھ لاکھ پاؤنڈز کا نقصان معمولی نہیں ہے شاہ عالم!"

"میں تم سے صرف ہمدردی کر سکتا ہوں لیکن نقصان تو میرا بھی ہوا ہے" میں نے کہا۔

"تم پہلے بھی میرے سوا دو لاکھ پاؤنڈز کے مقروض تھے۔ چھ لاکھ پاؤنڈز کے آدھے تین لاکھ اس میں اور شامل کر لو" وہ پھر چلانے لگا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو رب نواز! مال تم نے میرے حوالے نہیں کیا تھا۔ جی کو بیچا تھا۔"

"میں ہمیشہ سے ایسا ہی کر رہا تھا۔ میرا مال تم لندن لے جاتے تھے اور جی اسے گاہکوں تک پہنچاتا تھا۔"

"لیکن اس دفعہ طریق کار الٹ گیا تھا۔ میں پہلے سے لندن میں تھا اور تم نے مال براہ راست جی کو بھیجا تھا۔ اس نے مجھے دکھایا تھا اور میں نے ایک ایجنٹ کی معرفت لارڈ پرائس سے سودا کیا تھا۔ لیکن بعد میں لارڈ پرائس نے اس ایجنٹ کو قتل کرا دیا اور گرفتار ہو گیا۔ اب اس کی زندگی کے جو تھوڑے بہت دن بچے ہیں وہ جیل میں ہی گزریں گے۔"

"دیکھو شاہ عالم! ہم مل کے بیٹھیں گے اور کوئی صورت نکالیں گے جس سے تمہارے تین لاکھ پاؤنڈز کا نقصان بھی پورا ہو جائے اور میرے چھ لاکھ پاؤنڈز کے مال کا گھاٹا بھی برابر ہو جائے۔ چھ لاکھ میں چار لاکھ تو میرے تھے' تمہارا حصہ صرف ایک لاکھ پاؤنڈز کا بنتا تھا اور اتنا ہی جی کا تھا۔"

"اگر وہ تین لاکھ مجھ سے نہ چھینے جاتے تو میں دو لاکھ یقیناً تم تک پہنچا دیتا" میں نے کہا "باقی دو لاکھ بھی دیتا۔"

"چلو تم نے یہ تو مانا کہ دو لاکھ پاؤنڈز میرے تھے۔ اسی طرح تم مجھے سوا چار لاکھ پاؤنڈز دینے کے پابند ہو۔ اخلاقی طور پر اور ہم جو غیر قانونی کام کر رہے تھے اس میں قانونی معاہدے یا قانونی ذمے داری کی بات بھی نہیں۔ آج کل حالات بہت سازگار ہیں۔ مارکیٹ میں مال بہت ہے اور سستا بھی ہے۔ ظاہر ہے سپلائی زیادہ ہوگی تو قیمت گرے گی۔ لیکن بین الاقوامی مارکیٹ پہلے سے زیادہ تیز جا رہی ہے۔ پہلے پانچ کے سو ملتے تھے تو اب تین کے سوا سو کا ریٹ ہے۔ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا "ہم فائدہ ضرور اٹھائیں گے لیکن ابھی تو میں تجارت سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لے رہا ہوں۔"

وہ بولا "ان دونوں میں فرق ہے کوئی؟"

میں نے کہا "نہیں مگر آج ہی پریس کانفرنس میں' میں نے اپنے پروگرام کا اعلان کیا ہے۔ انتخابات میں دو مہینے باقی ہیں اور یہ وقت اپنی پارٹی کو پوری طرح فعال کرنے کے لیے بہت کم ہے۔"

"میں تو کہتا ہوں شاہ جی کہ اب اپنی ساری توجہ بزنس کو دو۔ سیاست کے بھاری پتھر کو ایک بار چوم کے چھوڑ دیا ہے تو اسے دوبارہ اٹھانے کی ناکام کوشش سے جگ ہنسائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ کم سے کم اس الیکشن میں مجھے تمہاری کامیابی کا کوئی چانس نظر نہیں آتا۔"

میں نے کہا "میں کوشش کیے بغیر میدان چھوڑنے والا نہیں ہوں۔"

"تم شرط لگا لو مجھ سے۔ تمہارے امیدواروں کی ضمانت بھی ضبط ہو جائے گی۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "دیکھو' رب نواز۔ تمہارے لیے ایسا کہنا بہت قبل از وقت ہے۔ انتخابات میں جو سب کے ساتھ ہوتا آیا ہے وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم ہار سکتے ہیں تو جیت بھی سکتے ہیں۔ اگر ہمارے امیدواروں کی ضمانت ضبط ہو سکتی ہے تو وہ بلامقابلہ کامیاب بھی ہو سکتے ہیں۔ ہر الیکشن میں SURPRISES بھی بہت ہوتے ہیں۔"

"پتا نہیں اپنی پارٹی کو دوبارہ زندہ اور فعال کرنے کا مشورہ تمہیں کس عقلمند نے دیا تھا؟"

میں نے کہا "یہ مت بھولو کہ کچھ عرصہ قبل خود تم نے میری پارٹی کا ٹکٹ بڑی خوشی سے قبول کیا تھا۔"

وہ بولا "اس وقت مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں گھاٹے کا سودا کر رہا ہوں۔ میں آزاد ہی بھلا شاہ جی۔ اپنے آبائی حلقے سے میری سیٹ ریزرو ہے۔"

میں نے کہا "رب نواز! میں اس وقت سیاسی نظریات اور صورت حالات پر بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"مجھے بھی تمہارے سیاسی مستقبل کی نہیں' اپنے ساڑھے چار لاکھ پاؤنڈز کی فکر ہے۔ ڈیڑھ کروڑ روپے بنتے ہیں یہ پاکستانی کرنسی میں جو تم مجھے ادا کرنے کے پابند ہو۔"

میں نے کہا "میں کہہ چکا ہوں کہ کاروباری معاملات پر بعد میں بات کریں گے۔"

وہ چلانے لگا "بعد میں کب؟ انتخابات کے بعد۔ تم مجھے ٹال رہے ہو شاہ جی!"

میں نے سخت لہجے میں کہا "اس وقت میں سونا چاہتا ہوں رب نواز!"

وہ مشتعل ہو گیا "میری نیندیں حرام کر دی ہیں تم نے اور خود چین سے سونا چاہتے ہو۔ کسی غلط فہمی میں مت رہنا شاہ عالم۔ میرے پاس رسید نہیں ہے گواہ نہیں ہیں اور میں ڈیڑھ کروڑ تم سے قانونی طریقے سے عدالت کے ذریعے وصول نہیں کر سکتا مگر قانون سے مدد لینے والے ہوتے ہیں ۔۔۔" اس نے خود کو گالی دی۔

میں نے کہا "تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟"

"ہاں' میں دھمکی دے رہا ہوں تمہیں۔ میرے ڈیڑھ کروڑ ادا کیے بغیر تم مر بھی نہیں سکتے شاہ عالم۔ تم مجھے جانتے ہو" وہ چیخ کے بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ اور میں ان چاروں کو بھی جانتا ہوں جن کو آج تم نے بھیجا تھا۔ وہ پریس کانفرنس کے دوران ہی پکڑ لیے گئے تھے مگر فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ میرے علاوہ بہت سے لوگوں نے دیکھا تھا ان جعلی صحافیوں کو۔"

وہ لہجہ بدل کے بولا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں نے کسی کو بھی نہیں بھیجا تھا۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں شاہ عالم!"

"مجھے چکر دینے کی کوشش مت کرو۔ شاید وہ اس وقت بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوں گے۔"

"نہیں شاہ عالم! تم جس کی قسم کہو' میں کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے کسی کو تمہارے پاس نہیں بھیجا تھا۔"

میں نے کہا "قسم کھانے سے جھوٹ کبھی سچ نہیں ہوتا۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے بھی انہیں پکڑ لیا تھا مگر وہ ہنگامہ کر کے نکل گئے۔"

وہ خدا' رسول کی قسمیں کھانے لگا۔ مگر میں نے فون کا ریسیور رکھ دیا اور آپریٹر سے کہا کہ وہ مجھے کوئی فون کال نہ دے کیونکہ کچھ لوگ مجھے فون پر قتل کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔

شبنم اٹھ کر میرے پاس آ گئی "ٹیک اٹ ایزی عالی!"

میں نے کہا "یہ سب کچھ میرے پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ سچ مچ کچھ لوگ مجھے اغوا کرنے کی کوشش کریں اور مجھ پر ایک ناکام قاتلانہ حملہ بھی ہو جائے۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے؟"

"کیا ہو سکتا ہے؟"

"تم مجھ پر ایک ناکام قاتلانہ حملے کا بندوبست کرا سکتی ہو؟"

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا "پلیز عالی! معاملات کو اس انتہا تک مت لے جاؤ۔"

میں نے کہا "میں آنے والے واقعات کو ایک منطقی انجام کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آج میں نے خطرات کی پیش گوئی کر دی۔ مستند صحافیوں نے چار افراد کو دیکھ لیا جو بدنیتی کے ساتھ پریس کانفرنس کے وقت موجود تھے۔ میں نے ہوٹل کی انتظامیہ کو بھی بتا دیا ہے کہ میں یہاں محفوظ نہیں ہوں۔ رب نواز نے صحیح وقت پر دھمکی دی۔ اب ایک قاتلانہ حملے کا ڈراما ہو جائے تو تیاری مکمل۔"

"آئی ایم سوری' میں یہ نہیں کر سکتی۔"

"کوئی بات نہیں۔ صبح رئیس آ جائے گا' وہ سب کر لے گا۔ ایک ناکام قاتلانہ حملے کے بعد شاہ عالم کسی حادثے میں ہلاک ہو جاتا ہے یا غائب ہو جاتا ہے اور بعد میں اس کی ناقابل شناخت لاش ملتی ہے تو شک کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہی سمجھا جائے گا کہ شاہ عالم کو اس کے دشمنوں نے مار دیا۔"

اس نے میرے گلے میں باہیں حمائل کر دیں "چھوڑو یہ ڈرانے والی باتیں۔ ہم اتنے عرصے بعد ملے ہیں' کوئی اپنی بات کرو۔"

میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی اور اسے نرمی سے دور کرنا چاہا "یہ باتیں تم دور بیٹھ کے بھی کر سکتی ہو۔"

وہ مجھ سے اور چمٹ گئی۔ "نہیں شاہ عالم! اب اس سے زیادہ دوری مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ دو مہینے میں نے کیسے گزارے ہیں؟"

میں نے اپنا دفاع جاری رکھا "شبنم' پلیز! دیکھو تم نے وعدہ کیا تھا۔"

وہ مجھے دیوانہ وار چومنے لگی "تم سمجھتے کیوں نہیں عالی! آئی لو یو' میں کتنا چاہتی ہوں تمہیں۔"

میں نے اسے دھکا دے کر الگ کر دیا "دیکھو شبنم۔ مجھے تمہاری چاہت پر کوئی اعتراض نہیں' مگر یہ سب کھیل نہیں چلے گا۔"

وہ دکھی لہجے میں بولی "تم ایسے کیوں پیش آ رہے ہو میرے ساتھ؟ دو مہینے بعد لوٹے ہو' پھر بھی ۔۔۔ یہ بے رخی ۔۔۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "آخر میں کتنی بار وضاحت کروں کہ شاہ عالم وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہے جو تمہارا استحصال کرتا رہا' جسمانی طور پر۔"

"تمہیں میرے جذبات کا بھی خیال نہیں۔ آخر کیوں عالی! تم جو مجسم آگ تھے' بے حسی کی برف کیوں بن گئے ہو۔ تم چند دن بھی مجھ سے دور نہیں رہ سکتے تھے۔ پھر کیسے تم اس حد تک بے نیاز ہو گئے ہو کہ تمہیں میری ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔"

میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کے نرمی سے کہا۔ "شبنم۔ میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں' بہت عزت کرتا ہوں۔"

اس نے میرے ہاتھ جھٹک دیے "نہیں چاہیے مجھے یہ عزت اور تمہاری ایسی قدر دانی۔ تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میں گوشت پوست کی بنی ہوئی زندہ عورت ہوں۔ زندگی کی ساری توانائی اور ضرورت' جذبوں اور احساسات کی ساری تڑپ رکھتی ہوں۔"

"لیکن میں تمہیں دل بہلانے کا ایک خوبصورت کھلونا نہیں سمجھتا جیسا کہ شاہ عالم پہلے سمجھتا تھا۔ تم ایک ذہین اور حوصلہ مند عورت ہو۔ مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہے۔"

وہ مایوسی کے ردِ عمل کی خفت کا شکار ہو گئی "آخر بات کیا ہے۔ تم ایسی باتیں کیوں کرتے ہو مجھ سے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ حسین ہوں اور میرے شباب کی قوت تسخیر کیا ہے۔ میرے ایک اشارے پر نہ جانے کتنے سر کٹانے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ میری ایک نظر کے لیے ترستے ہیں تم جیسے ہزاروں۔ مگر مجھے تمہارے سوا کسی کی ضرورت نہیں' میں بہت مجبور ہوں۔"

میں نے کہا "سوری شبنم! میں مجبور نہیں ہوں۔"

وہ غصے میں اپنے ہونٹ کاٹنے لگی "تم اس طرح مجھے نہیں ٹھکرا سکتے۔"

میں نے کہا "تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"نہیں' تم میری مجبوری سے فائدہ اٹھا کے مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ آخر کیوں عالی! تمہاری خاطر میں نے کیا نہیں کیا۔ میں نے تمہیں اس عورت سے زیادہ محبت دی جو تمہاری بیوی تھی۔ تم نے نہ جانے کتنی بار اس کا اعتراف کیا۔ اب تو وہ بھی نہیں ہے ہمارے بیچ میں۔ پھر تمہیں کس کا ڈر ہے؟"

"ڈر کسی کا نہیں' ذرا بات کو سمجھو۔"

"بات کو تم سمجھو۔ آج ساری دنیا میں تمہارے نام کے ساتھ میرا نام ایسے آتا ہے جیسے میں ایک صحافی' ایک اخبار کی ایڈیٹر نہیں' کوئی فاحشہ ہوں' تمہاری داشتہ ہوں۔ اور میں ساری رسوائی کو برداشت کرتی ہوں" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "جہاں موقع ملتا ہے کوئی مجھ پر کیچڑ اچھالنے سے نہیں چوکتا۔ سب بولتے ہیں کہ اب کیا ہے' اب شاہ عالم تم سے شادی کیوں نہیں کرتا؟ آزاد صاحب مجھے بے عزت کرتے ہیں کہ تم نے خود کو لٹا دیا۔ اب کیا رہ گیا ہے تمہارے پاس اسے دینے کے لیے۔ وہ کیوں پروا کرے گا تمہاری۔ وہ مجھے سمجھاتے ہیں کہ اتنے اچھے اچھے لوگ تمہاری ایک نگاہِ التفات کے لیے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو پسند کرو۔ میں کیا بتاؤں انہیں کہ شبنم کو صرف شاہ عالم چاہیے' کوئی اور مرد نہیں۔"

میں نے کہا "شبنم' اگر میں کر سکتا تو تم سے پہلے ہی شادی کر لیتا۔"

"پہلے تم رخشی سے ڈرتے تھے۔ رخشی کا کانٹا ہمارے بیچ سے نکل گیا' اب تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کر سکتے۔ دیکھو' میں خود کو بالکل بدل لوں گی۔ تم جیسا چاہتے ہو میں ویسی ہی بن جاؤں گی۔ میں یہ صحافت کا پیشہ بھی چھوڑ دوں گی۔ میں صرف تمہاری بیوی بن کے رہوں گی۔ تمہیں وہ سب خوشیاں دوں گی جو رخشی نہیں دے سکی۔ جو دنیا کی کوئی عورت تمہیں نہیں دے سکتی۔" وہ میری گود میں سر رکھ کر رونے لگی اور نیچے بیٹھ گئی۔

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ "شبنم۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ تم مجھ سے محبت کرتی ہو' کرو لیکن میں۔۔۔"

"تم مجھ سے محبت نہیں کر سکتے نہ کرو' بغیر محبت کے مجھے اپنے دل میں' اپنے گھر میں جگہ دے دو۔"

"یہ ناممکن ہے۔۔۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کیوں ناممکن ہے۔ میں تم سے کیا مانگ رہی ہوں؟ صرف تھوڑی سی توجہ' تھوڑا سا التفات۔ میں تم پر اجارہ داری نہیں چاہتی۔ یہ نہیں کہتی کہ مجھے اپنانے کے بعد تم کسی اور کی طرف دیکھ ہی نہیں سکتے' تم جسے چاہو۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔"

اس نے اچانک سر اٹھا کے مجھے دیکھا "عالی۔ تم کسی اور کو چاہتے ہو۔ اگر چاہتے ہو تو اس سے شادی کر لو۔ میں کرا دوں گی تمہاری شادی۔ میں اسے دلہن بنا کے لاؤں گی تمہارے لیے۔ اور پھر تمہارے ساتھ ایک خادمہ بن کے رہوں گی۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو شبنم!"

"یہ تو ٹھیک ہے۔ میں پاگل ہوں۔ لیکن مجھے اور پاگل مت کرو۔ مجھے دیوانگی کی اس انتہا تک مت لے جاؤ جہاں میں کچھ کر بیٹھوں۔ تم مجھے اپنی بیوی بنانا نہیں چاہتے؟ مت بناؤ۔ اپنی داشتہ رکھ لو۔ میں تمہاری بیوی کو منالوں گی' اسے سمجھاؤں گی کہ قصور تمہارے شوہر کا نہیں' میرا ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔"

"اس قسم کی گھٹیا باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں شبنم! تم ایک باعزت' تعلیم یافتہ اور کامیاب صحافی ہو۔ تمہاری خود اعتمادی اور عزتِ نفس۔"

اس نے میری بات کاٹ کے کہا "تم چندا سے شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟"

"میں جانتی ہوں' اس کے سوا کوئی اور لڑکی نہیں ہو سکتی لیکن میں تو خود کہہ رہی ہوں کہ چندا سے شادی کر لو۔ میں نے رخشی کے سامنے بھی اعترافِ جرم کر لیا تھا۔ اپنی بے بسی کو مان لیا تھا اور اس نے بھی میری مجبوری کو تسلیم کر لیا تھا۔ کیا کبھی اس نے تمہیں میرے نام کا طعنہ دیا؟ میں چندا سے بھی کہہ دوں گی۔"

میں نے کہا "خدا کے لیے شبنم! کوئی اور بات کرو۔ دیکھو' کتنی رات ہو گئی ہے۔ ابھی تک میں نے کمال سے اور کسی سے بات نہیں کی۔"

وہ غصے میں پھنکارتی ہوئی اٹھی "نہیں' مجھے بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے۔ کیا میں اتنی بدصورت ہوں' اتنی قابلِ نفرت ہوں' کیا کمی ہے مجھ میں؟"

میں ڈر گیا "شبنم! آہستہ بولو۔"

"کیوں آہستہ بولوں۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ ڈرتے ہو تم!" اس نے چیخ کے کہا "بتاؤ' کیا میں بوڑھی ہوں۔ کوڑھ نکلا ہوا ہے میرے جسم پر۔ ایڈز ہے مجھے؟ میرا جسم عورت کا نہیں ہے؟" اس نے اچانک اپنے کپڑے اتار کر پھینکنے شروع کر دیے اور میرے سامنے تن کے کھڑی ہو گئی "دیکھو' کیا یہ جسم اس قابل نہیں ہے کہ کسی کے جذبات جگا سکے۔ یا تم نامرد ہو گئے ہو؟"

میں نے اس کے ایک بھرپور جھانپڑ رسید کیا۔ وہ بیڈ پر گر گئی لیکن چلاتی رہی "مارو' اور مارو مجھے۔ لیکن تم سچ کو چندا سے بھی کیسے چھپاؤ گے۔ تم اب مرد ہی نہیں رہے تو اس سے بھی کیسے شادی کرو گے؟" وہ ہنسنے لگی۔ ہسٹیریا کی دیوانگی میں قہقہے لگانے لگی۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ میرا سانس پھولا ہوا تھا اور میرے ماتھے پر پسینہ بہہ رہا تھا۔ میں نے ایک تولیے سے چہرہ صاف کیا اور دروازے کو تھوڑا سا کھولا۔

باہر وہی اسسٹنٹ منیجر کھڑا ہوا تھا "اینی پرابلم سر!"

"نو پرابلم ہو گی تو میں تم سے نہیں کہوں گا۔"

"لیکن دو مہمانوں نے شکایت کی ہے کہ آپ کے کمرے میں ہنگامہ ہو رہا ہے۔ یو سی سر! لوگ سو رہے ہیں۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میری بیوی۔۔۔ وہ کچھ زیادہ پی کے آؤٹ ہو گئی۔۔۔ اب ٹھیک ہے۔"

"یس سر!" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا اور چلا گیا۔

شبنم بیڈ پر پڑی لرز رہی تھی۔ کانپ رہی تھی اور اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔ "مجھے مردوں کی کیا کمی' میں ہر روز۔۔۔"

میں نے اس کی گردن دبوچ لی "اگر تم نے اپنی بکواس بند نہ کی تو میں۔۔۔"

اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا "کیا کرو گے تم؟"

میں نے اسے چھوڑ دیا "کچھ نہیں۔ پلیز' اپنے کپڑے پہن لو۔ ایسا نہ ہو کہ ہوٹل والے پولیس کو بلا لیں۔"

وہ پھر بیڈ پر اوندھی گر گئی۔ اسے اپنا ہوش نہیں تھا۔ اب وہ خاموش ہونے لگی تھی مگر اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ میں نے خود اسے زبردستی کپڑے پہنائے اور اپنے سامان میں سکون آور گولیاں تلاش کیں جو میں کسی بھی ہنگامی ضرورت کے لیے ساتھ رکھتا تھا۔ شبنم نے مزاحمت نہیں کی اور دو گولیاں کھا کے سیدھی لیٹ گئی۔

ایک اعصاب شکن حد تک بوجھل اور قابلِ نفرت خاموشی میں وقت کا ہر لمحہ مجھے شرمسار کرتا ہوا گزرنے لگا۔ میرا ضمیر صاف تھا مگر میرا دل مجھے اس ناخوشگوار صورتِ حال پر ملامت کر رہا تھا۔ میں نے شبنم کو یقین دلا دیا تھا کہ میں زندگی کے پہلے دور میں ناصر عظیم تھا۔ سیاست داں کی حیثیت سے میں شاہ عالم مشہور ہوا لیکن اب میں پھر اپنی اصل زندگی کی طرف لوٹ کے ناصر عظیم بننا چاہتا ہوں اور جو فرق ناصر عظیم کے کردار میں تھا وہی اب شاہ عالم کے کردار میں بھی نظر آئے گا۔ شبنم نے میرے جھوٹ کو دل سے سچ مان لیا تھا اور زندگی کا ایک نیا دور شروع کرنے میں میری پوری مدد بھی کی تھی مگر وہ اپنے جذبات کو نہیں بدل سکی تھی۔ وہ میرے ساتھ اسی طرح رہنا چاہتی تھی جیسے شاہ عالم کے ساتھ رہتی تھی لیکن میں اس سے تعلق کے معاملے میں اپنے ضابطۂ اخلاق کے اصولوں کو پامال نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میری بدلی ہوئی

شخصیت کے رویے کو دیکھتی رہی اور مجبوراً برداشت بھی کرتی رہی مگر آج جذبات کی آتش فشانی نے شرم وحیا کی زنجیریں توڑ کے اسے دیوانگی کی اس سرحد تک دھکیل دیا جہاں وہ ایک صحافی، ایک معزز تعلیم یافتہ عورت اور ایک ایڈیٹر کی انسانی سطح سے گر کر جسم کی بھوک کے جذبات سے مغلوب حیوان رہ گئی تھی۔

دیوانگی کے اس دورے سے گزرتے ہی اعصابی کمزوری اس پر غالب آگئی تھی۔ وہ چند منٹ کے اندر اندر پرسکون ہوکے سوگئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب وہ سو کر اٹھے گی تو اس پر اس دورے کے ردعمل کی پشیمانی اور ملامت کے جذبات کا دورہ پڑے گا اور وہ اپنے آپ سے اتنی شرمسار ہوگی کہ میرا سامنا نہیں کر پائے گی۔

جب مجھے پورا یقین آگیا کہ وہ بے ہوشی کی گہری نیند میں گم ہو چکی ہے تو میں نے صوفے پر لیٹ کے فون کو اپنے قریب کیا اور قمر کے گھر کا فون نمبر ملایا۔

گھنٹی پانچ چھ بار بجی، پھر قمر نے غنودگی میں کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "آپا جی، السلام علیکم!"

قمر نے ایک چیخ ماری "یہ تم بول رہے ہو بھائی!"

میں نے کہا "نہیں۔ تیرے کان بج رہے ہیں۔"

وہ چلائی "کہاں ہو تم بھائی! جب سے لندن گئے ہو ایک بار فون کیا تھا۔ وہ بھی ڈیڑھ مہینہ ہوگیا۔ مصروفیت میں بہن کو بالکل بھلا دیا۔"

میں نے آہ بھری "مصروفیت کا مت پوچھ بہنا!"

"ہفتہ دس دن کا کہہ کے گئے تھے تم بھائی اور جب چندا آئی تھی واپس تو اس نے کہا تھا کہ تمہارے بھائی بھی لوٹ آئیں گے دو چار دن میں۔"

میں نے کہا "شاید دو چار ہفتے کہا ہوگا۔ اور دیکھ میں آگیا۔"

اس نے ایک اور چیخ ماری "کیا؟ تم آگئے ہو بھائی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر اگلی پرواز سے واپس جا رہا ہوں۔"

وہ تشویش میں مبتلا ہوگئی "کیوں بھائی۔ گھر کیوں نہیں آئے؟"

میں نے کہا "مجبوری ہے۔ ایک چیز بھول آیا تھا۔ اس کے بغیر تو گھر میں کہاں گھسنے دے گی۔ واپس جانا ہی پڑے گا۔"

وہ ہنسنے لگی "ارے نہیں بھائی۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ میں تو بھول ہی گئی ہوں چاکلیٹ کھانا۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا "ارے اُداس کیوں ہوتی ہے؟ تیرا بھائی سب کچھ بھول سکتا ہے۔ چاکلیٹ نہیں بھول سکتا وہ الو کا پٹھا تو مرا پڑا ہوگا۔"

وہ ہنسی "نہیں بھائی، جاگ رہے ہیں اور گھور رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی آواز آئی "خیر سے بدھو گھر لوٹ آئے؟"

میں نے کہا "ساڑھے تین گھنٹے ہوگئے ہمیں لاہور میں قدم رنجہ فرمائے ہوئے۔"

"اور اب فون کرنے کا خیال آیا ہے، آدھی رات کے بعد۔"

میں نے کہا "یار، وہ ایک پریس کانفرنس تھی۔"

"میں نے دیکھ لیا تھا تیرا پروگرام اخبار میں۔ اس وقت کہاں سے بول رہا ہے تو؟"

"ہمیشہ کی طرح اپنے منہ سے۔ اور منہ دیکھا جا سکتا ہے پی سی کے وی آئی پی سوئٹ نمبر دو میں۔"

"اور کون ہے تیرے ساتھ؟"

میں نے ایک نظر گہری نیند میں سوئی ہوئی شبنم کو دیکھا "یار کیا بتاؤں، شرم آتی ہے بتاتے ہوئے۔ ویسے تو بھابی ہوتی ہے رشتے میں قمر کی۔ مگر یار ہے خالص ولایتی مال۔ فرنگی حسینہ ہے۔"

"تو میم لے آیا ہے؟"

میں نے کہا "اب نہیں یار۔ میم مجھے لے کر آئی ہے پاکستان۔ اتنی محبت کرتی ہے مجھ سے کہ کہہ رہی تھی تمہیں پاکستانی بیوی بن کے دکھاؤں گی۔ شٹل کاک برقع پہنوں گی۔ ہر سال کم سے کم ایک بچہ دوں گی۔ تمہارے پاؤں دھودھو کے پیوں گی۔ روز مسور کی دال پکاؤں گی اور کہوں گی یہ منہ اور مسور کی دال۔ کیا نصیب ہیں میرے۔"

وہ ہنسنے لگا "اب لے آیا ہے کسی میم کو تو قمر کیا کر سکتی ہے؟"

فوراً ہی قمر کی آواز آئی "یہ کیا بھائی، تم نے کسی میم سے شادی کرلی ہے۔ کہہ دو یہ جھوٹ ہے۔ تم مذاق کر رہے تھے؟"

"نہیں قمر۔ مذاق تو تقدیر نے کیا ہے میرے ساتھ" میں نے دردناک لہجہ بنا کے کہا "وہ کیا کہا ہے مہر علی نے گستاخ اکھیاں کتھے جا لڑیاں۔ نصیب میں جو لکھا ہو وہ ہو کے رہتا ہے۔ یہ ہے تو میم مگر تو دیکھے گی تو خوش ہو جائے گی۔"

وہ بگڑ کے بولی "مجھے کوئی شوق نہیں بھائی، آپ کو ہی مبارک ہو وہ امپورٹیڈ ولایتی بیوی۔ ریجھ گئے ہوں گے سفید چمڑی پر۔"

میں نے کہا "ارے نہیں قمر۔ بے شک وہ ولایتی چیز ہے مگر رنگ اس کا ہے بالکل اس توے جیسا جس پر تو روٹیاں تھوپتی ہے۔"

"یعنی نیگرو ہے وہ" قمر چلا کے بولی۔

"بات رنگ کی نہیں قمر۔ دل آنے کی ہے۔ اب ویسے تو وزن بھی اس کا ہے دو سو بیس پاؤنڈز۔ اور ہے بھی کرسچین۔"

"تم نے مسلمان کیے بغیر اس سے شادی کرلی بھائی!" قمر رونے کے قریب ہوگئی۔

"بات یہ ہے قمر کہ سارے کھیل نصیب کے ہیں۔ اسے مجھ سے محبت ہوگئی تھی۔ میں کیا اس کا دل توڑ دیتا؟ یہ گناہ مجھ سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھ سے شادی کرو گے؟ میں نے کہا کہ میری تو مرضی نہیں ہے۔ وہ بولی چلو ٹاس کر لیتے ہیں۔ بڑی انصاف پسند ہے وہ۔ کسی معاملے میں میرے ساتھ زبردستی نہیں کرتی۔ ٹاس سے فیصلہ میں نے قبول کرلیا۔ ٹاس میں ہار گیا۔ اس کے بعد آیا معاملہ مذہب کا تو میں نے کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔ وہ پھر بولی کہ ٹاس کر لیتے ہیں۔ اور اب میں کیا کہوں، میں پھر ٹاس ہار گیا۔ شادی کے بعد میں نے کہا کہ اب ہم ولایت میں نہیں، پاکستان میں رہیں گے تو پھر ٹاس پر فیصلہ ہوا۔ وہ جیت گئی اور مجھے اس کو ساتھ لے کر آنا پڑا۔ ابھی کل ٹاس کیا کہ پاکستان پہنچ کے کہاں جائیں گی۔ وہ بولی پی سی اور میں نے کہا بہن کے گھر۔ یہ بھی میں ہار گیا۔ اب تو ہی بتا، میں کیا کروں؟ وہ تو کہہ رہی ہے کہ ٹاس کرلو، بچہ کس کے ہوگا، میرے یا تمہارے؟ اس کے بعد ٹاس کریں گے کہ لڑکا ہو یا لڑکی؟"

قمر کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا "آپ پھر ہار جائیں گے بھائی!"

میں نے کہا "اچھا! باقی باتیں ملاقات پر۔ میں صبح آؤں گا۔"

"آپ ہوٹل میں کیوں ٹھہرے ہیں بھائی؟"

میں نے کہا "جس آدمی کا کوئی گھر نہ ہو وہ کہاں جائے۔"

"کیوں بھائی، میرا گھر آپ کا نہیں ہے۔"

"افسوس کہ مجھے بھونکنا نہیں آتا۔"

"کیا مطلب؟"

میں نے کہا "تو نے سنا نہیں۔ بہن کے گھر بھائی کتا۔ ساس کے گھر جوائی کتا۔"

"مت کریں ایسی باتیں بھائی۔ یہ آپ کے دوست کا گھر بھی تو ہے۔"

میں نے کہا "اچھا یہ بتا چندا کا کیا حال ہے۔"

"آپ خود پوچھ لیں فون کرکے" وہ بولی "اس کا فون نمبر الگ ہوگیا ہے؟" اس نے مجھے نمبر بتا دیا۔

میں نے کہا "اچھا اب تو سو جا۔ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔"

چندا خلافِ توقع جاگ رہی تھی۔ میں نے کہا "کیسی ہو تم؟"

وہ بولی "جیسی پہلے تھی، ہمیشہ تھی۔"

اس کی بات میں مجھے طنز کی آمیزش محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے بالواسطہ طور پر وہ مجھے یاد دلا رہی ہے کہ یہ تم ہی ہو جو ناصر عظیم سے شاہ عالم بنے تھے پھر شاہ عالم سے ناصر عظیم بنے۔ اور آج کل پھر شاہ عالم ہو۔ اس کے بعد تم ناصر عظیم بن کے رہنا چاہتے ہو۔ لیکن دنیا کے باقی لوگ، ان کے رشتے، ان کے روز و شب سب وہی ہیں۔ میں جیسی تھی، ویسی ہی ہوں اور ویسی ہی رہوں گی۔ آج بھی، کل بھی مجھ سے بار کیں سے، قمر سے یا کمال سے یہ کیا پوچھنا کہ کیسے ہو؟

میں نے کہا "یہ صرف تمہارا خیال ہے کہ تم ویسی ہی ہو۔"

وہ ہنسی "کیوں؟ تمہیں کیا تبدیلی محسوس ہوئی؟"

میں نے کہا "تمہیں رات کو کھانا کھاتے ہی نیند آنے لگتی تھی۔ سونے کی ماہر تھیں تم۔ تمہیں تو جگانا بھی ایک مرحلہ ہوتا تھا۔ لیکن اب تم رات کے ایک بجے بھی جاگ رہی ہو؟"

وہ بولی "تم کب آرہے ہو؟ لندن کے بارے میں صحیح کہتے ہیں لوگ کہ یہ آدمی کو اسیر کرلیتا ہے۔"

میں نے کہا "صرف انہی کو جو اسیر ہونا چاہتے ہیں۔"

"تم شاید بھول گئے کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

"ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے سے بہت کچھ کہا تھا" میں نے کہا۔

"چالاک آدمی۔ بات کو گھمانے کی ضرورت نہیں۔ تم دو دن بعد ہی واپس آرہے تھے۔ تم نے کہا تھا کہ میں پرسوں روانہ ہو جاؤں گا۔"

میں نے کہا "بعض اوقات تقدیر آدمی کے راستے میں نظر نہ آنے والے جال پھیلا دیتی ہے۔"

"خیر چھوڑو۔ اب کیا پروگرام ہے، کب آرہے ہو؟"

میں نے کہا "تم کہو تو ابھی پہنچ جاؤں' اسی وقت!"

وہ ہنسی "پہنچ جاؤ۔"

میں نے ریسیور رکھا۔ ایک نظر سوتی ہوئی شبنم پر ڈالی اور دروازے کو اپنے پیچھے آہستہ سے بند کرکے باہر نکل آیا۔ ہوٹل کا کوریڈور سنسان پڑا تھا لیکن کچھ کمروں میں روشنی تھی اور کچھ بند دروازوں کی تاریکی کے پیچھے سے دبی دبی ہنسی اور خود اپنی کہانی کہتی سرگوشیاں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں زینے سے اُترا تو مجھے لابی میں اور اس کے آگے کافی شاپس میں بہت سے لوگ نظر آئے جو بے فکری سے باتیں کررہے تھے۔ ہنس رہے تھے' سگریٹوں کا دھواں اڑا رہے تھے اور کافی کو انجوائے کررہے تھے۔

ہوٹل کے صدر دروازے پر اس وقت جو دو ٹیکسیاں موجود تھیں۔ میں نے آگے والی ٹیکسی کے ڈرائیور کو کمال کے اسپتال کا پتا سمجھایا تو وہ کچھ تذبذب میں پڑگیا۔ کمال کا اسپتال ملتان روڈ پر نسبتاً غیر آباد علاقے میں تھا اور آدھی رات کے بعد ٹیکسی والے کو وہاں سے واپسی پر سواری ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ میٹر سے چلنے کا دستور اب تقریباً ہر شہر میں ختم ہوتا جارہا ہے۔ رکشا ٹیکسی والے منہ پھاڑ کے رقم مانگتے ہیں اور ضرورت مند اپنی مجبوری یا.....وقت کو دیکھتے ہوئے سودا کرلیتا ہے۔

رات کے پونے دو بجے کمال اسپتال کا چوکیدار بھی اپنے کیبن میں سورہا تھا۔ میں نے اسے آواز دے کر بیدار کیا تو اس نے مجھے پہچان کے گیٹ کھول دیا۔ پانچ منٹ بعد میں چندا کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کمال اور قمر کا گھر تھا مگر وہاں اندھیرا تھا۔ میں نے آہستہ سے دستک دی اور پھر کچھ اونچی آواز میں۔ تو اندر کے کمرے کا دروازہ کھلا اور روشنی صحن میں آئی۔

چندا نے اندر سے ہی پوچھا "کون ہے؟"

میں نے کہا "وہی جسے تم نے فوراً پہنچنے کا حکم دیا تھا۔"

چشم تصور سے میں نے چندا کی صورت پر شاک اور بے یقینی کے تاثرات کو دیکھا اور پھر اس پُر مسرت مسکراہٹ کو جو اس کے سپاٹ جذبات سے عاری چہرے پر صبح کی شفق بن کے روشن ہوگئی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔

میں نے مسکرا کے کہا "بلا تو لیا ہے' کیا اب اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی؟"

"بڑے ڈرامے باز ہو تم۔" اس نے راستہ چھوڑ دیا۔

"ڈراما کیا۔ تم نے بلایا اور ہم چلے آئے' بقول فلمی شاعر۔"

اس نے صحن کا دروازہ بند کیا "تم نے یہیں سے فون کیا تھا۔"

میں نے کہا "جب تم سے بات ہوئی آخری بار تو میں لندن میں تھا۔ مگر تم نے کہا کہ ابھی آجاؤ تو میں نے خیال کے ساتھ پرواز کی اور بس حاضر ہوگیا۔"

وہ مجھے اندر لے گئی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی اور اس کے بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ جو کتاب وہ پڑھ رہی تھی وہ تکیے پر الٹی کھلی پڑی تھی۔ چندا مجھے پہلے کے مقابلے میں کچھ کمزور اور تھکی ہوئی نظر آئی حالانکہ اس کی ادائے حسن کی معصومیت کا انداز پہلے سے زیادہ جان لیوا ہوگیا تھا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا تو اس نے کہا "کب آئے؟"

میں نے کہا "تقریباً چھ گھنٹے ہوگئے ویسے تو۔۔۔ لیکن یہاں آتے ہی ایک پریس کانفرنس سے نمٹنا پڑا۔"

"قمر کو معلوم ہے؟"

میں نے کہا "پہلے اسے فون کیا تھا۔ اسی نے تمہارا نیا نمبر دیا۔"

وہ چند سیکنڈ خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی "بہت مصروف رہے تم؟"

میں نے کہا "تم نے کیسے اندازہ کیا' میری صورت سے؟"

"نہیں۔ میں اخبار بھی دیکھتی رہی ہوں۔"

"تمہاری مصروفیت کا اندازہ تمہاری صحت سے ہوجاتا ہے۔ تم بہت زیادہ کام کررہی ہو۔"

وہ مسکرائی "کام زیادہ کہاں ہوتا ہے۔ وہی ایک معمول ہے' صبح سے شام تک۔"

میں نے کہا "اور شام سے رات تک تم اس گوشۂ تنہائی میں قید رہتی ہو۔ کیا کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں' تھوڑی بہت گھر کی صفائی۔ کچھ دیر کا کام۔ ٹی وی دیکھتی ہوں' کتابیں پڑھتی ہوں۔ رات کو اسپتال کی لائبریری سے اخبار لے آتی ہوں۔ دل نہ لگے تو اسپتال کا چکر لگالیتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہ اکیلا پن تمہاری زندگی پر اثر انداز ہورہا ہے۔ تم معمولات کے اس دائرے سے باہر کب نکلتی ہو۔"

"مجھے اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ویسے کمال اور قمر کے ساتھ بازار بھی جاتی ہوں۔"

میں نے کہا "تم ان کی طرف بالکل نہیں جاتیں۔ وہ ادھر نہیں آتے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ آنا جانا لگا رہتا ہے۔ مگر ان کی ایک پرائیویٹ لائف ہے۔ تم نے اسپتال میں کوئی تبدیلی دیکھی؟"

میں نے کہا "میں نے غور نہیں کیا۔"

وہ بولی "اسپتال کے دو نئے بلاک نظر نہیں آئے تمہیں؟"

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "بات یہ ہے کہ ایک تو میرا دھیان اس طرف نہیں تھا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا نہیں۔ پھر ادھر اندھیرا بھی تھا۔"

وہ بولی "اب تو کام تقریباً مکمل ہورہا ہے۔ فنشنگ باقی رہ گئی ہے۔"

میں نے کہا "اور وہ مشینری اور اسپتال ایکوپ منٹ جس کی خریداری کے لیے تم لندن آئی تھیں؟"

"تین فرموں کے نمائندوں نے اطلاع دی ہے کہ وہ سامان کراچی پورٹ پر پہنچ گیا ہے اور اب سڑک کے راستے لاہور لایا جائے یا گڈز ٹرین سے۔ ہم نے روڈ ٹرانسپورٹ کو ترجیح دی ہے۔ اس کے بعد آئے گا تنصیب کا مرحلہ۔"

میں نے کہا "کب تک کام شروع کردے گی لیبارٹری اور دوسری مشینری۔"

"میرا اندازہ ہے کہ تین ماہ کے اندر اندر اسپتال میں سب کچھ ہوگا۔ جدید ایکسرے پلانٹ' موبائل یونٹ۔ سی ٹی اسکین اور ایم آر آئی۔"

میں نے کہا "گھر آئے مہمان کو کیا چائے کے لیے بھی نہیں پوچھو گی۔"

اس نے کہا "تم مہمان بن کے آئے ہو؟"

میں نے کہا "گھر تمہارا ہے' تم جو چاہو سمجھو۔"

وہ اٹھی "آؤ' وہیں باتیں کریں گے۔"

میں کچن میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا اور اسے چائے بناتے دیکھتا رہا۔ گزشتہ ایک سال میں وہ خاصی بدل گئی تھی۔ وہ پہلے جیسی چاق وچوبند' پھرتیلی اور تیز طرار نہیں رہی تھی۔ اس کے انداز واطوار اور حرکات وسکنات میں ایک تکان زدہ ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ اس کی چلبلی طبیعت اداؤں کی شوخی' خوش باشی اور زندہ دلی کی جگہ ایک پُرسکون نظر آنے والی متانت اور دھیمے پن والی خوش مزاجی نے لے لی تھی جو بعض اوقات مصنوعی اخلاق کا مظاہرہ لگتی تھی۔

اس کی وجہ مخالف حالات کا نامہربان رویہ تھا جس کا سلسلہ میری بے راہ روی سے شروع ہوا تھا۔ خان جی کو میری بے گانگی اور بے وفائی کے احساس نے توڑ کے رکھ دیا تھا اور انہیں میرے شاہ عالم بن جانے سے بہت اذیت ہوئی تھی۔ انہوں نے مجھ سے جو توقعات وابستہ کررکھی تھیں وہ غلط ہوئیں تو انہیں مایوسی کے صدمات نے بیمار کردیا۔ چندا نے ان کی بیماری کا طویل' صبر آزما اور حوصلہ شکن دور اکیلے حالات کا مقابلہ کرتے گزارا جب میں بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ پھر خان اعظم کی موت نے اسے پہلی بار بے سہارا' تنہا اور کمزور ہونے کا احساس دلایا۔

گزشتہ کئی ماہ سے وہ دو کمروں کے چھوٹے سے قید خانے جیسے گھر میں اپنے اکیلے پن سے لڑرہی تھی۔ خود کو مصروفیت کی پناہ میں محفوظ سمجھنے پر مجبور تھی اور معمولات کے بیزار کن ماحول میں جینے کا عذاب جھیل رہی تھی۔ اس معمول میں سوائے دکھ اور بیماری سے شکوہ بلب سسکتے کراہتے صبح سے شام تک موت اور زندگی کی جنگ میں ہارتے جیتتے مریضوں اور ان کے فریاد کناں' اُداس چہروں کے ساتھ دست بدعا لواحقین کے درمیان بھاگ دوڑ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے گردوپیش کے ماحول کی المناک ویرانی' ناامیدی اور بے بسی چندا کی زندگی میں بھی ایسے اتر آئی تھی جیسے کھلے دروازوں اور روشن دریچوں والے کشادہ گھر میں نامعلوم طریقے پر شام کے گھٹن پیدا کرنے والے سائے گھس آتے ہیں۔

چندا نے چائے میرے سامنے رکھی "تم تو پلک جھپکانا ہی بھول گئے ہو۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے؟"

میں نے کہا "میں تبدیلی دیکھ رہا ہوں جو اندر سے آئی ہے۔"

وہ میرے سامنے ایک شیلف کے سہارے پر ٹک گئی "وقت کے ساتھ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہتا۔"

میں نے کہا "اچھا وقت گزر گیا ہے جب ہم سب' میں تم اور خان جی ایک ساتھ تھے۔ تم نے ستار بجانا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے درمیان کب سے جوڑو کرانے کا کوئی مقابلہ نہیں ہوا۔"

وہ خلا میں دیکھتی رہی۔

میں نے کہا "لیکن اچھا وقت پھر آئے گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں' تمہاری یہ اداسی اور اکیلے پن کا جمود اور میری زندگی کی بے ترتیبی اور شب وروز کا انتشار' یہ سب ختم ہوجائے گا۔"

وہ بولی "تم فلسفی اور قنوطی ہورہے ہو۔"

میں نے کہا "میں دہری زندگی کی اذیت اور ہر سمت محسوس ہونے والی غیریت کے عذاب سے گھبرا گیا ہوں چندا۔ اپنوں سے دور ہو کے میں اتنا ہی اکیلا پن محسوس کرتا ہوں جتنا غیروں کے ہجوم میں محصور ہو کے۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں رہے گا۔ میں واپس آ رہا ہوں۔ میں بہت جلد لوٹ آؤں گا اور پھر ہم سب مل کے اچھے دنوں کو پھر منالیں گے جو ہم سے روٹھ گئے ہیں۔ ہم ایک بہت بڑا خاندان ہیں چندا۔ جس میں سب مخلص' بے ریا پیار کرنے والے اور محبت کے قابل لوگ ہیں۔ میں' تم' قمر اور کمال۔ رئیس اور نیلم۔ عینی اور عاقل ۔۔۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ انہوں نے شادی کرلی ہے۔"

وہ جیسے خواب دیکھتے دیکھتے چونکی "کس نے؟"

میں نے کہا "عینی اور عاقل نے لندن میں۔"

وہ بولی "میں ان سے اتنی زیادہ واقف نہیں۔"

"مگر وہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ کیا تم لندن میں ان سے ملی نہیں تھیں؟"

"وہ بس سرسری ملاقات تھی۔"

میں نے کہا "تم رئیس کو تو جانتی ہوتا؟"

"وہ تمہارا بچپن کا دوست ہے۔ ڈاکٹر کمال سے بھی پہلے کا۔"

"ہاں۔ وہ شادی کر رہا ہے نیلم سے۔ نیلم کا نام تو سنا ہوگا تم نے۔ مجھ پر اس کی بڑی مہربانیاں ہیں۔"

اس نے سر ہلایا "تم اکثر اس کا ذکر کرتے تھے لیکن میں کبھی ملی نہیں اس سے۔ ویسے تو وہ صفِ اول کی ہیروئن ہے۔ کون نہیں جانتا اسے۔ مگر اسے رئیس میں کیا نظر آیا؟"

"وہی جو تمہیں کبھی نظر نہیں آیا" میں نے گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے کہ مجھے اب چلنا چاہیے۔"

وہ ہنسی "باتیں ختم ہوگئیں یا نیند آ رہی ہے؟"

میں نے کہا "تم ساری رات جاگتی رہو گی تو صبح مریض بھگتیں گے۔"

"قمر سے نہیں ملو گے؟"

"میں نے اسے فون کرلیا تھا۔ کمال سے بھی بات ہوگئی تھی" میں نے کہا۔

وہ میرے ساتھ دروازے تک آئی "اپنا وعدہ یاد رکھنا۔" اس نے اچانک آہستہ سے کہا۔

میں نے سر ہلایا "تمہاری ایک امانت بھی ہے میرے پاس۔"

"وہ کیا ہے؟"

"اگلی بار آؤں گا تو سرپرائز دوں گا۔ میں لندن سے لے کر آیا تھا مگر اس وقت لا نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت قیمتی چیز ہے۔"

"کوئی تحفہ ہے؟"

"تحفہ ہی سمجھ لو۔ مگر خان جی مرحوم کا۔"

اس کی حیرانی اور تجسس میں اضافہ ہوگیا۔ لیکن میں نے اسے اور کچھ نہیں بتایا۔ اس وقت صبح کے ساڑھے تین بجے تھے۔ میرے چاروں طرف ایک پُرسکون رات کا سناٹا تھا جسے وقفے وقفے سے کسی وارڈ کے مریض کی پُراذیت کراہ مجروح کردیتی تھی۔ اسپتال کے لمبے کوریڈور میں بھی روشنیاں کم کردی گئی تھیں اور وارڈوں میں زیرو واٹ کے بلبوں کا اجالا رہ گیا تھا۔ باہر کے باغ کی لائٹس آف تھیں مگر گیٹ کی طرف سے آنے والی دھندلی روشنی میں مجھے نئے تعمیر شدہ اسپتال بلاکس کے خدوخال صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ لمبی لمبی تاریک بیرکس کسی مستطیل کے دو اضلاع کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اوپر آسمان ستاروں سے روشن تھا اور آخری دنوں کا چاند مشرق سے مغرب کی طرف سست روی کے ساتھ گامزن تھا۔

گیٹ کے قریب پہنچ کے میں نے مڑنے سے پہلے پلٹ کے دیکھا۔ چندا ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔ اندھیرے کے پس منظر میں دروازے کی روشن مستطیل ایک فریم کی طرح دکھائی دیتی تھی اور چندا اس میں لگی ہوئی کسی تصویر کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ ہلایا اور جواب میں اس نے بھی ہاتھ ہلا کے مجھے خدا حافظ کہا۔

رات کے آخری پہر میں ملتان روڈ پر ٹریفک برائے نام رہ گئی تھی۔ مجھے ٹیکسی کی تلاش میں دو کلو میٹر تک پیدل مارچ کرنا پڑی۔ پھر ایک خالی کھڑے ہوئے رکشا کے نیم خوابیدہ اور تھکے ہوئے ڈرائیور نے مجھے دگنے کرائے کے معاہدے پر اجازت دی کہ میں رکشا میں تشریف رکھوں۔ ضرورت مندوہ بھی تھا ورنہ اس وقت اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ سو رہا ہوتا لیکن میں زیادہ مجبور تھا۔

مجھے صبح ساڑھے چار بجے باہر سے آتا ہوا دیکھ کے نائٹ ڈیوٹی والے اسسٹنٹ منیجر نے واجبی سی حیرت کا اظہار کیا لیکن خاموشی سے پیچھے ہاتھ باندھے کھڑا رہا۔ پرسنل سیکیورٹی کے معاملے پر اختلافِ رائے کے باعث اس کے اور میرے تعلقات میں گرم جوشی نہیں رہی تھی۔

میں نے بہت احتیاط کے ساتھ آواز کیے بغیر دروازہ کھول کے کمرے میں جھانکا۔ شبنم اسی طرح بیڈ پر بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے جوتے اتار کے کپڑے بدلے۔ دروازے کو اندر سے مقفل کیا اور صوفے پر گر کے سو گیا۔ تھکن سے میرا یہ حال تھا کہ لیٹتے ہی میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

پانچ گھنٹے بعد صبح دس بجے میری آنکھ کھلی تو میں نے گھڑی دیکھی اور پھر ایک انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ میری نظر بیڈ پر گئی۔ بیڈ خالی تھا۔ شبنم صبح آنکھ کھلتے ہی مجھے بتائے بغیر اپنے احساسِ شرمندگی کے ساتھ غائب ہوگئی تھی۔ میں نے کاؤنٹر سے معلوم کیا "میرا کوئی فون یا ملاقاتی؟"

انہوں نے بتایا "کوئی مسٹر رئیس دوبار فون کرچکے ہیں۔"

میں نے ناگواری سے کہا "مجھے بتایا کیوں نہیں گیا؟"

"شاید آپ بھول گئے سر۔ آپ نے فون پر دھمکیاں ملنے کے بعد کال لینے سے منع کردیا تھا۔ لیجئے ان کا فون پھر آگیا ہے شاید۔"

میں نے چند سیکنڈ انتظار کرنے کے بعد کہا "ہیلو!"

دوسری طرف سے رئیس نے مجھے گالیاں دینی شروع کیں "سالے ہیلو کی اولاد۔ اب یہ نوبت آگئی ہے کہ ہم سے بھی بات نہیں کرتا الو کے پٹھے۔"

میں نے کہا "سوری یار۔ میں ابھی سو کے اٹھا ہوں اور کل میری رب نواز سے گرما گرمی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد میں نے خود کہہ دیا تھا کہ میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔"

اس کی خفگی کم نہیں ہوئی "ابے تو مت کر ہم سے بھی بات۔ ہم تو اچھے بھلے جا رہے تھے لندن۔ تو نے ہی روکا تھا کہ مجھے کام ہے۔"

میں نے کہا "خفا کیوں ہوتا ہے پیارے۔ اپنے تو سارے کام پھدکے ہوئے ہیں تیرے بغیر۔ تو آجا فوراً' نیلم کہاں ہے؟"

"ہم خوار ہو کے نائٹ کوچ سے پہنچے تھے۔ وہ آتے ہی سو گئی تھی۔ میں بھی ابھی اٹھا ہوں۔"

"چل ٹھیک ہے۔ ناشتا اکٹھے کریں گے۔" میں نے کہا اور فون بند کرکے غسل کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ وہاں کپڑوں کے اسٹینڈ پر مجھے شبنم کی ایک خالص زنانہ استعمال کی چیز نظر آئی۔ مجھے سخت خفت محسوس ہوئی۔ اگر کوئی اور دیکھ لیتا تو نہ جانے کیا رائے قائم کرتا۔ تاہم اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ صبح شبنم فرار نہیں ہوئی۔ اس نے اطمینان سے غسل کیا اور ممکن ہے روم سروس سے منگوا کے بریک فاسٹ بھی کیا ہو۔ اس کا گزشتہ شب کا رویہ میرے لیے بڑا پریشان کن ثابت ہوا تھا لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ شبنم برسوں سے شاہ عالم کے التفات کی عادی تھی جو ذہنی سے زیادہ جسمانی ہوتا تھا۔ میں نامحرم عظیم تھا اور اگرچہ میں نے اپنے رویے کی تبدیلی کے ساتھ شبنم کو دلائل سے بھی قائل کیا تھا کہ میرے ان کے مراسم کس حد تک دوستانہ رہیں گے مگر شبنم نے پوری طرح اس حد بندی کو قبول نہیں کیا تھا۔

اصل مسئلہ یہ تھا کہ شبنم کو ابتدا ہی سے وہ گھریلو ماحول میسر نہیں آیا تھا جس میں والدین اپنے بچوں کو اپنے رہن سہن کے مطابق ایک مخصوص ضابطۂ اخلاق کی پابندی سکھاتے ہیں جس پر وہ خود مختار ہونے کے بعد بھی عمل پیرا رہتے ہیں۔ شبنم کی تربیت آزاد صاحب نے کی تھی جو ساری عمر ازدواجی زندگی کی سب ذمے داریوں سے بھی آزاد رہے تھے۔ انہوں نے شبنم کی مادی ضروریات کا خیال رکھنے میں کمی نہیں کی تھی مگر وہ اس کو ماں کی طرح یہ نہیں سمجھا سکے تھے کہ ایک مشرقی لڑکی کو روایات کے زنداں میں خود حفاظتی کے کتنے سخت انتظامات کے ساتھ جینا پڑتا ہے ورنہ اس پر آبروباختہ ہونے کا لیبل جتنی آسانی سے لگ جاتا ہے اتنی آسانی سے اتارا نہیں جاسکتا۔

طبعاً شبنم باغی رجحانات رکھتی تھی اور آزاد صاحب نے اپنی روشن خیالی کے چکر میں اس کی ترقی پسندانہ آزاد روش کو آوارہ مزاجی تک جانے سے نہیں روکا۔ مزید یہ کہ اس نے ایک ایسا پیشہ اختیار کرلیا جس میں اس کی بے باکی کو سراہا گیا اور اس کے خود سر اطوار کو خود اعتمادی کا قابلِ فخر معیار قرار دیا گیا۔ اس کا نتیجہ شاہ عالم کے ساتھ ایسے مراسم کی صورت میں نکلا جو اسے رسوائی کی سند کے سوا کچھ نہیں دے سکتے تھے۔ معلوم نہیں شاہ عالم نے اس پر کیا جادو پڑھ کے پھونکا تھا کہ وہ اسی کی دیوانی ہو کے رہ گئی تھی۔ یہ اس کی شخصیت کا پُراسرار طلسم تھا یا اس کی دیوانی کشش کا جذبہ کہ مجھے شاہ عالم مان لینے کے بعد وہ قطعی غیر مشروط انداز میں اپنا تن من دھن سب کچھ مجھے ہر وقت سونپنے کے لیے تیار تھی اور میرے کسی اندازِ بے رخی سے اس کا یک طرفہ اندازِ جنوں کم نہیں ہوتا تھا۔ کسی حد تک میں نے اسے عشق اور ہوس کا فرق سمجھا دیا تھا لیکن اس کی سوچ کو بدلنے کا مرحلہ ابھی باقی تھا۔

غسل کے بعد میں نے اپنے کمرے میں ہی ناشتا منگوایا اور ناشتا آنے تک تمام اخبارات میں شاہ عالم کی پریس کانفرنس اور اس کے سیاسی عزائم پر تبصرے ملاحظہ کیے۔ اتفاقِ رائے اس بات پر پایا جاتا تھا کہ شاہ عالم اپنی خیالی زقند سے خواہ کتنا ہی اوپر اٹھ جائے' حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی

کہ اب اسے یا اس کی جماعت کو آنے والے انتخابات میں کوئی معجزہ ہی تھوڑی بہت کامیابی دلا سکتا ہے۔

ان تبصروں سے زیادہ میرے لیے وہ خبریں اہم تھیں جن میں شاہ عالم کی زندگی کو لاحق خطرات کا حوالہ تھا اور ان دھمکیوں کا ذکر تھا جو اسے اپنے سیاسی مخالفین اور "سازشی عناصر" کی طرف سے مل رہی تھیں۔ شبنم کی ہدایات کے مطابق اس کے نیوز ایڈیٹر نے ان چار افراد کا بھی ذکر کیا تھا جو خطرناک عزائم کے ساتھ شاہ عالم کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رئیس ناشتا لانے والے ویٹر کے ساتھ ہی اندر آگیا۔ اس کی وضع قطع نے پھر مجھے حیران کیا۔ وہ بہترین سلے ہوئے سفاری سوٹ میں تھا اور اس کے جوتے پالش سے چمک رہے تھے۔ بچپن سے اب تک میں نے کبھی بھی اسے ڈھنگ کے کپڑوں میں نہیں دیکھا تھا۔ اب ایسا لگتا تھا کہ نیلم نے اسے ایک نئی شخصیت دینے کے پروگرام پر سختی سے عمل شروع کردیا ہے۔ عورت جب کسی کو چاہے تو اسے اپنی پسند کے مطابق کوئی بھی روپ دے سکتی ہے۔ نیلم نے اپنی توجہ سے رئیس کو ایک نمایاں شخصیت بنادیا تھا۔

"قسم اللہ کی یار سے پیٹ میں چوہے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے ہیں کہ ایک دوسرے کو کھا جائیں۔"

میں نے کہا "رئیس تونے اخبارات دیکھے؟"

"ابے لعنت بھیج اخباروں پر" وہ ناشتے پر ٹوٹ پڑا "خبریں کیا ہوں گی۔ وہی روز کی گھسی پٹی۔"

گیارہ بجے خود میرا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ میں نے اور رئیس نے ڈٹ کے ناشتا کیا۔ پھر وہ مجھے اپنی نائٹ کوچ سے سفر کی بپتا سنانے لگا۔ ناشتے کے بعد میں نے سوچا کہ رخشی اور فرید عباسی کو بھی اپنی ولایت سے واپسی کی اطلاع دے دوں لیکن ان کے گھر پر گھنٹی بجتی رہی۔ ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔

"فرید عباسی تو ہوگا کورٹ میں؟"

میں نے کہا "اور رخشی!"

"وہ آج کل عباسی کا آفس سنبھالتی ہے۔ فرید تو شام کو آتا ہے۔ رخشی دوپہر کے وقت پہنچ جاتی ہے۔ میں نے سنا ہے اس نے ایک سیکریٹری کو بھی فارغ کردیا ہے۔ دفتر میں ایک ٹائپسٹ رکھی ہے مگر وہ بھی کوئی عمر رسیدہ ناقابلِ دید خاتون ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا "دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ شاہ عالم خوب عیش کرتا تھا سیکریٹریوں کے ساتھ۔ فرید کو وہ کوئی موقع نہیں دے گی۔ تو کب ملا تھا ان سے آخری بار۔"

وہ کچھ خفیف ہوا "مجھے ... ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا۔ درمیان میں ایک بار فرید سے بات ہوئی۔ وہ تیرا پوچھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ رخشی قانون کا امتحان دینے کی تیاری کررہی ہے۔ وکیل بن جائے گی اور میاں بیوی مل کے مشق کریں گے۔"

"مشق؟ تیرا مطلب ہے پریکٹس۔"

"ابے ہاں یار۔ اردو میں کہہ دیا تو کیا غلط ہوگیا؟"

میں اور رئیس ناشتے کے بعد بھی ایک گھنٹے تک اپنی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے گزشتہ رات کے واقعات کے بارے میں بتایا۔ اپنی اور چندا کی ملاقات کے بارے میں بتایا اور رب نواز سے فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا لیکن شبنم کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کی زیادہ تر باتوں کا محور نیلم تھی۔ نیلم کیا ہے؟ کیسی ہے؟ اس کے لیے کیا کرتی ہے؟ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ اس کے لیے کیا سوچتا ہے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے اس کے خیالات، جذبات اور محسوسات پر نیلم کی حکمرانی ہے۔

بارہ بجے تک امن و امان تھا۔ اس کے بعد پرانے پارٹی ورکرز کے ٹیلی فونوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں بیشتر میرے بے وقوف خیرخواہ تھے جو آج بھی میری سیاسی کامیابی کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے ان سب کو ایک ہی جواب دیا کہ بہت جلد میں پارٹی آفس میں بیٹھنا شروع کردوں گا تو تمام کارکنوں سے ملاقات کروں گا۔ خلافِ توقع ایک ٹیلی فون اس علاقے کے ڈی ایس پی نے کیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا اپنی زندگی کو لاحق خطرات کے پیشِ نظر میں پولیس کی سیکیورٹی لینا چاہوں گا؟ میں نے اسے شکریہ ادا کرکے ٹال دیا کہ ضرورت پڑے گی تو میں کسی پرائیویٹ سیکیورٹی کمپنی سے گارڈ حاصل کرلوں گا۔

ساڑھے بارہ بجے اچانک فرید کا فون آگیا۔ "مجھے اخبارات دیکھ کے تمہاری تشریف آوری کا علم ہوا۔"

میں نے کہا "میں نے تمہارے گھر فون کیا تھا۔ دس بجے کے قریب۔ مگر شاید گھر پر کوئی نہیں تھا۔"

"ہوتا بھی کیسے؟" وہ بولا "میں صبح آٹھ بجے کورٹ کے لیے نکل جاتا ہوں۔ رخشی دس بجے آفس پہنچ جاتی ہے۔"

میں نے کہا "آفس کا مجھے خیال نہیں آیا۔ ابھی رئیس نے بتایا کہ رخشی نے آفس کا چارج سنبھال لیا ہے۔"

"وہ ایک حیرت انگیز عورت ہے یار۔ اس نے گھر کے

ہی نہیں دفتر کے معاملات کو بھی اتنا سنوار دیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ افسوس کہ شاہ عالم نے اس کی قدر نہیں کی ورنہ وہ اس کی سب سے زیادہ قابلِ اعتماد مشیر ثابت ہوتی۔"

میں نے کہا "رئیس نے بتایا ہے کہ وہ وکالت کے امتحان میں بھی بیٹھنا چاہتی ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے۔ وہ دن رات تیاری کررہی ہے اور میں اس کی پوری مدد کررہا ہوں۔ تم دیکھنا! ایک دن ہم میاں بیوی کی بہت بڑی قانونی مشاورت کی فرم ہوگی۔"

میں نے کہا "اس فرم کا پہلا کلائنٹ تم مجھے سمجھ لو۔"

وہ بولا "اچھی طرح سوچ لو۔ ہماری فیس بہت زیادہ ہوگی، خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ تمہارے خلاف پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھولنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ایک نیا ایس ایس پی آیا ہے شوکت علی بھٹہ۔ وہ رب نواز کی بیوی کا کچھ کزن وغیرہ ہے۔"

"کیا اس نے خود تجھے بتایا ہے؟"

"وہ مجھے کیوں بتائے گا یار۔ آج صبح بار میں تمہاری پریس کانفرنس پر تبصرے ہو رہے تھے۔ زیادہ تر وکیلوں کا یہ خیال تھا کہ اب تمہارا کوئی چانس نہیں۔ کسی وکیل نے تمہارے خلاف پرانے مقدمات کے بارے میں پوچھا کہ ان کی اب کیا پوزیشن ہے۔ اس پر دوسرے وکیل نے یہ بات کہی کہ مقدمات دب گئے تھے مگر اب پھر اٹھائے جا رہے ہیں۔ اس نے شوکت علی بھٹہ کا حوالہ دیا تھا۔ معلوم نہیں ان کے آپس میں کس قسم کے مراسم ہیں کہ اسے اندر کی بات کا علم ہوگیا۔"

"کل بھی کچھ صحافیوں نے اس کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔"

"میرا مشورہ ہے کہ تم محتاط رہو۔"

میں نے کہا "محتاط رہنے سے کیا ہوگا۔ مقدمات کی نوعیت ایسی ہے کہ پولیس مجھے گرفتار ضرور کرے گی۔ خصوصاً عمروراز کے قتل کا کیس۔"

"اس میں تمہارے ناقابلِ ضمانت وارنٹ تھے۔ اب تک تو تمہیں مفرور مجرم قرار دیا جاچکا ہوگا۔"

میں نے کہا "بس آج کا دن خیریت سے گزر جائے۔ شام سے پہلے پہلے میں غائب ہوجاؤں گا۔"

"غائب ہوکے کہاں جاؤ گے؟"

میں نے کہا "وہ تمہیں معلوم ہوجائے گا۔ شاہ عالم کی زندگی کے دن تو پورے ہوچکے ہیں۔ ہوسکتا ہے کل ناصر عظیم کی زندگی اس عذاب سے آزاد ہوجائے۔"

"اور اگر کل سے پہلے ہی تمہیں گرفتار کرلیا گیا پھر؟"

میں نے کہا "میں کوشش کرتا ہوں کہ اس ہوٹل سے ابھی نکل جاؤں لیکن کیا تم میری طرف سے درخواست دائر نہیں کرسکتے۔ ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے۔"

"اس درخواست کے منظور ہونے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔ اس کے لیے تمہارا خود کو عدالت میں پیش کرنا بھی لازمی ہوگا۔"

میں نے کہا "اس کا مطلب ہے میں کسی بھی ہوٹل میں محفوظ نہیں۔ اگر پولیس نے میری تلاش میں چھاپے مارے تو پہلے ہوٹل دیکھے گی۔"

"تم میرے گھر میں رہ سکتے ہو۔ ڈاکٹر کمال کا گھر ہے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ میں کسی کے لیے بھی قانونی مسائل پیدا کیوں کروں۔ میں کوئی کرائے کا گھر دیکھ لیتا ہوں۔ فی الحال میرے پاس رہنے کے لیے کوئی بھی جگہ نہیں ہے۔ شاہ عالم کو نہ سہی، ناصر عظیم کو ایک مستقل رہائش گاہ چاہیے۔"

"میرا خیال ہے شبنم نے تمہارے لیے آفس کے علاوہ کسی گھر کا انتظام بھی کیا ہے۔"

میں نے کہا "میں پوچھ لیتا ہوں۔"

اس وقت شبنم گھر پر مل سکتی تھی۔ عام دنوں میں وہ رات بھر اخبار کے دفتر میں کام کرنے کے بعد سات آٹھ بجے تک گھر پہنچ کے سوجاتی تھی اور شام چار بجے تک سوتی رہتی تھی مگر میں نے گھر پر فون کیا تو گھنٹی بجتی رہی۔ پھر میں نے دفتر میں کوشش کی۔

ریسیور آزاد صاحب نے اٹھایا "شبنم؟ جی بالکل دستیاب ہے گویا۔ عام طور پر تو صبح دم ہی برگِ گل پہ نظر آتی ہے مگر آج یہاں بھی نظر آرہی ہے اس وقت اور یہ وقت ہے گلشن گلہائے ناز کا۔ لیکن تم اپنے بارے میں کچھ ارشاد کرو کہ کیا ہو اور کیوں ہو وغیرہ۔ کچھ اپنا تاریخ جغرافیہ عرض کرو گویا۔"

میں نے کہا "حضرت، میں آپ کا قدیم نیازمند ہوں۔"

وہ ہنسے "اچھا اچھا۔ نیازمند صاحب ہو۔ تو نیاز صاحب، گفت و شنید فرمایئے شبنم سے بقلم خود گویا۔"

مگر اس سے پہلے کہ میں شبنم کی ہیلو سنتا، لائن ڈراپ ہوگئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو مجھے پولیس کی وردی میں ایک سب انسپکٹر نظر آیا۔

وہ عجیب مسکین صورت اور مختصر قسم کا پولیس انسپکٹر تھا۔ وردی اس کے تن لاغر پر اتنی ڈھیلی تھی کہ اس جیسے دو ہوتے تو مل کے پہن سکتے تھے لیکن اس کی آواز میں بغیر سائلنسر والی موٹر سائیکل کی آواز جیسی کرختگی تھی۔

"شاہ عالم تم ہی ہو؟ چیئرمین پی ایچ ایف؟" اس نے مجھے ڈانٹ کے پوچھا۔

میں نے کہا "پی ایچ ایف سے تو شاید پاکستان ہاکی فیڈریشن بنتا ہے۔ میں پی جے ایف کا چیئرمین ہوں۔"

"پی جے ایف۔۔۔ اس سے کیا بنتا ہے؟ ایک تو یہ بڑی مشکل ہے۔ اے بی سی ڈی والی اتنی جماعتیں بن گئی ہیں کہ کچھ یاد نہیں رہتا۔"

میں نے کہا "پی جے ایف سے بنتا ہے پیس جسٹس اینڈ فریڈم پارٹی۔۔۔ لیکن تم کون ہو؟"

اس نے ایسے سر ہلایا جیسے میری کم عقلی پر افسوس کر رہا ہو "میرا نام ہے سب انسپکٹر صابر علی۔ کیا اب میں اندر آسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "پہلے ثابت کرو کہ پولیس کی وردی میں تم کوئی جعلی انسپکٹر نہیں ہو؟"

اس نے اپنا شناختی کارڈ بڑی ناگواری کے ساتھ پیش کیا "تسلی کرلیں جناب عالی' یہ نقلی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے تم اندر آسکتے ہو۔"

اس نے اندر آکے بڑی مشتبہ اور تیکھی نظروں سے کمرے کے ہر گوشے کا جائزہ لیا۔ پہلے الماریاں کھول کے دیکھیں پھر بیڈ کے نیچے جھانکا اور پھر باتھ روم کا دروازہ کھول کے اپنی تسلی کی۔

میں نے کہا "آخر تمھیں کس چیز کی تلاش ہے؟"

رئیس نے طنز سے کہا "کیا پتا یار' کہیں ناجائز اسلحہ مل جائے یا کہیں سے ہیروئن برآمد ہوجائے۔"

پولیس مین نے کہا "حوجی' آپ بھی کمال کے بندے ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "بندہ میں خدا کا ہوں۔ کمال میرا دوست ہے۔"

اس نے قدرے خفگی کا اظہار کیا "جناب عالی۔ آپ کو مذاق کے بجائے مجھ سے تعاون فرمانا چاہیے۔ میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں۔"

میں نے کہا "مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ کس الو کے پٹھے نے تمھاری ڈیوٹی لگائی ہے یہاں پر اور کیوں؟"

وہ بولا "افسرانِ بالا کو گالی دینا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ میری ڈیوٹی لگائی ہے ایس ایس پی شوکت علی عطش نے۔ آپ کی حفاظت کے لیے۔"

میں نے کہا "مگر میں نے تو اس کے لیے کوئی درخواست نہیں دی تھی۔"

"مگر اخبار والوں سے آپ نے ہی کہا تھا اور آپ کا بیان بھی چھپا ہے اخبار میں کہ آپ کی جان کو دشمنوں سے خطرہ ہے۔"

میں نے کہا "اور تم آئے ہو مجھے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے؟"

وہ بولا "پہلے آپ بتائیں خطرہ کہاں ہے' کس سے ہے؟"

رئیس ہنسا "اجی تھانے دار صاحب! پہلے آپ جائیں وہ عینک لگا کے آئیں جس سے خطرہ نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "ہاں خطرہ تو ہر جگہ ہے لیکن ایسے تمھیں دکھائی نہیں دے گا۔"

وہ کچھ کھسیاتا ہوا "دیکھیں نا جی! آپ نے خود ہی فرمایا ہے کہ آپ کی زندگی کے دشمن بہت ہیں۔ آخر کون ہیں وہ دشمن؟"

میں نے کہا "تھانے دار صاحب! آپ ان دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اپنے ساتھ کوئی توپ خانہ وغیرہ لائے ہو؟ وہ بڑے ڈاڈے دشمن ہیں۔"

وہ اضطرابی کیفیت میں ہاتھ ملنے لگا۔ "جناب عالی' پولیس سے ڈاڈا کوئی نہیں ہوتا۔ اگر کوئی خود کو سمجھتا ہے تو اس کی غلط فہمی ہے۔ اب ذرا نام بتاؤ مجھے' کون ہیں وہ لوگ؟"

میں نے کہا "دیکھو شیر کا دشمن گیدڑ نہیں ہوسکتا۔ میرے دشمن مجھ سے زیادہ طاقتور ہیں اور بڑا اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ مثلاً ملک رب نواز ہے۔ اس کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟"

اس کی صورت پر بارہ بجنے لگے "ملک رب نواز۔۔!"

میں نے کہا "کیوں؟ ایک نام سن کے ہی حوصلہ جواب دے گیا؟ میرے کہنے پر اسے گرفتار کرسکتے ہو تم؟"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "کیوں نہیں' اگر ثبوت ہو۔۔؟"

میں نے کہا "ثبوت تو کوئی بے وقوف مجرم بھی نہیں چھوڑتا پولیس کے لیے اور یہ صرف ایک نام ہے۔ ایسے کئی نام ہیں جن پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں' اس کے علاوہ ۔۔۔ یہ لوگ خود کچھ نہیں کرتے۔ یہ دشمن صرف حکم دیتے ہیں اور باقی ان کے حکم کے غلام کرتے ہیں۔ تم مجھے کس کس سے

بچاؤ گے اور کہاں کہاں بچاؤ گے۔ صابر علی! فرض کرو کسی نے مجھ پر گولی چلائی تو کیا تم گولی کو روک لوگے؟"

وہ پہلو بدل کے بولا "میں ۔۔۔ میں اسے پکڑلوں گا۔ گولی چلانے والے کو۔"

رئیس ہنسنے لگا "وہ کیسے پیارے؟ کیا کوئی سامنے آکے گولی چلائے گا؟ اور تمھیں موقع دے گا کہ اسے گرفتار کرلو؟"

"میں اسے تھاں گولی ماردوں گا۔ جائے واردات پر۔۔۔"

میں نے کہا "لیکن میرے مرجانے کے بعد؟ آفرین ہے تم پر۔ یہی اس پولیس افسر نے کیا تھا جس نے لیاقت علی خان پر راولپنڈی کے جلسہ عام میں گولی چلانے والے کو وہیں شوٹ کردیا تھا۔ حالانکہ وہ اسے گرفتار بھی کرسکتا تھا۔"

"اسے یہی حکم تھا۔ بعد میں اسے قتل کا اور قاتل کا سراغ مٹانے پر انعام سے بھی نوازا گیا تھا" رئیس بولا۔

صابر علی نے بے چارگی سے کہا "اپنی مرضی سے ہم کیا کرسکتے ہیں جی۔ ہم تو غلاموں کے غلام ہیں۔ ہم افسرانِ بالا کے غلام ہیں اور وہ آپ کے غلام ہیں۔"

رئیس ہنسنے لگا "افسرانِ بالا کو غلام کہہ کے کیوں گنہگار ہوتا ہے پیارے! وہ ہمیشہ حاکم رہے ہیں اور رہیں گے۔"

میں نے کہا "ہم جیسے تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ وزیر سے وزیراعظم تک سب کی نوکری کچی ہی رہتی ہے۔ پکی نوکری ہے تھانے دار کی جو بادشاہ ہوتا ہے۔"

"پھر میرے لیے کیا حکم ہے جناب عالی!" صابر علی کچھ دیر بعد بولا۔

میں نے کہا "ایس آئی صابر علی۔ میرا اس بات پر پختہ عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے اور فرشتۂ اجل کا راستہ دنیا کا کوئی سیکیورٹی سسٹم آج تک نہیں روک سکا۔ پھر تم کیا کرلوگے لیکن اب تم آہی گئے ہو تو نیچے جاؤ اور ہوٹل کی انتظامیہ سے رجوع کرو۔ انھیں بتاؤ کہ تمھیں میرے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات پر مامور کیا گیا ہے۔ ہوٹل والوں کی اپنی سیکیورٹی فورس ہے۔ دیکھو وہ کس حد تک تمھیں دخل انداز ہونے دیتے ہیں۔"

وہ کچھ مایوس ہوا "لیکن میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں اس بات کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا کہ تم ہر جگہ میرے ساتھ سائے کی طرح نظر آؤ۔ تمھاری وجہ سے میں مارا جاؤں گا یا میری وجہ سے تمھاری جان جائے گی۔"

"پھر میں کیا کروں جناب عالی!"

میں نے کہا "تم فی الحال آنے جانے والوں پر نظر رکھو۔ کوئی مجھ سے ملنے آئے تو پہلے مجھے بتاؤ اور پھر اس کی شناخت کی تصدیق کرو۔ وہ کون ہے' کیا چاہتا ہے۔ مسلح تو نہیں ہے۔ جس پر تمھیں شک ہو یا جس سے میں نہ ملنا چاہوں اسے روک لو۔ کیا پہلے کبھی تم نے کسی وی آئی پی کے ساتھ سیکیورٹی ڈیوٹی کی ہے؟"

وہ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا "پہلے ۔۔۔ نہیں جی' میرا مطلب ہے ہاں جی۔ ایک منسٹر صاحب تھے۔ شیخ عنایت اللہ سندار۔ فوت ہوگئے بے چارے' اپنے گاؤں سے واپس شہر آرہے تھے۔ راستے میں مخالفین کے ساتھ ٹاکرا ہوگیا۔ دونوں طرف سے فائرنگ ہوئی۔ تین بندے مارے گئے تھے ان میں شیخ عنایت بھی تھے۔"

میں نے کہا "اس وقت تم ان کے ساتھ تھے؟"

"آہو جی۔ لیکن مجھے موقع مل گیا جیپ کے پیچھے گھس کر جان بچانے کا" وہ روانی میں کہہ گیا۔

میں نے کہا "یعنی جس کی حفاظت کے لیے تمھیں بھیجا گیا تھا اسے تو تم نہیں بچاسکے۔ اپنی جان بچانے میں کامیاب رہے۔"

وہ سخت خفیف ہوا "دیکھو جی۔ نشانہ خطا نہیں ہوا ورنہ میں بھی ساتھ ہی تھا اور حملہ ہو تو ایسے ہی ہوتا ہے۔ بندہ جب تک دفاعی پوزیشن اختیار نہ کرے' مقابلہ کیسے جاری رکھ سکتا ہے۔ دو بندے پیچھے سے پھڑکا دیے میں نے۔۔۔ تھے تو وہ شیخ عنایت کے حریف صادق اعوان کے حمایتی مگر اخبار میں ڈاکو لکھا گیا تھا جو پولیس مقابلے میں ہلاک ہوئے۔ مجھے تعریفی سند بھی ملی تھی۔"

جب وہ چائے پی کے چلا گیا تو میں نے پھر شبنم کو فون کیا۔ لائن ڈراپ ہوجانے کی وجہ سے اور پھر صابر علی کے آنے سے بات نامکمل رہ گئی تھی لیکن اس نے کال بیک کرکے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

اس انداز بے اعتنائی سے بھی ثابت ہوتا تھا کہ میرے گزشتہ شب کے رویے سے ابھی تک وہ آزردہ ہے۔ اب یہ اخلاقی طور پر میرا فرض بنتا تھا کہ میں اسے مناؤں لیکن میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ اسے منانے کے لیے مجھے کیا کہنا چاہیے۔ صرف سوری کہنے سے بات نہیں بنتی تھی اور اس سے آگے جاتا تو مجھے کہنا پڑتا کہ خاتون' مجھ سے غلطی ہوئی۔ آئندہ میں یہ غلطی نہیں کروں گا اور آپ کو شکایت کا موقع

نہیں دوں گا بلکہ وہی کروں گا جو آپ چاہتی تھیں۔ ظاہر ہے یہ ناممکن تھا۔ میں یہ کیسے تسلیم کرسکتا تھا کہ میں نے جو بھی کیا وہ صحیح نہیں تھا۔

گھنٹی کئی بار بجی اور بالآخر ایک واچ مین نے ریسیور اٹھا کے مجھے مطلع کیا کہ آفس میں اس وقت کوئی بھی نہیں ہے۔

میں نے شکایتی لہجے میں کہا "ابھی کچھ دیر پہلے تو میں نے بات کی تھی آزاد صاحب سے۔"

"ضرور کی ہوگی" واچ مین نے ایک منطقی جواب دیا "کچھ دیر پہلے وہ موجود تھے' اب جا چکے ہیں۔" اور ریسیور رکھ دیا۔

"اوکی چھٹی۔" میں نے بہ آوازِ بلند کہا اور ریسیور پٹخ دیا۔ "نخرے دکھاتی ہے مجھے۔ جہنم میں جائے میری طرف سے۔"

"شبنم کی لڑائی ہوئی تھی تیرے ساتھ" رئیس مسکرانے لگا۔

میں نے کہا "ہاں۔"

"کس بات پر؟"

میں نے کہا "یار' میرے اور شبنم کے تعلقات میں بڑی گڑبڑ ہے۔ اور یہ گڑبڑ اچانک نہیں ہوئی ہے۔ بہت عرصے میں حالات اس انتہا تک پہنچے ہیں کہ ایک طرف تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے دوسری طرف میرے لیے لگی لپٹی رکھے بغیر اسے یہ بتانا ناگزیر ہوگیا ہے کہ اس کے اور میرے درمیان تعلقات کی نوعیت وہ نہیں ہوسکتی جو شاہ عالم اور شبنم کے درمیان بہت عرصہ رہی۔ میں وہ سب نہیں کرسکتا' جو وہ چاہتی ہے۔"

رئیس نے سوچ کے ایک احمقانہ سوال کیا "وہ کیا چاہتی ہے؟"

میں نے بھنّا کے کہا "تیرا سر۔ اسے وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے ساتھ ویسے ہی جذباتی تعلق رکھوں جیسے شاہ عالم رکھتا تھا۔ اور وہ بڑی فیاضی دکھاتی تھی اس محبت میں جو ہوس کے سوا کچھ نہیں تھی۔ اعلانیہ کہتی پھرتی تھی کہ وہ شاہ عالم سے محبت کرتی ہے اور اسے کسی بدنامی کی پروا نہیں۔ جس کا جو دل چاہے کہے' اس نے شاہ عالم کے شادی شدہ ہونے پر بھی خود اپنے ساتھ ایک سمجھوتا کرلیا تھا کہ وہ بیوی کی جگہ نہیں لے سکتی اور نہ لے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے بیوی اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ معلوم نہیں رخشی نے اس بیہودہ صورتِ حال سے کیسے سمجھوتا کر رکھا تھا۔"

"اسے کیسے کیا' وہ مجبور تھی۔"

"اب اپنے رویے سے میں نے شبنم پر بہت اچھی طرح واضح کردیا ہے کہ میں شاہ عالم نہیں' ناصر عظیم ہوں تو وہ پریشان ہے اور مجھے بھی پریشان کرتی ہے۔ میں دو مہینے بعد لوٹ کے آیا تھا۔ اس نے کل رات ایسے BEHAVE کیا جیسے وہ میری بیوی ہے۔ جدائی کی ایک ایک رات اس نے میرے انتظار میں انگاروں پر لوٹتے کاٹی ہے اور میں واپس آیا ہوں تو جدائی کی یہ لمبی سیاہ رات بھی ختم ہوجانی چاہیے۔ اسے یہ توقع تھی مجھ سے کہ ایسی ہی بے قراری میرے جذبات میں ہوگی اور میں اظہارِ محبت میں اتنا ہی بے اختیار والہانہ پن دکھاؤں گا۔ جتنا وہ دکھاتا ہوگا شاہ عالم' ہزار بار اس پر واضح کیا ہے میں نے کہ میں اب وہ نہیں ہوں مگر اس کی عادت بگڑی ہوئی ہے۔ بے شک عادت بگاڑی تھی خود شاہ عالم نے لیکن اسے آزادی اور مکمل خودسپردگی کی اجازت دینے والی کون تھی' خود شبنم۔ اس مسئلے پر کئی بار ہمارے درمیان رنجش ہوچکی تھی۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں اسے ٹھکراتا ہوں۔ اس کی نسوانیت کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہے مگر میں کیا کروں؟ میں اس کی بے عنان خواہشات کے آگے سرِ تسلیم خم کیسے کروں۔ گزشتہ رات بھی یہی ہوا اور اس نے بھی حد کردی۔ وہ یہاں سونا چاہتی تھی۔ مجھے اس پر اعتراض تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ خلوت میں جذبات کی چنگاری بھڑک کر آگ بن سکتی ہے۔ مگر اس نے شرافت سے الگ سونے کا وعدہ کیا تو میں مان گیا۔ رات بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا اب وہ اکیلی کہاں جائے گی اور اس کے وعدے پر اعتماد کرلیا مگر بعد میں اس نے تنہائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ وہ اس حد تک گر گئی کہ مجھے اب بھی سوچ کے شرم آتی ہے۔ تجھ سے میں نے کبھی کچھ چھپایا نہیں اس لیے بتا رہا ہوں۔"

رئیس نے سب سن کے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ کچھ متفکر اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔

میں نے ایک مختصر وقفے کے بعد کہا "تو میری پوزیشن کو سمجھتا ہے رئیس۔ میں شبنم سے اس کی محبت کے جواب میں محبت کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ محبت کے بارے میں یہ جو کہا جاتا ہے نا۔ کہ یہ کی نہیں جاتی۔ تو یہ بڑی آفاقی سچائی ہے ناقابلِ تردید۔ شاہ عالم' اللہ اس کی مغفرت نہ کرے۔ شبنم کے ساتھ پیار کا ڈراما کرسکتا تھا اور کرتا تھا۔ شبنم کا جسمانی استحصال کرکے وہ شبنم کے ذہن کو استعمال کرتا تھا۔ شبنم صرف ایک عورت ہی نہیں تھی' وہ ایک دھانسو جرنلسٹ بھی تھی۔ عورت اس کے اشارۂ ابرو پر اپنا سب کچھ شاہ عالم کے حوالے کردیتی تھی تو صحافی خود اس کے قابو میں آجاتی تھی۔

وہ شبنم سے دہرا فائدہ اٹھاتا تھا۔ وہ ویسے بھی عیاش آدمی تھا جس کے کوئی اخلاقی اصول وغیرہ نہیں تھے۔ مگر میں شبنم سے جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے ساتھ محبت کا ناٹک نہیں رچا سکتا۔ میں اس کی یکطرفہ محبت والی جذباتی مجبوری کے نظریے کو مسترد نہیں کرتا مگر اس کے جواب میں شبنم کو جھوٹ موٹ کی محبت بھی نہیں دے سکتا۔ شاید ایسا کرنا تیرے لیے بھی ناممکن ہوگا۔ ایک محبوبہ کو ایک گری ہوئی عورت کی طرح داشتہ بنا کے نہیں رکھا جاسکتا۔ تیرے میرے جیسے لوگ تو داشتہ رکھنے کے اصول کو بھی اخلاقی طور پر قبول نہیں کرپاتے۔ اور محبوبہ کو اس مقام پر لاکے اس کی تذلیل نہیں کرسکتے۔ جس سے آدمی محبت کرتا ہے اسے رسوائی نہیں دے سکتا۔ اس کی عزت پر حرف آئے' یہ برداشت نہیں کرسکتا اور محبت کو ہوس کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دے' اتنا گر نہیں سکتا۔ یہی کچھ میں چندا کے بارے میں سوچتا ہوں۔ اور اسی لیے وہ مجھ پر پورا اعتماد رکھتی ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ کبھی وہ میرے ساتھ اکیلی ہو تو میں اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرسکتا ہوں۔ کل رات شبنم کی جگہ اگر چندا ہوتی تو ہم شاید ساری رات باتیں کرتے رہتے۔ پھر وہ مجھے شب بخیر کہہ کے بڑے سکون سے میرے بیڈ پر سوجاتی اور میں اسے کمبل اوڑھا کے صوفے پر لیٹ جاتا اور اسی طرح سکون سے سوتا۔"

"اس مسئلے کا کوئی حل بھی ہے برادر" رئیس خان نے بہت دیر غور فرما کے کہا۔

میں نے کہا "حل تو نکالنا ہی پڑے گا کوئی۔ اس نے سخت تذلیل محسوس کی ہوگی گزشتہ رات۔ بات وہ بھی غلط نہیں کہ ٹھکرائی ہوئی عورت ناگن سے زیادہ خطرناک ہوجاتی ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ شبنم کے جذبات کا رخ اتنی جلدی پلٹ جائے۔ وہ کسی منفی رویے کی انتہا تک نہیں جاسکتی۔ کیونکہ وہ ذہین ہے اور اپنی عقل اور سوچ پر اختیار بھی رکھتی ہے۔ لیکن مجھے اس کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو نئے سرے سے DEFINE کرنا ہے۔ میں اس کے لیے کیا کرسکتا ہوں اور کیا نہیں کرسکتا۔ یہ بالکل واضح ہوجانا چاہیے۔ بے شک وہ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ میری اور ہم سب کی بہت مخلص اور بھروسے کے قابل دوست ہے لیکن میرے ساتھ وہ اپنے تعلق کو ایک عورت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہ غلط ہے کیونکہ میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ میں اسے کسی خود فریبی یا خوش فہمی میں مبتلا نہیں رکھ سکتا کہ ایک نہ ایک دن میں اسے اپنا لوں گا۔ یہ جھوٹ بولنا میرے بس کی بات نہیں اور اسے اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنا میرے نزدیک ذلالت ہے۔ اگر اس بات کا کوئی امکان ہوتا کہ میں اسے چاہنے لگوں گا اور مستقبل میں شاید کبھی اسے شریکِ حیات بھی بنالوں گا تو میں اس تعلق کو شبنم کی نظر سے دیکھتے ہوئے نباہتا رہتا مگر یار' وہ شاہ عالم کی محبوبہ تھی۔ محبوبہ کیا داشتہ تھی۔ سارا زمانہ یہ جانتا ہے۔ میں اس احساس سے سمجھوتا کیسے کرسکتا ہوں؟"

"اس نے تو سمجھوتا کرلیا ہے۔"

میں نے کہا "یہی تو ساری خرابی ہے۔ اس نے مان لیا ہے کہ میں پہلے ناصر عظیم تھا۔ پھر شاہ عالم بن گیا اور اب دوبارہ ناصر عظیم بن گیا ہوں۔ یہ میرے خارجی حالات کے تقاضے تھے۔ اس کا یہ سمجھنا جائز ہے کہ نام بدلنے سے جذبات تو نہیں بدل سکتے۔ شاہ عالم اسے چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ چاہت نہیں تھی۔ ایسے ہی ناصر عظیم کو اسے چاہنا چاہیے۔ اس میں سوچ بچار یا تذبذب کیسا لیکن میں جانتا ہوں اور تو جانتا ہے کہ سچ کیا ہے۔"

"یہ بات تو اسے کیسے سمجھائے گا۔"

"اسے سمجھنی پڑے گی کہ اب شاہ عالم کے جذبات بھی بدل گئے ہیں۔ وہ شبنم کے ساتھ پیار کا کھیل جاری نہیں رکھ سکتا کیونکہ یہ جھوٹ بولنا میرے بس میں نہیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ناصر عظیم جذباتی طور پر شبنم کے عشق میں مبتلا ہوجائے اور اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں کہ مجبوراً اسے اپنی شریکِ حیات تسلیم کرلے۔ چنانچہ اس کے ساتھ کسی قسم کے جذباتی تعلق کا ویسے بھی کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اب شبنم کو طے کرنا ہی ہوگا کہ وہ میرے ساتھ بے غرض اور بے طلب دوستی رکھنا چاہے گی یا نہیں۔ وہ عاقل و بالغ ہے۔ اپنے قول و فعل کی خود ذمے دار ہے۔ اگر مجھے چھوڑ کے وہ کسی اور سے رابطہ استوار کرلیتی ہے تو اس کی مرضی' میں اعتراض کرنے والا کون۔"

"وہ پوچھے گی نہیں کہ تمہارے خیالات میں یہ انقلاب کیوں؟"

"وہ کہہ سکتا ہوں کہ اب میرے جذبات وہ نہیں رہے۔ جذبات کیا بدل نہیں سکتے۔"

"نہیں۔ محبت میں تو یہ ممکن نہیں۔"

"لیکن شاہ عالم کو شبنم سے محبت ہی کب تھی؟ وہ تو اپنا مطلب نکال رہا تھا۔ میں یہ الزام قبول کرنے کے لیے تیار ہوں کہ میرا اس سے دل بھر گیا ہے۔ مطلب نکل جانے کے بعد میں نے نظریں پھیرلی ہیں۔ میں نے کب اس کے ساتھ

زندگی نبھانے کے قول و قرار رکھتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وفا میری سرشت میں ہی نہیں۔ میں نے یعنی شاہ عالم نے پتا نہیں کس کس سے دل لگایا اور دل لگی کرکے چھوڑ دیا۔"

"وہ چندا سے حسد میں مبتلا ہو جائے گی۔"

"ہو جائے۔ اس سے چندا یا میری صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ خود ہمیشہ دعویٰ کرتی رہی ہے کہ اسے رخشی سے کوئی بغض اور حسد نہیں۔ اب اگر رخشی کی جگہ چندا کا نام آگیا ہے تو برداشت کرے۔ جیسے پہلے کرتی تھی۔ وہ تو ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ میری محبت غیر مشروط ہے اور سب سے الگ ہے۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور اٹھالیا "ہیلو!" دوسری طرف سے ہوٹل کی انتظامیہ کے کسی رکن نے کہا "سر۔ یہ پولیس کا سب انسپکٹر صابر علی ہمارے لیے مسائل پیدا کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

"وہ ہر آنے جانے والے سے شناخت طلب کر رہا ہے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے شناخت مانگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "تم اس کے ساتھ جیسے چاہو ڈیل کرو۔ اسے میں نے نہیں بلایا۔ ایس ایس پی شوکت علی بھٹہ نے خود اسے میری حفاظت کے لیے بھیج دیا ہے۔"

"ہم نے اسے ہوٹل سے باہر نکال دیا ہے۔ ایس ایس پی کیا ہم ڈی آئی جی سے بات کرسکتے ہیں۔ ہماری سیکیورٹی کے نظام میں پولیس ایسے مداخلت نہیں کرسکتی۔"

میں نے کہا "میں اپنی حفاظت کے لیے کسی کا محتاج نہیں۔ خدا پر بھروسا میرے اطمینان کے لیے کافی ہے۔"

"ایک اور بات سر۔ کل جو لوگ آپ کی پریس کانفرنس میں صحافی بن کے گھس آئے تھے۔ ان میں سے دو باہر موجود ہیں۔"

میں نے کہا "تم انہیں پہچانتے ہو؟"

وہ بولا "کل دوپہر بارہ بجے سے رات بارہ بجے تک میں ہی ڈیوٹی پر تھا سر۔ آپ کی بات بھی ہوئی تھی مجھ سے۔"

میں نے کہا "وہ دونوں باہر کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ سب انسپکٹر صابر علی سے باتیں کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اچھا، ان دو میں سے ایک وہ تو نہیں ہے جس نے خود کو اے ایس پی ولاور شاہ ظاہر کیا تھا؟"

"رائٹ سر۔ ان میں سے ایک وہی ہے۔ وہ اندر آرہے ہیں۔"

میں نے کہا "او کے۔ میں دیکھ لیتا ہوں نیچے آکے۔"

شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف کو پاکستان آئے سولہ سترہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کی پریس کانفرنس کی روداد اخباروں میں شائع ہوئے بھی کئی گھنٹے بیت گئے تھے مگر ابھی تک اس کا کوئی ہلچل پیدا کرنے والا ردِ عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے شاہ عالم کے نام کو شیطان کے نام کی طرح شہرت دینے والے تمام واقعات کی پبلسٹی کے باوجود اس کے حامی اسے بھلا چکے ہیں اور اب اس کی خاطر سیاست کے کسی کھیل میں فریق بننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنے وقت میں کتنا ہی بڑا مداری کیوں نہ ہو، اب اس کا تماشا ختم ہوا۔ اب وہ کوئی بھی بچہ جمورا لے کر میدان میں آئے اس کا رنگ نہیں جمے گا۔ وہ لاکھ ڈگڈگی بجائے اور کتنا ہی عقل کو حیران کر دینے والا کھیل دکھانے کے اعلان کیوں نہ کرے، اس کی باتوں پر یقین کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ وہ ایک بھولی ہوئی داستان اور گزرا ہوا خیال بن چکا ہے۔ اس کا طلسم گزرے ہوئے وقت کی وہ کہانی ہو گیا ہے جس پر اب کوئی اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ صبح سے اب تک مجھے کم سے کم تیس پینتیس افراد نے فون کیا تھا لیکن یہ تعداد شرمناک حد تک کم تھی۔ جس شہر میں شاہ عالم کی پارٹی کے ہزاروں کارکن اور لاکھوں نام لیوا ہوں وہاں صرف تیس پینتیس افراد کا فون پر حال پوچھ لینا صرف اجتماعی لاتعلقی اور مجموعی عدم دلچسپی کو ظاہر کرتا تھا۔ اگر وہ حقیقی معنوں میں ایک پاپولر لیڈر ہوتا تو ملک کے گوشے گوشے سے فون کرنے والے ٹیلی فون لائنوں کو جام کر دیتے۔ لاہور میں اس کے ہوٹل کے باہر زندہ باد کے نعرے لگانے والوں کا ایک اجتماع ہوتا اور اس کے کمرے میں نیک خواہشات کے طور پر موصول ہونے والے گلدستوں کا ڈھیر لگ جاتا۔

بے شک گزشتہ شب میں نے ایک خاصی بڑی پریس کانفرنس سے خطاب فرمایا تھا لیکن اس کو میری سیاسی کامیابی سے زیادہ شبنم کی ذاتی کوشش کا نتیجہ سمجھا جاسکتا تھا۔ اس نے فرداً فرداً سب کو مدعو کیا تھا اور شاہ عالم کے نام سے زیادہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈنر کی کشش نے صحافیوں کو کھینچ لیا تھا۔ اخباروں میں شائع ہونے والی روداد بھی اسی پریس کی تشہیری مہم کا ایک حصہ تھی جو شبنم میرے لیے کسی بہت مستعد اور کامیاب پی آر او کی طرح چلا رہی تھی۔

اخباری نمائندے شبنم کی اپیل پر میری پریس کانفرنس میں ضرور پہنچ گئے تھے لیکن اس سیاسی تماشے کے اسٹیج پر میرے ساتھ قریشی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ میری سیاسی

جماعت کے عہدے داروں میں سے کسی نے وہاں آکے مجھے اپنی وفاداری اور حمایت کا یقین دلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شاید قریشی ہی میرے سیاسی اکیلے پن اور میری ناکام کوشش کا تماشائے عبرت دیکھنے آیا تھا۔ حقیقت نے اپنا وجود تسلیم کرالیا تھا۔ شاہ عالم اب ایک ایسا لیڈر تھا جس کا دوٹ کہیں نہیں تھا۔ جس لیڈر کے ساتھ ووٹ نہ ہو وہ عام آدمی ہو جاتا ہے اور عام آدمی کے ساتھ قانون کے نام پر لاقانونیت کے سارے حربے آزمائے جاسکتے ہیں اور پھانسی کا کوئی بھی پھندا اس کی گردن کے عین مطابق قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔ فرید عباسی نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ میرے خلاف پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھل گئی ہوں اور مجھے تصفیہ طلب مقدمات میں مطلوب قرار دے کر گرفتار بھی کرلیا جائے۔ اب میں وہ شاہ عالم نہیں تھا جس کی گرفتاری کے خلاف اس کے کارکن احتجاجی مارچ کرتے، جلوس نکالتے، ہڑتال کراتے یا دیواروں پر نعرے لکھتے۔ وہ شاہ عالم جب پہلی بار مرا تھا تو اس کے جنازے میں لاکھوں افراد شریک ہوئے تھے اور اس کے شایانِ شان مزار بنانے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی تھی اور ایک عقیدت مند نے ایک پُرفضا مقام پر لاکھوں روپے مالیت کا ذاتی پلاٹ وقف کر دیا تھا۔ اگر وہ مزار بنتا تو اس کی لاگت کروڑوں تک پہنچتی۔

لیکن ایک شاندار اور پُرشکوہ تدفین کے فوراً بعد ہی یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ مرنے والا شاہ عالم نہیں کوئی ہم شکل تھا۔ اس کے بعد پیش آنے والے واقعات نے اور پھر شاہ عالم کی سیاست سے دوری اور جلاوطنی نے پی جے ایف کے حامیوں اور کارکنوں کو مایوس، بے حوصلہ اور منتشر کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ آج شاہ عالم کا نام کسی کو متوجہ کرنے میں بھی ناکام تھا۔ اصل شاہ عالم کو جب نقلی قرار دے دیا گیا تو اس کا مزار بھی ایک جعلساز کا مدفن ہو گیا اور بنانے والوں نے اسے لاوارث چھوڑ کے بھلا دیا۔ شاید مزار کے لیے پلاٹ عطیہ کرنے والے نے بھی اپنی پیشکش واپس لے لی ہوگی اور خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ جذبات کی رو میں بہہ کے اس نے لاکھوں کی قیمتی زمین نہیں گنوائی۔ شاہ عالم کی قبر کا آج روئے زمین پر نام و نشان بتانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔

تقدیر کے کھیل بڑے ستم ظریفانہ ہوتے ہیں۔ اصل شاہ عالم کی موت کو پہلے جذباتی طور پر بھی تسلیم کرلیا گیا تھا اور قانونی طور پر بھی۔ پھر وقت کی ایک سازشی کروٹ نے حقائق کا منصوبہ بدل دیا اور یہ تسلیم کرلیا گیا کہ شاہ عالم زندہ ہے اور لندن میں ہے اور اب میں پھر حقیقت کو اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق تسلیم کرانے کے لیے کوشاں تھا۔ اب بے وجود شاہ عالم کو پھر مرنا تھا اور پھر دفن ہونا تھا اور دنیا کو یہ ماننا تھا کہ ہاں، اب شاہ عالم واقعی مر گیا ہے۔

شاہ عالم کی سیاسی حیثیت ختم ہو جانے سے میرا کام آسان ہو گیا تھا اور اب حالات کی موافقت سے فائدہ اٹھانا میرے ہاتھ میں تھا۔ فی الحال دو ماہ سے شاہ عالم کی ذات اخبارات کی سرخیوں میں زندہ تھی اور وطن واپسی پر اس کی پریس کانفرنس نے وقتی طور پر اسے اہم بھی کر دیا تھا۔ اگر یہ وقت گزر جاتا تو شاہ عالم خبروں کے پس منظر میں چلا جاتا اور غیر اہم یا غیر ضروری سیاست دانوں کی طرح بھلا دیا جاتا۔ یا پھر اس کے خلاف پرانے جرائم کے مقدمات شروع ہو جاتے تو اس کا مرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ یہ شاہ عالم کو موت سے ہمکنار کرنے کے لیے موزوں ترین وقت تھا، جب اس نے پہلے سے شور مچا رکھا تھا کہ میں آرہا ہوں۔ میں پہنچ رہا ہوں۔ میں وارد ہو گیا ہوں۔ اور اس کے ساتھ ہی ڈھول پیٹ دیا تھا کہ مجھے جان کے دشمنوں سے خطرہ ہے۔ مجھے مار دیا جائے گا۔ میرے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ اگر ایسے میں وہ غائب ہو جاتا تو حالات و واقعات کی شہادت از خود یہ ثابت کرتی کہ اسے دشمنوں نے اغوا کرلیا ہوگا اور پھر کہیں اس کی لاش مل جاتی تو کہا جاتا کہ وہ غلط نہیں کہتا تھا، دشمنوں نے بالآخر اسے مار ہی دیا۔

لیکن اس کے بعد کچھ نہ ہوتا۔ پہلی موت کی طرح اس کی دوسری موت ہنگامہ خیز نہ ہوتی۔ کوئی اسے چیلنج نہ کرتا۔ اس کی موت کو خاموشی سے تسلیم کرلیا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ دو چار تعزیتی پیغامات شائع ہوتے اور بس۔ چنانچہ ناصر عظیم کے لیے شاہ عالم کے پیچھا کرنے والے آسیب سے جان چھڑانے کا یہ بہترین موقع تھا اور میرے لیے حصولِ مقصد کے پلان پر بلا تاخیر عمل درآمد شروع کرنا ضروری تھا۔

یہ سب سوچ لینے کے بعد میں نے اپنی ترجیحات کا از سرِ نو تعین کیا اور ناصر عظیم کے سارے پروگرام منسوخ کر دیے۔ پہلا کام جو سب پر فوقیت رکھتا تھا، شاہ عالم کا پُراسرار حالات میں غائب ہونا تھا۔

ہوٹل کے منیجر کی اطلاع درست تھی تو امکانات کے دو متضاد پہلو سامنے آئے تھے۔ ایک یہ کہ گزشتہ شب پریس کانفرنس میں نظر آنے والا اے ایس پی دلاور شاہ کوئی جعلساز تھا تو ایس آئی صابر علی بھی جعلی تھا۔ بصورتِ دیگر انسپکٹر صابر علی کا اپنے افسر کو پہچان کے اس سے باتیں کرنا کوئی قابل

اعتراض بات نہیں تھی مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انسپکٹر صابر علی کی تو خیر سیکیورٹی ڈیوٹی لگائی گئی تھی اس لیے وہ وہاں موجود تھا۔ اے ایس پی دلاور شاہ کل رات یہاں کیا کر رہا تھا اور صبح پھر کیوں آیا تھا۔ کیا وہ میری نگرانی کر رہا تھا؟

میں نے رئیس سے مشورہ کیا اور پھر سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس شوکت علی عطّہ سے صورتِ حال کی وضاحت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ عام طور پر ایس ایس پی اپنے دفاتر میں کم بیٹھتے ہیں۔ وہ انتظامی نوعیت کی کسی میٹنگ میں ضلعی انتظامیہ کے ساتھ مصروف نہ ہوں تب بھی ان کے سیکریٹری عام آدمی کو یہی جواب دیتے ہیں کہ صاحب میٹنگ میں ہیں۔ اب عام آدمی کون ہے اور خاص کون' اس کا فیصلہ ہوشیار سیکریٹری ذاتی تجربے اور صلاحیت کی بنا پر کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ آج کل خواص میں کون شامل ہے۔

جب سیکریٹری نے "ایک منٹ سر" کہنے کے فوراً بعد ہی میری بات ایس ایس پی سے کرا دی تو مجھے یقین آنے لگا کہ میں ابھی تک وی آئی پی لسٹ میں ہوں۔

ایس ایس پی نے سپاٹ لہجے میں کہا "جی شاہ عالم صاحب؟"

میں نے کہا "میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔"

"کس بات پر؟"

میں نے کہا "آپ نے میری پریس کانفرنس کو اتنی اہمیت دی۔"

وہ بولا "آئی ایم سوری شاہ عالم صاحب! آج ایک ایمرجنسی ہو گئی تھی صبح صبح۔ مجھے تو اخبار کی سرخیاں دیکھنے کا موقع بھی نہیں ملا' کوئی خاص بات؟"

میں نے کہا "آپ نے میری سیکیورٹی کو اتنا اہم سمجھا۔"

وہ بولا "ہمارے لیے تو سب کی سیکیورٹی اہم ہے۔"

میں نے کہا "کل رات میں نے اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا ذکر کیا تھا۔ آپ نے صبح صبح میری حفاظت کے لیے پولیس فورس بھیج دی۔"

وہ کچھ حیران ہوا "میں نے ___؟"

"میرے پاس آ کے رپورٹ کرنے والے ایس آئی صابر علی نے تو یہی کہا تھا کہ آپ نے اس کی سیکیورٹی ڈیوٹی لگائی ہے۔"

وہ چند سیکنڈ بعد بولا "یہ سب انسپکٹر کہاں ہے اس وقت؟"

میں نے کہا "میں جس ہوٹل میں مقیم ہوں وہیں نیچے لاؤنج میں۔ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا ___"

ایس ایس پی نے میری بات کاٹ دی "یکمیکوزمی شاہ جی۔ یہ کوئی غلط فہمی ہے یا غلط بیانی' میں نے کسی کی ڈیوٹی نہیں لگائی۔ آپ جیسے بڑے لوگ تو ایسے بیانات دیتے ہی رہتے ہیں' مگر جب تک وہ خود ہم سے براہِ راست سیکیورٹی نہ مانگیں' افسرانِ بالا کا یا عدالت کا حکم نہ ہو' ہم اپنے طور پر کسی کے لیے خصوصی حفاظتی انتظامات نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "آپ کا مطلب ہے صابر علی جھوٹا ہے؟"

"یس۔ جھوٹا وہ یقیناً ہے لیکن جعلساز بھی ہو سکتا ہے۔ آپ نے اس سے کہا تھا کہ اپنی شناخت کرائے؟"

میں نے کہا "میں نے اس کا شناختی کارڈ چیک کیا تھا۔"

"آپ اسے بلائیں اور اسے کہیں کہ مجھ سے بات کرے۔"

میں نے کہا "ابھی بلاتا ہوں لیکن اس سے پہلے اگر آپ میری ایک الجھن دور کر دیں تو بڑی عنایت ہو گی۔"

"کیسی الجھن؟"

میں نے کہا "یہ اے ایس پی دلاور شاہ کون ہے؟"

"ایک نیا افسر ہے۔ مردان سے پوسٹ ہو کے ابھی دو مہینے پہلے ہی یہاں آیا ہے۔"

میں نے کہا "میں آپ کے عہدے کی حساس ذمے داریوں کو سمجھتا ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی اور کے ایما پر ایسا ہوا ہو۔ لیکن کل شام وہ سادہ لباس پہنے پریس کانفرنس میں صحافیوں کے درمیان کیوں موجود تھا؟"

"اس کی ڈیوٹی لگی ہو گی۔ مگر میں نے بہرحال نہیں لگائی تھی۔"

"ایس ایس پی صاحب! پولیٹیکل نوعیت کے اجتماعات کی رپورٹ لینا بعض اوقات ایک محکمہ جاتی ضرورت ہوتی ہے یہ میں سمجھتا ہوں لیکن ایک تو اس نے جھوٹ بولا تھا کہ میں صحافی ہوں۔ اس کا جھوٹ پکڑا گیا اور اسے خاصا بے عزت ہو کے رخصت ہونا پڑا۔"

"معلوم نہیں اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟"

میں نے کہا "بعد میں اس نے ہوٹل کی انتظامیہ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس کے ساتھ تین آدمی اور تھے وہ سب دلاور شاہ کی طرح پکڑے گئے تھے اور دھکے دے کر نکالے گئے تھے مگر وہ بعد میں دلاور شاہ کے ساتھ ہوٹل کی لابی میں بیٹھے رہے اور انہوں نے خود کو کسٹم کے افسران ظاہر کیا۔ بدمزگی سے بچنے کے لیے صحافیوں نے بھی اس معاملے کو زیادہ طول نہیں دیا اور ہوٹل کی انتظامیہ بھی خاموش ہونے پر مجبور ہو گئی۔"

"اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں انکوائری ہو تو لکھ کے رپورٹ کر دیں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ بات تو ختم ہو گئی تھی لیکن اب وہ پھر ہوٹل میں موجود ہے۔"

"پھر موجود ہے؟" ایس ایس پی نے پُرخیال انداز میں کہا۔

"جی ___ اور یہ سب انسپکٹر صابر علی' وہ بھی اس کے ساتھ ہے۔ دیکھیے اگر میری نگرانی کی جا رہی ہے ___"

ایس ایس پی نے پھر میری بات کاٹ دی۔ "آئی ایم سوری شاہ عالم صاحب! میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ میرے علم میں کچھ نہیں۔"

میں نے کہا "اس ڈسٹرکٹ کی پولیس انتظامیہ کے سربراہ تو آپ ہی ہیں۔"

"ہاں' لیکن بعض اوقات افسرانِ بالا کو بھی اوپر سے خفیہ احکامات آجاتے ہیں اور وہ مجھے بتائے بغیر بھی فیصلے کر سکتے ہیں۔ آپ مجھ سے وضاحت طلب نہ کریں۔ براہِ راست دلاور شاہ سے بات کریں یا پھر اوپر والوں سے پوچھیں" اس نے خاصی ناگواری سے کہا اور فون بند کر دیا۔

ایس ایس پی کا میری بات سے جزبز ہونا غلط نہ تھا۔ وہ بڑے سے بڑے سیاسی لیڈر کو بھی پولیس اقدامات کا جواز پیش کرنے کا پابند نہیں تھا اور بظاہر اس معاملے سے اس کا تعلق بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ تاہم اس سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نہ اے ایس پی جعلی تھا اور نہ سب انسپکٹر صابر علی۔ وہ دونوں کسی خاص مقصد کے تحت یہاں موجود تھے جو واضح نہیں تھا۔

رئیس نے کہا "ابے یار' جا کے انہی سے پوچھ لے کہ بھائی آخر کیا چاہتے ہو تم دونوں؟"

"تیرا کیا خیال ہے وہ بتا دیں گے؟ کبھی نہیں۔ صابر علی کا جھوٹ تو پکڑا جا چکا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ ایک اور جھوٹ بول دے کہ ایس ایس پی صاحب بڑے آدمی ہیں۔ حکم دے کر بھول گئے تو ان سے کون پوچھے۔ اے ایس پی میرے قابو نہیں آئے گا۔ وہ کہے گا کہ میں اپنی ڈیوٹی کر رہا ہوں اور آپ کو کچھ بھی بتانے کا پابند نہیں کہ ڈیوٹی کیا ہے۔ اگر آپ کو ہوٹل میں میری موجودگی پر اعتراض ہے تو جائیں' اوپر والوں سے میری شکایت کر دیں۔"

"مجھے لگتا ہے رئیس کہ میری نگرانی ہو رہی ہے کہ میں کہیں غائب نہ ہو جاؤں۔ پولیس ضرور مجھے گرفتار کرتے کے چکر میں ہے۔ وہ قانونی کارروائی پوری کرنے کے بعد مجھ پر ہاتھ ڈالیں گے۔ فرید عباسی کے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ میرے خلاف پرانے مقدمات کی فائلیں کھول دی گئی ہوں گی۔"

رئیس بھی سوچ میں پڑ گیا "تو بات کر کے تو دیکھ۔"

میں نے کہا "میں ان سے نیچے جا کے ملتا ہوں۔ تو پہلے نکل جا۔ میں اب غائب ہونا چاہتا ہوں مگر خاموشی سے نہیں۔ مجھے ایسے پُراسرار اور سنسنی خیز طور پر غائب ہونا ہے کہ سب نوٹ کریں۔"

رئیس ہنسنے لگا "پھر تو ایسا کر۔ نیچے ہال میں جا کے سب کو متوجہ کر کہ حاضرین' ناظرین! میری طرف دیکھیے' میں شاہ عالم ہوں۔ چیئرمین پی جے ایف۔ اس وقت آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے۔ ایک بج کر دس منٹ بیس سیکنڈ۔ دس منٹ اور پچیس سیکنڈ پر میں غائب ہو جاؤں گا۔ دیکھیے' دیکھتے رہیے۔ ون ٹو ___ تھری ___ دیکھنا کتنی سنسنی پھیلے گی۔"

میں نے کہا "مذاق مت کر۔ میں نے طریقۂ واردات طے کر لیا ہے۔ میں آج بلکہ ابھی دو گھنٹے کے اندر اندر غائب نہ ہوا تو کسی مشکل میں نہ پڑ جاؤں' میں گرفتار ہونے کا رسک نہیں لے سکتا۔"

"ابے تو سامان اٹھا ابھی اور چلا جا کہیں بھی۔ شبنم نے تیرے لیے رہائش کا انتظام بھی کر لیا ہے اور آفس کا بھی۔"

"ابھی میں وہاں نہیں جانا چاہتا۔"

"تو چل میرے ساتھ ___ نیلم کے گھر" وہ بولا۔

میں نے کہا "بس۔ وہی ایک محفوظ جگہ نظر آتی ہے مجھے۔ ناصر عظیم کا ٹھکانا یا تو قمر کا گھر ہو سکتا ہے یا نیلم کا۔ جہاں یہ گواہی بھی مل سکتی ہے کہ وہ تو وہیں تھا۔ گزشتہ دو مہینے میں بھی جب لندن سے شاہ عالم کے بارے میں خبریں موصول ہو رہی تھیں ناصر عظیم لاہور میں تھا۔ نیلم کے گھر میں تھا۔"

"اور اس کی گواہی دیں گے ہم سب؟"

"اگر ضرورت پڑی۔ میرا خیال ہے کہ ضرورت نہیں پڑے گی۔ ابھی تو جا بازار اور کچھ چیزیں لے کر فوراً واپس آ۔ ایک تو مجھے چاہیے کوئی وردی۔ اگر اس ہوٹل کے ویٹرز یا سیکیورٹی اسٹاف جیسی مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ جو تجھے اچھی لگے۔ بس میرے سائز پر فٹ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ روسیاہی کے لیے مجھے سیاہی چاہیے۔"

"کون سی ___ لکھنے والی یا توے کی؟" رئیس ہنسا۔

میں نے کہا "واٹر کلر آسانی سے صاف ہو جاتے ہیں۔"

وہ بولا "میری مان تو ہمیشہ کے لیے اپنا منہ کالا کر لے۔ پندرہ دن میں ایک بار چہرے پر ہیئر کلر لگا لے۔ پھر مجال ہے جو

کوئی تجھے شاہ عالم سمجھے۔"

میں نے کہا "ایسے کالے منہ والے کو ناصر عظیم بھی کون سمجھے گا؟"

رئیس نے میرا پلان سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے میں واپس آنے کا کہہ کے چلا گیا تو میں نے بھی نیچے ہال جا کے صورت حالات کا جائزہ لیا۔ سب انسپکٹر صابر علی مجھے گیٹ کے پاس کرسی ڈالے اخبار پڑھتا نظر آیا۔ میں نے دوسری طرف دیکھا تو ہال میں پھیلی ہوئی زیادہ تر میزوں پر خوش پوش اور خوش حال لوگ نظر آئے جو یہاں بزنس لنچ پر مدعو تھے یا خود کسی کو مدعو کر کے لائے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے وجود سے بے نیاز اپنی باتوں میں مگن تھے۔

میری نگاہیں سب چہروں کا طائرانہ انداز میں جائزہ لیتی ہوئی اے ایس پی دلاور شاہ تک پہنچ کے رک گئیں۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک خاصی فیشن ایبل خاتون تھی جو اس کی بیوی بہرحال نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے اطوار خاصے عامیانہ تھے۔ وہ عمر میں بھی دلاور شاہ سے زیادہ ہی ہوگی مگر اس نے شوخ میک اَپ اور عریانی کی حد تک الٹرا ماڈرن لباس کی مدد سے عمر میں دس سال کم نظر آنے کی بھونڈی کوشش ضرور کی تھی۔ اس کا گریبان سامنے سے جتنا کشادہ تھا' اس سے کہیں زیادہ پشت پر کمر کے نچلے حصے تک آیا ہوا تھا۔ وہ میز پر کہنیاں ٹکائے اور اپنا چہرہ دلاور شاہ کے قریب لانے کے لیے کچھ آگے جھک آئی تھی اور اس پوز میں دلاور شاہ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ سامنے نہ دیکھے۔

اپنی ہیجانی مصروفیت کے باوجود دلاور شاہ میری موجودگی کے احساس سے بیگانہ نہیں تھا۔ وہ چوری چوری ایک نظر میری طرف بھی ڈال لیتا تھا اور پھر ڈیڑھ فٹ دور کے منظر میں گم ہو جاتا تھا۔ میں نے خود کو شک سے محفوظ رکھنے کے لیے ہال کے آخری کنارے تک دیکھا اور پھر پلٹ کے اپنے سوئٹ تک لے جانے والے زینے پر چڑھنے لگا۔

اپنے کمرے سے میں نے آفس کا نمبر ملایا اور اسسٹنٹ منیجر سے بات کی۔ "میں شاہ عالم بول رہا ہوں۔"

"یس سر!"

میں نے کہا "تم نے مجھے بتایا تھا کہ انسپکٹر صابر علی اور اے ایس پی دلاور شاہ باتیں کرتے اندر آ رہے ہیں۔"

"میں نے ایسا ہی دیکھا تھا سر!"

"وہ کتنی دیر ایک دوسرے سے گفتگو کرتے رہے تھے" میں نے پوچھا۔

وہ بولا "مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ شاید پانچ چھ منٹ"

میں نے کہا "دلاور شاہ اس وقت بھی ہال میں ہے۔ اس کے سامنے ایک عورت ہے۔۔۔ وہ کون ہے؟"

"ایسے ہی ایک چلتی پھرتی عورت ہے۔ کسی نہ کسی کے ساتھ لنچ میں شریک ہو جاتی ہے۔ یہاں اکثر نظر آتی ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو فار دس انفارمیشن۔ اب تم ذرا انسپکٹر صابر علی کو اوپر بھیج دو۔ کہہ دو شاہ جی بلا رہے ہیں۔"

"یس سر!"

سب انسپکٹر صابر علی پانچ منٹ میں اوپر آ گیا "آپ نے یاد فرمایا ہے جناب عالی!"

میں نے دروازہ بند کر کے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا "صابر علی' کوئی پرابلم تو نہیں ہے؟"

"پرابلم یہ ہے سر کہ مکھیاں مارنے کی ڈیوٹی بڑی سخت ہے۔"

میں نے کہا "میری ابھی ایس ایس پی شوکت علی سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ میں نے سیکیورٹی ڈیوٹی کے لیے چن کے بندہ بھیجا ہے۔"

وہ کچھ نروس ہوا "اچھا جی! ایسا بولا انہوں نے؟"

میں نے کہا "کیا غلط بولا انہوں نے۔"

"نہیں' اتنے بڑے افسر ہیں غلط کیسے بول سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ تم نے ان سے منسوب کر کے کوئی غلط بات کی ہے۔ تو ان کا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اڑا "وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں جی!"

میں نے کہا "تم کسی اے ایس پی دلاور شاہ کو جانتے ہو؟"

وہ اب گھبراہٹ میں مبتلا ہونے لگا "جانتا ہوں جی مگر۔"

میں نے کہا "آخری بار تم ان سے کب ملے تھے؟"

"آخری بار دیکھا تھا ان کو۔۔۔ ہفتہ بھر پہلے۔ ملاقات تو نہیں ہوئی۔ وہ افسر لوگ ہیں۔"

میں نے اسے نظر جما کے دیکھا "تم کتنے جھوٹ بولو گے صابر علی!"

اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری "جھوٹ!"

میں نے گرج کے کہا "ہاں جھوٹ۔ ایس ایس پی شوکت علی نے صاف کہا کہ اس نے تمہاری ڈیوٹی نہیں لگائی۔ وہ تو تمہیں جانتا تک نہیں۔"

"وہ۔۔۔ وہ جی۔۔۔ مجھے تو ان کے ریڈر نے حکم دیا تھا۔" وہ ہکلانے لگا۔

میں نے کہا "شٹ اَپ۔ کون ہو تم صابر علی! کس کے لیے کام کر رہے ہو؟ کیا مقصد تھا یہ جھوٹ بول کے میرے قریب آنے کا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اے ایس پی دلاور شاہ نے تم کو کیا ہدایات دی تھیں؟"

اس نے ڈھٹائی سے کہا "میں تو انہیں جانتا بھی نہیں۔"

میں نے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی۔ "اگر تم نے سچ نہ بتایا تو میں تمہیں ننگا کر کے ماروں گا۔ وہ سؤر کا بچہ دلاور شاہ تمہیں بچا نہیں سکتا صابر علی۔ بتاؤ' اس نے کیا کہا تھا تم سے؟ میں ابھی نیچے جا کے سب دیکھ آیا ہوں۔ وہ ایک میز پر اپنی ہمشیرہ کے ساتھ موجود ہے۔ وہ کل شام سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ بولو' وہ کیا چاہتا ہے؟"

اس نے گلو خلاصی کے لیے بہت ہاتھ پاؤں چلائے لیکن میرے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس کا سانس رکنے لگا۔ وہ مچلا تڑپا اور اس نے مجھے دور دھکیلنے کی پوری کوشش کی مگر میں نے ایک گھٹنے کی مدد سے اس کو کرسی پر دبائے رکھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگیں مگر میں نے اسے نہیں چھوڑا' یہاں تک کہ اس کے حلق سے الفاظ کے بجائے خرخراہٹ سنائی دینے لگی۔

پھر میں نے اسے سانس لینے کی تھوڑی سی مہلت دی۔ اس نے کھنکار کے اور کھانس کے اپنا گلا صاف کیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ چند منٹ بعد جب اس کے اوسان بحال ہو گئے تو وہ بولا "تم۔۔۔ تم جانتے ہو' یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں اور یونیفارم میں ہوں۔"

میں نے ایک ایڑی پر گھوم کر اسے لات ماری "پھر کیا خیال ہے' پہلے تمہاری یونیفارم اتار دوں؟"

وہ کرسی سمیت گر گیا اور بڑی مشکل سے اٹھا۔ میری لات اس کے سر پر لگی تھی چنانچہ اسے چکر آ رہے تھے۔

میں نے کہا "کیا ڈیوٹی دے رہے ہو تم اور کس کے لیے؟ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں چاہوں تو تمہیں قاتلانہ حملہ کرنے کے الزام میں پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے کسی ثبوت گواہ کی ضرورت نہیں۔ تمہارے مقابلے میں میری بات سنی بھی جائے گی اور مانی بھی جائے گی۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "قاتلانہ حملے اہم شخصیات پر ہی ہوتے ہیں۔"

وہ مجھے خونی نظروں سے گھورنے لگا "تم کچھ بھی کر لو۔ میں تمہیں کچھ بھی بتانے والا نہیں ہوں۔ اور مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے۔ اے ایس پی دلاور شاہ مجھے بچا لے گا۔ وہ بہت اثر رسوخ والا بندہ ہے۔"

میں نے کہا "کیا تم میری نگرانی کر رہے تھے؟ دیکھو صابر علی۔ شاید پہلے تمہارا واسطہ نہیں پڑا ہوگا میرے جیسے لوگوں سے۔ ابھی جو تم نے کہا تھا نا کہ تم ہمارے غلاموں کے بھی غلام ہو۔ تو یہ بالکل صحیح ہے۔ تمہاری کوئی حیثیت نہیں' تم مارے جاؤ گے۔ تمہاری نوکری ہی نہیں جان بھی جا سکتی ہے۔"

وہ مجھے گھورتا رہا "میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے کہا "تم کر بھی کیا سکتے ہو صابر علی سوائے غلامی کے اور وہ بھی دلاور شاہ جیسے چھوٹے افسران کی۔ کیا دے گا اس کا صلہ وہ شخص جو خود دوسروں کے اشاروں پر ناچتا ہو۔ اس کی خوشنودی حاصل کر کے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟ شاید ایک دو ایڈوانس انکریمنٹ۔ کوئی اچھی رپورٹ جو تمہاری ترقی میں معاون ہو۔ اپنی مرضی کی پوسٹنگ۔ لیکن اس کے نقصانات کی طرف شاید تمہاری نظر ہی نہیں گئی۔ یہ دیکھو کہ اس نے کس طرح پیادے کی طرح تمہیں مروانے کے لیے اپنی بساط پر آگے بڑھا دیا ہے اور خود پیچھے بیٹھ کے کھیل دیکھ رہا ہے۔ یہ بتاؤ میرے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ صرف یہی نا کہ میں ایک سیاست داں ہوں۔ نہیں صابر علی' اس کے علاوہ بھی میں بہت کچھ ہوں۔ میرے تعلقات انڈر ورلڈ کی ایک بہت خطرناک مافیا سے ہیں۔"

"میرا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔"

میں نے دھاڑ کے کہا "بیچ میں مت بولو۔ بات یہ ہے کہ مجھے تمہاری کم علمی پر ترس آ گیا ہے ورنہ میرے کاروبار میں انسان کی زندگی بہت بے وقعت ہے۔ نہ جانے کتنے کارکن ایک معمولی سی غلطی پر ضائع ہو جاتے ہیں۔ آدمی کو ٹانگ اڑانے سے پہلے دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کہاں ٹانگ اڑا رہا ہے۔ سائیکل کے پہیے میں یا ٹرین کے پہیے میں اور کسے گرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بکری کے بچے کو یا ہاتھی کو۔ اگر میں چاہوں تو تمہاری گردن ایسے توڑ سکتا ہوں۔۔۔ ایسے۔۔۔"

اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے میں نے ویسی ہی ایک کرسی کو جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا' ایک پاؤں بڑھا کے اوپر اچھالا اور کھڑی ہتھیلی کے وار سے دو ٹکڑے کر دیا۔ اس کی قیمت بل کے ساتھ ادا کرنا میرے لیے کوئی مہنگا سودا نہیں تھا کیونکہ فوری طور پر مجھے اپنی ہلاکت خیزی کے مظاہرے سے مطلوبہ

نتائج حاصل کرنے میں بڑی مدد ملی۔

میں نے ہکا بکا اور پریشان نظر آنے والے صابر علی کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ "اور تمہاری گردن توڑ کے میں تمہیں اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں' میرا مطلب ہے تمہاری لاش کو۔ تو پوسٹ مارٹم سے کبھی ثابت نہیں ہوگا کہ تمہاری گردن توڑ کے میں نے تمہیں قتل کیا تھا۔ سمجھا یہی جائے گا کہ تم نے دوسری منزل سے چھلانگ لگائی تو تمہاری گردن ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد تفتیش ہوگی کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اس کے نتیجے میں ثابت ہوگا کہ تم نے خودکشی کی تھی۔ یقین کرو' میرا تو نام ہی کوئی نہیں لے گا۔ اگر تم واقعی سرکاری طور پر یہاں سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور ہوتے تو شاید اخبار میں اتنا ضرور لکھا جاتا کہ مرنے والا شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف کے حفاظتی عملے میں شامل تھا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں لیکن اس وقت تو تمہاری پوزیشن بہت خراب ہے۔"

اس نے ہمت کرکے لب کھولے "اچھا جناب عالی! غلطی ہوگئی مجھ سے' مجھے جانے دیں۔"

میں نے کہا "ایسے کیسے جانے دوں۔ غلطی کی ہے تم نے تو اس کی سزا بھگتو یا کفارہ ادا کرو۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں یہاں کیوں بھیجا گیا تھا؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "میں نہیں بتا سکتا سر' میں مجبور ہوں۔"

میں نے کہا "کیا مجبوری ہے تمہاری۔ جو کچھ تم۔۔ مجھے بتاؤ گے کسی کو معلوم نہیں ہوگا۔ میں تمہیں تمہاری توقع سے بڑھ کر انعام بھی دے سکتا ہوں۔ یہ انعام سرکاری انعام جیسا نہیں ہوگا جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔ نہیں' اس سے تمہیں فائدہ ہوگا۔ بہت بڑا فائدہ۔ اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم ابھی فوری فائدہ حاصل کرکے مطمئن ہوتے ہو یا مستقل فائدہ چاہتے ہو۔"

وہ نروس لہجے میں بولا "مجھے کوئی فائدہ نہیں چاہیے جناب! آپ کی بڑی مہربانی ہوگی' مجھے معاف کردیں۔"

میں نے کہا "دیکھو صابر علی! اچھی بات یہ ہے کہ تم ایماندار' فرض شناس اور ضمیر پرست وغیرہ نہیں ہو۔ جذباتی لوگ ان چکروں میں پڑتے ہیں اور اپنی زندگی خراب کرتے ہیں۔ تم عقلمند آدمی ہو۔ وقت سے فائدہ اٹھانا جانتے ہو۔ میں تمہیں ایک آفر کرتا ہوں۔ تم میرے لیے کام کرو' جتنا تم اس نوکری میں کما رہے ہو' اس سے سوگنا کما لوگے اور اگر ڈرتے ہو تو چلو چھوڑو' تعاون کی نقد قیمت لو۔"

میں نے اس کے پیچھے جاکے اپنا سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے ایک ہزار پاؤنڈز نکالے جو بازار میں تقریباً پینتالیس ہزار پاکستانی روپے میں فروخت کیے جاسکتے تھے۔ اس وقت اچانک میری نظر ایک برطانوی ساخت کے ریوالور پر گئی جو میں لندن سے اپنے ساتھ لانے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ ایک ضبط شدہ ریوالور تھا جو میں نے ہوگرائنڈ کمپنی سے چھینا تھا اور یہ میرے ڈپلومیٹک پاسپورٹ کا کمال تھا کہ میرا بیگ نہ لندن میں چیک ہوا تھا اور نہ کراچی میں۔

ریوالور دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے اسے نکال کے ایک کپڑے پر رگڑ کے صاف کیا اور نوٹوں کی گڈی پر رکھ دیا۔ ایک ہزار پاؤنڈز کے نوٹ اور ریوالور میں نے صابر علی کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ اس نے حیرت' خوف اور دلچسپی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان پر نگاہ ڈالی۔

میں نے کہا "صابر علی۔ یہ ایک ہزار پاؤنڈز ہیں۔ سو فیصد اصلی' انہیں تم بلیک میں بیچ کے پچاس ہزار بھی بنا سکتے ہو۔ سرکاری نرخ پر یہ پینتالیس ہزار روپے ہیں۔ اور یہ ریوالور' بالکل نیا اور ولایتی ہے۔ اٹھا کے دیکھو' ڈرو نہیں یہ خالی ہے۔"

اس نے ریوالور اٹھالیا لیکن اسے اٹھاتے ہی صابر علی سمجھ گیا کہ میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ بہرحال ایک پولیس مین تھا اور اس کے ہاتھ خالی یا بھرے ہوئے ریوالور کے وزن میں فرق محسوس کرسکتے تھے۔ غلط فہمی اسے یہ ہوئی کہ اس جھوٹ کو وہ میری بے وقوفی یا کمزوری سمجھا۔ وہ سمجھا کہ شاید میں بھرا ہوا ریوالور اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں وہ اس کا رخ میری طرف نہ کردے چنانچہ میں نے جھوٹ بول دیا کہ ریوالور خالی ہے۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی جب صابر علی میرے پھیلائے ہوئے جال میں پوری طرح پھنس گیا۔ اسلحہ ہاتھ میں آتے ہی وہ بہادر ہوگیا۔ اس کے چہرے کا تاثر بڑی تیزی سے بدلا۔ اس کی صورت پر پھیلی ہوئی ذلت اور شکست خوردگی کی شرمساری' اس کی آنکھوں میں نظر آنے والی دہشت اور اس کی بزدلانہ رویے کی بے چارگی' سب اچانک غائب ہوگئے۔ اس کی جگہ اعتماد کی بے خوفی' اشتعال آمیز نفرت اور انتقامی جارحیت نے لے لی۔

اس نے سچ مچ ریوالور کا رخ میری طرف کردیا "سیدھا کھڑا ہوجا' تیری تو۔۔۔ وڈے سیاست داں دے پتر۔ لیڈر کے" اس نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔ گالیاں وہ عادتاً دیتا تھا۔

میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھالیے "یہ تم کیا کررہے ہو؟"

"وہی جو تو میرے ساتھ کررہا تھا۔" اس نے دانت پیس کے مجھے ایک اور گالی دی "تو میری گردن توڑ کے باہر پھینکنا چاہتا تھا مجھے۔ خودکشی تو اب میں تیری کراؤں گا پتر۔ میری تو یہاں ڈیوٹی ہی نہیں ہے۔ مجھ سے کون پوچھے گا۔ تفتیش میں میرا نام ہی نہیں آئے گا۔ میں تجھے گولی مار کے بھاگ جاؤں گا مگر ایسے نہیں۔"

اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ نوٹوں کی طرف بڑھا "یہ مال میں ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

مجھے اس بے وقوف پر افسوس بھی ہوا مگر وہ عقل و ذہانت میں اوسط پولیس والا تھا جس کی نظر اس دام ہم رنگ زمیں کو نہیں دیکھ سکتی تھی جو میں نے اسے پھانسنے اور ایک تیر سے دو شکار کرنے کے لیے پھیلایا تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہورہا تھا کہ کیا وہ مجھے سچ مچ شوٹ بھی کردے گا۔ کیا وہ اس حد تک بے وقوف ثابت ہوگا؟ وہ مجھ سے اپنی ذلت کا بدلہ لے رہا تھا اور گالیاں دے کر اپنا غصہ نکال رہا تھا لیکن ایک پولیس مین کسی سیاسی لیڈر کو قتل کردے' یہ بڑے دل گردے اور جنون کی بات تھی اور بظاہر ایسا ہونا مجھے ناممکن لگتا تھا مگر میں کسی بھی بدترین صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چوکس تھا۔

جیسے ہی صابر علی نے نوٹ اپنی جیب میں رکھے' اس کی آنکھوں میں ایک خون آشام سفاک چمک سی پیدا ہوئی جسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ اس کی عقل ساتھ چھوڑ چکی ہے اور وہ نتائج سے بے بہرہ ہوکے مجھ پر گولی چلانے کے لیے تیار ہے۔ میں نے ایک دم غوطہ مارا اور اس کے ساتھ ہی ٹوٹی ہوئی کرسی اٹھا کے صابر علی پر پھینک دی۔

کمرے میں تقریباً ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے۔ پہلا دھماکا ریوالور کے فائر کا تھا۔ دوسرا گولی لگنے سے ٹی وی کی پکچر ٹیوب کے پھٹنے کا۔ تیسرا دھماکا کرسی کے کھڑکی سے ٹکرانے کا ہوا جس سے کھڑکی کا شیشہ بکھر گیا۔

میں نے صابر علی کو دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہیں دی۔ نیچے جھکتے ہوئے میں صابر علی میں گھس گیا اور ابھی اس کا ہاتھ دوسری بار میرا نشانہ لینے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ میں نے بائیں ہتھیلی گھما کے اس کی کلائی پر ماری۔ ایک اور فائر ہوا مگر ریوالور صابر علی کے ہاتھ سے اڑ گیا۔ اس کی کلائی یقیناً ٹوٹ گئی ہوگی۔ وہ نیچے گرتے ہوئے بری طرح بلبلایا۔

فائر کی آواز کمرے کے باہر بھی سنی گئی تھی۔ دوسرا فائر ہونے کے ساتھ ہی میں نے باہر سے چیخ پکار اور دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ جب ہوٹل کی سیکیورٹی والے اور انتظامیہ کے لوگ دروازہ توڑنے لگے تو میں نے صابر علی کو ناک آؤٹ کیا۔ اس کی جیب سے ایک ہزار پاؤنڈز نکالے اور دروازہ کھول دیا۔

سیکیورٹی عملے کے لوگ خودکار اسلحے سے لیس اندر آگئے۔ انہوں نے کمرے میں میرے سامنے اور میرے آگے پیچھے پوزیشن سنبھال لی۔ ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر نے پہلے مجھے اور فرش پر بے سدھ پڑے ہوئے صابر علی کو دیکھا اور پھر کمرے کی حالت کو۔ کمرے میں ایک کرسی ٹوٹی پڑی تھی۔ میز الٹی ہوئی تھی۔ دھماکے سے پھٹنے والی پکچر ٹیوب کا شیشہ دور دور تک بکھرا ہوا تھا۔

کسی پکچر ٹیوب کے پھٹنے کا دھماکا چھوٹے موٹے بم جیسا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹیوب کے اندر مکمل خلا ہوتا ہے اور یہ ایک بہت مضبوط موٹے شیشے والے بلب کی طرح پھٹتی ہے تو شیشے کے ٹکڑے انسان کو اچھا خاصا زخمی کرسکتے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ جب گولی پکچر ٹیوب کو لگی تو میں غوطہ مار چکا تھا چنانچہ شیشے کے چھرے جیسے ٹکڑے میرے اوپر سے گزر گئے' یہ ٹکڑے تین دیواروں سے ٹکرا کے پورے کمرے میں گرے تھے اور انہوں نے کچھ ڈیکوریشن پیس بھی توڑ دیے تھے۔ جو کرسی میں نے صابر علی پر پھینکی تھی وہ پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ صابر علی کو لگنے کے بعد کمرے کی کھڑکی سے ٹکرائی تھی اور کھڑکی کا شیشہ باہر کاریڈور میں پھیل گیا تھا۔

اسسٹنٹ منیجر نے میری طرف دیکھا "واٹ از آل دس' سر!"

میں نے غصے میں دھاڑ کے کہا "تمہیں کیا نظر آرہا ہے؟ بالآخر وہی ہوا نا جس کی میں نے پیش گوئی کی تھی۔ اس سب انسپکٹر کو کسی نے مجھے قتل کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میری جان کو خطرہ ہے۔"

اسسٹنٹ منیجر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں "آر یو آل رائٹ سر!"

"بس' میں بچ گیا ہوں۔ حالانکہ اس نے مجھ پر دو فائر کیے۔" میں نے خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی "یہ پڑا ہے اس کا ریوالور۔ خیال رکھنا کہ اسے پولیس کے سوا کوئی نہ چھوئے۔ اس پر فنگر پرنٹ ہوں گے۔"

"لیکن یہ اچانک کیسے ہوا؟"

"اچانک کچھ نہیں ہوتا" میں نے برہمی سے کہا "اس

شخص کو کسی نے خاص طور پر ہائر کیا تھا۔ اسی کام کے لیے۔"

"لیکن یہ تو آپ کی سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور تھا۔"

میں نے کہا "یہ اس کا اپنا بیان تھا جس پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لیکن اس نے غلطی سے حوالہ دے دیا ایس ایس پی شوکت علی کا۔ آج صبح میری ان سے فون پر بات ہوئی تو اتفاق سے صابر علی کا ذکر آگیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ میرا پریس کانفرنس کا بیان پڑھ کے انہوں نے میری سیکیورٹی کے لیے پولیس کے سب انسپکٹر صابر علی کی ڈیوٹی لگادی۔ وہ بہت حیران ہوئے کیونکہ انہوں نے کسی کی ڈیوٹی نہیں لگائی تھی۔ میں نے صابر علی کو اسی لیے کمرے میں بلایا تھا کہ اس سے پوچھوں کہ آخر یہ جھوٹ اس نے کیوں بولا تھا اور وہ کیا چاہتا ہے؟"

میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازے میں اے ایس پی دلاور شاہ نمودار ہوا "کیا ہورہا ہے یہاں؟" اس نے رعب دار آواز میں کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا "دروازے پر یہ کیسا مجمع لگا ہوا ہے؟"

اسسٹنٹ منیجر نے کہا "آپ کے سب انسپکٹر صابر علی نے مسٹر شاہ عالم کو قتل کرنے کی کوشش کی۔"

"مجھ پر دو فائر کیے اس نے" میں نے کہا۔

"واٹ نان سینس!" دلاور شاہ نے کہا "صابر علی کو کیا دشمنی ہوسکتی ہے مسٹر شاہ عالم سے۔"

"لیکن اسے میرا کوئی دشمن تو استعمال کرسکتا ہے۔"

"پولیس مین کبھی کرائے کے قاتل نہیں بنتے۔ آپ کے دشمن کیا اتنے بے وقوف ہیں کہ آپ کو قتل کرانے کے لیے پولیس کو استعمال کریں گے۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "یہ سوال کرنے سے پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو۔ میں تمہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔"

اس نے فوراً دفاعی انداز اختیار کرلیا "ہوسکتا ہے آپ نے مجھے مردان میں دیکھا ہو۔ یہاں میں صرف دو ماہ پہلے ہی آیا ہوں اور دو مہینے سے آپ لندن میں تھے۔ از ڈٹ رائٹ' میں اے ایس پی دلاور شاہ ہوں۔"

میں نے کہا "یعنی اس وقت تم اتفاق سے ہوٹل میں موجود تھے۔"

"ہاں' میں ایک مہمان کے ساتھ لنچ کے لیے آیا تھا۔ کیا یہی وہ پستول ہے۔"

میں اس کی راہ میں حائل ہوگیا۔ "تم اسے ہاتھ نہیں لگاسکتے۔ اس پر گولی چلانے والے کے فنگر پرنٹ ہیں۔"

اس نے متانت سے کہا "میں ایک ذمے دار پولیس آفیسر ہوں۔ آپ کو مجھ پر پورا بھروسا ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "اے ایس پی صاحب! کیا آپ آن ڈیوٹی ہیں؟"

وہ بولا "اس صورتِ حال میں مجھے ڈیوٹی پر تصور کیا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ فی الحال میں کچھ بھی تصور کرنا نہیں چاہتا' میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تک اس علاقے کے تھانے سے پولیس نہ آجائے صورتِ حال جوں کی توں رہے۔"

اے ایس پی برہم ہوگیا" میں پولیس کے آنے تک تمام معاملات کا چارج لے رہا ہوں۔"

میں نے بھی تیز ہوکے کہا "کس حیثیت میں؟ کیا یہ تمہارا علاقہ ہے؟ تمہاری پوسٹنگ کہاں ہے۔ مجھے بتاؤ' میں ایس ایس پی سے کنفرم کرلوں۔"

"دیکھیے' آپ اپنی حدود سے تجاوز کررہے ہیں" وہ کچھ نرم پڑگیا۔

میں نے کہا "ابھی جب تھانے کے لوگ آجائیں تو آپ میرے خلاف حد سے بڑھنے کی رپورٹ بھی لکھوادیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن ابھی میں آپ کو کسی قانونی کارروائی کی اجازت بھی نہیں دوں گا بلکہ بہتر ہوگا کہ آپ تشریف لے جائیں۔"

اس نے فوراً مصالحانہ انداز اختیار کرلیا۔ "شاہ عالم صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت آپ ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہیں۔"

"کیا اس شخص کو ذہنی طور پر مطمئن اور بہت پُرسکون نظر آنا چاہیے جس پر چند منٹ پہلے قاتلانہ حملہ ہوا ہو؟ مجھے معلوم ہے کہ آپ یہاں کیوں موجود ہیں۔ کچھ دیر پہلے میں نیچے گیا تو آپ ڈائننگ ہال میں تھے اور ایک خاتون کے ساتھ لنچ کررہے تھے۔ اس عورت کو بھی میں اچھی طرح جانتا ہوں اور اے ایس پی صاحب' جو آپ کی مہمان تھی۔ شی از اے پروس۔۔۔ آئی نو!"

"آپ سوچے سمجھے بغیر بولتے جارہے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں سر۔ میں صورتِ حال کو سمجھ کے بات کررہا ہوں۔ اس وقت آپ کا پھر یہاں موجود ہونا بے سبب نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی اتفاق۔ مجھے اب یاد آگیا ہے کہ آپ کو میں نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ آپ کل رات میری پریس کانفرنس میں آئے تھے۔ حالانکہ آپ کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔"

"میں ڈیوٹی پر تھا۔ اور سیاسی نوعیت کے اجتماعات میں ہم وردی پہن کے رپورٹ لینے نہیں جاتے۔"

میں نے کہا "تو۔ آپ ڈیوٹی پر بھی نہیں تھے۔ جو صحافی یہاں موجود تھے' سب نے آپ کی پرفیکٹی کا منظر دیکھا تھا۔ انہوں نے بعد میں اپنے ذرائع سے یہ معلوم کرلیا تھا کہ کسی اے ایس پی دلاور شاہ کو خفیہ رپورٹ لینے کے لیے یہاں نہیں بھیجا گیا تھا۔ آخر تم کیوں میرے پیچھے لگے ہوئے ہو؟ اس پولیس مین سے تمہارا کیا تعلق تھا جس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی؟"

وہ ایک دم محتاط ہوگیا "اس سے میرا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔"

میں نے کہا "تم اس سے باتیں کررہے تھے۔"

"یہ غلط ہے۔"

میں نے کہا "اسے میں نے اپنے کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ وہ یہاں سے نکل کے ہوٹل کے باہر تمہیں کیا رپورٹ دینے گیا تھا؟"

ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر پر گھبراہٹ سوار ہونے لگی۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اب میں اسے گواہ کے طور پر پیش کروں گا "سر۔ ہم نے آپ کے لیے دوسرے سوئٹ کا انتظام کردیا ہے۔"

میں نے کہا "پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے تھانے میں رپورٹ کی ہے یا نہیں؟"

"رپورٹ کردی ہے سر۔ وہاں سے پولیس آتی ہی ہوگی" وہ بولا "آپ چلیں۔"

میں نے کہا "ان کے آنے سے پہلے میں نہیں چاہتا کہ کسی چیز کو چھیڑا جائے۔ پہلے انہیں رپورٹ لکھ لینے دو۔ پھر میں شفٹ کرلوں گا۔"

اے ایس پی دلاور شاہ نے اپنی افسرانہ شان اور اپنی خودی کے علم کو بلند رکھتے ہوئے رخصت ہوجانا ہی بہتر سمجھا۔ "مسٹر شاہ عالم! میں صرف آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن آپ نہیں چاہتے تو آپ کی مرضی۔ بعد میں یہ نہ کہیے گا کہ یہاں ایک اعلیٰ پولیس افسر موجود تھا مگر اس نے اپنا لنچ نہیں چھوڑا۔"

میں نے کہا "نہیں کہوں گا۔ آپ جائیں اپنا لنچ انجوائے کریں۔"

پولیس تقریباً پندرہ منٹ بعد پہنچی۔ اس وقت تک صابر شاہ کچھ کراہنے لگا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد ہوش میں آجائے گا۔ پولیس پارٹی کی قیادت روایتی توند رکھنے والا ایک انسپکٹر کررہا تھا۔ اس نے مجھ سے اپنا تعارف انسپکٹر سلامت علی کی حیثیت سے کرایا۔ اس کے ماتحتوں میں ایک اے ایس آئی تھا جس کا نام اس کی شرٹ پر دل مراد خان لکھا ہوا تھا۔ باقی تین میں سے ایک لانس نائیک تھا یعنی حوالدار اور دو کانسٹیبل تھے جو اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑی اٹھائے مؤدب کھڑے تھے۔ معاملہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل اور ایک سیاسی لیڈر کا تھا چنانچہ پولیس اپنی فرض شناسی اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ غیر روایتی انداز میں کررہی تھی۔

سلامت علی نے ایک نظر کمرے پر اور پھر صوفے کے قریب پڑے ہوئے ایس آئی سلامت شاہ پر ڈالی اور بولا۔ "اجازت ہے؟" اور میرے کچھ کہنے سے پہلے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ پچاس برس سے اوپر کا چہرے سے خرانٹ نظر آنے والا افسر تھا جو موقع محل کے اعتبار سے اپنے رویے کو بدلنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ آنے والے اے ایس آئی دل مراد خان کو اشارے سے ایک کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا "دل مراد۔ اپنے شاہ صاحب کی رپورٹ لکھو۔"

دل مراد نے روزنامچے کو درمیان سے کھولا اور اس میں کاربن پیپر رکھنے لگا پھر اس نے بال پوائنٹ نکال کے میری طرف دیکھا "جی سر جی!"

انسپکٹر سلامت علی نے اسے روک دیا "پہلے آپ مجھے بتائیں' یہ بندہ کون ہے؟"

میں نے کہا "اس نے اپنا نام صابر علی بتایا تھا۔"

"آپ پر اس نے گولی چلائی تھی؟" اس نے مشتبہ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "ہاں' اس ریوالور سے صابر علی نے مجھ پر دو فائر کیے۔ ان گولیوں کے خول بھی یہاں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ جو تباہی کمرے میں نظر آرہی ہے' یہ نشانہ خطا ہونے کا نتیجہ ہے۔"

"اس کا نشانہ خطا ہوگیا" اس نے یوں کہا جیسے یہ جان کے اسے دلی صدمہ پہنچا ہو۔

میں نے کہا "ظاہر ہے' ورنہ یہاں میری لاش پڑی ہوتی۔"

اس نے سرہلایا "میرا مطلب یہ تھا کہ اتنے کم فاصلے سے ایک پولیس والا گولی چلائے اور گولی بندے کو لگنے کے بجائے ٹی وی میں جالگے یا چھت میں لگے" اس نے سر اٹھاکے اوپر دیکھا "حیرت ہے۔"

میں نے کہا "میں وہی بتارہا ہوں جو ہوا تھا' کیا اب آپ رپورٹ لکھیں گے؟ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"چلیں جی' مجھے شروع سے بتائیں ساری بات۔"

میں نے کہا "یہ سب انسپکٹر صابر علی آج صبح میرے پاس آیا تھا اور اس نے کہا کہ ایس ایس پی شوکت علی بھٹہ نے اسے میری سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور کیا ہے۔ گزشتہ رات میں نے اپنی پریس کانفرنس میں اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ مجھے اپنے سیاسی حریفوں اور دشمنوں سے جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اخبارات میں یہ بیان دیکھنے کے بعد ایس ایس پی صاحب نے صابر علی کو حکم دیا کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں صابر علی کے بیان پر شک کرتا مگر میں نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا اور پھر خود ایس ایس پی صاحب سے بات کی تو وہ بہت حیران ہوئے کیونکہ انہوں نے کسی کو بھی سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور نہیں کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ کوئی درخواست کرے یا عدالت حکم دے تو پولیس انکار نہیں کرتی مگر ایسے اخباری بیانوں پر ایکشن لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صابر علی میرے ساتھ رہنا چاہتا تھا مگر میں نے کہا کہ مجھے کسی کا سائے کی طرح تعاقب کرنا اچھا نہیں لگتا۔ وہ ہوٹل میں میرے ملاقاتیوں پر نظر رکھے۔ ایس ایس پی سے بات ہوجانے کے بعد میں نے صابر علی کو طلب کیا اور اس سے پوچھا کہ اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا۔ پہلے تو وہ اپنی بات پر اڑا رہا کہ یہ جھوٹ نہیں ہے مگر جب میں نے سختی کی۔"

"کیا سختی کی؟" انسپکٹر نے سوال کیا۔

میں محتاط ہوگیا۔ اگر میں کہتا کہ سچ اگلوانے کے لیے میں نے صابر علی کا گلا دبایا تھا۔ اس پر جسمانی تشدد کیا تھا اور اسے دہشت زدہ کیا تھا تو انسپکٹر اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر کرتا اور ثابت یہ ہوتا کہ قاتلانہ حملے میں پہل کرنے والا میں تھا۔ صابر علی نے تو اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔

میں نے کہا "میں نے سختی سے پوچھا کہ اسے کس نے بھیجا ہے؟ تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر جانے کی کوشش کی تو میں نے اس کو روک لیا کہ پہلے ایس ایس پی صاحب سے تو بات کرلو۔ اس نے کہا کہ مجھے کسی سے بات نہیں کرنی ہے اور مجھے دھکا دے کر فرار ہونا چاہا۔ میں نے دروازے کو کنڈی لگادی اور صابر علی سے کہا کہ میں اسے پولیس کے حوالے کردوں گا اور ایس ایس پی سے کہوں گا کہ اس کے خلاف قانون کے مطابق کارروائی کی جائے۔ اس پر صابر علی نے پستول نکال لیا اور مجھ پر گولی چلادی لیکن میں بچ گیا اور گولی ٹی وی کے اسکرین پر لگی۔ پھر اس نے دوسری گولی چلائی مگر اس وقت تک میں صابر علی پر قابو پانے کے لیے اس پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ چنانچہ دوسری گولی چھت کی طرف چلی گئی۔ یہ کرسی میں نے صابر علی پر پھینکی تھی جو کھڑکی پر لگی۔ اس کا شیشہ آپ نے باہر کاریڈور میں بکھرا ہوا دیکھا ہوگا۔ فائرنگ پر ہوٹل کی سیکیورٹی والے فوراً آگئے لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ملزم کو ناک آوٹ کرنے کے بعد دروازہ کھولا لیکن نہ میں نے کسی چیز کو ہاتھ لگایا' نہ کسی اور کو اجازت دی کہ وہ کسی چیز کو چھیڑے حالانکہ آپ کے محکمے کے ایک اے ایس پی صاحب نیچے ڈائننگ ہال میں کسی کے ساتھ لنچ کررہے تھے۔ وہ بھی فوراً آگئے تھے۔"

"شاہ عالم صاحب! آپ نے ملزم کو کیسے ناک آوٹ کیا تھا؟ اس کے سر پر کچھ مارا تھا یا۔"

میں نے کہا "میں جوڈو کراٹے جانتا ہوں۔ میرے پاس بلیک بیلٹ وغیرہ تو نہیں ہے مگر آپ میری مہارت آزمانا چاہیں تو اپنے چاروں ماتحتوں کو کہیں کہ وہ میرے مقابلے پر آجائیں۔"

انسپکٹر معنی خیز طریقے پر مسکرایا "میں ویسے ہی آپ کی بات مان لیتا ہوں۔"

میں نے عمداً اپنی رپورٹ میں اے ایس پی دلاور شاہ کے مشتبہ رویے کا حوالہ نہیں دیا۔ اگر میں اس کی پریس کانفرنس میں بلاجواز موجودگی' صابر علی کے ساتھ اس کے رابطے اور کچھ دیر پہلے ہونے والی تلخ کلامی کا ذکر کرتا تو یہ الگ ایک کیس بن جاتا جس میں ثبوت اور گواہ پیش کرکے بھی مجھے حاصل کچھ نہ ہوتا۔ سوائے اے ایس پی کی دشمنی کے۔ صابر علی کے خلاف رپورٹ لکھوانا بھی ایک کاغذی کارروائی کے سوا کچھ نہ تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ پولیس بالواسطہ طور پر صابر علی کی پوری مدد کرے گی اور اسے بچائے گی۔ ایسا ہمیشہ اور ہر جگہ ہوتا ہے۔ جب خود پولیس کی حیثیت ملزم کی ہوجائے تو پورا محکمہ اس کی خاموش حمایت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اول تو اسے گرفتار ہی نہیں کیا جاتا اور "مفرور" ظاہر کردیا جاتا ہے جبکہ درحقیقت وہ اپنے کسی عزیز دوست کے گھر میں مزے سے بیٹھا ہوتا ہے یا تبدیلی آب وہوا کے لیے کسی دوسرے شہر چلا جاتا ہے اور حالات کے سازگار ہونے تک منظر عام پر نہیں آتا۔ اگر بحالت مجبوری اس کی گرفتاری ظاہر کرنی پڑے تو اسے تھانے کے اندر یا پولیس لائن میں رہنے کے لیے گھر جیسا ماحول فراہم کردیا جاتا ہے اور اسے قانون کے خلاف پورا تحفظ دیا جاتا ہے۔ دوران "تفتیش" اس کے ساتھی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں کہ ثبوت مٹادیے جائیں یا مشتبہ کردیے جائیں۔ گواہ منحرف ہوجائیں اور واقعاتی شہادتوں کو مسخ کردیا جائے۔ ملزم بڑی آسانی سے ضمانت حاصل کرلیتا ہے اور بالفرض محال کوئی سرپھرا جج ضمانت قبول نہ کرے تو اسے عدالت کے کمرے سے "فرار" ہونے کے پورے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔ وہ پھر اپنے ساتھیوں کی پناہ میں کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچ جاتا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ میری رپورٹ سے صابر علی کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا۔ وقتی طور پر اسے معطل اور گرفتار بھی کیا جائے گا مگر بعد میں جب مدعی شاہ عالم بھی نہیں رہے گا تو ملزم کے خلاف کیس دبا دیا جائے گا۔ اعلیٰ افسران کی ملی بھگت سے اسے ٹرانسفر کردیا جائے گا اور وہ کسی دوسرے شہر میں ڈیوٹی بھی دینے لگے گا۔ سال دو سال بعد کسے یاد رہے گا کہ صابر علی نے غیرقانونی اسلحے سے شاہ عالم کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔

صابر علی پر یہ جھوٹا الزام لگانے کا مقصد اسے سزا دلوانا تھا بھی نہیں۔ میری اس سے کوئی ذاتی دشمنی ہوتی تب بھی میں ایسا نہ کرتا۔ میں تو اپنی زندگی کو لاحق خطرات کا ثبوت دنیا کے سامنے لانا چاہتا تھا اور یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اے ایس پی دلاور شاہ اور سب انسپکٹر صابر علی کے گٹھ جوڑ کا مقصد کیا ہے۔

انسپکٹر نے "وقوعہ" کی پوری رپورٹ اس طرح لکھی کہ شک کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ملزم کو پہنچے جسے اس نے "حراست" میں لے کر فوری طور پر میڈیکل رپورٹ اور علاج کے لیے سرکاری اسپتال بھجوادیا تھا اور تاکید کردی تھی کہ ملزم کی سخت نگرانی کی جائے۔ میں یہ ظاہر کرتا رہا جیسے میں اس کی ہوشیاری کو بالکل نہیں سمجھتا اور میرا مقصد محض قانونی کارروائی کے رسمی تقاضے پورے کرنا ہے۔ بعد میں پولیس کیا کرتی ہے کیا نہیں' ان معاملات سے میرا کوئی سروکار نہیں اور نہ میں قاتلانہ حملے سے خوف زدہ یا پریشان ہوں۔ سیاست کے کھیل میں یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے۔

معمول کے مطابق رسمی کارروائی ابھی چل رہی تھی کہ رئیس خان کی واپسی ہوئی۔

اس نے صورت حال کو اور پھر مجھے بڑی تشویش سے دیکھا اور بدحواس ہوگیا "شاہ جی! خیر ہے نا؟"

میں نے اسے مدبرانہ تحمل کے ساتھ دیکھا "سب خیر ہے سیکریٹری۔ ہم پر ایک اور قاتلانہ حملہ ہوگیا" اور سب کی نظر بچا کے اسے آنکھ ماری۔

"ایک اور یعنی۔۔۔ چوبیسواں؟ نہیں۔۔۔ پچیسواں' سلور جوبلی حملہ!"

میں نے کہا "بس اللہ کی مہربانی ہے اور ہماری خوش قسمتی کہ ہم پھر بچ گئے۔ یہ تھانے دار صاحب آئے ہیں تفتیش کے لیے۔ ملزم گرفتار ہوچکا ہے۔"

رئیس بولا "آپ کو پہلے دو نفل شکرانے کے ادا کرنے چاہئیں۔"

میں نے کہا "اور تمہیں دو کالے بکرے ہماری جان کا صدقہ سمجھ کے قربان کرنے چاہئیں۔"

وہ پلٹ کر جانے لگا "میں اخبار والوں کو بتادوں۔"

تھانے دار نے اسے روک لیا "ابھی نہیں سیکریٹری صاحب۔ اخبار والے آگئے تو ہمارا کام رک جائے گا۔"

رئیس رک گیا اور تھانے دار نے اپنے ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ فٹافٹ کام کریں۔ ابتدائی تفتیش مکمل ہوجانے کے بعد رپورٹ لکھ لی گئی تو پولیس نے جائے واردات کا تفصیلی نقشہ تیار کیا اور واردات میں استعمال ہونے والا اسلحہ اپنی تحویل میں لیا۔ میرے دستخط حاصل کرنے اور مجھے اپنے تعاون کا پورا یقین دلانے کے بعد انسپکٹر سلامت علی رخصت ہوا تو سہ پہر بھی بیت چکی تھی۔

وہ اسسٹنٹ منیجر جس نے ایک دن پہلے میرے خدشات کو اہمیت دینے سے انکار کردیا تھا' پہلے سخت پشیمان اور پریشان تھا کہ کہیں میں قاتلانہ حملے میں ہوٹل کی انتظامیہ کو بھی ملوث نہ کرلوں جو مجھے مناسب سیکیورٹی فراہم کرنے میں ناکام رہی تھی لیکن جب میں نے کسی بھی معاملے میں اسے گواہ تک نہیں کیا تو وہ خاصی مطمئن اور شکرگزار نظر آنے لگا۔ اس نے مجھ سے بہت معذرت کی اور انتہائی مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے سوئٹ نمبر دو میں منتقل کردیا۔ اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ مجھے جو زحمت ہوئی' اس کے بدلے میں مجھ سے قیام وطعام کا بل نہ لیا جائے۔

تنہائی میسر آتے ہی رئیس مجھ پر برس پڑا "الو کے پٹھے یہ تونے کیا نیا ڈراما شروع کردیا۔"

میں نے کہا "تجھے یہ ڈراما لگتا ہے؟ قاتلانہ حملہ کرنے والا سب انسپکٹر واردات میں استعمال ہونے والے اسلحے سمیت گرفتار ہوا ہے۔"

رئیس کی خفگی برقرار رہی "آخر اس بے چارے تھانے دار نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟"

میں نے کہا "رئیس۔ اول تو کوئی تھانے دار بے چارہ نہیں ہوتا اور ایسی بے بنیاد الزام تراشی سے اس کا کوئی بھی

کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اگر اس نے سچ مچ مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہوتا تب بھی پولیس اسے بچالیتی۔ بے شک واقعاتی شہادت اس کے خلاف جاتی ہے مگر ہوش میں آنے کے بعد وہ بھی تو بیان دے گا کہ مجھے بدنیتی کے ساتھ جھوٹ بول کر قاتلانہ حملے کے الزام میں ملوث کیا گیا ہے۔"

رئیس نے کہا "پھر اس کا مقصد؟"

"پبلسٹی رئیس خان' پبلسٹی! پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ شاہ عالم پہلے ڈھول پیٹ رہا تھا کہ میری جان خطرے میں ہے۔ دشمن مجھے ماردیں گے۔ اس ڈرامے سے یہ ثابت ہوگیا کہ وہ ڈراما نہیں کررہا تھا۔ سچ بول رہا تھا۔ کتنے عیار دشمن ہیں اس کے۔ انہوں نے ایک قاتل کو محافظ بنا کے بھیج دیا۔ اگر خود پولیس کرائے کے قاتل کا رول ادا کرنے لگی تو لوگوں کی جان ومال کی حفاظت کون کرے گا؟ سیاست میں مداری کا کھیل ایسے ہی ہوتا ہے۔ بھس میں چنگاری ڈال کے جمالو دور کھڑی تماشا دیکھتی ہے۔ شاہ عالم کو بالآخر غائب ہونا ہے۔ جب وہ غائب ہوگا تو زبانِ خلق خود گواہی دے گی کہ یہ بھی اس کے دشمنوں کی کارستانی ہے۔ وہ دشمن کون ہیں اور کہاں ہیں۔ جانے شاہ عالم کی بلا۔ قیاس آرائیاں کرنے والے اِدھر اُدھر جھک مارتے پھریں۔۔۔"

دروازے پر دستک ہوئی اور دو ویٹر میز پر لنچ کے لوازمات سجا کے رخصت ہوگئے۔

رئیس کو میری بات نے قائل کرلیا تھا "اگر مقصد شہتیر ہے تو پھر سب اخبار والوں کو ضرور بتادینا چاہیے۔"

میں نے کہا "شہتیر نہیں جاہل کی اولاد۔ تشہیر!"

وہ جھینپ کے بولا "جی ہاں وہی۔"

میں نے کہا "سب کو چھوڑ۔ صرف شبنم کو بتادے۔ باقی کام وہ خود کرے گی۔ ہمارا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ بہت زبردست ہے۔"

رئیس بولا "یہ کام مقتول کو خود کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا "مسئلہ یہ ہے پیارے کہ وہ مقتول صاحب سے سخت ناراض ہے۔ ہوسکتا ہے وہ خود نہ آئے مگر باقی سب کو بھیج دے گی۔"

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد آٹھ دس صحافی مجھ سے قاتلانہ حملے کی تفصیلات معلوم کرنے پہنچ گئے۔ یہ سب غیر معروف قسم کے وہ رپورٹر تھے جن کا تعلق شام کے اخبارات سے تھا۔ بڑے اخباروں کے نامور صحافیوں نے شام کے وقت ایک غیر اہم سیاست داں کے لیے فرصت نکالنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

پُرتکلف چائے پینے کے بعد بالآخر وہ قائل ہوگئے کہ میں نے ناکام قاتلانہ حملے کی خبر سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے نہیں پھیلائی تھی' ان کے کسی حد تک غیر سنجیدہ رویے سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ ملکی سیاست میں شاہ عالم کا محدود کردار اب تقریباً ختم ہوچکا ہے۔

ان حالات میں اگر شاہ عالم مرجاتا تو اس کی موت سے نہ سیاست کی دنیا میں کوئی ہلچل ہوتی اور نہ صحافت کی دنیا میں۔ حالات کی یہ عدم موافقت میرے لیے بہت سازگار تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اس بار شاہ عالم دنیا سے رخصت ہو تو دنیا اس کا واجبی انداز میں نوٹس لے اور پھر اسے فراموش کردے۔

پریس کانفرنس کے اختتام پر رپورٹر رسمی انداز میں اپنی اہمیت کا احساس دلا کے رخصت ہوگئے تو ہال کے اس گوشے میں رئیس کے علاوہ صرف ایک شخص رہ گیا۔ وہ تیس بتیس سال کا دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی عینک پوش آنکھوں میں ایک بے نام سی اُداسی تھی اور اس کا کستا ہوا متفکر چہرہ مسکراہٹ سے ناآشنا نظر آتا تھا۔ اس نے مٹیالے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور شکن آلود پتلون پہن رکھی تھی۔

اس نے کہا "شاہ صاحب۔ مجھے آپ سے اکیلے میں ایک بات کرنی تھی۔"

میں نے کہا "رئیس میرا سیکریٹری ہے جس سے میں کوئی بات بھی سیکرٹ نہیں رکھتا۔"

"میں روزنامہ "تہلکہ" سے آیا ہوں اور میرا نام ہے مرزا سلیم!"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "آپ کے اخبار کا نام بڑا تہلکہ خیز لگتا ہے لیکن۔۔۔"

"لیکن آپ نے کبھی اخبار دیکھا نہیں۔"

میں نے معذرت کی "دراصل ایک شہر سے نکلنے والے تمام اخبارات دیکھنا بھی بعض اوقات ممکن نہیں ہوتا۔"

"قصور آپ کا نہیں۔ یہ ایک نیا اخبار ہے۔ اس کی پرنٹر اور پبلشر ہی نہیں ایڈیٹر کو۔۔۔ بھی آپ یقیناً جانتے ہوں گے۔ ان کا نام ہے روزینہ" وہ بولا اور پھر مجھے پُرتوقع نظروں سے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا "روزینہ۔۔۔!"

"یس۔۔۔ مس شبنم نے انہیں بھی فون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں موجود ہوں گی۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے شبنم کہیں مصروف ہو۔"

"کیا آپ کی ان سے کوئی بات نہیں ہوئی" وہ بولا۔

میں نے کہا "کس سلسلے میں؟"

"خصوصی ضمیمہ کے سلسلے میں۔ ہم یہ ضمیمہ شائع کرسکتے ہیں۔ ابھی سوا تین بجے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو چھ سوا چھ بجے تک ضمیمہ تقسیم کیا جاسکتا ہے۔" مرزا سلیم نے کندھے پر لٹکے ہوئے کیمرے کو نمایاں کیا۔

میں نے کہا "اس میں میرے چاہنے والی کیا بات ہے؟"

وہ بولا "شاہ صاحب۔ ابھی خبر گرم ہے۔ صبح تک باسی ہوجائے گی اور یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ کتنے اخبار اسے نمایاں سرخی بنا کے پہلے صفحے پر شائع کریں گے۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ اٹ۔ شاہ عالم کا نام اب پبلک کے لیے اتنا اہم نہیں رہا۔"

میں نے کہا "مجھے اس کا اندازہ ہورہا ہے۔"

"لیکن ایک خصوصی ضمیمہ آپ کو اہم بنا سکتا ہے۔"

میں نے کہا "اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو چشم ما روشن دل ماشاد۔ ضرور چھاپیے۔"

اس کے لبوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ آئی "کتنی تعداد میں؟"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ فیصلہ تو آپ کی پرنٹر' پبلشر اور ایڈیٹر ہی کرسکتی ہیں۔ بائی دا وے' یہ وہی خاتون تو نہیں ہیں۔۔۔ روزی۔۔۔؟"

"مجھے تعجب ہے کہ یہ نام آپ کو اتنی دیر سے یاد آیا۔ انہوں نے کہا تھا کہ شاہ جی سے صاف بات کرلینا۔ دس ہزار کی تعداد میں ایک صفحے کا ضمیمہ چھاپنے کے اخراجات ہوں گے تقریباً پچیس ہزار۔"

"وہ چاہتی ہے کہ یہ اخراجات میں اٹھاؤں؟" میں نے اسے غور سے دیکھا۔

"ظاہر ہے۔ دلچسپی یا سنسنی خیزی کے اعتبار سے یہ خبر اتنی بڑی نہیں ہے کہ پبلک اپنی جیب سے ایک روپیہ خرچ کرکے ضمیمہ خریدے۔ دو چار ہزار نکل جائیں گے' باقی ردی ہوگی۔"

میں نے کہا "یعنی میں پچیس ہزار روپے خرچ کرکے دس ہزار اشتہار شائع کراؤں' صرف لاہور میں تقسیم کرانے کے لیے؟"

"پبلسٹی حاصل کرنے کے لیے اتنے کم وقت میں آپ اور کیا کرسکتے ہیں شاہ جی۔ یہ جو پریس کانفرنس میں کھاپی کے گئے ہیں یہ کچھ بھی نہیں کریں گے سوائے خبر آگے پہنچانے کے۔ اس کا فیصلہ تو مالک ہی کریں گے کہ خبر کو اخبار کے آخری صفحے کے آخری کالم میں سب سے نیچے جگہ دی جائے یا پہلے صفحے کی سرخی بنایا جائے اور گستاخی معاف' اب آپ نواز شریف یا بے نظیر تو ہیں نہیں۔۔۔ لیکن آپ الیکشن سے پہلے کچھ توجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو پیسہ خرچ کرکے اخبار والوں کو خریدنا پڑے گا۔ آپ کو صفحۂ اول کی سرخی میں آنے کے لیے جگہ خریدنی ہوگی۔ کیونکہ ویسے تو آپ کی جگہ بنتی نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تمہاری صاف گوئی پسند آئی۔"

وہ بولا "یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ آپ کی پریس کانفرنس میں آدھے لوگ کھانے پینے آتے ہیں تو آدھے مروت میں یا شبنم کی وجہ سے آجاتے ہیں۔ روزینہ سے بھی شبنم نے ہی ضمیمہ شائع کرنے کے لیے کہا تھا ورنہ ایسی فضول خبر پر ضمیمہ خصوصی کون بے وقوف چھاپ سکتا ہے۔ اب آپ اسے اشتہار کہیں یا کچھ اور۔۔۔ لیکن زمانہ اشتہار بازی کا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن کیا پچیس ہزار زیادہ نہیں ہیں؟"

"اس لحاظ سے یقیناً زیادہ ہیں کہ آپ خود اشتہار چھاپیں تو شاید پانچ ہزار میں کام ہوجائے مگر کیا یہ کام آپ تین گھنٹے میں کرسکتے ہیں؟ اخبار کے پاس تو وسائل ہیں۔ ایک پوری تربیت یافتہ اور منظم ٹیم ہے اور تجربہ ہے۔ اس سے اگلا مرحلہ ہوتا ہے تقسیم کا۔ آپ سارے لاہور میں اشتہار کیسے تقسیم کریں گے؟ اخبار کے پاس تو ہاکرز کی فوج ہے۔"

میں نے کہا "تم بڑے اچھے سیلز مین ہو۔"

وہ بولا "اس کے علاوہ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ نے سیاست کی دکان سجا رکھی ہے تو روزینہ نے خبروں کی دکان لگائی ہے۔ فائدے کے لیے۔ وہ بھی خدمتِ خلق نہیں کرتی۔ فائدہ آپ دیکھتے ہیں تو کیا اسے نہیں دیکھنا چاہیے؟"

میں نے کہا "تمہارے دلائل بہت مضبوط ہیں۔ میں قائل ہوا۔ تم جاؤ اور ضمیمہ چھاپو۔"

اس کے لبوں پر پھر وہی مردہ سی مسکراہٹ آئی "اگر میں اس بات کی گارنٹی دوں کہ ضمیمہ پورا بک جائے گا۔ ردی میں نہیں جائے گا بلکہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا تو آپ مجھے کیا دیں گے؟"

رئیس ہنسنے لگا "یہ بھی تم خود ہی بتادو پیارے!"

وہ بولا "آپ مجھے صرف دو ہزار روپے دیں۔ ضمیمے کی دو چار ہزار نہیں دس ہزار کاپیاں یوں جائیں گی' یوں۔" اس نے چٹکی بجائی۔

میں نے کہا "اوکے۔ دو ہزار تمہارے۔ حالانکہ دس ہزار کاپیاں فروخت ہوں گی تو اصل فائدہ ہوگا تہلکہ کے

مالکوں کو مگر یہ کام تم کیسے کرو گے؟"

وہ بولا "خصوصی ضمیمے بکتے ہیں ایک سنسنی خیز سرخی پر۔ وہ سرخی میں بتاؤں گا۔ پریس کانفرنس کے دوران میں نے کچھ سرخیاں لکھی تھیں۔ آپ دیکھ لیں' پہلی ہے "پولیس نے انتخابات سے قبل متعدد سیاست دانوں کو قتل کرانے کی ذمے داری قبول کرلی۔"

میں اچھل پڑا "یہ سرخی کیسے ہو سکتی ہے؟"

وہ اسی سپاٹ لہجے میں بولتا رہا "دوسری سرخی ملاحظہ ہو۔ "شاہ عالم کے بعد نواز شریف اور بے نظیر کو قتل کرانے کے لیے پولیس کا منصوبہ۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "کیا تم پاگل ہو؟"

وہ بولا "تیسری سرخی یہ ہو سکتی ہے۔ "پولیس نے کرائے کے قاتل بھرتی کر لیے۔ شاہ عالم پر قاتلانہ حملے کے الزام میں تھانے دار گرفتار۔"

رئیس نے کہا "یار' تم اخبار کو بند کرا دو گے۔"

اس نے کہا "سر' ہم اپنا کام سمجھتے ہیں۔ اس میں آپ کی تو کوئی ذمے داری نہیں۔ ہم اخبار والے بھی مداری ہیں۔ روز ایسا تماشا دکھاتے ہیں۔ سرخی کے نیچے کہیں متن میں ہم لکھ دیتے ہیں کہ غیر مصدقہ ذرائع سے ملنے والی اطلاعات کے مطابق۔"

میں ہنس پڑا "یعنی جھوٹ بولنے کے بعد کہہ دیتے ہو دروغ بر گردن راوی۔"

"یہی سمجھ لیں۔ مگر اس سے آپ کا کام تو ہو جائے گا نا۔ جو سرخی دیکھ کے ضمیمہ خریدے گا پھر وہ پوری خبر بھی پڑھے گا۔ جلدی فیصلہ کریں' وقت کم ہے۔"

میں نے کہا "فیصلہ تو ہو گیا لیکن پچیس ہزار میں تمہیں نہیں دے سکتا۔"

"آپ مجھے میرے دو ہزار روپے دیں۔ باقی رقم ایک گھنٹے کے اندر اندر مس روزینہ کو پہنچا دیں۔ یا مس شبنم ان سے بات کر لیں کہ رقم مل جائے گی۔"

میں نے کہا "تمہاری مس روزینہ کا پہلے کوئی دوسرا اخبار تھا۔ کیا وہ بند ہو گیا؟"

وہ بولا "ان کے کئی اخبار بند ہو چکے ہیں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج کل ڈیکلریشن اسلام آباد سے نہیں لینا پڑتا۔ ڈی سی آفس دیتا ہے۔ جتنے چاہو لے لو۔ ہر روز نیا اخبار نکالا جا سکتا ہے۔ اچھا' اب میں چلتا ہوں۔"

وہ چند قدم گیا اور پھر لوٹ آیا "ایک اور آئیڈیا ہے' اگر آپ پسند کریں؟"

میں نے کہا "تم ایک ماہر مشیر بن سکتے ہو پبلسٹی کے لیے۔ پھر یہ رپورٹنگ کا کام کیوں کر رہے ہو؟"

وہ بولا "ہر کام کے لیے ایک پلیٹ فارم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کے پاس سیاست ایک پلیٹ فارم ہے عزت' شہرت اور اقتدار حاصل کرنے کا۔ میرے پاس صحافت کی سند نہ ہو تو میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا "اپنا آئیڈیا بتاؤ۔"

اس نے کہا "اگر آپ دس ہزار خرچ کریں تو دو بڑے اخباروں میں یہ خبر پہلے صفحے کی سرخی بن سکتی ہے۔"

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

"ایک نیوز ایڈیٹر پانچ ہزار روپے لیتا ہے۔ کم سے کم دو کالم کی سرخی ہو گی۔ تین کی بھی ہو سکتی ہے۔ اگر لے آؤٹ میں جگہ بن جائے۔"

میں نے کہا "تم کیا ان کے ایجنٹ ہو؟"

"میں سب کا ایجنٹ ہوں۔ سب کے فائدے کی بات کرتا ہوں" اس نے کہا۔

میں نے مشورہ طلب نظروں سے رئیس کو دیکھا تو اس نے تائید میں سر ہلایا۔ "کیا اس کے لیے بھی مس شبنم کی ضمانت ضرور ہو گی۔"

"آپ چاہیں تو مجھے ادائیگی کر سکتے ہیں' ابھی۔"

میں نے کہا "تمہیں بھی ہم پر اعتبار ہونا چاہیے۔"

اس نے کچھ سوچا اور پھر سر ہلا کے رخصت ہو گیا۔ پیسا بڑی تیزی سے زر پرستی کے مذہب کا خدا بنتا جا رہا تھا۔ پیسے کی قوتِ خرید کسی سیلابی ریلے کی طرح معاشرے کی اخلاقی قدروں پر غالب آ رہی تھی یہاں تک کہ صحافت جیسے مقدس سمجھے جانے والے پیشے میں بھی جھوٹ اور منافقت کی دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ پیسا ایسی طاقت سے بڑی طاقت بن گیا تھا۔ اس پر سے جائز اور ناجائز کا لیبل اتر گیا تھا۔ حرام کی کمائی کے خلاف ایمان کی مزاحمت رکھنے والے اتنے کمزور پڑ گئے تھے کہ ان کا وجود محسوس بھی نہیں ہوتا تھا۔

شاہ عالم کے لیے مداری کا آخری کھیل پیش کرنے کے لیے اسٹیج سیٹ ہو چکا تھا۔ اس رپورٹر کے رخصت ہوتے ہی میں نے ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر کو طلب کیا۔ وہ میرا بہت شکر گزار تھا کہ میں نے کسی مرحلے پر اس کو یا ہوٹل کی انتظامیہ کو اپنے قانونی معاملات میں ملوث نہیں کیا چنانچہ اس کی نوکری اور ہوٹل کی نیک نامی دونوں پر کوئی حرف نہیں آیا۔

میں نے کہا "تمہیں زیادہ متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اتنا عرصہ لندن میں رہا' اب جیسے ہی یہاں رہائش

کا مستقل بندوبست ہو گا' میں ہوٹل سے شفٹ کر جاؤں گا۔"

اس نے اخلاقاً کہا "آپ ہمارے معزز مہمان ہیں سر۔ آپ کا یہاں قیام ہماری عزت افزائی ہے۔"

میں نے کہا "شاید دو چار دن رہوں گا میں یہاں۔"

"میں نے فرسٹ فلور کی طرف آنے والے راستے پر اسپیشل سیکیورٹی کا انتظام کر لیا ہے سر!"

"تھینک یو۔ آج شام تک میں کسی قسم کی مداخلت نہیں چاہتا۔ نو ٹیلی فون کال۔ نو وزیٹر۔" میں نے اسے دس ہزار روپے دیتے ہوئے کہا "یہ میرے اکاؤنٹ میں ایڈجسٹ ہو جائیں گے۔"

وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلا گیا تو میں نے رئیس سے کہا "بس اب ایک گھنٹے میں مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

رئیس نے ایک بیگ کھولا "یہ ہے تیری وردی اور تیرے منہ کالا کرنے کا سامان۔"

میں نے کہا "نیلم اس وقت کہاں ہو گی؟"

"اس کا شیڈول دیکھ کے بتا سکتا ہوں۔ لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ آج کچھ جلدی فارغ ہو جائے گی۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ فی الحال اس کے پاس چلا جاؤں۔"

وہ خوش ہو گیا "میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ تو ہمارے ساتھ رہ۔ تیرے لیے اس گھر سے زیادہ محفوظ جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔"

میں نے وردی کا معائنہ کیا۔ سرمئی نیلے رنگ کے کپڑے کی یہ وردی' پتلون اور بشرٹ پر مشتمل تھی۔ اس کے ساتھ میچ کرتی ہوئی سفید پٹی والی ڈرائیور کی ٹوپی تھی۔ اسے جسم پر چڑھانے سے پہلے ضروری تھا کہ میں اپنا چہرہ بھی بدلوں۔ میرے چہرے پر کئی ہفتوں کی شیو تھی جو بڑھتے بڑھتے باقاعدہ داڑھی کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ میرا پرانا ہیئر اسٹائل بھی بالکل مختلف تھا۔ داڑھی تو میں خود شیو کر کے بنا سکتا تھا مگر کسی ماہرِ فن ہیئر ڈریسر کی مدد کے بغیر میں اپنے موجودہ ہیئر اسٹائل کو بدلنے سے قاصر تھا۔

چہرے کے ساتھ میں اپنے حلیے میں نمایاں تبدیلی لباس بدل کے کر سکتا تھا۔ شاہ عالم سیاسی فیشن کے مطابق کلف سے کھڑکھڑ کرتے سفید لٹھے کے شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹ میں پبلک کے سامنے آیا تھا اور پریس کے سامنے پیش ہوا تھا۔ اخبارات میں شائع ہونے والی اس کی تمام تصاویر بھی اس لباس اور وضع قطع کے مطابق تھیں جو سیاست کے کھیل میں ہر مداری نے اختیار کر لیا تھا۔ ناصر عظیم یہ پیشہ ورانہ لباس

ترک کر کے پینٹ شرٹ اور ٹائی یا سوٹ میں ایک بالکل نئی شخصیت کے قالب میں ڈھل سکتا تھا۔ حلیے اور لباس میں اس تبدیلی کے اور نام مختلف ہونے کے باوجود اس بات کے امکانات بالکل ختم نہیں ہوتے تھے کہ کسی تقریب میں سیاسی اجتماع میں یا راہ چلتے پی جے ایف کے کسی پرانے حامی کو یا کارکن کو ناصر عظیم پر شاہ عالم ہونے کا شبہ ہو جائے لیکن شاہ عالم کی آخری موت میں کوئی شبہ نہیں رہے گا تو دیکھنے والے کو یہ مشابہت ایک اتفاق سے زیادہ چونکانے والی محسوس نہیں ہو گی۔ دنیا میں ایسے بہت لوگ ہیں جو اپنی صورت کے نقوش کی مماثلت سے کسی مشہور شخصیت کے ہم شکل نظر آتے ہیں۔ یہ بات ہٹلر کے بارے میں زیادہ مشہور ہے کہ وہ اپنا ایک ہم شکل ساتھ رکھتا تھا اور ایک تقریب میں وہ صرف اس لیے بچ گیا کہ وہاں اس کا ڈپلی کیٹ موجود تھا۔ دنیا کے کئی سربراہانِ مملکت جن کو اپنے مخالفین اور دہشت گردوں سے حملے کا خطرہ رہتا ہے' ذاتی سیکیورٹی کے لیے اپنے کسی ہم شکل کو قربانی کے بکرے کے طور پر ہمرکاب رکھتے ہیں۔

اپنا چہرہ اور حلیہ بدل کے کسی کے نوٹس میں آئے بغیر ہوٹل سے نکلنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں خالی ہاتھ جاؤں۔ اگر میں سوٹ کیس اٹھا کے جاتا تو انتظامیہ کی نگاہیں زیادہ باریک بینی سے مجھے تاڑتیں کہ کہیں کوئی معزز مہمان بل کے واجبات ادا کیے بغیر تو فرار نہیں ہو رہا ہے۔ میں اپنا سامان رئیس کو بھی دے سکتا تھا لیکن اس میں بھی یہ رسک بہرحال تھا کہ میرا سوٹ کیس اس منیجر کی نظر میں آ جائے جس نے کچھ دیر پہلے پولیس کے ساتھ میرے کمرے میں آ کے جائے واردات کا معائنہ کیا تھا۔ اس نے میرا سامان سوئٹ نمبر دو میں ہی شفٹ کر دیا تھا۔ وہ سوٹ کیس کو پہچان سکتا تھا۔

پھر میرے ذہن نے اس مسئلے کا حل بھی تلاش کر لیا۔ میں نے رئیس سے کہا "یار' تیرا ایک دوست تھا جیرا بلیڈ عرف انسپکٹر نذیر!"

رئیس بولا "تھا کا کیا مطلب۔۔۔ وہ فوت تو نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "اس کے کرتوت بھی وہی ہیں۔"

رئیس ہنسا "ابے چور جائے چوری سے' ہیرا پھیری سے تو نہیں جاتا۔ اس وقت وہ کیسے یاد آ گیا؟"

میں نے کہا "وہ ایک کام کر سکتا ہے لیکن وہ ملے گا کہاں؟ اس کا کوئی فون نمبر وغیرہ ہے؟"

"فون نمبر تو ہے لیکن وہ پاؤں میں مہندی لگا کے گھر میں تو نہیں بیٹھا ہوتا' اسے تو ڈھونڈنا پڑے گا اس کے ٹھکانوں پر' تو

کام تھا۔"

میں نے کہا "یہ جو شاہ عالم کا سامان ہے۔ اس میں سے کچھ تو یہاں چھوڑنا ہوگا مثلاً اس کے کپڑے' جوتے' یہ سوٹ کیس اور شاہ عالم کا بریف کیس۔ اس میں شناخت کی بہت سی دستاویزات ہیں۔ پاسپورٹ' شناختی کارڈ اور انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس۔ بینک اکاؤنٹ کی چیک بکس۔ اگر یہ ثابت کرنا مقصود ہو کہ شاہ عالم پُراسرار حالات میں غائب ہوا' اسے اغوا کیا گیا تو ظاہر ہے سامان کمرے میں ہی ملنا چاہیے۔ یہ بھی ثابت ہونا چاہیے کہ اسے کوئی چیز اپنے ساتھ لے جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

رئیس نے مجھ سے اتفاق کیا "پھر پریشانی کیسی۔ چھوڑ دے یہ سب سامان یہاں اور ہاتھ جھاڑ کے چل۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ اس میں کچھ سامان تو میرا ہے ہی نہیں۔ مثلاً یہ چھوٹا سا باکس' جو دیکھنے میں سگار باکس لگتا ہے۔"

"اس میں کیا ہے؟"

میں نے کہا "تو خود دیکھ لے۔"

رئیس نے وہ باکس کھولا جو مجھے لارڈ پرائس نے خاص طور پر اسپتال میں بلا کے دیا تھا۔

"سونے کے زیورات؟" رئیس حیرانی سے بولا۔

میں نے کہا "چوبیس قیراط خالص سونے کے... کیسے ہیں؟"

"بہت خوبصورت... لاجواب... مگر یہ تو کس کے لیے لایا ہے؟"

میں نے کہا "تیری کھوپڑی میں جس کا نام ہے اس کے لیے نہیں۔"

"میں تو سمجھا تھا تو نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم تھا تجھے اور کوئی خیال آ ہی نہیں سکتا۔ یار' یہ چندا کی امانت ہے۔ پچاس سال سے لارڈ پرائس کے پاس محفوظ تھی۔"

"لارڈ پرائس کون؟"

میں نے اسے مختصراً لارڈ پرائس کے اور پھر اس سے اسپتال میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ "کرنل خان' نے یہ زیور معلوم نہیں کس کے لیے بنوائے تھے اور لارڈ پرائس کے پاس رکھوا دیے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد لارڈ پرائس واپس انگلستان چلا گیا اور کرنل خان سے اُس کا رابطہ نہیں رہا۔ بس اتفاق کی بات ہے کہ اسے چندا سے میرے تعلق کے بارے میں معلوم ہوگیا اور یہ کہ چندا اسی کرنل خان کی پوتی ہے۔ ابھی تک مجھے موقع نہیں مل سکا کہ یہ زیورات چندا کو پہنچا سکوں۔"

رئیس نے باکس بند کر دیا "بڑا باریک کام ہے یار۔ پہلے ہوتا ہوگا۔ یہاں تو میں نے کہیں بھی ایسی مہارت نہیں دیکھی۔"

میں نے کہا "ان زیورات کے علاوہ پانچ پاؤنڈ چاکلیٹ لایا تھا میں لندن سے۔"

"قمر کے لیے' اسے اب بھی شوق ہے؟"

میں نے کہا "شوق کی کوئی عمر ہوتی ہے؟ اور ابھی اس کی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ مجھے تو آج بھی وہ کل والی چھوٹی سی بچی لگتی ہے جو صرف اسی بات پر اپنے بھائی سے روٹھ کے کُپا ہو جاتی تھی کہ وہ بازار گیا تھا تو اس کے لیے چاکلیٹ کیوں نہیں لایا۔ بھائیوں کے جذبات نہیں بدلتے۔"

رئیس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی "اپنی تو پیارے ایسی قسمت ہی نہیں تھی کہ کوئی چھوٹی یا بڑی بہن ہوتی۔ ہمیں کیا معلوم بہن بھائی کے رشتے میں کیا جذبات ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "کتنی چھوٹی سی بچی تھی قمر جب اس کی ماں اسے میرے حوالے کرکے گئی تھی۔ باپ قتل ہو گیا تھا۔ ماں قاتلوں سے بدلہ لینے گئی تھی اور لوٹ کے نہیں آئی۔ بڑی ذمے داری آ گئی تھی میرے کندھوں پر۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے مجھے توفیق دی' حوصلہ دیا اور استقامت دی۔ آج قمر اپنے گھر میں خوش ہے۔ یہ دیکھ کے مجھے کتنی خوشی ملتی ہے' اس کا تو اندازہ نہیں کر سکتا۔ یہ چاکلیٹ دیکھ کے اس کا چہرہ خوشی سے کیسے کھل اٹھے گا' صرف یہ دیکھنے کے لیے میں کہیں بھی جاؤں' اس کے لیے چاکلیٹ ضرور لاتا ہوں۔"

رئیس نے کہا "چل یہ چاکلیٹ بھی رکھ لے' اور کیا سامان ہے؟"

میں نے کہا "شاہ عالم کے ایک دو جوڑے بھی ساتھ لینے ضروری ہیں۔ شاہ عالم کا پاسپورٹ میں یہیں چھوڑ دوں گا۔ شناختی کارڈ بھی چھوڑا جا سکتا ہے۔ دوسرا بن جائے گا۔ لیکن بعد میں شاہ عالم کی شناخت کے لیے میں ایک چیز رکھ لیتا ہوں۔ اس کا انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس۔ یہ بات یقینی ہے کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں ہوٹل سے شاہ عالم کے غائب ہو جانے کا راز فاش ہوگا تو انتظامیہ اس کی رپورٹ پولیس کو دینے پر مجبور ہوگی۔ پولیس یہ سب سامان اپنی تحویل میں لے گی اور جب رپورٹ لکھی جائے گی تو اسے کیس پراپرٹی قرار

دے کر مال خانے میں جمع کرا دے گی جہاں یہ تاقیامت پڑا رہے گا۔ ظاہر ہے نقد رقم ان کے لیے نہیں چھوڑی جا سکتی۔ غتر بود ہو جائے گی۔"

"یہ سامان تو میں ایک بیگ میں ڈال کے نکل جاؤں گا۔"

میں نے کہا "یار' اس کے علاوہ بھی کچھ سامان ہے۔ لندن سے سونی نے اور نیلم کے سابق پی آر او عاقل نے کچھ تحائف بھیجے ہیں۔ کچھ نوادرات میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں جو وہاں نہیں چھوڑے جا سکتے تھے مثلاً قرآن کریم کا ایک نایاب نسخہ ہے۔ جو اورنگ زیب عالمگیرؒ نے لکھا تھا۔ یہ سب سامان لے جانے کے لیے ایک سوٹ کیس تو چاہیے۔"

"چل سوٹ کیس مل جائے گا۔"

میں نے کہا "لیکن اسے باہر کون نکالے گا؟ میں نہیں چاہتا کہ تو باہر سے کوئی سوٹ کیس لائے اور آدھے گھنٹے بعد واپس لے جائے تو کسی کو شک ہو۔ اس کے لیے میرے ذہن میں انسپکٹر نذیر بیگ کا نام آیا ہے تو اسے تلاش کر۔ وہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

"اس میں دو گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں' پتا نہیں وہ کہاں ملے گا؟"

میں نے کہا "وہ جہاں بھی ملے' اس سے کہنا کہ ایک سوٹ کیس میں کچھ سامان ڈال کر لائے۔ کچھ کپڑے میرے سائز کے۔ کچھ ایسا سامان جو کسی کو اغوا کرتے میں کام آ سکتا ہو مثلاً ایک بوری' رسی' شراب کی آدھی یا خالی بوتل' بے ہوش کرنے والی دوا..."

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "تیرا مطلب ہے کلوروفارم۔ وہ اتنی آسانی سے نہیں ملتا۔"

"تیرے تو انڈر گراؤنڈ دنیا میں بڑے تعلقات تھے۔"

"تھے جب تھے... اب نہیں ہیں۔ نیند کے انجکشن البتہ لا سکتا ہوں کوشش کرکے۔"

"ان سے بھی کام چل جائے گا" میں نے کہا "نذیر کو ایک ریوالور بھی قربان کرنا پڑے گا۔ اسے کہنا فکر نہ کرے' میں اسے دوسرا دلوا دوں گا۔"

"ایک ہی ریوالور ہوگا اس کے پاس تو۔"

میں نے کہا "یہ سب سامان وہ ایک سوٹ کیس میں ڈال کے یہاں آ جائے۔ فرضی نام سے ہوٹل میں ایک کمرا حاصل کر لے۔ میرے نکل جانے کے ایک گھنٹے بعد وہ اپنا سوٹ کیس کمرے میں خالی کرے۔ اپنا سارا سامان یہیں چھوڑ دے اور سوٹ کیس اٹھا کے نکل جائے۔ میں اپنا سامان اس میں ڈال دوں گا۔"

رئیس کے چہرے پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے "لیکن یہ سب آخر کس لیے؟"

میں نے کہا "دیکھ یار۔ شاہ عالم کی گمشدگی کے معاملے میں کنفیوژن پھیلانا ضروری ہے۔ یہ بات بھی بالآخر ہوٹل والوں کو معلوم ہو جائے گی کہ جو مہمان گھنٹے دو گھنٹے کے لیے آیا تھا وہ کمرے میں کیا چھوڑ گیا ہے۔ تقریباً اسی وقت شاہ عالم بھی غائب ہوگا۔ اس سے جیرے بلیڈ کی پوزیشن مشکوک ہو جائے گی۔ پولیس بھی اسی چکر میں پڑ جائے گی کہ اس پُراسرار مہمان کا یقیناً شاہ عالم کیس سے کوئی تعلق ہوگا۔ تجھے واپس آنے کی ضرورت نہیں۔"

رئیس کے جانے کے بعد میں نے ریکارڈ کے لیے ایک ٹیلی فون کال سونی کے نمبر پر بک کرائی۔ لندن میں دوپہر تھی مگر عاقل اور سونی مجھے گھر پر ہی مل گئے۔

سونی میری آواز سن کے سخت جذباتی ہو گئی "اتنی دور سے تمہاری آواز سن کے بڑا عجیب لگ رہا ہے بھیا!"

"ایسا صرف ٹیلی فون کی ایجاد کی وجہ سے ممکن ہوا خاتون۔"

وہ بولی "جب آپ کا جہاز اڑ گیا تو میں بہت روئی۔"

میں نے کہا "پاگل ہے تو۔"

"مجھے ایسا لگتا تھا جیسے لندن کے شہر میں صرف ویرانی اور سناٹا ہے۔ میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں۔ اور پاکستان تو اتنی دور ہے۔ اتنی دور ہے کہ میں اس دوری کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

میں نے کہا "آواز سے تیز چلنے والے جیٹ طیاروں کے اس دور میں کوئی جگہ دور نہیں۔ لندن سے آٹھ نو گھنٹے میں جہاز پاکستان پہنچ جاتا ہے۔"

وہ اداسی سے بولی "کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا میرے لیے بھیا۔ تم ہی بتاؤ' سونی کیسے آ سکتی ہے پاکستان؟"

میں نے کہا "خواہ مخواہ ایسی باتیں مت سوچا کر۔ کیا یہاں سے شادی کرکے لڑکیاں امریکا' برطانیہ نہیں جا رہی ہیں۔ اور پھر یہ تھوڑے دن کی بات ہے۔ اس کے بعد تو بھی جب چاہے گی آ جائے گی ورنہ جب تو کہے گی ہم آ جائیں گے۔"

"نہیں بھیا۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اتنی دور کون آتا ہے کسی سے ملنے۔ فرصت کسے ملتی ہے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں ایسے مصروف ہو جاتے ہیں کہ آنا تو دور کی بات ہے' کسی کو فون

کرنے کی اور پھر یاد کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔"

میں نے کہا "تو اداس مت ہو، ہم آئیں گے اور بہت جلد آئیں گے، صرف تجھ سے ملنے۔"

"سچ بھیا۔ کب آؤ گے، میں دن گننا شروع کردوں؟"

میں نے کہا "ابھی تو میں الجھا ہوا ہوں، اپنے معاملات نمٹانے میں، ان معاملات کے بارے میں تو اچھی طرح جانتی ہے۔"

"آپ اپنا فون نمبر تو مجھے دے دیں۔"

میں نے کہا "بمبئی میں ٹھہرا ہوا ہوں ہوٹل میں۔"

"ہوٹل میں کیوں، اپنے گھر میں کیوں نہیں؟"

میں نے کہا "میرا کون سا گھر ہے بہنا۔ تونے تو اپنا گھر بسا لیا۔"

وہ بولی "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب میرا گھر نہیں تھا تو کیا میں ہوٹل میں رہتی تھی؟"

میں نے کہا "تو نہیں سمجھتی اس لیے کہہ رہی ہے۔ بہنیں تو رہتی ہی بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ مگر شادی کے بعد بھائی نہیں جاتے بہنوں کے گھر میں رہنے کے لیے۔"

"آخر پہلے کہاں رہتے تھے تم؟"

"رئیس خانے میں مگر وہاں تو بقول شاعر۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔ رئیس نے میری وجہ سے بڑی پریشانی اٹھائی۔ اس کا لاکھوں کا گھر جو اس نے بڑے شوق سے بنوایا تھا، راکھ ہوگیا۔ اب وہ خود نیلم کے ساتھ اس کے گھر میں رہتا ہے۔"

"تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں اس گھر میں؟ آخر میں بھی تو رہی تھی۔"

میں نے کہا "ویسے تو شبنم نے کیا ہے کچھ انتظام۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ فی الحال نیلم کے ساتھ رہنا سب سے بہتر ہوگا۔ چل اب تو فون دے اپنے مجازی خدا کو۔"

وہ ہنسی "مجازی خدا تو بھوت بنے ہوئے ہیں۔ صبح سے گھر کے جالے صاف کر رہے تھے۔ لو وہ آ گئے منہ دھو کر۔"

عاقل نے کہا "تسلیمات بجالاتا ہوں سالے صاحب!"

میں نے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے یار۔ دو دن میں تم نے مجھے قائم مقام سسر کے عہدے سے گھٹا کے سالا کردیا۔"

"کیا کریں بھائی! ہماری اپنی اوقات دو کوڑی کی ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے ڈکشنری میں بھی شوہر کے لغوی معنی بدل دیے جائیں۔ شوہر کے معنی حکم کا غلام... مفت کا نوکر۔"

میں نے کہا "حضرت، آپ تو دو ہی دن میں مجسم نقشِ فریادی بن گئے۔"

"حضرت!" اس نے ایک آہ بھری "خدا آپ پر بھی یہ وقت لائے گا۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے، سب اسی زلف کے اسیر ہوئے اور اس کے بعد وہی ہوا جو ہوتا آیا ہے۔ شادی ہوئی، بچے ہوئے اور پھر بچوں کے بچے ہوئے اور بالآخر انجام بخیر ہوا۔ خیر چھوڑو، تم اپنی سناؤ کہ جب خیر سے بدھو گھر کو آئے تو گھر آکے کیا تیر مارا؟ تمہارے معاملات کہاں تک پہنچے۔"

میں نے کہا "معاملات اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں لیکن یار، گڑے مردے اکھاڑنا بہت مشکل کام ثابت ہو رہا ہے۔ یہاں لوگ شاہ عالم کو بھول چکے تھے۔ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے، کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ دو دن میں ایک پریس کانفرنس کی اور اپنا ڈھول خود پیٹا۔ اخبار میں خبریں لگوائیں۔ آج ایک قاتلانہ حملے کی خبر کا بندوبست کیا تاکہ لوگ کچھ تو چونکیں۔ شاہ عالم کی کچھ سیاسی اہمیت تو بحال ہو تاکہ وہ مرے تو خبر بنے۔ اب وہ پہلے والی شاندار تدفین تو ناممکن ہے مگر کچھ گواہ ضرور مل جائیں گے اس کی موت کے۔"

وہ بولا "میں بھی شادی کے بعد خانہ آبادی کے مسائل میں الجھ کے رہ گیا ہوں اور حال میرا یہ ہے کہ شادی ایک ہوئی ہے مگر گھر دوبار بسانا پڑ گیا۔ پرانے فلیٹ میں جو آتش زنی کی واردات ہوئی تھی، اس کے قانونی مسائل سے نمٹ رہا ہوں۔ انشورنس کلیم کے معاملات الگ ہیں۔ سبحان اللہ کیا ہنی مون گزر رہا ہے۔"

میں نے کہا "بمبئی کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہ کچھ اداس ہے۔"

"یار ایسی باتیں تو سب لڑکیاں کرتی ہیں۔ لگتا ہے کہ چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر آج جانا پڑا تو گویا بڑا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ خوب نسوے بہالیتی ہیں اور ایکٹنگ بھی اچھی کرلیتی ہیں ڈپریشن کی۔ سب ڈراما ہے۔ آہ۔"

میں نے کہا "کیا ہوا؟"

عاقل بولا "وہی جو سچ بولنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جالے صاف کرنے والا برش ماردیا۔ شکر ہے ہاتھ میں گولی مارنے والا آلہ نہیں تھا۔"

میں نے کہا "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے ان نوادرات کے بارے میں غور و فکر کیا ہے۔"

وہ بولا "جتنا غور کیا ہے اتنا ہی میری فکر میں تشویش ناک اضافہ ہوا ہے۔ کل اتفاق سے ایک مردِ دانا ملا جو

امپورٹ ایکسپورٹ کے قانونی مسائل کا ماہر تھا۔ اس نے بتایا کہ کوئی شخص یا ادارہ نوادرات کو ایک ملک سے دوسرے ملک لانے لے جانے کا مجاز نہیں۔ یعنی قانونی طور پر یہ ناممکن ہے کہ میں وہ نوادرات آپ کے نام ارسال کرسکوں۔ سب سے پہلے تو یہ سوال اٹھے گا کہ آخر یہ نوادرات کہاں سے اور کیسے آئے؟ آثارِ قدیمہ اور نوادرات کی منتقلی ملک کے اندر ہو یا باہر۔ صرف اور صرف حکومتوں کی ذمے داری ہے۔ برطانوی حکومت ہماری حکومت سے کہے گی کہ سوری، یہ آپ کے ملک کا تاریخی اور تہذیبی ورثہ ہے جو غلطی سے یہاں بھیج دیا گیا تھا تو حکومتِ پاکستان بھی سخت مائنڈ کرے گی کہ سوری کا کیا مطلب۔ بتایا جائے کہ یہ غلطی کرنے والا کون تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بہت طویل اور مشکل قانونی مرحلہ ہے.... لیکن۔"

میں نے کہا "لیکن کیا۔؟"

"ہر مشکل کام کا ایک آسان طریقہ بھی ہوتا ہے۔ جسے عام طور پر غیر قانونی طریقہ کہا جاتا ہے۔ یہ نوادرات واپس اسمگل کیے جاسکتے ہیں لیکن ایک تو مجھے اسمگلنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔ دوسرے میرے دوست احباب یہاں تک کہ سسرالی عزیزوں میں کوئی اسمگلر نہیں ہے۔ سب شرفا ہیں۔"

میں نے کہا "کیا تم اسمگلروں کو جانتے.... نہیں۔ جولی کا شوہر تو جیل میں ہے مگر جولی تمہاری مدد کرسکتی ہے۔"

"بالکل کرسکتی ہے۔ اگر تم اس سے کہو۔"

میں نے کہا "لارڈ پرائس بھی کام کا آدمی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ سب جو آرٹ اینڈ کرافٹ ڈیلر ہیں۔ دنیا بھر سے نوادرات لندن لانے والے اور ان کے ایجنٹ، سب تمہارا مسئلہ حل کرسکتے ہیں۔"

عاقل نے کہا "ہاں یہ تو ہے۔ جو سیدھا عمل کرتے ہیں وہ الٹا کیوں نہیں کرسکتے۔ بقول شاعر یہ سڑک جاتی ہے جلال پور جٹاں کو۔ اور پھر واپس بھی یہیں آتی ہے۔ جو پاکستان سے نوادرات لاتے ہیں، وہ نوادرات کو پاکستان بھی لے جاسکتے ہیں۔ اسمگلنگ کی شاہراہ پرون وے ٹریفک تو نہیں چلتی۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ تمہارا مسئلہ حل ہوا۔ فہو المطلوب۔"

"لیکن تم تصویر کا دوسرا رخ نہیں دیکھ رہے ہو۔ وہ جو پاکستانی نوادرات اسمگل کرکے یہاں لاتے ہیں۔ انہیں یہاں حق محنت وصول ہوجاتا ہے۔ الٹی گنگا بہانے میں کسی کو کتنے نفل کا ثواب ملے گا۔"

میں نے کہا "ہم اسے معاوضہ ادا کریں گے، تم بات کرلو۔"

"ایک پرابلم تمہیں بھی ہوگی۔ تم ان نوادرات کا کیا کروگے؟ کیسے انہیں حکومت کے حوالے کروگے۔"

میں نے کہا "میں کوئی صورت نکال لوں گا۔"

بات ختم کرکے میں نے فون رکھا ہی تھا کہ نیلم کا فون آگیا۔

میں نے کہا "کہاں ہو تم اس وقت؟"

"آج ایک شوٹنگ کینسل ہوگئی تھی اس لیے گھر آگئی ہوں۔ تم کیوں ہوٹل میں ڈیرا ڈالے بیٹھے ہو؟"

میں نے کہا "ایک لاوارث اور بے گھر آدمی آخر کہاں جائے۔ سب رئیس جیسے خوش قسمت تو نہیں ہوتے۔"

وہ ہنسنے لگی "مذاق چھوڑو۔ یہ بتاؤ اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ تمہاری پریس کانفرنس کی روداد پڑھ کے تو ایسا لگتا ہے جیسے تم پھر سیاست کے میدان میں اترنے پر کمربستہ ہو۔"

میں نے کہا "وہ سب فضول باتیں ہیں جو صرف پریس کانفرنس میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ حقیقت تم جانتی ہو۔ میں اس جالِ بلکہ جنجال سے نکلنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔"

"اپنی رہائش کے بارے میں کیا طے کیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ ذمے داری میں نے شبنم کو سونپ دی تھی۔ اس نے میرے لیے آفس اور گھر کا بندوبست تو کیا ہے کہیں۔"

"تم کرائے کے گھر میں رہوگے؟"

میں نے کہا "مجبوری ہے۔ بڑے بڑے معزز لوگ رہتے ہیں۔"

وہ بولی "ناصر۔ بڑے شرم کی بات ہے یہ میرے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ کیا میرا گھر تمہارا نہیں ہے؟"

"بالکل ہے۔ اور اسی لیے میں تمہارے گھر کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری زندگی کو لاحق خطرات کا سایہ بھی اس گھر پر پڑے۔"

"آخر ایسا کیوں سوچتے ہو تم؟ ایسی غیریت کی باتیں کیوں کرتے ہو۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے نیلم کہ جتنا بڑا تمہارا گھر ہے۔ اس سے کہیں بڑا تمہارا دل ہے۔ میرے لیے تمہارے دل میں جتنی جگہ ہے یہ بھی جانتا ہوں میں۔ اسی لیے تو برسوں بعد بھی سونی کو لے کر تمہارے پاس آگیا تھا اور آج اگر بمبئی بن جانے والی سونی اپنے گھر میں ہنسی خوشی آباد ہے تو صرف

تمہاری وجہ سے۔"

"باربار ایسی باتیں سننا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بس تم اپنا سامان اٹھاؤ اور آجاؤ۔"

میں نے کہا "میری زندگی کی کہانی بھی عجیب ہے نیلم۔ میری آدھی زندگی تو یتیم خانے میں گزر گئی۔ اس کے بعد سے میں دربدر ہوں۔ کتنا عرصہ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں رہا۔ پھر شادو کے عشق نے خوار کیا تو فقیر ہوگیا اور شاہ جی کے ڈیرے پر پڑا رہا۔ اس کے بعد ماں باپ کی طرح میرا خیال رکھنے والے ہیر رانجھا مل گئے اور وہاں کچھ دن ایسے آئے تھے جب شادو نے میرا گھر آباد کیا تھا مگر تم جانتی ہو' اس کے بعد کیا ہوا۔ شادو میرا ساتھ چھوڑ گئی اور اس وقت جب دنیا میرا کوئی نہ تھا' تم نے مجھے اپنالیا پھر قسمت نے کرنل خان کے گھر پہنچادیا۔ اسے بھی میں نے اپنا گھر سمجھ لیا تھا لیکن تقدیر نے مجھے شاہ عالم ہاؤس پہنچادیا۔ اس کے بعد میں روپوش رہا اور ایک سال رئیس خانے میں گزار دیا۔ کوئی بھی گھر ایسا نہیں تھا جسے میں اپنا کہہ سکوں۔"

"اگر اپنا گھر بس وہی ہوتا ہے جو اپنے نام ہو تو میں نیلم ہاؤس تمہارے نام کردوں گی" نیلم ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "جب میں دوسری طرح سوچتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں کتنا خوش قسمت تھا۔ کتنے لوگوں نے مجھے اپنا سمجھا تھا اور آج بھی سمجھتے ہیں۔ اگر میں ڈاکٹر کمال سے کہوں کہ میں تیرے ساتھ رہنا چاہتا ہوں تو وہ کہے گا کہ سؤر کے بچے! پوچھ کیوں رہا ہے' سامان اٹھا اور آجا۔ قمر اس سے زیادہ خوش ہوگی۔ لیکن وہ خود رہتے ہیں دو کمروں کے ایک کوارٹر میں۔ عجب فقیر اور درویش آدمی ہے کمال بھی۔ پیسے کی اسے کوئی کمی نہیں۔ وہ چاہے تو اسپتال کے احاطے میں ہی اپنے لیے کوٹھی بنا سکتا ہے۔ اسے کوئی بھی کچھ نہیں کہے گا مگر وہ اپنی ضروریات کی سطح کو کم سے کم رکھتا ہے۔"

"تم خود بھی تو اپنی کوٹھی بنا سکتے ہو وہاں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اور واقعی کتنا اچھا ہو اگر نیلم ہاؤس جیسا عالی شان محل نہ سہی' اتنا بڑا ایک گھر ہو جہاں ہم سب ساتھ رہ سکیں۔ جیسے پہلے رہتے تھے۔ میں اور قمر' کمال اور چندا' ایک فیملی کی طرح۔ لیکن ابھی وہ بڑے سکون سے اپنا کام کررہے ہیں۔ میں ان کی زندگی کو اپنے مسائل کے ساتھ ڈسٹرب نہیں کرسکتا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ یہاں آجاؤ۔ میں تم اور رئیس اکٹھے رہ سکتے ہیں۔"

"ابھی تمہارا فون آنے سے پہلے میں غنی سے بات کررہا تھا وہ بھی مجھے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ مجھے اور کہیں نہیں رہنا چاہیے۔ خود رئیس یہی چاہتا ہے۔"

"دیکھو ناصر...!"

میں نے کہا "شاہ عالم...!"

"اچھا بھئی شاہ عالم! اتنے لوگوں کی خواہش ہے تو تمہیں مان لینا چاہیے۔ ویسے بھی آگے چل کے ہماری زندگی کے مقاصد مشترک ہوں گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "صرف اپنی اور رئیس کی بات کرو۔"

وہ بولی "کیوں؟ رئیس کے اور تمہارے راستے الگ ہوجائیں گے کیا۔ رئیس تمہارے ساتھ رہے گا۔ میں رئیس کے ساتھ تو گویا تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "اچھا بابا۔ تم جیتیں اور میں ہارا۔"

اس نے کہا "رئیس کہاں ہے؟"

میں نے کہا "وہ ایک کام سے گیا ہے۔ بس آتا ہی ہوگا۔ تمہارے سیکریٹری کو میں نے زبردستی اپنا سیکریٹری بنایا ہے۔ اب تم کیا کروگی؟"

وہ ہنسی "تم یہاں آجاؤ گے تو ہم اسے شیئر کریں گے۔"

میں نے کہا "بڑی فراخ دلی دکھارہی ہو۔ بعد میں سب سے زیادہ شکایت تمہی کو ہوگی عام بیویوں کی طرح کہ مجھ سے میرا شوہر چھین لیا۔"

رئیس آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا تو اپنے مقصد میں کامیابی کا اظہار اس کے چہرے سے ہورہا تھا۔ "زیادہ نہیں تلاش کرنا پڑا اسے۔ جیرا بلیڈ اتفاق سے گھر پر ہی تھا۔"

"کیا وہ تیرے ساتھ نہیں آیا؟"

رئیس نے گھڑی دیکھی۔ "اسے میں نے بتایا تھا کہ کیا سامان ساتھ لانا ہے' پہلے تو سالا پریشان ہوا۔ پوچھنے لگا کہ چکر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ بھوتنی کے' ساری زندگی تو چکروں میں گزاری ہے۔ اب ہم سے پوچھتا ہے کہ چکر کیا ہے۔ تجھے اپنا چاچا پتنگ باز یاد ہے؟"

میں نے کہا "بالکل یاد ہے۔ کیا وہ آج کل جیل سے باہر ہے؟"

"ابے یار! وہ صرف ایک بار جیل گیا ہے۔ وہ بھی ایک جھوٹی شکایت پر۔ وہ ہماری چنڈال چوکڑی کا سردار تھا۔"

"اس وقت چاچا پتنگ باز کا ذکر کیسے آگیا؟" میں نے کہا۔

"آج کل وہ اور جیرا بلیڈ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ چاچا ہر فن مولا ہے۔ دنیا کا ہر کام کرسکتا ہے۔ وہ جیرے کے ساتھ گیا ہے انشاء اللہ سب سامان لے کر ہی آئے گا۔ یہاں سالے سیکیورٹی والے مجھے بھی روک رہے تھے۔ میں نے کہا کہ میں تو سیکریٹری ہوں شاہ عالم کا لیکن انہوں نے ایک نہیں سنی۔ مجھے لے گئے منیجر کے پاس۔ پھر کہیں اوپر آنے کی اجازت ملی۔ منیجر کہہ رہا تھا کہ ویسے تو بہت فون آرہے ہیں ان لوگوں کے جو شاہ عالم کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہے ہیں مگر ایک کوئی ایم پی اے ہے۔ ملک رب نواز' وہ بہت گرم ہورہا تھا جب ہم نے کہا کہ شاہ عالم سے بات نہیں ہوسکتی تو دھمکیاں دینے لگا۔"

میں نے کہا "سالا ایم پی اے کی اولاد۔"

رئیس بولا "یار' کہیں وہ خود نہ پہنچ جائے۔"

میں نے کہا "یہاں آکے بھی کیا ہوگا۔ میں نے تو ملاقاتوں پر بھی پابندی لگا رکھی ہے۔"

مکمل رازداری کے لیے ضروری تھا کہ ہوٹل میں پہنچ جانے کے بعد جیرا بلیڈ نہ مجھے فون کرے اور نہ مجھ سے ملنے کی کوشش۔ اس کا فون نمبر معلوم کرنے کے لیے رئیس کو دوبارہ باہر جاکے فون کرنا پڑا۔ پہلی مرتبہ تو ہوٹل والوں نے معذرت کرلی کہ اس نام کے کوئی مہمان یہاں قیام پذیر نہیں ہیں لیکن پندرہ منٹ بعد اس کی دوسری کوشش کامیاب رہی۔

"وہ کمرا نمبر چار سو گیارہ میں ہے" اس نے واپس آکے بتایا۔

میں نے کہا "تو نے اسے سب سمجھادیا تھا نا؟ اسے یہاں صرف ایک گھنٹا قیام کرنا ہے۔"

رئیس نے سرہلایا "جیرے بلیڈ پر بھروسا ہونا چاہیے تجھے۔ وہ کتنی مرتبہ ہمارے کام آیا ہے۔"

میں نے کہا "اپنا سب سامان الگ کرلیا ہے میں نے۔ تو اوپر لے جا اور جیرے کو سمجھادے کہ یہاں سے نکل کے سیدھا نیلم کے پاس جائے اور سوٹ کیس نیلم کے حوالے کردے۔"

"تو نہیں ملے گا جیرے بلیڈ سے۔"

میں نے کہا "اب ملاقات ہوتی رہے گی یار۔ یہاں کسی نے مجھے اس سے ملاقات کرتے دیکھ لیا تو سارا پلان چوپٹ ہوجائے گا۔ یہ سامان پہنچا کے تو بھی جا اور وہیں نیلم کے گھر انتظار کر میرا۔"

"زیادہ دیر مت کرنا۔"

میں نے کہا "میں شیو کرکے یہ داڑھی صاف کرلوں۔ پھر منہ کالا کرکے یہ وردی پہنتا ہوں اور آتا ہوں تقریباً ایک گھنٹے میں۔"

رئیس کچھ فکرمند ہوگیا "ابے ایسا نہ ہو کہ سالے سیکیورٹی والے پہچان جائیں تجھے۔ باہر ابھی روشنی ہے۔"

میں نے کہا "تو جو واٹر کلر لایا ہے اس سے میں چہرے اور ہاتھوں پر قدرتی کالا رنگ کرلوں گا تو بالکل حبشی نظر آؤں گا۔ ڈرائیوروں والی وردی اور سر پر ٹوپی ہوگی تو کس کا دھیان جائے گا میری طرف۔ داڑھی بھی صاف ہوگی اور مونچھیں بھی۔ ایک گھنٹے میں سورج غروب ہوجائے گا تو دن کا اجالا نہیں ہوگا۔ بلب کی روشنی میں کوئی مجھے نہیں پہچان سکتا۔ تو جا۔"

دس منٹ بعد میں نے روم سروس سے اپنے لیے کافی طلب کی تو یہ بھی کہا کہ مجھے روزنامہ "تہلکہ" کا خصوصی ضمیمہ چاہیے۔ اس کی ایڈیٹر روزینہ کو میں نے کوئی ادائیگی نہیں کی تھی اور نہ شبنم نے میری طرف سے کوئی یقین دہانی کرائی تھی مگر اس کے باوجود شاہ عالم سے پرانے مراسم کا لحاظ کرتے ہوئے روزینہ نے ضمیمہ چھاپ دیا تھا۔ شاید اسے بھی یہ یقین ہوگا کہ اب میں نے دوبارہ میدانِ سیاست میں قدم رکھا ہے تو اسے آئندہ بھی مجھ سے فائدہ اٹھانے کے مواقع ملتے رہیں گے۔

روزینہ سنسنی خیز صحافت کی دنیا میں ایک جینئس تھی۔ اس نے شاہ عالم پر ناکام قاتلانہ حملے کی خبر چھ کالمی سرخی بنا کے چھاپی تھی' یہ سرخی وہی تھی جو پیسے کی ہاتھوں ہاتھ فروخت کی ضامن ہوسکتی تھی۔ روزینہ نے میری سرخی کا انتخاب کیا تھا۔ "پولیس نے کرائے کے قاتل بھرتی کرلیے۔ شاہ عالم پر قاتلانہ حملے کا ملزم تھانے دار گرفتار۔"

خبر کی تفصیلات کے ساتھ میری تازہ ترین تصویر لگی ہوئی۔ دوسری طرف پولیس کی وردی میں ملزم نظر آرہا تھا۔ وہ اسپتال کے ایک بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی نگرانی کے لیے دو مسلح پولیس والے موجود تھے۔ تیسری تصویر واردات میں استعمال ہونے والے ریوالور کی تھی اور چوتھی میں جائے واردات یعنی ہوٹل کے کمرے میں تباہی کے منظر کو واضح کیا گیا تھا۔ روزینہ نے شاہ عالم کے ساتھ تجدیدِ مراسم کے مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مختصر سا اداریہ بھی لکھ مارا تھا جس میں پولیس کو خوب رگیدا گیا تھا اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ اعلیٰ حکام نے میری گزشتہ شب کی پریس کانفرنس میں کیے گئے خدشات کو بالکل اہمیت نہیں دی۔

اے ایس آئی صابر شاہ اور اے ایس پی دلاور شاہ دونوں ہی کسی نادیدہ ہاتھ کے آگے بڑھائے ہوئے مہرے تھے۔ بے شک میری غیر متوقع جوابی چال سے چھوٹا مہرہ پٹ

گیا تھا اور بڑے مہرے کو پیچھے ہٹنا پڑا تھا لیکن میری یہ کامیابی بہت عارضی تھی۔ اس نے انھیں زیادہ چراغ پا کیا ہوگا جو کسی خاص مقصد کے تحت پولیس کو میرے خلاف استعمال کر رہے تھے۔ شاید وہ میری گرفتاری چاہتے تھے لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھولی جائیں اور ایک مفرور مجرم کی حیثیت سے میری گرفتاری کے احکامات بھی حاصل کیے جائیں۔ قانون کے حرکت میں آنے سے پہلے اگر میں ہوٹل سے نکل کے کہیں جانے کی کوشش کرتا تو وارنٹ دکھائے بغیر نہ وہ مجھے روک سکتے تھے اور نہ گرفتار کرسکتے تھے چنانچہ انہوں نے صابر علی کو محافظ بنا کے میرے ساتھ کردیا۔ ان کی بدقسمتی یا میری خوش نصیبی کہ یہ راز فاش ہوگیا اور مجھے تھوڑی سی مہلت مل گئی۔

فرید عباسی مجھے پہلے ہی خبردار کرچکا تھا کہ قانونی طور پر میری پوزیشن بہت خطرناک ہے اور مجھے کسی بھی وقت کہیں بھی گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ دلاور شاہ کو میری نگرانی پر کس نے مامور کیا تھا اور صابر علی کو میرے پیچھے کس نے لگایا تھا۔ خود پولیس نے یا کسی رب نواز جیسے مہربان نے مگر میرے پاس حقیقت حال تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ برا وقت آنے سے پہلے ہی شاہ عالم کا غائب ہوجانا اس کے اپنے مفاد میں تھا۔ اور بے حد ضروری تھا۔

لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ برا وقت آچکا ہے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے کہا "یس!" تو ہوٹل کا اسسٹنٹ منیجر اندر آگیا۔ اس کے چہرے سے کچھ بدحواسی عیاں تھی "سر! ایک چھوٹی سی پرابلم پیدا ہوگئی ہے۔"

میں نے کہا "میری وجہ سے؟"

اس نے ہاتھ مل کے کہا "آپ کی وجہ سے تو نہیں سر۔ مگر تعلق آپ سے ہی ہے۔ آپ کی پارٹی کے کچھ کارکن' جب میں نے دیکھا تو پندرہ بیس تھے۔ اب ممکن ہے زیادہ ہوگئے ہوں۔ وہ گیٹ کے سامنے جمع ہیں اور پولیس کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز نعرے لگا رہے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ روزنامہ "تہلکہ" کے خصوصی ضمیمے کا ردِ عمل ہوگا۔ میں نے کسی سیاسی لیڈر کی طرح ایک ڈائیلاگ بولا "عوامی غیظ و غضب کا طوفان ایک دن بیوروکریسی کے سازشی ٹولے کو سیلاب کی طرح بہا کرلے جائے گا۔"

اسسٹنٹ منیجر کچھ نروس ہوا "لیکن یہ کارکن ہمارے لیے انتظامی مسئلہ پیدا کر رہے ہیں۔ سڑک کے اس پار ایک پولیس چوکی ہے۔ کہیں ان کا تصادم نہ ہوجائے۔ میں خود بھی ہوٹل کو محفوظ رکھنے کے لیے پولیس کو بلانا نہیں چاہتا سر۔ اگر آپ نیچے جاکے ان سے بات کرلیں تو شاید وہ مطمئن ہوکے واپس چلے جائیں۔"

میں نے کہا "اوکے۔ اگر تم کہتے ہو تو میں انہیں سمجھا رہا ہوں کہ وہ پُرامن رہیں اور کسی قسم کی اشتعال انگیزی نہ کریں۔"

ہوٹل کے مین گیٹ میں جمع ہونے والے کارکنوں کی تعداد مشکل سے پندرہ بیس ہوگی۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے حفاظتی پیش بندی کرتے ہوئے گیٹ بند کرادیا تھا۔ اس سے آنے اور جانے والی ٹریفک متاثر ہوئی تھی۔ سیکیورٹی کا عملہ جانے والی گاڑیوں کو پارکنگ کے سامنے آنے والے گیٹ کی طرف موڑ رہا تھا۔

نعرے لگانے والوں کی قیادت ایک جوشیلا نوجوان کر رہا تھا جس کا قد مشکل سے پانچ فٹ ہوگا۔ وہ ہر نعرے کے ساتھ پٹاخے کی طرح اچھلتا تھا۔ باقی لوگ زندہ باد اور مردہ باد کہنے والے وہی جذباتی احمق تھے جو ہر سیاسی لیڈر کو بلامعاوضہ دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ ہر جلسہ گاہ کی رونق بڑھاتے ہیں۔ ہر جلوس میں وعدوں کے فریب کھانے کے باوجود ہر بار خوش فہمی کے نئے خواب دکھانے والے کسی مداری کا تماشا دیکھنے لگتے ہیں۔

میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا لیکن میں نے اپنے چہرے پر ایک دوستانہ شناسائی کی پُرمنافقت مسکراہٹ سجالی اور ان کی طرف دیکھ کے یوں ہاتھ ہلایا جیسے ان سب سے پھر مل کے مجھے بے حد مسرت ہوئی ہے۔ اپنے محبوب لیڈر کو ملاقات کے لیے گیٹ کی طرف آتے دیکھ کر کارکنوں کا جوش و خروش بڑھ گیا اور ان میں سے ایک گیٹ پر چڑھ کے نعرے لگانے لگا اور ہوا میں مکے لہرانے لگا۔ گیٹ کے اندر کھڑا ہوا مسلح محافظ خاصا بدحواس نظر آرہا تھا کیونکہ ابھی تک اسے انتظامیہ کی طرف سے کوئی ہدایات موصول نہیں ہوئی تھیں کہ وہ مظاہرین کا سامنا کرے یا پیچھے ہٹ جائے۔ عام طور پر کسی بھی ہنگامہ خیز صورت حال میں پولیس کو فوراً طلب کرلیا جاتا تھا کہ وہ حالات کو پُرسکون بنائے مگر پولیس اپنے طور پر کوئی ایکشن لینے سے گریز کرتی تھی۔

میں نے قریب جاکے لوگوں کے نعروں کا ہاتھ ہلا کر جواب دیا اور گارڈ سے کہا کہ وہ گیٹ کھول دے۔ گارڈ نے تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کیا تو میں نے پیچھے دیکھا۔ اسسٹنٹ منیجر مجھ سے تقریباً پچاس قدم پیچھے تھا۔ اس نے گارڈ کو اشارہ کیا کہ گیٹ کھول دے۔

گیٹ کھلتے ہی پندرہ بیس افراد میرے گرد جمع ہوگئے۔

میں نے کہا "آپ لوگ باہر چلیں۔ یہ ہوٹل ہے اور یہاں ہمارے غیر ملکی مہمان بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہ کریں۔"

جوشیلے نوجوان نے نعرہ لگایا "قاتل پولیس!"

مجمع نے جواب دیا "ہائے ہائے" اور کچھ لوگ پولیس چوکی کی طرف منہ کرکے زور زور سے ضمیمے کو یوں ہلانے لگے جیسے ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہے ہوں۔ بلاشبہ یہ اشتعال دلانے والی حرکت تھی اور پولیس والے اس کے جواب میں لاٹھی چارج کرنے آجاتے تو کوئی حیرانی کی بات نہ ہوتی۔

میں نے ان لوگوں کو پیچھے ہٹنے اور پُرسکون رہنے پر مجبور کیا۔ میرے کہنے سے لوگ گیٹ چھوڑ کے کچھ فاصلے پر چلے گئے۔ جہاں سڑک کے ساتھ ساتھ بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وہاں میں نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں لوگوں سے کہا گیا تھا کہ وہ مشتعل ہوکے قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں۔ قصور پولیس کا نہیں کیونکہ وہ تو خود بیوروکریسی کی غلام ہے۔ ایک پولیس مین کے مجرمانہ فعل کے نتیجے میں ساری پولیس فورس کو مجرم ٹھہرانا مناسب نہیں۔ ظالموں کے احتساب کا وقت اب دور نہیں اور وہ دور آنے والا ہے جب خود کو حاکم سمجھنے والے عوام کے خادم کہلائیں گے' وغیرہ وغیرہ۔

میں نے کبھی کسی سیاسی اجتماع یا جلسے جلوس سے اس قسم کی صورتِ حال میں خطاب نہیں کیا تھا۔ وہ پندرہ بیس افراد بے حد جوشیلے تھے اور ان کے جارحانہ عزائم دیکھ کے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں کسی نے انہیں امن و امان کی صورتِ حال خراب کرنے نہ بھیجا ہو یا وہ کسی سازشی ٹولے کا آلۂ کار بن کے نہ آئے ہوں۔ اگر وہ اچانک پتھراؤ شروع کردیتے' ہوٹل کے اور گاڑیوں کے شیشے توڑنے لگتے یا کسی گاڑی کو آگ لگادیتے اور پھر فرار ہوتے تو اس تخریبی کارروائی پر مقدمہ میرے خلاف درج ہوتا۔ گرفتار مجھے کیا جاتا اور الزام بھی مجھ پر آتا کہ میں نے خود ہی پارٹی کے کارکنوں کو ہوٹل کے سامنے مظاہرہ کرنے کے لیے بلایا تھا تاکہ اس واقعے کو بھی میڈیا میں اچھالا جاسکے۔

میری تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ مظاہرہ کرنے والے پُرسکون ہوگئے۔ ان کے رویے میں تبدیلی ڈرامائی طور پر آئی۔ پہلے وہ ایسے پیش آرہے تھے جیسے ان کے آتش فشاں جذبات کی سرکش قوت کنٹرول سے باہر ہے اور اپنے محبوب لیڈر پر قاتلانہ حملے کے خلاف احتجاج کرنے والے سامنے آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کردیں گے۔ ان پندرہ بیس افراد کو منتشر کرنے کے لیے پولیس چوکی پر موجود نفری بھی کافی تھی لیکن وہ یوں BEHAVE کر رہے تھے جیسے ان کے پیچھے پندرہ سو یا پندرہ ہزار افراد کی طاقت ہے۔ ظاہر ہے وہ اوور ایکٹنگ کر رہے تھے۔ ان سے خطاب کرتے ہوئے میں نے نعرے لگانے والے جوشیلے نوجوان کو دیکھا تو وہ میری نظر بچا کے مظاہرین کو آنکھ مار رہا تھا اور یہ سگنل تھا کہ بس' مظاہرہ ختم۔ اور اس کے ساتھ ہی نعرے یکلخت بند ہوگئے۔ یوں جیسے ڈوریوں سے کٹھ پتلیوں کو چلانے والے نے اپنا ہاتھ روک لیا ہو۔

مظاہرین میں سے ایک نے آٹوگراف بک میرے سامنے رکھ دی۔ جب میں دستخط کر رہا تھا تو اسی جوشیلے نوجوان نے کہا "سر۔ ہاشم' آپ سے ہاتھ ملانا چاہتا ہے۔"

میں نے بے خیالی میں پوچھ لیا "ہاشم کون؟"

"ہاشم۔ وہی نوجوان سر' جو آپ کی جان بچاتے ہوئے گولی کا نشانہ بن گیا تھا" وہ نوجوان بڑا دکھی چہرہ بنا کے بولا "گولی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پھنسی ہوئی ہے۔ مفلوج پڑا ہے تب سے بے چارہ۔"

اگر اس قسم کا کوئی واقعہ شاہ عالم کی زندگی میں پیش آیا تھا تو میرے علم میں نہیں تھا چنانچہ میں نے آٹوگراف بک واپس کرتے ہوئے صورتِ حال کو سنبھالا "اچھا ۔۔ وہ ہاشم' میں اس سے ضرور ملوں گا۔ کہاں ہے وہ آج کل۔"

"سر' وہ آپ سے ملنے خود آیا ہے؟" نوجوان نے ایک بڑی ٹویوٹا پک اپ کی طرف اشارہ کیا جو پولیس موبائل جیسی بنی ہوئی تھی۔

میں نے کہا "اس نے اتنی تکلیف اٹھائی۔ صرف مجھ سے ملنے کے لیے۔"

جوشیلے نوجوان نے کہا "سر اسے بڑا صدمہ ہوا ضمیمہ دیکھ کر۔ کہہ رہا تھا کاش آج میں شاہ عالم صاحب پر چلائی جانے والی گولی اپنے سینے پر روک سکتا۔"

میرے نزدیک یہ جذباتی دیوانگی تھی لیکن ہر سیاسی لیڈر کو ایسے وفادار جاں نثار مل جاتے ہیں جو اس کے ساتھ اپنی پُر عقیدت وابستگی میں کسی بھی انتہا تک جانے کے لیے عقل کی دلیل کے محتاج نہیں ہوتے۔ میں نے ہاشم کو بھی اپنا ایسا ہی مرید سمجھتے ہوئے اس کی خواہش پوری کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھا اور چند قدم دور فٹ پاتھ کے متوازن کھڑی ہوئی پک اپ کی طرف بڑھ گیا۔

پک اپ کا رخ ہوٹل کی طرف تھا چنانچہ میں اس کے

پیچھے گیا تو ہوٹل کا پورا منظر میری نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ پک اپ کے پچھلے حصے پر ٹین کی چھت تھی اور اسے دروازے جیسے دو فولادی پٹ لگا کے بند کر دیا گیا تھا۔ ویسے بند کیبن والی پک اپ عام طور پر مال برداری میں استعمال ہوتی ہے لیکن میں نے اس میں اسکول کے بچوں کو بھی آتے جاتے دیکھا تھا۔

یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید اندر لیٹے ہوئے فالج زدہ ہاشم کو دھوپ سے بچانے کے لیے کیبن کا دروازہ بند کیا گیا ہو گا خود ہی ہاتھ بڑھا کے کنڈی کھولی اور اندر جھانکا۔ اس ایک لمحے میں بہت کچھ ہو گیا۔ اندر سے اچانک اور غیر متوقع طور پر بڑھنے والا ایک ہاتھ میرے منہ پر جم گیا۔ اس ہاتھ میں ایک رومال تھا جو غالباً کلوروفارم میں بھیگا ہوا تھا میرے دماغ کو ایک زبردست جھٹکا لگا مگر اس سے پہلے کہ میں اس ہاتھ کو ہٹانے کے لیے کچھ کرتا یا خود پیچھے ہٹتا۔ دو ہاتھوں نے مجھے پیچھے سے اٹھا کے آگے دھکیلا اور پک اپ میں پھینک دیا۔ وہ ہوش کا آخری لمحہ تھا جس میں میرے کانوں نے خود اپنے ہی جسم کے فرش پر گرنے کی اور پھر کیبن کا دروازہ بند ہونے کی آواز کے ساتھ ہی پک اپ کے انجن کے غرانے کی آواز سنی۔ پھر میرا ذہن بے حسی کے گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

بے ہوشی سے ہوش مندی کی جانب واپسی کا سفر ایک طویل پُر اذیت تجربہ تھا۔ پہلے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دماغ کے اندر چکی چل رہی ہے یہ بے ہنگم شور رفتہ رفتہ ایک پُر شور پنکھے کی آواز میں ڈھل گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں گول گھومنے والے جھولے پر بیٹھا ہوں اور جھولا اتنا تیز چل رہا ہے کہ میری نظر کسی چیز کو یا کسی چہرے کو فوکس نہیں کر سکتی۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا تو مجھے اپنے گرد ہر چیز گھومتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے سر کے اندر اب درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں اور میرا حلق ایسے ہو رہا تھا جیسے میں نے صحرائی خشک ریت پھانک لی ہو۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد میں نظر جما کے دیکھنے اور کچھ سوچنے کے قابل ہوا تو مجھے یہ سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ مجھے اغوا کر لیا گیا تھا۔ میں ایک آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا جو اب جھولے کی طرح گھوم نہیں رہا تھا۔ پانی کی لہروں پر بہتی کشتی کی طرح ڈول رہا تھا۔ کمرے میں روشنیاں تھیں جو جل بجھ رہی تھیں اور میرے ہاتھوں پیروں میں اتنی جان نہیں تھی کہ میں اٹھ کے بیٹھ سکوں۔ میرے پیٹ میں اینٹھن سی تھی اور ظاہر ہے یہ سب کلوروفارم جیسی خطرناک دوا کے ذیلی اثرات تھے۔

مجھے اغوا کرنے والے وہی مظاہرین تھے جو شاہ عالم کی پارٹی کے کارکن بن کر نعرے لگاتے ہوئے آئے تھے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو رفتہ رفتہ مجھے سب یاد آنے لگا۔ ہاں' میں نے پک اپ میں جھانکا تھا۔ کیا دیکھنے کے لیے کیا نام تھا اس کارکن کا۔ ہاں۔۔۔ ہاشم لیکن اندر ہاشم نہیں تھا۔ اندر کوئی اور تھا۔ اس نے میرے منہ پر رومال رکھ کے مجھے اندر کھینچ لیا۔ اور پھر پیچھے سے مجھے کسی نے اندر اچھال دیا تھا۔ بس۔ پک اپ فوراً روانہ ہو گئی تھی۔

سوال یہ ہے کہ اب میں کہاں ہوں؟ اس سوال کا صحیح جواب پانے میں جیسے صدیاں بیت گئیں۔ میں وقت کی رفتار کا اندازہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا۔ ہر لمحہ درد کے احساس کی ایک گھڑی ہو گیا تھا۔ یہ درد میرے وجود میں ناطاقتی کی بے بسی بن گیا تھا۔ میں اپنی مرضی سے اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ میرے لیے آنکھیں کھولنا اور گرد و پیش کو دیکھتے رہنا بھی ایک مشکل کام تھا۔

آہستہ آہستہ میرا دماغ بے ہوشی کی دوا کے مغلوب کر لینے والے اثرات کے خلاف اپنی جنگ میں کامیاب ہونے لگا۔ میں اپنی نظر کو مرکوز کرنے اور غور سے گرد و پیش کا جائزہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ میرا ذہن گرد و پیش کے منظر کو سمجھنے لگا۔

میں ایک ایسے کمرے میں لیٹا ہوا تھا جس کی آرائش میں جدید اور قدیم کا امتزاج تھا۔ فرش پر بیش قیمت قالین تھے اور کھڑکیوں دروازوں کے سامنے پھیلے ہوئے پردے جدید وضع کے تھے۔ کمرے کی ایک دیوار میں نصب ائرکنڈیشنر کے علاوہ ایک کونے میں رکھا ہوا ٹیلی وژن اور دوسرے کونے میں رکھا ہوا چھوٹا سا ڈبل ڈور فریج دورِ جدید کے پُر تکلف اور پُر آسائش بیڈ روم کا نقشہ پیش کرتے تھے لیکن کمرے کا فرنیچر روایتی قدامت پسندی کا آئینہ دار تھا۔ جس بیڈ پر میں لیٹا ہوا تھا وہ تقریباً پانچ فٹ چوڑا اور سات فٹ لمبا پلنگ تھا جس کے موٹے موٹے پائے شوخ رنگوں کے نقش و نگار سے مزین تھے۔ کشن والے صوفوں کے بازو اور پچھلے حصے پر لکڑی میں تراشے ہوئے گل بوٹے کسی دیہاتی کاریگر کی صناعی کا نمونہ تھے۔ صوفوں کے پائے بھی موٹی لکڑی کو تراش کے بنائے گئے تھے اور ان کے اوپر والے حصے کو مسجد کے مینار جیسی شکل دے دی گئی تھی۔ صوفے اتنے بھاری تھے کہ ایک آدمی انہیں اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتا تھا۔ ایسی ہی رنگین پایوں والی میز کے درمیانی حصے میں سیاہ پالش والے گل بوٹے

کھدے ہوئے تھے اور ان میں کوئی سفید مسالا بھرا گیا تھا جو دیکھنے میں ہاتھی دانت کی طرح اور اوپر جہاں دیوار چھت سے ملتی تھی ہر کونے کی لمبائی چوڑائی کے ساتھ ساتھ بڑے بھدے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کمرے کی دیواروں پر گلابی رنگ تھا اور مجموعی طور پر اسبابِ آرائش میں تیز لال نیلے اور پیلے رنگ غالب تھے۔

جب میری طبیعت اس حد تک بحال ہو گئی کہ میں اٹھ کے بیٹھ سکوں تو میں نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پھر تاریخ اور دن پر نظر ڈالی تو اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے بے ہوش ہونے کے چار گھنٹے بعد دوبارہ ہوش آیا ہے۔ میرا سر ابھی تک بھاری تھا اور یوں لگتا تھا جیسے ایک بھاری پتھر ہے جو میرے کندھوں کے درمیان ٹکا دیا گیا ہے۔

میں کچھ دیر سر تھامے بیٹھا رہا۔ پھر میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے چکر آیا اور میں نیچے گر گیا۔ اب مجھے سخت متلی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کچھ دیر قالین پر سر رکھے پڑا رہا اور پھر ہمت کر کے اٹھا تو تھوڑی دیر جھومنے کے بعد سیدھا کھڑا ہونے کے قابل ہو گیا۔

میں نے ایک پردہ ہٹا کے دیکھا۔ اس کے پیچھے کھڑکی تھی اور کھڑکی کے شیشوں پر اندھیرا کالے رنگ کی طرح جما ہوا تھا۔ دوسرے پردے کے پیچھے ایک بند دروازہ تھا جو شاید باہر سے مقفل تھا۔ تیسرا دروازہ اٹیچ باتھ روم کا تھا۔ میں نے لائٹ جلائی تو اپنے سامنے ایک وسیع اور جدید وضع کا مکمل واش روم دیکھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں چکنے ٹائلوں والے فرش پر میرا پاؤں نہ پھسل جائے' میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا واش بیسن تک گیا اور ٹونٹی کھول کے اپنا سر پانی کی دھار کے نیچے کر دیا۔ چند منٹ بعد میں نے سر کو تولیے سے رگڑ کے صاف کیا تو مجھے اپنی حالت میں نمایاں افاقہ محسوس ہوا۔

اب میں نے اپنے اس زنداں یا مہمان خانے کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔ کمرے کا دوسرا دروازہ ایک اور کمرے میں کھلتا تھا جو آرائش کے اعتبار سے ڈرائنگ روم سمجھا جا سکتا تھا۔ اس میں بھی ہر چیز بہت صاف ستھری' بیش قیمت اور خوبصورت تھی مگر مجموعی آرائش کے انداز میں مغربی فیشن سے زیادہ مشرقی روایات کے حسن کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔

میں نے ایک بار بلند آواز میں پوچھا "کوئی ہے" تو مجھے اپنی ہی آواز بہت اجنبی لگی۔ دوسری بار میں نے زیادہ واضح انداز میں یہی بات دہرائی لیکن مجھے جواب میں وہی خاموشی ملی۔ میں نے ڈرائنگ روم کے ایک کھلے دروازے کا رخ کیا۔ اگلا کمرا بھی مہمانوں کے بیٹھنے کا تھا مگر یہاں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ دبیز پھول دار قالین پر دیوار کے ساتھ ساتھ سرخ مخملی غلاف والے گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چھوٹی چھوٹی گلاس ٹاپ میزیں نظر آ رہی تھیں۔ درمیان میں ایک نسبتاً بڑی میز پر گلدان میں بالکل تازہ پھول لگے ہوئے تھے۔ یہ کمرا بھی تقریباً اٹھارہ فٹ چوڑا اور تیس فٹ لمبا تھا۔ اس میں بھی لمبائی کے رخ چھت سے تین فانوس معلق تھے جن میں درمیان والا بڑا تھا۔ ایک اگر ویسٹرن اسٹائل کا ڈرائنگ روم تھا تو دوسرا مشرقی انداز کی بیٹھک تھی۔ دونوں میں ایک خاص اہتمام صدرِ محفل یا میزبان کی نشست کا تھا۔ مغربی انداز کے ڈرائنگ روم میں ایک دیوار کے ساتھ شاہانہ تخت جیسا صوفہ تھا تو بیٹھک میں نشست کا خصوصی انتظام ایک چھ فٹ چوڑے نو فٹ لمبے قالین کی صورت میں کیا گیا تھا جس پر بالکل الگ نظر آنے والے گولڈن تشنیل کے کور چڑھے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔

مغربی طرز کے ڈرائنگ روم میں قالین اور پردوں کا رنگ بھی وہی تھا جو مشرقی انداز کی بیٹھک میں لیکن اندازِ نشست کے فرق نے ماحول کو یکسر بدل دیا تھا۔

میں دوسرے سے تیسرے کمرے میں گیا اور پھر گھومتا پھرتا کچن میں جانکلا۔ وہاں ایک خانساماں ٹائپ شخص خاموشی سے کچھ پکانے میں مصروف تھا۔ میرے کھنکارنے پر وہ تیزی سے پلٹا اور پھر مجھے دیکھ کر اتنا بدحواس ہوا جیسے اس نے اپنے سامنے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

"سلام سائیں!" اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "آپ نے ادھر آنے کی تکلیف کیوں کی' مجھے حکم دیتے۔"

میں نے کہا "تم کون ہو؟"

وہ بولا "ہم سائیں حکم کے غلام ہیں۔ آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔"

میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"نام تو سائیں عبداللہ بلوچ ہے پر سب عبدل بولتے ہیں۔" وہ اسی طرح دست بستہ کھڑا رہا۔

میں نے کہا "عبدل۔ یہ گھر کس کا ہے۔"

"یہ سائیں ڈیرا ہے پیر سبحان شاہ کا۔ وہ جب لاہور آتے ہیں تو ادھری ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس وقت وہ کہاں ہیں؟"

"اس وقت تو سائیں کچھ پتا نہیں کہاں ہوں گے۔ بادشاہ لوگ ہیں' اپنی مرضی سے آتے جاتے ہیں' کبھی اسلام آباد تو کبھی کراچی۔ ابھی سائیں ناراض مت ہونا۔ آپ مہمان ہو۔ ہم کو اجازت نہیں ہے مہمان سے بات کرنے کی اور آپ کو بھی ادھر نہیں آنا چاہیے۔ کسی نے دیکھا تو ہماری شامت آئے گی۔ ابھی حکم کرو۔"

میں نے کہا "تمہارے علاوہ یہاں کون ہے؟"

"ہمارے علاوہ سائیں سارے خدمت گار ہیں۔ سب پرانے ملازم ہیں۔ پیر سائیں کے نمک خوار ہیں۔"

میں نے کہا "پیر صاحب کا یہ ڈیرا کہاں ہے؟"

میرے سوالات سے وہ سخت پریشان تھا۔ "ہم کو کچھ پتا نہیں سائیں۔ ہم بھی آج ہی آئے ہیں۔"

میں نے کہا "اتنی بڑی حویلی میں مجھے تمہارے سوا کوئی دوسرا نظر نہیں آرہا ہے۔"

وہ بولا "باہر چوکیدار ہے سائیں۔ ادھر ڈرائیور بھی ہوگا۔ آپ حکم کرو۔"

میں نے کہا "کیا یہاں ٹیلی فون ہے؟"

"ہر کمرے میں ٹیلی فون ہے سائیں۔"

میں نے کہا "اچھا' تم کافی بنا سکتے ہو؟"

"ابھی حاضر کرتا ہوں سائیں۔ آپ ادھر چلو۔"

میں نے کہا "عبدل۔ میں مہمان ہوں یا قیدی؟"

وہ میرے سوال سے نروس ہوگیا "جی سائیں!"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے۔ کیا میں اپنی مرضی سے ہر جگہ آجا سکتا ہوں۔ اگر میں ابھی ڈرائیور سے کہوں کہ مجھے کہیں لے چلے۔ تو کیا وہ گاڑی نکالے گا؟"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے "ہمیں کچھ پتا نہیں سائیں۔ آپ مہمان ہو' پیر سائیں کے اور ہمیں حکم ہے آپ کی خدمت کرنے کا۔ اس سے زیادہ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔"

میں کچن سے نکل کے باہر گیا تو مجھے حویلی کی وسعت اور شان و شوکت کا اندازہ ہوا۔ یہ محل نما عمارت جدید اور قدیم طرزِ تعمیر کا خوبصورت نمونہ تھی اور کم سے کم بھی تین کنال پر محیط تھی۔ اس کی بیرونی فصیل کی بلندی دس فٹ سے زیادہ تھی چنانچہ میں باہر کا منظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ اس فصیل کے چاروں طرف سرچ لائٹس اس طرح لگائی گئی تھیں کہ فصیل کے دونوں جانب روشنی ہے۔ تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر مجھے دائیں بائیں دو بلند وبالا فولادی گیٹ نظر آرہے تھے جن کے درمیان تقریباً دو سو فٹ کا فاصلہ تھا۔ ایک سرخ بجری بچھی سڑک انگریزی حرف یو کی شکل بناتی ایک گیٹ سے شروع ہوکے درمیانی لان اور باغ کے گرد گھومتی اور پورچ سے گزرتی دوسرے گیٹ تک جارہی تھی۔ سڑک کے ساتھ ساتھ آرائشی قسم کے درختوں کی قطار تھی اور درمیان میں سرسبز لان تھا جس کے وسط میں بہت خوبصورت فوارہ بنا ہوا تھا۔

چوکیدار مجھے کسی گیٹ پر نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ شاید کسی پرائیویٹ سیکیورٹی کمپنی کا گارڈ ہوگا جو جدید ترین اسلحہ لیے باہر کھڑا ہوگا۔ ڈرائیو وے سے کچھ فاصلے پر ایک شاہانہ قسم کی لینڈ کروزر بھی کھڑی تھی مگر اس میں کوئی ڈرائیور نہیں تھا۔ اندر باہر کی ساری لائٹس جل رہی تھیں مگر آواز کوئی نہیں تھی۔ یہ صورتِ حال میرے لیے بہت چکرا دینے والی تھی۔ ابھی تک کسی نے مجھے روکا نہیں تھا اور بظاہر میری حیثیت مہمان جیسی ہی تھی مگر میرا دل یہ بات نہیں مانتا تھا کیونکہ مجھے یہاں مہمانوں کی طرح نہیں لایا گیا تھا۔

میں پیر سبحان شاہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا لیکن اتنا اندازہ مجھے ہورہا تھا کہ وہ کوئی بہت دولت مند' اثر رسوخ کے اعتبار سے انتہائی طاقتور اور ذہنی طور پر چالاک اور سفاک شخص ہوگا۔ ممکن ہے وہ کوئی جدی پشتی

جاگیردار یا خاندانی پیر ہو۔ ملکی سیاست میں ایسے لوگوں کی افراط ہے جو کئی نسلوں سے حکومت کو اپنا موروثی حق سمجھتے آئے ہیں۔

مجھے ایسا لگتا تھا جیسے سبحان شاہ بھی کوئی ایسا ہی نمرود کی خدائی کا دعوے دار پیر ہوگا۔ اس نے کسی وجہ سے کوشش کی تھی کہ مجھے اے ایس پی دلاور شاہ کے ذریعے اپنے طاقتور ہونے کا احساس دلائے' ایسے لوگ اپنے علاقے میں پولیس افسر بھی اپنی پسند کے رکھتے ہیں اور پھر انھیں اپنی مرضی سے استعمال کرتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ اے ایس پی دلاور شاہ پیر سائیں کا کوئی فرمان مجھ تک پہنچاتا' اسے پریس کانفرنس سے نکال دیا گیا۔ وہ حکم کا غلام اس کے باوجود وہیں موجود رہا۔ وہ پیر سائیں کو اپنی کوشش میں ناکامی کی خبر دینے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسری چال چلی اور حکم کے دوسرے غلام صابر علی کو محافظ کے روپ میں میرا نگراں بنانے کی کوشش کی مگر یہ ترکیب الٹی اس کے گلے پڑ گئی۔

ابھی میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ آخر پیر سائیں مجھ سے ملاقات کے لیے اتنے بے چین کیوں ہیں لیکن یہ سمجھنا دشوار نہ تھا کہ مجھے اس پُرفریب طریقے سے زبردستی بلانے کا مقصد کیا ہوسکتا ہے۔ پیر سائیں کو اپنے ایک مرید خاص کے ساتھ میرا سلوک سخت ناگوار گزرا ہوگا اور انہوں نے فیصلہ کیا ہوگا کہ مجھے اس گستاخی پر کچھ سبق سکھایا جائے۔

بظاہر مجھے گھر کے اندر گھومنے پھرنے کی آزادی تھی اور میں اس کوٹھی میں کسی معزز مہمان سے کم حیثیت نہ رکھتا تھا لیکن میرے لیے آزادی کا مفہوم یقیناً محدود تھا۔ میں یہ فرض نہیں کرسکتا تھا کہ میں کہ چاہوں چلا جاؤں اور جس سے چاہوں رابطہ کروں۔

اس کا ثبوت مجھے فوراً ہی مل گیا۔ میں نے واپس اپنے کمرے میں آکے دیکھا تو مجھے ٹیلی فون نظر آگیا مگر اس میں کوئی آواز نہیں تھی۔ ٹیلی فون واقعی ہر کمرے میں تھا مگر بے جان تھا۔ غالباً کوٹھی کے اندر جتنے فون تھے' ان کا باہر کی دنیا سے رابطہ وقتی طور پر منقطع کردیا گیا تھا۔ ممکن ہے حویلی کا اپنا ایک دو لائن کا ایکس چینج ہو اور کسی بھی فون کو ڈس کنکٹ کرنا آپریٹر کے اختیار میں ہو۔

عبدل تھوڑی دیر بعد کافی لے کر آیا تو میں نے پھر اس سے بات کرنے کی کوشش کی "عبدل۔ تمہارے' اور ڈرائیور یا چوکیدار کے علاوہ یہاں کوئی ایسا ذمے دار ملازم ہے جو مجھے کچھ بتا سکے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ دیے "سائیں۔ ہم ادھر آپ سے کوئی بات نہیں کرسکتے۔ پیر سائیں کو پتا چل جائے تو ہماری زبان چھری سے کاٹ دیں۔"

میں نے کہا "لیکن اس وقت تو پیر سائیں یہاں موجود نہیں ہیں۔"

اس نے خوف زدہ نظروں سے باہر دیکھا۔ "لیکن دوسرے بندے ہیں جو ہماری شکایت کرسکتے ہیں۔ ہم بہت غریب لوگ ہیں سائیں!"

میں نے کہا "صرف اتنا بتاؤ کہ پیر سائیں کے بارے میں مجھے کوئی بتا سکتا ہے؟ اگر مجھے ان سے ملنا ہو یا ان سے فون پر بات کرنی ہو۔"

"ابھی ان کا وہ آجائے گا سائیں' کیا بولتے ہیں اس کو' ہاں سیکریٹری' وہ کسی کام سے گیا ہے۔" عبدل نے جاتے جاتے کہا۔

کافی بہت عمدہ تھی۔ دیہاتی خانساماں ایک ماڈرن کچن چلانے کا تجربہ رکھتا تھا۔ کافی پیتے ہوئے میں نے اپنی موجودہ حالت پر غور کیا۔ میں اچانک سب سے کٹ گیا تھا۔ رئیس جب اوپر والے کمرے میں چیرے بلیڈ کو میرا سامان پہنچا کے واپس آیا ہوگا تو مجھے غائب دیکھ کے شک میں مبتلا نہیں ہوا ہوگا۔ اس نے پہلے تو یہ سمجھا ہوگا کہ میں کسی کام سے باہر نکلا ہوں لیکن ایک گھنٹے بعد اسے تشویش لاحق ہوئی ہوگی کہ اسے بتائے بغیر ہی ہوٹل سے باہر کہاں جاسکتا ہوں۔ انتظار سے گھبرا کے اس نے ہوٹل کے اسسٹنٹ منیجر سے پوچھا ہوگا تو اس نے بتایا ہوگا کہ عالم اپنی پارٹی کے کارکنوں سے بات کرنے گئے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ مظاہرین کو سمجھا بجھا کے منتشر کردیں اور انہوں نے چند منٹ میں مظاہرہ ختم کرادیا تھا۔ کیا اس کے بعد وہ لوٹ کے کمرے میں نہیں آئے تھے؟ ممکن ہے وہ کسی کام سے چلے گئے ہوں۔ مظاہرین ہی ان کی پارٹی کے وفادار کارکن تھے۔ کیا پتا وہ شاہ عالم کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں۔ انھیں پارٹی لیڈر سے کوئی کام پڑ گیا ہو۔

مزید گھنٹے دو گھنٹے انتظار کے بعد رئیس کا شک یقین میں بدل گیا ہوگا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں سچ مچ پُراسرار طور پر غائب ہوگیا ہوں لیکن رئیس کا شک بھی مظاہرین کی طرف کیسے جاسکتا ہے۔ وہ سمجھے گا کہ مجھے اے ایس پی دلاور شاہ نے اٹھوالیا۔ صابر علی کو تو میں نے پھنسوادیا تھا مگر دلاور شاہ ایک سینئر پولیس افسر تھا اور کسی اے ایس آئی سے کہیں زیادہ اختیارات کا مالک تھا۔ وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔

سوچ سوچ کے میرا دماغ تھک گیا۔ کافی نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ میں ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح مستعد ہوگیا تھا۔ اب مجھے یہ قید گراں گزر رہی تھی لیکن میں بے بس تھا۔ اگر میں غریب خانساماں یا ڈرائیور کو ناک آؤٹ کردیتا تب بھی باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ کوٹھی کے اندر گھومنے پھرنے کی آزادی مجھے اسی لیے حاصل تھی کہ باہر کی فصیل بہت اونچی تھی۔ اس پر کانٹے والی تار کی باڑھ تھی اور یہ بات خاصے وثوق سے کہی جاسکتی تھی کہ اس باڑھ میں برقی رو ہوگی۔ فصیل کے باہر بھی پہرا اتنا سخت ہوگا کہ میرے باہر نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میرے دل میں ایک خواہش یہ بھی تھی کہ میں پیر سائیں سے ملوں اور اس سے پوچھوں کہ اس نے تعارف حاصل کرنے کا یہ پراسرار اور غیر شریفانہ طریقہ کیوں اختیار کیا تھا۔ اگر اس کا پیغام ملتا تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ میں اس سے ملنے سے انکار کرتا۔

کافی پینے کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے گھوم پھر کے کوٹھی کا مزید جائزہ لینا چاہیے۔ شاید صورت حال اتنی مایوس کن نہ ہو جتنی میں سمجھ رہا ہوں اور مجھے باہر نکلنے کا موقع مل جائے لیکن میں نے اٹھنا چاہا تو مجھ پر نقاہت غالب آنے لگی۔ یہ بڑی عجیب بات تھی۔ کافی پی کے مجھے زیادہ چست محسوس کرنا چاہیے مگر میرے پاؤں اتنے بے جان ہو رہے تھے کہ میرے جسم کا بوجھ اٹھانے سے قاصر لگتے تھے۔ میں نے سر جھٹک کے ناطاقتی کے اس وقتی احساس سے نجات حاصل کرنی چاہی لیکن میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تو میں سمجھ گیا کہ یہ سارا فساد اس کافی کا ہے۔ مجھے کافی میں کوئی بے ہوشی کی دوا دے دی گئی تھی اور یہ اس لیے ضروری ہوگیا تھا کہ میں اچانک اٹھ کے پیر سائیں کی کوٹھی کا جائزہ لینے نکل کھڑا ہوا تھا۔ شاید مجھے زیر دام لانے والوں کو یقین ہوگا کہ میں اتنی جلدی ہوش میں نہیں آسکتا۔

وجہ کچھ بھی ہو۔ اس دیہاتی اور بے وقوف نظر آنے والے خانساماں نے بڑی سادگی سے مجھے سائیں سائیں کہتے ہوئے خود کو محفوظ رکھا، مجھے کسی دشواری کے بغیر پھر ہوش سے بے گانہ کردیا۔ میں چکرا کے نیچے گرا اور اس کے ساتھ ہی گردوپیش کا منظر میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

جب میں پھر ہوش میں آیا تو مجھے منظر بالکل بدلا ہوا نظر آیا۔ ایک نظر میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں کسی تھانے کی حوالات میں ہوں جہاں میرے سوا کوئی قیدی نہیں تھا۔ میرے جسم پر وہی کپڑے تھے اور میں سیمنٹ کے سخت اور سرد فرش پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ پر سے گھڑی اتار لی گئی تھی چنانچہ اب میں وقت دن اور تاریخ کا صرف اندازہ کرسکتا تھا۔ عام طور پر بے ہوشی کی دوا کا اثر چھ سے آٹھ گھنٹے تک رہتا ہے۔ میں نے کافی رات ساڑھے دس بجے پی تھی۔ اس حساب سے یہ صبح پانچ چھ بجے کے درمیان کا وقت ہوسکتا تھا اور دن کے ساتھ تاریخ بدل گئی تھی۔

عام طور پر حوالات ہر تھانے کی عمارت کا ایک حصہ ہوتی ہے جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں لیکن یہ حوالات جیسا کمرا کسی الگ جگہ پر بنایا گیا تھا۔ یہ ایک خاصا بڑا ہال تھا جس کی لمبائی شاید چوبیس فٹ ہوگی اور چوڑائی بارہ چودہ فٹ۔ اس کے آٹھ فٹ حصے کو لوہے کی سلاخیں لگا کے الگ کردیا گیا تھا۔ چودہ فٹ لمبے حصے میں میرے پیچھے اور دائیں بائیں سپاٹ دیواریں تھیں۔

کمرے کا باقی حصہ بھی بالکل خالی تھا۔ اس میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن فرش میں لوہے کی ایک کرسی نصب تھی۔ اس کے عین مقابل کی دیوار پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے سرچ لائٹس لگائی گئی تھیں جو اس وقت روشن نہیں تھیں۔ تمام سرچ لائٹس کو کرسی پر فوکس کیا گیا تھا۔ ایک دیوار میں لوہے کے مضبوط ہک فرش سے دس فٹ کی بلندی پر لگائے گئے تھے اور ان سے فولادی زنجیریں منسلک تھیں۔ چھت سے لوہے کے حلقے آویزاں تھے اور ایک گوشے میں کچھ رسیاں اور چمڑے کی بیلٹیں پڑی تھیں۔

یہ سب ایذا رسانی اور جسمانی تشدد کا سامان تھا۔ کسی مبینہ ملزم سے کسی بھی جرم کا اقرار کرانے کے لیے اسے لوہے کی کرسی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہوگا۔ کلائی میں زنجیریں ڈال کے اسے دیوار پر کپڑے کی طرح ٹانگ دیا جاتا ہوگا۔ اس طرح کہ اس کے پیر زمین کو نہ چھوئیں یا چھت سے آویزاں حلقوں میں اس کے پاؤں ڈال کے اسے الٹا لٹکا دیا جاتا ہوگا۔ میری نظروں کے سامنے پولیس کا عقوبت خانہ تھا جہاں لائے جانے والوں پر ایسے انسانیت سوز تشدد کے حربے آزمائے جاتے تھے جن کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

جو بات مجھے عجیب لگی وہ یہ تھی کہ حوالات میں دوسری انسانی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں جو کسی بھی پولیس اسٹیشن کے ماحول کا حصہ ہوتی ہیں۔ گالی گلوچ، چیخ پکار، آہ وزاری، ٹیلی فون کی گھنٹی۔ گاڑیوں کے آنے جانے کی آوازیں اور زندہ انسانوں کے وجود کا ثبوت فراہم کرنے والی آوازیں۔ اس حوالات کا ماحول بھی نسبتاً صاف ستھرا تھا۔ میں نے شہر کے اکثر تھانوں کی حوالات میں وہی بدبو اور تعفن محسوس کیا تھا جو کسی پبلک ٹوائلٹ کی سڑاند جیسا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حوالاتی جب تفتیش کے لیے نکالے جاتے تھے تو خوف سے ان کا پیشاب وہیں خطا ہوجاتا تھا۔ تفتیش کے بعد لاکر وہاں ڈال دیے جانے والے بھی بعض اوقات اپنے ہی خون یا پیشاب پاخانے کی گندگی سے لتھڑے ہوئے ہوتے تھے۔ میں نے کسی حوالات کو کبھی بالکل خالی بھی نہیں دیکھا تھا۔ عموماً اتنے ہی بڑے کمروں میں آٹھ دس افراد پڑے نظر آتے تھے۔ بعض اوقات ان کی تعداد پندرہ بیس تک بھی ہوجاتی تھی۔ لیکن اس صاف ستھری حوالات میں میرے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ یہ بات میری سمجھ میں آنے لگی کہ میں کسی تھانے کی حوالات میں نہیں ہوں بلکہ کسی کی نجی جیل میں ہوں۔ یہ جگہ غالباً پیر سائیں کے اس قصر عالی شان کے تہ خانے میں تھی اور دوسری بار بے ہوش کرنے کے بعد مجھے زیادہ سخت حفاظتی انتظام کے لیے ایک پُرتکلف خواب گاہ سے اس زمین دوز قید خانے میں منتقل کردیا گیا تھا۔

اس انتظام کی ضرورت کو میرا ذہن سمجھنے سے قاصر رہا۔ میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس کی یہ سزا تھی۔ میں ہوش میں آنے کے بعد اٹھ کے صرف کچن تک گیا تھا اور خانساماں سے چند باتیں کی تھیں جو بالکل بے ضرر تھیں۔ میں نے فرار ہونے کی کوشش تو درکنار، فرار کے کسی راستے کا عملی جائزہ تک نہیں لیا تھا۔

حوالات کے اندر وقت بھی قید میں محسوس ہوتا تھا۔ باہر یقیناً وقت اپنی ازلی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا مگر ان سلاخوں کے پیچھے میرا وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ ہوش کے لمحے شمار کرتے کرتے میں بالآخر اس قابل ہوگیا تھا کہ بیٹھ سکوں، پھر کھڑا ہوسکوں اور پھر اپنی مزید محدود ہوجانے والی آزادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زنداں کی دیواروں کے حصار میں چل پھر سکوں۔

ان سلاخوں کے پیچھے میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ سوائے سوچنے کے۔ چنانچہ میں جنگل سے پکڑے جانے والے جانور کی طرح سے پنجرے میں چکر لگاتا رہا اور اپنے آپ سے وہ سوالات کرتا رہا جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ آخر یہ سب کچھ میرے ساتھ کیوں ہورہا ہے؟" اور کب تک ہوتا رہے گا؟ پیر سائیں مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ کسی وجہ کے بغیر وہ میرا دشمن کیوں ہوگیا ہے۔ انصاف ہے کہ حکم عقوبت سے پیشتر۔ اک بار سوئے دامن یوسف تو دیکھے۔ اگر کسی نے غلط فہمی کی بنا پر مجھے اٹھوا لیا ہے تو کیا اس کا یہ اخلاقی فرض نہیں بنتا کہ مجھے بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دے، میری بھی سنے۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ پیر سائیں جیسے لوگ اپنی ذات کو ہر قسم کی اخلاقی یا قانونی ذمے داریوں اور پابندیوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ معلوم نہیں اس وقت پیر سائیں کی مصروفیت کون ہوگی۔ وہ رات کے آخری پہر میں کہاں اور کس کی خواب ناز میں محو استراحت ہوگا۔ جب اس کی صبح ہوگی اور اس کے معمولات میں جہاں میرے لیے گنجائش ہوگی اس سے پہلے وہ میرے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔

بے بسی کے ایک طویل، عذاب ناک انتظار کے بعد جب میں دیکھتے اور سوچتے سوچتے بھی تھک گیا تھا ہال کے آخری حصے کا ایک دروازہ کھلا اور ایک ساتھ تین افراد اندر آگئے۔ ان میں سے ایک نے اپنے ہاتھ میں ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ باقی دو کے ہاتھوں میں جدید ترین خود کار کلاشنکوف تھیں، ان میں سے ایک نے دروازے کو اندر سے مقفل کیا اور وہیں رک گیا۔ دوسرا اس ملازم کے ساتھ آگے آیا جس نے ناشتے کی ٹرے اٹھا رکھی تھی۔ اس کی لمبی لمبی مونچھیں اس کے مختصر قد سے ذرا بھی میچ نہیں کرتی تھیں مگر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سفاک چمک تھی۔ ٹرے اٹھا کے لانے والا وہی خانساماں تھا جس سے میری گزشتہ شب کچن میں ملاقات ہوئی تھی۔

مونچھوں والے محافظ نے چند فٹ کے فاصلے پر رک کے کہا "ادھر سے پیچھے ہٹ جاؤ بابا!"

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کردی اور مسکرا کے کہا "کیا حال ہے تمہارا عبدل؟"

عبدل کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ایک آنکھ پر نیل بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور حوالات کے گیٹ کا تالا کھولنے لگا۔

مونچھوں والے کو میرے انداز بے نیازی نے مشتعل کیا "دیکھو بابا۔ ہم کو آرڈر ہے کہ گڑبڑ ہو تو تم کو گولی ماردیوے۔ آگے مت آنا۔"

عبدل نے ٹرے اندر کھسکا کے دروازے کو پھر مقفل کردیا "ابھی ناشتا کرلو سائیں۔ ہم برتن واپس لے جائیں۔"

میں نے کہا "کل کافی خوب پلائی تم نے۔ کیا اس چائے میں بھی بے ہوشی کی دوا ڈالی ہے؟"

محافظ نے غرا کے کہا "ابھی فالتو بات نہیں کرونی۔"

میں نے ٹرے کو اپنی طرف کھسکا لیا "تم مجھے کتے کے چھوٹے سے پلے کی طرح لگتے ہو جو چڑیا گھر کے پنجرے میں بند

شیر پر بھونک رہا ہو۔"

فرطِ اشتعال سے اس کی مونچھیں لرزنے لگیں مگر وہ خون کے گھونٹ پی کے خاموش رہنے کے سوا کیا کر سکتا تھا۔

میں نے ناشتے پر غور کیا۔ اس میں دو پراٹھے تھے، تھوڑی سی آلو کی بھجیا اور ایک کیتلی میں ریڈی میڈ مکس چائے۔ میں نے گزشتہ رات بھی کچھ نہیں کھایا تھا چنانچہ اب سامنے کھانا دیکھ کے میری بھوک چمک اٹھی تھی۔ میں نے ناشتا لانے والے تین معمولی حیثیت کے ملازموں سے فضول بات کرنا لاحاصل سمجھا۔ عبدل کو گزشتہ رات مجھ سے غیر ضروری باتیں کرنے کی اچھی خاصی سزا ملی تھی۔ اب میں لاکھ کوشش کرتا وہ میرے کسی سوال کا جواب نہ دیتے۔ چائے پینے میں پھر رسک تھا لیکن میری عقل یہ کہتی تھی کہ اب مجھے مزید بے ہوش رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اور شاید یہ ناشتا اس لیے لایا گیا تھا کہ جب مجھے پیر سائیں کے سامنے پیش کیا جائے تو میری حالت ٹھیک ہو۔ لیکن اس کے برعکس صورت حال بھی مجھے منظور تھی۔ اس پنجرے میں جاگ کے وقت کا ایک ایک لمحہ شمار کرنے سے تو یہی بہتر ہوگا کہ میں سو جاؤں۔

میں نے ناشتا ختم کیا تو عبدل نے ٹرے اٹھائی اور سلاخوں والے دروازے کو پھر مقفل کر دیا۔ محافظوں نے اس کے لیے باہر جانے والا دروازہ کھول دیا مگر خود اپنی جگہ پر موجود رہے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ یہ حوالات زیرِ زمین تھی۔ جب عبدل باہر گیا تو مجھے ایک لمحے کے لیے اس زینے کی ایک جھلک دکھائی دی جو اوپر جا رہا تھا۔

ناشتے نے میرے جسم میں توانائی بھر دی تھی۔ اندر ٹہلتے ہوئے میں بے چینی سے اس عذاب کے ختم ہونے کا انتظار کرتا رہا اور چائے میں ملائی جانے والی بے ہوشی کی دوا کے اثرات کے ظاہر ہونے کا انتظار کرتا رہا۔ وقت ایک زنجیر گرانبار ہو گیا تھا جو کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ بقول شاعر جو ہم پہ گزرنی ہے اک بار گزر جائے۔

بالآخر میری دعائیں قبول ہوئیں۔ دروازے پر دستک ہوئی اور باہر سے کسی نے کچھ کہا۔ ایک محافظ نے فوراً چابی لگا کے قفل کھول دیا اور پھر اندر آنے والے کو سلیوٹ کیا۔

اندر آنے والا اے ایس پی دلاور شاہ تھا۔ اسے وہاں دیکھ کے مجھے زیادہ حیرانی نہیں ہوئی۔ ایک سوال جس کا اب تک کوئی جواب نہیں ملا تھا، یہ تھا کہ دلاور شاہ کس کے حکم کا غلام تھا؟

دلاور شاہ باوقار قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا اور بڑے اسٹائل سے سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتا آگے آیا۔ وہ حوالات کی سلاخوں سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔

"تم حیران نہیں ہوئے مجھے دیکھ کے شاہ عالم؟" اس نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں۔ بس مجھے اپنے ایک سوال کا جواب مل گیا ہے کہ وردی تو تمہارے جسم پر حکومت پاکستان کی دی ہوئی ہے لیکن تمہاری گردن میں پٹہ کسی اور نے ڈال رکھا ہے۔ آج معلوم ہو گیا کہ تم کس کے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے ہو۔"

اس کا چہرہ مسخ ہونے لگا "کتے کی طرح تو تم بھونک رہے ہو۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔"

میں نے کہا "یہی رسی ایک دن تمہاری گردن میں پھانسی کا پھندا بنے گی دلاور شاہ۔ اس وقت اپنا بل کھاتا دیکھنا۔"

اس نے آدھی سگریٹ کو پاؤں سے مسل دیا "تم کو ان اخبار والوں نے خبریں چھاپ چھاپ کے اہم بنا رکھا ہے ورنہ تم خود بھی اچھی طرح جانتے ہو شاہ عالم کہ تمہیں اب کوئی پوچھتا نہیں۔ تمہاری سیاسی حیثیت کا گراف زیرو کی طرف جا چکا ہے۔"

میں نے کہا "فضول باتوں میں وقت گنوانے کے بجائے تم مجھے میرا جرم بتاؤ۔"

اس نے ایک اور سگریٹ نکالی اور اسے پرسکون انداز میں لائٹر سے جلانے لگا۔ ایک کش کا دھواں خارج کر کے اس نے کہا "تمہارے خلاف الزامات کی ایک طویل فہرست ہے۔"

میں نے کہا "تم قانونی الزامات کی بات کس منہ سے کرتے ہو؟"

وہ بولا "میں قانون کا نمائندہ ہوں۔ پولیس سروس آف پاکستان کا ایک اعلیٰ افسر ہوں۔ اور میں نے تمہارے خلاف قائم کیے جانے والے تمام قانونی مقدمات کی فائلیں دیکھی ہیں سائیں۔"

"پھر مجھے قانون کے تحت گرفتار کیوں نہیں کیا۔ تم قانونی طریقے سے میرے خلاف گرفتاری کا وارنٹ بھی لا سکتے تھے۔"

اس نے سر ہلایا "میں نے کوشش کی تھی کہ تمہیں قانونی گرفتاری سے محفوظ رکھوں۔ تمہیں یقیناً علم ہوگا کہ تمہارے خلاف پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھول دی گئی ہیں اور اس وقت اگر تم یہاں نہ ہوتے تو کسی تھانے کی حوالات میں عام قیدیوں کے ساتھ پڑے ہوتے۔"

میں نے کہا "حوالات تو یہ بھی ہے۔"

"سائیں! یہ پیر سبحان شاہ کا وہ مہمان خانہ ہے جہاں خطرناک مجرم رکھے جاتے ہیں۔ تمہیں پہلے غلطی سے معزز مہمان کا درجہ دے دیا گیا تھا لیکن پھر پتا چلا کہ تم جوڈو کراٹے کے ماہر بن چکے ہو۔ خالی ہاتھوں سے بھی ہتھیار کا کام لینا جانتے ہو۔ اے ایس آئی صابر علی کا بیان سننے کے بعد تمہیں یہاں منتقل کر دیا گیا۔ تم نے اس پر ایک جھوٹا مقدمہ کیوں بنایا۔ تمہیں معلوم نہیں شاید کہ وہ پیر سائیں کا خاص آدمی ہے۔"

میں نے کہا "اس نے مجھے کچھ بھی بتانے سے انکار کر دیا تھا۔"

"وہ تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وقت تمہارے لیے بہت بدل گیا ہے شاہ عالم۔ تم اب وہ سیاسی لیڈر نہیں ہو جس کے پیچھے چلنے والے ہزاروں تھے۔ تمہاری ایک اسلحہ بردار غنڈا فورس تھی جو تمہارے نام پر کسی کی بھی جان لینے کے لیے تیار رہتی تھی۔ فاتح عالم فورس۔ اس وقت لوگ تم سے ڈرتے تھے۔ تمہارے دشمن بہت تھے مگر تم محفوظ رہے۔ تمہارے وہ دشمن آج تم سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اور ان کے لیے پرانے بدلے چکانے کا وقت آ گیا ہے۔"

ساری بات اچانک میری سمجھ میں آ گئی "پیر سائیں کو بھی اسی دن کا انتظار تھا۔"

"ظاہر ہے۔ تم اگر ذرا بھی حقیقت پسند ہوتے تو تمہیں حالات کا صحیح اندازہ ہوتا تو شاید تم لوٹ کے پاکستان آنے کا رسک نہ لیتے۔ اب تم کیا کرو گے شاہ عالم!"

میں نے سوچ کے کہا "تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"سائیں" اس نے نفی میں سر ہلایا "تمہارے اختیار میں اب کیا ہے؟"

میں نے کہا "قانونی مقدمات سے میں نہیں ڈرتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ جھوٹے تھے اور عدالت میں جھوٹ سامنے آ جائے گا۔"

"نہیں شاہ عالم! عدالت پر اور انصاف کے عمل پر اتنا بھروسا مت کرو۔ کس بے گناہ کو مجرم ثابت کرنا ہے اور کس مجرم کو بے گناہ۔ یہ ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اصل معاملات کچھ اور ہیں، تم جانتے ہو۔"

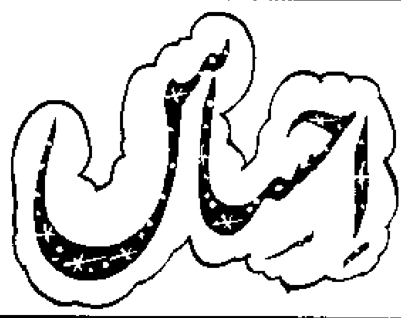
مشکل یہ تھی کہ میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا مگر اس کا اعتراف نہیں کر سکتا تھا۔ شاہ عالم کے معاملات کا شاہ عالم کو علم نہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر میں اے ایس پی دلاور شاہ سے کہتا کہ مجھے پیر سائیں سے شاہ عالم کے اختلافات کی وجہ بتاؤ تو وہ سمجھتا شاید میں مذاق کر رہا ہوں۔

میں نے احتیاط کے ساتھ الفاظ کا انتخاب کیا۔ "اے ایس پی دلاور شاہ! سیاست میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ کل کے دوست آج کے دشمن اور کل کے دشمن آج کے دوست بن جائیں تو یہ کوئی انوکھی اور انہونی بات نہیں۔ سیاست میں یہ مداری کا کھیل چلتا ہے۔"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "پیر سائیں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا کہ تم ان کے مقابلے پر اپنا بندہ کھڑا مت کرو لیکن تم نہیں مانے تھے۔ حاصل کیا ہوا تمہیں۔ تمہارا امیدوار تو ایک عام آدمی تھا۔ وہ پیر سائیں کے مقابلے میں جیت ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ جیت جاتا تو پیر سائیں کے مرید اسے قتل کر دیتے لیکن اس نے انتخابی جلسوں میں پیر سائیں کے خلاف جو کچھ کہا۔ اس کے ذمے دار تم تھے۔ خود تم نے بہت بکواس کی تھی۔ تمہارے اس امیدوار سے تو ہم نے نمٹ لیا۔ ابھی تم باقی تھے۔"

"دیکھو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ میری غلطی تھی۔ اور پیر سائیں کے سامنے اس کا اعتراف بھی کر سکتا ہوں۔ میں اپنی غلطی پر کسی سے بھی معافی مانگنے کو اپنی بے عزتی تصور نہیں کرتا۔ خواہ میرے سامنے کوئی مجھ سے بڑا ہو یا چھوٹا۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا "چلو، فرض کرو۔ تم پیر سائیں سے سیاسی معاملات طے کر لیتے ہو، تم اب سیاست کے کھیل سے ہی باہر ہو گئے ہو تو یہی کر سکتے ہو کہ بے شرم بن کے سب سے معافی مانگ لو۔ جب آدمی غیرت کو بیچنے پر مل جائے تو اس کے لیے بے عزتی کی کوئی بات نہیں رہتی لیکن تم اپنے کاروبار کا



کیا کرو گے؟ کتنا نقصان کیا ہے تم نے پیر سائیں کا۔"

میں نے کہا "میرا کاروبار۔ کون سا کاروبار؟"

"وہی جو تم پیر سائیں کے دشمنوں کے ساتھ مل کے چلاتے ہو۔"

میں نے اندازے سے اندھیرے میں تیر چلایا "تمہارا مطلب ہے نوادرات کا بزنس؟"

وہ تلخی سے بولا "نہیں۔ ریڑھی پر کباب بیچنے کا بزنس!"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا تیر نشانے پر لگا ہے۔ ہر بزنس میں کاروباری رقابت کی انتہا دشمنی پر ہو سکتی ہے لیکن رب نواز نے آج تک کبھی پیر سبحان شاہ کا نام میرے سامنے نہیں لیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک انکشاف تھا کہ آثار قدیمہ اور نوادرات کے بزنس میں ملک رب نواز اور پیر سائیں ایک دوسرے کے حریف ہی نہیں جانی دشمن بھی ہیں۔

میں نے کہا "وہ بزنس تو میں نے ختم کر دیا ہے۔"

وہ مجھے نفرت آمیز نظروں سے دیکھتا رہا "ابھی۔ اسی وقت ختم کر دیا ہے؟ نہیں سائیں شاہ عالم! ایسے تم کسی کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

میں نے برہمی سے کہا "تم کیا سمجھتے ہو میں ڈر کے جھوٹ بول رہا ہوں؟"

اس نے گرج کے کہا "ہاں۔ جھوٹ بول رہے ہو تم۔ بکواس کر رہے ہو چور کے بچے!"

"یہ تم نہیں بول رہے ہو دلاور شاہ۔ تمہاری وردی بول رہی ہے اور پیر سائیں کی حمایت بول رہی ہے ورنہ تمہاری مجال نہیں تھی کہ مجھ سے اس لہجے میں بات کر سکتے" میں نے بھی دھاڑ کے کہا۔

"دیکھو شاہ عالم۔ میری نظر میں تمہاری اوقات ایک معمولی چور کے برابر بھی نہیں ہے۔ جو مسجد سے جوتیاں چراتا ہے یا مالک کی تجوری سے روپے۔ میرے سامنے تمہارا ڈراما نہیں چلے گا۔ میں نے پیر سائیں سے وعدہ کیا ہے کہ ان کا مال تم سے برآمد کر کے چھوڑوں گا۔ چوری کا مال برآمد کرنے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس کا ابھی تمہیں کچھ اندازہ نہیں۔" وہ خالص پولیس والوں کے انداز میں دھمکی دینے لگا "آج تم میرے قابو میں آئے ہو تو تم بولو گے۔ میں تمہاری کھال میں بھس بھر کے پیر سائیں کے سامنے رکھ دوں تو تمہارا وہ چور چلا بھی بولے گا۔"

میں سخت الجھن میں پڑ گیا تھا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ مجھے بار بار چور کیوں کہہ رہا ہے اور چوری کا کون سا مال برآمد کرنا چاہتا ہے۔ یہ شاہ عالم کی زندگی کا کوئی ایسا راز تھا جو میرے علم میں نہیں تھا۔ میں اس سے لاعلمی کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا اور حقیقت جانے بغیر کوئی بات کرنے کا رسک بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آنے لگا تھا کہ مجھے اس عقوبت خانے میں کیوں لایا گیا تھا۔ اے ایس پی مجھ سے وہ مال برآمد کرنا چاہتا تھا جو میں نے چوری نہیں کیا تھا۔ اور جس مال کے بارے میں مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ شاہ عالم نے چوری کیا تھا یا رب نواز نے۔ اس کے بارے میں میں کچھ بتاتا بھی تو کیسے؟

بالآخر میں نے کہا "دلاور شاہ۔ میں پیر سائیں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"تم پیر سائیں سے مل سکتے ہو۔ لیکن۔۔۔؟"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن کیا؟ مجھے جو بتانا ہے میں پیر سائیں کو بتاؤں گا۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا "نہیں سائیں۔ پہلے تم مجھے بتاؤ گے۔"

اچانک میں نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے چیخ کے کہا "دفع ہو جاؤ یہاں سے فضول بھونکنے والے کتے۔ تم کیا سمجھتے ہو میں تمہاری دھمکیوں سے ڈر جاؤں گا؟ پنجرے میں بند کر کے تم نے شیر کو گیدڑ سمجھ لیا ہے۔ میں تمہیں کھا جاؤں گا دلاور شاہ۔" میں نے اسے اور اس کی پولیس افسری کو ایک سے بڑھ کر ایک گندی گالی دی جو اس کے محافظوں نے بھی سنی۔

میرا یہ حربہ موثر رہا۔ اے ایس پی دلاور شاہ نے اپنے رویے سے کسی خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا لیکن اس کے جارحانہ تیور بدل گئے۔ اس نے اپنے انداز بے نیازی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس نے میری دی ہوئی گالیوں کو سنا ہی نہیں اور سنا تو فضول بکواس سمجھ کے اہمیت نہیں دی۔

"آج پہلا دن ہے شاہ عالم! اگلے دو دن میں تمہاری زبان بدل جائے گی۔ لیکن تم چاہو تو خود کو بڑے عذاب سے بچا سکتے ہو۔ تم مجھے صرف یہ بتا دو کہ لندن میں چوری ہونے والا چھ لاکھ کا مال اب کہاں ہے؟"

عین ممکن تھا کہ یہ جملہ سن کے میں اچھل پڑتا لیکن میں نے اپنے ردعمل کا اظہار نہیں ہونے دیا "چھ لاکھ کا مال؟"

"ہاں۔ وہ سب نوادرات اب کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "پاگل کے بچے۔ ابھی تک لندن کی پولیس یہ بات معلوم نہیں کر سکی۔"

"لیکن میں کر لوں گا" وہ چلا کے بولا۔

میں نے جواب میں چلا کے کہا "اور میں کہہ چکا ہوں کہ جو بتاؤں گا پیر سائیں کو بتاؤں گا۔"

پہلی بار اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آئے "مجھے پتا تھا کہ چور کا مال چوری نہیں ہو سکتا۔"

اب آہستہ آہستہ میرا ذہن اس الجھن کو سلجھانے لگا تھا۔ میں نے کہا "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ مال میں نے چوری نہیں کیا تھا۔ میں تو دو سال سے لندن میں تھا۔"

"مال تم نے چوری کیا یا رب نواز نے۔ بات ایک ہی ہے۔ وہ مال پیر سائیں کا تھا اور انہیں واپس ملنا چاہیے۔"

میں نے اب خود کو زیادہ پُراعتماد محسوس کیا۔ قیاس آرائی کی بنا پر میں نے جو نتائج اخذ کیے تھے وہ درست ثابت ہو رہے تھے۔ میں نے کہا "دلاور شاہ۔ تم پر یقیناً پیر سائیں کو بہت اعتماد ہے اور خود کو پیر سائیں کی نظر میں معتبر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تم اس کے ساتھ کتے سے زیادہ وفادار بن کے رہو اور تمہاری کارکردگی میں ریس کے گھوڑے جیسی رہے۔"

وہ غرایا "تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ میں رشتے میں پیر سائیں کا سالا بھی ہوں اور بزنس میں اس کی ایک پارٹنر میری بہن ہے۔"

میں سنبھل گیا "یہ کہنے کی بات نہیں مگر تم پیر سائیں کے سالے نہ ہوتے تو شاید پولیس کے ایک کانسٹیبل ہی ہو سکتے تھے۔ تم کو کوئی اے ایس آئی بھرتی نہ کرتا۔"

"شاہ عالم! مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں جو تھانے میں ایک عام چور کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم یہ دیکھ رہے ہو؟" اس نے ایذا رسانی کے اسباب کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا "دو باتیں ذہن میں رکھو دلاور شاہ۔ ایک یہ کہ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ سیاست میں میری اہمیت کم ہوئی ہے، ختم نہیں ہوئی ہے۔ اب بھی میرے ایسے وفادار اور جاں نثار ہیں جو میرے لیے جان دے بھی سکتے ہیں اور تمہاری جان لے بھی سکتے ہیں۔"

وہ تلخی سے ہنسا "حشر سے پہلے انہیں پتا ہی نہیں چلے گا کہ ان کا لیڈر کہاں گیا؟"

میں نے کہا "دوسری بات، تم نے ایسے مجرم بھی دیکھے ضرور ہوں گے جو تشدد سے مر جاتے ہیں لیکن اپنی زبان نہیں کھولتے۔ میرے نہ بیوی بچے، نہ ماں باپ جو مجھے روئیں۔ لیکن تمہیں رونے والے بہت ہیں۔ بہت سے صحافی تمہیں پریس کانفرنس میں دیکھ چکے ہیں، تم میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔"

وہ ہنسا "لیکن تمہیں تو اپنی ہی پارٹی کے لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔"

میں نے کہا "کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ ہم کام کی بات کریں۔ میرے اور پیر سائیں کے درمیان تعلقات میں بہتری آ سکتی ہے۔ اس کے لیے ان کے اور میرے درمیان براہ راست ملاقات ضروری ہے۔"

وہ پھر اپنی بات پر اڑ گیا "جب تک مال برآمد نہ ہو کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی۔"

میں نے کہا "تم پیر سائیں تک میرا ایک پیغام پہنچا دو۔ میں رب نواز کے ساتھ اپنا بزنس ختم کر چکا ہوں۔ وہ مال اب بھی برآمد ہو سکتا ہے مگر رب نواز سے۔ اور اس کام میں پیر سائیں کی مدد میں کر سکتا ہوں لیکن ایسے نہیں، مجھے قید میں اذیت دے کر یا میری جان لے کر انہیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہم برابری کی سطح پر ایک دوسرے کے لیے فائدہ مند بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ مستقبل میں ان کا اور میرا کاروباری اشتراک بھی ممکن ہے۔"

دلاور شاہ کچھ دیر سوچتا رہا جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چند منٹ خاموشی میں گزر گئے لیکن اس کی صورت کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میرے ترکش کا یہ آخری تیر بھی نشانے پر لگا ہے۔

بالآخر اس نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کے جوتے کی ایڑھی سے بجھایا "پیر سائیں کل رات ہی کراچی سے آئے ہیں۔ میں موقع ملتے ہی ان سے بات کروں گا۔" اس نے کہا اور جھنجلاہٹ کے انداز میں پیر پٹختا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں محافظ بھی غائب ہو گئے جو اپنی مستعدی کا مظاہرہ کرنے کے لیے یوں کلاشنکوف کا رخ میری طرف کیے کھڑے تھے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ میں آہنی سلاخیں توڑ کے دلاور شاہ پر حملہ نہ کر دوں۔

ایک بار پھر میں قید خانے کی تنہائی میں اپنی سوچوں کے ساتھ رہ گیا لیکن اب میں پہلے کی طرح ناامید نہیں تھا۔ میں نے اپنی ہر چال بڑی ہوش مندی سے چلی تھی اور کسی حد تک صورت حال کو اپنے حق میں کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ پیر سائیں سے ملاقات میری نجات کا واحد ذریعہ تھی اور میں نے دلاور شاہ کو قائل کر لیا تھا کہ یہ ملاقات باہمی مفاد میں بے حد ضروری ہے۔

پیر سائیں سے ابتدائی غائبانہ تعارف کے بعد میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہو گا۔ اس نے گزشتہ عام انتخابات میں شاہ عالم کی پارٹی کے کسی امیدوار کو شکست

دے کر کامیابی حاصل کی تھی۔ طے شدہ طور پر وہ اپنے علاقے میں ایک بے تاج بادشاہ کی حیثیت کا مالک ہوگا۔ اس کے سیاسی اثر رسوخ کا دائرہ ان تمام پیروں ڈیروں تک پھیلا ہوا ہوگا جو ایک ہی جیسے سامراجی اور استحصالی ہتھکنڈوں سے اپنے اپنے علاقے کے بے زبان اور مظلوم و مجبور عوام پر حکومت کرتے ہوں گے۔

پیر سائیں کے روحانی مریدوں کی تعداد بھی لاکھوں میں ہوگی جو اپنی صدیوں پرانی جہالت اور توہم پرستی کی روایات کے باعث پیر سائیں کو دیوتا کی طرح پوجتے ہوں گے اور اس کے حکم پر جان دینے کو اپنی خوش نصیبی اور دنیا و عقبیٰ میں سرخروئی کا وسیلہ سمجھتے ہوں گے۔

یہ انسانی نفسیات کا بڑا عجیب معاملہ ہے کہ ایک فرقہ کسی شخص کو اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرے تو اس کے جذبات میں اندھی عقیدت اور عقل کے جواز سے بے نیاز بندگی کا انداز کیسے پیدا ہوجاتا ہے۔ ان کی آنکھیں دیکھتی ہیں کہ ان کا روحانی پیشوا تمام علائق دنیاوی میں ملوث ہے۔ وہ عالی شان محلات میں رہتا ہے۔ بہترین کاروں میں گھومتا ہے۔ حرم آباد رکھتا ہے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام کرتا ہے اور بیرون ملک عیاشی کرنے جاتا ہے۔ اس کے باوجود لوگ اس کی روحانی قوتوں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور یہ سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے کہ مادہ پرستی اور روحانی بلندی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

شاید یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ جسے وہ پوجتا ہے اسے عرش پر اور خود کو فرش پر دیکھنا چاہتا ہے۔ پیر سائیں کو بھی بادشاہ کی طرح عام لوگوں سے بہت اوپر ہونا چاہیے۔ عرش کی یہ بلندیاں فرش کی پستیوں سے ہیں۔

روحانی قوت کے ساتھ پیر سائیں کے پاس دولت مندی کی طاقت بھی تھی۔ اس کے سادہ لوح مرید تو اس کے رتبہ بلند کو بھی عطیہ خداوندی' ایک روحانی کرشمہ اور معجزہ قرار دیتے ہوں گے۔ وہ کیسے جان سکتے ہیں کہ تیرے پیر سائیں اسمگلر بھی ہیں' جعلساز بھی اور ڈاکو بھی۔ وہ ملک کے آثار قدیمہ اور نوادرات چرا کے باہر بھیج رہے ہیں اور ان کی نقل دنیا کے بازار میں بیچ کے لاکھوں ڈالر کما رہے ہیں۔

پیر سائیں اپنی قہاری و جباری کی صفات کا مظاہرہ کرنے کے لیے اپنی مرید رعایا کو ڈاکوؤں کی مدد سے دہشت زدہ بھی رکھتا ہوگا اور ان کو درس عبرت بنانے کے لیے لرزہ خیز سزائیں بھی دیتا ہوگا تاکہ اس بات میں کسی کو شبہ نہ رہے کہ وہی ان کے جان و مال اور آبرو کا مالک ہے اور ان پر مالکانہ اختیار بھی رکھتا ہے۔

ان حالات میں یہ بات بہت واضح تھی کہ میں دھونس یا دھمکی سے پیر سائیں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں ڈپلومیسی سے کام لوں' جس کا دوسرا نام منافقت ہوتا ہے مگر لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ ایک منافق کو دوسرا منافق ہی قابو میں کرسکتا ہے۔ اپنی سیاسی طاقت کے بارے میں بھی مجھے کوئی خوش فہمی نہیں رہی تھی۔ میں اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے مدد کی کوئی توقع نہیں رکھ سکتا تھا۔ انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں اور مجھے کس نے اغوا کیا ہے اور کسی غیبی طاقت پر بھروسا کرنا خود فریبی کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

اب میں قدرے مطمئن اور فارغ تھا تو میں نے شاہ عالم کی داستان حیات کے اس باب پر غور کیا جو اب تک میری نظر سے اوجھل تھا۔ میں نے اس کے کاروباری حریفوں کا حوالہ تو سنا تھا مگر اس میں پیر سائیں کا نام کبھی نہیں آیا تھا۔ شاہ عالم کے ساتھ پیر سائیں کی کاروباری رقابت اب ملک رب نواز کے ساتھ ایک باقاعدہ دشمنی کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ اس کی ایک وجہ بہت زیادہ پرانی نہیں تھی۔ حال ہی میں ملک رب نواز نے پیر سائیں کے بیرون ملک جانے والے مال کی پوری کھیپ چوری کرلی تھی اور لندن پہنچادی تھی۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ جیسے لندن میں ملک رب نواز کا ایجنٹ بھی تھا ایسے ہی پیر سائیں کے کارندے بھی ہوں گے۔ مارکیٹ میں چوری کا مال آتے ہی انہوں نے پیر سائیں کو مطلع کردیا ہوگا کہ چور کون ہے۔ گڑبڑ یہ ہوئی کہ اس مال کی فروخت اور پھر چوری ہونے کی خبر میں شاہ عالم کا نام بار بار آیا۔ اس مال کی قیمت وصول کرنے والا بھی شاہ عالم تھا جو دو سال سے لندن میں گمنامی کی زندگی گزارنے کے بعد اچانک خبروں میں نمایاں ہوگیا تھا۔

عین ممکن تھا کہ پیر سائیں چوری کے اصل مجرم ملک رب نواز پر فرد جرم عائد کرنے کے بعد اسے مناسب سزا دینے کے امکانات کا جائزہ لیتا لیکن ملک رب نواز۔ دلاور کے الفاظ میں' کوئی عام چور نہیں تھا جو مسجد سے جوتیاں یا مالک کی تجوری سے روپے چراتا ہو۔ وہ پیر سائیں کی طرح بڑا چور تھا جس کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے انہیں اپنے گریبان میں جھانکنا پڑتا تھا۔

اس کے علاوہ رب نواز آسان شکار بھی نہ تھا مگر قسمت کا کھیل دیکھیے کہ شامت اعمال شاہ عالم کو گھیر کر لندن سے لاہور لے آئی اور اس نے ایک ہوٹل میں بیٹھ کے بڑک

ماری شروع کی کہ وہ ملکی سیاست میں انقلاب لانے کے لیے وطن واپس آیا ہے۔ اخباروں میں اس کی بونگیاں بھی بڑے طمطراق سے شائع ہونے لگیں تو پیر سائیں نے کہا کہ ذرا معلوم کرو یہ چور کا بچہ سیاسی تالاب میں پھر کودا ہے تو کتنے پانی میں ہے اور مخبروں نے اطلاع دی کہ پیرومرشد' وہ تو اکیلا ہی اچھل رہا ہے۔ اپنے ووٹ کے سوا اسے دوسرا ووٹ دینے والا کوئی نہیں۔

پیر سائیں نے حکم دیا کہ ایسا ہے تو اسے اٹھالاؤ اور پوچھو اس سے کہ چوری کا مال کہاں ہے بظاہر تو ایسا لگتا ہے کہ چوروں کو پڑگئے مور۔ ہمارا مال چوری کرکے لے گیا تھا ملک رب نواز مگر آگے اسے مل گیا شاہ عالم جیسا مہا چور۔ لندن کے کچھ اخباروں کی قیاس آرائی اور بازار میں گشت کرنے والی افواہوں سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ چھ لاکھ کے نوادرات کی چوری بھی ایک ڈراما تھی۔ کچھ کہتے ہیں وہ خود جی نے غائب کیے۔ کچھ لارڈ پرائس کو موردالزام سمجھتے ہیں تو کچھ اسے شاہ عالم کی کارستانی قرار دیتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے' یہ شاہ عالم سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ پیر سائیں کے حکم کے غلام شاہ عالم کو یعنی مجھے ایسے اٹھالائے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ شاہ عالم نے اس دوران ایک جرم یہ کیا تھا کہ پیر سائیں کے ایک خاص بندے کو قاتلانہ حملے کے الزام میں اندر کرادیا تھا اور بڑی چالاکی دکھاتے ہوئے اس کے خلاف سارے ثبوت بھی فراہم کردیے تھے۔ تاہم اس کے حکم کے غلام نے ہوش میں آنے کے بعد اصل بات اپنے الفاظ میں بتائی ہوگی تو پیر سائیں کے علاوہ پولیس کے اعلیٰ افسران نے بھی طے کرلیا ہوگا کہ شاہ عالم کو سبق سکھانا ضروری ہے۔

اچانک شاہ عالم کے خلاف طاقتور دشمنوں کا ایک اتحاد ثلاثہ وجود میں آگیا تھا۔ اس میں ملک رب نواز' پیر سائیں اور پولیس شامل تھے۔ ان متحدہ دشمنوں کا مقابلہ کرنا شاہ عالم کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے حق میں یہی بہتر تھا کہ وہ غائب ہوجائے اور اس نے غائب ہونے والا مداری کا کھیل دکھانے کا پورا انتظام بھی کرلیا تھا مگر اے بسا آرزو کے خاک شدہ۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔

اب صورت حال کی ستم ظریفی یہ تھی کہ شاہ عالم کے دھوکے میں ناصر عظیم اس کرۂ ارض سے ناپید ہونے والا تھا۔ اور ستم بالائے ستم کہ اگر وہ کسی کو یہ بات بتاتا کہ وہ شاہ عالم نہیں ہے تو اس پر یقین کوئی بھی نہ کرتا۔

میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ قید و بند کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا اور مجھے پیر سبحان شاہ کی نجی جیل سے کیسے رہائی ملے گی۔ اگر شاہ عالم کو پولیس نے گرفتار کیا ہوتا تو اس کی رہائی کے لیے سب سے مؤثر انداز میں شبنم اپنے وسائل کا استعمال کر سکتی تھی۔ وہ میری گرفتاری کے معاملے پر اخبارات میں آواز اٹھاتی۔ میرا پتا چلانے کے لیے اور مجھ سے ملنے کے لیے اپنے تعلقات کو استعمال کرتی اور عدالتِ عالیہ میں حبسِ بے جا کی درخواست دائر کرتی۔

گزشتہ چند برسوں میں خود حکومت نے نجی آزادی کے تصور کو بری طرح پامال کیا ہے۔ اب کسی بھی شخص کو دن دہاڑے یا رات کے اندھیرے میں اس کے گھر سے دفتر سے یا پبلک کی نظروں کے سامنے سے اٹھالیا جاتا ہے اور پھر وہ شخص عموماً ایسے غائب ہو جاتا ہے کہ اس کا سراغ تک نہیں ملتا۔ اسے اپنے ساتھ لے جانے والے سادہ کپڑوں میں آتے ہیں اور اپنے دہشت زدہ کرنے والے رویے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ سرکاری اہلکار ہیں۔ گرفتاری کے نام پر یہ اغوا ہوتا ہے جس پر اعتراض یا احتجاج کرنے والوں کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے کر خاموش کردیا جاتا ہے۔ غیر متعلقہ لوگ جو چشم دید گواہ ہوتے ہیں' نظریں چرا لیتے ہیں اور انجان بن جاتے ہیں یا بے مروت ہو کر صاف کہہ دیتے ہیں کہ انہیں اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی جان و مال اور آبرو عزیز ہے اس لیے وہ پرائے معاملے میں گواہی کے عذاب سے دور رہنا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد صرف اغوا ہونے والے کے گھر والے رہ جاتے ہیں جو سارے زمانے میں پوچھتے پھرتے ہیں کہ وہ جسے "قانون نافذ کرنے والے ادارے" نے گرفتار کیا تھا اب کہاں ہے اور کس کی تحویل میں ہے؟ پولیس' اسپیشل پولیس' سی آئی اے' ایف آئی اے' پیرا ملٹری فورس اور آرمی۔ سب قانون نافذ کرنے والے ادارے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ پتا نہ چلے اور لواحقین عدالتِ عالیہ میں درخواست دائر کرنے کا حوصلہ اور استطاعت رکھتے ہوں تو قانون کا "طریق کار" والا سست اور تکلیف دہ عمل شروع ہوتا ہے۔ ہائی کورٹ حکومت کو نوٹس جاری کرتی ہے کہ گرفتار شدہ شخص کے بارے میں بتایا جائے۔ پھر ایڈووکیٹ جنرل سے لے کر قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سربراہ یا ان کے نمائندے کی طرف سے عدالت میں بیان داخل کردیا جاتا ہے کہ مذکورہ شخص کسی کی تحویل میں نہیں ہے۔ اب فریاد کرنے والا جائے تو کہاں جائے؟ گواہ بھی پیش کرے تو فائدہ؟ انگلی اٹھائے تو کس پر اٹھائے۔ قسمت اچھی ہو تو گرفتار ہونے والا کسی دن خود ہی لوٹ آتا ہے لیکن اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ وہ کہاں تھا اور حراست میں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ ورنہ لواحقین ساری عمر ایک پُرعذاب صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہتے ہیں اور جانے والے کبھی نہیں آتے۔

میرا معاملہ اس سے بھی بُرا تھا۔ اگر شبنم کسی وکیل کے ذریعے سے عدالتِ عالیہ تک جاتی تو اسے بالآخر قانون نافذ کرنے والے ہر ادارے سے وہی جواب ملتا کہ شاہ عالم بے شک دن دہاڑے ایک ہوٹل کے باہر سے اغوا ہوا تھا مگر وہ ہماری تحویل میں نہیں ہے اور ان کا یہ بیان مبنی بر حقیقت ہوتا۔ اب یہ صرف پیر سبحان شاہ کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ مجھے کب تک اپنی قید میں رکھتا ہے۔ بالآخر چھوڑ دیتا ہے یا میری موت کا فرمان جاری کردیتا ہے۔

سرکاری قانون نافذ کرنے والے اداروں سے الگ' ملک کے ہر صوبے میں وڈیروں' جاگیرداروں' خرکاروں' اسمگلروں اور ڈاکوؤں کی نجی جیلیں ہیں جہاں ان کے مخالفین' دشمن اور ان کے مجرم قید رہتے ہیں۔ ان جیلوں کا غیر قانونی وجود ثابت ہے اور پولیس خود ان تک بالواسطہ رسائی رکھتی ہے مگر ان کے سامنے قانون بے بس ہے۔

اس لحاظ سے اغوا برائے تاوان کرنے والے ڈاکو سب سے اچھے ہیں کہ قانون کے محافظ یا نمائندے بن کر نہیں آتے۔ جو کرتے ہیں اعلانیہ کرتے ہیں اور صاف بتا دیتے ہیں کہ یہ نقدِ جاں کا سودا ہے۔

ابھی میری اسیری کو چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور میں نے ابھی تک اسیری کے سوا جو خود ایک اذیت تھی' کوئی اذیت نہیں اٹھائی تھی مگر مجھے ان سب کی طرف سے پریشانی تھی جو مجھے اپنا سمجھتے تھے۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب تک رئیس نے صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ لیا ہوگا۔ اس نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ جو لوگ مجھے ہوٹل کے اندر سے اغوا کرنے میں ناکام رہے تھے' انہوں نے مجھے باہر سے اٹھالیا۔ ہوٹل کے منیجر نے اسے مظاہرین کے بارے میں بتایا ہوگا تو قدرتی طور پر یہ بات اس کے دماغ میں بھی آئے گی کہ یا تو پارٹی کے کارکن بن کر آنے والے ہی درحقیقت کرائے کے لوگ تھے جو مجھے دھوکے سے اپنے پاس بلانے میں کامیاب رہے یا پھر مجھے اس وقت اغوا کیا گیا جب میں مظاہرین کو پُرسکون رہنے اور منتشر ہو جانے کی تلقین کر کے واپس آرہا تھا۔

رئیس بہت سمجھ دار اور ٹھنڈا دماغ رکھنے والا آدمی تھا۔ وہ میری پُراسرار گمشدگی سے پریشان تو ہوگا مگر بدحواس نہیں ہوگا۔ وہ جائے واردات سے کوئی بات معلوم کرنے میں ناکام ہو جائے گا تو سب سے پہلے فرید عباسی کو اطلاع دے گا اور پھر شاید شبنم سے بات کرے گا مگر نیلم سے اور قمر یا چندا سے یہ بات چھپالے گا۔

قدرتی طور پر خود رئیس کا اور فرید عباسی کا شک سب سے پہلے اے ایس پی دلاور شاہ پر جائے گا اور ممکن ہے اب تک وہ کسی ذریعے سے اپنے شک کا اظہار بھی کرچکے ہوں مگر دلاور شاہ ایک چالاک پولیس افسر ہی نہیں پیر سبحان شاہ کا سالا بھی ہے۔ نظریۂ ضرورت کا ناجائز استعمال تو اب بالکل عام ہوگیا ہے۔ دلاور شاہ جیسا شخص اپنے جھوٹ کو جواز عطا کرنے کے لیے حلف بھی اٹھا سکتا ہے کہ نہ اس نے شاہ عالم کو گرفتار کیا ہے اور نہ اس کا شاہ عالم کے اغوا سے کوئی تعلق ہے۔ نیت کا حال تو صرف خدا جانتا ہے۔ الفاظ کی حد تک اس کا حلف غلط نہیں ہوگا۔ وہ چاہے تو قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہہ دے کہ نہ کوئی گرفتاری کا حکم ہے اور نہ اس نے شاہ عالم کو اغوا ہوتے دیکھا۔

اب مجھے پیر سبحان شاہ سے ملاقات کا انتظار تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے دلاور شاہ کو یقین دلا دیا تھا کہ میں کاروباری معاملات میں پیر سائیں کے ساتھ اشتراک کا خواہش مند ہوں کیونکہ میرے ملک رب نواز سے کاروباری مراسم ختم ہوگئے ہیں۔ دلاور شاہ بڑے طمطراق کے ساتھ آیا تھا کہ مجھ سے چوری کا مال برآمد کرے مگر میرے جارحانہ رویے نے اسے تھوڑا سا محتاط ہو کے پسپائی پر مجبور کردیا تھا اور اس نے اپنی ذمّے داری پر کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے پیر سائیں سے بات کرلینا بہتر سمجھا تھا۔

میں نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس زنداں سے میری رہائی صرف پیر سائیں کے اجازت نامے سے مشروط ہے۔ اس معاملے میں نہ میری ہوشیاری کام آئے گی' نہ میری جراتِ رندانہ اور نہ قانون کی دستگیری۔ اگر میں کسی طرح پیر سائیں کو یقین دلانے میں کامیاب رہا کہ میں نے واقعی ملک رب نواز کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور میں نیک نیتی کے ساتھ پیر سائیں سے عہدِ وفا استوار کرنا چاہتا ہوں تو شاید کسی ضمانت پر مجھے مہلت مل جائے کہ میں جو کہہ رہا ہوں' ثابت کر کے بھی دکھاؤں۔ یہ ضمانت کیا ہوگی؟ یہ میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ یقیناً پیر سائیں اتنا احمق نہیں تھا کہ صرف میرے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے مجھے چھوڑ دے۔

میں چاہتا تھا کہ پیر سائیں سے ملاقات ہو جائے تو دوسرے معاملات پر بات کرنے سے پہلے میں اس سے درخواست کروں کہ وہ میرا ایک پیغام گھر والوں تک پہنچا دے۔ اگر مجھے فون کرنے کی اجازت نہیں تو کوئی اور رئیس سے کہہ دے کہ میں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔ وہ میری گمشدگی کے بارے میں کسی وکیل سے بات نہ کریں اور خاموشی سے میری واپسی کا انتظار کریں۔ رہی شاہ عالم کی پارٹی اور اخبار والوں کی بات تو وہ قیاس آرائیوں کی بنیاد پر جو چاہیں کریں۔

مجھے یقین تھا کہ پیر سائیں میری یہ بات ضرور مان لے گا۔ لیکن اس سے ملاقات کب ہوگی' یہ غیر یقینی تھا۔ میں نے گزشتہ رات یہ سنا تھا کہ وہ کراچی سے لاہور آیا ہے اور اس سے ایک امید پیدا ہوئی تھی کہ فرصت ملتے ہی وہ میرے معاملے میں کوئی فیصلہ ضرور کرے گا۔

دوپہر تک میں اپنی تنہائی اور خاموشی کے ساتھ اپنے خیالات کی دنیا میں سرگرداں رہا۔ میں اپنی گرفتاری سے ذرا بھی خوف زدہ یا ناامید نہیں تھا۔ مجھے صرف اپنی فکر کرنے والوں کی فکر تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابھی قمر کو کچھ معلوم ہو تو وہ رو رو کے خود کو ہلکان کرلے یا چندا اور نیلم کو پتا چلے تو وہ پریشانی میں کھانا پینا بھی چھوڑ دیں اور آنسو بہانے بیٹھ جائیں۔ ڈاکٹر کمال' فرید عباسی یا رئیس حقیقت پسندانہ انداز میں صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

دوسری طرف یہ بات بھی یقینی تھی کہ آج صبح کے اخبارات نے شاہ عالم کے پُراسرار طور پر اچانک لاپتا ہو جانے کی خبر کو پوری تفصیلات کے ساتھ شائع کیا ہوگا اور یہ ناممکن ہوگا کہ یہ خبر چندا' نیلم یا قمر سے چھپی رہے چنانچہ اب یہ میرے لیے ضروری تھا کہ میں جلد از جلد انہیں اپنی خیریت سے مطلع کروں تاکہ ان کا حوصلہ کچھ بحال ہو۔

دوپہر کے بعد عبدل کے ساتھ کوئی مسلح محافظ نہیں آیا تو مجھے حیرانی ہوئی۔ اس نے دروازے کے پاس رک کے مجھے رحم طلب ملتجی نظروں سے دیکھا "سائیں' ہم کھانا لے کر آئے ہیں۔"

میں نے کہا "انہوں نے تمہیں اکیلا کیسے آنے دیا؟"

وہ کچھ دیر چپ رہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے سائیں۔

باہر تو وہ کھڑے ہیں بندوق لیے۔"
میں نے کہا "ڈرو نہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔"
وہ بولا "آپ پیچھے چلے جاؤ تو ہم دروازہ کھول کے کھانا اندر رکھ دیں۔"
میں آخری دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ "عبدل! مجھے بہت افسوس ہے کہ کل میری وجہ سے تم پر مصیبت آئی۔"
اس نے دروازے کا قفل کھول کے کھانے کی ٹرے اندر رکھی اور پھر جلدی سے تالا لگا دیا۔ اس ایک منٹ میں عبدل کی نظر مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے میں کوئی آدم خور شیر ہوں جو موقع ملتے ہی اس پر جھپٹ پڑے گا۔
میں نے کہا "عبدل' میں پیر سائیں سے ملنا چاہتا ہوں۔"
وہ اِدھر اُدھر دیکھ کے بولا "ہم کیا کر سکتے ہیں سائیں؟"
میں نے کہا "اچھا یہ تو بتا دو کہ پیر سائیں آ گئے ہیں؟"
"وہ حویلی میں موجود ہیں جناب! آپ کھانا کھا لو۔"
میں نے کہا "ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔"
اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور خوف زدہ انداز میں چلتا ہوا واپس ہو گیا۔ میں نے کھانے پر نظر ڈالی۔ یہ قیدیوں والا کھانا نہیں تھا۔ یہ پیر سائیں کے دسترخوان پر رکھا جانے والا خوانِ نعمت تھا جس کے پُر تکلف مرغن کھانے اپنی اشتہا انگیز خوشبو پھیلا رہے تھے۔
فکرمندی کے باوجود مجھ پر بھوک غالب آ گئی۔ میں نے سوچا کہ جو ہونا ہے وہ تو ہو گا۔ مجھے بھوکا رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ جسم میں کچھ توانائی ہو گی تو کام آئے گی۔ خالی پیٹ کے ساتھ تو دماغ بھی کام نہیں کرے گا۔ میں نے مرغ قورمے' پلاؤ اور شیرمال کے ساتھ پورا انصاف کیا اور بعد میں سویٹ ڈش سے بھی۔ آہستہ آہستہ مجھے یہ امید ہو رہی تھی کہ قید خانے میں میرے ساتھ ایک مجرم جیسا سلوک نہیں ہو رہا ہے بلکہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بھی مجھے مہمان کی حیثیت دی جا رہی ہے تو اس میں پیر سائیں کی رضامندی شامل ہو گی۔
کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد جب پھر مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہوا تو مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ایک بار پھر مجھے کوئی خواب آور دوا کھلا دی گئی ہے تو اس کا بھی کچھ مقصد ہو گا۔ مردہ بدست زندہ۔ ایک قیدی اپنی مرضی سے کیا کر سکتا ہے۔ مجھے زنداں میں رکھنے والے جتنی آسانی سے..... زہر دے سکتے تھے اتنی ہی آسانی سے مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ دنیا کو کبھی معلوم نہ ہوتا کہ شاہ عالم' جو درحقیقت ناصر عظیم تھا۔ کس کے ہاتھوں کیسے مارا گیا اور کہاں دفن ہوا۔ یوم حشر سے پہلے میرے لہو کا سراغ نہ مجھے چاہنے والے لگا سکتے تھے اور نہ وہ سراغ رساں جو ذرے سے آفتاب کا پتا پوچھ لیتے ہیں۔
تیسری بار میری آنکھ پھر اسی کمرے میں کھلی جس میں مجھے پہلی بار لا کے رکھا گیا تھا۔ میں اسی آرام دہ بستر پر دراز تھا اور اب میری وہ حالت بھی نہیں تھی جو پہلی بار ہوش میں آنے کے بعد تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں سکون کی طویل نیند لے کر جاگا ہوں۔ میں نے اٹھ کے ایک انگڑائی لی اور پھر یہ دیکھا کہ کیا ایک بار پھر مجھے آزادانہ نقل و حرکت کی آزادی عطا ہو گئی ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ ایک واش روم کے دروازے کے علاوہ تمام دروازے باہر سے مقفل تھے۔
میں نے ساتھ والے ڈرائنگ روم کے دروازے سے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی تو مجھے بہت سے لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں مگر وہ ڈرائنگ روم سے آگے والی بیٹھک میں تھے۔ میں ان باتوں کا کوئی مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔
کمرے میں لگے ہوئے کلاک نے شام کے پانچ بجائے۔ مجھے اغوا ہوئے اب چوبیس گھنٹے ہونے والے تھے۔ وہ کام جو میں بھیس بدل کے کرنا چاہتا تھا' خود بخود ہو گیا تھا۔ شاہ عالم پُراسرار طور پر اپنے ہوٹل سے غائب ہو گیا تھا کہ کسی نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا اور خود ہوٹل والے گواہ بن گئے تھے کہ شاہ عالم نے چیک آؤٹ نہیں کیا مگر وہ باہر اپنی پارٹی کے کچھ مظاہرین سے ملنے گئے تو لوٹ کے نہیں آئے۔ سیکیورٹی کا عملہ بھی گواہی دے گا کہ وہ سامنے ہی موجود تھے کہ اچانک غائب ہو گئے۔
اچانک میری نظر کپڑوں کے ایک جوڑے پر پڑی جو بڑے سلیقے سے استری کر کے میرے بیڈ کے پاس ہی صوفے پر رکھ دیا گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کے دیکھا۔ یہ میرے سائز کا تھا اور مجھے اپنے میزبانوں کی طرف سے فراہم کیا گیا تھا۔ صاف کپڑے دیکھ کر میرے دل میں نہانے کی خواہش پیدا ہوئی اور میں کپڑے اٹھا کے واش روم میں چلا گیا۔ وہاں میں نے باتھ ٹب میں نیم گرم پانی بھرا اور نہانے کے لیے گھس گیا۔ اس شاہی حمام میں ایک سے بڑھ کر ایک باتھ سوپ' لوشن اور شیمپو موجود تھے۔
آدھے گھنٹے بعد میں کپڑے بدل کے نکلا تو بالکل فریش تھا۔ میں نے کمرے میں آتے ہی اے ایس پی دلاور شاہ کو دیکھا جو خاموشی سے کمرے میں آ کے بیٹھ گیا تھا اور صوفے پر

نیم دراز سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید اس کمرے میں کسی خفیہ کیمرے کی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہو گی۔
وہ مجھے دیکھ کے دوستانہ انداز میں مگر عیاری سے مسکرایا۔ "ہاؤ آر یو فیلنگ ناؤ؟"
میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا "تم نے پیر سائیں سے میری بات کی؟"
وہ سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف چھوڑتا رہا "ابھی نہیں۔"
میں نے کہا "جھوٹ بول رہے ہو تم۔ تم اتنا اختیار نہیں رکھتے اس گھر میں کہ مہمان کو قیدی کا اور قیدی کو مہمان کا درجہ دے سکو۔"
وہ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا "میرے اختیارات کی بات مت کرو۔ ساری خدائی اک طرف..... جورو کا بھائی....."
میں نے اس کی بات کاٹ دی "کون سی جورو کا بھائی۔ پیر سائیں نے شرع کی حد میں چار تو کرلی ہوں گی۔"
"کوئی بھی بڑا آدمی چار چھوڑ دس کرے۔ گھر کی مالکن وہی سمجھی جاتی ہے جو خاندانی ہوتی ہے اور پہلی ہوتی ہے۔"
میں نے کہا "تمہارے اطوار میں مجھے کوئی بات خاندانی نہیں لگتی۔"
یہ اس کے لیے گالی تھی۔ اس کا چہرہ لمحہ بھر کے لیے متغیر ہوا۔ "چلو میرے ساتھ۔ تمہیں پیر سبحان شاہ نے بلایا ہے۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ تم اس کی حویلی میں ہو۔ جس طرح تم میرے ساتھ پیش آئے ہو' ایسے اس کے سامنے بی ہیو مت کرنا' ورنہ نقصان میں رہو گے۔"
میں نے کہا "مجھے پروٹوکول مت سکھاؤ۔"
وہ بولا "یقیناً' یہ ضروری ہے۔ تمہارے لیے وہ شاید غیر اہم ہو۔ ایک عام آدمی جو تمہارا سیاسی حریف تھا یا کاروباری' لیکن یہاں وہ ایک تسلیم شدہ پیر ہے۔ جتنے لوگ تمہیں یہاں نظر آئیں گے' وہ اس کی قدم بوسی کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔ اگر تم نے ان کے سامنے پیر سائیں کی شان میں کوئی گستاخی کی یا توہین آمیز جملہ بولا تو وہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔"
اسے ٹالنے کے لیے میں نے کہا "او کے۔ میں خیال رکھوں گا لیکن نہ میں اس کی قدم بوسی کروں گا اور نہ اس کے سامنے دو زانو ہو کے اور عقیدت سے سر جھکا کے بیٹھوں گا۔"
وہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ہم اسی مغربی طرز کے ڈرائنگ روم اور اس سے متصل مشرقی انداز کی بیٹھک سے گزرے۔ بیٹھک میں صفائی ہو رہی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں محفل ابھی برخاست ہوئی ہے۔ ایک ملازم چیزوں کو سلیقے سے اپنی اپنی جگہ پر رکھ رہا تھا۔ دوسرا قالین کو جھاڑ رہا تھا۔ سگریٹوں کے ٹکڑے ایش ٹرے میں ڈال رہا تھا اور تیسرا خالی ہونے والے چائے کے برتن ایک ٹرالی میں سمیٹ کر لے جا رہا تھا۔

دلاور شاہ مجھے حویلی یا کوٹھی کے عقب میں لے گیا جہاں سنگِ مرمر کے ٹائلوں والا صحن تھا۔ یہ حویلی کا آخری حصہ تھا جس کے بعد وہی خاردار تاروں والی اونچی فصیل تھی۔ یہاں بھی ایک تخت تھا اور چند کرسیاں رکھی تھیں۔ تخت پر قالین بچھا ہوا تھا اور بید کی بُنائی والی کرسیوں پر کشن تھے۔

پیر سائیں تخت پر ایک شال اوڑھے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں ربر کے پائپ والی حقّے کی نے تھی۔ وہ پچاس پچپن سال کا بھاری بھرکم آدمی تھا جس کے چہرے پر مذہبی تقدس کی علامت داڑھی بھی نہیں تھی۔ میں نے اس سے پہلے کوئی کلین شیو پیر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بارعب چہرے کو جلالی انداز دینے والی لال لال آنکھیں تھیں اور گھنی مونچھیں جو ناک کے دونوں جانب دو دو انچ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے سر پر بہت کم چھوٹے چھوٹے بال تھے جن کی سفیدی اس کی عمر کے باعث سیاہی پر غالب آچکی تھی۔

تخت سے کچھ دور ٹائلوں کے فرش پر ایک گھنی سیاہ داڑھی والا شخص بڑے مؤدبانہ انداز میں دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ننگے سر تھا اور اس کے سر پر لمبے پٹوں والے سیاہ بال تھے جو تیل سے چمک رہے تھے۔ وہ ہلکے پیلے رنگ کے سلک جیسے شلوار قمیص میں تھا۔

پیر سائیں کے دائیں ہاتھ پر ایک غریب صورت خستہ حال اور کمزور سا آدمی ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ایک عورت خاموش کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ عورت کے عہدِ شباب کا وہ زمانہ تو گزر چکا تھا جب اس کے چہرے کی تازگی اور بھرپور بدن کی جوانی دعوتِ دید دیتی ہوگی مگر وہ ابھی بوڑھی نہیں ہوئی تھی۔ تلخیِ حالات اور تفکرات نے اس کی جوانی کو قبل از وقت بڑھاپے کی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ اپنے انداز و اطوار سے میاں بیوی نظر آتے تھے۔

پیر سائیں کے تخت کے بالکل پیچھے ایک محافظ کندھے سے کلاشنکوف لٹکائے کھڑا تھا اور دلچسپی سے عورت کو دیکھ رہا تھا جو حسین تو خیر نہیں تھی لیکن جاذبِ نظر ضرور تھی۔

میں قریب پہنچا تو پیر سائیں نے سپاٹ چہرے کے ساتھ ایک نظر مجھ پر ڈالی اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے ان کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا جو تخت کے سامنے دائیں بائیں دو قطاروں میں لگی ہوئی تھیں۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دلاور شاہ چند قدم چل کے گیا اور مخالف سمت کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

پیر سائیں نے فریادی مرد کی طرف دیکھا "ہاں بھئی' دیکھو یہی ہے وہ بندہ۔ تُو پہچانتا ہے اسے؟"

فریادی نے دونوں ہاتھ جوڑے "بہت اچھی طرح مائی باپ!"

پیر نے عورت سے پوچھا "تو بھی دیکھ لے' اس کی شکل۔"

عورت نے روتے ہوئے کہا "یہی ہے جی وہ حرامی پلّا۔"

پیر سائیں کے پیچھے کھڑے ہوئے محافظ نے گرج کے کہا "گالی مت دے پیر سائیں کے سامنے۔"

مرد نے کہا "غلطی ہوگئی پیر سائیں!"

پیر سائیں نے سہلایا "جس کا دل دکھا ہوا ہو' اس کے منہ سے گالی نکلے گی یا بددعا۔"

مرد چلاّنے لگا "پیر سائیں۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ اس نے بچوں کے سامنے ماں کی عزت خراب کی۔ وہ بچے خیر...... جوان ہو رہے ہیں۔ لڑکا ہے پندرہ سال کا' لڑکی چودہ سال کی ہے۔ اس سے پوچھو سائیں کہ کیا اس کے گھر میں ماں بہن کے ساتھ ایسا ہو۔"

پیر سائیں نے اسے دلاسا دیا "حوصلہ کر حوصلہ۔ ابھی تیرے ساتھ انصاف ہوگا۔" پھر وہ داڑھی والے سے مخاطب ہوا "ہاں بھئی' سچ بول رہی ہے یہ عورت یا جھوٹ بک رہی ہے؟"

داڑھی والے نے سر جھکا لیا۔

پیر سائیں گرجا "ابھی منہ سے کچھ بکواس کر۔ تیرے منہ میں زبان ہے نا۔ یا نکال کے دکھائیں تیرے کو۔ ڈاکو ایسے ہوتے ہیں بے غیرت!"

ڈاکو نے ہاتھ جوڑدیے "پیر سائیں' بھول چوک ہوگئی۔"

"بھول چوک! یہ بھول چوک ہے؟" پیر سائیں آگ بگولا ہوکے بولا "پرائی بہو بیٹی کے ساتھ بھول چوک۔ بابا کبھی اپنے گھر میں بھی کی ہے بھول چوک۔ خود کو ڈاکو کہتے ہو اور کام کرتے ہو نامردوں والے۔"

ڈاکو اسی طرح ہاتھ جوڑے بیٹھا رہا "سائیں اس بار معافی دے دو۔"

پیر سائیں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں بابا۔ ابھی ہم کون معافی دینے والا۔ معافی دینے والی ذات اللہ کی ہے۔ یا یہ فریادی تیرے کو بول دے کہ جا معاف کیا۔"

ڈاکو نے فریادی کی طرف نظریں اٹھائیں تو اس کا سر انکار میں ہلنے لگا "ہم کو انصاف چاہیے پیر سائیں!"

پیر سائیں نے کہا "انصاف برابر ملے گا۔ ضرور ملے گا۔

یہ تو حکم ہے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ جان کے بدلے جان!"

ڈاکو چلاّنے لگا۔ "سائیں' ایسا مت کرو۔"

پیر سائیں کا چہرہ جلالی ہوگیا "بھونکتا ہے میرے سامنے کتے۔ ہمیں بتاتا ہے کیا کرو' اپنی آواز کم کرو ورنہ ہمیں بند کرنی پڑے گی۔"

ڈاکو سجدے میں گر گیا "معافی پیر سائیں' معافی!"

لیکن پیر سائیں نے حکم صادر کردیا "اوئے' لاؤ اس کی گھر والی کو۔"

ڈاکو اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "ایسا ظلم نہیں کرو پیر سائیں ہم پر!"

پیر سائیں نے دلاور شاہ کی طرف دیکھا "ابھی یہ اس کو ظلم لگتا ہے' جب اس کا زور چلتا تھا تو اسے خیال نہیں آیا کہ ظلم ہے۔"

دو ملازم ایک عورت کو بازو سے پکڑ کے گھسیٹتے ہوئے درمیان میں لے آئے۔ وہ خاصی فربہ بدن اور تیس بتیس سال کی جوان عورت تھی جس کے سانولے رنگ اور تیکھے نقوش میں بڑی دلآویزی تھی۔ اس نے آنکھوں میں ڈھیروں سرمہ لگا رکھا تھا اور شوخ رنگ کے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے لیکن خوف اور گھبراہٹ سے اس کا حال خراب تھا۔ وہ مزاحمت کررہی تھی اور کانپ رہی تھی۔

پیر سائیں کے سامنے پہنچ کے وہ زور زور سے رونے لگی۔ "پیر سائیں' میری کیا غلطی ہے۔ اس کے جرم کی سزا مجھے کیوں دیتے ہو؟"

پیر سائیں نے فرمایا "اس لیے کہ تو بیوی ہے اس کی۔ اگر یہ مرجائے تو اس کی جائداد اور دولت تجھے ملے گی یا نہیں؟ اس پر سب سے پہلے تیرا ہی دعویٰ ہوگا۔ پھر اس کا قرض تو کیوں نہیں چکاتی؟"

نظامِ انصاف کے ان اصولوں کی ایسی انوکھی تشریح نے مجھے حیران کردیا مگر میں ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھنے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔

پیر سائیں نے ڈاکو کی بیوی کو لانے والے سے پوچھا "کیا یہ اکیلی آئی ہے؟"

ایک ملازم نے دست بستہ عرض کی "آپ نے حکم دیا تھا کہ بچے بھی ساتھ لائے جائیں' وہ اندر ہیں۔"

پیر سائیں نے فریادی کو دیکھا "چل بھئی' جاکے اپنا حساب برابر کرلے۔ ہم تجھے انصاف کا پورا حق دیتے ہیں۔"

عورت پھر چیخی "سائیں' میرے پر اتنا ظلم مت کریں۔"

پیر سائیں نے دھاڑ کے کہا "ظلم ہم نہیں کررہے ہیں۔ تیرے گھر والے نے پہل کی تھی۔ اب وہ بھگتے گا۔"

میں اس فیصلے پر بھونچکا رہ گیا۔ پیر سائیں نے اسلام کے نظامِ قصاص کی اتنی غلط توضیح کی تھی مگر باقی لوگ اسے عین انصاف قرار دے رہے تھے۔ خود دلاور شاہ قطعی لاتعلق بیٹھا تھا اور باقی لوگ تائید میں سر ہلا رہے تھے۔ مجھے اس وقت مزید صدمہ پہنچا جب فریادی نے اس فیصلے کو تسلیم کیا اور اس کی بیوی نے بھی برضا و رغبت اس پر عمل درآمد کی اجازت دی۔ یہ عین جہالت تھی اور لاقانونیت کی انتہا تھی کہ ایک جرم کا حساب دوسرے جرم کا ارتکاب کرکے برابر کیا جائے۔ مگر یہاں ملک کا قانون نہیں' پیر سائیں کا قانون چلتا تھا۔ ڈاکو نے ایک شخص کی بیوی کی عزت اس کے بچوں کے سامنے لوٹی تھی۔ اب وہ شخص ڈاکو کی بیوی کی عزت اس کے بچوں کے سامنے لوٹے گا۔ انصاف زندہ باد' پیر سائیں زندہ باد۔

میں نے فریادی کو جوشِ انتقام سے تمتماتے چہرے کے ساتھ ڈاکو کی بیوی کے ساتھ جاتے دیکھا۔ ڈاکو کی بیوی نے بھی اب پیر سائیں کے حکم کو (نعوذ باللہ) فرمانِ الٰہی کی طرح تسلیم کرلیا تھا۔ پہلے بے آبرو ہونے والی عورت نے بھی اپنے شوہر کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب برابر کرآئے۔ کیس کا فیصلہ ہوگیا تھا اور فریقین اسے انصاف سمجھ رہے تھے تو میں کیا کرسکتا تھا۔ اس فیصلے کے خلاف نہ اپیل تھی نہ کسی عدالتِ عالیہ میں فریاد کی گنجائش۔

صحن میں اب ہم چار ہی افراد رہ گئے تھے۔ میں' پیر سائیں' اے ایس پی دلاور شاہ اور پیر سائیں کے پیچھے کھڑا ہوا مسلح محافظ۔ میرا خیال تھا کہ اب پیر سائیں مجھ سے مخاطب ہوگا مگر اس نے حکم دیا "ابھی کتے کو لاؤ بابا!"

پیر سائیں کے تخت سے ساٹھ ستر فٹ کے فاصلے پر حویلی کی عقبی دیوار میں ایک دروازہ تھا جس کے پیچھے سے لوگ ایسے نمودار ہوتے تھے جیسے اسٹیج پر آرٹسٹ انٹری دیتے ہیں۔ اس دروازے سے ڈاکو کی بیوی کو لایا گیا تھا۔ پھر اسی دروازے سے وہ ایک غیر مرد کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔ اندر کسی کمرے میں اس کے بچے سہمے بیٹھے ہوں گے۔ وہ نہ قانون کو سمجھتے ہوں گے نہ مکافاتِ عمل کو۔ شاید انہیں یہ بھی علم نہ ہو کہ ان کے باپ کا جرم کیا تھا مگر جو کچھ ان کی ماں کے ساتھ ہوگا اسے شاید وہ تمام عمر نہ بھلا سکیں۔ ایک مظلوم عورت مطمئن ہوگئی تھی کہ پیر سائیں نے انصاف کیا اور ایک ظالم ڈاکو اس اذیت سے گزر رہا تھا جو وہ دوسروں کو دے چکا تھا۔

مجھے ایسا لگتا تھا جیسے سوچ سوچ کے میرا دماغ پھٹ

جائے گا۔ میں اپنی پریشانی بھول گیا تھا اور اکیسویں صدی کی باتیں کرنے والی دنیا میں زمانۂ جاہلیت کا نمونہ دیکھ کے حیران تھا' دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔ پیر سائیں کی مطلق العنانی اور طاقت کے مظاہرے نے مجھے محتاط کردیا تھا۔

اچانک سامنے والا دروازہ جو میرے دائیں جانب تھا' پھر کھلا اور اس مرتبہ میں نے ایک نیا سین دیکھا۔ ایک شخص اندر سے کتے کی طرح چاروں ہاتھوں پاؤں پر چلتا ہوا نمودار ہوا۔ اس کے گلے میں پٹا بھی پڑا ہوا تھا اور پٹے سے منسلک زنجیر کو ایک ملازم نے تھام رکھا تھا۔ پھر دوسرا ملازم باہر آیا جس نے السیشین نسل کے ایک کتے کی زنجیر پکڑ رکھی تھی۔ ایک انسان اور ایک کتا ایک ہی طرح چلتے ہوئے آگے بڑھے۔

اصل کتا تخت کے قریب پہنچ کر پچھلی دو ٹانگوں پر بیٹھ گیا اور پیر سائیں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کانوں کو سہلایا۔ کتا خوشی سے غرانے لگا۔ کتے کی طرح چلنے والے انسان نے پہلے صحن کا ایک راؤنڈ لگایا۔ وہ پہلے دلاور شاہ کے پاس گیا اور کتے کی طرح ہی اس کے جوتوں کو چاٹتا رہا۔ پھر میری طرف آیا۔ اور میرے پیروں میں لوٹنے لگا۔

میرے بدن میں ایک کپکپی پھیل گئی۔ کتے کی طرح حرکتیں کرنے والے اس انسان نے صرف ایک انڈرویئر پہن رکھا تھا۔ اس کا جسم دبلا پتلا اور سیاہ تھا جس پر لمبے لمبے داغ کوڑوں کی مار کے غماز تھے۔ وہ میرے اندازے کے مطابق چالیس سال کی عمر کا آدمی تھا جسے مار مار کے کتا بنا دیا گیا تھا اور اس نے تشدد کے عذاب سے بچنے کے لیے بالآخر ذہنی طور پر خود کو انسان اور اشرف المخلوقات کے بجائے ایک حقیر کتا تسلیم کرلیا تھا۔ اس نے بالآخر پیر سبحان شاہ کے سامنے جا کے بھونکنا شروع کردیا۔

میں نے پیر سائیں کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک خباثت بھری' فاتحانہ اور پُراطمینان مسکراہٹ تھی "ہاں ہاں' ٹھیک ہے بابا۔ تیرے کو بھوک لگی ہے ابھی۔"

دروازے سے ایک ملازم باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں تقریباً تین فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی ٹرے تھی اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کا ایک کین تھا۔ اس نے ٹرے کو کتے کے سامنے رکھا اور کین سے اس میں دودھ انڈیلنے لگا۔

پھر میں نے ایک اور انسانیت سوز اور لرزہ خیز منظر دیکھا۔ وہ السیشین کتا اور خود کو کتا سمجھنے والا ایک انسان اس ٹرے میں منہ جھکا کے پڑپڑ دودھ پینے لگے۔

پیر سائیں نے ایک قہقہہ لگایا "شاہ عالم۔۔۔ اپنے دوست کو دیکھو بابا!"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا "کس دوست کو پیر سائیں؟"

اس نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اس بار دلاور شاہ نے بھی جنونی کا ساتھ دیا "یہ کیسی بات ہے۔ تم نے بھی اسے پہچاننے سے انکار کردیا تو اس بے چارے کو کتنا صدمہ ہوگا۔"

میں نے غور سے کتے کے ساتھ ایک ہی ٹرے میں دودھ پینے والے انسان کو دیکھا مگر یہ کوئی شاہ عالم کا دوست تھا۔ معلوم نہیں وہ اپنے کس جرم کی سزا کاٹ رہا تھا مگر میں اسے شناخت کرنے سے قاصر تھا۔

دلاور شاہ بولا "پہلے یہ بہت بھونکتا تھا۔"

پیر سائیں مسکرایا "اسٹیج پر چڑھ کے بھونکتا تھا۔ دیکھو شاہ عالم! یہ تمہارا یار ہے یا سرایاز میاں' جسے تم نے ہمارے مقابلے میں کھڑا کیا تھا۔ اگر یہ جیت جاتا تو اسمبلی کا ممبر ہوتا۔"

ساری بات ایک دم میری سمجھ میں آگئی۔ یا سرایاز میاں میری اپنی پارٹی پی جے ایف کے ٹکٹ پر سبحان شاہ کے مقابل کھڑا ہوا تھا اور ہار گیا تھا۔ اس کے جیتنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بارے میں دلاور شاہ نے مجھے بتا دیا تھا۔ شاہ عالم کے ایک وفادار ساتھی کا یہ حال دیکھ کر میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ قطع نظر اس سے کہ شاہ عالم کا انداز سیاست کیا تھا' محض اس سے عہد وفا نبھانے کی یہ سزا قابل نفرت حد تک شیطانی تھی۔

لیکن مصلحت نے یا میری بزدلی نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کردیا اور میں اس انسان کو دیکھتا رہا جو مقام انسانیت سے گرا دیا گیا تھا۔ اسے یہ خوش فہمی ہوگئی تھی کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوسکتے ہیں اور عام انتخابات میں عام آدمی بھی حصہ لے سکتا ہے۔ مقابلہ کرسکتا ہے اور جیت بھی سکتا ہے۔

میں نے کہا "پیر سائیں۔ اس کی خطا کب معاف ہوگی؟"

پیر سائیں نے دونوں کتوں کو دیکھا "ہم اسے یہ سزا نہ دیتے مگر اس نے اسٹیج پر ہمارے لوگوں کے سامنے ہمیں کتا کہا تھا۔"

میں نے کہا "اپنی غلطی کی یہ بہت سزا بھگت چکا ہے' اب اسے معاف کردیں۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا "ابھی ساری دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ کتا کون ہے؟ اس لیے تمہارے کہنے پر ہم اس کو معاف

کرتے ہیں۔ تم مہمان ہو ہمارے۔"

پیر سائیں کے اشارے پر دو ملازم دونوں کتوں کو زنجیر سے تھام کرلے گئے۔ جاتے جاتے یا سرایاز نے ایک بار پلٹ کر مجھے دیکھا اور اس وقت مجھے ان آنکھوں میں ویرانی کی جگہ نفرت کا الاؤ بھڑکتا محسوس ہوا۔ میں اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ اسے یہ بھی نہ بتا سکا کہ میں قصوروار نہیں کیونکہ میں شاہ عالم جیسا ضرور ہوں مگر شاہ عالم نہیں ہوں۔

پیر سبحان شاہ نے اپنے انصاف اور اپنی حدود واختیار کے دو نمونے مجھے متاثر کرنے کے لیے دکھائے تھے۔ اس نے مجھے جانتے بوجھتے وہاں ایسے وقت میں طلب کیا تھا جب وہ مجھے اپنی قہاری وجباری کی طاقت کے مظاہرے سے مرعوب کرسکے۔ تاہم اس نے مجھے مہمان کا درجہ بھی دیا تھا اور بظاہر میری ایک درخواست کو شرفِ قبولیت بخش کے میرا اعتماد بحال کردیا تھا لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا "پیر سائیں۔ آپ کو میرا پیغام؟"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا "وقت کے ساتھ تمہارے خیالات کتنے بدل گئے ہیں شاہ عالم۔ آج تمہارے لہجے میں کتنی عاجزی ہے۔ تمہارا رویہ دیکھ کے مجھے حیرانی ہو رہی ہے۔ تم مجھے پیر سائیں کہہ رہے ہو۔ تم تو مجھے پیر سبحان شاہ نہیں پیر شیطان شاہ کہتے تھے۔"

میں نے کہا "پرانی باتوں کو جانے دیں۔ میرے اور آپ کے درمیان جو سیاسی اختلافات تھے' وہ اب ختم ہوجانے چاہئیں۔"

وہ دلاور شاہ کی طرف دیکھ کے مسکرایا "اس لیے کہ تمہاری سیاست ختم ہوگئی ہے؟"

میں نے کہا "حالات کے پیش نظر میرے لیے سیاست سے خود کو الگ کرلینا ہی بہتر ہے۔"

وہ بولا "پریس کانفرنس میں تو تمہارے دعوے کچھ اور تھے۔ بہت گرج برس رہے تھے تم؟"

میں نے کہا "آپ تو جانتے ہیں کہ میں دو سال سے باہر تھا۔ مجھے یہاں کے حالات کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ پریس کانفرنس کے بعد دو دن میں مجھے معلوم ہوگیا کہ ملکی سیاست میں اب میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ چنانچہ میں نے سیاست سے دستبردار ہوجانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"اس کا اعلان تم کب کرو گے؟" وہ پُرتمسخر لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "اعلان کیا پیر سائیں۔ بس میں خاموشی سے واپس لندن چلا جاؤں گا۔"

دلاور شاہ بولا "کیا خیال ہے' پہلی فلائٹ سے تمہاری سیٹ بک کروا دوں؟"

میں نے دلاور شاہ کی طرف دیکھا بھی نہیں "میں یہ چاہتا ہوں کہ میری طرف سے آپ کا دل صاف ہوجائے۔ ہمارے درمیان دشمنی کی وجہ کوئی نہیں۔ سیاست میں ہم ایک دوسرے کے حریف تھے اور ہم نے ایک دوسرے کے خلاف بہت سی باتیں کہی ہوں گی جو دل آزار تھیں۔ آج میں پہل کرتے ہوئے ان سب باتوں پر آپ سے معافی مانگنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا جو میں نے کی تھیں۔ میں بہرحال عمر میں آپ سے چھوٹا ہوں۔ میں اصرار نہیں کروں گا کہ آپ بھی مجھ سے معافی مانگیں۔ مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔"

میری بات کے خوشگوار تاثرات آہستہ آہستہ پیر سبحان شاہ کے چہرے پر ظاہر ہوئے "یہ میں جانتا ہوں شاہ عالم کہ تم ایک چالاک آدمی ہو۔"

میں نے کہا "پیر سائیں' آپ کو شک ہے کہ میں خدانخواستہ آپ کو بے وقوف بنا رہا ہوں؟"

"ضرورت پڑنے پر تم گدھے کو باپ بنانے کے اور کام نکل جائے تو باپ کو گدھے کی طرح لات مارنے کے ماہر ہو۔"

میں نے کہا "میں یہ بات سب کے سامنے کہہ سکتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو اخبار والوں کو بلالیں۔"

"افسوس اس بات کا ہے بابا کہ ہم تمہیں مہمان نہیں رکھ سکتے ورنہ جھوٹ سچ کا پتا چل جاتا" وہ بولا۔

اس کی بات نے مجھے چونکا دیا "آپ کا مہمان تو میں ہوں۔"

وہ بولا "کبھی کبھی برائی بھی آدمی کے حق میں اچھائی بن جاتی ہے۔ ابھی تم کو صرف اس لیے پیر سبحان شاہ کی جیل سے رہائی ملے گی کہ گورنمنٹ تم کو اپنی جیل میں رکھنا چاہتی ہے۔ تمہارے خلاف گرفتاری کے وارنٹ ہیں دلاور کے پاس۔ اس لیے تم یہاں ایک دن سے زیادہ نہیں رہ سکتے لیکن ہمارے ہاتھ کتنے لمبے ہیں' اس کا اندازہ تم کو سرکاری جیل میں بھی ہوگا۔"

میں نے اس اطلاع سے وقتی طور پر کچھ اطمینان محسوس کیا کہ پرانے مقدمات میں میری دوبارہ گرفتاری کے احکامات موجود تھے ورنہ شاید پیر سبحان شاہ کی جیل میں میرا بھی وہی حال ہوسکتا تھا جو شاہ عالم کے ساتھی یا سرایاز کا ہوا۔ اب

اے ایس پی دلاور شاہ قانونی طور پر پابند تھا کہ مجھے گرفتاری کے بعد چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کسی مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرے اور پولیس کو تحویل میں دینے کے لیے ریمانڈ حاصل کرے۔ اگرچہ یہ قانون بھی صرف کتابوں تک محدود تھا مگر اس وقت یہی کتابی قانون میرے تحفظ کی ضمانت بن گیا تھا۔ سرکاری جیل میں اپنے لیے قانون کے مطابق زندہ رہنے کی سہولت حاصل کرنا میرے اختیار میں تھا۔ میں اپنے تعلقات اور اپنے وسائل استعمال کر کے اچھے سے اچھے وکیل کی خدمات حاصل کر سکتا تھا اور ایک قانونی جنگ لڑ کے جیتنے کی امید کر سکتا تھا جو پیر سبحان شاہ کی نجی جیل میں ناممکن تھا۔

میں نے کہا "پیر سائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کل تک ہم سیاسی حریف بھی تھے اور ہمارے درمیان کاروباری رقابت بھی تھی مگر آج حالات بالکل مختلف ہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "دلاور نے یہ بات بھی بتائی ہے مجھے کہ رب نواز کے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا پڑ گیا ہے۔"

میں نے اب خود کو زیادہ پُراعتماد محسوس کیا "آپ تو اچھی طرح جانتے ہو پیر سائیں کہ دو سال سے میں باہر تھا۔"

"یہ ہم نے سنا ہے۔"

میں نے کہا "میں لندن میں تھا۔ وہاں میں نے شادی کر لی تھی۔ وہ ناکام ہو گئی۔ پھر میں نے دوسری شادی کی۔ لندن میں میرے قیام کے ایک ایک دن کے گواہ موجود ہیں۔ ان دو سالوں میں ایک بار بھی میں پاکستان نہیں آیا تھا... بلکہ یہ بات اے ایس پی دلاور شاہ سے معلوم ہوئی ہے کہ وہ چھ لاکھ پاؤنڈ مالیت کے نوادرات درحقیقت آپ کے تھے۔"

پیر سائیں نے سرہلایا "وہ ہمارے گودام سے غائب ہو گئے تھے شاہ عالم۔ ہم نے محافظوں کو غفلت کی بہت سخت سزا دی لیکن پھر معاف کر دیا۔ وہ ملک رب نواز کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔"

میں نے کہا "آپ کو یقین ہے کہ وہ نوادرات ملک رب نواز کے سوا کسی نے نہیں چرائے تھے۔"

وہ گرم ہو گیا "ہم نے پوری تفتیش کی تھی بابا۔ دلاور نے چوری کا سراغ لگا لیا تھا۔ وہ چوری نہیں ڈکیتی تھی۔ رب نواز کے آدمی ایک ٹرک میں بھر کے آئے تھے۔ انہوں نے ایک محافظ کو مار دیا۔ ایک کو وہ مردہ سمجھ کے چھوڑ گئے تھے لیکن وہ زخمی ہوا تھا۔ اس نے حملہ آوروں کی صورتیں دیکھی تھیں۔"

میں نے کہا "پیر سائیں۔ آپ جو کہہ رہے ہیں بالکل صحیح ہو گا لیکن اس چوری کا الزام آپ مجھے کیسے دے سکتے ہیں؟"

"چور کا ساتھی کیا چور نہیں ہوتا؟"

میں نے کہا "نہیں سائیں۔ میرا اس چوری کے مال سے کیا واسطہ، کتنے سالوں سے میں اور ملک رب نواز بزنس پارٹنر تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے مجھے چوری کا مال تھمایا ہو۔ اور کیا بزنس ایسے چل سکتا ہے کہ آج تم نے میرے مال پر ڈاکا ڈالا، کل میں تمہارا مال اٹھا کے بازار سے لے جاؤں۔"

اس نے مجھ سے اتفاق کیا "بزنس ایسے نہیں چل سکتا۔"

میں نے کہا "خیر مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ مال رب نواز کا نہیں ہے لیکن اس کی وجہ سے ہمارے تعلقات ضرور خراب ہوئے۔ وہ مجھ پر شک کرتا ہے مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ تو ملک رب نواز کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ وہ آج میرا دشمن ہو رہا ہے۔"

"یہ بات میں کیسے مان لوں۔"

میں نے کہا "میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔"

"لیکن اس دشمنی کی وجہ ...؟" وہ جانتے بوجھتے انجان بن گیا۔

میں نے کہا "پیر سائیں، سب کچھ تو اخباروں میں شائع ہوا تھا۔"

وہ بولا "بابا، اخبار والوں کی بات مت کرو۔ کیا ہم جانتے نہیں کہ جو کچھ اخباروں میں شائع ہوتا ہے، کیسے شائع کرایا جاتا ہے۔ ہمارے تعلقات بھی ہیں اخبار والوں سے۔ وہ ہمیں اندر کی بات بھی بتا دیتے ہیں۔ ہمارا ایک بندہ اخبار والوں کے ساتھ اچھے تعلقات بنا کے رکھتا ہے۔ تم اسے ہمارا پی آر او سمجھ لو۔ وہ سب کو خوش رکھتا ہے۔ سب کو موقع محل دیکھ کے تحفے تحائف دیتا رہتا ہے۔ ابھی کل ایک کالم نویس کی شادی کی سلور جوبلی سالگرہ تھی۔ ہم نے کیک کے ساتھ اس کی بیوی کے لیے سونے کا ایک سیٹ بھیج دیا۔ اس کالم نویس کیا نام ہے اس کا۔ حقی یزدانی، اس کے لیے ایک امپورٹیڈ سوٹ پیس بھیجا۔"

میں نے کہا "میں مانتا ہوں کہ ..."

اس نے میری بات کاٹ دی "تمہارا تو معاملہ ہی سب سے الگ ہے۔ تمہارا اپنا اخبار ہے۔"

میں نے کہا "میرا ذاتی اخبار تو کوئی نہیں۔"

وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا "ذاتی ہی سمجھو۔ اس کی جو ایڈیٹر ہے، وہ تمہارے قبضے میں ہے۔"

میں نے کہا "آپ شبنم کی بات کر رہے ہیں؟"

"اور کون ہے جس کا کوئی نام لے۔ ہم نے کسی داشتہ کو اتنا وفادار نہیں دیکھا۔ اسے ذرا خیال نہیں اپنی پوزیشن کا۔"

میں نے کہا "پیر سائیں۔ شبنم نے اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں لکھا۔ یہ سب پہلے لندن کے اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک فیصد بھی جھوٹ نہیں کہ چھ لاکھ پاؤنڈز کا وہ مال جو یہاں سے رب نواز نے لندن میں اپنے ایجنٹ جیمس پونڈ نیبی جی کو بھیجا تھا، اور جو درحقیقت تمہارا تھا، یہ اب معلوم ہوا، وہ چوری ہو گیا تھا۔"

وہ شکی لہجے میں بولا "تم اس کی قیمت وصول کر چکے تھے؟"

میں نے کہا "آدھی قیمت۔ اور اس کے بعد مال سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ اس کو بحفاظت رکھنے کا ذمے دار میں نہیں جی تھا۔ اب تو لندن کی پولیس اسے گرفتار کر چکی ہے اور اس کے خلاف ثبوت خود جی کی بیوی نے فراہم کر دیا ہے کہ مجھے تین لاکھ پاؤنڈز سے محروم کرنے کا سارا پلان خود جی نے ہی بنایا تھا۔ بظاہر وہ میرا ہمدرد اور دوست بنا ہوا تھا۔ بلکہ محافظ بن کے میرے ساتھ گیا تھا۔"

"بابا، وہ سب قصہ میں نے پڑھا ہے۔ لیکن اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا" پیر سائیں نے بدمزگی سے کہا۔

میں نے کہا "پیر سائیں، کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے نوادرات میں نے چوری کیے تھے؟"

وہ کشمکش و پیچ میں پڑ گیا "اس مال کا تمہارے علاوہ صرف جی کو علم تھا۔ مگر جی کے پاس وہ مال ہوتا تو اب تک برآمد ہو جاتا۔"

میں نے کہا "تم لارڈ پرائس کو بھول رہے ہو۔"

وہ نفی میں سرہلانے لگا "اسے تم دونوں نے پھنسانے کی پوری کوشش کی تھی لیکن وہ ایسا آدمی نہیں ہے۔ میرا مال یہاں رب نواز نے چوری کیا اور جی کو بھیجا۔ اگر وہ گرفتار نہ ہوتا تو میرے آدمی اس سے بھی پوچھ لیتے لیکن وہ پولیس کی تحویل میں ہے اور اس کے خلاف دوسرے بہت سے سنگین معاملات ہیں۔"

میں نے کہا "اسے اگر سزائے موت نہ ہوئی تو اس کی باقی زندگی جیل میں ہی گزرے گی۔"

وہ بولا "دیکھو شاہ عالم۔ یہ کوئی پرچون کی مارکیٹ نہیں ہے، نوادرات کا بزنس ہے۔ اس میں چوری کا مال کوئی نہیں چھپا سکتا۔ جب مال نکلے گا تو مارکیٹ میں نظر آئے گا۔ اور چور کا بھی پتا چل جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ بات ملک رب نواز سمجھ لیتا تو کبھی مجھ پر شک نہ کرتا۔ اس کے اور میرے تعلقات اتنے خراب نہ ہوتے۔"

پیر سائیں سوچ میں پڑ گیا "کیا واقعی تمہارے ساتھ اس کے تعلقات اتنے خراب ہیں؟"

میں نے کہا "کیا تمہیں ثبوت چاہیے؟"

وہ بولا "تم کیا ثبوت دے سکتے ہو؟"

میں نے کہا "ثبوت تم خود اپنے کانوں سے سن سکتے ہو۔ میری اس سے فون پر بات کراؤ۔ جو گفتگو ہمارے درمیان ہو گی تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ تم تیسرے فون پر ہماری باتیں سنو یا ٹیپ کر لو۔"

وہ کچھ قائل ہوا۔ اس نے دلاور کی طرف دیکھا "میرا خیال ہے کہ ہم اندر چلتے ہیں۔"

اے ایس پی دلاور شاہ کے ساتھ ہی پیر سبحان شاہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم اس بیٹھک میں آ گئے جو صفائی کے بعد اب پھر بزم آرائی کے لیے تیار تھی۔ پیر سائیں اس قالین پر بیٹھ گیا جو اس کے لیے مخصوص تھا۔

اس نے دلاور شاہ سے کہا "رب نواز کا فون ملاؤ۔"

دلاور نے تعمیل کی اور چند سیکنڈ سننے کے بعد ریسیور رکھ دیا "ابھی یہ لائن بزی ہے۔ میں دوسرے فون پر دیکھتا ہوں۔"

پیر سبحان شاہ نے ریسیور پر ہاتھ رکھ دیا "یہاں سے ہم بات سنیں گے، تم اندر جا کے فون ملاؤ۔ اور کسی کو چائے کے لیے بولو۔"

دلاور چلا گیا تو میں نے کہا "پیر سبحان شاہ۔ تم شاید اسی لیے کامیاب ہو کہ خدا نے تمہیں ذہانت کے ساتھ صحیح قوتِ فیصلہ بھی عطا کی ہے۔ تم معقول بات سن سکتے ہو اور سمجھ لیتے ہو۔"

اپنی تعریف سن کر کون خوش نہیں ہوتا۔ پیر سبحان شاہ نے میری بات کو خوشامدانہ مطلب برآری کا انداز نہیں سمجھا تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ گفتگو کے کسی مرحلے میں نہ میری خود اعتمادی میں کمی آئی تھی اور نہ میں نے اپنے خوف کو ظاہر ہونے دیا تھا۔

"شاہ عالم۔ نہ پیری مریدی کے معاملات جذبات سے چلتے ہیں اور نہ کاروبار کے" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا "پیر سائیں، ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو" اس نے کہا۔

"تمہارا مال یہاں لاہور میں چوری ہوا تھا۔ تمہیں کیسے شک ہوا کہ یہ مال وہی ہے جو لندن پہنچا اور وہاں چوری ہوگیا۔ تم نے وہ مال دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور جب تک مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش نہ ہو۔ دیکھو گے بھی نہیں۔"

وہ عیاری سے مسکرایا "میرے پاس مال کی ایک فہرست تھی۔ بلکہ پورا رنگین تصویروں والا کیٹلاگ ہے' تم دیکھو گے؟"

میں نے کہا "ضرور دیکھوں گا۔"

پیر سائیں اندر گیا اور چند منٹ بعد واپس آیا تو البم اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس وقت تک چائے بھی آگئی تھی۔ کسی وجہ سے دلاور شاہ کو ملک رب نواز کا فون ملانے میں ناکامی ہوئی تھی چنانچہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی آبیٹھا تھا۔ چائے پیتے ہوئے میں نے البم کے صفحات کھول کے ہر تصویر کو دیکھا۔ ایسا ہی ایک کیٹلاگ مجھے لندن میں جی نے بھی دکھایا تھا۔ جو اس کو یقیناً ملک رب نواز نے بھیجا ہوگا۔

میں نے کہا "میں یہ البم دیکھ چکا ہوں۔"

"کہاں دیکھ چکے ہو؟" پیر سبحان نے پوچھا۔

میں نے کہا "مال کے ساتھ۔"

"ہاں اس۔۔۔ نے دوسرا بنوایا ہوگا" اس نے ملک رب نواز کے نام کی جگہ ایک زوردار گالی استعمال کی۔ "جب مال چوری ہوگیا تو میں نے اس کیٹلاگ کی سو کاپیاں بنوا کے لندن اور پیرس' روم' جنیوا اور دنیا کے دس بڑے بڑے شہروں کے آرٹ ڈیلرز کو بھیج دی تھیں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اب چوری کا مال دنیا میں کہیں بھی فروخت کے لیے پیش کیا جائے' مجھے معلوم ہوجائے گا۔ ہر شہر کے دس بڑے آرٹ اینڈ کرافٹ اور اینٹیکس کے ڈیلرز نے یہ کیٹلاگ شہر کے سو ایجنٹوں کو دکھائی ہوں گی۔ اس طرح دنیا بھر کے ایک ہزار ایجنٹوں نے چوری ہونے والے مال کو پہچان لیا ہوگا۔ مجھے تو رب نواز پر حیرانی ہے کہ اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟ عام چور مرغی تو چرا سکتا ہے۔ چڑیا گھر کا ہاتھی یا زیبرا کیسے چرا سکتا ہے؟"

"شاید اسے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ تم ایک کیٹلاگ تیار کرا چکے ہو" میں نے کہا۔

"ہاں' یہی ہوا شاید۔ تم جانتے ہو یہ مال ایک دن میں جمع نہیں ہوتا۔ اس میں کئی ہفتے بعض اوقات کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔ میرے پاس جیسے جیسے مال آتا ہے میں اس کے رنگین فوٹو تیار کرالیتا ہوں۔ پھر ان سب کو ایک البم میں لگا دیتا ہوں۔ اس کے بارے میں ضروری معلومات اور حوالے جمع کر کے کیٹلاگ بن جاتا ہے۔ لندن کے ایک ایجنٹ نے یہ مال دیکھا اور پہچان لیا۔"

میں نے کہا "اوہ۔ تم اس ایجنٹ کی بات کر رہے ہو جو لارڈ پرائس کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس نے بتادیا تھا کہ چوری کا مال لندن میں ہے۔"

"ہاں۔ لیکن اس ایجنٹ نے اپنے کمیشن کے لالچ میں یہ بات پہلے لارڈ پرائس کو نہیں بتائی تھی۔ جب سودا ہوگیا تو لارڈ پرائس پر انکشاف ہوا کہ وہ چوری کا مال خرید چکا ہے۔ وہ اس کی آدھی قیمت بھی ادا کرچکا تھا۔ اس نے باقی آدھی قیمت جی کو ادا کرنے سے انکار کردیا۔ یہ بھی حیرانی کی بات ہے کہ نہ جی نے میرے چوری ہوجانے والے مال کے بارے میں سنا تھا اور نہ لارڈ پرائس نے' حالانکہ دونوں لندن کے ہر ڈیلر اور ایجنٹ سے واقف ہیں۔ خیر' جی نے لارڈ پرائس کے الزام کو جھوٹ قرار دیا اور کہا کہ ایجنٹ تو سارا مال دیکھ چکا ہے۔ اس نے مال کو چوری کا نہیں بتایا اور وہ کوئی عام یا نیا ایجنٹ نہیں۔ پرانا تجربہ کار آدمی ہے۔ لارڈ پرائس نے اس ایجنٹ کو بلا کے پوچھا تو اس نے تسلیم کرلیا کہ مارکیٹ میں ایک ایسی البم موجود ہے جس میں اس سامان کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ لارڈ پرائس اتنا مشتعل ہوا کہ اس نے ایجنٹ کو گولی ماردی۔ اور بعد میں اس کی لاش غائب کرانے کی کوشش میں پکڑا گیا۔"

"لارڈ پرائس نے تین لاکھ پاؤنڈز مجھے ادا کیے تھے اور مزید تیس ہزار اس ایجنٹ کو۔ اور اس کے بدلے میں چوری کا مال خریدا تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

"شاید وہ تمہیں اس معاملے میں ملوث نہیں سمجھتا تھا۔"

میں نے کہا "میں ملوث تھا بھی نہیں۔ مال جی کا تھا۔ جی نے ایک ایجنٹ کے ذریعے فروخت کرادیا۔ اس کے پاس بھی مال لاہور سے آیا تھا اور ملک رب نواز نے بھیجا تھا۔ میں تو صرف درمیان کا آدمی تھا جو پہلے بھی قیمت وصول کرتا تھا اور آگے پہنچا دیتا تھا۔"

"کیا تم بعد میں اس سے ملے تھے؟"

میں نے کہا "میں اس سے اسپتال میں ملا تھا جہاں وہ دل کا دورہ پڑنے کے بعد داخل ہوا تھا۔"

پیر سبحان شاہ بولا "شاید اسے دل کا دورہ بھی اسی لیے پڑا ہوگا۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے اس دورے کا یہی سبب ہو مگر وہ دل کا پرانا مریض ہے۔ اس کی حالت خاصی نازک تھی۔ وہ کسی وقت بھی مرسکتا ہے۔ جی پولیس کی تحویل میں ہے اور تمہارے مال کا کچھ پتا نہیں' اب تم کیا کرو گے؟"

"میں انتظار کے سوا کیا کرسکتا ہوں۔ جس نے بھی وہ چوری کا مال چرایا ہے' وہ کبھی نہ کبھی اس کو بازار میں لائے گا اور پکڑا جائے گا۔"

میں نے کہا "تمہیں کم از کم مجھے شک سے بری کردینا چاہیے۔ میں پاکستان آگیا ہوں اور میرا واپس جانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں اس لیے بھی بے قصور ہوں کہ مجھے یہاں آنے کے بعد اصل بات معلوم ہوئی۔ جی نے اور ملک رب نواز نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ تو الٹا مجھے ملزم بنا رہا ہے۔"

"اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اصل چور جی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ چوری کا مال ہے۔ اس کے باوجود جی نے مال کا سودا کیا۔ حالانکہ یہ بات چھپ نہیں سکتی تھی۔ وہ بعد میں پکڑا جاتا لیکن اس نے لارڈ پرائس کو کچھ نہیں بتایا اور سودا کرلیا۔ آدھی رقم تم نے وصول کرلی مگر باقی آدھی جی کے ہاتھ میں آنے سے پہلے یہ راز فاش ہوگیا۔ جی کو ضرور پتا چل گیا ہوگا کہ وہ ایجنٹ اپنے کمیشن کے لالچ میں مارا گیا۔ اگر وہ لارڈ پرائس کو بتادیتا کہ مال چوری کا ہے تو سودا ہی کہاں ہوتا۔ اس ڈر سے کہ مارکیٹ میں ساکھ خراب نہ ہو' جی نے خود بھی چوری کا مال غائب کردیا۔ نقصان ہوا صرف لارڈ پرائس کا مگر وہ بعد میں جی سے پورا کرلے گا۔ ابھی تو جی اس چوری کے مال کو چھپا کے بیٹھا رہے گا۔ سال دو سال یا اس سے بھی زیادہ۔ پھر اسے تھوڑا تھوڑا کرکے مختلف راستوں سے نکالے گا۔"

میں خاموشی سے پیر سبحان شاہ کی باتیں سنتا رہا۔ اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ چوری ہونے والا سارا مال بحفاظت لندن کے ایک گھر میں موجود ہے جس کے بارے میں نہ جی کو معلوم ہے اور نہ لارڈ پرائس کو۔ اس کے بارے میں سونی عرف گینی جانتی ہے۔ اس کا شوہر عاقل جانتا ہے یا میں جانتا ہوں۔ اور یہ کہ اب وہ مال کبھی کسی مارکیٹ میں سیل کے لیے پیش نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ ایک امانت کے طور پر حکومت پاکستان کے حوالے کردیا جائے گا۔

لیکن یہ کام کیسے ہوگا؟ ابھی اس سوال کا میرے پاس بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ اب یہ کام انتہائی خطرناک ہوگیا تھا۔

اے ایس پی دلاور شاہ نے ٹیلی فون ملانے کی ذمے داری کسی ملازم کو سونپ دی تھی جو شاید مسلسل رب نواز کا نمبر ری ڈائل کرنے میں مصروف تھا۔ اچانک اس نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا "پیر سائیں' نمبر مل گیا ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "میں ادھر سے بات کرتا ہوں' آپ یہاں سنیں۔"

وہ ایک ہی فون تھا جس کی ایکس ٹینشن مغربی انداز کے ڈرائنگ روم میں بھی تھی اور مشرقی طرز کی بیٹھک میں بھی۔

میں نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو!"

دوسری طرف سے رب نواز نے کہا "شاہ عالم! کہاں سے بول رہے ہو تم؟"

میں نے کہا "اپنے منہ سے۔ کیا تم کہیں اور سے بول رہے ہو؟"

اس نے یہ مذاق پسند نہیں کیا "میرا مطلب ہے تم کہاں ہو اس وقت؟"

میں نے کہا "میں جہاں بھی ہوں خیریت سے ہوں۔"

"تم اپنے ہوٹل سے بات کر رہے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

وہ بگڑ گیا "فرق تمہیں نہیں پڑتا۔ آخر تم یہ کیا ڈراما کر رہے ہو پُراسرار گمشدگی کا۔ اخبار والے سب کیا لکھ رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میں نے اخبار نہیں دیکھا۔"

"اخباروں میں تمہارے اغوا ہوجانے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا تھا مگر میں نے شبنم سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ تمہیں پولیس نے گرفتار کرلیا ہے۔"

میں نے کہا "شاید۔ لیکن ابھی میں کسی تھانے میں نہیں ملوں گا۔ تم یہ نہیں پوچھو گے کہ مجھے کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہے؟"

"تمہارے خلاف پرانے کیس کی فائلیں پھر کھل گئی ہوں گی۔"

"اتنے انجان مت بنو رب نواز۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔"

وہ برہمی سے بولا "فضول باتیں مت کرو۔ دھوکا تم نے کیا ہے میرے ساتھ اور اب تم نے کوئی نیا کھیل شروع کردیا ہے۔"

میں نے کہا "تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا کہ وہ مال چوری کا تھا؟"

وہ اس سوال کے لیے یقیناً تیار نہ تھا "کون کہتا ہے کہ..."

میں نے اس کی بات کاٹ دی "رب نواز' تم نے چوری کا مال بیچا تھا جی کو۔؟"

"یہ غلط ہے" اس نے پُر اعتماد رہنے کی کوشش کی۔

"تم نے جی کو بھی ڈبل کراس کیا رب نواز۔ اسے بھی نہیں بتایا کہ یہ مال چوری کا ہے۔ وہ اسے بازار میں لے گیا۔"

"تمہیں ضرور کسی نے میرے خلاف بھڑکایا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے ایک شرمناک گالی دی "تم ایک گھٹیا چور ہو۔ تم نے سب کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ تم کیا سمجھتے تھے' یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہوگی کہ جس مال کو تم باپ کا مال سمجھ کر لندن کی مارکیٹ میں لے گئے تھے اس کے بارے میں حقیقت کبھی سامنے نہیں آئے گی۔"

وہ چلانے لگا "تم اپنا جرم میرے سر تھوپ رہے ہو۔ وہ مال تم نے چوری کیا ہے' تم نے اور جی نے مل کے چوری ڈکیتی کا سارا ڈراما رچایا تھا' چور تم ہو۔"

میں نے اسے مزید گالیاں دیں "مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ وہ مال کس کا تھا؟"

"وہ میرا مال تھا۔"

"تمہارے بھونکنے سے میں قائل نہیں ہو سکتا کتے۔ وہ مال پیر سبحان شاہ کا تھا" میں نے دھاڑ کے کہا۔

وہ ایک دم ٹھنڈا پڑ گیا "دیکھو۔ تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ لیکن تم میرے پاس آؤ' میں تمہیں اصل بات بتا دوں گا۔"

"اصل بات تو پتا چل گئی ہے مجھے۔ تم نے بہت گھٹیا حرکت کی ہے رب نواز۔ جی میں اور تم کب سے ساتھ تھے۔ تم نے ہماری عزت کا بھی خیال نہیں کیا۔ تم نے اپنی ہی نہیں' مارکیٹ میں میری اور جی کی ساکھ بھی خراب کی۔"

شاید رب نواز سمجھ گیا کہ اب اس کی باتوں کا جادو مجھ پر نہیں چلے گا۔ وہ لہجہ بدل کے بولا "ایسی باتیں فون پر نہیں ہونی چاہئیں۔ تم ملو گے تو میں بتا دوں گا۔"

"اب ہم کبھی نہیں ملیں گے رب نواز۔ ذرا سوچو کہ تمہارے لالچ کی وجہ سے کتنی خرابی ہوئی۔ مجھے جی کا کوئی افسوس نہیں' لیکن تمہارے جرم کی سزا ایک ایجنٹ کو ملی۔ وہ اپنی جان سے گیا۔ لارڈ پرائس کو ہارٹ اٹیک ہوا۔"

"دیکھو شاہ عالم! ہم آرام سے اس مسئلے پر بات کریں گے۔"

میں نے چلا کے کہا "لعنت اس پر جو پھر تم سے بات کرے' جو تمہاری شکل بھی دوبارہ دیکھے وہ اپنے باپ کا نہیں رب نواز۔ تم نے بہت بڑا دھوکا دیا مجھے اور الزام بھی مجھے دیتے رہے۔ مجھ پر کبھی بھروسا مت کرنا۔ میں آج سے تمہارا دوست نہیں دشمن ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور پٹخ دیا۔

میں نے رب نواز سے وہی کہا تھا جو مجھے کہنا چاہیے تھا لیکن اس گفتگو نے پیر سبحان شاہ کو میری بے گناہی کا قائل کر لیا تھا' اسے یقین آگیا تھا کہ رب نواز سے کاروباری تعلقات ختم کرنے کے معاملے میں جو کچھ میں نے اے ایس پی دلاور شاہ سے کہا تھا' جھوٹ نہیں تھا۔ جب میں واپس ان کے پاس گیا تو وہ آپس میں سر جوڑے کچھ صلاح مشورہ کر رہے تھے۔

میں نے کہا "اب تو آپ کو یقین آگیا؟"

پیر سبحان شاہ نے سر ہلایا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رب نواز نے تمہارے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تم اس کے پرانے ساتھی ہو؟"

میں نے کہا "لالچ آدمی کو اندھا کر دیتا ہے۔"

"اگر وہ چوری کا مال مارکیٹ میں آجاتا تو رب نواز کی ساکھ کا بیڑا غرق ہو جاتا۔ اس سے کوئی سودا نہ کرتا۔"

میں نے کہا "شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ اس نے خود ہی وہ مال ہٹا لیا اور مشہور کر دیا کہ مال چوری ہو گیا۔ میں اب اس کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔"

"تم اب کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "ابھی میں نے سوچا نہیں۔ میں اپنا بزنس بھی کر سکتا ہوں اور اگر آپ کے ساتھ کوئی بات بن جائے تو کیا بات ہے۔"

وہ بولا "بات بنانا بچوں کا کھیل نہیں ہے بابا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی تمہاری آپس کی چال ہو۔ دشمن پر اتنی جلدی اعتبار کر لینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ اس کے علاوہ' ابھی تم پر پولیس کیس ہیں۔"

میں نے خفت کا اظہار کیا "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"تم نے ہمارے ایک آدمی کو بھی پھنسا دیا ہے شاہ عالم" اس نے شکایتی انداز میں ناراضی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا "وہ بے وقوف آدمی تھا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"وہ تمہیں کیا بتاتا؟" دلاور شاہ نے کہا۔

میں نے اے ایس پی دلاور شاہ کی طرف دیکھا "آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے تو مجھے ایک پیغام بھیج دیتے۔ مجھ سے کسی نے بات نہیں کی۔"

"ہمیں معلوم تھا تم نہیں آؤ گے" دلاور شاہ بولا۔

میں نے کہا "تم نے بہت رسک لیا۔ تمہیں پریس کانفرنس چھوڑ کے جانا پڑا۔ صابر علی میرے ہاتھوں مارا جاتا تو یہ اپنے دفاع میں قتل کہلاتا۔"

پیر سبحان شاہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ "ابھی ہم اس کے لیے کچھ ضرور کریں گے۔ تم نے بہت زیادتی کی۔ اس پر قاتلانہ حملے کا کیس بھی بنا دیا۔ اسلحہ ایکٹ الگ لگا دیا۔ وہ بڑی مشکل میں پڑ گیا ہے۔ جیل خانے سے تو ہم بچا لیں گے اسے مگر نوکری گئی اس کی۔"

میں نے کہا "پیر سائیں۔ آپ کی مہربانی ہو تو اسے نوکریوں کی کیا کمی۔ میں بھی کوشش کروں گا۔"

"تم نے یہ جوڈو کراٹے کب سیکھا؟"

میں نے کہا "ابھی لندن میں۔"

اس کے ساتھ ہی میری اپنے میزبانوں کے ساتھ ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی۔ اس سے میری حیثیت پیر سائیں کے دشمنوں جیسی نہیں رہی۔ میں اس رات پیر سبحان شاہ کا مہمان بن کے رہا۔ ہم نے کھانا بھی ساتھ ہی کھایا مگر دسترخوان پر دیگر لوگوں کی موجودگی میں ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس وقت دلاور شاہ بھی موجود نہیں تھا مگر رات گیارہ بجے کے بعد جب میں سونے کے موڈ میں تھا' وہ پھر نمودار ہو گیا۔ یہ اس کی بہن کا گھر تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے وہ زیادہ وقت یہاں گزارتا ہے۔

اس نے مجھے مطلع کیا "صبح تمہیں سرکاری مہمان خانے میں منتقل کر دیا جائے گا۔"

میں نے کہا "کوئی مجبوری ہے؟"

وہ بولا "ہاں۔ وہ جو تمہاری کنجری ہے نا۔ اس نے وخت ڈال رکھا ہے شاہ عالم کو غیر قانونی طور پر اغوا کیا گیا اور گرفتاری کے وارنٹ ہونے کے باوجود کسی تھانے میں نہیں رکھا گیا۔"

میں نے کہا "آئندہ میرے سامنے شبنم کا ذکر کرو تو کوئی غلط لفظ استعمال مت کرنا۔ اس وقت میں نے تمہارے عہدے کا نہیں پیر سائیں کے ساتھ تمہارے رشتے کا لحاظ کیا۔"

وہ برا سا منہ بنا کے بولا "ورنہ تم کیا کرتے؟"

میں نے کہا "محاورہ تو ہے دن میں تارے دکھانا۔ میں تمہیں رات میں سورج دکھا دیتا۔"

"دن میں تارے ہم دکھائیں گے تمہیں" وہ مجھے دھمکی دے کر اٹھ گیا۔

پیر سبحان شاہ نے صحیح کہا تھا کہ ایک خرابی نے مجھے بچا لیا۔ اگر اے ایس پی دلاور شاہ کے پاس میری گرفتاری کے وارنٹ نہ ہوتے تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ میں پیر سائیں کا مجرم تھا۔ مجھے اس کی نجی جیل میں ڈالنے والے کسی رعایت کا مستحق نہ سمجھتے۔ وہ مجھے پیر سائیں کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے میرا دماغ درست کرتے اور یہ کام عجلت میں نہ ہوتا۔ سبحان شاہ کو اپنے پیری مریدی کے سیاسی اور کاروباری مشاغل سے فرصت ملتی تو وہ پوچھتا کہ بابا وہ شاہ عالم کو منگوایا تھا ہم نے۔ وہ کدھر گیا۔ لاؤ آج اس کی بھی مزاج پرسی کر لیں۔

لیکن شاہ عالم کے دو سال پرانے مقدمات کی فائلیں پھر کھولی گئیں تو اس کی گرفتاری کے احکامات از سرِ نو جاری کیے گئے کیونکہ عدالت کے ریکارڈ کے مطابق شاہ عالم ایک مفرور مجرم تھا۔ اس کے خلاف سماعت کا سلسلہ پھر وہیں سے شروع ہونا لازمی تھا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

میری گرفتاری سے پیر سبحان کو بھی بڑی دلچسپی تھی۔ گرفتاری کے بعد اس کا برادر ان لا اے ایس پی دلاور شاہ اپنی نگرانی میں مجھ سے خصوصی تفتیش کرتا اور مجھ سے مالِ غنیمت برآمد کرا کے اپنے جیجاجی کی نظروں میں مزید سرخرو ہوتا۔ چنانچہ اس نے ملزم شاہ عالم کی گرفتاری کے احکامات پر عمل درآمد کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لی تھی۔ سرکاری قواعد و ضوابط کے مطابق وارنٹس کے اجرا میں دو دن گزر گئے تھے مگر خود کو پولیس کا اعلیٰ افسر سمجھنے کے باوجود دلاور شاہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ مجھے صحافیوں کے سامنے یا ہوٹل کے اندر سے وارنٹ دکھائے بغیر گرفتار کر سکتا۔

تاہم اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ کہیں میں پھر قانون کو جُل دے کر غائب نہ ہو جاؤں' اس نے میری نگرانی جاری رکھی تھی اور اپنے ایک خاص آدمی صابر علی کو بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد جو ہوا میری خوش قسمتی کے باعث ہوا۔ صابر علی نے ایس ایس پی کا نام لینے کی غلطی کی اور اس سے پیچھا چھڑانے اور اس کو سزا دینے کے لیے مجھے اس کے خلاف ایک جھوٹا کیس کھڑا کرنا پڑا۔

اس کے بعد اچانک پیر سبحان شاہ کو معلوم ہوا کہ مفرور ملزم شاہ عالم کی سرکشی قانون کی حد سے بڑھ گئی ہے اور اس کی پیر سائیں کے ایک مرید خاص کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچانے کی جھوٹی سازش بھی کامیاب ہو گئی ہے چنانچہ پیر سائیں نے حکم دیا کہ عدالت میں پیشی سے پہلے اس گستاخ کو ہمارے سامنے پیش کیا جائے۔ ہم اسے بتاتے ہیں کہ پیر سبحان شاہ سے ذاتی عداوت پالنا کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے۔

لیکن پیر سائیں کے سامنے پیشی میرے لیے ایک بہانہ بن گئی' مجھے ہوشمندی سے کام لیتے ہوئے ذاتی عداوت کے الزام کی صفائی پیش کرنے کا موقع مل گیا۔ شاہ عالم کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوچکے تھے۔ اسے گرفتار ظاہر کرنا بھی ناگزیر تھا۔ یہ وارنٹ نہ ہوتے تو میں پیر سبحان شاہ کی نجی جیل میں اسی طرح بے بس پڑا رہتا جیسے یاسر ایاز تھا۔

یہ میرا ہوٹل کے باہر سے اچانک غائب ہوجانا ایک پُراسرار معاملہ بن گیا تھا۔ فرید عباسی یا شبنم نے اپنے تعلقات کی ڈوریاں ہلا کے یہ معلوم کرلیا ہوگا کہ شاہ عالم کے وارنٹ اے ایس پی دلاور شاہ کے حوالے کیے گئے تھے۔ مجھے اغوا ہوتے کسی نے نہیں دیکھا تھا چنانچہ یہ فرض کرلیا گیا کہ شاہ عالم کو پولیس نے ہوٹل کے باہر سے اٹھالیا ہوگا۔ مگر اس کے بعد ملزم کو اسی علاقے کے تھانے میں ہونا چاہیے جس میں ہوٹل واقع تھا۔ اس تھانے کے روزنامچے میں شاہ عالم کے نام کا اندراج بھی ہونا چاہیے لیکن اس رات میں پیر سبحان شاہ کی حویلی میں تھا تو تھانے میں کیسے مل سکتا تھا۔

میرے دوستوں میں قانونی کارروائی کو سمجھنے والا صرف فرید عباسی تھا یا شبنم تھی جو لاقانونیت کے خلاف آواز اٹھاسکتی تھی۔ انہوں نے ایک کے بعد دوسرے تھانے دیکھے ہوں گے اور صبح کے اخبارات میں یہ خبر دے دی ہوگی کہ پولیس نے کیسے اغوا کے انداز میں شاہ عالم کو گرفتار کیا اور پھر کہیں غائب کردیا کیونکہ اسے لاہور کے کسی تھانے میں نہیں رکھا گیا ہے۔ خبر میں مطالبہ کیا گیا ہوگا کہ حکومت شاہ عالم کا اتا پتا بتائے ورنہ اس معاملے میں عدالتِ عالیہ سے رجوع کیا جائے گا۔

یہ اسی دباؤ کا نتیجہ تھا کہ مجھے اگلی صبح پولیس کی ایک گاڑی میں ہتھکڑی لگا کے مسلح نفری کے ساتھ تھانے لے جایا گیا اور میری گرفتاری کا اندراج گزشتہ تاریخ میں چوبیس گھنٹے قبل دکھادیا گیا۔ انسپکٹر سلامت علی نے خاصی سرد مہری اور مایوسی کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ اگرچہ مجھے پیر سائیں کے ڈیرے سبحان اللہ ہاؤس سے گھما کے لایا گیا تھا مگر اب میری غیر سرکاری حیثیت بدل گئی تھی۔ میں اب پیر سائیں کا معتوب ملزم نہیں تھا۔ میں اپنی ذاتی حیثیت کے علاوہ سبحان اللہ ہاؤس کے معزز مہمان ہونے کا اعزاز بھی حاصل کرچکا تھا چنانچہ تحقیق و تفتیش کے نام پر مجھے ہر عذاب دینے کی ساری حسرت باقی رہ گئی تھی اور اس عذاب سے نجات کے لیے لواحقین سے نذرانے وصول کرنے کی اور سرکاری مہمان خانے میں گھر جیسے آرام و آسائش کے اسباب فراہم کرنے کا معاوضہ وصول کرنے کی آرزو بھی پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

مزید خرابی یہ ہوئی کہ شبنم کے ایما پر تھانے کے باہر موجود رہنے والے ایک رپورٹر نے میری تشریف آوری کے ساتھ ہی ایس ایچ او صاحب کو اپنی صورت دکھادی اور یہ خوش خبری بھی سنادی کہ اطلاع آگے سب کو پہنچادی گئی ہے کہ شاہ عالم کس تھانے میں ہے۔

انسپکٹر سلامت علی کا موڈ اور خراب ہوگیا "میں تھانے میں کسی صحافی کو دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"کوئی صحافی بھی آپ کو تھانے میں دیکھنا نہیں چاہتا" رپورٹر نے بڑی عاجزی کے ساتھ اعتراف کیا۔ "لیکن اپنی اپنی پیشہ ورانہ مجبوریاں ہیں۔ نہ میں آپ کو تھانے سے نکال سکتا ہوں اور نہ آپ مجھے۔"

"آخر تم کیا چاہتے ہو؟" سلامت علی زچ ہو کے بولا۔

"میں شاہ عالم سے ملنا چاہتا ہوں" رپورٹر نے کہا۔

میں اندر والے ایک کمرے میں بیٹھا ان کی بحث سنتا رہا۔ مگر تھانا انچارج نے اس کی ایک نہیں سنی اور اس کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگر مجھے عام حالات میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ رکھا جاتا تو وہاں رپورٹر بہ آسانی پہنچ جاتے چنانچہ ایس ایچ او نے مجھے تھانے کے عقبی حصے میں الگ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے میرے ہاتھوں سے ہتھکڑی بھی نہیں کھولی اور اس کی زنجیر کو ایک کھڑکی کی آہنی سلاخوں کے ساتھ لاک کردیا۔

میرے احتجاج پر اس نے واضح کیا کہ میرے بارے میں افسرانِ بالا کے احکامات کیا ہیں۔ شاہ عالم ایک خطرناک مجرم ہے جو خالی ہاتھوں سے بھی ہتھیار کا کام لیتا جانتا ہے۔ اسے کھلا چھوڑنے کا خطرہ مول نہ لیا جائے' اسے جہاں بھی لے جایا جائے' مسلح نفری کے ساتھ لے جایا جائے اور اگر ملزم فرار کی کوشش کرے تو اسے بلا تامل گولی ماردی جائے۔

مجھے کھڑکی کے قریب ہی ایک چارپائی دے دی گئی جس پر میں بیٹھ یا لیٹ سکتا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ کی کلائی کو ہتھکڑی نے جکڑ رکھا تھا لیکن میں اپنا دایاں ہاتھ استعمال کرسکتا تھا۔ ہتھکڑی سے منسلک زنجیر کوئی دو گز لمبی تھی۔ کھڑکی کے ساتھ ہی وہ باتھ روم تھا جو تھانا انچارج صاحب کے ذاتی استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ میں اس دروازے سے اندر داخل ہو کے اپنا بایاں ہاتھ باہر پھیلاتا تو اس قابل ہوسکتا تھا کہ ڈبلیو سی بھی استعمال کرسکوں۔

فوری طور پر میں کچھ بھی کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

تھانا انچارج مجھے ایک ماتحت سب انسپکٹر کے سپرد کرکے چلا گیا تھا لیکن تھانے کے اندر کا ماحول میرے لیے سخت معاندانہ تھا کیونکہ میں نے اسی تھانے کے ایس آئی صابر علی کو جھوٹے الزام میں گرفتار کرادیا تھا اور وہ عملاً آزاد ہونے کے باوجود حوالات میں بند تھا۔ کم سے کم روزنامچے کا اندراج یہی ظاہر کرتا تھا۔

لیکن مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔ ایک رپورٹر مجھے تھانے میں دیکھ گیا تھا اور اس نے خبر آگے بھی پہنچادی تھی۔ اب اس بات کا بظاہر کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا کہ شاہ عالم کے سیاسی کارکن یا دوست اس سے ملاقات کے لیے جوق در جوق چلے آئیں مگر میرے اپنے دوستوں میں سے رئیس کا فرید عباسی کا اور شبنم کا آنا یقینی تھا۔

صابر علی دس منٹ بعد کہیں سے گھومتا پھرتا نمودار ہوا اور مجھ سے کچھ فاصلے پر دروازے میں ہی ٹھہر گیا۔ "آگیا تو۔" اس نے مجھے ایک گالی دے کے کہا "اب دیکھ تیرا کیا حشر ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "پیار محبت کی باتیں اتنی دور سے مزہ نہیں دیتیں۔ ذرا قریب آکے فرماؤ جو فرماتا ہے۔ میں ذرا اونچا سنتا ہوں۔"

"کھول دیں گے کان کے سوراخ بھی" وہ بولا "سارے سوراخ کھول دیں گے آج ہی۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "سب انسپکٹر صابر علی۔ کل میں نے پیر سبحان شاہ سے بات چیت میں یہ بتادیا تھا کہ تمہارے ساتھ جو بھی ہوا غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور مجھے اس کا افسوس بھی ہے۔"

اس کا چہرہ تاریک ہوگیا "اب کیا فائدہ افسوس کا؟"

میں نے کہا "تم میرے ساتھ ذاتی دشمنی کرکے میرا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مارو۔ میں ایک سیاست داں ہوں اور اس ملک کی سیاست میں سب سے بڑا کردار پیسے کا ہے۔ وہ بھی بہت ہے میرے پاس۔ تمہارے خلاف مقدمہ تو دبانے والے دبا ہی دیں گے۔ نوکری نہ ملے تو میرے پاس آجانا۔ میں تمہیں دگنی تنخواہ پر ملازم رکھ لوں گا۔"

شاید بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اسے اپنی اور میری اوقات کے فرق کا اندازہ بھی ہوگیا اور یہ بھی کہ اس نے میرے ساتھ عام مجرموں والا سلوک کیا تو وہ نقصان اٹھائے گا۔ وہ کچھ کہے بغیر پلٹ کے چلا گیا۔

دس منٹ کے بعد تھانے میں پہلا ٹیلی فون موصول ہوگیا' یہ ایس ایس پی شوکت علی بٹ نے کیا تھا۔ ڈیوٹی افسر تھوڑی دیر بعد آیا تو اس کی صورت پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

"سرجی' آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟"

میں نے کہا "کیا تھانے میں مجرموں کو ان کی ضروریات کے مطابق ہر چیز فراہم کرنے کا انتظام ہے؟"

اس نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا "وہ جی' اپنے ایس ایس پی صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ کا خیال رکھا جائے۔ ہماری تو جناب' کوئی خطا نہیں۔ ہم جو کرتے ہیں قانون کے مطابق کرتے ہیں۔ آپ ناراض مت ہونا۔"

میں نے کہا "اچھا مجھے چائے لادو۔"

آدھے گھنٹے بعد فرید عباسی اور شبنم ایک ساتھ نمودار ہوئے۔ ایس ایچ او صاحب گشت پر گئے ہوئے تھے چنانچہ ڈیوٹی افسر بڑی مشکل میں پڑگیا۔ اس نے ان دونوں کو انچارج صاحب کے کمرے میں بٹھایا اور خود موبائل کے وائرلیس پر رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگیا۔ اس نے کہا۔ "جناب' ہماری مجبوری کا بھی خیال کریں۔ ہم تھانا انچارج صاحب کے آرڈر کے خلاف نہیں جاسکتے۔"

دیکھتے دیکھتے صورتِ حال تبدیل ہوگئی۔ شبنم نے تھانے میں بیٹھے بیٹھے دو فون کیے اور دس منٹ میں تھانا انچارج صاحب گشت سے لوٹ آئے۔ چند منٹ بعد فرید عباسی اور شبنم نے اس کمرے میں قدم رکھا جو میرے لیے خصوصی حوالات کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ وہاں بیٹھنے کے لیے وہی ایک چارپائی تھی۔ وہ میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ فرید عباسی نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا "اس پر دستخط کرو۔"

میں نے کہا "یہ کیا ہے؟"

"تیرا وکالت نامہ" فرید عباسی بولا "اب سارے مقدمات کی سماعت پھر شروع ہوگی۔"

شبنم نے مایوسی سے کہا "تمہارا وفات پانے کا پروگرام تو رہ گیا۔"

میں نے کہا "کچھ عرصے کے لیے مؤخر ضرور ہوگیا ہے مگر بدلا نہیں۔"

فرید عباسی نے کہا "ایک غلط فہمی میں دور کردوں۔ فی الحال تیری رہائی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کوئی بھی عدالت کسی مفرور مجرم کی دوبارہ گرفتاری کے بعد اس کی ضمانت پر رہائی منظور نہیں کرتی۔"

میں نے کہا "وکیل صاحب! جو ایک بار فرار ہوگیا ہو' کیا وہ دوبارہ فرار نہیں ہوسکتا؟"

فرید نے پلٹ کے دیکھا "تھانے میں بیٹھ کے ایسی بات

بالکل نہیں کرنی چاہیے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے ذرا سی دیر ہوگئی نکلنے میں۔"

فرید بولا "میں نے تو دو دن پہلے بتا دیا تھا تجھے یار کہ تیرے خلاف ہزار مقدمات ہیں۔ مزید یہ کہ آپ کی واپسی بھی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اخبارات میں اتنا ڈھول پیٹا جارہا تھا گرفتاری تو حقیقی تھی۔"

میں نے شبنم سے کہا "تم نے واقعی مجھے بہت سپورٹ کیا۔"

"اس سپورٹ سے کیا فائدہ ہوا؟" وہ بولی۔

"یہ فائدہ کیا کم ہے کہ سیاسی حیثیت کچھ نہ ہونے کے باوجود تم نے مجھے ایک وی آئی پی بنادیا اور میرا بھرم باقی رہا ورنہ شاہ عالم واپس آتا تو شاید یہ کوئی خبر بھی نہ بنتی۔" میں نے کہا "اس وقت جو سلوک میرے ساتھ پولیس کی تحویل میں ہورہا ہے' صرف اس لیے اچھا ہے کہ پریس میرے ساتھ ہے۔"

شبنم نے اپنے بیگ سے دو کاغذ نکالے "مجھے تم سے کرائے ناموں پر بھی دستخط کرانے تھے۔"

"یہ کس چیز کے کرائے نامے ہیں؟"

وہ بولی "ایک تو تمہارا آفس ہے۔ اس پر تم ناصر عظیم کے دستخط کروگے اور بیس دن پہلے کی تاریخ ڈالوگے۔ دوسرا اسی آفس کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ ہے۔ دونوں ایک دروازے کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے ہیں مگر کرائے نامے کی رو سے الگ ہیں۔"

میں نے دونوں پر دستخط کردیے تو شبنم نے انہیں اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ فرید عباسی بھی مجھ سے گزرے ہوئے دو دنوں کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں اپنے اغوا سے تھانے میں لائے جانے تک تمام واقعات کی مفصل رپورٹ دی۔

پھر میں نے پوچھا "رئیس کہاں ہے؟"

"ابھی آجائے گا" فرید نے کہا "نیلم تمہاری گرفتاری کی خبر سے بہت اَپ سیٹ تھی۔ اس نے رئیس سے کہا کہ تمہاری پیروی کے لیے وکیلوں کا پورا پینل ہونا چاہیے جس میں لاہور کے سینئر وکلا ہوں۔ رئیس نے مجھ سے کہا تو میں نے نیلم سے بات کی اور اسے تسلی دی کہ احمد اینڈ کمپنی فوجداری مقدمات میں خصوصی شہرت رکھتی ہے اور احمد صاحب کا شمار سینئر ترین وکلا میں ہوتا ہے۔ شاہ عالم پر قتل کے دو مقدمات ہیں جن میں سے ایک تو شاید پہلی دوسری پیشی میں ختم ہوجائے گا کیونکہ خالد عثمان اور خادم مرزا کے دوہرے قتل کا الزام ان کے زندہ سلامت پائے جانے کے بعد بے معنی ہوگیا ہے۔ دوسرے کیس میں شاہ عالم پر اپنے ایک پرانے ساتھی عمورواز کو زہر دے کر قتل کرنے کا الزام ہے مگر یہ بھی بہت کمزور کیس ہے۔ ہم شاہ عالم کو باعزت طور پر بری کرانے میں کامیاب ہوجائیں گے لیکن اس کا سماعت مکمل ہونے سے پہلے فرار ہوکے برطانیہ جانے کا معاملہ زیادہ سنگین ہے۔ وہ دو سال بعد واپس آیا ہے۔ ظاہر ہے' عدالت اس کا بہت سیریس نوٹس لے گی اور اس میں تین سال تک جیل ہوسکتی ہے۔"

"تو نے یہ نیلم کو بتادیا؟"

"اسے پہلے سے معلوم تھا" فرید عباسی بولا "وہ بے وقوف نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ذاتی قانونی معاملات کے لیے اس کا بھی ایک وکیل ہے وہ نیلم کو قانونی پوزیشن بتا چکا تھا۔"

میں نے کہا "اگر قتل کے مقدمات ختم ہوجاتے ہیں تو کیا اس کے بعد بھی میری ضمانت پر رہائی کا کوئی امکان نہیں؟"

فرید نے نفی میں سر ہلایا "دراصل ہمارے پاس کوئی مجبوری کا عذر نہیں۔ فرض کر' کسی کو اپنے علاج کے لیے یا بیوی بچوں کا علاج کرانے کے لیے جانا پڑتا ہے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ اسے عدالت سے اجازت ملنے کی امید نہیں تھی۔ اس لیے وہ مجبوراً بلا اجازت چلا گیا۔ اور عدالت سے درخواست کرسکتا ہے کہ مجبوری کی اس غلطی کو معاف کردے یا کسی کو جان کا خطرہ تھا۔ کوئی یہ کہے کہ مجھے اغوا کرلیا گیا تھا۔ کوئی جھوٹی سچی کہانی سنادے تو ممکن ہے عدالت رحم دلانہ نقطۂ نظر اختیار کرے مگر شاہ عالم کے پاس لندن جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے وہاں دو سال رہا۔"

"شادیاں بھی کرتا رہا؟" شبنم بولی۔

"ہاں۔ اور یہ سب خبریں اخباروں میں شائع ہوئیں۔ ایسی صورت میں عدالت کیسے چھوڑے گی؟"

میں نے کہا "میری زندگی تو خطرے میں تھی۔"

"یہ سب آف دی ریکارڈ ہے۔" فرید عباسی نے کہا "اگر شاہ عالم یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کی جان کو خطرہ ہے تو اس پر لازم تھا کہ یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر لاتا اور درخواست کرتا کہ اس کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ عام طور پر ایسی درخواست کے جواب میں پولیس ہر ملزم کو حفاظتی تحویل میں لے لیتی ہے۔ شاہ عالم ایک سیاست داں تھا اور

اس کو خطرہ مقدمے کے کسی فریق سے لاحق نہیں تھا۔ اپنے سیاسی حریفوں سے تھا۔ شاہ عالم عدالت میں کسی کا نام نہیں لے سکتا تھا۔ لیکن اس بات کا امکان تھا کہ اسے پولیس گارڈ مل جاتے مگر وہ عدالت کو کچھ بتائے بغیر بھاگ کے لندن چلا گیا تھا۔ اب وہ عدالت سے کسی رعایت کی امید کیسے رکھ سکتا ہے۔"

ہم ویسے تو کمرے میں آزادانہ گفتگو کررہے تھے لیکن باہر دوسرے کمرے میں ایس ایچ او صاحب بنفسِ نفیس موجود تھے اور تھانے کے انتظامی امور میں مصروف ہونے کے باوجود ہماری طرف سے بے خبر ہرگز نہیں تھے۔ اس کمرے کی لمبائی چوڑائی مشکل سے دس فٹ ہوگی اور یہ کمرے سے زیادہ ایک اسٹور لگتا تھا۔ اس کمرے سے باہر جانے کا واحد راستہ تھانا انچارج کے کمرے سے تھا۔ کھڑکی صرف ایک تھی اور اس میں ناقابلِ شکست قسم کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور باتھ روم میں کوئی روشن دان تک نہیں تھا جس سے کوئی باہر نکل کے فرار ہوجائے۔ انسپکٹر سلامت علی خود بھی مسلح تھا اور جب تک وہ کمرے میں موجود رہتا تھا' ایک مسلح محافظ باہر والے دروازے سے لگا کھڑا رہتا تھا۔ چنانچہ خطرے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

ایک گھنٹے بعد سلامت علی کا حوصلہ بالآخر جواب دے گیا۔ اس نے اندر آکے طنزیہ انداز میں فرید سے سوال کیا۔ "وکیل صاحب! ایک وکالت نامے پر دستخط کرانے میں آخر کتنا وقت لگتا ہے؟"

فرید نے کہا "مجھے اپنے مؤکل سے قانونی مشورہ بھی کرنا تھا۔"

"مس شبنم! آپ بے شک صحافی ہیں اور ہم بڑی عزت کرتے ہیں آپ کی... لیکن کچھ ہماری نوکری کا بھی خیال رکھو۔ قانونی طور پر آپ کو ملزم سے ملاقات کی اجازت دینے کا میرے پاس کوئی اختیار نہیں۔"

"ہاں... قانونی طور پر" شبنم نے اس سے اتفاق کیا۔ "غیر قانونی طور پر تم اپنے اختیارات کو کیسے استعمال کرسکتے ہو ... اور کرتے ہو' اس کی کوئی حد نہیں۔ پھر بھی تمہارا شکریہ ادا نہ کرنا بداخلاقی ہوگی۔"

وہ بولا "دیکھو جی' شکریے کو دفع کرو۔ بس کسی کو معلوم نہ ہو کہ تھانا انچارج یہاں بیٹھا جھک ماررہا تھا اور اندر وکیل' صحافی سب جمع تھے۔"

ابھی انہیں گئے ہوئے مشکل سے پانچ منٹ ہوئے تھے کہ رئیس نمودار ہوگیا۔ "تھانے دار صاحب! سلاما لیکم!" اس نے عادتاً کہا۔

"کون ہو تم؟" تھانے دار نے اسے غور سے دیکھا "تم کو میں نے پہلے بھی دیکھا ہے۔"

"جنابِ عالی! رئیس ہے میرا نام لیکن بندہ بڑا غریب سا ہوں۔" رئیس نے کہا "خیر سے پولیس میں اپنا اچھی صاحب سلامت ہے۔ آپ جیسے مہربان بہت ہیں۔"

"کام بتاؤ اپنا؟" سلامت علی نے رکھائی سے کہا۔

"سرجی۔ اپنا باس آپ کا مہمان ہے۔"

سلامت علی نے پوچھا "باس۔ کون باس؟"

"شاہ عالم۔ میں ان کا سیکریٹری ہوں۔"

تھانے دار نے کہا "اوئے رئیس اعظم۔ یہ چکر کیا ہے آخر۔ میں نے تو کچھ اور سنا تھا... کہ تم اس فلموں کی ہیروئن نیلم کے سیکریٹری ہو اور تمہارا کچھ چکر ہے اس کے ساتھ؟"

رئیس نے اپنی عاجزی والی اداکاری جاری رکھی "مائی باپ یہ اخبار والے ایسے ہی اڑاتے رہتے ہیں جھوٹ سچ۔"

تھانے دار نے کہا "شاہ عالم حراست میں ہے۔ تم اس سے نہیں مل سکتے۔"

رئیس ہنسنے لگا "سرجی! ملاقات کی اجازت دینے کا اختیار بھی آپ کے پاس ہے۔ ہم تو بس خدمت گزار ہیں۔"

سلامت شاہ کچھ نرم پڑا "اوئے کتنی خدمت کرسکتے ہو؟" "سرکار' آپ کی توقع سے کہیں زیادہ۔ لیکن باس پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔ وہ جس سے چاہے ملے گھر سے بستر اور کھانا منگوالے۔"

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد انسپکٹر سلامت علی نے کہا۔ "کتنے ہیں؟"

"پورے دس عالی جاہ!" رئیس نے کہا اور میں سمجھ گیا کہ اس نے لفافے میں دس ہزار روپے ڈال کے تھانا انچارج کو تھمادیے ہیں۔

ایک منٹ بعد وہ دروازے میں نمودار ہوا اور قریب آکے مجھ سے لپٹ گیا۔ "کیا حال ہے تیرا یار... قسم اللہ کی دو دن ماہی بے آب کی طرح تڑپتے گزارے ہیں۔"

میں نے اسے بے تکلفی سے ایک مکا رسید کیا "ماہی بے آب' جاہل کی اولاد۔"

"ابے رہنے دے اپنی افلاطونیت۔ تجھے کیا پتا ہم سب کی بے تابی کا۔" رئیس میرے پاس بیٹھ گیا "وہ تو میں نے

روکے رکھا نیلم کو ورنہ وہ پتا نہیں کس کس سے بات کرلیتی۔"

میں نے کہا "یہ تونے بڑا اچھا کیا۔ نیلم کا کیا تعلق شاہ عالم سے؟"

"اپن نے تو پیارے جھوٹ بول دیا قسم کھاکے۔ اللہ معاف کرے، مگر اس کے بغیر گزارا کہاں تھا۔ نیلم کو قائل کیا بڑی مشکل سے کہ تونے فون کیا تھا کہیں سے اور یہ کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ کہنے لگی کہ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کھاؤ میری قسم!" تو پیارے بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا اس نے مجھے۔ یار، اس میں تو کوئی غلط بات نہیں ہوسکتی؟ اگر میں نیلم کو بچانے کے لیے اس کی جھوٹی قسم کھالوں؟"

میں نے کہا "میں کوئی مفتی تو ہوں نہیں مگر میرا خیال ہے کہ آدمی کی نیت ٹھیک ہو تو معاف کرنے والا اللہ ہے۔"

"اس کے بعد مجھے بڑی ایکٹنگ کرنی پڑی۔ میں یہ ظاہر کرتا رہا جیسے اب میں ذرا بھی پریشان نہیں ہوں۔ نیلم پوچھتی رہی کہ فون کس وقت آیا تھا۔ میں کہاں تھی، تم نے ریسیو کیا تھا؟ ناصر۔۔۔ شاہ عالم کی آواز سے کیا لگ رہا تھا، وہ واقعی ٹھیک ہے یا کوئی زبردستی اس سے یہ کہلوا رہا تھا؟ آخر اس نے بتایا کیوں نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ بس یار، اس کے سوال تھے اور اپنے جھوٹ، ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے بولے سو جھوٹ۔ پھر بھی آخر میں پھڈا ہو ہی گیا۔ میں نے کہا کہ غیب کا علم نہیں ہے میرے پاس۔ اتنا ہی بتا سکتا ہوں میں جتنا شاہ عالم نے بتایا۔ میرا دماغ مت کھاؤ۔ بس یار، اس کے بعد وہ آگئی عورت ذات کے ہتھیاروں پر۔ رونے لگی سالی!"

میں نے کہا "گالی مت دے اسے میرے سامنے۔"

"ابے یار۔ پرانی عادت ہے؟" وہ خفیف ہوکے بولا۔ "نیلم نے چھڑا دی ہے مگر پھر بھی زبان بہک جاتی ہے۔"

میں نے کہا "قمر نے اور چندا نے بھی تو پوچھا ہوگا؟"

"وہاں میں خود چلا گیا تھا کل۔ وہ جو تیری بہن ہے نا۔۔۔ وہ تو بالکل ہی پاگل ہے۔ رو رو کے برا حال کرلیا تھا اس نے اپنا۔ میں نے چاکلیٹ کا ڈبا دیا تو ایسے چلانے لگی جیسے اس کے مرحوم بھائی کی کوئی نشانی سامنے رکھ دی ہو۔ بڑی مشکل سے اسے سمجھایا کہ سب ٹھیک ہے مگر وہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی۔ اس کے شوہر ڈاکٹر صاحب نے بھی کوشش کی مگر یار، وہ لڑکی بہت ہی جذباتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تو اس سے خود بات کرلے تاکہ اسے تسلی ہوجائے۔ میرا اپنا تو یہی خیال تھا کہ یہ کام ہے پولیس کا۔ وہ تجھے اٹھاکے لے گئے۔"

"آپ کا خیال غلط تھا سیکریٹری صاحب!"

اس کی شکل ہونقوں والی ہوگئی "ابے غلط کیسے تھا؟"

میں نے کہا "مجھے پیر سبحان شاہ نے اٹھوایا تھا۔"

چند منٹ رئیس کو پیر سائیں کی مہمانی کا حال سنانے میں لگے۔ رئیس منہ کھولے سنتا رہا اور اپنے انداز میں تبصرے بھی جاری کرتا رہا۔

"میری گلوخلاصی اس لیے ہوگئی کہ میں نے پیر سائیں کو کاروباری اشتراک کی پیش کش کردی تھی۔ یہ اس نے اپنے کانوں سے سن لیا تھا کہ رب نواز کے ساتھ میرے تعلقات ختم ہوگئے" میں نے کہا۔

"چل یار۔ سب ٹھیک ہوگیا" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کہا "ٹھیک کہاں سب چوپٹ ہوگیا۔ میرا کیا پروگرام تھا لیکن فی الحال تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ مجھے شاہ عالم بن کے ہی رہنا پڑے گا۔"

"تھوڑے دن کی بات ہے یار!"

"عدالتی معاملات اتنی جلدی ختم نہیں ہوں گے رئیس۔ اور مجھے فرید بتا گیا ہے کہ قتل کے الزام سے چاہے میں بری ہوجاؤں۔ مگر میں جو لندن چلا گیا تھا۔ ضمانت پر رہائی کے دوران، وہ جرم ناقابل معافی ہے۔"

"اس میں کیا ہوگا۔ تو معافی مانگ لینا۔"

میں نے کہا "ایسے معافی مانگنے سے معافی ملتی تو لوگ ہر جرم کے بعد سو بار معافی مانگ لیتے۔ اب تو بس ایک ہی طریقہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

میں نے چٹکی بجاکے کہا "پھرررر!"

رئیس کی سمجھ میں میری بات آہستہ آہستہ آئی۔ اس نے سہلا کے میرے خیال کی تائید کی "بالکل ٹھیک۔ مگر۔۔۔"

"یہاں اگر مگر کچھ نہیں۔ پھر بات کریں گے۔ مجھے یہ بتا کہ ہوٹل سے میرا سامان اٹھالیا تھا تونے۔"

"ہاں۔ اور نیلم کے گھر پہنچادیا۔"

"اس میں ایک چیز تھی چندا کے لیے" میں نے کہا۔

"وہ تو اپنا یار جیرا بلیڈ لے گیا تھا۔ جب میں چندا سے ملنے گیا تھا کمال اسپتال۔ تو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ میں اسے جتنا بتا سکتا تھا، بتادیا۔ باقی تو خود بتادینا۔ اس کی بڑی عجیب حالت ہوگئی تھی۔ میں تو سمجھا کہ سکتہ ہوگیا۔ پلک جھپکائے بغیر دیوار کو گھور رہی تھی۔"

میں نے کہا "باپ کی یاد آرہی ہوگی۔"

"ہاں۔ مجھ سے کہنے لگی کہ مجھے سچ سچ بتادو۔ میں قمر نہیں

ہوں۔ میں نے کہا کہ قمر سے کیا جھوٹ بولا ہے میں نے۔ اس نے بڑا کنٹرول کیا خود کو لیکن پھر بھی آنسو نہ روک سکی۔ پھر کہنے لگی کہ یہ ناصر بڑا جھوٹا آدمی ہے۔ اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ تم سے کیا جھوٹ بولا اس نے۔ اس پر کہنے لگی کہ تم دوست ہو اس کے۔ تم بھی جھوٹ بولتے ہوگے۔ میں نے پوچھا کہ آخر کچھ بتاؤ کیا بات جھوٹ لگی تمہیں۔ وہ بولی کہ ابھی کیا کہوں، لیکن تم دیکھ لینا۔۔۔ جب وہ لوٹ کے آئے گا تو پتا چلے گا کہ سچ کچھ اور تھا۔ مجھے اور قمر کو مطمئن رکھنے کے لیے تم کہہ رہے ہو کہ وہ ٹھیک ہے۔ تم سارے مرد آپس میں مل جاتے ہو۔ عورتوں سے حقیقت چھپالیتے ہو۔"

میں نے کہا "ایسا کہا اس نے؟"

"ہاں یار۔ میں تو لاجواب ہوگیا تھا قسم اللہ کی۔ لیکن ڈھٹائی سے اپنی بات پر اڑا رہا۔ زیورات پر تو اس نے ایک نظر ڈال کے ایسے ایک طرف رکھ دیے تھے جیسے نقلی ہوں۔ ایک کلو سے زیادہ ہی وزن ہوگا۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو خوشی سے پاگل ہوجاتی۔ پاگل تو خیر ہیں یہ سب۔ قمر اور چندا اور نیلم۔ اور وہاں لندن میں ایک نجمی ہے۔ بس ایک شبنم کچھ ٹھیک ہے۔ مگر اس کا پاگل پن دوسرا ہے۔"

میں نے کہا "نجمی کو کچھ مت بتانا۔ اگر اس کا فون آئے، کہہ دینا کہ پرانے مقدمات میں گرفتار کیا ہے۔ ضمانت ہوجائے گی۔ مقدمات ہیں تو کچھ بھی نہیں۔ جلد ختم ہوجائیں گے۔ وہ بھی کم جذباتی لڑکی نہیں ہے۔ اور اکیلی ہے سب سے دور تو ہر بات کو زیادہ ہی محسوس کرتی ہے۔ یہاں سب کو سمجھا دینا کہ مجھ سے کسی قسم کا رابطہ نہ رکھیں۔ شاہ عالم کا کسی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ نہ چندا سے نہ قمر سے۔ نہ نیلم سے اور نہ ڈاکٹر کمال سے۔ مجھ سے شبنم کا یا فرید عباسی کا رابطہ رہے یا تیرا، کوئی شک کی بات نہیں۔"

تھانے میں میرا پہلا دن بہت صبر آزما رہا۔ اگرچہ مجھے پیر سائیں کے مہمان کا درجہ حاصل تھا مگر صرف یہ اعزاز مجھے کوئی رعایت دلانے کے لیے ناکافی تھا۔ زیادہ سے زیادہ میں زبردستی کی تفتیش کے عذاب سے بچ جاتا لیکن حوالات میں بند رہنے کی اذیت سے چھٹکارا صرف رئیس کی کوشش سے ملا تھا۔ دس ہزار روپے میں مجھے حوالات کے قیدیوں سے الگ ایک کمرے میں رہنے کی اجازت حاصل ہوگئی تھی جہاں میرا اپنا بستر تھا اور میں اپنی مرضی سے اپنا پیسہ خرچ کرکے کھانا یا چائے بھی منگوا سکتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تھانا

انچارج کا دس ہزار روپے لینے والا ہاتھ ہفتے بھر بعد پھر کھل جائے گا اور مراعات کے تسلسل کے لیے ہفتہ واری نذرانے کو جاری رکھنا ضروری ہوگا۔

تاہم تمام دستیاب یا قابل خرید سہولتوں کے باوجود قید کی اذیت اپنی جگہ تھی۔ انسپکٹر سلامت علی کسی یقین دہانی پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ میرے ایک ہاتھ سے ہتھکڑی کھول دی جائے تو میں سارے تھانے کو ناک آؤٹ کرکے فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس معاملے میں تھانے دار کا موقف بہت واضح تھا: "میرے پاس فالتو نفری تو ہے نہیں کہ ایک مسلح کانسٹیبل کو چوبیس گھنٹے شاہ جی کی نگرانی

کے لیے کھڑا کروں۔ اور یہی بات ہے کہ نگرانی کرنے والے کی نظر بھی چوک جاتی ہے۔ یہ تو ایک منٹ میں اس سے بندوق بھی چھین لیں گے۔ اب جیسی ان کی مرضی۔ میں ہتھکڑی کھول کے انہیں حوالات میں کھلا چھوڑ دیتا ہوں۔ یا ان کا اپنا کمرا اور بستر ہے۔ یہ یہاں رہیں مزے سے۔ ایک ہاتھ کو فرض کرلیں کہ ہے ہی نہیں۔"

اس جسمانی تکلیف کے ساتھ تھانے کے ماحول کی ذہنی اذیت تھی۔ سلامت علی دن میں کئی بار آتا جاتا تھا۔ اس نے دروازے کے باہر کھڑے ہونے والے سنتری کو ہدایت کردی تھی کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی ادھر اُدھر نہ جائے۔ اسے شاید یہ ڈر تھا کہ کہیں میں ہتھکڑی کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی سلاخیں یا کھڑکی توڑ کے آزاد نہ ہوجاؤں۔ ہر بار آتے ہی وہ ایک نظر اندر جھانک کے ضرور دیکھتا تھا کہ میں موجود ہوں یا خالی چارپائی مع ہتھکڑی موجود ہے اور میں غائب ہوں۔

تھانے کے اندر کی ساری آوازیں مجھ تک صاف پہنچتی تھیں۔ دن بھر میں جتنے مجرم پکڑے گئے، ان کا استقبال بڑے زور شور سے ہوتا تھا۔ پھر ان کے ساتھ آنے والے فریاد و فغاں کرتے تھے اور اس کے بعد سودے بازی کا عمل شروع ہوتا تھا۔ کالج میں پڑھنے والا ایک لڑکا ٹیوشن سینٹر سے واپس گھر جاتے ہوئے بدقسمتی کا شکار ہوگیا۔ وہ جس بس میں سفر کررہا تھا اس میں کسی جیب کترے نے ہاتھ کی صفائی دکھادی مگر جس کی جیب صاف ہوئی تھی، اسے پتا چل گیا کہ جیب ہلکی ہوچکی ہے۔ اس نے شور مچادیا۔ جیب کترے نے پکڑے جانے کے ڈر سے بٹوا اس کالج کے لڑکے کی جیب میں ڈال دیا۔ جب تلاشی شروع ہوئی تو اصل مجرم بچ گیا اور وہ لڑکا پکڑا گیا جس کی جیب سے بٹوا برآمد ہوا تھا۔ لوگ اسے پکڑ کے تھانے لے آئے۔ تھانے والے بے وقوف نہیں ہوتے۔ وہ مجرم کو صورت سے بھی پہچان لیتے ہیں خصوصاً جیب کترے تو اپنی انگلیوں کی ساخت اور سختی سے بھی پہچان لیے جاتے ہیں۔ تھانے والوں نے دیکھ لیا ہوگا کہ وہ سیدھا سادہ شریف لڑکا ہے مگر اس کے گھر والوں کے آنے سے پہلے تفتیش کا عمل شروع ہوگیا تھا۔ گھر والوں نے سخت احتجاج کیا اور ثبوت پیش کیے کہ وہ تھرڈ ائر کا طالب علم ہے اور وہ شریف لوگ ہیں مگر تھانے میں خالی خولی شرافت کی سند کہاں چلتی ہے۔ لڑکے کو رہا نہیں کیا گیا اور اتنا مارا گیا کہ اسے خون کی الٹیاں ہونے لگیں۔ اب گھر والے رونے پیٹنے لگے اور ہاتھ پیر جوڑنے لگے۔ اس کے بعد رہائی کے لیے مذاکرات شروع ہوئے اور بالآخر گھر والے اپنی عزت اور لڑکے کی جان کی

قیمت ادا کرکے اسے گھر لے گئے۔ یہ کوئی ایک واقعہ نہیں تھا۔ ایک جگہ بم کا دھماکا ہوا۔ اصل مجرم تو پہلے ہی جائے واردات سے فرار ہوچکے تھے۔ بے وقوفوں کی طرح وہاں کھڑے ہوکے تماشا دیکھنے والے پکڑے گئے۔ پولیس نے پندرہ بیس آدمی شبے میں اٹھالیے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی بے گناہی کی قیمت ادا کرکے گھر گیا۔ ان پکڑے جانے والوں میں بعض اوقات ایسے لاوارث بے گھر بھی دھرلیے جاتے ہیں جن کو چھڑانے کوئی نہیں آتا۔ وہ محاورے کے مطابق حامد کی پگڑی محمود کے سر رکھنے میں کام آتے ہیں۔ دوسروں کے جرائم ان کے سر ڈال دیے جاتے ہیں اور وہ مہینوں بعض اوقات برسوں تھانے یا جیل میں پیشی کے منتظر پڑے سڑتے رہتے ہیں۔ نہ وہ خود اس قابل ہوتے ہیں کہ کوئی وکیل کرسکیں نہ کوئی اور ان کی رہائی کے لیے فکرمند ہوتا ہے۔

شام تک اس ماحول میں میری طبیعت بیزار ہوگئی لیکن میری رہائی کسی قیمت پر ممکن نہیں تھی ورنہ رئیس ایک لاکھ تو کیا ایک کروڑ بھی لے آتا۔ رات ہوئی تو کمرے میں اندھیرا پھیلنے لگا۔ کمرے کا بلب فیوز ہوچکا تھا اور تھانے میں کوئی بھی اپنی جیب سے پیسے خرچ کرکے بلب لانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ جب میں نے پیسے دیے تو کسی نے لاکے بلب لگادیا۔ میں نے بازار سے چائے منگواکے پی تو اس خدمت کا معاوضہ الگ دیا۔ دراصل وڈے تھانے دار صاحب تو محاورے کے مطابق شیر کا حصہ لے کر الگ ہوجاتے ہیں۔ پھر شکار رہ جاتا ہے دوسرے اور تیسرے درجے کی مخلوق کے لیے۔ تھانے کا عملہ سارا دن پرچون فروشی کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کاموں کا معاوضہ وصول کرکے اپنا خرچہ پورا کرتا ہے۔ رپورٹ لکھوانی ہے، رپورٹ کی نقل چاہیے۔ ملاقات کرنی ہے۔ کھانا منگوانا ہے کپڑے بدلنے ہیں۔ رفع حاجت کے لیے جانا ہے۔ پیسے نکالو، قدم قدم پر دس بیس سو پچاس خرچ کرنے ہی پڑتے ہیں۔

رات کو رئیس پھر آیا۔ وہ کھانا لے کر آیا تھا۔ ہم نے ایک ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا پھر شبنم آگئی۔ اس نے اپنے طور پر پولیس کے اعلیٰ افسران سے بات کی تھی اور انہوں نے کہا ضرور تھا کہ وہ میرے ہاتھ کو ہتھکڑی سے آزاد کرادیں گے لیکن ایس ایچ او سلامت علی نے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا کہ ملزم خطرناک ہے۔ جوڈو کراٹے جانتا ہے۔ پہلے بھی دو سال مفرور رہا ہے۔ اگر پھر بار دھاڑ کرکے نکل گیا تو میری نوکری پر حرف آئے گا۔ نتیجہ یہ کہ ہتھکڑی اپنی جگہ پر رہی۔

شبنم نے مجھے تسلی دی "کل تمہیں مجسٹریٹ کے سامنے

پیش کردیا جائے گا۔"

میں نے کہا "اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ پولیس ریمانڈ لے لے گی۔"

"وہ پولیس کی مجبوری ہے۔ انہیں ظاہر تو کرنا ہے کہ وہ تفتیش کررہے ہیں۔"

میں نے کہا "تفتیش تو پہلے ہی مکمل ہوچکی تھی۔"

"تمہارا یہ جرم اضافی ہے کہ تم سماعت کے دوران میں ضمانت توڑ کے فرار ہوگئے تھے" شبنم بولی۔

میں نے کہا "اس میں تفتیش والی کون سی بات ہے۔ میں تو مان رہا ہوں کہ ہاں، میں بھاگ گیا تھا اپنی جان بچا کے۔"

اس نے کہا "پولیس کو بھی خانہ پری کی تفتیش کرنی ہوتی ہے۔ وہ تمہارا بیان لیں گے کہ کیوں فرار ہوئے تھے۔ فرار ہوکے کہاں روپوش رہے۔ تم ذرا ہمت سے کام لو۔"

میں نے کہا "ہمت سے کیا ہوگا۔ ریمانڈ تو پولیس کو مل ہی جائے گا اور ضمانت پر رہائی ہوگی نہیں۔"

"میں کوشش کررہی ہوں کہ سرکاری وکیل سے بات ہوجائے اور ضمانت منظور ہونے کی کوئی صورت نکل آئے۔ ضمانت کی رقم دگنی ہوجائے۔ ہم ایک کے بجائے دو افراد کی ذاتی ضمانت بھی فراہم کردیں گے۔ لیکن اس کے بعد تمہیں مقدمات کا فیصلہ ہونے تک شاہ عالم ہی رہنا پڑے گا۔"

"اس میں تو برسوں لگ جائیں گے۔"

"نہیں یار۔ پولیس ابھی ایک ہفتے کا ریمانڈ لینا چاہے گی۔ ہم کوشش کریں گے صرف تین دن کا ریمانڈ ملے۔ آج مجسٹریٹ کا پتا چل جائے گا۔ ممکن ہے اس سے بات ہوجائے۔ قانونی طور پر وہ تمہاری ضمانت منظور نہیں کرسکتا لیکن وہ تمہیں رہا کردے تو اسے کون پوچھ سکتا ہے۔ فرید عباسی نے بتایا ہے کہ ضمانت پر رہائی کا اختیار اے ڈی جے کے پاس ہے۔"

میں نے کہا "یہ اے ڈی جے کون صاحب ہیں؟"

"ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج۔ ایک دو جج ایسے ہیں جن کی ریپوٹیشن اچھی نہیں ہے۔ وہ تمہاری بھی ضمانت پر رہائی کا حکم صادر کرسکتے ہیں۔ وہ پوری طرح با اختیار ہیں۔ ویسے تو ان حالات میں ہائی کورٹ بھی ضمانت پر رہائی کا حکم نہیں دیتی مگر اے ڈی جے کے اختیارات کو صرف سرکاری وکیل چیلنج کرسکتا ہے کہ عدالت نے ضمانت منظور کرکے غلطی کی ہے اور ہائی کورٹ میں اپیل ہوسکتی ہے کہ ضمانت منسوخ کی جائے مگر ہم سرکاری وکیل کو راضی کرلیں گے کہ وہ اے

ڈی جے کے حکم پر اعتراض نہ کرے۔"

میں نے کہا "اس کام میں ہفتہ دس دن تو گزر ہی جائیں گے۔"

"یہ تو ہے۔ قانون اپنی رفتار سے چلتا ہے اور طریق کار کی پابندی بھی لازمی ہے۔ تین دن کے بعد ہم کوشش کریں گے کہ پولیس مزید ریمانڈ مانگے تو جج انکار کردے اور تمہیں جیل بھجوادیا جائے جوڈیشل ریمانڈ پر۔"

"وہ اور مصیبت ہوجائے گی۔"

"نہیں۔ وہاں تمہارے لیے بی کلاس لی جاسکتی ہے اور بی کلاس میں اے کلاس کی سہولتیں فراہم کرنا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ تم اتنا گھبرا کیوں رہے ہو؟ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ ذرا سی تاخیر سے اور میری بے احتیاطی سے بنا بنایا کھیل بگڑ گیا ورنہ اب تک میں غائب ہوگیا ہوتا۔"

وہ بولی "چلو دیر آید درست آید۔"

میں نے کہا "شبنم میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "پنچھی پنجرہ توڑ کے اُڑ جائے۔"

اس نے گھبرا کے باہر کی طرف دیکھا "ایسی بات سوچو بھی مت۔"

میں نے کہا "کیوں کیا یہ ناممکن ہے؟"

"ناممکن ہی سمجھو۔ ہم جو تمہاری رہائی کے لیے کوششیں کررہے ہیں، سب مشکل میں پڑجائیں گے۔"

"لیکن تمہارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

وہ بولی "ٹیک اٹ ایزی۔ اتنی جلدی مت کرو۔ مجھے نوّے فیصد امید ہے کہ دوبارہ تمہاری ضمانت پر رہائی بھی ہوجائے گی اور تمہارے خلاف یہ مقدمات بھی ختم ہوجائیں گے۔"

"میں اس ماحول کی اذیت اور سب سے دوری برداشت نہیں کرسکتا۔"

"غالی۔ تم اتنے کم ہمت ہو، مجھے اندازہ نہیں تھا۔ تم سے دور کون ہے۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ اب مجھے آفس جانا ہے۔ میں وہاں سے فون کروں گی تمہیں اور صبح تمہارے لیے ناشتا لے کر آؤں گی۔"

رئیس تیسری مرتبہ آیا تو میرے لیے بستر اور تکیہ وغیرہ لایا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھنے کے موڈ میں تھا مگر رات گیارہ بجے ایس ایچ او صاحب نے دربار لگایا تو اسے جانا پڑا۔ میں

نے کوشش کی کہ آنکھیں بند کرکے کسی طرح نیند کو بلالوں مگر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھانا انچارج کے کمرے میں دن بھر کے مقدمات پیش کیے جارہے تھے اور فیصلے ہورہے تھے گالی گلوچ اور مارپیٹ کی آوازیں آرہی تھیں اور سودے ہورہے تھے۔

رات کا وقت ہر تھانے میں بڑی مصروفیت کا ہوتا ہے۔ پولیس چھاپے مارتی ہے اور ہر قسم کے مجرم پولیس موبائل میں بھر بھر کے تھانے لائے جاتے ہیں۔ تھانا انچارج جو دن بھر "گشت" پر رہتے ہیں' مقدمات کی سماعت کے لیے دستیاب ہوتے ہیں۔ پولیس کے مخبر اپنی کارکردگی کی رپورٹ لاتے ہیں اور پرانے ملزمان سے تفتیش کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔

ایسے وحشت ناک ماحول میں کون سوسکتا تھا۔ میں بھی کروٹیں بدلتا رہا اور باہر سے آنے والی آوازوں سے بھاگ کر نیند کی آغوش میں پناہ لینے کی ناکام کوشش میں مصروف رہا۔ بالآخر صبح کے آثار سلاخوں والی کھڑکی کے باہر سفیدی کی صورت میں عیاں ہونے لگے۔ مجھے فیض کی نظم "زنداں کی ایک صبح" یاد آئی اور یہ شعر "رات باقی تھی ابھی جب سرہانے آکر۔ چاند نے مجھ سے کہا جاگ سحر آئی ہے۔"

قریب ہونے کے باوجود سحر بہت دور تھی۔ میں بوجھل آنکھوں کے ساتھ چارپائی پر بیٹھا اس وقت کے بارے میں سوچتا رہا جو میری دسترس میں آکے نکل گیا تھا۔ اگر اس روز میں اپنی پارٹی کے "مظاہرین" کو سمجھانے کے لیے باہر نہ جاتا تو شاید ایک گھنٹے میں بھیس بدل کے نکل گیا ہوتا اور آج شاہ عالم نہیں ناصر عظیم بن کے نیلم کے قصرِ عالی شان کی کسی شاہانہ خواب گاہ میں محوِ خواب ہوتا۔ یہ احساس مجھے رہ رہ کے کچوکے دیتا تھا کہ بہت قریب آجانے والی منزل کو خود میں نے اپنی ایک چھوٹی سی غلطی سے گنوا دیا تھا۔

لیکن ایسی ہی چھوٹی چھوٹی غلطیاں انسانی تدبیر پر تقدیر کی بالادستی کا ثبوت ہوتی ہیں ورنہ انسان جو چاہے وہ کرسکے تو نعوذ باللہ خدا نہ بن جائے۔

تھانا انچارج رات دو ڈھائی بجے چلا گیا تھا اور اس کے بعد مقامات کی پیشی کا شور تو کمرے میں نہیں رہا تھا لیکن باہر سے آنے والی چیخ و پکار کا شور بڑھ گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس کمرے کے پیچھے ہی تھانے کا ڈرائنگ روم تھا جہاں صبح کا اجالا نمودار ہونے تک مجرموں پر تشدد کا عذاب ناک سلسلہ جاری رہا اور میں ساری رات ان کے سسکنے تڑپنے کے ہائے ہائے کرنے اور وحشیانہ انداز میں چیخنے چلانے کی آوازیں سن سن کر چونکتا رہا۔

رئیس صبح ہوتے ہی پھر نمودار ہوگیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ تھرماس میں کافی بنوا کے لایا تھا "یہ چندا نے بھیجی ہے۔"

میں نے کہا "تو صبح صبح وہاں گیا تھا۔"

"اسے مجھے تیرے یار ڈاکٹر کمال نے بلایا تھا۔ اس نے بھی اوپر والوں سے بات کی ہے۔ تو بے غم ہوجا۔"

میں نے کہا "چندا نے کچھ کہا۔"

"یار' یہ سب لڑکیاں ایک جیسی پاگل کیوں ہوتی ہیں۔ جو بات چندا نے کہی وہی قمر نے کی۔ وہی نیلم نے کہی۔ شاہ عالم کو دیکھنے کے لیے تھانے جانا ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا جاؤ' اپنا نام بھی بتادینا اور یہ بھی کہ شاہ عالم سے کیا رشتہ ہے تمہارا۔ کیسے جانتی ہو تم شاہ عالم کو۔ اس کی پارٹی میں تھیں تو پہلے ملنے کا خیال کیوں نہیں آیا۔ اب اس کی اپنی پارٹی کے لوگ بھاگ گئے ہیں تو تم وفاداری جتانا چاہتی ہو۔ پہلے قمر نے کہا کہ رئیس بھائی' میں برقع اوڑھ کے چلی جاؤں۔ اور اپنا نام کچھ بھی بتادوں۔ یہ ہوسکتا ہے نا؟ میں نے کہا ہو تو سکتا ہے مگر تم بیٹھو آرام سے گھر میں۔ اس کا خیال رکھنے والے ہم ہیں نا۔ یہی خیال چندا کو بھی آیا اور بالآخر نیلم کو۔ منع تو سب کو کیا تھا میں نے مگر وہ ماننے والی نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟ یہاں آئیں گی' مجھ سے ملنے؟" میں نے اپنا سر پکڑلیا۔

آٹھ بجے شبنم پہنچ گئی۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق ناشتا بھی ساتھ لائی تھی۔ "رات آزاد صاحب کی بات ہوگئی ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل سے۔ اگر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ نے تمہاری ضمانت منظور کرلی تو اس فیصلے کے خلاف اپیل نہیں ہوگی۔"

"لیکن اے ڈی جے کا مرحلہ ابھی دور ہے۔"

"ہاں۔ آج ایس ڈی ایم تین دن کا ریمانڈ دے گا۔ پولیس ایک ہفتے کی درخواست دے گی۔ فرید عباسی مخالفت کرے گا۔ ایس ڈی ایم اچھا آدمی ہے۔" شبنم نے کہا۔

رئیس بولا "کل رات ڈاکٹر کمال کی اس سے بات ہوئی۔ وہ کہنے لگا کہ میں مجبور ہوں۔ میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں مگر یہ بہت مشکل ہے کہ میں ایک دن کا ریمانڈ بھی نہ دوں۔ کیس بہت سیریس ہیں۔"

ساڑھے نو بجے میری عدالت میں پیشی ہوئی اور جیسا کہ پہلے سے طے تھا۔ پولیس کو تین دن کے لیے میرا جسمانی ریمانڈ مل گیا۔ پولیس مجھے باقاعدہ ہتھکڑی ڈال کے اپنی موبائل میں لے گئی تھی اور حفاظت کے لیے چار مسلح افراد کی نفری بھی ساتھ تھی۔

دو بجے میری تھانے واپسی ہوئی اور ایک بار پھر مجھے کھڑکی کی سلاخ سے باندھ دیا گیا۔ میرا بایاں ہاتھ مسلسل ہتھکڑی میں رہنے سے نیلا پڑ گیا تھا اور کچھ سوج بھی رہا تھا۔ [illegible] نے آیوڈیکس کا لیپ کیا اور ہتھکڑی دوسرے ہاتھ میں [illegible] مگر وہ دایاں ہاتھ تھا۔ رات تک میں سارے کام [illegible] "یعنی لیفٹ ہینڈر کی طرح کرتا رہا۔

شام کو میں نے قمر کی آواز سنی۔ وہ باہر کسی سے بحث کررہی تھی "میں شاہ جی کی بہن ہوں۔"

"ہم کسی بہن بھائی کو نہیں جانتے" سنتری نے کہا "سارا خاندان نہیں مل سکتا تھانے میں۔"

لیکن یہ ساری بحث محض سو پچاس روپے کے لیے تھی۔ [illegible] برقع میں ملفوف اندر آگئی۔ مجھے ہتھکڑی لگی دیکھ کے اس کا برا حال ہوگیا۔ وہ مجھ سے لپٹ کے زاروقطار رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے ڈانٹ ڈپٹ کے خاموش کیا "تجھے منع کیا تھا رئیس نے۔ پھر کیوں آئی ہے یہاں پگلی۔ دیکھ لے' مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ بالکل آرام سے ہوں۔ رات آرام سے سویا تھا۔ کھانا خود رئیس لے کے آتا ہے۔ بس گھر نہیں ہے مگر آرام کیا گھر سے کم ہے؟"

وہ آنسو پونچھ کے بولی "بس بھائی' دل نہیں مانتا تھا۔"

"بس کی بچی۔ کچھ دماغ سے بھی کام لے۔" میں نے اس کے سر پہ ایک چپت لگائی "مگر یہاں تو بھری ہوئی ہے چاکلیٹ۔"

"آپ کب تک آؤگے گھر بھائی!"

میں نے کہا "بس تھوڑے دن کی بات ہے۔ تین دن کا ریمانڈ ہے۔ پھر میں چلا جاؤں گا جیل۔ وہاں رہوں گا سماعت مکمل ہونے تک۔ سال دو سال۔ اس کے بعد چودہ سال کی سزا کاٹ کے گھر۔ یوں گزر جائے گا وقت" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

لیکن وہ نادان لڑکی پھر پھوٹ پھوٹ رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ میں مذاق کررہا تھا اور میں ایک ہفتے کے اندر اندر ضمانت پر رہا ہوجاؤں گا۔ وہ گئی ہی تھی کہ دوسری رشتے کی بہن نمودار ہوگئی مگر چندا' ڈاکٹر کمال کے ساتھ آئی تھی۔ چندا نے کوئی رونا دھونا نہیں کیا بلکہ الٹا میرا حوصلہ بڑھاتی رہی کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ رئیس نے اور ڈاکٹر کمال نے جھوٹ بول بول کے اسے مطمئن کردیا تھا کہ گرفتاری اور رہائی سب ڈراما ہے اور قانونی ضرورت ہے لیکن وہ اپنی آنکھوں سے سب دیکھے بنا یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔ میں نے اس سے بھی وہی سب کہا جو قمر سے کہا تھا۔

میرے لیے اسپیشل حوالات قرار دیے جانے والے اس کمرے میں مہمانوں کی آمدورفت سے چہل پہل رات تک جاری رہی۔ رئیس نے کئی چکر لگائے۔ وہ گھر سے کھانا اور کافی بنوا کے لایا اور مجھے بتاگیا کہ رات کو نیلم ضرور آئے گی۔ شبنم مغرب کے بعد آئی اور آفس جانے تک میرے پاس بیٹھی رہی۔ ڈاکٹر کمال' شبنم اور نیلم کی مشترکہ کوشش کی وجہ سے میرے لیے تھانے میں مسلسل فون آرہے تھے اور تھانے والے میری اہمیت کے قائل ہوتے جارہے تھے اور مجھ پر عائد پابندیاں نرم پڑتی جارہی تھیں۔

نیلم سب کے بعد رات گیارہ بجے آئی اور میں نے اسے برقع میں دیکھا تو مجھے بے اختیار ہنسی آئی "کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ اس وقت تھانے میں فلم اسٹار نیلم موجود ہے۔ اگر یہ بات میں کسی سے کہوں تو وہ کہے گا کہ ضرور آئی ہوگی تمہارے خواب میں۔"

وہ سنجیدہ رہی "یہ سب تمہارا اپنا کیا دھرا ہے۔"

میں نے کہا "خاتون۔ ہر شخص خود اپنے اعمال کی سزا پاتا ہے۔"

"بلاوجہ تم نے دیر کی۔ شاہ عالم کی اچھی خاصی تشہیر ہوچکی تھی' ایک پریس کانفرنس سے۔ اس کے بعد ہوٹل میں رکنے کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے مجھے ڈانٹنے کے انداز میں کہا "ایک کے بعد ایک بے وقوفی سرزد فرماتے رہے وہاں بیٹھ کے۔ اتنی لمبی پلاننگ کی بلاوجہ۔۔۔ اور خواہ مخواہ اس پولیس والے سے پنگا لیا۔"

میں نے کہا "ایک بات کہوں؟"

"بولو۔"

"برقع میں تم قیامت لگ رہی ہو۔ کیا تمہارے پرستاروں نے کبھی تمہارے چہرے کو ایسے سیاہ نقاب میں دیکھا ہے؟"

وہ تھوڑا سا شرما کے مسکرائی "ایک دو فلموں میں برقع بھی اوڑھا تھا۔ لیکن انارکلی یا مال پر شاپنگ کے لیے جانا ہو تو میں یہی برقع استعمال کرتی ہوں۔"

"مجھے رشک آرہا ہے رئیس پر۔ کیا قسمت پائی ہے اس نے۔"

وہ بولی "میں اب چلتی ہوں۔ تم یہ ایک لاکھ اپنے پاس رکھ لو۔"

مجھے ہنسی آگئی "ایک لاکھ تھانے میں؟ کیا کروں گا ان سے میں؟ جوا کھیلوں پولیس والوں کے ساتھ۔ اور ہار جاؤں

ورنہ یہ لوگ ایسے ہی چھین لیں گے۔ ایک لاکھ کے لیے تو قتل بھی ہو سکتا ہے میرا۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ تھانے میں ہر قدم پر پیسہ کھلانا پڑتا ہے۔"

میں نے کہا "تھانے کو تم سے زیادہ میں جانتا ہوں اور مجھ سے زیادہ رئیس سمجھتا ہے۔ یہاں دن بھر دس بیس اور سو پچاس کے معاملے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے میرے پاس دو ہزار ہیں۔ رئیس آتا جاتا رہتا ہے۔ ضرورت پڑی تو بتا دوں گا اسے۔"

اس نے کچھ خفیف ہو کے نوٹ واپس بیگ میں رکھ لیے اور چہرے پر نقاب ڈال کے نکل گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی موجودگی میں کوئی آیا نہیں اور کسی نے اس کی صورت نہیں دیکھی ورنہ تھانے میں سنسنی پھیل جاتی اور صبح کے اخباروں میں یہ خبر آجاتی کہ "سپر اسٹار نیلم نے تھانے میں شاہ عالم سے ملاقات کی۔"

آدھی رات کے وقت پھر گزشتہ رات والا معمول شروع ہوا ہی تھا کہ انسپکٹر سلامت علی میرے پاس آگیا "کیسا وقت گزر رہا ہے شاہ جی؟"

میں نے کہا "مہربانی ہے آپ کی۔"

وہ بولا "اے ایس پی صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ اور معلوم ہے انھوں نے کیا فرمایا تھا؟"

میں نے کہا "مجھے کیسے علم ہو سکتا ہے؟"

"وہ چاہتے ہیں کہ تم سے کوئی رعایت نہ کی جائے۔ پیر سبحان شاہ کا مہمان نہ سمجھا جائے تمہیں۔"

میں نے کہا "تم افسران بالا کا حکم نہیں مانتے؟"

وہ بولا "میری تو زندگی عذاب کر دی ہے ٹیلی فونوں نے۔ ایس ایس پی شوکت علی بھٹ کہتا ہے تمہارا خیال رکھا جائے۔ ہم کیا خیال نہیں رکھ رہے ہیں؟ پھر تم اوپر والوں سے کیوں کہلواتے ہو؟"

میں نے کہا "اوپر والے خود فون کرتے ہوں گے۔ میرے مراسم تو سب سے تھے۔ میں کس کس کو منع کروں؟"

"میں نے طے کیا ہے کہ تمہیں یہاں سے شفٹ کر دیا جائے۔ کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ تم سے سی آئی اے سینٹر میں تفتیش ہوگی۔"

میں نے کہا "یہ سراسر غیر قانونی ہوگا؟"

"ایسی کی تیسی مجھے قانون سمجھانے والے کی" وہ دھاڑ کے بولا "میں تم کو ابھی ایسی جگہ پہنچا دوں گا جہاں کسی کے فرشتے بھی تمہارا پتا نہ لگا سکیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ سارا دن یہاں میلہ لگا رہتا ہے۔ تمہارا سارا خاندان ملنے آرہا ہے۔ یہ تھانا ہے یا تمہارا ہوٹل؟"

اس کے رویے میں برہمی کا یہ انداز اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آیا مگر دس پندرہ منٹ کے بعد وہ تھانے کی نفری کے ساتھ پھر نمودار ہوا۔ ایک حوالدار نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور دوسرے نے میرے ہاتھ کمر کے پیچھے لے جا کے ہتھکڑی لگا دی۔ میرے کسی سوال یا احتجاج اور مزاحمت کی انھوں نے بالکل پروا نہیں کی۔

میں نے سلامت علی سے کہا "یہ جو بھی تم کر رہے ہو غلط ہے اور غیر قانونی ہے۔"

اس نے بڑی رعونت سے کہا "پھر؟"

میں نے کہا "میں اپنے وکیل کو بتانا چاہتا ہوں۔"

اس نے وکیل کو ایک گالی دی "وکیل کی ۔۔۔ تمہیں ضرورت سے زیادہ رعایت مل گئی تھی۔"

میں نے کہا "تم نے مجھ پر کوئی احسان نہیں کیا تھا سلامت علی۔ تم مجبور تھے اور تمہیں اس کی قیمت بھی ادا کر دی گئی تھی۔"

اس نے زہر آلود لہجے میں کہا "بکواس مت کر۔" اور مجھے ایک دھکا دیا "چل آگے ۔۔۔ میری مجبوری دیکھ لی نا تو نے۔ اب ذرا اپنی مجبوری بھی دیکھ لے۔"

میں دھکے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ مجھے کسی اندھے کی طرح ہانکتے ہوئے باہر لے گئے اور ایک موبائل میں بٹھا دیا۔ پولیس کے رویے میں اس تبدیلی کا میں ایک ہی مطلب نکال سکتا تھا۔ کسی حریف یا دشمن نے مجھے ملنے والی رعایتوں کی آگے شکایت کر دی تھی اور کہیں بہت اوپر سے حکم آگیا تھا کہ یہ مراعات واپس لے لی جائیں۔

مجھے اب اپنے اور فرید عباسی کے اندازے غلط ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ شاید اب میرے ریمانڈ میں توسیع بھی ہو جائے گی اور مجھ سے پوچھ گچھ میں عام مجرموں جیسا سلوک بھی ہوگا۔ خیر، اب جو ہوتا ہے، وہ ہوگا۔ صبح سے میرے حامی پھر میدان میں آجائیں گے اور سفارشوں کے سہارے اور رشوتوں کے بل پر میرے لیے انصاف کے حصول کی کوششوں کا سلسلہ از سر نو شروع ہوگا۔

موبائل آدھی رات کی خاموشی میں اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ میں نے ابتدا میں حساب رکھنے کی کوشش کی کہ موبائل کتنی بار دائیں بائیں مڑی ہے لیکن بعد میں سب غلط ملط ہو گیا اور جب بالآخر چند رہ بیس منٹ کی ڈرائیونگ کے بعد گاڑی ٹھہری تو مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ مجھے کہاں لایا گیا ہے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ گاڑی سیدھے راستے پر چلتی رہی ہو مگر اس بات کا امکان بھی تھا کہ اسے گھما پھرا کے لے جایا گیا ہو۔

ایک بار پھر مجھے دھکے دے کے نیچے اتارا گیا اور میں نے ایس ایچ او انسپکٹر سلامت علی کی آواز سنی۔ دو ہاتھوں نے مجھے دائیں بائیں بازوؤں سے تھام رکھا تھا اور میں ان کی ہدایات کے مطابق چل رہا تھا۔ میرے کانوں نے لوہے کا گیٹ پھاٹک کھولے جانے کی آواز سنی۔ میں تین سیڑھیوں کے برابر بلند ایک ڈھلوان سطح پر چڑھ کے اوپر گیا۔ پھر مجھے سو قدم اندر چلنا پڑا۔ اس کے بعد کوئی دروازہ کھلا اور میرے پیروں کے نیچے قالین آگیا۔

میرا دماغ سوچنے لگا۔ کس تھانے میں ایسے دبیز قالین بچھے ہوتے ہیں؟ سی آئی اے سینٹر بھی میرا دیکھا ہوا تھا۔ وہاں کا ماحول بھی مختلف نہیں تھا۔ پھر کیا مجھے کسی ڈی آئی جی اور آئی جی کے سامنے پیش کیا جا رہا تھا؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ خود آئی جی مجھ سے ملنا چاہتا ہو یا اس نے حکم دیا ہو کہ شاہ عالم کو کسی ریسٹ ہاؤس میں رکھا جائے۔ سیاستدانوں کے لیے کسی گھر کو بھی "سب جیل" قرار دے دیا جاتا ہے۔

مجھے ساتھ لے کر چلنے والوں میں سے ایک نے کہا "آگے سیڑھیاں ہیں۔ اوپر جانا ہے۔"

میں ایک ایک سیڑھی گنتا گیا اور اوپر چڑھتا گیا۔ بائیس سیڑھیوں کے بعد مجھے سیدھا چلنے کے لیے کہا گیا۔ کسی وجہ کے بغیر میں نے اپنے قدم شمار کیے۔ ٹھیک چالیس قدم کے بعد مجھے پھر بتایا گیا کہ آگے اترنے والی سیڑھیاں ہیں۔ میں نے دوبارہ انھیں شمار کیا۔ وہ پھر بائیس تھیں۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔ میں ایک طرف سے اوپر چڑھا تھا اور چالیس قدم سیدھا چل کے پھر نیچے اتر گیا تھا۔ ایسا کہاں تھا؟ مجھے یہ نقشہ جانا پہچانا سا لگا۔

گھوم کے چند قدم چلنے کے بعد مجھے پھر کہا گیا کہ آگے سیڑھیاں اترتی ہیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے کنفیوز کرنے کی ایک احمقانہ کوشش تھی۔ سی آئی اے سینٹر کی دو منزلہ عمارت تھی۔ وہ مجھے پہلے اوپر کی منزل پر لے گئے۔ میں نے پورا برآمدہ طے کیا اور دوسری طرف کی سیڑھیاں اتر کے دوبارہ گراؤنڈ فلور پر آگیا۔ اب وہ مجھے زمین دوز عقوبت خانوں میں لے جا رہے تھے جو ایذا رسانی کے ننگِ انسانیت طریقوں کے لیے بدنام زمانہ تھے۔ ذہنی طور پر میں نے خود کو ہر طرح کے جسمانی تشدد کے لیے تیار کر لیا۔ میں سفارشوں کی جنگ میں ہار گیا تھا اور اب میری حیثیت عام مجرم سے بھی کمتر ہو گئی تھی۔ میرے خلاف کسی دشمن کا انتقامی جذبہ کام کر رہا تھا۔ یہ دشمن ملک رب نواز بھی ہو سکتا تھا اور پیر سبحان شاہ یا اس کا سالا بھی۔

تہ خانے کی گہرائی زیادہ نہیں تھی۔ میں چودہ سیڑھیاں نیچے اترا۔ پھر فرش آگیا۔ میرے اندازے کے مطابق ہر سیڑھی چھ سات انچ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں جس تہ خانے میں اترا تھا اس کی چھت آٹھ فٹ کے قریب اونچی تھی۔ جو بات مجھے ابھی تک کھٹک رہی تھی، یہ تھی کہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے جانے والے دونوں زینے بالکل سیدھے نہیں تھے جیسے کہ عام طور پر پرانی عمارات میں ہوتے ہیں۔ وہ زینے ایک نیم دائرے میں گول گھوم کے نیچے اترے تھے اور ان پر چپس کا یا ماربل کا فرش تھا۔ سی آئی اے سینٹر کی عمارت تو اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور اس کا فرش پرانی اینٹوں کا اور گھسا ہوا تھا۔

اچانک میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور مجھے کسی دروازے سے اندر دھکیل کر دروازہ بند کر دیا گیا۔ اب میرے ہاتھ آزاد تھے۔ میں نے آنکھوں کی پٹی اتار دی۔ اس کے باوجود میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر رہا۔ اس زنداں میں گھپ اندھیرا تھا لیکن ایک دروازے کے نیچے سے باہر کی روشنی ایک لکیر کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ دیر بعد یہی روشنی کی لکیر اندر کے اندھیرے میں میری آنکھوں کو دیکھنے کے قابل بنا دے گی اور ایسا ہی ہوا۔ چند منٹ بعد جب میں اندھوں کی طرح ہاتھ اپنے سامنے پھیلا کے اور پیر فرش پر کھسکاتا آگے بڑھ رہا تھا اچانک میرے مقابل کوئی دیوار آگئی۔

اب میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ پہلی دیوار پانچ قدم کے بعد ختم ہو گئی۔ دوسری سے تیسری اور پھر چوتھی دیوار تک کا فاصلہ بھی پانچ قدم ہی رہا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ دس بارہ فٹ چوڑا اور لمبا کمرا تھا جس میں دو دروازے تھے۔ ایک وہ جس کے نیچے سے لائٹ نظر آرہی تھی اور دوسرا پچھلی طرف کے آخری گوشے میں۔

میں نے دوسری کوشش میں کمرے کو ترچھا عبور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ کمرا بالکل خالی ہے۔ اس کی دیواروں پر بھی سپاٹ پلاسٹر تھا لیکن نیچے کا فرش موزائیک تھا۔ اس کی چکنی سطح کو میں نے اپنے پیروں سے بھی چھو کے محسوس کیا۔ فرش پر گرد و غبار کا نہ ہونا یہ ثابت کرتا تھا کہ اسے روزانہ یا ہفتے میں دو تین بار ضرور صاف کیا جاتا ہوگا۔ کمرے میں کوئی تعفن والی بو بھی نہیں تھی اور نہ وہ اعصاب شکن بھیانک بدبو جو سی آئی اے سینٹر جیسے سفاک اداروں کے عقوبت خانوں سے

منسوب کی جا سکتی ہو۔ پیشاب اور انسانی فضلے' خون اور پسینے کی ملی جلی بو جو قید میں اذیت جھیلنے والوں کی موجودگی کا پتا دیتی ہے۔

چنانچہ یہ بات مجھے اس حقیقت کا پتا دینے کے لیے کافی تھی کہ میں ایک صاف ستھرے خالی کمرے میں ہوں جو کسی تھانے یا تفتیشی ادارے کا عقوبت خانہ نہیں ہے۔ اس سے میری کچھ ڈھارس بندھی اور میں فرش پر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ میری آنکھیں اس برائے نام روشنی میں دیکھنے لگی تھیں جو دروازے کے نیچے سے آ رہی تھی۔

اچانک دروازے کے باہر کسی نے قفل میں چابی لگائی اور میں ایک دم جست لگا کے دروازے کے قریب والی دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ دروازہ کھلا تو مجھ پر جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ کمرے کے باہر ٹیوب لائٹ کی روشنی میں مجھے اپنے مقابل لالی نظر آئی۔

چھ فٹ سے زائد قد کی بھاری بھرکم مضبوط ہاتھوں پیروں اور مردانہ صفات کی حامل لالی وہ مخلوق تھی جس کو دیکھتے ہی مجھے ملک رب نواز کا اور پروفیسر ہاشم رضا کا خیال آیا۔ اس نیم انسانی نیم حیوانی عورت نما مخلوق کو پروفیسر ہاشم رضا نے اپنی جینیاتی سائنس کے ایک تجربے سے ایجاد کیا تھا۔ لالی کی ماں ایک عام عورت تھی مگر باپ افریقہ کے بن مانس اور گوریلے جیسی حیوانی مخلوق تھا اور لالی ان کی ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی نوع کی دوسری تخلیق جمبو تھا جسے پروفیسر ہاشم رضا نے پال کے بڑا کیا تھا اور وہ مردانہ صفات رکھتا تھا لیکن خاص بات یہ تھی کہ جمبو اور لالی دیکھنے میں مرد عورت نظر آنے کے باوجود تولیدی نظام سے محروم تھے اور شادی کرکے اپنے جیسے بچے پیدا نہیں کر سکتے تھے۔

جیسا کہ پروفیسر ہاشم رضا نے بتایا تھا' جمبو یا لالی APE فیملی کے دو جانداروں کے ملاپ سے پیدا ہوئے لیکن یہ ملاپ جسمانی نہیں تھا۔ یہ ایک لیبارٹری ٹیسٹ کا نتیجہ تھا۔ اس کا مقصد ایک ایسی مخلوق کو دنیا میں لانا تھا جو ماں باپ کی مشترکہ نسلی صفات سے مزین ہو یعنی گوریلے باپ جیسی جسمانی طاقت کی مالک ہو تو ماں کی طرف سے انسانی ذہانت رکھتی ہو۔ اور پروفیسر ہاشم رضا کا یہ تجربہ کامیاب رہا تھا۔ جینیٹک سائنس کے تجربات کا سلسلہ پچھلی ایک صدی پر محیط ہے اور اس کی تازہ ترین کامیابی DOLLY نام کی بھیڑ ہے جو کلوننگ سے وجود میں آئی تھی۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک زندہ خلیے سے پورا جاندار یہاں تک کہ اپنی مرضی کا انسان بھی تیار کر سکتے ہیں اور اس طرح بنائے جانے والے انسان میں وہی ظاہری و باطنی صفات ہوں گی جو اصل خلیے کے مالک میں تھیں۔ اخلاقی اور مذہبی وجوہ کی بنا پر ابھی تک دنیا کے بیشتر ممالک میں جانوروں کی کلوننگ پر کام ہو رہا ہے مگر انسانی کلوننگ پر پابندی عائد ہے۔ تاہم اسرائیل' یونان اور چند دیگر ممالک کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہاں انسانی کلوننگ پر چھپ کے کام ہو رہا ہے۔

پروفیسر ہاشم رضا کا تجربہ ابتدائی نوعیت کا سمجھا جا سکتا تھا۔ لالی ایک ہی نسل کے سمجھے جانے والے دو جانوروں کی مشترکہ صفات رکھتی تھی۔ جیسے کہ خچر جو گدھے گھوڑے کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے اور دونوں کی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے یعنی گدھے کی طرح جفاکش اور بوجھ ڈھونے والا ہوتا ہے تو گھوڑے کی طرح تیز رفتار۔ لیکن اس میں بھی خامی یہی ہے کہ خچر سے خچر پیدا نہیں ہوتا۔

لالی میں دوسری خرابی یہ تھی کہ اس عمل کو الٹا نہیں جا سکتا تھا یعنی اس کا باپ انسان اور ماں گوریلے کی مادہ نہیں بن سکتی تھی چنانچہ وہ عورتیں جو لالی اور جمبو کی ماں بنی تھیں انہیں جنم دیتے وقت مر گئی تھیں اور پروفیسر جانتا تھا کہ کسی گوریلے کے بچے کی پیدائش کے وقت ہر عورت مر جائے گی چنانچہ جمبو اور لالی جیسی نسل کے فروغ کا کام نہ صرف یہ کہ انتہائی مہنگا تھا بلکہ قانونی طور پر بھی جرم کا درجہ رکھتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ پروفیسر ہاشم رضا نے اپنے تجربات کے لیے جن عورتوں کو استعمال کیا تھا انہوں نے معاشی مجبوری کے باعث اپنے آپ کو بہت بھاری قیمت پر فروخت کیا تھا اور ایسی عورتیں آسانی سے دستیاب نہیں تھیں جو دس بیس لاکھ لے کر ایک طویل تکلیف دہ موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہوں۔

پروفیسر ہاشم رضا سے ایک ذاتی ملاقات میں بہت سے ایسے ہی ہولناک انکشافات ہوئے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ بندر جیسی پھرتی' گوریلے جیسی قوت اور انسانی ذہانت سے مزین اس مخلوق پر مزید تجربات کر رہا ہے اور ان کے رویے کو مصنوعی طریقے سے کنٹرول کرنا چاہتا ہے تاکہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق استعمال کیا جا سکے۔ وہ جمبو کو ایک انجکشن لگاتا تھا جس سے اس کا ذہن اس طرح متاثر ہوتا تھا جیسے مسمریزم سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ جمبو کو جیسی ہدایات دیتا تھا' وہ اس کے لاشعور میں اتر جاتی تھیں اور وہ انہی کے مطابق عمل کرتا تھا۔

پروفیسر کا نظریہ تھا کہ ایسی مخلوق کی دنیا میں بہت ڈیمانڈ ہوگی۔ نہ صرف یہ کہ جرائم پیشہ تنظیموں کو ان کی ضرورت ہوگی بلکہ مختلف ممالک اپنی فوج میں ایسے ہی سپاہی رکھنا پسند کریں گے۔ عملی طور پر یہ کسی حد تک ممکن تھا۔ یہ کہنا قبل از وقت تھا لیکن ایسے کسی امکان کی کامیابی کا خیال انتہائی خوف ناک تھا۔

ایک بہت لمبے عرصے کے بعد لالی کو دیکھ کے مجھے بہت سی پرانی باتیں یاد آئیں۔ ایک عجیب و غریب قرار دی جانے والی مخلوق نے ایک بار شبنم کے اخبار کے دفتر پر اور ایک بار نیلم کے گھر پر حملہ کیا تھا۔ اخبار کے دفتر پر حملہ کرنے والا بھی ایک بچہ تھا جو نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے چھلانگیں لگاتا ہوا غائب ہو گیا تھا مگر نیلم کے گھر پر حملہ کرنے والا بچہ گولی کا نشانہ بن گیا تھا لیکن بعد میں اس کی لاش پوسٹ مارٹم سے پہلے ہی غائب ہو گئی تھی۔ اس حملہ آور کو مختصر قد کی وجہ سے بچہ کہا گیا تھا لیکن بعض عینی شاہدین کا خیال یہ بھی تھا کہ وہ بہت بڑے سائز کا بندر تھا۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ اس کا تعلق بھی پروفیسر ہاشم رضا کی تجربہ گاہ سے ہوگا۔

جمبو سے ایک بار رمیں کا واسطہ پڑ چکا تھا اور لالی کو میں سمجھتا تھا۔ وہ اپنی جسمانی طاقت میں سچ مچ کے ٹارزن تھے اور میرے جیسے آدمی سے ایسے کھیل سکتے تھے جیسے بلی چوہے سے کھیلتی ہے۔ اگر لالی مجھے دبوچ لیتی تو اس کے فولادی بازوؤں کی گرفت میں میری پسلیاں چرمر ہو جاتیں۔

کسی اشتعال انگیزی کے بغیر لالی پر حملہ کرنا نادانی تھی۔ میں نے اسے کمرے میں داخل ہونے کا موقع دیا اور دوستانہ انداز میں اس کی طرف ہاتھ بڑھا کے کہا "کیسی ہو لالی؟"

لالی نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا اور منہ سے کوئی آواز نکالی جو میری سمجھ میں نہیں آئی پھر میں نے رب نواز کو دیکھا جو ایک کلاشنکوف والے مسلح محافظ کے ساتھ آگے بڑھتا آ رہا تھا۔ اندر آنے سے پہلے اس نے باہر سے کوئی سوئچ آن کیا۔ کمرا روشن ہو گیا۔ رب نواز کی صورت سے نظر آ رہا تھا کہ وہ میرے خلاف عناد کے جذبات سے بھرا ہوا ہے۔

"آ گئے ہو تم باغی شہزادے!" وہ طنز سے بولا۔

میں نے کہا "بقول فلمی شاعر۔ تم نے بلایا اور ہم چلے آئے جان ہتھیلی پہ لے آئے رے۔"

وہ تلخی سے مسکرایا "قانونی طور پر تم اس وقت بھی پولیس کی تحویل میں ہو۔"

میں نے کہا "قانون پہلے اندھا بہرا سمجھا جاتا تھا۔ اب معذور بھی ہے۔ قانون کی بات کیا کرتے ہو؟"

"پولیس نے تمہارا فزیکل ریمانڈ تین دن کے لیے حاصل کیا تھا۔"

میں نے کہا "آج پہلا دن تھا۔ اگلے دو دن تم میرے ساتھ وہ سلوک کر سکتے ہو جو پولیس نے نہیں کیا تھا لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"شاہ عالم۔ میں صرف سچ جاننا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا "کون سا سچ۔ مجھے نہیں معلوم تم کس سچ کی بات کر رہے ہو؟"

وہ بولا "اس ڈبا پیر سبحان شاہ کے ڈیرے پر تم بہت آرٹ فن دکھا رہے تھے۔"

میں نے کہا "معاف کرنا رب نواز۔ میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتا تھا' جتنا تم نے خود کو ثابت کیا۔ وہ تمہارا دشمن ہے۔ وہاں بیٹھ کے کیا میں تم سے دوستی جتاتا اور تمہاری تعریف کرتا؟"

اس کی صورت پر الجھن کے آثار نمایاں ہوئے "تم مجھے ایسی باتوں سے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

میں نے کہا "رائٹ۔ تم تو بنے بنائے بے وقوف ہو۔ تم نے جو سنا اس پر اعتبار کر لیا۔ یہ نہیں سوچا کہ میں کہاں سے

اور کس حالت میں وہ بات کہہ رہا تھا۔ پیر سبحان شاہ کے آدمی مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ وہ مجھے جان سے مار کے کہیں گاڑ دیتے تو روزِ محشر سے پہلے میرا سراغ نہ ملتا۔ وہ تو میری قسمت کی خرابی ہی ایک اچھائی بن گئی کہ پولیس کے پاس یعنی اے ایس پی ولاور شاہ کے ہاتھ میں میری گرفتاری کے وارنٹ آچکے تھے اور پولیس میری گرفتاری دکھانے کی پابند تھی۔ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے پیر سبحان شاہ سے بڑے قائل کرنے والے انداز میں جھوٹ بولنا پڑا اور یہ کہنا پڑا کہ میں نے تمہارے ساتھ کاروباری مراسم ختم کر لیے ہیں۔ وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے میں نے تمہیں فون پر بہت کچھ کہا۔ جو دوسرے فون پر پیر سبحان شاہ نے سنا۔ پھر میں نے اسے یقین دلایا کہ اب میں اس کے ساتھ بزنس پارٹنر شپ کے لیے تیار ہوں۔"

رب نواز کنفیوز نظر آنے لگا "اس نے تمہیں اور کیا بتایا؟"

میں نے کہا "کیا ہم یہاں کھڑے رہیں گے رات بھر؟ ہم کہیں بیٹھ کے شریفانہ انداز میں بھی باتیں کر سکتے ہیں؟"

"مجھے تم پر اعتبار نہیں شاہ عالم!"

میں نے کہا "تم اپنے گھر میں مجھ سے ڈرتے ہو؟ تمہاری یہ خوفناک بلا جسے تم پیار سے لالی کہتے ہو۔ میرا راستہ روکے کھڑی ہے۔ باہر ایک محافظ ہاتھ میں کلاشنکوف لیے موجود ہے۔ تمہارا گھر ایک قلعے سے زیادہ محفوظ ہے۔"

"میں تم سے ڈرتا نہیں۔ لیکن اب میں تم پر اعتبار بھی نہیں کر سکتا۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔"

میں نے کہا "یہ غلط ہے۔ میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا۔ دھوکا تم نے مجھے دیا تھا۔ وہ چوری کا مال تھا جو تم نے میرے حوالے کر دیا کہ لندن کی انٹرنیشنل مارکیٹ میں نکال دو۔ سوچو ذرا اگر میں پکڑا جاتا تو کیا ہوتا۔ پکڑا جاتا جمی' ابھی تک اسے معلوم نہیں کہ تم نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا لیکن اسے معلوم ہو جائے گا۔"

"اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ تم ساری دنیا کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ لارڈ پرائس پر ایک بروکر کے قتل کا الزام ہے۔ جب یہ مقدمہ عدالت میں پیش ہوگا تو وہ بتادے گا کہ بروکر نے اپنا کمیشن پکا کرنے کے لیے اسے نہیں بتایا تھا کہ وہ چوری کا مال ہے چنانچہ بعد میں جب اس نے اعتراف کیا کہ وہ یہ بات جانتا تھا تو اس نے بروکر کو گولی مار دی۔ وہ بروکر کی دروغ گوئی پر سخت مشتعل ہو گیا تھا۔ ممکن ہے اس سے لارڈ پرائس کو دی جانے والی سزا میں تخفیف ہو جائے۔ لیکن تم سوچو کہ اس سے تمہاری ساکھ کتنی متاثر ہوگی۔ ایسا کیوں کیا تم نے رب نواز۔ بزنس کیا ایسے چل سکتا ہے کہ ایک بزنس مین دوسرے کا مال اٹھالے۔"

وہ جھنجلا کے بولا "بند کرو اپنی یہ بکواس۔ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں۔ اس پیر نے تمہیں آدھی بات بتائی ہے۔"

"او کے۔ باقی آدھی بات تم مجھے بتادو۔"

رب نواز کچھ دیر سوچتا رہا "ٹھیک ہے۔ میں تمہیں ایک موقع اور دوں گا۔"

پانچ منٹ بعد میں رب نواز کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا جہاں میں پہلے بھی کئی بار آچکا تھا۔ میرے بالکل سامنے ڈرائنگ روم کا وہ دروازہ تھا جس سے ہم اندر آئے تھے۔ اس دروازے کو بند کر کے کلاشنکوف بردار محافظ اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ لالی اپنے جارحانہ تیور بھول کے اندر کچن میں جا چکی تھی اور شاید ہمارے لیے کافی بنا رہی تھی۔

"پیر سبحان شاہ نے گزشتہ تین سالوں میں کم سے کم چھ بار میرا مال ضبط کرایا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اتنی احتیاط سے کام لیتا ہوں' سب کو خوش بھی رکھتا ہوں اور اس کاروبار میں میرے جیسے اور بھی لوگ ہیں۔ صوبۂ سرحد میں مردان اور تخت بھائی کے علاقے میں دو ڈیلر ہیں۔ جن کی آپس میں ٹھنی ہوئی ہے۔ ایسے ہی دو بلوچستان میں ہیں۔ سندھ میں تین ہیں مگر اپنے اپنے علاقے ہیں ان کے اور وہ ایک دوسرے کے کام میں دخل نہیں دیتے۔ ایک کراچی میں ہے۔ دو نارتھ ناظم آباد اور جیکب آباد میں ہیں۔ پھر یہاں پنجاب میں مجھ سے کون دشمنی کر رہا ہے۔ ایک ڈیلر ساہیوال میں تھا۔ اس نے حلفیہ کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتا ہے اور کسی سے کاروباری رقابت میں نہیں پڑتا۔ وہ بڑا صوفی ٹائپ آدمی تھا۔ کہنے لگا کہ میاں جی' جس کا جتنا رزق ہے اور جہاں ہے وہ اسے ضرور مل جاتا ہے۔ بالآخر مجھے پولیس کے ایک ذریعے سے مخبری کرنے والے کا پتا چلا اور میں نے اسے اٹھوایا تو پتا چلا وہ پیر سبحان شاہ کا مرید ہے۔ اس پیر نے ابھی چار پانچ سال پہلے ہی یہ دھندا شروع کیا تھا اور اپنی پیری مریدی کی طرح اس کاروبار میں بھی کسی اور کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنا کام چھوڑ کر مریدوں کو میرے پیچھے لگا دیا۔ خیر' اس مرید کی تو آج قبر بھی کسی کو یاد نہیں کہ کہاں ہوگی۔ میں نے حساب لگایا تو اس پیر کی وجہ سے میرا لاکھوں کا نقصان ہو چکا تھا۔ میں نے کہا کہ بیٹا' سو سنار کی تو ایک لوہار کی۔ ایک رات ڈاکوؤں نے اس کا گودام صاف کر دیا۔ اس کو پتا بھی نہیں چلا اور مال پہنچ گیا لندن۔"

میں نے کہا "پنجابی کی ایک کہاوت ہے کہ سیانا کوا ہی گو کھاتا ہے۔ تم نے اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری سے کام لیا تھا مگر وہ پیر تم سے کہیں زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ اس کے پاس چوری ہونے والے مال کا پورا کیٹلاگ تھا۔ اس نے اس کی دس کاپیاں بنوا کے دس بڑے شہروں کے ڈیلرز کو فراہم کر دی تھیں۔"

"تم چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ کہ اب وہ مال کہاں ہے؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پیر سبحان شاہ کی طرح تمہاری رائے لندن پولیس کے بارے میں اتنی خراب کیوں ہے حالانکہ ان کی کارکردگی دنیا میں مثالی سمجھی جاتی ہے۔ تم خود سوچو کہ اگر وہ نوادرات خود مسٹر جمی نے یا لارڈ پرائس میں سے کسی نے چھپائے ہوتے تو کیا پولیس کے سراغ رساں ہماری نگرانی کر کے ان کا پتا نہ لگا لیتے۔"

"تم لندن پولیس کے سراغ رسانوں سے زیادہ چالاک ہو سکتے کے بچے!" وہ چلا کے بولا۔

میں نے کہا "اس تعریف کا شکریہ لیکن رب نواز! اس معاملے میں اگر کسی پر شک کیا جا سکتا ہے تو وہ جمی کی ذات ہے۔"

"اسے تو بیوی نے مروا دیا۔"

میں نے کہا "اگر وہ سچ مچ جولی کا شوہر ہوتا تو یہ صورت ہی پیدا ہی نہ ہوتی۔ جولی نے مجھے بتایا کہ جمی کا اپنا کاروبار مسلسل خسارے میں جا رہا تھا۔ اس کے کیسینو کی ساکھ خراب ہو گئی تھی اور نائٹ کلب پر کئی بار چھاپا پڑ چکا تھا کیونکہ وہ غیر قانونی طور پر انڈین لڑکیاں اسمگل کراتا تھا۔ وہ وہاں صرف اسٹرپ ٹیز ہی نہیں' جسم فروشی بھی کرتی تھیں۔ جمی کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ بیوی جس پر وہ سب سے زیادہ بھروسا کرتا ہے' وہی اس سے دشمنی کر رہی ہے۔ اگر اس کا یہ نوادرات کا بزنس نہ ہوتا تو وہ بالکل ہی برباد ہو جاتا۔ میرا خیال ہے کہ ہم دونوں کو لوٹ کے بے ایمانی سے سرمایہ حاصل کرنے کا خیال جمی کو اسی لیے آیا کہ وہ سنبھلنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نائٹ کلب اور جوئے خانے کو بیچ کر کوئی اور بزنس کرے گا۔ اس کو اچانک موقع مل گیا۔ اس نے بیوی کو بتایا اور اپنے مال پر خود ڈاکا ڈالنے کا پروگرام بنا لیا۔"

"جمی یہ بات نہیں مانتا۔"

"وہ بری طرح پھنس چکا ہے۔ اس پر کم سے کم چار افراد کے قتل کا الزام ہے۔ فرسٹ ڈگری مرڈر جسے ہماری قانونی زبان میں قتلِ عمد کہا جاتا ہے' دوسرا الزام عورتوں کی اسمگلنگ اور ان سے جسم فروشی کرانے کا ہے۔ تیسرا کیس چوری کا تھا۔ چوتھا ڈکیتی کا بن گیا۔ اس کی بیوی نے پولیس کو ایک ویڈیو کیسٹ فراہم کر دی جس میں اس نے اپنے آفس میں مجھ سے تین لاکھ پاؤنڈز چھین لینے کا پروگرام بنایا تھا۔ جیسے ہی میں یہ رقم لے کر جمی کے آفس پہنچتا دو ڈاکو وہاں سیف ڈیپازٹ کمپنی کے نمائندے بن کر پہنچ جاتے اور سب کچھ لوٹ کر لے جاتے۔ یہ ساری گفتگو جولی نے سنی اور ریکارڈ کر لی۔ جمی کے پلان میں دو افراد اس کے ساتھ شریک تھے جو شاید ایک ایک لاکھ پاؤنڈ لے جاتے۔ غالباً جمی کو یہ سودا مہنگا لگا ہوگا۔ بعد میں اس نے دوسرا پلان بنایا جس کی خبر جولی کو نہیں ہوئی۔ اس نے دو آدمی اس کام کے لیے حاصل کیے کہ جب ہم لارڈ پرائس کے گھر سے تین لاکھ پاؤنڈز لے کر واپس آرہے ہوں تو وہ راستے میں ہم سے گاڑی چھین لیں۔ میرا خیال ہے کہ جمی نے انہیں گاڑی میں موجود کیش کے بارے میں نہیں بتایا ہوگا۔ گاڑی چھیننا ایک عام سا جرم ہے۔ جمی نے شاید پانچ ہزار پاؤنڈز میں دو بدمعاشوں کی خدمات حاصل کر لی ہوں گی کہ گاڑی چھین کے لے جانا اور فلاں جگہ پر چھوڑ دینا۔ اس طرح جمی نے دو لاکھ پاؤنڈز بچا لیے ہوں گے۔ نوادرات کو غائب کرنے کا پروگرام اس نے پہلے ہی بنا رکھا ہوگا۔ اس مال کو وہ بعد میں آہستہ آہستہ نکالتا۔ اس کی بدقسمتی کہ وہ مال چوری کا تھا اور اس چوری کی خبر مارکیٹ میں پہلے ہی عام ہو چکی تھی۔ اسے نو لاکھ پاؤنڈز مل جاتے تو وہ اپنا بزنس سنبھال لیتا لیکن گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھادی۔ اس کی بیوی نہ جانے کب سے موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے جمی کو ٹھکانے لگا دیا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ رب نواز میری باتوں سے قائل ہونے لگا ہے۔ یہ سب باتیں اسے پہلے ہی معلوم تھیں لیکن میں نے اپنا کیس ایسے مدلل انداز میں پیش کیا کہ مجھے تھوڑی سی مہلت مل جاتی تو میں اسے اپنا ہم خیال بنا لیتا اور قائل کر لیتا کہ پیر سبحان شاہ کے ڈیرے سے میں نے جو بھی کہا تھا' بحالتِ مجبوری اپنی جان بچانے کے لیے کہا تھا ورنہ ہم حسبِ سابق پارٹنر ہیں اور رہیں گے۔ ڈکیتی سے ہونے والے اس نقصان کو مل جل کے برداشت کریں گے اور مستقبل کے سودوں میں برابر کر لیں گے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ بزنس میں کبھی کبھی ایسے غیر متوقع نقصانات بھی ہو جاتے ہیں۔

لیکن میری قسمت کی خرابی کہ اچانک رب نواز کا بیٹا آگیا۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا اور اس وقت تو بہت اچھی طرح دیکھا تھا جب میں نے اور سونی نے مل کے اسے اس گھر سے اغوا کیا تھا۔ وہ اب کافی بدل گیا تھا۔ اس کا جسم پہلے کے مقابلے میں کچھ بھاری ہوگیا تھا اور اس کی شخصیت شاندار ہوگئی تھی کیونکہ باپ کی طرح وہ بھی دراز قد اور کھلی کھلی رنگت کا مالک تھا۔ رب نواز کا جسم اب ادھیڑ عمری کی طرف مائل تھا اور اس کے سر پر گنج بھی نمودار ہوگیا تھا جبکہ دلنواز کے سر پر گھنے چمکیلے سیاہ بال تھے۔

مجھے دیکھ کے وہ چونکا اور پھر سیدھا میری طرف آیا۔

"ڈیڈ' یہ کون ہے؟"

اس کے باپ نے حیرانی سے کہا "تم شاہ عالم کو جانتے ہو؟"

"نہیں ڈیڈ!" اس نے میری طرف انگلی اٹھا کے کہا "یہ وہی داڑھی والا جن ہے۔ غور سے دیکھئے' اسی نے اغوا کیا تھا مجھے اور اس کے ساتھ وہ فاحشہ سونی تھی۔"

ملک کے لاشعور میں اگر داڑھی والے جن کا خیال تھا تو یہ بات ابھی تک اس کی زبان تک نہیں آئی تھی۔ دلنواز کی بات نے جیسے اس کے خیال کو اظہار کی راہ دکھادی۔

رب نواز نے مجھے غور سے دیکھا "داڑھی والا جن!"

"ہاں ڈیڈ! یہ وہی بدمعاش ہے۔"

میں نے کہا "دل نواز۔ تم کیسی باتیں کررہے ہو؟"

اس نے گرم ہو کے کہا "بکواس بند کرو۔ میں تمہیں بھول نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو۔ میں شاہ عالم ہوں' سارا زمانہ جانتا ہے مجھے۔"

دلنواز میرے قریب آیا اور اس نے میرا کالر پکڑلیا "اس وقت ہم داڑھی سے دھوکا کھاگئے تھے۔"

میں نے غرا کے کہا "ہاتھ ہٹاؤ ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔"

رب نواز بھی کھڑا ہوگیا "کیا ٹھیک نہیں ہوگا۔ دلنواز ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میری آنکھیں واقعی دھوکا کھاگئی تھیں۔ میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ تم وہی ہو' شک کی کوئی بات ہی نہیں۔ آج تمہارے چہرے پر داڑھی ہے تو تم سوفیصد وہی نظر آرہے ہو۔ داڑھی والے جن!"

میں نے کہا "رب نواز کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟" میں نے کہا۔

"نہیں' میں پاگل تھا۔ اب مجھے ہوش آگیا ہے۔ میرا سب سے بڑا دشمن تو میرا بزنس پارٹنر تھا جس پر میں سب سے زیادہ اعتماد کرتا تھا" وہ چلا کے بولا۔

دل نواز نے کہا "یہ ایسے نہیں مانے گا ڈیڈ۔ اسے آپ میرے حوالے کردیں۔ اس نے داڑھی والا جن بن کے ہمیں برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شاہ عالم ہی داڑھی لگا کے ہمارا دشمن بنا ہوا تھا۔ اب میں اس سے پوچھ لوں گا۔"

میرا انکار' احتجاج اور اشتعال سب رائگاں گیا۔ اچانک رب نواز کو بھی یقین آگیا تھا کہ داڑھی والے جن کے روپ میں بھی یہ میں ہی تھا جو اس کے خاندان کو تباہ کررہا تھا۔ اس نے محافظوں کو حکم دیا کہ اس ـــ کو وہیں بند کردو اور پانچ منٹ بعد میں پھر اسی زنداں میں تھا جہاں سے میں نے اپنی چرب زبانی کے باعث رہائی حاصل کرلی تھی۔

رب نواز کے مقابلے میں اس کا بیٹا بہت چالاک ثابت ہوا۔ وہ کچھ دیر بعد کپڑے بدل کے آیا تو اس کے ساتھ ایک مسلح گارڈ تھا اور لالی تھی۔ وہ خود ایک چمڑے کا ہنٹر لے کر آیا تھا۔

"کیا تم مجھے شرافت کی زبان میں بتاؤ گے کہ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟" وہ ہنٹر لہرا کے بولا۔

میں نے مضبوطی سے کہا "مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

دلنواز کا ہنٹر ہوا میں لہرا کے میری کمر پر لگا۔ "سمجھ میں آجائے گا تھوڑی دیر بعد۔ آخر کیا بگاڑا تھا میرے باپ نے تیرا ـــ" وہ گالیاں بکنے لگا اور ہنٹر سے دیوانہ وار میرے جسم پر وار کرنے لگا۔ ہنٹر کی ہر ضرب سے میرے جسم پر جیسے آگ کی اک لکیر سی بن جاتی تھی مگر میں برداشت کررہا تھا۔ اس کا نشانہ میرے جسم کا گردن سے نیچے رانوں تک سارا بدن تھا اور میری خود کو بچانے کی کوشش لاحاصل تھی لیکن ایک مرحلہ ایسا آگیا جب میری قوتِ برداشت جواب دے گئی اور میں نے چابک پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔ دلنواز کی گرفت چابک پر بہت مضبوط تھی۔ اس نے ایک جھٹکا کھایا اور تھوڑا سا آگے آگیا۔ اگر وہ میرے ہاتھوں کی پہنچ میں آجاتا تو میں اسے دبوچ لیتا اور یرغمال بنالیتا لیکن اس نے چابک چھوڑدیا۔

دلنواز نے مجھے گالی دی اور پلٹ کے لالی سے کہا "لالی۔ اس کو پکڑلے۔"

میں نے ہوا میں چابک لہرایا۔ "اگر لالی نے مجھے چھونے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔"

لیکن لالی پر دلنواز کے حکم کا بڑا عجیب اثر ہوا تھا۔ اچانک اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔ اس کا سانس

دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا اور اس کے نتھنے پھڑکنے لگے تھے۔ اس کی انسانی صورت پر حیوانی جذبات کی سفاکی آگئی تھی اور اس کا جسم جیسے طاقت کے دباؤ سے بل کھانے لگا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ میں نے پھر چلا کے کہا "دلنواز' اگر میرا داؤ چل گیا تو میں اس کی گردن توڑدوں گا۔ بعد میں مت کہنا۔"

لیکن میرے الفاظ کے جواب میں کلاشنکوف کے راؤنڈ کا برسٹ آیا اور میرے پیروں سے کچھ فاصلے پر فرش ادھڑ گیا۔ مسلح محافظ میری جارحیت کے جواب میں میری ٹانگ پر گولی مارنے کے لیے بالکل تیار تھا۔

لالی نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکالی اور پھر مجھ پر جست لگائی۔ میں اس کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں جھکائی دے کر ایک طرف ہٹ گیا مگر اس کے بعد لالی نے غیرانسانی پھرتی کے ساتھ رخ بدلا اور میرے سنبھلنے سے پہلے دونوں ہاتھ پھیلا کے میری طرف چھلانگ لگائی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے اپنے اندازے کی غلطی کا احساس ہوتے ہی ہوا میں اپنا رخ تبدیل کرلیا۔ اس سے پہلے کہ اس کے پیر زمین کو چھوتے' وہ میری طرف پلٹ گئی۔

لالی کے بازو غیرمعمولی طور پر لمبے تھے۔ اس نے مجھے پیچھے سے کمر میں ہاتھ ڈال کے دبوچ لیا۔ میں نے دونوں کہنیوں کو پیچھے لے جاکے اس کی پسلیوں میں مارا۔ لالی کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور اس نے مجھے اٹھا کے دور پھینک دیا۔ میں دیوار سے ٹکرایا اور ابھی سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ لالی میرے اوپر آگری۔ اس کا وزن اتنی ہی جسامت کے کسی مرد سے بھی زیادہ تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کے نیچے سے نہ نکل سکا۔

اب لالی مجھ پر سوار تھی۔ اس نے ایک گھٹنے سے میرے شانوں کو ایسے دبا رکھا تھا کہ میرا سانس رک رہا تھا۔ اس کا دوسرا گھٹنا میری کمر پر تھا۔ میرے لیے اپنے بازوؤں کو موڑنا بھی اتنا ہی مشکل ہورہا تھا جتنا اپنی ٹانگیں اٹھانا۔ لالی کے جسم کی حیوانی قوت دو طاقتور مردوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ میرے جسم پر چابک سے پڑنے والی لکیروں نے میری جلد کو زخمی کردیا تھا اور ان زخموں کی اذیت فرش کی رگڑ سے اور بڑھ گئی تھی۔

میں نے کراہ کے کہا "خدا کے لیے مجھے چھوڑدو۔"

دلنواز نے ولن کے انداز میں قہقہہ لگایا "بڑی جلدی خدا یاد آگیا تجھے' داڑھی والے جن۔ اب یہ تجھے چھوڑے گی نہیں۔"

میں نے کہا "دل.... نواز ـــ میرا دم نکل ـــ جائے گا۔"

دلنواز پر کوئی اثر نہیں ہوا "لالی' اس حرام زادے کو مار۔"

لالی نے ایک دم مجھے دونوں ہاتھوں میں ایسے اٹھالیا جیسے میں کوئی بچہ ہوں۔ اس نے مجھے الٹا پکڑ کے ایک دائرے میں گھمایا اور چھوڑدیا۔ میں کسی بے قابو ہوجانے والے ہوائی جہاز کی طرح اڑتا ہوا گیا اور دیوار سے ٹکراگیا۔ میرا سر ایک دھماکے سے دیوار پر لگا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرے میں ستارے سے جھلملاگئے۔

میں نیچے گرا تو کوشش کے باوجود نہ اٹھ سکا کیونکہ میرے قدموں کے نیچے زمین ابھی تک گردش میں تھی۔ مجھے وہ کمرا بھی گھومتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ لالی نے مجھے فرش سے اٹھایا اور اپنا ایک ہاتھ دھپ سے میری کمر پر مارا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ہاتھ نہیں توپ کا گولا تھا جس نے میری ریڑھ کی ہڈی توڑدی ہے۔ اس نے دوسرا ہاتھ میرے سر کے اوپر مارا تو میری گردن جیسے میرے کندھوں کے درمیان دھنس گئی اور میرا سر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرے ہاتھوں پیروں کے گرد نائلون کی مضبوط رسی تھی اور میں ایک چارپائی پر الٹا بندھا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ سامنے باندھے گئے تھے لیکن چارپائی کا صرف فریم تھا۔ اس کے درمیان میں میرے جسم کو سہارا دینے والی کوئی چیز نہ تھی۔ میں چھ فٹ لمبے لکڑی کے فریم میں الٹا بندھا ہوا تھا اور میرے جسم کا سارا وزن میری کمر پر آگیا تھا۔ میرا چہرہ بھیگا ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے ہوش میں لانے کے لیے مجھ پر پانی ڈالا گیا تھا۔

سب سے زیادہ اذیت ناک بات یہ تھی کہ میرے جسم پر سے ہر کپڑا اتارلیا گیا تھا۔ میں نے سر گھما کے دیکھا تو لالی مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر موجود تھی اور دلنواز سرہانے کی طرف ہاتھ میں ہنٹر لیے کھڑا تھا۔

اس نے اچانک میرے بال پکڑلیے "بول تیری ـــ تو وہی داڑھی والا جن ہے نا؟ تونے اغوا کیا تھا مجھے۔"

میں نے بڑی مشکل سے کراہ کے جواب دیا "دلنواز' تمہیں غلط فہمی ـــ"

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے میرے سر کو پلنگ کی پٹی پر مارا "تیری غلط فہمی کی ـــ" اس نے بال پکڑ کے میرے سر کو پٹی سے ٹکرانا جاری رکھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بال اکھڑ کے دلنواز کے ہاتھ میں رہ جائیں گے اور میرا

کاسۂ سر دو ٹکڑے ہو جائے گا۔

لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے میں نے خدا کو یاد کیا اور اس سے استقامت مانگی۔ اگر میری زندگی کی معیاد پوری ہو گئی ہو گی تو میں انہی دو دنوں میں مر جاؤں گا ورنہ دو دن بعد پولیس مجھے پھر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کی پابند ہو گی۔ رب نواز مجھے دو دن سے زیادہ نہیں رکھ سکتا تھا۔

دلنواز گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ گیا "شاہ عالم۔ وہ دن گزر گئے جب میرا باپ تیرا محتاج تھا۔ تو اپنے ڈپلومیٹک پاسپورٹ پر باہر آتا جاتا تھا تو اس کا مال بھی لے جاتا تھا۔ اب نہ تیری سیاست ہے نہ میرے باپ کو تیری ضرورت۔ اس کا مال تیری مدد کے بغیر بھی آئے گا' جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ۔۔۔ تو اچھی بات ہے۔"

اس نے میرے منہ پر تھوک دیا "بے غیرت' دغا باز۔ تو نے دوستی کی آڑ میں دشمنی کی ہمارے ساتھ۔ ہمارے خاندان کو مصیبت میں ڈالا' داڑھی والے جن کی اولاد...."

میں نے کہا "میں کسی داڑھی والے جن کو نہیں جانتا۔"

وہ میری داڑھی کو مٹھی میں پکڑ کے زور زور سے جھٹکے دینے لگا "اب میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ ایسی ہی داڑھی تھی تیرے چہرے پر مگر وہ نقلی تھی۔ اس سے تھوڑی سی بڑی تھی۔ لیکن آج تو اصلی داڑھی میں سامنے آگیا۔ تیری شامتِ اعمال لے آئی۔"

اذیت سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے "تم کیا چاہتے ہو آخر؟ چلو میں مان لیتا ہوں کہ میں ہی داڑھی والا جن تھا۔ تم زبردستی منوانا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے۔"

"میں زندہ نہیں چھوڑوں گا تجھے۔"

"مجھے مار کے کیا ملے گا تمہیں۔۔۔ سوائے تسلی کے۔ لیکن تم خود مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ پولیس نے مجھے غیر قانونی طور پر تمہارے حوالے کیا ہے۔"

وہ ہنٹر لے کے مجھ پر پل پڑا "قانون کی بات کرتا ہے میرے سامنے۔"

مسلسل پڑنے والے چابکوں کی مار کی اذیت نے بالآخر مجھے ہوش سے بے گانہ کر دیا۔ مجھے پھر ہوش آیا تو میں اسی اندھیرے کمرے میں ننگے فرش پر پڑا ہوا تھا اور میرے بدن کے ہر حصے سے درد کی تڑپا دینے والی ٹیس اٹھ رہی تھی۔ اب دن نکل آیا تھا۔ میں دروازے کے نیچے سے دن کا اجالا دیکھ سکتا تھا لیکن کچھ دیر بعد دروازہ کھلا تو مجھے پتا چلا کہ وہ ٹیوب لائٹ کی روشنی تھی۔ اس تہ خانے میں دن کے اجالے کا گزر ہی نہ تھا۔ یہاں ہر وقت رات رہتی تھی۔

ایک بار پھر رب نواز ایک مسلح محافظ اور لالی کے ساتھ اندر آگیا۔ اس نے مجھے ایک بے رحمانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا "وقت تمہارے لیے کتنا بدل گیا ہے شاہ عالم۔ تم جیل میں اے کلاس مانگنے والے کس حالت میں فرش پر پڑے سسک رہے ہو۔"

میں نے کہا "میں اپنی مصیبت کو اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتا ہوں۔"

"تمہیں اندازہ ہو جانا چاہیے کہ میں تمہارا جتنا اچھا دوست تھا' اتنا ہی اچھا دشمن بھی تھا۔ دلنواز بہت برا دشمن ہے۔ وہ مجھ سے بہت مختلف ہے شاہ عالم۔"

میں نے کہا "یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی رہے گا خواہ میری زبان اقرار کرنے پر مجبور ہو جائے کہ میں ہی داڑھی والا جن ہوں۔"

"تم جانتے ہو کہ تمہاری وجہ سے ہمارا کتنا نقصان ہو چکا ہے۔ اگر تم وہ نقصان پورا کرنے کا وعدہ کر لو تو میں تمہاری رہائی کے لیے کوشش کر سکتا ہوں" رب نواز بولا۔

میں نے صاف انکار کر دیا "میں کوئی وعدہ کیوں کروں جب کہ میں خود بھی ایسے وعدے کی قانونی اور اخلاقی حیثیت کو تسلیم نہیں کر سکتا۔"

لالی اپنے ساتھ ایک ٹرے لائی تھی جو اس نے میرے پاس رکھ دی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے لالی کی آنکھوں میں جذبات کی بے رحمی کا حیوانی تاثر باقی نہیں رہا۔ اب اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے لالی اپنے دل میں پیدا ہونے والے رحم کے جذبات کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھے یہ خیال بھی فریبِ آرزو لگا۔ یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے۔ لالی مجھ پر مہربان ہو جائے اور مجھے رہائی کا کوئی موقع فراہم کر دے۔ وہ ایک غلام تھی اور اس کے لیے آقاؤں کے حکم کے خلاف سوچنا بھی جرم کا درجہ رکھتا تھا۔

ٹرے میں ایک روٹی تھی جو باسی اور رات کی بچی ہوئی نظر آتی تھی۔ ایک پانی کا گلاس تھا اور ایک چائے کا کپ۔ مجھے اپنی جیل میں اسیر رکھنے والے نہیں چاہتے تھے کہ میں جسمانی ناطاقتی کے سبب قیدِ حیات سے نجات پا سکوں۔

کوئی خواہش نہ ہونے کے باوجود میں نے ٹرے کو خالی کر دیا۔ یہ خدا کی عطا کردہ وہ نعمت تھی جو اس قید خانے میں من و سلویٰ سے کم نہ تھی۔ اسے ٹھکرانا کفرانِ نعمت تھا۔

میرے لیے وہ پورا دن عذاب کی ایک صدی بن گیا تھا۔ میں نے جسمانی تشدد کے وہ سارے مرحلے جھیلے جن کا تصور ممکن تھا۔ دلنواز نے کئی بار میرے جسم پر اپنی سفاکی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے پولیس کے مستعمل تمام طریقے آزما لیے لیکن مجھ سے یہ کہلوانے میں ناکام رہا کہ میں ہی وہ داڑھی والا جن تھا جس نے اسے سونی کے ساتھ مل کے اغوا کیا تھا۔ اسے بھی جیسے ضد سی ہو گئی تھی کہ یہ میری زبان سے سن کے رہے گا۔ اس نے میرے جسم کے زخموں پر نمک مرچ والا پانی ڈالا۔ مجھے مرچوں کی دھونی دی۔ مجھے یخ ٹھنڈے پانی میں ڈبویا اور میرے جسم کو سگریٹوں سے داغا۔ اس اذیت ناک عمل کے دوران میں کئی بار بے ہوش ہوا اور دوبارہ ہوش میں آیا تو میں نے خدا سے استقامت کے سوا کچھ نہیں مانگا۔

بالآخر یہ پرعذاب مرحلہ تمام ہوا۔ آخری بار جب مجھے ہوش آیا تو میں کسی بیڈ روم میں تھا اور میرے جسم پر صاف ستھرے کپڑے تھے۔ میری جسمانی حالت بھی بہتر تھی اور میری اذیت بھی کم محسوس ہوتی تھی۔ غالباً میرے جسم پر زخموں کو مندمل کرنے والی دواؤں کا لیپ کیا گیا تھا اور مجھے درد کش دوائیں انجکشن کے ذریعے دی گئی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ اب مجھے پولیس کو واپس کرنے کا وقت قریب ہے۔ قانونی طور پر رب نواز مجھے صحیح سلامت واپس کرنے کا پابند تھا۔ جب میں اس کے حوالے کیا گیا تھا تو میرے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا مگر اب میرا پورا جسم اذیت رسانی کی رونگٹے کھڑے کرنے والی کہانی کہتا تھا۔ لیکن اس سے رب نواز یا اس کے بیٹے کو فرق نہیں پڑتا تھا۔ انہوں نے پیسہ خرچ کر کے مجھے پولیس سے خریدا تھا اور ریمانڈ کے دو دنوں میں ایذا رسانی کے وہ سب طریقے آزما لیے تھے جو پولیس تھانوں میں اعترافِ جرم کرانے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ الزام اگر آتا تو پولیس پر۔ پولیس جسمانی ریمانڈ کے پیریڈ میں تفتیش کیسے کرتی ہے۔ یہ عدالتوں کے علم میں بھی تھا چنانچہ اب کسی زیرِ تفتیش ملزم کی خراب حالت دیکھ کے بیشتر عدالتوں کا ردِ عمل کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

اگر عدالتیں سختی سے قانون پر عمل درآمد کراتے ہوئے پولیس کو تھرڈ ڈگری کے حربے استعمال کرنے سے واقعی روک دیں تو شاید جتنے جرائم کا سراغ اب مل جاتا ہے اس سے نصف میں بھی پولیس کو کامیابی نہ ہو لیکن معاشرے میں ارتکابِ جرم کی شرح دگنی ہو جائے۔ مجرم جیل سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا تفتیش کے دوران پولیس کی حراست سے ڈرتے ہیں۔

رات کے وقت رب نواز پھر مسلح محافظ کے ساتھ آیا اور میرے پاس بیٹھ گیا۔ "تم بہت ضدی آدمی ہو' تم مر بھی سکتے تھے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر میری قضا آگئی ہوتی۔"

وہ بولا "دلنواز کو یقین ہے کہ تم ہی وہ داڑھی والے جن ہو۔"

"اور تمہیں؟"

"اس کے یقین کو دیکھتے ہوئے میں بھی ایسا ہی سمجھنے پر مجبور ہوں۔"

میں نے کہا "گویا تمہاری بھی ضد ہے کہ مجھ سے منوا کے دم لو گے۔"

وہ بولا "دلنواز نے حساب لگایا ہے کہ تمہاری وجہ سے ہمیں اس چھ لاکھ پاؤنڈز کے علاوہ کم سے کم ایک کروڑ کا نقصان ہوا ہے۔ چھ لاکھ پاؤنڈز کے بھی پاکستانی کرنسی میں تقریباً پونے تین کروڑ بنتے ہیں۔ اگر تم چار کروڑ ادا کرنے پر رضامندی ظاہر کرو تو تمہاری جان چھٹ سکتی ہے۔"

"اور اگر میں نہ مانوں تو؟"

"پھر تم ہمیشہ مشکل میں رہو گے۔ ابھی تو تم صرف دو دن کے مہمان تھے۔ صبح مجسٹریٹ تمہیں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دے گا۔ جس طرح پولیس میری مرضی کے تابع ہے' اسی طرح جیل میں بھی میری مرضی چلتی ہے۔ تم کو شاید اپنی دولت پر بھروسا ہو گا۔ یا پھر قانون پر۔ لیکن تمہارے لیے نہ اے کلاس ہو گی نہ بی۔ تم سی کلاس میں عام مجرموں سے بدتر حالات میں زندگی گزار رہے ہو گے۔ اور جو کچھ تمہارے ساتھ جیل میں ہو گا اس کی خبر کوئی باہر پہنچانے والا نہیں ہو گا۔ تمہارے اخباری دوست تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

جو کچھ رب نواز کہہ رہا تھا' غلط نہیں تھا۔ وہ جیل کے اندر میری زندگی کو عذاب کا جہنم بنا سکتا تھا اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جیل کے اندر کی دنیا کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ رب نواز کی چار کروڑ ادا کرنے کے وعدے والی بات احمقانہ اور مضحکہ خیز ضرور تھی مگر صرف ایک وعدے پر میری نجات ممکن ہو اس سے اچھی بات بھی کون سی ہو سکتی تھی۔

میں نے کہا "چار کروڑ میں کیسے ادا کروں گا؟ میرا مطلب ہے اگر میں نے وعدہ کر کے جان چھڑا لی؟"

وہ معنی خیز انداز میں سر ہلانے لگا "تم نے اچھا کیا پوچھ لیا' رب نواز کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ تم پہلے بھی میرے مقروض تھے مگر اس وقت ہمارے درمیان ایک کاروباری معاہدہ تھا۔ اب میں تم پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ میں تم سے

مختلف تاریخوں کے اسٹامپ پیپرز پر ایگری منٹ کروں گا جس کی رو سے تم مجھے مجموعی طور پر چار کروڑ روپے ادا کرنے کے پابند رہو گے۔ تم بہت سی رسیدوں پر دستخط کرو گے اور میری مرضی کے مطابق تاریخیں ڈالو گے۔ اگر بعد میں تم نے ادائیگی نہ کی تو دوسرے وصولی کے طریقے اپنی جگہ۔ میں تمہارے خلاف سول سوٹ فائل کردوں گا۔ اس میں جتنا وقت چاہے لگے لیکن بالآخر مجھے تمہارے خلاف ڈگری مل جائے گی۔"

"تم اس ڈگری کا کیا کرو گے' چاٹو گے؟"

وہ بولا "میں تمہارے بینک اکاؤنٹ منجمد کرا سکتا ہوں۔ تمہیں جیل بھجوا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "چار کروڑ روپے ادا کرتے کرتے میری ساری زندگی گزر جائے گی۔"

"جھوٹ مت بولو۔ یہ چند سودوں کا کھیل ہے۔ اگر تم اپنے حصے کا منافع بھی میرے حوالے کردو تو زیادہ سے زیادہ آٹھ سال میں قرض ادا ہوجائے گا۔"

میں نے ذہنی مزاحمت جاری رکھی تاکہ اسے شک نہ ہو ورنہ چار کروڑ کیا' وہ چار ارب کا قرض ادا کرنے کے وعدے پر میری جان چھوڑ دیتا تو میں آنکھ بند کرکے ہر دستاویز پر دستخط کرنے کے لیے تیار تھا۔

میں نے کہا "میرا سالانہ منافع اتنا تو نہیں ہوتا۔"

وہ بولا "ایک طریقہ اور ہے۔ ابھی تک اس کاروبار میں سارا سرمایہ میرا تھا۔ اگر تم ایک پارٹنر بن جاؤ۔"

"پارٹنر تو میں ہوں۔"

"ابھی تم ورکنگ پارٹنر ہو۔ اگر اتنا ہی سرمایہ تمہارا ہو جتنا میرا ہے تو ہمارا کام دگنا ہوجائے گا۔ مال کی فکر مت کرو۔ فیلڈ میں سپلائر زیادہ ہوتے جارہے ہیں اور مارکیٹ بھی اوپن ہوتی جارہی ہے۔ قیمت بھی پہلے سے اچھی مل رہی ہے۔ اس لیے منافع بڑھنے کی توقع ہے۔ تم دو سال میں بھی فارغ ہوسکتے ہو۔"

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں سوچ میں پڑ گیا ہوں اور اس پیش کش پر غور کررہا ہوں۔ بالآخر میں نے کہا "مجھے یقین ہے کہ تم نے تمام امکانات پر غور کرلیا ہوگا۔"

مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی خوشی کو دبانے کی کوشش کررہا ہے۔ "میں نے سب سوچ لیا ہے لیکن فیصلہ تمہارا ہے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم اِدھر اُدھر مت جاؤ۔ پیر سبحان شاہ جیسے بہت سے لوگوں کی میرے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔ بہت سے نئے لوگ بھی میدان میں آرہے ہیں مگر تم دیکھنا ان میں سے کوئی ٹکنے والا نہیں ہے۔ وہ خود نکل جائیں گے ورنہ میں انہیں بھاگنے پر مجبور کردوں گا۔"

میں نے کہا "تم پھر مجھ پر اعتبار کررہے ہو۔"

"اس کے لیے تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ تمہارا سیاست کا کھیل تو اب ختم ہوا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ اگر تم خود سیاست چھوڑ کے اپنی ساری توجہ کاروبار پر دو تو تمہیں خود اندازہ ہوجائے گا کہ یہ سیاست سے کہیں زیادہ منافع بخش پیشہ ہے۔ مجھے دیکھو۔ میں نے پہلے پیسہ کمایا پھر سیاست میں آیا اور سیاست کو بزنس پروموشن کے لیے استعمال کیا۔ تم نے اس کا الٹ کیا اور نقصان میں رہے۔ خیر اب تم اپنی پوری کوشش کرو تو کم سے کم اپنے مالی بحران پر ضرور قابو پالو گے اور مجھے یقین ہے کہ تمہارے حالات بالآخر ٹھیک ہوجائیں گے۔"

رب نواز نے آہستہ آہستہ اپنا تحکمانہ انداز برتری اور اپنی بالادستی کا غرور چھوڑ کے کچھ ناصحانہ اور بزرگانہ انداز اختیار کرلیا تھا اور ظاہر یہ ہوتا تھا جیسے اس سے بڑھ کر میرا خیر خواہ کوئی بھی نہیں ہوسکتا حالانکہ ایک تو اسے اپنے ڈوب جانے والے سرمائے کی فکر تھی تو دوسری طرف اپنی کمزور قانونی پوزیشن کا احساس تھا۔ وہ میرے ذریعے ایک ایسی بازی کوئی حکمتِ عملی سے جیتنے کی پلاننگ کررہا تھا جو بظاہر اس کی ہار کی طرف جارہی تھی۔ وہ تین چار کروڑ کے پھیر میں آچکا تھا مگر اپنا ہاتھ اوپر رکھتے ہوئے مجھے زیرِ دام لانے کی کوشش کررہا تھا کہ میں اسے قرض مان لوں اور اس کی ادائیگی کی ذمے داری قبول کرلوں۔

میں نے بہت "بے وقوف" ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بالآخر اپنی رضامندی کا اظہار ایسے کیا جیسے مجبوری نے میرے لیے انکار کے سب راستے مسدود کردیے ہیں۔ ملک رب نواز کی خوشی کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا لیکن اس نے چہرے سے اپنے جذبات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے اور اس کے ہونہار سپوت نے موقع سے دہرا فائدہ اٹھالیا۔ انہوں نے اپنی بدمعاشی کی۔ بے حد و حساب طاقت کا مظاہرہ کرکے مجھے دہشت زدہ بھی کردیا اور اپنے مربیانہ رویے سے مجھے قائل کرکے صراطِ مستقیم بھی دکھادی۔

ہونہار سپوت ایک بار پھر میدانِ عمل میں نظر آیا۔ بظاہر اس نے اپنے والد کی عاقبت نااندیشی والی پالیسی سے اختلاف کیا جو میرے جیسے محسن کش اور بے اعتبار شخص کو تیسری بار "سدھرنے" کا موقع فراہم کرکے بڑی فاش غلطی کررہے تھے اور یہ مقولہ بھی دہرایا کہ مومن ایک سوراخ

سے دوبار نہیں ڈسا جاتا اور والد صاحب نے فرمایا کہ اس دورِ پُرآشوب میں مومن کون ہے؟ بزنس میں اونچ نیچ ہوتی ہے اور حالات کی خرابی کو مزید خرابی کی طرف لے جانے میں دانش مندی کوئی نہیں۔

اگلی صبح مجھے پھر مجسٹریٹ کی عدالت میں پیشی کے لیے جانا تھا لیکن حالات کچھ ایسے بدلے تھے کہ نصف شب کو ایک سہ فریقی مذاکرات کا دور ہوا جس میں میرے اور رب نواز کے ساتھ ایس ایچ او سلامت علی بھی شریک رہا۔ طے یہ پایا کہ پولیس میرا مزید تین دن کا ریمانڈ لے گی تاہم اس کے لیے میرا بنفسِ نفیس پیش ہونا بالکل ضروری نہیں۔ اگر میرا وکیل اعتراض نہ کرے تو وہ صبح مجسٹریٹ کے چیمبر سے مزید تین دن کے لیے ریمانڈ کے احکامات حاصل کرلے گا اور میں مزید تین دن ملک صاحب کا مہمان رہوں گا۔

سب کچھ طے ہوجانے کے بعد میں نے ایک نکتہ اٹھایا۔ "ملک رب نواز مجھے تمہارے پلان کے مطابق چلنے میں اصولی طور پر کوئی اعتراض نہیں لیکن عملی طور پر یہ کیسے ہوگا۔ تین دن بعد مجھے جیل بھیج دیا جائے گا اور میرے خلاف قتل کے دو مقدمات شروع ہوجائیں گے۔ تیسرا مقدمہ میرے ضمانت توڑ کے فرار ہونے کا ہے۔"

رب نواز نے سوچ کے کہا "تمہارا وکیل کیا کہتا ہے؟"

میں نے کہا "وہ کہتا ہے قتل کے مقدمات میں کوئی جان نہیں مگر اس کیس میں مجھے سزا ہوسکتی ہے جس کا تعلق سماعت کے دوران میں کورٹ کی اجازت کے بغیر لندن جانے سے ہے۔ میں دو سال مفرور رہا۔"

رب نواز نے ایس ایچ او کی طرف دیکھا "اس کیس میں کیا ہوسکتا ہے؟"

"شاہ جی عدالت سے معافی مانگ لیں اور خود کو عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں تو عدالت معاف بھی کرسکتی ہے۔"

میں نے کہا "عدالت معاف نہیں کرے گی۔"

"تو کم سے کم سزا دے سکتی ہے۔ صرف چھ مہینے' چھ مہینے تو ایسے ہی گزر جائیں گے سماعت میں اور جتنا عرصہ تم جیل میں گزارو گے وہ سزا کی مدت میں شامل ہوگا۔"

میں نے کہا "یعنی مجھے جیل ضرور جانا پڑے گا۔"

"اگر تمہارا وکیل عدالت کے باہر دوڑ دھوپ کرے اور اچھا خاصا پیسہ خرچ کیا جائے کیس کو کمزور کرنے کے لیے تو چار چھ پیشیوں میں قتل کے مقدمات ختم ہوجائیں گے۔ فرار کے کیس میں تمہیں ایک سال کی جیل ہو تو چھ مہینے میں تم باہر آجاؤ گے۔ چھ مہینے تمہیں بہر صورت اندر رہنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "ایسی کوئی صورت نہیں ملک صاحب کہ میں جیل نہ جاؤں؟"

رب نواز نے کہا "اتنا گھبرانے کی کوئی بات نہیں' جیل میں تمہیں اے کلاس بھی مل سکتی ہے۔ باقی گھر جیسی سہولت تم خود حاصل کرسکتے ہو۔ شاہ جی جیل تو ہوتی ہے مفلس اور لاوارث کے لیے۔ ورنہ سزا کا صرف نام ہوتا ہے۔ لوگ دن میں ایک بار وہاں حاضری لگوانے جاتے ہیں۔ ہر رات اپنے گھر میں آرام سے سوتے ہیں۔ ٹیلی فون' ٹیلی وژن اور اخبارات' نوکر چاکر' سب تمہارے پاس ہوں گے۔ بس چھ مہینے پورے کرنے ہیں۔"

میں نے مردہ دلی سے کہا "یعنی چھ مہینے میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

"چھ مہینے تم آرام کرسکتے ہو" سلامت علی طنز سے بولا۔

تمام معاملات طے پانے کے بعد میں نے خود کو بہت پُراعتماد محسوس کیا۔ مجھے پوری امید تھی کہ اب میرے ساتھ ملک رب نواز کے گھر میں دوستانہ سلوک ہوگا اور میری نگرانی پہلے جیسی سخت نہیں رہے گی تو مجھے فرار کے مواقع بھی حاصل ہوجائیں گے۔ لیکن یہ توقع سے بڑھ کر توقع رکھنے والی بات غلط ثابت ہوئی۔ رب نواز ایک غلطی ضرور کررہا تھا مگر وہ اتنا بھی احمق نہیں تھا کہ مجھے آزاد کردیتا۔ مجھ پر مسلح پہرا بھی رہا اور میری نقل و حرکت اپنے بیڈ روم تک محدود رہی۔

صبح میں نے فرید عباسی سے فون پر کہا کہ وہ عدالت میں میری پیشی پر اصرار نہ کرے "پولیس آج میرا مزید تین دن کا فزیکل ریمانڈ لے گی۔"

"لیکن تو ہے کہاں؟"

میں نے کہا "میں ملک رب نواز کے ڈیرے پر ہوں۔"

"کیوں؟ تجھے پولیس نے وہاں کیوں پہنچا دیا؟"

میں نے کہا "تو فکر مت کر۔ حالات صحیح سمت میں جارہے ہیں۔"

وہ بولا "کوئی تجھ سے گن پوائنٹ پر یہ سب کہلوا رہا ہے؟"

"ہرگز نہیں کیا تو میرے لہجے سے اندازہ نہیں کرسکتا؟ باقی سب لوگوں کو بھی بتادینا کہ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ انشاء اللہ ایک دو روز میں پھر سب سے ملاقات ہوگی' فی الحال کوئی کچھ بھی نہ کرے۔"

فرید عباسی خاموش ہوگیا۔ اس نے بڑی دوراندیشی سے

کام لیا کہ شک پیدا کرنے والی کوئی بات نہیں کی۔ اس نے اندازہ کرلیا ہوگا کہ جب میں رب نواز کے ڈیرے سے بات کررہا ہوں تو یہ گفتگو رب نواز بھی سن رہا ہوگا۔

میں سارا دن ایک کمرے میں رہا۔ وہ ملک رب نواز کی حویلی کا مہمان خانہ یعنی گیسٹ بیڈ روم تھا۔ ظاہر ہے وہاں آرام و آسائش کے تمام لوازمات مہیا تھے اور کسی بھی چیز کے لیے میرا ایک اشارہ کافی تھا مگر اس کے باوجود میری حیثیت ایک قیدی جیسی تھی۔ ایک مسلح محافظ ہروقت میرے سامنے بند دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا رہتا تھا اور اسے یقیناً یہ ہدایات ہوں گی کہ میں باتھ روم کے دروازے کے علاوہ کسی اور دروازے کا رخ کروں تو مجھے روک دے اور میرے نہ رکنے کی صورت میں مجھ پر گولی چلانے سے دریغ نہ کرے۔ بے شک اسے یہ ہدایات بھی دی گئی ہوں گی کہ گولی چلاتے وقت وہ صرف میرے پیروں کو نشانہ بنائے۔ رب نواز اس بات کا پابند تھا کہ مجھے زندہ سلامت' سلامت علی کو لوٹائے۔

ایک نرس اور ایک ڈاکٹر نے مجھے ہر ممکن علاج معالجے کی سہولت فراہم کی۔ نرس سارا دن وہیں موجود رہی۔ ڈاکٹر تین بار آیا اور مجھے مختلف دواؤں کے انجکشن لگا کے چلا گیا۔ میری صحت حیرت انگیز تیز رفتاری کے ساتھ بحال ہورہی تھی اور میرے زخم مندمل ہونے لگے تھے۔

مجھے ایک بار یہ خیال بھی آیا کہ میں نرس کو یرغمال بنالوں اور پھر مطالبہ کروں کہ مجھے بحفاظت باہر نکلنے دیا جائے ورنہ میں اسے مار ڈالوں گا۔ لیکن مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ ملک رب نواز کے لیے ایک نرس کی زندگی کی اتنی اہمیت ہوگی۔ چنانچہ میں نے بہتر اور مناسب موقع کا انتظار کیا۔

اگلے دن ایک وکیل نے رب نواز کی موجودگی میں مجھ سے ملاقات کی۔ اس کے پاس گزشتہ دو سالوں کی تاریخ والے مختلف مالیت کے اشٹامپ پیپر تھے جن پر مختلف عبارتیں لکھی ہوئی تھیں۔ میں نے انہیں پڑھنے کی کوشش کی تو اس نے کہا کہ میں یہ زحمت نہ کروں۔ جو عبارت ایک پر تحریر ہے وہی دوسرے اشٹامپ پیپر کی ہے۔ صرف اس کی تاریخ الگ ہے اور اس میں قرض کی رقم مختلف ہے۔

ان تمام اشٹامپ پیپرز کی رو سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ میں نے یعنی شاہ عالم ولد محمد عالم نے مختلف مقاصد کے لیے الگ الگ مواقع پر ملک رب نواز ولد ملک شاہنواز سے قرض حاصل کیا۔ اس نے مجھ سے بیس پچیس رسیدوں پر دستخط لیے۔ ان پر گواہوں کے دستخط نہیں تھے ہمیں رب نواز نے کہا کہ ان کی کوئی ضرورت نہیں اور ضرورت پڑی تو دستخط کرنے والے بہت۔

میں نے ایسی مظلوم صورت بنائے رکھی جیسے میرے ساتھ زور زبردستی سے کام لیا جارہا ہے اور میں دستخط کرنے پر مجبور ہوں ورنہ کاغذات پھاڑ کے ملک رب نواز کے منہ پر مارتا اور نکل جاتا۔ ہر ایگری منٹ کے ساتھ ایک رسید تھی۔ کم سے کم رسید دس لاکھ کی تھی اور زیادہ سے زیادہ پچیس لاکھ کی۔ ان کی مجموعی مالیت' مجھے بتایا گیا۔ تین کروڑ نوے لاکھ بنتی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ خود ملک رب نواز بھی اس کاغذی کارروائی کی قانونی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوگا۔ کوئی شخص اگر سارے معاہدوں سے منکر ہوجائے تو اس کے خلاف وصولی کے لیے دیوانی مقدمات دائر کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا اور تین کروڑ نوے لاکھ کی مالیت ہو تو مقدمہ صرف ہائی کورٹ میں جاسکتا ہے لیکن الگ الگ معاہدے کرنے کا مقصد یہی تھا کہ پچیس لاکھ تک کا مقدمہ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں پیش کیا جاسکے۔ اس پر لاکھوں روپے مالیت کی اشٹامپ ڈیوٹی لازمی تھی' اس کے لیے لاکھوں روپے وکیل کی فیس میں دینے کے باوجود سالہا سال کا انتظار بھی ناگزیر تھا۔ اس کے بعد ایک چانس ضرور تھا کہ میرے خلاف مجموعی مالیت کی ڈگری لی جاسکے اور وصولی کے لیے میری جائیداد اور اثاثے نیلام کراکے اور میرے بینک اکاؤنٹ ضبط کراکے عدالتی احکامات پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جاسکے۔ اگر ملک رب نواز یہ چانس لینا چاہتا تھا تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ بصورت دیگر ملک رب نواز مجھے اذیت دیتا رہتا یا مروادیتا تب بھی اسے کیا ملتا۔

اس رات میں نے رہائی کے لیے کوشش کرنے کا فیصلہ کیا' یہاں اس کے لیے حالات زیادہ سازگار تھے ورنہ اگلی صبح عدالت کا دیا ہوا چھ دن کا فزیکل ریمانڈ ختم ہوجاتا تو پولیس کی تحویل سے نکل کے میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل حکام کے حوالے کردیا جاتا۔ بے شک پولیس کی حراست کے بعد بیشتر ملزمان کے لیے جوڈیشل ریمانڈ ایک بڑے عذاب کے جہنم سے بہت کمتر درجے کے جہنم میں منتقلی ہوتی ہے مگر میرے لیے یہ آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکنے کے مترادف ہوتا۔ پولیس کی حراست سے بھی فرار ہونا یقیناً آسان نہ تھا مگر جیل سے فرار ہونا تو عملاً ناممکن ہوجاتا۔

سب سے اچھے مواقع مجھے ملک رب نواز کے گیسٹ بیڈ روم میں حاصل تھے۔ رب نواز کوئی رسک نہیں لے رہا تھا

مگر میں مایوس نہیں تھا۔ میں نے کسی حد تک اپنے ذہن میں ایک پلان کو حتمی شکل دے دی تھی جس کے مطابق مجھے پہلے لالی کو قابو کرنا تھا۔ جو درحقیقت شاہ جنات کی بیٹی کو قابو کرنے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ وہ مجھ سے کئی گنا طاقتور اور پھرتیلی تھی اور مردانہ وار بلکہ حیوانہ وار میرا مقابلہ کرسکتی تھی لیکن میں نے اس کی کمزوریاں بھی تاڑلی تھیں اور اب مجھے مناسب موقع کا انتظار تھا۔

یہ موقع مجھے رات گئے ملا جب لالی میرے طلب کرنے پر کافی لے کر آئی۔ باہر سے اس کے آنے کی آہٹ سن کر میں سوتا بن گیا۔ اس نے کافی کا مگ میرے قریب ایک میز پر رکھا اور کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں کھڑی رہی۔ اس کے ساتھ محافظ بن کے آنے والا کلاشنکوف کا رخ میری طرف کیے کھڑا تھا۔

"کافی منگوا کے سوگیا۔" لالی نے عجیب سی غراہٹ کے ساتھ حلق سے آواز نکالی۔

محافظ نے کہا "سوگیا ہے تو جگادے۔"

لالی مجھ پر جھکی۔ اس کا ایک بازو میرے بازو پر جم گیا۔ میں نے خدا کا نام لے کر اسے ایک دم دبوچ لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ گارڈ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرپاتا میں نے لالی کو اس کے اوپر پھینک دیا۔ وہ چھ فٹ قد اور دو سو پاؤنڈز وزن کی اس مخلوق کے اچانک اوپر آپڑنے سے سنبھل نہ پایا۔ وہ اپنی کلاشنکوف سمیت نیچے دب گیا۔

میں نے بیڈ پر سے جست لگائی اور ان دونوں کے اوپر جا گرا۔ وہ ابھی اٹھنے کی کوشش ہی کررہے تھے کہ دوبارہ گر گئے۔ میرا ہاتھ سیدھا کلاشنکوف پر گیا اور ایک جھٹکے سے میں نے اسے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ایک سیکنڈ بعد میں اپنے پیروں پر کھڑا تھا۔

لالی بڑی پھرتی کے ساتھ اٹھ کے پلٹی تو میں بائیں پیر کی ایڑھی پر پورا گھوم گیا اور اپنا دایاں پیر گھما کے لالی کے پیٹ پر رسید کیا۔ اس نے حلق سے ایک خوفناک غراہٹ کی آواز نکالی اور لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی تو خالی ہاتھ رہ جانے والے گارڈ سے ٹکرائی جو مجھ پر حملہ کرنے کے لیے آگے آرہا تھا۔ گارڈ دیوار سے ٹکرایا تو اس کا سر تیز آواز کے ساتھ دیوار پر لگا۔

لالی پھر مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ اس کے دونوں بازو بڑے وحشیانہ انداز میں مجھے دبوچ لینے کے لیے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ میں ایک دم بیٹھ گیا اور نیچے سے کلاشنکوف کا فولادی بٹ پوری قوت کے ساتھ اس کے سینے پر مارا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے پیٹ میں سر مارتے ہوئے اسے اوپر اٹھایا۔ وہ ایک چیخ مار کے میرے اوپر سے گزری اور بیڈ سے ٹکرا کے فرش پر گر گئی۔

اب گارڈ میرے سامنے آگیا۔ میں نے کلاشنکوف کا دستہ اس کے سر پر رسید کیا تو اس کی ایک ہی چیخ نکلی پھر وہ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو لالی مجھ پر حملہ آور ہوچکی تھی۔ اس نے مجھے پیچھے سے دبوچ لیا تھا اور اس کے وحشیانہ قوت رکھنے والے لمبے لمبے بازو مجھے بے بس کررہے تھے۔

لالی نے مجھے دبانا شروع کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری سانس رک جائے گی۔ میں نے ایک ہاتھ کی کہنی پیچھے سے اس کی پسلیوں میں رسید کی۔ پھر ایک پاؤں کی ایڑی سے پیچھے کی طرف اس کی ٹانگوں کے بیچ میں شدید ضرب لگائی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑگئی۔ میں نے اس کے بوجھ کو اپنی کمر پر اٹھالیا اور ایک دم آگے جھک گیا۔ میں نے اور آگے جھک کر سر کو زمین کی طرف یوں جھکالیا' جیسے میں سر کے بل قلابازی کھانے والا ہوں۔ لالی کا بوجھ آگے شفٹ ہوا تو میں نے سر زمین پر ٹکا کے ایک جھٹکا دیا اور لالی کی گرفت سے نکل گیا۔ وہ کمر کے بل سیدھی آگے گری اور ابھی پلٹی ہی تھی کہ میں نے کلاشنکوف کا دستہ پوری قوت کے ساتھ اس کے سر پر مارا۔ سر کے پچھلے حصے میں پڑنے والی یہ ضرب فیصلہ کن ثابت ہوئی اور لالی ایک بھیانک چیخ کے ساتھ نیچے گر کے ساکت ہوگئی۔

اب صورت حال میرے کنٹرول میں تھی لیکن لالی نے اپنے حلق سے جنگلی جانوروں جیسی آوازیں نکال کے مجھے کچھ تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ گھر میں رہنے والوں کے کانوں تک بھی یہ چیخ پکار گئی ہو۔

وقت ضائع کیے بغیر میں کلاشنکوف اٹھا کے باہر نکلا اور سیدھا زینے کی طرف دوڑا۔ اس گھر کا نقشہ میرے ذہن میں تھا اور میں اب ایک پلان کے مطابق چل رہا تھا لیکن زینے سے اوپر پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا کہ اوپر والا دروازہ باہر کی طرف سے لاک ہے۔

میں نے دروازے پر دستک دی اور لالی جیسی آواز نکالنے کی کوشش کی "دروازہ کھول۔"

باہر سے کسی نے کہا "کون ہے؟"

میں نے کہا "میں ہوں— لالی!"

چند سیکنڈ گزر گئے۔ انہی چند سیکنڈوں میں میری کامیابی یا ناکامی کا انحصار تھا۔

انتظار کے وہ چند سیکنڈ ایک طویل عذاب ناک مرحلہ بن گئے۔ میں سانس روکے دروازے کے کھلنے کا منتظر رہا۔ مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں دروازے کی کسی جھری سے گارڈ اندر جھانک کے نہ دیکھ لے اور کامیابی کے سفر پر منزل کی جانب اٹھایا جانے والا پہلا قدم ہی ناکامی کی نذر۔۔ ہوجائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

باہر سے کسی نے دروازہ کھول کے اپنا سر اندر ڈالا اور بولا "کون ہے؟"

میں نے کہا "تمہارا اوریجنل باپ" اور سر کو بالوں سے پکڑ کے ایک جھٹکے سے اندر کھینچ لیا۔ اس کے حلق سے گالی نکلی۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی مگر اس کا جسم نیچے اترنے والی سیڑھی پر اتنا جھک گیا تھا کہ اب میں بھی اسے لڑھک کر نیچے جانے سے نہیں بچا سکتا تھا۔

وہ منہ کے بل یوں زینے پر گرا کہ اس کا سر نیچے کی طرف تھا اور کشش ثقل اسے مسلسل آگے کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جانے والی کلاشنکوف اس کے پیچھے جا رہی تھی کہ میں نے اسے روک لیا۔

سیکیورٹی گارڈ کا منہ زینے کی دھار پر سیدھا لگا تھا۔ اس کے سامنے والے سارے دانت ٹوٹ گئے تھے اور غالباً ناک کی ہڈی بھی سلامت نہیں رہی تھی۔ وہ اذیت سے چلایا "ہائے میں مر گیا" مگر پھر اس کا سر اگلی سیڑھیوں سے ٹکرایا تو وہ خاموش ہو گیا اور پھر آخر تک کسی بے جان لاش کی طرح گیا۔

مجھے شک ہوا کہ گارڈ غالباً گردن کی ہڈی کے ٹوٹ جانے سے مر گیا ہے کیونکہ زینے سے فرش پر پہنچنے کے بعد وہ بڑے عجیب انداز میں مڑا تڑا اور بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر اتنا زیادہ پیچھے کی طرف گھوم گیا تھا کہ گردن کی ہڈی سلامت ہوتی تو ایسے ناممکن زاویے پر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

مجھے اس کی موت کا افسوس ہوا لیکن وہ عداوت کی بساط پر کام آجانے والا ایک حقیر پیادہ تھا' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ چیونٹا تھا جو ہاتھیوں کی جنگ میں پیروں تلے مسلے بھی جاتے ہیں۔ زندہ رہنے اور جسم وجاں کا رشتہ استوار رکھنے کی مشکل نے اسے ملک رب نواز کے در کی نگہبانی پر مجبور کر دیا تھا جہاں خطرات کو ملک صاحب کی ذات سے دور رکھنے میں اپنی جان کی بازی لگانا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔

دروازے سے گزر کے میں نے گراؤنڈ فلور پر قدم رکھا تو میرے سامنے ایک اسٹور آگیا جہاں ہر قسم کا پرانا اور غیر ضروری سامان ڈھیر کر دیا گیا تھا۔ سامان میں ایک آفس چیئر' ایک ایکسرسائز مشین' کسی کیمیکل کا گہرا نیلا ڈرم۔ چھوٹے بچوں کی دو پرانی سائیکلیں' دیوار کے سہارے کھڑے ہوئے دو اسپرنگ والے میٹرس جو درمیان سے کچھ دب گئے تھے۔ ایک پیڈسٹل لیمپ اور ڈرائنگ ٹیبل کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔

میں ان چیزوں سے بچتا بچاتا اس دروازے تک گیا جس کے بائیں جانب ایک طویل کاریڈور نظر آرہا تھا۔ اسٹور اس کے بالکل آخری حصے میں تھا چنانچہ میں دائیں جانب لوہے کی گرل والی ایک کھڑکی دیکھ سکتا تھا جس کے شیشوں والے پٹ کبھی کھولے نہیں گئے تھے۔ ان پر مہینوں کا یا شاید سالوں کا گرد وغبار جمع تھا۔ میلے شیشوں سے باہر کا دھندلا سا اجالا جھلک رہا تھا۔ گرل اور فریم کے درمیان مکڑیوں کے ان گنت جالے تھے اور کوڑا کچرا تھا۔ میرے لیے اس کھڑکی کو کھول کے باہر کے منظر کا جائزہ لینا مشکل ہی نہیں خطرناک بھی تھا۔

کوریڈور میں مجھے دائیں طرف تین اور بائیں طرف چار دروازے نظر آرہے تھے۔ دائیں جانب کے دروازے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھے۔ ان میں سے ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں سے لوگوں کے بات کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے دھیان سے سنا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کچن تھا۔ وہاں برتن اٹھا کے رکھے جا رہے تھے اور ملازم ایک دوسرے سے فحش مذاق کر رہے تھے۔ پھر کسی نے کہا "جلدی کر حرامی ورنہ ملک صاحب تجھے گولی ماردیں گے۔" اور جواب میں دوسرے نے کہا "تو اپنا کام کر۔ چائے دم ہوگی تو لے کر جاؤں گا یا ایسے ہی گرم پانی لے جاکے سامنے رکھ دوں؟"

میں نے سکون کے ساتھ مناسب موقع کا انتظار کرنے میں خیریت جانی۔ میں اس وقت ایک فیصد کے چانس پر بھی رسک نہیں لے سکتا تھا۔ چند منٹ کے بعد ایک باوردی ویٹر چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا نکلا اور کاریڈور میں میری طرف پیٹھ کرکے چلنے لگا۔ اس نے بائیں جانب کا آخری دروازہ کھولا اور ٹرالی سمیت اندر غائب ہو گیا۔

میرے کانوں میں بلند آواز میں باتیں کرنے اور کسی کے زور سے قہقہہ لگانے کی آواز کے ساتھ کسی عورت کے خفگی سے چلانے کی آواز آئی "اتنی دیر کر دی چائے لانے میں" میں سمجھ گیا کہ وہ ڈرائنگ روم ہے کیونکہ عورت کی آواز سے میں نے ملکانی کو پہچان لیا تھا۔ وہاں شاید ان کے مہمان جمع تھے جو بے فکری سے گپیں لگا رہے تھے۔

ویٹر کچھ دیر بعد خالی ہاتھ واپس آگیا۔ کچن میں تین ملازم تھے جو اب خاموشی سے کام میں مصروف ہوگئے تھے۔ پھر ان میں سے ایک نکلا اور کوریڈور سے سیدھا گزرتا چلا گیا۔ باقی دو میں سے ایک چند منٹ بعد برآمد ہوا اور بالکل ساتھ والے دروازے میں گھس گیا۔ جب وہ برآمد ہوا تو اپنی شلوار کا ازار بند باندھ رہا تھا۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ دوسرا دروازہ ملازمین کے استعمال میں رہنے والے باتھ روم کا تھا۔

کچن کے سامنے سے گزرے بغیر میں باہر نہیں نکل سکتا تھا لیکن کچن میں تین افراد موجود تھے اور یہ ناممکن تھا کہ ان میں سے کسی کی نظر بھی مجھ پر نہ پڑے۔ میں نے کسی ویٹر سے وردی اتروا کے خود پہننے اور بھیس بدل کے نکل جانے کے امکانات کا جائزہ لیا اور اس خیال کو مسترد کرنے پر مجبور ہوا۔ ملازموں میں سے ایک بھی میری طرح باریش نہیں تھا۔ طویل کاریڈور کو عبور کرتے ہوئے کسی بھی لمحے میرا سامنا گھر کے کسی مالک سے ہوجاتا تو شور مچ جاتا۔

میرے ہاتھوں ایک بے قصور محافظ پہلے ہی ہلاک ہوچکا تھا۔ اب میں کلاشنکوف کا استعمال صرف ڈرانے کے لیے اور اپنا راستہ صاف مانگنے کے لیے کرنا چاہتا تھا لیکن ملک رب نواز کے جاں نثاروں اور محافظوں سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ مقابلے پر اتر آئیں۔ وہ سب مسلح تھے اور ایسے ہی مواقع پر ان کی نمک حلالی اور وفاداری کی آزمائش ہوتی تھی۔ اگر وہ مجھ سے ڈر کے راستہ چھوڑ دیتے یا اپنی جان بچانے کے لیے کسی محفوظ کونے کھدرے میں دبک جاتے تو یہ بزدلی اور نااہلی انہیں بعد میں بہت مہنگی پڑتی چنانچہ یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ مقابلہ ہوگا اور صرف ایک دوسرے کو ڈرا کے پیچھے ہٹنے پر مجبور کرنے کے لیے نہیں ہوگا۔ یہاں فرار کے راستے بھی نہیں تھے چنانچہ سامنے آجانے والے مرنے یا مارنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اچانک مجھے یاد آگیا۔ یہ مجھے ملک رب نواز کی خدمت میں پیش کرنے والے تھانا انچارج انسپکٹر سلامت علی کی آواز تھی۔ شاید وہ اپنے قیدی کو واپس لے جانے کے لیے آگیا تھا۔ ملزم زیر حراست شاہ عالم کا مزید تین یوم کا ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے اسے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا۔

اس کا مطلب بہت واضح تھا۔ کچھ ہی دیر میں میرے فرار کا راز فاش ہونے والا تھا لیکن میری یہ حالت تھی کہ میں ابھی کوٹھری سے نکل کر زنداں کی دیواروں کے اندر ہی بھٹک رہا تھا۔ میرا دوبارہ پکڑا جانا یقینی تھا اور اس بار میری گرفتاری زیادہ سنگین الزامات کی بنیاد پر ہوتی۔ میں نے لالی کو ناک آؤٹ کیا تھا۔ ایک محافظ کو بے ہوش کر دیا تھا اور دوسرے کو مار ڈالا تھا۔

قانونی طور پر میں پولیس کی تحویل میں اور تھانے میں بند تھا چنانچہ ملک رب نواز کے گھر کی کسی واردات میں مجھے ملوث کرنا خود سلامت علی کو بھی مشکل میں ڈال دیتا مگر وہ گرگ باراں دیدہ تھا۔ وہ اپنے تجربے اور اپنی شیطانی ذہانت سے کام لیتے ہوئے جائے واردات کو کسی ایسی لوکیشن پر لے جاتا جہاں کوئی کہانی بنا کے بار جرم مجھ پر ڈالنے میں قباحت کوئی نہ ہوتی۔

رب نواز اچانک ہی کاریڈور میں طلوع ہوا۔ اس سے ایک قدم پیچھے انسپکٹر سلامت علی نکلا۔ دلنواز کے باہر آنے تک اس کا باپ میری طرف کئی قدم بڑھ چکا تھا۔

اب میرے لیے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن والی صورت حال تھی۔ آگے کنواں پیچھے کھائی۔ اب میں واپس جاکے اپنے زنداں میں بند بھی نہیں ہو سکتا تھا اور آگے بڑھ کے سب کو گولیوں سے بھون بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر میں ایک بھی فائر کرتا تو اس کی آواز کوٹھی میں اوپر سے نیچے تک گونجتی اور تین افراد کی لاشیں پھلانگ کے بھی میں زندہ سلامت باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی مسلح پولیس ہر طرف سے کوٹھی کو محصور کر لیتی۔

میں نے پریشانی اور مایوسی کے عالم میں ادھر اُدھر دیکھا اور مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ذرا سی دیر کے لیے امید کی ایک کرن چمکی۔ سوچنے سمجھنے کے لیے میرے پاس چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں تھے۔ میں نے آخری وقت میں فیصلہ کیا اور خدا کے آسرے پر جان کی بازی لگادی۔ میں نے اس پرانے اسپرنگ میٹرس کی طرف دیکھا جسے پرانا ہونے کی وجہ سے اسٹور روم کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا تھا۔

میٹرس تھوڑا سا ترچھا تھا لیکن اسے نیچے سے مزید چند انچ آگے کھسکایا جاسکتا تھا۔ میں نے لات مار کے اسے آگے کیا اور جھک کر نیچے سے اندر گھس گیا۔ اس کے لیے مجھے چاروں ہاتھوں پیروں پر کتے کی طرح آگے جانا پڑا لیکن ساڑھے چھ فٹ لمبے میٹرس اور دیوار کے درمیان کی وہ سرنگ میری پناہ گاہ بن گئی۔

مشکل سے پانچ سیکنڈ بعد میں نے رب نواز کی آواز سنی۔ "یار' تم تھانے دار ہو کے اتنا گھبراتے ہو۔"

"گھبراتا نہیں ملک صاحب!" وہ بولا مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بھی ملک رب نواز چیخ پڑا تھا۔

"اوئے' اوئے یہ کیا؟"
دلنواز نے چلا کے کہا "کیا ہوا ڈیڈ!"
ملک رب نواز نے چیخ کے کہا "...... وہ ... وہ ... بھاگ گیا۔"
سلامت علی اور دلنواز ایک ساتھ چلائے "بھاگ گیا؟"
"ہاں ... ہاں' یہ دیکھو یہ بندہ مرا پڑا ہے ادھر۔ اور گیٹ بھی کھلا ہوا ہے۔ دلنواز' تو باہر دیکھ گارڈ سے پوچھ۔"
سلامت علی کے لہجے میں اب واضح گھبراہٹ تھی "ملک صاحب۔ یہ کیسے ہوگیا' آپ تو کہتے تھے ..."
"اوئے بے وقوف' ابھی تیرے ساتھ آیا ہوں تو دیکھا ہے میں نے بھی اور تو نے سوال جواب شروع کردیے۔ یا میرے مولا' اس ..... نے لالی کو بھی ماردیا۔ اس کے ساتھ جانے والے گارڈ کو بھی" وہ چیخنے لگا۔
کوٹھی کے اندر ایک قیامت برپا ہوگئی تھی۔ ملک چیخ چیخ کے مجھے فحش گالیاں بک رہا تھا اور محافظوں پر چلا رہا تھا۔ سلامت علی کی اپنی حالت یقیناً غیر ہوگی مگر وہ ملک رب نواز کی کوٹھی کے اندر سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ بار بار یہی پوچھ رہا تھا کہ اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود وہ بندہ نکل گیا۔ کیا وہ انسان نہیں جن بھوت ہے کوئی؟
ملک بار بار کہہ رہا تھا "یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تہ خانے میں سے بندہ نکل گیا۔ دو دو محافظوں کے ہوتے بھاگ گیا۔ نہیں' یہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں ضرور کوئی سازش ہے۔"
"سازش کیسی ملک صاحب۔ اگر اس نے آپ کے محافظوں کو خرید لیا ہوتا تو وہ ایسے نہ مرے پڑے ہوتے۔"
ملک رب نواز غصے میں چلاتا رہا "میں ان سب کی ماں کو ... ان کی بہن کو ... کسی کو نہیں چھوڑوں گا۔"
"وہ تو بعد کی بات ہے ملک صاحب" سلامت علی نے ہمت سے کام لیا "مجھے بتائیں میں کیا جواب دوں گا؟"
"اوئے یار' کیا تھانے سے قیدی فرار نہیں ہوتے؟"
"نہیں ملک صاحب! میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ میری وردی اتر جائے گی۔ مجھے گرفتار کرکے معطل کردیا جائے گا۔ میری برطرفی ہوجائے گی۔ میں نے اسی بھروسے پہ بندہ آپ کو دیا تھا۔"
"اوئے یار' حوصلہ رکھ۔ ہم پکڑلیں گے اسے۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔" ملک رب نواز ہانپتے ہوئے بولا۔
"نہیں ملک صاحب! بندہ نکل گیا۔ اب وہ ہاتھ نہیں آنے والا۔ میں اور آپ دونوں مارے گئے۔" سلامت علی نے ایک گہری سانس لی۔
"میں ... میں کیسے مارا گیا اوئے؟"
"وہ میں بتادوں گا۔ کہہ دوں گا کہ آپ نے کہا تھا اسے یہاں لاؤ۔ میری غلطی صرف اتنی ہوگی کہ آپ کی بات مانی۔ یہ الزام تو نہیں آئے گا کہ بندہ فرار کرادیا۔ لاکھوں وصول کرلیے۔"
"دیکھ سلامت علی! جوش سے نہیں ہوش سے کام لے۔ یہ وقت نہیں ہے ایسی باتیں کرنے کا۔ دیکھ نا' میں صاف انکار بھی کرسکتا ہوں۔ تو کیسے ثابت کرے گا کہ جو تو کہہ رہا ہے وہ سچ ہے؟ کون مانے گا تیری بات' خود سوچ۔"
"ملک صاحب' آپ سے یہ امید نہیں تھی مجھے۔"
"ہاں یار' امید تو مجھے بھی نہیں تھی۔ ایک پرسنٹ چانس نہیں تھا' اس کے نکلنے کا۔ پتا نہیں کیسے نکل گیا وہ۔" اس نے پھر مجھے گالیاں دینی شروع کیں "خیر' میں پتا کرلوں گا۔ مجھ سے بچ کے کہاں جائے گا وہ۔"
"ملک صاحب دو مرڈر بھی ہوئے ہیں" سلامت علی بولا۔
"دو نہیں ایک بندہ مرا ہے۔ دوسرا بے ہوش ہے۔ تو فکر مت کر یار۔ ابھی لالی ہوش میں آجائے گی۔ وہ سب بتادے گی' پتا چل جائے گا۔"
"لالی' کیا خاک بتاوے گی۔ یہی بتائے گی نا کہ اس نے کیسے مارا اور کیسے قابو کیا سب کو' اس سے کیا ہوگا۔"
رب نواز چلانے لگا۔ "او دل نواز' دل نواز جلدی کر۔ کسی ڈاکٹر کو بلا۔ بے شک ایمبولینس منگوالے یا ایسا کر۔ ان کو اپنی گاڑی میں ڈال کے لے جا۔ کچھ پتا چلا باہر سے۔"
دل نواز نے کہا "باہر کسی نے کچھ نہیں دیکھا ڈیڈ۔ وہ قسم کھارہے ہیں کہ انہوں نے کسی کو نہیں دیکھا" دلنواز نے جواب دیا۔
رب نواز نے ایک اور گالی دی "سب کو بلا۔ لائن میں کھڑا کرکے گولی ماردوں گا میں۔ سارے نکمے' حرام' اندھے' کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ سب سورہے ہوں گے۔ وہ کیا گیٹ سے گیا ہوگا۔ وہ دیوار پھاند کے گیا ہوگا۔"
سلامت علی نے کہا "آپ ذرا تلاشی لیں۔ ہوسکتا ہے وہ باہر باغ میں یا کوٹھی کے کسی کمرے میں چھپا ہوا ہو۔ باہر نکلنے کا موقع تلاش کررہا ہو۔ کسی گاڑی میں گھس کے بیٹھ گیا ہو۔"
"یہ تو نے ٹھیک کہا یار۔ میں خود جاتا ہوں۔"
سلامت علی نے کہا "تلاشی کا کام آپ مجھ پر چھوڑدیں ملک صاحب' آپ خود کو سنبھالیں۔"

دلنواز نے کہا "ڈیڈ' آپ کا بلڈ پریشر۔"
ملک نے ایک گالی دی "... میں کیا بلڈ پریشر۔ جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔ دیکھو دیر ہوگئی تو یہ دوسرا بندہ بھی مرجائے گا۔ لالی بھی مرجائے گی۔"
دلنواز نے کہا "اب جو ہونا تھا ہوگیا ڈیڈ۔ آپ آرام سے بیٹھ جائیں' میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔"
اور اس وقت میں نے ملکانی کی آواز سنی "ملک جی' آپ یہ گولی کھالو۔ نہیں' غصہ مت کرو' حوصلہ رکھو۔"
میں سیدھے کھڑے ہوئے میٹرس کے پیچھے ابھی تک انتہائی محفوظ تھا۔ اسٹور میں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آتی تھی۔ ہر چیز بظاہر اپنی جگہ پر تھی اور کسی کا ذہن اس طرف گیا ہی نہیں تھا کہ میں جیل کی کوٹھری جیسے اس کمرے سے نکل کے اتنے قریب ایک اسٹور میں چھپ سکتا ہوں۔ انہوں نے فرض کرلیا تھا کہ میں نکل بھاگا اور وہ آگے فرار کے تمام راستوں اور امکانات پر غور کررہے تھے۔ یہ بچہ بغل میں' ڈھنڈورا شہر میں کی اعلیٰ ترین مثال تھی۔ آہستہ آہستہ تفتیش کرنے والے دور جارہے تھے۔ پوری کوٹھی میں ایک بھگدڑ مچی ہوئی تھی مگر مجھے فوری طور پر کوئی خطرہ نہ تھا۔
میٹرس کے پیچھے میں ساری آوازیں اس لیے سن رہا تھا کہ پہلے رب نواز اور سلامت علی تہ خانے میں دروازے کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ پھر وہ اوپر آگئے اور کوریڈور میں رک کر چیختے چلاتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ آوازیں مجھ سے دور ہوگئیں۔
میں سیدھا لیٹا ہوا تھا اور کلاشنکوف میرے اوپر رکھی ہوئی تھی۔ خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا تو میں اٹھ کے بیٹھ گیا۔ میٹرس کے پیچھے فرش پر اتنی جگہ تھی کہ میں دیوار سے ٹیک لگا کے آرام سے بیٹھ سکتا تھا مگر اوپر سے یہ فاصلہ کچھ کم تھا۔ چھ فٹ چوڑا میٹرس درمیان سے کچھ دب گیا تھا۔ میں نے کلاشنکوف کو فرش اور دیوار کے کونے سے لگا کے رکھا اور اس کی نوک میٹرس کے اندر جھک آنے والے حصے میں پھنسا دی۔ اب اوپر اتنی جگہ ہوگئی تھی کہ میں سیدھا بیٹھ کے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دے سکوں۔
وہ جگہ ایک گزرگاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ تہ خانے کی سیڑھیوں کا راستہ اسٹور روم سے گزرنے کے بعد آتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے وہ آوازیں سنیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ ملازم نیچے پڑے ہوئے دو بے ہوش افراد کو اٹھا کے اوپر نہیں لے گئے ہیں۔ ان میں ایک لالی تھی۔ اسے اٹھاتے ہوئے ملازم آپس میں مذاق بھی کرتے جارہے تھے۔
اس کے بعد میں آوازوں سے کٹ گیا۔ اب جو کارروائی ہورہی تھی' گھر کے باہر یا گھر کے اس حصے میں ہورہی تھی جو مجھ سے بہت دور تھے۔ صرف کچن میرے قریب تھا اور وہاں ملازم بھی فری ہوکے بات کرتے تھے۔ اگلے ایک گھنٹے میں مجھے نوکروں کی گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ تھانے دار نے گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کو اور مالی کو' گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو اور دوسرے نوکروں کو بہت ڈانٹا ڈپٹا تھا اور دھمکی دی تھی کہ سب سے تھانے لے جاکے تفتیش کی جائے گی مگر سب نے قرآن کی قسم کھاکے ایک ہی بات کہی تھی کہ انہوں نے کسی کو فرار ہوتے دیکھا ہوتا تو وہ اسے روکنے کے لیے جان کی بازی لگادیتے یا اسے گولی ماردیتے۔
گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار نے حلفیہ کہا کہ پچھلے آدھے گھنٹے میں گیٹ کھولا بھی نہیں گیا تھا چنانچہ یہ ممکن ہے کہ بندہ درمیانی دیوار پر چڑھ کے دائیں بائیں یا پیچھے والی کوٹھی کے بیک یارڈ یا سائڈ کی گلی میں اتر گیا اور موقع پاکے ادھر سے ہی باہر نکل گیا۔
تھانے دار نے تھانے سے اضافی نفری طلب کی اور انہوں نے مل کے کوٹھی کے باغ کا چپا چپا چھان مارا۔ انہوں نے درختوں پر چڑھ کے دیکھا اور چھت پر جاکے دیکھا۔ وہ دائیں بائیں اور پیچھے بنی ہوئی کوٹھیوں میں گئے اور وہاں رہنے والوں سے پوچھا کہ انہوں نے کسی مشکوک آدمی کو اندر اترتے' فرار ہوتے تو نہیں دیکھا مگر ان کا جواب نفی میں تھا۔
سلامت علی کی ذاتی نگرانی میں کوٹھی کے ہر بیڈ روم اور باتھ روم کی تلاشی لی گئی۔ انہوں نے بیڈز کے نیچے اور الماریوں میں دیکھا لیکن وہ کچن اور اسٹور کی طرف نہیں آئے۔ انہیں یقین تھا کہ شاہ عالم تہ خانے کی قید سے نکل کے فرار ہوا تو سیدھا اوپر گیا ہوگا۔ اس کے لیے کوٹھی میں ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں تھی چنانچہ یہ ایک منطقی خیال تھا کہ وہ باہر نکلا اور ملازمین کی غفلت کے باعث کوئی دیوار پھاند کے فرار ہوگیا۔ رب نواز کی کوٹھی کے سامنے تو سڑک تھی لیکن پیچھے اور دائیں بائیں ایسی ہی دوسری کوٹھیاں تھیں۔
مجھے نوکروں کی باتیں سن کے یہ بھی پتا چلا کہ پولیس نے آس پاس کا وہ سارا علاقہ چھان مارا تھا اور وہ ابھی تک باہر موجود تھے۔ مجھے اس اسپرنگ والے گدے کے پیچھے دو گھنٹے گزرگئے تھے اور ابھی میرے لیے وہاں سے نکلنے کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ کوٹھی کے اندر ہر شخص ذرا سہما ہوا' مشتعل اور شکاری کتے سے زیادہ چوکس تھا۔ کوٹھی کے اندر

ی فضا ایسی ہوگئی تھی جیسے گھر میں کہیں کوئی مہلک سانپ موجود ہے جس کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا کہ اسے کہاں چھپایا گیا ہے مگر یہ خوف سب کے اعصاب پر سوار ہے کہ سانپ کسی بھی وقت نمودار ہوسکتا ہے۔

یہ سوال میرے ذہن میں شروع سے موجود تھا کہ آخر میں اس میٹرس کی پناہ میں کتنا وقت گزار سکتا ہوں۔ دو گھنٹے' چار گھنٹے' زیادہ سے زیادہ بارہ گھنٹے۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ اگر مجھے چھینک بھی آجاتی تو کوئی نہ سنتا اور کسی پر بھی میری موجودگی کا راز فاش نہ ہوتا۔ میں چوبیس گھنٹے تک کھائے پیے بغیر رہ سکتا تھا بحالتِ مجبوری اس محدود جگہ کو احتیاط کے ساتھ حوائج ضروری سے فراغت کے لیے استعمال کرنا پڑتا تو یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ وقت کے گزرنے کے ساتھ یہ سوال بھی میرے ذہن میں سر اٹھا رہا تھا کہ باہر نکلنے کے لیے میں کیا حکمتِ عملی اختیار کروں گا؟ کیا مجھے دشمن کے علاقے سے گزرنے کے لیے فائر کھولنا پڑے گا؟ کسی بے گناہ کی جان لینی پڑے گی؟ مگر میدان جنگ میں یہ کیا سوچنا کہ سامنے آکے راستہ روکنے والا گنہگار ہے یا معصوم' وہ تو بس دشمن ہوتا ہے۔ آپ نے اسے مارنے میں پہل نہ کی تو وہ آپ کو مار دے گا۔

ایک امکان یہ تھا کہ میں کسی کو یرغمال بنا کے نکل جاؤں۔ رب نواز یا دلنواز کا ادھر آنا فی الحال مشکل تھا لیکن ملکانی کچن میں آسکتی تھی۔ کسی ملازم کو یرغمال بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی جان کی کوئی قیمت نہیں۔ میرے ساتھ وہ بھی مارا جائے گا لیکن ملکانی کی اہمیت کسی طرح بھی رب نواز سے کم نہیں تھی۔ وہ رب نواز کی بیوی اور اس کے بچوں کی ماں تھی۔ اگر وہ قابو میں آجائے تو مجھے بحفاظت باہر لے جاسکتی ہے۔ بس' یہی سب سے محفوظ اور موثر طریقہ ہے۔ میں نے سوچا لیکن ملکانی کچن میں کیوں آئے گی؟ وہ اکثر کام پر ملازموں سے بات کرلیتی ہوگی اور اسی طرح سب اپنے اپنے کمروں سے ہر حکم کی تعمیل کراتے ہوں گے۔

لیکن عاصمہ شاہ جسے سب ملک کی بیوی ہونے کے ناتے ملکانی کہتے تھے' ایک گھریلو قسم کی عورت تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ خود کو کچن سے دور رکھے اور ملازموں کو اجناس کی خورد برد کی کھلی چھٹی عطا کردے۔ وہ بار بار نہ سہی' دن میں ایک دو بار کچن کا چکر ضرور لگاتی ہوگی اور ایک عام ہاؤس وائف کی طرح کچن میں صرف ہونے والے آٹے' گھی' چینی کے اسٹاک کا جائزہ ضرور لیتی ہوگی۔

میرے کانوں میں ملکانی کی آواز اچانک آئی تو میں چونک پڑا۔ وہ کچن میں ملازموں سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ اس کے سوالات عمومی نوعیت کے تھے۔ یہ چیز کھلی کیوں پڑی ہے۔ وہ چیز گندی کیوں ہے۔ صفائی کا خیال نہیں' پانچ کلو گھی ایک ہفتے میں کیسے ختم ہوگیا۔ کل گوشت کون لایا تھا؟ آنکھیں کھلی نہیں رکھتے۔ جو قصاب دے دے' اس کی مہربانی۔ مفت لائے ہو کیا۔ وغیرہ وغیرہ اور ہوشیار ملازم بڑی عاجزی کے ساتھ اس کے ہر سوال کا مدلل جواب دے کر اپنا دفاع کر رہے تھے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے فرار ہوئے دو گھنٹے چالیس منٹ ہوچکے تھے۔ تلاش کرنے والے یقیناً اب تک میری بازیافت کی ہر امید سے کنارہ کش ہوچکے ہوں گے اور اب ان ٹھکانوں کا رخ کرنے کا سوچ رہے ہوں گے جہاں میرے پائے جانے کا کوئی امکان ہو۔ پھر۔۔۔ کیا مجھے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نکل جانا چاہیے یا ملکانی کے اگلے دورے کا انتظار کرنا چاہیے؟ ہوسکتا ہے آج وہ دوبارہ کچن میں نہ آئے۔ ایسی صورت میں مجھے مزید چوبیس گھنٹے اسی پناہ گاہ میں گزارنے پڑیں گے۔ ابھی رسک ہے مگر رسک تو ہر وقت ہے۔ مجھے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ میرے لیے جلد از جلد کسی فیصلے پر پہنچنا ضروری تھا لیکن میرا ذہن مخالفت اور موافقت کے کنفیوز کرنے والے دلائل میں الجھا ہوا تھا۔

لیکن بالآخر میں ایک فیصلے پر پہنچنے میں کامیاب رہا۔ باہر نکلنے کے لیے یہی وقت مناسب ترین تھا۔ گھر کی تلاشی سے مایوس ہوکے انسپکٹر سلامت علی اور ملک رب نواز باہر جاچکے تھے۔ دلنواز اگر گھر میں تھا تو میری تلاش سے زیادہ اہم اور خطرناک معاملات سے نمٹ رہا تھا۔ وہ لالی کو اور ایک بے ہوش محافظ کو اسپتال لے کر گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا یا اوپر کہیں ہوش میں آجانے والوں سے پوچھ گچھ میں مصروف تھا۔ میرے اندازے کے مطابق مرجانے والے سیکیورٹی گارڈ کی لاش ابھی تک تہ خانے کی سیڑھیوں کے آخر میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کو ٹھکانے لگانے کا مرحلہ شاید اس کے بعد آئے گا۔ رب نواز فیصلہ کرے گا کہ لاش کو کیسے غائب کیا جائے؟

یہ فیصلہ کرلینے کے بعد کہ مجھے اسی وقت نکل جانا چاہیے' میں نے کلاشنکوف اٹھائی اور میٹرس کے پیچھے سے نکل آیا۔ اپنے ہاتھوں پیروں کو حرکت میں لانے کے بعد میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ کوریڈور آخر تک خالی پڑا

تھا۔ کچن سے ابھی تک ملکانی کی ڈانٹ ڈپٹ سنائی دی۔ پھر اس کی آواز میں ایک اور زنانہ آواز شامل ہوگئی۔ کسی عورت نے کہا "ممی۔ میں آپ کو سارے گھر میں ڈھونڈ رہی تھی۔"

میں سمجھ گیا' یہ آواز دلنواز کی بیوی فریال کی تھی۔

"کیا ہوگیا؟" ملکانی نے کہا۔

"ممی۔ دس ہزار روپے ہیں آپ کے پاس؟"

"ابھی چاہئیں؟"

"ہاں' میں ذرا جا رہی ہوں" فریال نے کہا۔

"ایسی جلدی کیا ہے؟ دلنواز آگیا؟"

"ان کا فون آیا تھا۔"

میں نے مزید انتظار لاحاصل سمجھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ ملکانی اپنی بہو کو دس ہزار دینے کے لیے کچن سے چلی جائے۔ میں نے اللہ کا نام لے کر باہر قدم رکھا اور ایک جست میں کچن کے اندر پہنچ گیا۔ کچن میں صرف ایک ملازم تھا جو غالباً خانساماں تھا۔ دلنواز کی بیوی فریال کی پشت دروازے کی طرف تھی لیکن ملکانی کا رخ میری طرف تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے یقینی کی عجیب وحشت نمودار ہوئی اس سے پہلے کہ وہ چیخ مارتی' میں نے آگے بڑھ کر فریال کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ فریال چلائی "ممی!" مگر میری گرفت سے نہ نکل سکی۔

ملکانی کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی "تم۔۔۔!"

میں نے فریال کی گردن ایک بازو کے حلقے میں لے کر دبائی "ہاں' میں۔"

فریال مچلنے اور نا تکبیر چلانے لگی۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھیں حلقوں سے ابلنے لگی تھیں "مجھے۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔" وہ بلبلائی۔

ملکانی نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی "دیکھو شاہ عالم' فریال کو چھوڑ دو۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے اس کی گردن پر اپنی گرفت ڈھیلی کی "باہر نکلنے کے بعد میں اسے چھوڑ دوں گا لیکن کسی نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی تو میں اسے بھی مار دوں گا۔"

ملکانی نے کہا "تم سمجھتے کیوں نہیں۔ یہ ماں بننے والی ہے۔"

میں نے کہا "میں صرف ایک بات سمجھتا ہوں۔ مجھے یہاں سے باہر جانا ہے اور اس میں تمہاری بہو مدد کرسکتی ہے۔"

ملکانی کا چہرہ تاریک ہوگیا "تمہاری مدد میں کروں گی۔

اسے چھوڑ دو' پلیز۔۔۔!"

میں نے کہا "نہیں۔ میں تم پر اعتبار نہیں کرسکتا۔ تم اندر جاؤ اور کسی گاڑی کی چابی لے کر آؤ۔ تب تک یہ میرے قبضے میں رہے گی۔"

ملکانی نے ایک گہری سانس لی "اوکے۔ میں چابی لاتی ہوں۔ تم وعدہ کرو کہ فریال کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے؟"

میں نے کہا "ملکانی۔ یہ یقین دہانی مجھے تم سے چاہیے کہ تم اپنی عقل کے گھوڑے غلط سمت میں نہیں دوڑاؤ گی۔ اگر تم نے رب نواز یا اس کے بیٹے' پولیس یا باہر کسی سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ دو بندے مار چکا ہوں میں اب تک۔"

اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا "شاہ عالم۔ میں پاگل یا بے وقوف نہیں ہوں کہ فریال کی جان کو خطرے میں ڈالوں۔"

میں نے کہا "میرا بھی کسی کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں ہے۔ یہ کلاشنکوف استعمال کرکے میں بہت پہلے نکل سکتا تھا۔ میری راہ میں جو بھی آتا' اپنی جان سے جاتا لیکن میں بلاوجہ کشت و خون سے گریز کر رہا تھا۔"

اس نے کہا "میں چابی لے کر آتی ہوں۔"

فریال اب بری طرح رو رہی تھی اور خوف سے اس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ میں نے اسے آزاد کردیا اور خانساماں کو حکم دیا کہ وہ کچن کی دیوار کے ایک کونے میں منہ دوسری طرف کرکے بیٹھ جائے۔ اس نے زیر لب آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے تعمیل کی۔

میں نے کہا "فریال' تمہاری سلامتی کا انحصار اب تمہاری ساس کے رویے پر ہے۔"

فریال ہاتھ جوڑنے لگی "ممی۔ اسے نکل جانے دیں۔ ورنہ یہ مجھے بھی مار ڈالے گا اور میرے بچے کو بھی۔"

ملکانی نے شفقت سے سہلایا۔ اب وہ بالکل پُرسکون ہوچکی تھی اور اسے اپنے اعصاب پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ "فکر مت کر فریال۔ میں جانتی ہوں اچھی طرح اسے۔ یہ پھنس گیا ہے مشکل میں ورنہ یہ حیوان نہیں ہے۔"

"ممی' آپ چابی لے آؤ" فریال نے روتے روتے کہا۔

میں نے کہا "ایک بار پھر سن لو۔ اگر کسی کو بھی میرے کچن میں ہونے کا پتا چلا تو نقصان میں تم بھی رہو گی۔ تمہیں دلنواز کے لیے دوسری بیوی تو مل جائے گی مگر یہ بچہ ضائع ہو جائے گا جسے فریال جنم دینے والی ہے۔"

فریال پھر زور زور سے رونے لگی اور ملکانی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ میں نے اس کے جسم میں لرزش کو واضح طور پر محسوس کیا "میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں بحفاظت باہر نکال دوں گی۔ آگے تمہاری قسمت۔"

میں نے کہا "تم مجھے صرف اپنی کوٹھی کے گیٹ سے گزار دو۔ اس کے بعد تمہاری ذمے داری ختم۔"

وہ بولی "ابھی باہر پولیس کھڑی ہے۔"

میں نے کہا "کھڑی رہے۔ تمہاری گاڑی کے شیشے سیاہ ہیں۔ اور تمہیں کہیں جانے سے کون روک سکتا ہے' میں ابھی آتی ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے فریال سے کہا "ٹیک اٹ ایزی!"

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں پاگل ہوں کہ ان حالات میں اسے یہ مشورہ دے رہا ہوں۔

میں نے کہا "میرا مطلب ہے گھبراؤ نہیں۔ اگر تمہاری ساس نے کوئی چالاکی نہ دکھائی تو تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم تھوڑی دیر میں واپس آجاؤ گی۔"

"مجھے پانی.... پینا ہے۔"

"ضرور پیو" میں نے کہا۔

اجازت اس نے اپنے لیے نہیں' خانساماں کے لیے لی تھی۔ اس کو عادت نہیں تھی کہ کچن میں سے گلاس تلاش کرے' فریج کھولے اور پانی نکالے۔ اس نے خانساماں کو حکم دیا "بابا' مجھے پانی پلاؤ۔"

بابا نے میری طرف مڑ کے اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو میں نے سرہلایا "پانی پلا کے پھر اپنی جگہ بیٹھو جاؤ۔"

اسی وقت ملکانی نمودار ہوئی۔ اس نے چابی میری طرف بڑھائی "باہر ایک بالکل نئے ماڈل کی ٹیوٹا کھڑی ہے۔"

میں نے کہا "ڈرائیونگ میں نہیں کروں گا' تم کرو گی۔"

اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا "اچھا۔ اب اسے جانے دو۔"

"میں نے وعدہ کیا ہے کہ باہر نکلتے ہی اسے چھوڑ دوں گا۔ مجھے اس گھر سے صرف ایک کلومیٹر دور کہیں اتار دو اور واپس آجاؤ۔ تمہاری بہو تمہارے اچھے رویے کی اور تعاون کی ضمانت کے طور پر ساتھ جائے گی۔"

اس نے ایک لمبی گہری سانس لی "اچھا' چلو۔"

میں نے فریال کو اشارہ کیا۔ وہ ایسے آگے بڑھی جیسے سزائے موت پانے والا پھانسی گھاٹ کی طرف بڑھتا ہے۔ ہم ایک قطار میں آگے پیچھے چلتے ہوئے طویل کاریڈور سے گزرے۔ عاصمہ سب سے آگے تھی۔ فریال درمیان میں تھی اور میں سب کے پیچھے تھا۔ میری پوری کوشش تھی کہ کلاشنکوف کسی کو دکھائی نہ دے چنانچہ اس کا رخ فریال کی جانب رکھنے کے بجائے میں نے اسے دائیں ہاتھ میں تھام کے نیچے جھکا رکھا تھا۔

ابھی ہم نے آدھا کاریڈور طے کیا تھا کہ ایک دروازہ کھلا اور اندر سے لالی نمودار ہوئی۔ اس نے پہلے ملکانی کو دیکھا اور پھر مجھے۔ اچانک اس کے اعصاب کا تناؤ اس کی صورت پر ظاہر ہونے لگا۔

ملکانی نے اسے حکم دیا "لالی۔ اندر جا اپنے کمرے میں۔"

لالی کمر پر ہاتھ رکھے سامنے کھڑی رہی اور مجھے گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی تھی۔

ملکانی نے اپنا لہجہ سخت کر لیا "تو نے سنا نہیں' میں نے کیا کہا؟ چپ چاپ جا اپنے کمرے میں اور آرام سے بیٹھ۔"

لالی نے صورتِ حال کو سمجھ لیا تھا۔ ملکانی کے حکم نے اسے مجبور کر دیا تھا ورنہ شاید وہ مجھے آسانی سے نہ جانے دیتی۔ میرا وجود اس کے نزدیک خطرے کی علامت تھا اور میرا چہرہ ایک دشمن کا چہرہ تھا۔ ملکانی کا حکم اب تک دیے جانے والے احکامات کے برعکس تھا مگر اسے کچھ سوچنے کی اور اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ پلٹی اور سب سے آگے ہو گئی۔ کاریڈور کے اختتام پر وہ سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ گئی اور ملکانی الٹے ہاتھ کی طرف چلنے لگی۔

ہم تقریباً ایک ساتھ اس طویل برآمدے میں طلوع ہوئے جس کے وسط میں بلند و بالا رومن طرز کے ستونوں والا پورچ تھا۔ گیٹ کی فصیل یہاں سے تقریباً سو گز دور تھی۔ ملکانی باوقار انداز سے چلتی ہوئی گیٹ سے اندر آنے والے راستے کی طرف بڑھی جو آگے آ کے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ سیاہ سنگ مرمر کے ٹائل والا راستہ سیدھا کوٹھی کے بائیں جانب والے کھلے حصے کی طرف چلا جاتا تھا جہاں اس وقت بھی دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ان میں سے ایک بالکل نئی سفید رنگ کی ٹیوٹا تھی اور دوسری تین سال پہلے کی نیلی شیراڈ۔ اس راستے کا جو حصہ دائیں طرف گھوم کے پورچ تک اور پھر آگے باہر نکلنے والے راستے کی طرف جاتا تھا'

اس پر دو فٹ چوڑے اور لمبے سفید ٹائل تھے۔ آگے باہر جانے والے حصے پر بھی سیاہ پتھر تھے۔

درمیان میں لان تھا جہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ دونوں گیٹ بند تھے اور چوکیدار معمول کے مطابق کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کی کلاشنکوف کرسی کے سہارے کھڑی تھی۔ ملکانی کو دیکھتے ہی وہ مستعدی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے کلاشنکوف اٹھالی مگر ملکانی نے ان کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔

وہ اطمینان سے کار تک گئی اور لاک کھول کے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ رب نواز کی دوسری بیوی اور دلنواز کی سوتیلی ماں تھی۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ شادی سے پہلے وہ لیکچرر تھی اور سوشیالوجی پڑھاتی تھی۔ اس کی عمر تیس سے پینتیس سال کے درمیان ہوگی۔ اب اس کا بدن بھر گیا تھا اور اس کی شخصیت کی دلکشی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خوبصورت عورت تھی۔ پُراعتماد تھی اور اچھے کپڑے پہنتی تھی۔ اس کا جادو کسی بھی مرد پر چل سکتا تھا۔ اس کے مقابلے میں کم عمر اور زیادہ خوبصورت خطوط کی مالک فریال کا حسن بھی ماند پڑ جاتا تھا۔

ملکانی نے میرے لیے گاڑی کے پیچھے والا دروازہ کھول دیا۔ میں نے فریال کو آگے بڑھ کے پہلے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر میں بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ملکانی نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ اسے تھوڑا سا ریورس میں لیا اور گیٹ کی طرف بڑھی۔

کوٹھی میں آنے اور جانے کے راستے الگ الگ تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سہولت کی خاطر وہ سب ایک ہی گیٹ سے آنے جانے کے عادی تھے۔ شاید باہر جانے والے راستے کا گیٹ اس وقت استعمال کیا جاتا ہوگا جب ڈرائیو وے پر وی آئی پی قسم کے مہمانوں کی گاڑیاں آگے پیچھے ایک قطار میں آجاتی ہوں گی۔

ابھی ہماری گاڑی دروازے سے دور تھی کہ گیٹ کھلا اور سامنے سے ایک پجیرو اندر آئی۔ اسے دلنواز چلا رہا تھا۔

"دل نواز آگیا" ملکانی نے کہا۔

میں نے ایک ہاتھ کلاشنکوف پر رکھا "اسے سمجھا دینا کہ کوئی بے وقوفی یا مردانگی کا مظاہرہ نہ کرے۔ اور تم بھی یہ خیال رکھنا کہ...."

"تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں تمہیں باہر پہنچا دوں گی۔"

پجیرو ہمارے بالکل سامنے آکے رک گئی۔ دلنواز نے ونڈ اسکرین میں سے کار کے اندر مجھے' اپنی بیوی کو اور ملکانی کو دیکھتے ہی پچویشن کو سمجھ لیا تھا۔ وہ نیچے اترا تو اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

ملکانی نے گاڑی سے باہر جھانک کے کہا "دلنواز۔ راستہ چھوڑ دو۔"

وہ رکے بغیر آگے آیا۔ اس نے چیخ کے کہا "میں تجھے گولی مار دوں گا۔"

ملکانی نے بھی دھاڑ کے کہا "میں کہتی ہوں دلنواز پاگل مت بنو۔ اپنی گاڑی ہٹاؤ سامنے سے۔"

دلنواز کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے شعلے بھڑک رہے تھے اور وہ مجھے بیوی یا ماں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر ننگی گالیاں بک رہا تھا۔ ملکانی کی اونچی آواز نے اس کا جنون کچھ کم کیا "آپ فکر مت کرو ممی!"

"مجھے مت سمجھاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" ملکانی نے غصے میں آگ بگولا ہو کے کہا "خود یہ بات سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمہاری بیوی اور تمہارے ہونے والے بچے کی جان خطرے میں ہے۔"

دلنواز پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہاتھ نے ریوالور کو اتنی سختی سے پکڑ رکھا تھا کہ شیشے کا گلاس ہوتا تو کرچی کرچی ہو جاتا۔ اس کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی خود بند ہو رہی تھی اور کھل رہی تھی۔ وہ ایسے سانس لے رہا تھا جیسے ایک میل دوڑ کے آیا ہو لیکن بالآخر ماں کی بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

اس نے خون آشام نظروں سے میری طرف دیکھا "میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ جس دن بھی تو میرے ہاتھ آگیا' میں تیری...."

ملکانی نے کہا "تم کوئی بے وقوفی نہیں کرو گے دلنواز جس سے ہماری جان خطرے میں پڑے۔ تم کسی کو فون نہیں کرو گے۔ تم ہمارے پیچھے بھی نہیں آؤ گے۔"

دلنواز نے پھر ہوا میں مکا چلا کے کہا "میں اس.... کو چھوڑوں گا نہیں۔"

لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح وہ اپنی بے بسی کی فرسٹریشن کا اظہار کر رہا تھا۔ وہ پلٹ کے غصے میں غیر موجود فٹ بال کو پیروں سے کک مارتا اپنی پجیرو کی طرف گیا اور اسے تھوڑا سا پیچھے کر کے سائیڈ سے نکال لے گیا۔ پجیرو جب میرے پاس سے گزری تو مجھے پیچھے والی کھڑکی کے ساتھ اس گارڈ کا چہرہ چپکا ہوا نظر آیا جسے میں نے زمین دوز تہ خانے میں ناک آؤٹ کیا تھا۔ شاید دلنواز اسے اسپتال لے گیا تھا۔ اس گارڈ کے سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی نظر آرہی تھی۔

ٹیوٹا گیٹ سے گزری تو میں نے اپنے دل میں کامیابی

اور فتح مندی کے غرور کو ایک خواہش بن کے بیدار ہوتے دیکھا۔ دلنواز نے مجھے صورتِ حال پر مکمل کنٹرول اور کامل اعتماد کے ساتھ فرار ہوتے نہیں رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ اگرچہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے مگر ذہنی طور پر دلنواز نے خود کو اس جیلر سے زیادہ بے دست و پا محسوس کیا جس کو قیدیوں نے دروازہ کھلوانے کے بعد باندھ کے ڈال دیا ہو اور اب اس کی نظروں کے سامنے سے قہقہے لگاتے پُرجوش الوداعی مصافحے کرتے اور اسے گالیاں دیتے گزرتے جا رہے ہوں۔

"اب بتاؤ کدھر جانا ہے؟" عاصمہ شاہ نے گاڑی سڑک پر لانے کے بعد پلٹ کے پوچھا۔ اس کے ایک جھٹکے سے اس کے شانوں تک تراشیدہ بال چہرے پر آئے اور دوسرے جھٹکے سے واپس ہو گئے۔

میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ ملک رب نواز کی کوٹھی کا گیٹ بند ہو گیا تھا۔ فوری طور پر دلنواز کے باہر آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ میں نے گاڑی کو دائیں جانب موڑ لیا۔ اگلی اسٹریٹ سے پھر بائیں جانب موڑا اور سیدھا چلنے کا کہا۔ عاصمہ تعمیل کرتی رہی۔ میں نے کلاشنکوف کا میگزین خالی کیا اور پاور ونڈو کا بٹن دبایا۔ شیشہ پھسل کے تھوڑا سا نیچے گیا۔ آگے پیچھے سڑک پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے میگزین کو باہر پھینک دیا۔

اب مین روڈ سامنے آگئی تھی' میں نے گاڑی رکوائی "یہاں سے تم واپس جا سکتی ہو۔" میں نے کہا "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ خوبصورت عورت ذہین اور سمجھدار بھی ہو سکتی ہے۔"

وہ بولی "مجھے یقین ہے شاہ عالم... کہ زندگی میں ہم پھر کسی جگہ آمنے سامنے ہوں گے۔ اس وقت اگر صورتِ حال آج کے برعکس ہو تو تم بھی اسی طرح سمجھدار ہونے کا ثبوت دینا۔"

"میں یقیناً تمہیں مایوس نہیں کروں گا" میں نے کہا اور ہاتھ آگے بڑھا کے گلوو کمپارٹمنٹ کھولا۔ اس میں ایک ریوالور موجود تھا۔ میں نے اسے اپنے قبضے میں کر لیا۔

"تم چالاک بھی ہو اور خوش قسمت بھی" اس کے چہرے پر شدید مایوسی اور خجالت آمیز بے چارگی تھی۔

میں نے کہا "میرا یہ عقیدہ ہے کہ تقدیر ساتھ نہ دے تو تدبیر رائیگاں جاتی ہے۔ دراصل ابھی مجھے قدرت کی طرف سے ملنے والی زندگی کی مہلت تمام نہیں ہوئی تھی ورنہ تم میرے نیچے اترتے ہی گلوو کمپارٹمنٹ سے یہ ریوالور نکال کر میرے سر میں گولی مار دیتیں۔ میرا نصرت و کامرانی کا سارا غرور ایک سوراخ سے خون کے ساتھ بہہ جاتا۔ اس کے باوجود لیڈیز' آئی ایم سوری کہ میں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ یہ میری مجبوری تھی۔"

میں نے دروازہ بند کیا اور نیچے اتر کے صائمہ کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی کو موڑ لے اور واپس ہو جائے۔ میں اسے آگے مین روڈ کی طرف جانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا جہاں اتنی ٹریفک تھی کہ وہ شور مچا کے کسی کو میرے پیچھے لگا سکتی تھی۔ اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ گاڑی کو یوٹرن دیا اور گاڑی اسی راستے پر دوڑنے لگی جس پر آئی تھی۔ میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا اور پھر سڑک کی طرف چل پڑا۔

چند منٹ بعد میں ایک ٹیکسی میں بیٹھا خود کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کر رہا تھا کہ میں پولیس کی اور رب نواز کی قید سے زندہ سلامت نکل آیا ہوں۔ میرے وجود میں عزم اور حوصلے کی ایک نئی قوت انگڑائی لے رہی تھی اور زندگی کا اعتماد میرے جسم میں جوش اور ولولے کی لہرن کے دوڑ رہا تھا۔

میں نے ٹیکسی کو شبنم کے آفس لے جانے کا فیصلہ کیا اور پھر آدھے راستے میں اپنا ارادہ بدل دیا۔ ایک تو اس وقت شبنم کا یا آزاد صاحب کا وہاں ملنا بھی غیر یقینی تھا۔ پھر شبنم کا گھر اور آفس پولیس کے نقطۂ نظر سے پہلی جگہ ہو سکتے تھے جہاں میں جاتا۔ جیسے چوہے دان سے بچ نکلنے والا چوہا سیدھا اپنے بل کا رخ کرتا ہے۔

میں نے ٹیکسی کو فرید عباسی کے گھر کی طرف موڑ لیا۔ فرید گھر پر نہیں تھا۔ رخشی مجھے دیکھ کے اتنی حیران ہوئی کہ بات کرنا تک بھول گئی اور مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔

میں نے کہا "میں وہی ہوں۔ جو شاہ عالم تھا' اتنے غور سے کیا دیکھ رہی ہو؟"

وہ چونکی "تم..... تم تو پولیس کی تحویل میں تھے۔ فرید گئے ہیں تمہاری پیشی کے لیے..."

میں نے کہا "باہر ایک ٹیکسی کھڑی ہے۔ اسے کرایہ ادا کر دو۔ میری جیب میں پیسے نہیں تھے اس لیے میں ادھر آ گیا۔"

اس نے سر ہلایا "تم بیٹھو' میں اسے پیسے دیتی ہوں۔"

میں ایک صوفے پر پاؤں اور ہاتھ پھیلا کے اور آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا اس طرح مجھے گہرا خوشی دینے والا ذہنی اور جسمانی سکون محسوس ہو رہا تھا اور ایک آرام طلب اندر کی تھکن میرے جسم کو مغلوب کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے مہینوں کے لمبے پُرمشقت اور مسلسل جاری رہنے والے سفر کے تھکا دینے والے عذاب سے گزر کے بالآخر اپنے گھر' اپنے بیڈ روم میں اور کسی کی نرم گرم چاہت بھری جاں فزا آغوش میں پہنچ گیا ہوں۔ میں نیند کی غالب آنے والی خواہش سے لڑ رہا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ اپنے سفر کو یہاں ختم نہ کروں۔

رخشی نے ٹیکسی والے کو رخصت کیا اور میرے سامنے آ کے بیٹھ گئی "یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

میں نے کہا "کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

وہ بولی "ذرا آئینے میں صورت دیکھو اپنی۔ تم آدمی نہیں بھوت لگ رہے ہو۔ ایسا لگتا ہے جیسے عمر قید کاٹ کے نکلے ہو۔"

میں نے کہا "ہاں۔ ایسا تو مجھے بھی محسوس ہوتا ہے۔"

وہ بولی "چلو خیر۔ باتیں بعد میں کریں گے۔ پہلے تم نہا دھو کے انسان بن جاؤ۔ میں تمہارے لیے فرید کے کپڑے نکال دیتی ہوں۔"

میں نے کہا "نہیں رخشی۔ میں جاؤں گا۔"

"کہاں جاؤ گے۔ میں تمہیں اس حالت میں نہیں جانے دوں گی۔"

میں نے کہا "میں جا رہا تھا شبنم کی طرف۔ پھر اس لیے نہیں گیا کہ مجھے تلاش کرنے والے سب سے پہلے وہاں دیکھیں گے۔ فرید عباسی وکیل ہے میرا۔ وہ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔"

"انتا مت ڈرو۔"

میں نے کہا "ڈر کی بات نہیں رخشی۔ جتنا تم لوگوں نے میرے لیے کیا ہے اور کر رہے ہو' اس کے بعد تم میری وجہ سے مشکل میں پڑو' یہ میں نہیں چاہتا۔"

"ایسا مت کہو ناصر۔ جو کچھ تم نے میرے لیے کیا تھا..."

"میں نے تو کچھ نہیں کیا تھا۔"

وہ بولی "آج میں جو کچھ بھی ہوں' جہاں بھی ہوں' تمہاری وجہ سے ہوں۔"

میں نے کہا "یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں رخشی۔"

"نہیں ناصر۔ میں کیسے بھلا دوں کہ اس وقت جب میں تمہیں شاہ عالم اپنا شوہر سمجھتی تھی۔ تم نے صورتِ حال سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کا سوچا بھی نہیں۔ الٹا تم نے میری حفاظت کی۔ تم نے اپنے آپ کو بھی نہیں مجھے بھی سنبھالا۔ تم نے مجھے عذاب کے ایک جہنم سے نکالا اور وہ سب دے دیا جس پر شاہ عالم کی حیثیت سے تم اپنا قبضہ جاری رکھ سکتے تھے۔"

"اب ان باتوں کا کیا ذکر..."

"نہیں ناصر۔ میں کیسے بھلا سکتی ہوں تمہارا یہ احسان۔ آج میں اس گھر میں آباد ہوں تو یہ تمہاری کوشش کا نتیجہ ہے۔ میری زندگی کی ساری خوشی تمہاری ہی دی ہوئی ہے۔"

"ایسا مت کہو۔ سب سے بڑا احسان تو تم نے کیا تھا مجھ پر۔ اس وقت جب کوئی مجھے شاہ عالم ماننے کو تیار نہ تھا' صرف تمہاری گواہی نے شاہ عالم کو ایک نئی زندگی دی۔ میں تو حالات کا قیدی تھا۔ تم نے مجھے اس قید سے رہائی دلائی تھی۔ میں نے وہی کیا جو شاہ عالم تو نہیں کر سکتا تھا۔ مگر میں ناصر عظیم تھا۔ میں تمہارا شوہر بن جاتا تو تمام عمر خود کو اپنا چہرہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ آج میں تم سے نظر ملا کے بات کر سکتا ہوں۔ خدا کا شکر ہے۔"

"اچھا اب باتیں چھوڑو۔ جیسا میں کہہ رہی ہوں' ویسا کرو۔" اس نے مجھے حکم دیتے ہوئے کہا "جا کے چہرے سے یہ بالوں کا جنگل صاف کرو۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ تمہارے داڑھی مونچھوں کے اور سر کے بال کتنے بے ہنگم طریقے پر بڑھ گئے ہیں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کہ ناصر عظیم بن کے تم کیسے لگتے ہو؟"

"رخشی' مجھے مجبور مت کرو۔" میں اٹھ کھڑا ہوا "ناصر عظیم کو یہاں نظر بھی نہیں آنا چاہیے۔ شاہ عالم کی بیوی سے اس کا کیا تعلق؟"

وہ کچھ مایوس ہوئی "کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ تم مجھ سے ملو گے بھی نہیں؟"

میں نے کہا "ملوں گا۔ اپنے وکیل کی بیوی کی حیثیت سے کہیں نہ کہیں تمہاری اور میری ملاقات ضرور ہو گی۔ زندگی اتفاقات سے بھری پڑی ہے۔ ناصر عظیم کا شاہ عالم کی سابقہ بیوی کے گھر میں آنا جانا ہو سکتا ہے۔ ہمارے فیملی ریلیشن ہوں گے مگر ابھی نہیں' لاؤ مجھے کچھ پیسے دے دو۔"

وہ کچھ خفت زدہ نظر آنے لگی "میرے پاس تو ابھی مشکل سے چار پانچ ہزار ہوں گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "بابا مجھے صرف ٹیکسی کا کرایہ چاہیے۔ نیلم کے گھر تک جانے کے لیے۔"

اس نے مجھے ایک ہزار پکڑا دیے "یہ رکھو۔ جاتے ہوئے اپنے لیے کپڑے بھی لیتے جاؤ۔"

میں نے کہا "تھینکس!"

وہ مجھے چھوڑنے دروازے تک آئی اور اس وقت تک

دیکھتی رہی جب تک میں نظر آتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے جنونی تشویش تھی۔ یہ سب خدا کا خاص کرم تھا کہ اس نے مجھے اخلاقی مزاحمت کی توفیق دی ورنہ اس وقت جب رخشی مجھے اپنا شوہر تسلیم کرتے ہوئے خود کو میرے حوالے کرنے پر مصر تھی میں اس سے ایک شوہر کا حق وصول کرلیتا تو شاید وہ میرے لیے کچھ بھی نہ کرتی۔ وہ بھری عدالت میں میرے منہ پر طمانچہ مار کے کہتی کہ یہ دھوکے باز' جعلساز جو میرا شوہر بن رہا ہے' ناصر عظیم ہے اور آج میں اپنا سب کچھ گنوا کے جیل کاٹ رہا ہوتا۔ یہ جو آج پھر مجھے ناصر عظیم کی زندگی جینے کا موقع مل گیا ہے۔ یہ رخشی کا عطا کردہ ہے۔

سڑک پر آکے میرا اعتماد پھر کچھ متزلزل ہونے لگا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے خطرہ میرے چاروں طرف دھوئیں کی طرح بھرا ہوا ہے اور اس کے احساس سے مفر ممکن ہی نہیں۔ راہ چلتے لوگوں کی نظریں مجھے سوال کرتی محسوس ہوتی تھیں کہ تم کون ہو؟ شاہ عالم یا ناصر عظیم؟ اچانک سامنے سے ایک پولیس موبائل نمودار ہوئی تو میں نروس ہوگیا جیسے وہ میری ہی گرفتاری کے لیے وہاں آئی تھی۔

میں چلتا رہا یہاں تک کہ مجھے ایک خالی رکشا نظر آگیا۔ اس کے رکتے ہی میں اندر بیٹھ گیا تو ڈرائیور صاحب نے خاصا برا مانا "پہلے پوچھ تو لو بھائی جی کہ رکشا خالی ہے اور میں نے کدھر جانا ہے؟"

میں نے کہا "بات یہ ہے بھائی جی کہ رکشا خالی نہ ہوتا تو تم میرے اشارے پر رکتے کیوں؟ اور یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ جانا کدھر ہے۔ تم نے فلم اسٹار نیلم کا گھر دیکھا ہے؟"

"توبہ کرو جی۔ اللہ ان کنجریوں کے گھر نہ دکھائے" اس نے ایک عام مُتعصب رویے کا مظاہرہ کیا۔

میں نے کہا "اچھا چلو۔ راستہ میں بتاتا ہوں۔"

رکشا کی سواری خاصی صبر آزما ہوتی ہے۔ وہ رکشا بھی خیر سے ایسا تھا کہ جتنا آگے چلتا تھا' اس سے زیادہ دائیں بائیں ہلتا تھا۔ معمولی سے گڑھے میں بھی رکشا ایسے اچھلتا تھا کہ اندر میں اچھل پڑتا تھا۔ دوبار میرا سر اوپر کینوس کو سپورٹ کرنے والے پائپوں سے ٹکرایا۔ رہی سہی کسر اس کے میٹر نے پوری کی جو دگنی رفتار سے چلتا تھا مگر ایک بہت بڑے اور جان لیوا عذاب سے گزرنے کے بعد مجھے یہ سب محسوس بھی نہیں ہو رہا تھا اور میں بڑی بے چینی سے اس سفر کے اختتام کا انتظار کر رہا تھا۔

رکشا عین نیلم ہاؤس کے گیٹ پر رکا تو سیکیورٹی گارڈ نے اسے اشارہ کیا "اوئے آگے لے جاؤ رکشا کو۔"

رکشا والا اس سے بھی زیادہ ٹیڑھا ثابت ہوا "اوئے تو کھڑا رہ چپ کرکے اور اپنا کام کر۔ ادھر نو پارکنگ کا بورڈ لگا ہوا ہے کیا؟"

میں نے اسے کرایہ دے کے چلتا کیا مگر اس کے بعد ایک نیا مرحلہ آگیا۔ سیکیورٹی گارڈ نیا تھا اور مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ اس نے مجھے روک دیا۔

میں نے کہا "میں ناصر عظیم ہوں۔ نیلم کا دوست۔"

"ام کسی دوست کو نہیں جانتا۔ میڈم گھر پہ نہیں اے۔"

میں نے کہا "اچھا تو بانو خالہ کو بلاؤ۔"

وہ چونکا "بانو خالہ کو؟"

"ہاں۔ تم کچھ اونچا سنتے ہو۔ بانو خالہ کو بتاؤ میرا نام۔ انٹرکام پہ بات کرو" میں نے دو گھریلو ملازمین کے نام لیے جو خانساماں اور بٹلر تھے۔ اس کے بعد مشکل آسان ہوگئی۔ بانو خالہ نے خانساماں کو گیٹ پر مجھے ریسیو کرنے کے لیے بھیجا۔ وہ مجھے یوں اندر لے گیا جیسے میں ہی گھر کا مالک ہوں۔ ظاہر ہے یہ پروٹوکول دیکھ کے خود سیکیورٹی گارڈ نے بھی مجھ سے معافی مانگی۔

"ہائے ہائے" بانو خالہ مجھے دیکھ کے چونک پڑیں "ارے بیٹا' یہ تم ہو۔ میں نے تو کہا کہ ناصر کا نام لے کر کون جنگلی گھس آیا گھر میں۔"

میں نے فرطِ مسرت سے جنگلیوں جیسی آوازیں نکالیں۔ چیخیں ماریں اور بانو خالہ کو گود میں اٹھا کے ڈانس کرنے لگا "میں جنگلی ہوں بانو خالہ۔ بھوت ہوں۔ ہاہاہا.... اب تم کیا کروگی۔ میں نے گھر پر قبضہ کرلیا ہے۔"

وہ ہنستے ہوئے غصہ ہونے لگیں "ارے چھوڑو مجھے۔ یہ کیا تماشا کر رہے ہو نوکروں کے سامنے۔"

میں نے انہیں اتار دیا۔ "آج میں بہت خوش ہوں خالہ!"

انہوں نے اپنی سانس پر قابو پا کے کہا "اوہو ایسی کیا بات ہے؟"

میں نے کہا "آج شاہ عالم مرگیا۔"

انہوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہائے اللہ۔ کون مرگیا ہے اور تم اس پہ یوں خوشی منا رہے ہو' توبہ کرو توبہ!"

"وہ ایک شیطان تھا خالہ۔ اس نے قبضہ کر رکھا تھا مجھ پر۔ آج میں آزاد ہوں۔ بالکل آزاد" میں نے ناچتے ہوئے کہا۔

انہوں نے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا "پتا نہیں بیٹا' تم کیا کہہ

رہے ہو۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

میں نے کہا "چھوڑو خالہ۔ یہ بتاؤ نیلم کہاں ہے؟"

"لو۔ نیلم کیا اس وقت گھر میں ہوتی ہے۔ وہ تو بخار میں بھی چلی جائے شوٹنگ کے لیے۔"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے۔ شوٹنگ کہاں ہوگی اس کی۔ مگر تمہیں کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔ یہ بتاؤ رئیس کہاں ملے گا؟"

"جانے' مجھے کیا پتا بیٹا؟"

میں نے کہا "بانو خالہ۔ اگر آپ کو ایمرجنسی میں ضرورت پڑجائے تو آپ کیسے رابطہ کریں گی نیلم سے۔"

"ٹیلی فون ڈائری میں اسٹوڈیو کے نمبر ہیں۔ کسی سے پوچھوں گی۔" بانو خالہ نے سادگی سے کہا۔

"رائٹ!" میں نے چٹکی بجا کے کہا۔

ٹیلی فون ڈائری نیلم کے کمرے میں اس کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر موجود تھی۔ اس میں سارے اسٹوڈیوز کے اور تمام اہم فلمی شخصیات کے فون نمبر خاصی ترتیب سے لکھے ہوئے تھے۔ میں نے تین اسٹوڈیوز میں بات کی۔ چوتھی جگہ بات کرنے والے نے کہا "ہاں۔ میڈم سیٹ پر ہیں۔"

میں نے کہا "میں ان کے گھر سے بات کر رہا ہوں۔"

"میڈم' ابھی نہیں آسکتیں۔ شاٹ چل رہا ہے۔"

میں نے کہا "تم میڈم کے سیکریٹری [illegible] وہ فوراً گھر فون کرے' ایمرجنسی ہے۔"

مجھے اندازہ تھا کہ رئیس کو میرا پیغام ڈلیور ہونے اور پھر رئیس کے کہیں سے فون کرنے میں دس منٹ تو ضرور لگیں گے۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اسٹوڈیو میں تلاش کرنے سے وہ نہ ملے۔ وہ فرید عباسی کے ساتھ میری تلاش میں بھٹک رہا ہو اور ایسا ہی ہوا۔ میں فون سے لگا بیٹھا تھا اور انتظار کی کوفت سے گزر رہا تھا کہ گھنٹی بجی اور دوسری طرف سے میرے "ہیلو" کہتے ہی نیلم نے چیخ ماری۔

"ناصر۔ تم۔ تم کب آئے؟"

میں نے کہا "اف اتنے زور سے چلائی ہو کہ میرا کان خراب کردیا۔ آدھا گھنٹا ہوگیا مجھے آئے۔"

وہ گھبراہٹ میں بولی "دیکھو میں آتی ہوں ابھی ایک گھنٹے میں۔"

میں نے کہا "تم اطمینان سے اپنا کام نمٹا کے آؤ۔"

وہ بولی "تم کہیں جانا مت۔"

میں نے کہا "اب کہاں جانا ہے۔"

"تمہارا کچھ بھروسا نہیں۔ اچانک روانہ ہوجاؤ۔"

میں نے کہا "میں وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ قیامت بھی آجائے میں تمہارے واپس آنے تک کہیں نہیں جاؤں گا۔ رئیس کہاں ہے؟"

اس نے قدرے تذبذب کے ساتھ محتاط لہجے میں جواب دیا "وہ گیا ہے تمہارے ہی ایک ضروری کام سے۔"

غالباً نیلم کے آس پاس دوسرے لوگ بھی موجود تھے جو اس کی بات سن سکتے تھے اس لیے نیلم نے یہ کہنے سے گریز کیا کہ رئیس میرے جوڈیشل ریمانڈ کے سلسلے میں فرید عباسی کے ساتھ کورٹ گیا ہوا ہے۔

فون کرنے کے بعد میں نے ایک پرانے وفادار ملازم کو طلب کیا اور اس سے پوچھا "یہاں کتنے سال ہوگئے کام کرتے۔"

اس نے سوچ کے کہا "دس سال سے زیادہ ہوگئے جناب۔"

میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"محمد بخش جناب۔ بخشو کہتے ہیں سب لوگ۔"

میں نے کہا "محمد بخش۔ یہاں کوئی باربر ہے۔"

"باربر۔" اس نے میرے سر اور داڑھی مونچھوں پر ایک پُرتجسس نگاہ ڈالی "مل جائے گا جناب۔ نزدیک تو کوئی نہیں۔ مارکیٹ تک جانا پڑے گا آپ کو۔"

میں نے کہا "کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ باربر یہاں آجائے۔"

"کیوں نہیں ہوسکتا جناب۔ بس پیسے زیادہ لے گا گھر آنے کے۔"

میں نے کہا "کیسے لاؤ گے اسے؟ ٹیکسی میں۔"

وہ بولا "ایک گاڑی ہے جناب۔ میڈم نے ملازمین کو دے رکھی تھی ایسے ہی بازار کے کاموں کے لیے۔ رئیس صاحب نے واپس لے لی۔"

میں نے کہا "اس کی چابی کہاں ہے؟"

"بانو خالہ کے پاس ہوگی۔"

میں نے کہا "جاکے میرا نام لو۔ چابی مل جائے گی۔ کیا نام ہے میرا؟"

وہ تھوڑا سا نروس ہوا "نام۔"

میں نے کہا "'ناصر عظیم' ہے میرا نام۔ سب ملازموں کو بتا دو۔ ایک بات اور۔ فی الحال میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا اس لیے گیٹ پر چوکیدار سے کہہ دو کہ خواہ گورنر پیدل چل کے مجھ سے ملاقات کرنے آئے۔ اس سے کہہ دو کہ یہاں کوئی بھی نہیں آیا۔ گھر میں میڈم ہوں گی۔ رئیس صاحب

ہوں گے لیکن میں نہیں ہوں۔"

"سمجھ گیا جناب!" وہ جانے لگا۔

میں نے کہا "ایک بات اور۔"

وہ رک گیا "جی سر۔"

میں نے کہا "باربر کو ساتھ لے کر آؤ تو اسے سرونٹ کوارٹر کی طرف لے جانا۔ میں وہیں آجاؤں گا۔ اسے ڈرائنگ روم میں مت بٹھانا۔"

اس نے سرہلا کے جی جناب کہا اور چلا گیا۔ میں بیڈ پر لیٹ کر اپنی زندگی کے اس انقلاب کے بارے میں سوچنے لگا۔ آج میں پھر ناصر عظیم تھا اور مجھے اپنی زندگی ماضی کے سب رشتوں کے ساتھ اور مستقبل کے سارے خوابوں پر اختیار کے ساتھ واپس مل گئی تھی۔ شاہ عالم جسے مرے ہوئے زمانہ ہوگیا تھا مگر وہ ناصر عظیم کے قالب میں زندہ تھا۔ آج ہمیشہ کے لیے اس دنیا کی نظرے او جھل ہوگیا تھا۔

بے شک یہ سب ویسے نہیں ہوا تھا جیسے میں نے پلان کیا تھا مگر خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ میں نے ہوٹل سے اور دنیا سے ہمیشہ کے لیے غائب ہونے کا جو منصوبہ بنایا تھا وہ مشکل اور خطرناک ہی نہیں، کسی حد تک فلمی بھی تھا لیکن اب جو کچھ ہوا تھا بالکل فطری اور حقیقی تھا۔ شاہ عالم کو پولیس نے پرانے مقدمات کے سلسلے میں گرفتار کیا تھا۔ عدالت نے دوبار اس کا تین تین دن کے لیے جسمانی ریمانڈ دیا مگر ساتویں دن جب اسے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کے لیے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا وہ پولیس کی تحویل سے فرار ہوگیا۔

کیسے فرار ہوگیا؟ یہ عدالت کو بتائیں گے تھانہ انچارج انسپکٹر سلامت علی یا اس کے سرپرست اور افسر اعلیٰ اے ایس پی ولاور شاہ۔ وہ کس منہ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے تھانے کی حوالات سے ملک رب نواز کے گھر کی نجی جیل منتقل کردیا تھا جہاں اس کی نگرانی پر ایک غیر انسانی مخلوق لالی کے ساتھ کلاشنکوف رکھنے والے دو مسلح محافظ مامور تھے مگر اس نے ایک گارڈ کو ہلاک کردیا اور باقی کو ناک آؤٹ کردیا پھر اس نے گھر کی مالکن ملک رب نواز کی نصف بہتر ملکانی کو اور اس کی بہو کو یرغمال بنایا اور نکل گیا۔ کوئی بھی اس کا راستہ نہ روک سکا۔

رب نواز کے قبضے سے فرار ہو کے شاہ عالم کہاں گیا؟ یوم حشر سے پہلے اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکے گا۔ اسے آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ کچھ پتا نہیں اس دنیا سے وہ ایسے غائب ہوگیا جیسے وہ کوئی جادوگر تھا یا جن بھوت تھا۔

اب میرے لیے یہ بھی ضروری نہیں رہا تھا کہ میں کسی لاوارث لاش کے حصول اور اسے شاہ عالم قرار دینے کے لیے کوئی چکر چلاؤں اور قانونی طور پر اس نامعلوم شخص کے شاہ عالم قرار دیے جانے والے کی سرکاری طور پر تدفین کا ثبوت دنیا کے سامنے پیش کروں۔ اگر پولیس کو شاہ عالم کی گمشدگی کے مسئلے سے جان چھڑانی ہوگی اور اس کے خلاف چلنے والے کیسوں کی فائل کلوز کرنی ہوگی تو وہ خود ہی یہ سب کچھ کرے گی۔

میرے لیے اگلا مرحلہ تھا ناصر عظیم کی شناخت قائم کرنے کا لیکن اس میں مجھے کوئی دشواری پیش آنے کا امکان نہیں تھا۔ ایک بار جب مجھے رب نواز نے داڑھی والا جن سمجھتے ہوئے عدالت کے کمرے میں ہنگامہ کردیا تھا تو میں نے سپر اسٹار نیلم اور شہرت یافتہ نیک نام ڈاکٹر کمال جیسے معتبر معزز اور مستند گواہ عدالت میں پیش کردیے تھے اور خود کو ناصر عظیم ثابت کرکے رب نواز کی ساری غلط فہمی دور کردی تھی۔

تاہم اتفاقات کے لیے دنیا بہت چھوٹی جگہ تھی اور ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اس بات کے امکانات بہت زیادہ تھے کہ ملک رب نواز اور ناصر عظیم کا آمنا سامنا ہوجائے لیکن ایک بار میں اس کے سامنے ناقابلِ تردید ثبوت پیش کرچکا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں اور یہ بات وہ بھول نہیں سکتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس شہر میں شاہ عالم جیسا ہی دوسرا موجود ہے مگر وہ شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہے جس کا شاہ عالم سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

شاہ عالم کی سابق شریکِ حیات رخشندہ کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس راز سے آشنا تھے کہ ناصر عظیم نے کن حالات کے تحت اپنی زندگی کے چند ماہ شاہ عالم بن کر گزارے تھے لیکن وہ سب میرے اپنے لوگ تھے۔ یہ بات رئیس جانتا تھا اور ڈاکٹر کمال فاروقی جانتا تھا چندا قمر اور نیلم جانتی تھیں کہ اپنی بدقسمتی یا بے وقوفی کے باعث ناصر عظیم کتنے دن شاہ عالم کی زندگی جینے پر مجبور رہا تھا مگر کچھ ایسے مہرباں بھی تھے جو کچھ نہیں جانتے تھے اور پوری نیک نیتی اور یقینِ کامل کے ساتھ حلف اٹھا کے کہہ سکتے تھے کہ یہ وہی ناصر عظیم ہے جسے وہ بچپن سے جانتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر مشہود کی فیملی۔ ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا۔ کمال کی فرشتہ سیرت اسسٹنٹ کوثر اور دوجنگ منیجر مجھے دس سال سے جانتے تھے۔ چنانچہ ناصر عظیم کو ملک رب نواز سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

جب ملازم نے مجھے باربر کی آمد کی اطلاع دی تو میں تقریباً غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ سرونٹ کوارٹر میں جا کے میں نے باربر سے کہا کہ وہ میرے بال تراش کر چھوٹے کرے اور داڑھی صاف کرکے مجھے کلین شیو بنا دے تو وہ کچھ چونک کر زیرِ لب مسکرایا لیکن پھر کچھ بولے بغیر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

آدھے گھنٹے بعد میں نے اپنی صورت آئینے میں دیکھی تو خود کو پہچان کے مجھے ایک انجانی سی خوشی ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے آپ سے بھی بچھڑا ہوا تھا اور مجھے ایک حسبِ حال شعر یاد آیا۔

اے دوست کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کے طلب گار خطرات سے بھرے ہوئے ناامیدی کے تاریک جنگل کا سفر اچانک امید کے پرتحفظ اجالے کی منزل پر پہنچ کے تمام ہوگیا ہی۔ میں نے خود کو انتہائی ہلکا پھلکا اور سبک دوش محسوس کیا اور مجھے ایسا لگا جیسے مجھے اپنے ماضی کی یادوں کی سرزمین سے جوڑنے والا پل پھر مل گیا ہے اور وہ غربت، اکیلے پن اور مایوسی کا احساس دلانے والا وقت بے وجود ہوگیا ہے جو میرے ماضی اور حال کے درمیان ایک عمیق خلا کی طرح حائل تھا۔

میں نے غسل کے بعد گیسٹ بیڈ روم کی وارڈ روب میں جھانکا تو وہاں مجھے اپنے مطلب کے کپڑے مل گئے۔ تین مختلف سائز کی شرٹس میں سے ایک مجھے ٹھیک آگئی۔ ایسا ہی پتلون کے انتخاب میں ہوا۔ کپڑے بدلنے کے بعد جب میں ایک بالکل نیا انسان یعنی پرانا ناصر عظیم بن چکا تھا میں نے گھڑی دیکھی۔ نیلم سے میری بات ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہوگیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کو اپنے شوٹنگ کے شیڈول سے فرصت نہیں ملی اور وہ شاٹ مکمل کرا کے ہی آپائے گی۔

میں نے بانو خالہ سے کافی یا چائے کی فرمائش کرنے کا سوچا مگر پھر بیڈ کی آغوشِ راحت نے مجھے کھینچ لیا اور میرا سر تکیے سے لگا تو نیند مجھ پر غالب آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ باہر سے نیلم کے اور رئیس کے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا تو وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے لان پر آہستہ آہستہ چہل قدمی کررہے تھے۔ وہ دونوں اتنے پُرسکون اور ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے کہ مجھے یہ منظر دیکھ کے خوشی ہوئی اور میں کچھ دیر رئیس کی زندگی کے اس انقلاب کو دیکھتا رہا اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتا رہا۔

نیلم کے لیے چاہے جانے کی کیفیت کوئی انوکھا تجربہ نہیں تھی اس کے ہزاروں پرستار اور لاکھوں مداح تھے۔ ان میں ایسے بھی بہت تھے جنہوں نے ٹوٹ کے نیلم کو چاہا تھا اور دل کی گہرائی سے نیلم کو پیار کیا تھا مگر وہ اتنے خوش نصیب نہ تھے کہ جواب میں انہیں بھی نیلم کی نگاہِ التفات میسر آتی۔ اس نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ سیکڑوں میں ایک دو یقیناً ایسے تھے کہ انہیں وہ اپنے شریکِ حیات کے طور پر قبول کرلیتی مگر وہ صرف پرستار تھے۔ وہ کسی ایکٹریس سے شادی کو اپنے لیے معاشرتی طور پر گھاٹے کا سودا سمجھتے تھے۔ وہ صرف چند راتوں کی خلوت کے طلب گار تھے۔ بالفاظِ دیگر صرف ہوس پیشہ ہی تھے۔ باقی وہ سب تھے جن کو نیلم کی توجہ بھی حاصل نہ ہوسکی۔

رئیس کا معاملہ اس کے برعکس تھا کہ وہ نیلم کے مداحوں میں شامل تھا اور نہ اس کے پرستاروں میں۔ شاید وہ اتنی اونچی پرواز کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر نیلم کی نگاہ نے کیا کام لاجواب کیا کہ اس کو لاکھوں مردوں میں انتخاب کیا اور پھر یہ ثابت کیا کہ حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے اور محبت وہ پھول ہے جو کسی صحنِ گلشن میں نہ کھلے مگر پتھر کی چٹان میں یا ریگ صحرا میں کھل جائے۔

رئیس کے ساتھ وہی ہوا جو حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا تھا کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔ وہ میرے ساتھ نیلم کے گھر آتا جاتا رہا اور شاید ہر مرد کی طرح اس حسین عورت کے بارے میں سوچتا بھی رہا ہو۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی مرد نیلم کے اتنا قریب جاکے اسے دیکھے اور خواہش اس کی آتشِ شوق کو نہ بھڑکائے مگر اس نے کبھی تصور میں نہ سوچا ہوگا کہ انجانے میں محبت کی خاموش چنگاری نیلم کے دل میں چپکے چپکے سلگ رہی ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ننھا سا سوال شاید ریاضی کے ان دقیق مسائل سے زیادہ مشکل ہوگا جن پر فیثا غورث تمام عمر غور کرتا رہا اور جس کا جواب شاید کمپیوٹر کے دور کا کوئی سائنس داں بھی نہیں دے سکتا۔ بس تھی کوئی ایسی ناقابلِ فہم نظر نہ آنے والی اور دوسروں کو محسوس نہ ہونے والی بات جس نے نیلم کے دل کے خوابیدہ تاروں کو چھیڑ دیا اور محبت کے نغموں کو جگا دیا۔

چنانچہ وہ رئیس جو تمام عمر احساسِ محرومی اور احساسِ کمتری کا شکار رہا اور وقت گزاری کے لیے شوقین مزاج لڑکیوں سے دل لگی میں محبت کا کھیل کھیلتا رہا، اب نیلم کا محبوب تھا اور اس کی محبت کے سمندر کی گہرائی میں اتنا ڈوب

گیا تھا کہ میرے لیے اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار تھا۔ وہ بالکل لیلئے مجنوں ہوگئے تھے۔ دنیا جتنا چاہے اس انوکھے پیار پر حیران ہو مگر پیار تو ہوتا ہی انوکھا ہے۔

جب میں نے کھنکار کے اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو چونک کر انھوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ چھوڑ دیا پھر نیلم پلٹ کے میری طرف بے اختیار لپکی۔ مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر رک کے اس نے مجھے غور سے نظر جما کے دیکھا۔ اس کا چہرہ فرطِ اشتیاق اور مسرت سے تمتما رہا تھا۔ وہ ناصر عظیم کو اپنے اصل روپ میں اپنے مقابل دیکھ کر گزرے ہوئے وقت کی یادوں کی حسین وادیوں میں گم ہو گئی تھی۔

بالآخر میں نے مسکرا کے کہا "ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟"

اس نے آگے بڑھ کر میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھاما اور میرے ماتھے پر ایک بوسہ دیا جس میں ماتا کی محبت تھی۔ بہن کا پیار تھا۔ دوستی کی پُرخلوص وارفتگی تھی اور اپنائیت کا پاسیت بھرا انداز تھا۔ رئیس ہمارے قریب کھڑا فخر کے ساتھ مسکراتا رہا۔

وہ بولی "میں ناصر عظیم کو دیکھ رہی ہوں۔ بہت عرصے بعد۔"

میں نے کہا "ایک شعر سنو گی۔

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی ترے ہرجائی کی

وہ بولی "تم نے بہت اچھا کیا جو یہاں آگئے۔ اب میں تمہیں کہیں بھی نہیں جانے دوں گی۔"

میں نے کہا "تم تو خود مجھے چھوڑ جاؤ گی۔"

وہ میری بات نہیں سمجھی "میں کیوں چھوڑ جاؤں گی؟"

"اور کیا۔ چھوڑ کے جا ہی رہی تھیں لندن۔ میں نے پکڑ لیا کراچی ائرپورٹ پر اور اب تک روک رکھا ہے۔"

وہ شرما کے ہنسی "ہم آئے تو تم گہری نیند میں تھے۔ ہم نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"سوچا خلوت کے کچھ لمحات اور ساتھ گزار لیں۔ اس کے بعد تو کباب میں یہ مستقل ہڈی رہے گی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم۔"

رئیس بولا "اس کا دل چاہ رہا ہے گالیاں کھانے کو۔ اس کے بغیر دماغ کا ہاضمہ خراب رہتا ہے سالے کا۔"

میں نے کہا "ابھی میں چھپ کے تمہیں دیکھ رہا تھا تو قسم اللہ کی پیار نے۔ بہت اچھا لگا مجھے یہ سین۔ چلوئے حور تیں لنگور خدا کی قدرت۔ لیکن جوڑے اگر آسمانوں پر بنتے ہیں تو خدا نے شاید اس سے اچھا جوڑا آج تک نہ بنایا ہو۔ دس سال سے تو میں بھی دیکھ رہا ہوں تم دونوں کو۔ کتنا وقت لگا قدرت کو اس فیصلے پر پہنچنے میں اور جو فیصلہ اتنا سوچ سمجھ کے کیا جائے وہ کتنا صحیح ہو گا۔"

نیلم نے میرا بازو تھام لیا "چلو اندر چل کے باتیں کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم لوگ چائے پی چکے؟"

"تمہارے ساتھ پھر پئیں گے۔" نیلم بہت خوش تھی اور بات بات پر ہنس رہی تھی "اچھا تم لوگ یہاں بیٹھو۔ میں بانو خالہ سے کہتی ہوں۔"

میں نے کہا "میں تو کافی پیوں گا۔"

رئیس میرے ساتھ ٹیرس میں پڑے ہوئے کشن والے بید کے صوفے پر بیٹھ گیا "پتا تو مجھے چل گیا تھا تیرے فرار ہونے کا۔"

میں نے کہا "تجھے کیسے پتا چل گیا۔"

"اب یار کورٹ میں ایک سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجسٹریٹ نے کئی بار پوچھا کہ ملزم کہاں ہے تو ایس ایچ او نے بڑی مشکل سے کہا کہ سر آج اسے پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر مجسٹریٹ بگڑ گیا کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ تم ملزم کو لائے کیوں نہیں؟ انسپکٹر سلامت علی نے پہلے ٹالا کہ ملزم کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی مگر پھر فرید عباسی بھی اس کے پیچھے پڑ گیا کہ عدالت کو سچ بتاؤ۔ کیا تمہارے جسمانی تشدد کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہے؟ یا تم نے اسے مار دیا ہے۔ عدالت میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بالآخر انسپکٹر نے تسلیم کیا کہ ملزم حراست سے فرار ہو گیا ہے۔ فرید عباسی نے اسے جھوٹ قرار دیا تو سلامت علی نے کہا کہ ملزم کے کچھ ساتھی اسے تھانے سے زبردستی چھڑا کے لے گئے۔ فرید عباسی نے پوچھا کہ کیا تھانے پر مسلح افراد کے حملے کی اس واردات کا اندراج روزنامچے میں ہے؟ وہ کیا بتاتا آئیں بائیں شائیں کرتا رہا۔ ایس ڈی ایم تجربہ کار اور پولیس شناس لوگ ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ عدالت تمہیں دو گھنٹے دیتی ہے۔ دو گھنٹے بعد میں ملزم کو پیش کر دیا اس کی حراست سے فرار کا ریکارڈ لاؤ۔ سلامت علی تو عدالت سے بھاگ گیا۔ اس کے ایک ماتحت نے کہا کہ انچارج صاحب ریکارڈ لینے کے لیے تھانے ہی گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں لوٹ کر نہیں آئے۔ انھیں کچھ مہلت دی جائے۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ عدالت کا وقت ختم ہونے تک مہلت ہے۔ اس کے بعد تھانہ انچارج کے خلاف غفلت اور نا اہلی کے الزام میں مقدمہ درج کیا جائے۔ عدالت برخاست ہونے سے پہلے ہی اے ایس پی وہاں پہنچ گیا اور شاہ

پیش ہو گیا اور اس نے بتایا کہ انسپکٹر سلامت علی کو غفلت برتنے اور ادائے فرض میں کوتاہی برتنے پر معطل کر دیا گیا ہے اور اس معاملے کی پوری طرح چھان بین کی جائے گی۔ مجسٹریٹ نے کہا کہ تھانے کے عملے کو ہی معطل کیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ زیرِ حراست ملزم کو فرار کرانے میں کس کس کا ہاتھ ہے۔ ان سب کے خلاف مقدمات درج کیے جائیں اور ایک مہینے بعد رپورٹ عدالت میں پیش کی جائے۔ فرید عباسی نے اچھا خاصا ہنگامہ کیا کہ پولیس نے میرے مؤکل کو تشدد سے ہلاک کر دیا ہے۔ ان کے خلاف قتل کا مقدمہ درج نہ ہوا تو وہ ہائی کورٹ سے رجوع کرے گا۔ حراست سے فرار کی کہانی جھوٹ ہے جو پولیس انسپکٹر سلامت علی کو بچانے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ اس معاملے میں عدالت عالیہ کی سطح پر انکوائری آفیسر مقرر ہونا ضروری ہے۔"

"پولیس تو پھنس گئی۔" میں نے کہا۔

"فرید عباسی ایک دو دن میں ہائی کورٹ میں پولیس کے خلاف درخواست دے گا اور یہی موقف اختیار کرے گا کہ پولیس نے میرے مؤکل کو اپنے بہیمانہ تشدد سے ہلاک کر دیا ہے اور اب اس قتل کو چھپانے کے لیے حراست سے فرار کی کہانی گھڑی گئی ہے۔ پولیس کو حکم دیا جائے کہ وہ شاہ عالم کو عدالت میں پیش کرے۔"

میں نے کہا "فرید عباسی کے لیے یہ اپنی وکالت کی دکان چمکانے کا بہترین موقع ہے۔ وہ پریس کانفرنس بلا لے۔"

"یہی مشورہ اسے شبنم نے دیا تھا۔ وہ تجھ سے بات کرے گا پہلے۔" رئیس نے کہا۔

نیلم جو خاموشی سے ساری باتیں سن رہی تھی رئیس سے کہا "اب چھوڑو یہ سب۔ جان بچ گئی تو خدا کا شکر ادا کرو۔"

میں نے کہا "وہ تو میں کر ہی رہا ہوں لیکن یہ سب بھی ضروری ہے۔"

"کیوں ضروری ہے۔"

میں نے کہا "جھوٹ اگر مسلسل اور بار بار بولا جائے تو بالآخر دنیا اسے سچ مان لیتی ہے۔ میرے معاملے میں بہت زور و شور کے ساتھ مسلسل یہ بات کہی جانی چاہیے کہ پولیس نے اسے ہلاک کر دیا اور لاش غائب کر دی۔ ہم یہ جھوٹ بار بار اخباروں میں بولیں گے تو پبلک اس پر آسانی سے یقین کر لے گی کیونکہ پُراسرار طور پر کسی کا غائب ہونا ایک بے معنی بات ہے۔ پولیس تشدد سے لوگ ہلاک ہوتے ہی رہتے ہیں پھر ہمارے سیاسی کلچر میں سرکاری کریہ رسی؟ بقدر رضا و رغبت ہراساں کرنے اور راستے سے ہٹانے کے لیے ہمیشہ استعمال کیا گیا ہے اور سیاسی قتل بھی ہماری سیاسی تاریخ کا حصہ ہیں۔ ابھی شاہ عالم کی سیاسی حیثیت اخبارات کی حد تک برقرار ہے۔ چنانچہ اس کے قتل کو ایک سیاسی سازش بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ ملک رب نواز کے سوا باقی سب مان لیں گے کہ اسے بھی قتل کر دیا گیا یا کرا دیا گیا۔"

"آخر کیا ضرورت ہے اتنا لمبا چکر چلانے کی۔" نیلم بولی۔

"ضرورت ہے نیلم۔ اس کا ایک فائدہ تو مجھے ہو گا۔ لوگ جان لیں گے کہ اب شاہ عالم نہیں رہا۔ ناصر عظیم کے مستقبل کا تحفظ شاہ عالم کے عدم وجود کے ساتھ وابستہ ہے۔ شاہ عالم کے لیے صرف یہ فرض کر لینا کافی نہیں ہے کہ وہ لاپتا یا غائب ہو گیا ہے۔ مفرور ہے یا روپوش ہے کیونکہ ایسی صورت میں اس کے کہیں زندہ پائے جانے کے امکانات باقی رہتے ہیں۔ چنانچہ یہ لازمی ہے کہ شاہ عالم کے زندہ نہ ہونے پر لوگوں کو یقین آ جائے۔ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کی موت کو ثابت کر دیا جائے مگر اس کا ثبوت کوئی نہیں۔ دوسرا طریقہ صرف یہی ہے کہ اس کے نہ ملنے پر واویلا کیا جائے اور مسلسل یہ کہا جائے کہ اسے پولیس نے قتل کر کے اس کی لاش کو غائب کر دیا ہے۔ ظاہر ہے پولیس۔۔۔ اس کی نفی کرے گی لیکن لوگوں کا یہ ہے کہ وہ پولیس کے انکار کو بھی اقرار سمجھتے ہیں اور ہر دعوے کو بے بنیاد جھوٹ جانتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ ہمارے موقف کو بہ آسانی مان لیا جائے گا اور کسی ثبوت کے بغیر بھی تسلیم کر لیا جائے گا کہ شاہ عالم کو مروا دیا گیا۔ کس نے مروایا۔ کیوں مروایا اور کیسے مروایا۔ ایسے سوالات ہمیشہ اٹھتے ہیں لیکن لیاقت علی خاں سے لے کر آج تک ہونے والے کسی قتل کے سلسلے میں نہ ایسے سوالات کا کوئی جواب ملا ہے اور نہ کسی قتل کا معما حل ہوا ہے۔ چنانچہ شاہ عالم کا قتل بھی اسی فہرست میں شامل ہو جائے گا جس میں شہید ملت کے بعد ڈاکٹر خان صاحب اور امیر محمد خان آف کالا باغ کے بعد بھی کئی نام شامل ہو چکے ہیں اور یہ فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جا رہی ہے۔ کرنے والے تو اس فہرست میں ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق کے نام بھی شامل کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں شاہ عالم جیسے معمولی حیثیت کے سیاست داں کا نام بھی مارے جانے والوں میں لکھ دیا گیا تو یہ کوئی ناقابلِ یقین بات نہیں ہو گی۔"

رئیس سوچ کے بولا "پھر بھی ہمارے رب نواز جیسے

گیا تھا کہ میرے لیے اس کا ... لوگ ہمیشہ شک میں ہی مبتلا رہیں گے۔"

میں نے کہا "ٹھیک کہتا ہے تو مگر ہو سکتا ہے بعد میں خود پولیس اپنی جان چھڑانے کے لیے اور شاہ عالم کے سارے کیس ختم کرنے کے لیے کہیں سے اس کی لاش بھی برآمد کرلے اور پوسٹ مارٹم سے اسے شاہ عالم ثابت بھی کردے۔ اگر پولیس نے ایسا نہ کیا تو پھر ہم کچھ کریں گے۔ کبھی نہ کبھی شاہ عالم کی تدفین بھی کرا ہی دیں گے۔ فی الحال ہمارے لیے یہی کنفیوژن کافی ہے اور ناصر عظیم اس سے پورا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ یہ نحوست کا چکر ختم ہوا۔" نیلم نے ایک گہری سانس لے کر کہا "اب تم شاہ عالم کے بارے میں سوچو ہی نہیں۔ جو ہونا تھا ہوا۔ اب تم ناصر عظیم ہو تو بس ناصر عظیم رہو۔ شاہ عالم کا نام بھی مت لو۔"

ہم نے رات کا کھانا بھی اوپن ٹیرس پر ہی کھایا اور پھر دیر تک اپنی باتیں کرتے رہے۔ میں نے گرفتاری کے بعد ملک رب نواز کی حراست میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بتائی۔ نیلم بڑی نفرت آمیز دلچسپی کے ساتھ سنتی رہی اور بیچ بیچ میں میرے ساتھ ہمدردی کے جذبات کا اظہار بھی کرتی رہی اور ملک رب نواز پر خفا ہی ہوتی رہی۔ رئیس ہر بات کرید کرید کر پوچھتا تھا اور بار بار مشتعل ہو کے رب نواز کو گالیاں دینے لگتا تھا "قسم اللہ کی یار رے۔ اس کی تو میں..." غصے میں وہ بھول جاتا تھا کہ وہاں نیلم بھی موجود ہے اور نیلم ہر بار اسے ٹوکتی تھی کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔

ہماری باتیں شاید ساری رات جاری رہتیں مگر درمیان میں بانو خالہ نے جالی والے دروازے کے پیچھے آکے کہا "اے بیٹا اس کا فون آیا ہے۔ ارے کیا نام ہے اس کا اچھا سا۔ وہ جو اخبار میں ہے۔"

نیلم اٹھی "شبنم کا فون ہے۔"

رئیس نے اسے روک دیا "ایک منٹ ٹھہرو۔ کچھ تفریح لیتے ہیں۔"

اس نے ایک کارڈلیس فون کا ریسیور مجھے تھما دیا اور خود اندر جا کے باتیں کرنے لگا "شبنم۔ کوئی خبر؟"

شبنم نے مایوس لہجے میں جواب دیا "کچھ نہیں۔"

"میں نے بھی آج سارا دن جھک ماری۔ کچھ حاصل نہیں ہوا۔"

شبنم نے کہا "صبح دیکھنا۔ سارے اخباروں میں شاہ عالم کے لاپتا ہونے کی خبر تین کالم کی سرخی ہوگی۔ کہ پولیس نے شاہ عالم کو خدانخواستہ حراست میں تشدد سے ہلاک کردیا ہے۔"

"اس میں خدانخواستہ والی کوئی بات نہیں۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہے شبنم اور خبر سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"خبر تو محض پولیس پر دباؤ بڑھانے کے لیے ہے تاکہ وہ شاہ عالم کو عدالت میں پیش کردیں۔ ورنہ مجھے یقین ہے کہ پولیس ایسا نہیں کر سکتی۔"

"کیوں نہیں کر سکتی۔" رئیس تلخی سے بولا۔

"اس لیے کہ شاہ عالم کوئی عام لاوارث ملزم نہیں تھا۔ اس کا ایک امیج ہے۔ وہ پبلک لیڈر شمار ہوتا ہے۔"

"یہ سب باتیں دل کی تسلی کے لیے ہیں۔ مجھے اب کوئی امید نہیں رہی کہ وہ کہیں ہے۔"

شبنم کچھ خوف زدہ ہوگئی "ایسا مت کہو۔ تم دیکھنا کل تک پولیس اسے ضرور عدالت میں لے آئے گی۔ میں نے بہت سخت اداریہ لکھا ہے۔"

"بھاڑ میں گیا تمہارا اداریہ۔ کون پوچھتا ہے تمہارے اداریے کو بی بی۔ میں نے تو کچھ اور ہی سنا ہے۔ خدا کرے غلط ہو۔"

وہ نروس ہونے لگی "کیا سنا ہے؟"

"ایک افواہ ہے کہ پولیس نے اسے رب نواز کے حوالے کردیا تھا۔"

"پولیس ایسا نہیں کر سکتی؟"

"پولیس سب کچھ کر سکتی ہے۔ میں نے بھی اس پر یقین تو نہیں کیا مگر جس شخص نے یہ بتایا تھا وہ رب نواز کا خاص آدمی ہے۔ اس نے کہا۔"

شبنم گھبرا گئی "کیا کہا اس نے؟ بولو۔"

"چھوڑو۔ تمہیں صدمہ ہوگا۔"

شبنم نے بگڑ کے کہا "بتاتے کیوں نہیں کیا بات ہے؟"

"تم ابھی رونے لگو گی۔"

شبنم چلائی "ایسی کیا بات ہے آخر۔ مجھے پریشان کیوں کر رہے ہو۔"

رئیس نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا "شبنم۔ وہی ہوا بالآخر جس کا ڈر تھا۔ رب نواز نے اسے... مروا دیا ہے۔"

شبنم نے پھر چلا کے کہا "جھوٹ بکتے ہو تم۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"آئی ایم سوری شبنم۔ لیکن رب نواز کا وہ خاص بندہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔"

شبنم رونے کے قریب ہوگئی "میں نہیں مان سکتی۔ آخر اس نے تم سے یہ بات کیوں کی۔"

"او ہو۔ بات تو وہ کسی اور سے کر رہا تھا۔ میں نے سن لی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ شاہ عالم کو پولیس اب عدالت میں کہاں سے لائے گی۔ اس کی تو لاش بھی نہیں ملے گی کسی کو۔"

شبنم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔"

اب میں نے کہا "بالکل نہیں ہو سکتا جی۔ ہو سکتا ہے لاش نہ ملے بندہ خود مل جائے۔ بلکہ مل ہی چکا ہو اب تک۔"

شبنم کے ذہن کو کیسا جھٹکا لگا ہوگا اس کا اندازہ میں کر سکتا تھا۔ میری آواز سن کر اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا ہوگا کیونکہ وہ چند سیکنڈ خاموش رہی پھر چلانے لگی "تم۔؟ شرم نہیں آتی تمہیں۔ ذلیل۔ کمینے۔"

میں نے ہنس کے کہا "کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ ناصر عظیم گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا۔"

"یہ رئیس تمہارے ساتھ بیٹھ کے بکواس کر رہا تھا۔"

"جی۔ اور میں سب سن رہا تھا گویا۔"

"اسے تو میں وہاں آکے ٹھیک کروں گی۔" اس نے سخت طیش میں کہا "منحوس شکل اور منحوس زبان والا۔ رئیس خبیث!"

میں نے کہا "یہ اس کی صحیح تعریف ہے۔"

"تم کب آئے۔ کیسے آئے۔ اچھا میں وہیں آتی ہوں۔"

میں نے کہا "دیکھو۔ میں بھی بہت تھکا ہوا ہوں اور سونا چاہتا ہوں۔ تم صبح آؤ اپنا کام ختم کرکے۔"

"مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔" اب اس کا لہجہ خوشی سے معمور تھا۔

میں نے کہا "فی الحال صرف اتنا سن لو کہ میں واقعی رب نواز کی قید میں تھا مگر نکل آیا وہاں سے۔"

"کیسے نکل آئے۔"

"زور بازو سے اور کیسے۔"

"تم ٹھیک تو ہو نا؟" وہ سخت جذباتی ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "میں ایک سو ایک فیصد ٹھیک ہوں اور نیلم کے گھر میں ایک سو ایک فیصد محفوظ ہوں۔"

"ناصر۔ کسی نے تمہیں یہاں آتے ہوئے دیکھا تو نہیں تھا۔"

میں نے کہا "یہاں تک کسی کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہیں۔"

"پھر بھی تم احتیاط کرو۔ ابھی کچھ دن گھر سے مت نکلو۔"

"یعنی ایک قید سے نجات پا کے دوسری قید برضا و رغبت قبول کرلوں۔ ڈر کی وجہ سے باہر ہی نہ جاؤں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ صبح مجھے تمہارے ساتھ جا کے اپنے آفس دیکھنے ہیں۔"

وہ لجاجت سے بولی "ناصر میرا بہت دل چاہ رہا ہے ابھی آنے کو۔"

میں نے کہا "اگر تم بھی مجھ پر یہ تشدد کرنا چاہتی ہو تو آجاؤ۔ پہلے مجھے پولیس نے جگائے رکھا پھر رب نواز نے۔ اب کیا تم بھی سونے نہیں دو گی؟ میں نیند کی سخت کمی کا شکار ہوں شبنم۔"

"او کے۔ او کے۔ میں صبح آجاؤں گی۔ شب بخیر!"

میں نے کہا "شب بخیر۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

میری دلی خواہش تو یہ تھی کہ میں ابھی جا کے قمر اور چندا سے ملوں مگر میں نے اسے تقاضائے دانش مندی کے خلاف سمجھتے ہوئے خود کو قائل کیا کہ اس وقت سو جانے سے رات بھر میں میری ذہنی اور جسمانی توانائی کی بیٹری پوری طرح چارج ہوجائے گی اور میں نئی زندگی کی ولدار صبح کا استقبال زیادہ پُرجوش انداز میں کرسکوں گا اور میرے لیے ناصر عظیم کی حیاتِ نو کے معمولات کو اختیار کرنا زیادہ آسان ہوجائے گا۔

شبنم صبح سات بجے ہی آموجود ہوئی۔ گہری پُرسکون نیند سے جاگ کے میں نے بیڈ روم کے دروازے پر اس کے بے قرار ہاتھوں کی دستک سنی اور پھر اس کی آواز۔ میرے آنکھیں کھول کے بیڈ چھوڑنے تک اس نے گھر میں ایک ہنگامہ کردیا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا تو اس کے اندر آنے سے پہلے اس کی خوشبو کا جھونکا اندر آیا پھر میں نے اسے خوشی سے جگمگاتی مسکراہٹ اور بے تاب روشن آنکھوں کے ساتھ اپنے مقابل دیکھا۔ اس نے وہی نظر نواز لباس پہن رکھا تھا جو ایک طرح سے اس کی پہچان اور اس کی شخصیت کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ مردانہ کالر والی لمبی سیاہ شرٹ جس کا اوپر والا ایک بٹن ہمیشہ کھلا رہتا تھا یا غیر موجود ہوتا تھا اور جس میں اس کی گردن اور اس کے نیچے تک نظر آنے والی شفاف جلد کا اجلا پن زیادہ خیرہ کن ہوجاتا تھا۔ کندھے پر تھیلے جیسا بیگ اور نیچے سفید شلوار کے ساتھ جوگرز۔ اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی مخصوص پرفیوم لگا رکھی تھی اور شانوں تک تراشیدہ بالوں کے سر سراتے مچلتے ریشم کو کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

وہ کچھ دیر مجھے مسحور کردینے والی سحر زدہ نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر بولی "واؤ!"

میں نے اس کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا "اس داؤ کا بھلا کیا مطلب ہوا۔" میں ایک انگڑائی لے کر مسکرایا۔

"مطلب بتاؤں؟" وہ بولی اور ایک دم مجھ سے لپٹ کر میرے چہرے کو اپنے ہونٹوں کی لپ اسٹک سے لال کرنے لگی۔

میں نے اسے زبردستی دھکیلا "یہ کیا پاگل پن ہے شبنم۔"

"تم اتنے سویٹ اور ڈیشنگ لگ رہے ہو کہ میرا دل میرے قابو میں نہیں۔" پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کے جھول گئی۔

میں نے برہمی سے کہا "خدا کے لیے کچھ عقل سے کام لو۔"

"یہ عقل کا نہیں جذبات کا معاملہ ہے جانِ من۔" وہ میرے کلین شیو چہرے پر ہاتھ پھیر کے بولی۔

میں نے ایک جھٹکے سے اس کے بازو الگ کر دیے "بے وقوف لڑکی۔ ابھی نیلم آ گئی پھر۔"

وہ ہنسی "پھر کیا۔ کون سی نئی بات معلوم ہوگی اسے؟"

میں نے تولیے سے رگڑ کے اپنا چہرہ صاف کیا "میں کتنی بار تمہیں سمجھا چکا ہوں کہ میں اب پہلے والا شاہ عالم نہیں ہوں۔"

"مگر میں تو وہی شبنم ہوں۔" وہ ہینڈ بیگ میز پر رکھ کے میرے بیڈ پر جوتوں سمیت دراز ہو گئی "وہ کیا کہتے ہیں انگریز۔ گلاب کو جس نام سے بھی پکارو [illegible] رہے گا۔ تمہارا نام بدلنے سے میرے جذبات تو نہیں بدل سکتے۔"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "نہیں شبنم۔ ایسے بالکل نہیں چلے گا۔"

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگی "میں چلاؤں گی۔ بقول شاعر۔ تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے۔"

میں نے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ تم نے میری بڑی مدد کی ہے اور میں تمہارے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں مگر اس کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔"

"آج کی دنیا میں جائز فائدے کا کوئی تصور ہے؟"

میں نے کہا "تم جتنی جلدی یہ حقیقت تسلیم کر لو کہ ناصر عظیم وہ مرد نہیں ہے جو تمہاری چاہت کا جواب چاہت سے دے سکے۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "یہ چاہت تو مجھے شاہ عالم سے بھی غنڈا ٹیکس کی طرح وصول کرنی پڑتی تھی۔ اپنی خوشی سے یہ ٹیکس دیتا ہے کوئی؟"

میں نے خود کو سخت بے بس محسوس کیا "شبنم۔ تم اور میں اچھے دوستوں کی طرح رہ سکتے ہیں۔"

"اور پیار بھی کر سکتے ہیں۔ کیا دوستی پیار کی راہ میں حائل ہو سکتی ہے یا پیار ہو تو دوستی نہیں ہو سکتی۔ تمہاری منطق بھی عجیب ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی "چلو اب پہلے تم نہا دھو کے تیار ہو جاؤ۔ میں دیکھوں نیلم اٹھی یا نہیں پھر ہم ناشتا کریں گے۔ میرا تو بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔"

ناشتے کے بعد نیلم نے مجھ سے معذرت کی "آج میرا بہت بزی شیڈول ہے۔ رات کو ملاقات ہوگی۔ رئیس رہے گا تمہارے ساتھ۔"

رئیس بولا "میں اسے گھر میں باندھ کے رکھوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

میں نے کہا "نہیں یار آج بہت کام ہیں۔"

رئیس بولا "اب رہنے دے سارے کام ابھی۔ کچھ دن باہر مت جا۔"

"یہی مشورہ خاتون بھی دے رہی تھیں۔" میں نے شبنم کی طرف دیکھا "لیکن میرے لیے کسی قیدی کی طرح گھر میں بند رہنا ناممکن ہے۔"

نیلم نے کہا "ایسے کون سے ضروری کام ہیں آخر۔"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو مجھے اپنے لیے جوتے اور کپڑے وغیرہ لینے ہیں۔ روز مرہ کے استعمال کے لیے پھر مجھے بینک جانا ہے۔ بینک پر یاد آیا۔ میرا سامان [illegible] کہاں [illegible]؟"

رئیس نے کہا "کچھ سامان تو جیرا بلیڈ ایک سوٹ کیس میں ڈال کے لے گیا تھا۔ باقی میں ہوٹل سے اٹھا لایا تھا۔ تیرے کمرے میں پڑا ہے۔ تو نے دیکھا نہیں؟"

میں نے کہا "اس میں دو بینک ڈرافٹ ہیں دو لاکھ پاؤنڈ کے۔ لندن میں عاقل خان نے بنوائے تھے۔ ایک نیلم کے نام پر ہے وہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دے گی۔ دوسرا تیرے نام پر ہے۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔"

میں گیسٹ بیڈ روم تک گیا جہاں میں رات کو سویا تھا۔ وہاں ایک کونے میں میرے دو سوٹ کیس رکھے تھے اور ان کے اوپر بریف کیس رکھا ہوا تھا میں نے بینک ڈرافٹ نیلم اور رئیس کے حوالے کر دیے۔

نیلم نے کہا "میرا فارن ایکسچینج اکاؤنٹ ہی ہے کیا تمہیں ایک لاکھ پاؤنڈ نکلوانے ہیں۔"

میں نے کہا "پاؤنڈ کا میں کیا کروں گا؟"

"بینک سرکاری شرح پر لے گا اور بازار میں دو گے تو ایک لاکھ روپے زیادہ مل جائیں گے۔"

رئیس نے سر ہلایا "دو لاکھ پاؤنڈ مارکیٹ میں نوّے لاکھ کے ہوں گے۔ بینک سے اٹھاسی لاکھ ملیں گے۔"

میں نے کہا "یار میں کسی لمبے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ اب کون بازار جا کے منی بروکرز سے سودا کرے۔"

نیلم نے کہا "پھر میں یہ بینک ڈرافٹ جمع کرا دیتی ہوں اپنے اکاؤنٹ میں اور تمہیں پینتالیس لاکھ کا چیک دے دیتی ہوں۔ تم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا یا کیش لے لینا۔ جیسی تمہاری مرضی۔"

رئیس نے کہا "ایک چیک مجھ سے بھی لے لے۔"

میں نے کہا "آخر ایسی افراتفری کیا ہے؟ کر لیں گے بعد میں حساب۔ ابھی تو میرے اپنے اکاؤنٹ میں اس سے کہیں زیادہ رقم پڑی ہے۔"

"وہ مجھے معلوم ہے کہ تم غریب اور پھکڑ نہیں ہو۔ مگر حساب تو حساب ہے۔" نیلم نے کہا اور پینتالیس لاکھ کا چیک لکھ کر مجھے تھما دیا۔

میں نے کہا "واٹ از دس۔ بینک تمہیں دے گا چوالیس لاکھ اور تم مجھے دے رہی ہو پینتالیس۔"

وہ بولی "میں بازار سے پاؤنڈ خریدتی۔"

"لیکن تم بازار سے کیش خرید رہی ہو۔ ضرورت پڑے گی تو میں تم سے ایک لاکھ نہیں دس لاکھ بھی مانگ لوں گا۔"

میں نے چیک اسے واپس کر دیا "مگر ایسے نہیں لوں گا۔"

نیلم نے دوسرا چیک چوالیس لاکھ کا لکھا پھر اتنی ہی رقم کا چیک رئیس نے بھی دیا "اتفاق سے اپنے اکاؤنٹ میں بھی اتنی رقم ہے۔ میں نے رئیس خانے کی فروخت سے حاصل ہونے والی ساری رقم ڈال دی تھی۔"

میں نے کہا "تو نے رئیس خانہ بیچ دیا؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "رئیس خانے میں اب کیا تھا۔ ملبہ اور راکھ۔ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا۔"

میں نے کہا "اداس مت ہو۔ قدرت جو کرتی ہے اچھا کرتی ہے۔"

نیلم نے بات بدلنے کے لیے کہا "اور کہاں جانا ہے تمہیں؟"

میں نے کہا "کمال کے اسپتال جاؤں گا سب سے ملنے پھر شبنم کے ساتھ جا کے اپنے آفس دیکھنے ہیں۔ ناصر عظیم کی زندگی کا میدان بہت مصروفیت کا ہے۔"

نیلم نے کہا "ابھی میں رئیس کو ساتھ لے جا رہی ہوں۔ یہ مجھے اسٹوڈیو چھوڑ کے گاڑی واپس لے آئے گا۔"

"گاڑی تو ہے میرے پاس بھی۔" شبنم کچھ برا مان کے بولی۔

نیلم مسکرانے لگی "مجھے معلوم ہے لیکن میری گاڑی کے شیشے سیاہ ہیں اندر بیٹھا ہوا آدمی نظر نہیں آتا۔"

نیلم کے جانے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو صرف نو بجے تھے۔ میں شبنم کے ساتھ باغ میں ٹہلتا رہا اور اسے گزشتہ دو دن کی روداد سناتا رہا۔ وہ ایک بہت خوب صورت اور خوشگوار دن تھا۔ اجلی نیلاہٹ والے آسمان میں سفید کبوتروں کی ٹولی محوِ پرواز تھی۔ فضا میں صبح بہار کی تازگی اور مہک تھی۔ درختوں سے اور سبزے سے ایک دلآویز نمناک خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر مالی لان کو فوارے سے پانی دے رہا تھا اور شوخ سبز رنگ کی گھاس پر پانی کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ وسیع باغ اور لان کے آخری حصے کی فصیل کے ساتھ سیکیورٹی گارڈز اسلحہ اٹھائے بے نیازی سے کھڑے تھے۔ ان کی ڈیوٹی انتہائی سخت اور بیزار کن تھی۔ وہ آپس میں بات تک نہیں کر سکتے تھے اور کچھ نہ ہونے کے باوجود سارا دن چوکس رہنے پر مجبور تھے کہ کچھ ہو نہ جائے۔

میں نے شبنم سے کہا "تم رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔ سو جاؤ۔"

وہ بولی "میں الو ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی۔"

میں نے کہا "میری بات مانو۔ ایک بجے تک میں رئیس کے ساتھ بینک کے سب کام نمٹا کے آجاؤں گا پھر ہم یعنی میں اور تم چلیں گے۔ کہیں بیٹھ کے کھانا کھائیں گے پھر تم مجھے کچھ شاپنگ کرا دینا۔ میرے پاس استعمال کے لیے ڈھنگ کے کپڑے ہی نہیں ہیں۔ اس کے بعد اگر وقت بچا تو وہ آفس دیکھیں گے جو تم نے میرے لیے ڈیکوریٹ کروائے ہیں۔"

وہ بولی "وقت کی کوئی کمی نہیں۔ رات تک بہت ٹائم ہے۔"

"آج رات تو میں قمر کے گھر میں رہوں گا۔"

"اور چندا کے ساتھ۔!"

میں نے کہا "یس چندا اور ڈاکٹر کمال فاروقی۔ تم جانتی ہو کہ یہی میری فیملی ہے۔ اس میں رئیس اور نیلم کو اور شامل کر لو۔"

"یعنی میں کسی خانے میں فٹ نہیں ہوتی۔" وہ تلخی سے بولی۔

میں نے کہا "کیا بات کرتی ہو۔ تم سے اچھا دوست کون ہے میرا۔ جتنی مدد تم نے کی ہے میری اس پُر آشوب دور میں

کسی نے نہیں کی۔ تمہارے احسانات کا بہت بار ہے مجھ پر۔ اتنا کہ میں اتارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میرے لیے سب سے زیادہ قابلِ اعتبار مشیر ہو۔"

وہ مایوسی سے بولی "رہنے دو یہ دل خوش کرنے والی بیکار باتیں۔"

"شبنم میں جو کہہ رہا ہوں دل سے کہہ رہا ہوں۔"

وہ بولی "مگر دل سے وہ بات نہیں کہہ رہے ہو جو میں سننا چاہتی ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ محبت تمہیں مجھ سے کبھی نہیں تھی مگر بے رخی اور لاتعلقی کا یہ انداز پہلے نہ تھا۔ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے تم جانتے بوجھتے میرے ساتھ ایسا رویہ رکھتے ہو کہ میں بددل ہو کے تمہارا پیچھا چھوڑ دوں۔"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "ایسا سمجھنا بڑی زیادتی ہے شبنم۔ میرے دل میں تمہاری بڑی قدر ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اب تمہارے بغیر میری زندگی اتنی ہی ادھوری ہوگی جتنی قمر یا چندا کے بغیر۔ یا نیلم اور فرید عباسی کے بغیر۔"

"غلط۔ تمہارے دل میں میرے لیے وہ جگہ نہیں جو چندا کے لیے ہے۔"

"بالکل غلط۔ دراصل یہی تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تمہیں وہی عزت اور احترام بھی دینا چاہتا ہوں جو چندا کو حاصل ہے لیکن تم شاہ عالم کی زندگی والے پرانے مقام پر رہنے کی آرزو مند ہو۔ اس معاملے میں وضاحت میں پہلے کرچکا ہوں لیکن آج پھر دو ٹوک الفاظ میں کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر یہ بات پھر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں شاہ عالم کی طرح۔ میرا مطلب ہے پہلے کی طرح تمہارا جذباتی استحصال نہیں کروں گا۔"

"کھل کے کیوں نہیں کہہ دیتے کہ میرے جسم سے تمہارا دل بھر گیا ہے۔ اب تمہیں مجھ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔"

"خدا کے لیے شبنم۔ اپنی حیثیت اور مقام کو دیکھو۔ اپنے آپ کو اتنا آسان حاصل کیوں بناتی ہو۔ شاہ عالم کے لیے یا کسی اور کے لیے۔"

"میں کسی کے لیے آسان حاصل نہیں ہوں۔" وہ برہمی سے بولی "زبان سے کوئی کچھ بھی کہتا رہے لیکن کس میں ہمت ہے کہ شبنم کو بری نیت سے چھونے کی ہمت بھی کرے۔"

میں نے کہا "خدا نے تمہیں وہ حسن دیا ہے کہ جس پر تم جتنا ناز کرو کم ہے۔ تمہارے پاس ذہانت کی طاقت ہے اور آگے بڑھنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔ تمہاری جرأت اور حوصلہ مندی نے تمہیں وہ قوتِ تسخیر دے دی ہے جس سے کام لے کر تم سارے زمانے کو مطیع کرسکتی ہو۔"

"بس ایک شاہ عالم کو نہیں جیت سکتی کیونکہ وہ اب ناصر عظیم بن گیا ہے۔" شبنم نم لہجے میں بولی "ناصر عظیم کے لیے میں کچھ نہیں۔ وہ میری طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا۔"

میں نے کہا "آخر میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ تمہاری قدر و منزلت اب پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔"

"دیکھو۔ ایسے الفاظ سے مت کھیلو۔ ایک بات بتاؤ مجھے۔ تم کسے زیادہ چاہتے ہو؟ مجھے یا چندا کو؟"

"یہ کیا فضول سوال ہے۔ ایسے ہی رئیس سوال کرے مجھ سے کہ تمہارا زیادہ اچھا دوست کون ہے۔ میں یا کمال فاروقی۔ تو میں کیا جواب دوں گا اسے؟ تمہاری بات کا بھی یہی جواب ہے میرے پاس کہ تمہاری اہمیت اپنی جگہ ہے۔ چندا کی اپنی جگہ۔"

شبنم پر جیسے ضد سوار ہوگئی تھی کہ وہ مجھ سے اپنی مرضی کا جواب حاصل کرکے رہے گی۔

"مگر ایک مرد کی حیثیت سے تمہیں چندا میں زیادہ کشش محسوس ہوتی ہے۔ اگر موقع ملے تو تم کسے شریکِ حیات بناؤ گے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "خدا کے لیے شبنم۔ ایسے سوال مت پوچھو مجھ سے جن کا میرے پاس جواب ہی نہ ہو۔ ابھی تو میں نے شادی کے بارے میں سوچنا بھی شروع نہیں کیا۔ میں واقعی بڑی مشکل میں پڑ جاؤں گا اگر یہی سوال چندا مجھ سے پوچھ بیٹھے۔ حالات اور مستقبل پر کس کا اختیار ہے۔ کیا معلوم کل کیا ہو۔ جب وقت آئے گا تو نہ جانے کیا صورت حال ہوگی۔ ہو سکتا ہے میں ٹاس کرلوں۔ تم دونوں کو چھوڑ کے کسی تیسری سے شادی کرلوں یا شرعی طریقے سے تم دونوں کو عقد میں لے آؤں۔"

آہستہ آہستہ شبنم کا موڈ خراب ہوتا چلا گیا "ناصر۔ کوئی حد ہوتی ہے بے وقوف بنانے کی۔ میں جا رہی ہوں۔"

میں نے اسے پکڑ کے بٹھا لیا "ایسے روٹھ کے مت جاؤ۔ پہلے سمجھ لو کہ میں تمہیں کیا سمجھانا چاہتا ہوں۔ ماضی کو بھول جاؤ۔ پہلے جو ہوا غلط تھا اور غیر اخلاقی تھا۔ وہ تمہاری عزتِ نفس کا سودا تھا۔ جو رویہ شاہ عالم نے تمہارے ساتھ روا رکھا اس پر آج ناصر عظیم شرمندہ ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ تم خود کو ناصر عظیم کی ملکیت مت سمجھو۔ تم کسی کے پاؤں کی جوتی، شرٹ یا پینٹ نہیں ہو کہ جیسے چاہے استعمال کرے۔ جیسے چاہے رکھے اور جب دل بھر جائے تو کسی کو

دے دے یا پھینک دے۔ تم میرے لیے میری زندگی کی طرح قابلِ قدر اور اہم ہو۔ تمہاری حفاظت میرے لیے اتنی ہی ناگزیر اور لازمی ہے جتنی اپنی زندگی کی۔"

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی "اور اگر میں اپنی زندگی کا راستہ الگ کرنا چاہوں۔ کسی اور سے تعلق استوار کرلوں؟"

میں نے کہا "ویسے تو تم عاقل و بالغ اور خود مختار ہو۔ اپنا برا بھلا خود سمجھتی ہو اور اصولاً میں تم پر کوئی زبردستی کا اختیار نہیں رکھتا لیکن تمہارا انتخاب غلط ہوگا تو میں تمہیں بھی سمجھانے کی کوشش ضرور کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ اتنا عرصہ دوست رہنے کے بعد مجھے وہ حق حاصل ہوگیا ہے جو ایک بھائی کو ہوتا ہے کہ وہ بہن کو غلط راستے پر نہ جانے دے یا ایک باپ کو ہوتا ہے کہ وہ بیٹی کو روکے اور تمہارا ردِعمل انتقامی نوعیت کا ہوا تو مجھے دکھ ہوگا اور مایوسی ہوگی۔ اسے میں اپنی بدبختی کی طرح قبول کروں گا۔"

وہ میری باتوں سے سخت بدمزہ اور بیزار ہوگئی تھی مگر کسی بات کو غلط نہیں کہہ سکتی تھی "میرے سر میں درد شروع ہوگیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے تمہاری بات مان کے سو جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک۔ لیکن ایک آخری بات سن لو شبنم۔ یہ جو ہماری زندگی ہے۔ یہ بہت مختصر ہے۔ پتا نہیں ہمارا ساتھ کب تک ہے اور کہاں تک ہے۔ اس رفاقت کے زمانے کو اچھا اور قابلِ فخر ہونا چاہیے۔ باعثِ ندامت نہیں۔ ہم تمام عمر ساتھ رہیں خدا کرے۔ مگر مستقبل کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔ ہم اکیلے رہ جائیں۔ تمہیں زندگی میں کوئی رفیقِ سفر مل جائے جس پر تم فخر کرسکو۔ یہ کہہ سکو کہ ناصر عظیم کیا تھا۔ ایک بہت ہی معمولی آدمی۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی "میرا دماغ زیادہ خراب مت کرو۔ ہم پھر کبھی بات کریں گے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ یہ بات آج ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اب اس موضوع پر ہمارے درمیان کبھی بات نہیں ہوگی شبنم۔"

شبنم سونے چلی گئی تو میں نے اخبارات دیکھے۔ شبنم اپنے اخبار کی ایک کاپی ساتھ لائی تھی۔ اس میں صفحۂ اول پر سہ کالمی سرخی کا عنوان تھا "شاہ عالم پولیس کی تحویل میں ہلاک!" نیچے خبر کے متن میں وہی تھا کہ مصدقہ ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق شاہ عالم کو پولیس نے حراست کے دوران تشدد کرکے ہلاک کردیا ہے۔ چنانچہ اسے آج مجسٹریٹ کے سامنے پیش نہیں کیا جاسکا۔ اندرادارے میں بھی شبنم نے اس موقف کو دہرایا تھا۔ فرید عباسی کے بیان کو موضوع بنایا تھا اور حکومت سے اعلیٰ ترین سطح پر تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا۔ دوسرے اخبارات میں نے ایک ملازم کو بھیج کر منگوائے۔ ان سب میں اس افسوس ناک واقعے پر سخت غم و غصے کا اظہار کیا گیا تھا کہ پولیس کی خود سری، چیرہ دستی اور لاقانونیت بڑھتی جارہی ہے۔ اب اس کا نشانہ عام آدمی ہی نہیں شاہ عالم جیسے سیاست داں بھی ہورہے ہیں جو معاشرے میں ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ سب نے پولیس کے خلاف سخت زبان استعمال کی تھی اور حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ مجرموں کو سخت سزا دی جائے۔ بالاتفاق رائے یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ شاہ عالم کے فرار کی کہانی ایک سفید جھوٹ ہے اور درحقیقت شاہ عالم کو قتل کرکے اس کی لاش غائب کردی گئی ہے۔

اخبارات کا یہ موقف میرے مقاصد کی تکمیل میں بے حد معاون تھا۔ میں بھی چاہتا تھا کہ شاہ عالم کی روپوشی کے معاملے کو نظرانداز کرکے اخبارات اس کی موت کو یقینی ثابت کرنے کا تاثر قائم کریں اور شبنم کی کوشش سے ایسا ہی ہورہا تھا۔

میں اخباروں کو الٹ پلٹ ہی رہا تھا کہ رئیس آگیا۔ وہ نیلم کی شاہی سواری یعنی بجیرو کو واپس لے آیا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کے پوچھا "وہ بلا بن کے چمٹنے والی چلی گئی۔ شبنم؟"

میں نے کہا "وہ رات بھر جاگی تھی۔ میں نے کہا سو جاؤ۔"

"تجھے تو اس نے بالکل ہی ماردیا۔ اخبار پڑھا تو نے؟"

میں نے کہا "پڑھا ہے۔"

"قسم اللہ کی یار رے۔ تیرے ہوٹل سے غائب ہوجانے کے بعد بڑی گڑبڑ پھیل گئی تھی۔ وہ سالا ہوٹل کا منیجر مجھے تیرا سامان دینے پر تیار نہ تھا۔ میں نے کہا بھی کہ میں شاہ عالم کا سیکریٹری ہوں مگر اس نے بھی اپنی کی۔ جب تک پولیس نہیں آئی اس نے مجھے سامان نہیں اٹھانے دیا۔ بڑا حرامی پن کیا سالے نے۔"

میں نے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ تیرا لہجہ، رویہ اور زبان سب بدل گئے ہیں اچانک۔"

"اب ہاں یار۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "وہ پیچھے پڑگئی ہے میرے۔ کتے کی دُم کو سیدھا کرنا چاہتی ہے۔ کہتی ہے مجھے شریفانہ طور طریقے اور اپنی کلاس سکھا کے

چھوڑے گی۔ میں بھی پھنس گیا ہوں ایسا کہ کسی بات سے انکار نہیں کرسکتا۔ اپنی قسم دے دیتی ہے فوراً۔ بعض اوقات بڑی جھنجلاہٹ ہوتی ہے یار۔ ایسے مت بولو۔ یہ مت کہو۔ ایسے الفاظ مت استعمال کرو۔ یہ مت کرو وہ مت کرو۔ کیا کہتے ہیں اسے۔ لائف اسٹائل۔ میرا لائف اسٹائل اونچا کرنا چاہتی ہے۔ ہائی سوسائٹی والا۔ SOPHISTICATED۔"

"ارے واہ۔ اتنا مشکل لفظ بول گیا تو۔"

وہ جھینپ کر ہنسا "ایک انگلش سکھانے والی استانی بھی آرہی ہے یار۔ کرسچین ہے۔ بالکل مرد ٹائپ۔ عورتوں والی کوئی بات ہی نہیں اس میں۔ خود بھی سپاٹ ہے اور بات بھی ایسے سپاٹ لہجے میں کرتی ہے کہ سالی ایک گھنٹے میں دماغ چاٹ جاتی ہے۔ صبح شام دو وقت آتی ہے۔"

میں نے قہقہہ مار کے کہا "اب پھنسا ہے تو صحیح جگہ بیٹے ٹیوشن پڑھ رہا ہے۔ شرافت سیکھ رہا ہے۔ ہم کہتے تھے تو اثر نہیں ہوتا تھا تجھ پر۔"

وہ بولا "یار اچھا ہے نا مجبوری میں ہی ہم انسان کے بچے بن جائیں۔ چندا بھی بار بار یہی کہتی تھی تجھ سے مگر تو نے اس کی نہیں سنی اور دیکھ آج تو سارے زمانے میں خوار ہو کے پھر واپس آیا ہے تو حالات کتنے بدل چکے ہیں۔ رشتے جو ٹوٹ گئے تھے پھر جوڑنا کتنا مشکل ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے اس کا اندازہ ہو رہا ہے۔"

"لیکن تو فکر مت کر پیارے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ جو بیچ میں شاہ عالم آگیا تھا۔ اس کو اپنی زندگی سے نکال دیں گے ہم۔ تو پھر اپنا وہی پرانا یار ناصر عظیم ہو گا۔ اپنا یتیم خانے کا بھائی۔ شاہ جی کے اڈے والا۔ شادو کو چاہنے والا۔ ہیر رانجھے کا لاڈلا۔"

میرے دل میں درد کی ایک کسک جاگ اٹھی "یار ان کا کیا حال ہے۔"

"ٹھیک ہیں۔ اچھے ہیں۔ میں گیا تھا کوئی دو مہینے پہلے۔ دونوں تجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ ماسی ہیر تو رونے لگی۔"

میں نے کہا "یار ایسا کرتے ہیں۔ آج اکٹھے چلتے ہیں ان کی طرف۔ ناصر عظیم نے اپنی زندگی کا آغاز وہیں سے کیا تھا۔"

"مگر تجھے بازار جانا تھا۔"

میں نے کہا "بازار جاؤں گا میں شام کو شبنم کے ساتھ۔ ابھی صرف بینک جانا ہے ذرا سی دیر کے لیے۔"

"جیسی تیری مرضی۔"

میں رئیس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ لاہور کی جانی پہچانی سڑکوں پر سے ایک بار پھر بے خوفی کے ساتھ گزرتے ہوئے میرے وجود میں مسرت کی ایک نئی سنسنی خیزی جاگ اٹھی۔ ان سڑکوں نے میرا ہر روپ دیکھا تھا۔ اس وقت جب ناصر عظیم چھوٹے چھوٹے یتیم بچوں کی کسی ٹولی میں شامل ہو کے در در چندے کے نام پر بھیک مانگنے جاتا تھا۔ اس وقت جب شادو کے عشق میں دیوانہ ہو کے اس نے فقیری کا کشکول اٹھا لیا تھا۔ اس وقت جب ناصر عظیم نے کامیابی کی زمین پر اپنے قدم مضبوطی سے جمائے تھے۔ اس وقت جب وہ ایک بزنس مین اور بلڈر کی حیثیت سے لاکھوں کما رہا تھا اور کروڑ پتی ہو گیا تھا اور اس وقت جب وہ شاہ عالم بنا تھا۔ اس شہر کے کوچہ و بازار نے ناصر عظیم کو بچپن سے جوانی تک ہر انداز میں زندگی گزارتے دیکھا تھا۔

اگرچہ اب میرے شاہ عالم سمجھے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہی تھا مگر میں ابھی کچھ دن محتاط رہنا چاہتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ میں خود کو ناصر عظیم کی حیثیت سے اپنے ماحول میں پوری طرح اڈجسٹ کرلوں۔ اس طرح کہ خدانخواستہ کوئی مجھے شاہ عالم سمجھنے کی غلطی کرے تو میں اسے قائل کرسکوں کہ میں ہمیشہ سے ناصر عظیم ہوں اور گزشتہ دو ماہ میں نہ میں لندن گیا اور نہ میرے ساتھ وہ سب ہوا جو شاہ عالم کے ساتھ ہوا۔ میں یہاں اپنی زندگی جی رہا تھا اور میرے روز و شب کی مصروفیات کے گواہ بہت ہیں۔

رئیس کے ساتھ میں پہلے ایک بینک میں گیا تو منیجر نے بڑے پرتپاک انداز میں میرا خیر مقدم کیا "آیئے۔ آیئے ناصر صاحب۔ بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی۔"

میں نے کہا "میں آیا تھا دو چار مرتبہ لیکن اتفاق ہے کہ جلدی میں تھا۔ آپ سے نہ مل سکا۔"

وہ بولا "کیا کر رہے ہیں آج کل آپ؟"

میں نے کہا "ایک تو کمال ہاسپٹل میں کچھ کام ہے۔ میں نے وہاں ایک لیبارٹری کا سامان دیا ہے اور کچھ میڈیکل ایکوپمنٹ۔ ڈاگنو اسٹک۔"

"DONATION" وہ بولا۔

"یہی سمجھ لیجیے۔ اس سلسلے میں کافی مصروف رہا۔ اس کے علاوہ میرا جو ایک پرانا خواب ہے۔ یتیم بچوں کے لیے ایک مثالی رہائش اور تعلیمی ادارہ بنانے کا۔ میں اسے یتیم خانہ کہنا نہیں چاہتا۔ وہی بنوا رہا ہوں۔"

"بہت نوبل کاز ہے۔" وہ بولا۔

اس نے میرے لیے چائے منگوائی اور میں نے اسے

ایک ایک لاکھ کے پانچ چیک دیے جن پر گزشتہ دو ماہ کی مختلف تاریخیں تھیں۔ ظاہر ہے اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور مجھے وہیں بیٹھے رقم مل گئی پھر میں رئیس کے ساتھ دوسرے بینک گیا اور وہاں بھی تقریباً ایسی ہی گفتگو ہوئی۔ میں نے وہاں سے بھی پانچ لاکھ نکالے۔ اگلے چند دنوں میں مجھے بہت سی ادائیگیاں کرنی تھیں۔ میں نے ایک بینک میں نیلم کا دیا ہوا چالیس لاکھ کا چیک بھی جمع کرایا اور دوسرے میں رئیس کا دیا ہوا۔ میں نے دونوں جگہ اپنے اکاؤنٹس کی پوزیشن بھی دیکھی پھر ہم رئیس اور نیلم کے بینک گئے جہاں رئیس نے دونوں فارن ایکسچینج کے بینک ڈرافٹ جمع کرائے۔ یہ سارے کام ایک گھنٹے میں ختم ہو گئے تو میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی گیارہ بجے تھے۔ شبنم کا دو بجے سے پہلے اٹھنا مشکل تھا۔ چنانچہ میرے پاس تین گھنٹے تھے۔

میں نے رئیس سے کہا "چل یار آج انہیں بھی اپنی صورت دکھا ہی دوں۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کو۔"

"وہ تو بہت خوش ہوں گے تجھے دیکھ کے۔ بے چارے بڑھاپا اکیلے گزار رہے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے تجھے دعائیں دیتے ہیں۔ بہت پوچھ رہے تھے تجھے۔ میں نے کہا کہ آج کل ولایت گیا ہوا ہے۔ رانجھا نے کہا کہ ہاں۔ اب وہ بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ ولایت چلا جاتا ہے جہاز میں بیٹھ کے۔ گاڑی میں بیٹھ کے ادھر آنے کے لیے اسے فرصت نہیں ملتی۔"

"خود انہوں نے کون سی کوشش کی مجھے تلاش کرنے کی یا مجھ سے ملنے کی۔ میں اتنا گمنام بھی نہیں تھا اور نیلم کو تو بہت اچھی طرح جانتے ہیں وہ۔ جب میں ان کے ساتھ رہتا تھا تو وہ کئی بار آئی تھی۔ ماسی ہیر نے تو بہت کہا تھا مجھ سے کہ میں شادو کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے نیلم سے شادی کرلوں۔ اسے نیلم بہت پسند تھی۔"

"یار ایک بات پوچھوں؟"

"مجھے معلوم ہے تو کیا پوچھے گا۔ یہی نا کہ آخر میں نے سب کی بات کیوں نہیں مانی تھی جبکہ میں خود بھی نیلم کو پسند کرتا تھا۔"

"وہ تجھ سے عمر میں بڑی تھی اس لیے۔"

میں نے کہا "نہیں یار عمر کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا۔ دیکھنے میں یہ فرق نظر بھی نہیں آتا۔ مجھے ایک بار خود نیلم نے بتایا تھا کہ وہ بتیس سال کی ہو گئی ہے ورنہ سب کی طرح میں بھی اسے چوبیس کی ہی سمجھتا تھا۔"

"ان ایکٹرسوں کی عمر کا بھی عجیب حساب ہے۔ عمر کے معاملے میں سب ڈنڈی مارتی ہیں۔ پندرہ بیس سال گزار دیتی ہیں بیس بائیس کی ہونے میں۔"

میں نے کہا "یہ ایک پیشہ ورانہ ضرورت کی بات ہے۔ لوگ ہیروئن کو اس سے زیادہ عمر کی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔"

"لوگوں کی بات رہنے دے یار۔ اس وقت کتنی ہیں جن کی عمر چالیس سے بھی اوپر ہو گئی ہے مگر وہ آرہی ہیں لڑکی بن کے۔ کالج کی اسٹوڈنٹ کا رول کرتی ہیں اور گاؤں کی الھڑ مٹیار بنی کھیتوں میں کودتی پھرتی ہیں۔"

"نیلم کا رشتہ میرے ساتھ ذرا مختلف ہے۔ تجھے یاد ہے پہلی بار وہ کیسے ملی تھی۔ میں اس کی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا اور وہ مجھے اسپتال لے گئی تھی۔ میں فلمیں نہیں دیکھتا تھا اس لیے نیلم کو پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ ٹاپ پر تھی۔ اس نے اپنا اخلاقی فرض پورا کردیا تھا۔ وہ چاہتی تو لوٹ کے نہ آتی مگر وہ اسپتال میں مجھے دیکھنے آتی رہی اور پھر وہاں بھی آئی جہاں میں رہتا تھا۔ دھرم پورہ کی ایک تنگ گلی کا چھوٹا سا مکان تھا جس میں ہم کرائے پر رہتے تھے۔ میں ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔ نیلم نے مجھے ایک لاکھ روپے بطور جرمانہ یا کفارہ ادا کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اس زمانے میں ایک لاکھ کا چیک قارون کے خزانے کی طرح تھا مگر میں نے وہ لینے سے انکار کردیا تھا اور میری یہی خودداری کی ادا اسے بھا گئی۔ اس کے بعد وہ برابر ملتی رہی۔ شادو کی موت کے بعد اس نے کتنا خیال رکھا تھا میرا۔ وہ نہ ہوتی تو شاید میں خودکشی کرلیتا یا پاگل ہو جاتا۔ اس نے ہمیشہ مجھے سنبھالا۔ مجھے مشکلات سے بچایا اور مجھے زندگی سے لڑنے کا حوصلہ دیا۔ اس کی شخصیت کا تصور میرے ذہن میں ایسا ہی ہے۔ اس عورت کا جو مشکل وقت میں سہارا دیتی ہے۔ آزمائش میں حوصلہ عطا کرتی ہے۔ دل جوئی کرتی ہے اور مسیحائی کرتی ہے۔ جیسے محبت کرنے والی ماں یا شفیق بڑی بہن یا خیال رکھنے والی بڑی بھابی۔ دیکھو اس نے سونی کو کیسے تحفظ فراہم کیا۔ آج وہ محفوظ ہے تو کس کی وجہ سے؟ صرف نیلم کی کوشش سے۔ نیلم ایسی ہی ہے۔ کہنے کو وہ ایک فلم ایکٹریس ہے۔ دنیا اسے ایک ایکٹریس کے سوا کچھ نہیں سمجھتی اور اس کے بارے میں پتا نہیں کیا کچھ کہتی رہتی ہے۔ اس نیلم کو ہمارے سوا کون جانتا ہے۔ اگر میں عام ہوس پیشہ مردوں کی طرح اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتا تو شاید آج وہ میرے نام سے بھی ناواقف ہوتی پھر ہمارا یہ رشتہ بھی نہ بنتا جو آج ہے۔ میں نے اسے عزت دی اور احترام دیا۔ میری نظر میں وہ اپنی عمر کی وجہ سے نہیں، اپنے کردار کی وجہ سے بڑی ہے۔ اسے میں نے کبھی ایک عورت سمجھ کے مرد کی نظر سے دیکھا ہی نہیں۔"

رئیس خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا "دیکھ نا یار۔ اس نے کیسے مجھے اس مقام تک پہنچا دیا۔ ایک بگڑے ہوئے لاوارث شخص کو فرش سے اٹھا کے عرش پر بٹھا دیا۔ مجھے بالکل بدل دیا۔ میرے حال پر اتنی توجہ اور مہربانی کی کہ میں خود بدل گیا۔ میری آج کی زندگی میرے گزرے ہوئے کل سے کتنی مختلف ہے۔ میرے انداز و اطوار میرا لب ولہجہ میری عادات اور میری شخصیت سب میں ایک ایسا انقلاب آیا ہے کہ میں خود اپنے آپ کو دیکھ کے حیران ہوتا ہوں۔"

"تو بڑا خوش قسمت ہے رئیس۔"

"ابے نہیں یار۔ ہم نے تو ہمیشہ خود کو انتہائی بدنصیب اور دنیا کی نظر سے گرا ہوا سمجھا تھا۔ کوئی اوقات ہی نہیں تھی اپنی مگر نیلم کی محبت دے کر تقدیر نے ساری زندگی کے نقصان کی تلافی کردی ہے۔"

میں نے کہا "ماسی ہیر سنے گی تو کتنا حیران ہوگی۔"

"ساری دنیا کی طرح وہ بھی مجھے نکما۔ جاہل اور بگڑا ہوا' بدحال اور بدکردار سمجھتی تھی اور ٹھیک ہی سمجھتی تھی۔ پیسہ تو بہت کمالیا میں نے ادھر ادھر کے دھندوں سے مگر شرافت اور عزت کی زندگی سے اپنا کوئی واسطہ نہ تھا۔ ایک تیرے سوا کسی شریف آدمی نے کبھی منہ نہیں لگایا تھا۔ پتا نہیں نیلم نے کیا دیکھ لیا مجھ میں۔"

"اس نے اپنے مستقبل کا تحفظ دیکھ لیا اور تیرے اندر کے آدمی کو پہچان لیا جو بہت بھروسے کے قابل ہے۔ دس سال سے جانتی تھی وہ ہم دونوں کو اور وہ کوئی بے وقوف جذباتی عورت بھی نہیں ہے۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کے اپنی زندگی کی باگ ڈور تیرے ہاتھ میں دی ہوگی۔ اگر کبھی تو نے اس کے اعتماد کو دھوکا دینے کی کوشش کی تو میں قتل کروں گا تجھے۔"

وہ ہنسنے لگا "تو جانتا ہے پیارے میں شادو کا دیوانہ تھا۔ کتنا چاہتا تھا اسے۔ اس کی خاطر جان بھی دے سکتا تھا اگر وہ کہتی یہ محض ڈائیلاگ نہیں۔ حقیقت ہے لیکن جب اس نے تجھے اور تو نے اسے پسند کرلیا تو میں نے اپنے پیار کی قربانی دی اور خود پیچھے ہٹ گیا۔ اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ تو نے حساب برابر کردیا۔ نیلم کے معاملے میں تو پیچھے ہٹ گیا۔"

"یار ایسی بات نہیں۔ وہ تجھ سے شادی نہ کرتی تو کسی اور سے کرتی یا نہیں نہ کرتی مگر ہمارے درمیان کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ بھی ایسا ہی سوچتی ہے۔"

رئیس نے گاڑی کا رخ ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے اس گھر کی طرف موڑ لیا تھا جو میں نے خریدا تھا اور ان کے نام کردیا تھا۔ اس گھر میں جو کچھ بھی تھا میں نے لیا تھا۔ ان کے پاس ایک گاڑی تھی۔ وہ بھی میں نے خریدی تھی لیکن یہ سب پیسے کا کھیل تھا۔ آج اتنے عرصے بعد ان کی طرف جاتے ہوئے مجھے اس خیال سے شرم آرہی تھی کہ دو سال سے میں نے ان کی کوئی خیر خبر نہیں لی تھی۔ انہیں میں اپنے ماں باپ کی جگہ سمجھتا تھا لیکن کاروبارِ حیات کی مصروفیات نے مجھے ایسا اسیر کیا تھا کہ میں یہ رشتہ بھی بھولا ہوا تھا۔

ان کی رہائش اوپر والی منزل پر تھی۔ نیچے ہیر کلینک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مریض اس وقت بھی آتے تھے جب وہ ڈاکٹر رانجھا نہیں صرف رانجھا شربت فروش تھا اور مختلف پھلوں سبزیوں اور جڑی بوٹیوں کے بیج اور مغزیات کو گھوٹ کے شربت میں شامل کرتا تھا اور بیماری کی نوعیت یا شدت کی مناسبت سے شربت کا فارمولا بدلتا رہتا تھا۔ آج وہ مستند ڈاکٹر اور حکیم بنا ہوا تھا۔ اس نے حکمت کے ساتھ ہومیو پیتھی کی چند کتابیں پڑھ لی تھیں اور ایلوپیتھی پر دوا ساز کمپنیوں کی شائع کردہ کتابوں سے دواؤں کے نام یاد کرلیے تھے۔ وہ ہر مریض کو اس کی خواہش اور پسند پوچھ کر دوا دیتا تھا۔ ہومیو پیتھی پر اعتقاد ظاہر کرنے والے کو فرانس اور جرمنی سے درآمد کردہ دوائیں تجویز کردیتا تھا اور اس کے پاس ایلوپیتھی کی دواؤں کا پورا اسٹور تھا جہاں وہ عام استعمال کے ولایتی شربت اور گولیاں رکھتا تھا۔ اب اس نے مرض کی تشخیص کے لیے کرائے جانے والے مختلف قسم کے ٹیسٹ کی رپورٹیں پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہر لیبارٹری کی رپورٹ کے چھپے ہوئے فارم پر پہلے ہی درج ہوتا تھا کہ نارمل رپورٹ کیا ہوتی ہے۔

آج ڈاکٹر رانجھا کا کلینک مریضوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی اور بچے بھی۔ رانجھا بلاشبہ عطائی تھا مگر اس کی پریکٹس بہت سے مستند ڈاکٹروں سے زیادہ چلتی تھی۔ وہ دواؤں کے مقابلے میں بہت محتاط تھا۔ نوے فیصد مریضوں کو عام امراض لاحق ہوتے تھے اور وہ اس کی دوا سے ٹھیک ہوجاتے تھے کیونکہ شفا دینے والا تو بہرحال خدا ہے۔ باقی دس فیصد پیچیدہ امراض والوں کو وہ کسی اسپیشلسٹ کے پاس بھیج دیتا تھا۔ دوسری احتیاط وہ انجکشن کے معاملے میں کرتا تھا اور عام طاقت کے یعنی ملٹی وٹامن والے بی کمپلیکس کے سوا کوئی انجکشن نہیں لگاتا تھا جس سے کسی مریض کو ری ایکشن ہونے کا امکان ہو۔

تمام مریض اپنے اپنے نمبر کے مطابق ڈاکٹر کے پاس

جانے کے پابند تھے۔ چنانچہ میں سیدھا اندر گیا تو کچھ لوگوں نے دبے دبے الفاظ میں احتجاج کیا مگر پھر یہ سمجھ کے خاموش ہوگئے کہ شاید میں مریض نہیں تھا۔ کوئی ڈاکٹر تھا میڈیکل ریپ یا ڈاکٹر رانجھا کا کوئی جاننے والا۔

ڈاکٹر رانجھا اس وقت بھی کانوں سے آلہ لگائے کسی مریض کے سینے کے اندر کی آوازیں سن رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "او میاں جی ذرا صبر کرو۔ دیکھتے نہیں میں ایک مریض کا معائنہ کررہا ہوں۔"

میں نے بدتمیزی سے کہا "میں تمہارا معائنہ کرنے آیا ہوں۔"

اس جواب پر رانجھا کا چونکنا لازمی تھا۔ شاید وہ سمجھا ہوگا کہ محکمۂ صحت کے کوئی اہلکار اس کے میڈیکل پریکٹس کے لائسنس یا اس کی ڈگری چیک کرنے آگیا۔ اس نے ناک پر چشمہ جما کے میری طرف دیکھا اور چند سیکنڈ دیکھتا رہا۔

پھر وہ چلایا "اوئے۔ اوئے تو ناصر ہے؟!" اس نے چلا کے کہا اور اسٹیتھو سکوپ چھوڑ کے اٹھا۔ میز کے گرد گھوم کے وہ بے تابانہ میری طرف آیا اور اس نے مجھے گلے لگالیا۔

اس کی حالت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی تھی۔ شاید دو سال میں اس کے سر پر چند بال اور کم ہوگئے ہوں۔ اس کے چہرے پر عمر کی لکیریں کچھ اور گہری ہوگئی ہوں مگر مجھے اس میں کچھ بھی بدلا ہوا نہیں لگا۔ وہ جسمانی طور پر بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ اس نے عادت کے مطابق نہایت بے تکا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی قمیص ہرے رنگ کی اور ریشمی تھی۔ پتلون نیلے رنگ کی اور اس نے زرد رنگ کی چوڑی ٹائی لگا رکھی تھی۔ اس کے جسم سے آج بھی خس کے عطر کی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی کیونکہ اس نے عطر میں ڈوبا ہوا روئی کا پھایا اپنے کان میں لگا رکھا تھا۔

"اوئے ناصر۔ یہ تو ہے پتر۔ سبحان اللہ بھئی سبحان اللہ۔ خیر سے آج کدھر چن چڑھ گیا۔" اس نے والہانہ انداز میں مجھے کئی بار دبایا اور چوما اور اس دوران زیرِ معائنہ مریض دم بخود بیٹھا رہا۔

میں نے کہا "کیسے ہو تم۔"

"او یار ہمیں کیا ہونا تھا بھئی۔ دیکھ لے تیرے سامنے ہیں مگر تو بہت بدل گیا ہے۔"

میں نے کہا "ماسی ہیر کیسی ہے۔"

"اوئے مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ جا کے دیکھ خود۔" اس نے مجھے پیار سے ڈانٹا "اوپر چل کے بیٹھ۔ میں آتا ہوں ابھی تھوڑی دیر میں۔ میرا کلینک ایک بجے بند ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "آج میں اتنی دیر نہیں رک سکتا۔"

اس نے محبت سے میری کمر پر ایک مکا مارا "چل بکواس نہ کر۔ اتنے دن بعد آیا ہے تو کیا کھڑے کھڑے چلا جائے گا اور وہ جانے کب دے گی تیری ماسی۔ ابھی اوپر جا کے یہ بات کہنا ذرا پھر تیری خوب خاطر کرے گی وہ اور تو اکیلا آیا ہے یا وہ بھی ہے تیرے ساتھ۔ تیری وہٹی۔!"

میں نے ہنس کے کہا "کون وہٹی۔ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔"

"اچھا ایسے ہی پھر رہا ہے خیر سے۔ چل چنگا ہے آزادی کے مزے لوٹ لے جب تک ٹائم ہے۔"

میں نے کہا "رئیس آیا ہے میرے ساتھ۔"

"اچھا؟ وہ تیرا یار۔ کہاں ہے۔"

میں نے رئیس کو بھی اندر بلالیا۔ ڈاکٹر رانجھا نے اسے بھی گلے لگالیا "یہ تو آجاتا ہے یار چھ مہینے بعد چکر لگانے۔"

رئیس بولا "دیکھو آج تمہارے حرامی پتر کو بھی لے آیا۔"

رانجھا ہنسا "تو خود کون سا حلالی ہے۔ چلو اوپر جاؤ۔ آرام سے بیٹھو میں آتا ہوں۔ پھر کھانا اکٹھے کھائیں گے۔ خبردار جو جانے کی بات کی۔"

میں نے رئیس کو آگے بھیجا اور خود پیچھے کھڑا رہا۔ حسبِ توقع ماسی ہیر نے رئیس کا استقبال اپنی پیار بھری گالیوں سے کیا "رئیس؟ آگیا تو خبیث۔ خیال آگیا تجھے میرا کمینے۔ کہاں غائب رہتا ہے مینوں۔"

رئیس ہنسنے لگا "لو ماسی۔ ابھی دو مہینے پہلے ہی تو آیا تھا۔"

ماسی نے اس کے ایک دو ہتڑ مارا "دو مہینے کی بات ایسے کرتا ہے ذلیل جیسے دو دن پہلے آیا تھا۔"

رئیس بولا "اسے کچھ نہیں کہتی ہو جو سالوں نہیں آتا۔ تمہارا ناصر۔"

وہ اداس ہوگئی "اسے میں کیا کہوں۔ اللہ اسے خوش رکھے وہ جہاں بھی ہے۔ ہم تو دعا کرتے رہتے ہیں خدا سے۔ وہ بھول گیا ہے ہمیں تو اس کا گلہ بھی اپنی تقدیر سے کرتے ہیں۔"

"ماسی۔ اگر وہ آجائے تو اسے جوتے مارو گی؟ وعدہ کرو تو میں اسے لے آؤں۔ اسی جوتی سے اس کا سر گنجا کردینا۔"

ماسی نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تیرے بس میں ہوتا تو پہلے نہ لے آتا۔ وہ اب نہیں آئے گا رئیس۔ ہم سمجھتے تھے اللہ نے اس عمر میں اولاد دے دی۔ بڑی غلط فہمی تھی

ہماری۔"

رئیس نے پھر کہا "نہیں تم بتاؤ۔ کتنے جوتے مارو گی؟"

اس وقت میں اچانک پیچھے سے نکل آیا اور ماسی کے سامنے جھک گیا "میں آگیا ہوں ماسی۔ مارو مجھے کتنے جوتے مارنے ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے ماسی کو حیرت کے صدمے نے منجمد کردیا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی مجھے دیکھتی رہی پھر ایک چیخ مار کے مجھ سے لپٹ گئی "ناصر۔ تو ناصری ہے نا یا میرا خیال ہے مجھے دھوکا دے رہا ہے۔"

میں نے اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روکا "میں ناصری ہوں ماسی۔"

وہ میرا سر اپنے سینے سے لگا کے زار و قطار رونے لگی "کہاں چلا گیا تھا تو بے شرم' بے حیا۔ کہاں مر گیا تھا۔ تجھے ہمارا خیال بھی نہیں آیا۔ ایک بار بھی نہیں سوچا کہ ماسی ہیر کا کیا حال ہوگا۔ تو بھول گیا تھا ہمیں۔ اپنے ماں باپ کو بھول گیا تھا کمینے۔ خون سفید ہوگیا تھا تیرا۔ بے غیرت۔ بے ایمان۔"

ماسی مجھے اپنی پیار بھری گالیوں سے نوازتی رہی اور روتی رہی۔ میں نے اسے بہت دلا سا دیا بہت تسلی دی۔ اس سے بار بار معافی مانگی اور بالآخر ماسی کی بے قرار روح کو قرار آگیا۔ اس نے مجھے آنگن میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر بٹھا دیا اور خود میرے سامنے ایک پیڑھی پر بیٹھ کے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اب اس کے چہرے پر خوشی کے جذبات کا رنگ نمایاں ہوتا جارہا تھا۔

میں نے کہا "ماسی میں یہاں نہیں تھا۔"

"چل جھوٹ مت بول میرے سامنے۔ رئیس بتاتا رہتا تھا مجھے تیرے بارے میں سب۔" اس نے پاؤں کی جوتی اتار کے مجھے دکھائی۔

میں نے کہا "تمہارے سر کی قسم۔ میں باہر گیا ہوا تھا۔"

"باہر تو ابھی گیا تھا دو مہینے پہلے۔ اس سے پہلے تو کیا کررہا تھا۔ سب معلوم ہے مجھے۔"

میں نے رئیس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے نفی میں سر ہلا کے واضح کیا کہ ماسی کو حقیقت حال کا کوئی علم نہیں۔ یعنی اسے نہیں معلوم کہ اس کا بیٹا ناصر کتنا عرصہ شاہ عالم بن کے زندگی گزارنے پر مجبور ہوا تھا اور سب سے دور ہوگیا تھا۔

میں نے کہا "اب یہاں باقاعدگی سے آؤں گا ماسی۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے۔ مجھے پتا ہے تو نہیں آئے گا۔ تو اب بڑا آدمی ہوگیا ہے۔ بہت مصروف رہتا ہے۔ تجھے کہاں یاد آئے گی اپنی ماسی ہیر کی۔ رانجھے سے ملا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ پہلے اسی کو سلام کرنے گیا تھا۔"

ماسی بار بار رونے لگتی تھی اور پرانے وقتوں کو یاد کرتی تھی جب ہم سب اکٹھے رہتے تھے۔ اچانک اس نے پوچھ لیا۔

"ناصر وہ کہاں ہے؟ نیلم۔"

میں نے کہا "اسی شہر میں ہے اور کہاں۔"

"اسے دیکھنے کو بہت دل کرتا ہے۔"

رئیس بولا "اسے دیکھنا کیا مشکل ہے ماسی۔ کسی سنیما پر جاکے ٹکٹ لو اور فلم میں دیکھ لو۔"

ماسی نے پھر جوتی اتار لی "تا اب اس عمر میں فلم دیکھنے جاؤں گی میں۔"

میں نے کہا "وہ خود آئے گی ماسی۔ ورنہ میں آپ کو اس کے پاس لے چلوں گا۔ میں اب اسی کے گھر میں ہوں۔"

ماسی نے خوشی سے کہا "شادی کرلی ہے تم دونوں نے۔ بڑا اچھا کیا۔"

میں نے کہا "میں نے اس سے شادی نہیں کی ماسی۔"

اس نے ملامت بھری نظروں سے دیکھا "کیوں نہیں کی؟"

"اس کی شادی رئیس سے ہورہی ہے۔"

ماسی نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے فارسی بولی ہو "کیا کہہ رہا ہے تو؟"

میں نے کہا "رئیس سے پوچھ لو اور چاہو تو میرے ساتھ چل کے خود نیلم سے پوچھو۔"

ماسی کچھ چپ ہوگئی "لیکن۔ وہ تو۔ تیرے ساتھ۔"

میں نے کہا "نہیں ماسی۔ وہ بڑی بہن کی طرح میرا خیال رکھتی تھی۔ رئیس اور نیلم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ چند دن میں ان کی شادی ہونے والی ہے ہم آپ کو بھی لے چلیں گے۔"

گزرے ہوئے وقت کے سارے حالات کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے بھی ہمیں ایک گھنٹا لگ گیا۔ ماسی نے دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع کردی تھی اور ہمیں کچن میں اپنے پاس ہی دری بچھا کے بٹھالیا تھا۔ اس کی خواہش تو یہی تھی کہ نیلم سے میں شادی کرتا مگر رئیس کے انتخاب کو بھی ماسی نے نیلم کا بڑا دانش مندانہ فیصلہ قرار دیا "بھئی جیسا ناصر ویسا رئیس۔ یہ ذرا لوفر ہے مگر اب کام کاج کرنے لگا ہے تو ٹھیک ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "شوہر کتے کی دم ہو پھر بھی بیوی سیدھا کرلیتی ہے۔"

"وہ بڑی سیانی لڑکی ہے۔ اس کی قدر کرنا۔ تیرے بھاگ ہیں کہ وہ تیرے جیسے نکمے اور ہڈ حرام سے شادی کررہی ہے۔ پرانے کرتوت اب چھوڑ دے اور شرافت کی زندگی گزارنے کا عہد کرلے۔"

رئیس نے خفگی سے کہا "ماسی میں اب وہ پرانا والا رئیس نہیں ہوں۔"

ماسی نے کہا "مرغے لڑاتا ہے اب بھی؟"

"کہاں ماسی۔ وہ سب خواب و خیال کی باتیں ہوگئی ہیں۔ اب تو میں بہت شریف اور روزے دار بن گیا ہوں۔"

میں نے کہا "نیلم نے بنادیا ہے ماسی۔"

ماسی نے کہا "مجھے ایک بات بتا۔ کیا شادی کے بعد بھی وہ اسی طرح فلموں میں ناچے گی دوسروں کے ساتھ۔ تیری بیوی بننے کے بعد بھی کام کرے گی۔"

میں نے کہا "ماسی اس نے شادی کے فیصلے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب وہ فلموں میں کام نہیں کرے گی۔"

ماسی خوش ہوگئی "اللہ خوش رکھے تم دونوں کو۔ وہ بڑی نیک لڑکی ہے۔ بھونکتے ہیں کتے جو اس کے بارے میں الٹی سیدھی بات کرتے ہیں۔"

ماسی نے میری آمد کی خوشی میں کھانے کے ساتھ گڑ کے میٹھے چاول بھی پکائے تھے جو میں بہت شوق سے کھاتا تھا۔ ایک بجے رانجھا کلینک بند کرکے آگیا اور بولا "ہاں بھئی ناصر اب سنا کیسی گزر رہی ہے؟"

میں نے کہا "بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

ماسی نے کہا "رانجھے تو نے کچھ سنا۔ وہ نیلم تھی نا۔"

"تھی کا کیا مطلب ہے۔ ہے فلموں میں۔" رانجھا نے کہا۔

وہ بولی "وہ شادی کررہی ہے رئیس سے۔"

رانجھے نے صرف شادی کی بات سنی اور مجھے مبارک باد دینے لگا "او بھئی واہ تے واہ... رب نے ملائی جوڑی اور خوب ملائی۔"

میں نے اس کا رخ رئیس کی طرف کردیا "اسے مبارک باد دو۔ شادی اس کی ہورہی ہے نیلم سے۔ میری نہیں۔"

رانجھے کا منہ فرطِ حیرت سے کھلا رہ گیا "رئیس سے؟"

ایک بار پھر مجھے یہ بتانا پڑا کہ میری شادی نیلم سے کیوں نہیں ہوسکتی تھی اور رئیس کی کیوں ہورہی ہے۔ باتیں برسوں کی تھیں اور ہمارے پاس وقت کم تھا پھر مجھے شبنم کا بھی خیال تھا کہ وہ میرا انتظار کررہی ہوگی۔ ادھر ہیر رانجھا دونوں رئیس اور نیلم کی شادی کی خبر سن کے بہت جوش میں تھے اور اس شادی کی تفصیلات جاننا چاہتے تھے تاکہ وہ اس میں بھرپور طریقے سے شرکت کرسکیں۔

دو بجے میں نے شبنم کو فون کیا تو مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ وہ ابھی سو رہی ہے۔ میں نے بانو خالہ سے کہا کہ جب وہ جاگے تو اسے پیغام دے دیں کہ میں چار بجے تک گھر آؤں گا۔ رئیس نے نیلم سے بات کی اور اسے بتایا کہ ہم کہاں ہیں پھر نیلم نے ماسی ہیر سے بات کی اور ماسی ہیر نے اسے جو دودھوں نہانے پوتوں پھلنے کی دعائیں دینا شروع کیں تو نیلم کو جان چھڑانا مشکل ہوگیا۔ دس پندرہ منٹ بعد جب نیلم نے وعدہ کرلیا کہ وہ بھی آج ہی حاضری دے گی تو ماسی نے اسے معاف کیا۔

میں اور رئیس بہت جلد پھر آنے کا اور باقاعدگی سے آتے رہنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوئے۔ ماسی دروازے پر کھڑی ہو کے پھر رونے لگی "ایسا نہ ہو کہ اب جاؤ تو پھر سالوں نہ آؤ۔"

میں نے کہا "ماسی۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔"

"کھا میرے سر کی قسم۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا۔

"تمہارے سر کی قسم ماسی۔ میں آؤں گا۔ تمہیں شادی کے لیے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

وہ رئیس سے مخاطب ہوگئی "تو بھی سن لے۔ اگر اکیلے اکیلے شادی کی نا تو ساری عمر تیری شکل نہیں دیکھوں گی۔ زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔"

رئیس نے بھی اس کے سر کی قسم کھائی "آج رات وہ خود آئے گی تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے۔ میں بھی آؤں گا۔"

"اور تو ناصر۔" ماسی نے کہا "تو بھی ساتھ آئے گا؟"

"نہیں ماسی۔" میں نے کہا "میں آج نہیں آسکتا۔ مجھے کام ہے کچھ۔ چند دن تو میں بہت مصروف رہوں گا۔"

رانجھا نیچے تک میرے ساتھ آیا "تیری گڈی تو بہت شاندار ہے بھئی۔"

میں نے کہا "یہ نیلم کی گاڑی ہے۔ اچھا خدا حافظ!"

"خدا حافظ۔" وہ بولا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

آج میرے دل پر سے احساسِ جرم و ندامت کا ایک بوجھ ہٹ گیا تھا اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے اپنے ماضی کے جزیرے کا ایک اور ٹوٹا ہوا پل جوڑ دیا ہے۔

رئیس کو اسٹوڈیو جانا تھا۔ نیلم کی ڈائری اس کے پاس

تھی اور نیلم کو اپنی ڈیش کا کوئی مسئلہ درپیش تھا۔ میں نے اسے اسٹوڈیو کے اندر ریسٹ پر لے جاکے چھوڑا اور واپس ہوگیا۔ ساڑھے تین بجے میں نیلم کے گھر پہنچا تو شبنم سج سجائے بیٹھی تھی اور ایک رسالے کی ورق گردانی کررہی تھی۔

"یہ تمہارا ایک بجا ہے؟"

میں نے کہا "دو بجے فون کیا تھا میں نے تو تم سورہی تھیں۔"

"تم جگا سکتے تھے۔ مجھے خود آکے۔"

میں نے کہا "کوئی بات نہیں اگر دیر ہوگئی۔ یہ بتاؤ تم نے کھانا کھایا؟"

"اور کیا بھوکی بیٹھی رہتی۔" اس نے رسالہ پھینک دیا۔

میں نے کہا "میں نے بھی کھالیا۔ ہم آج ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کی طرف چلے گئے تھے۔ آر یو ریڈی؟"

"میں کب سے تیار بیٹھی ہوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پہلے تو تم مجھے کچھ کپڑے جوتے دلوا دو۔" میں نے کہا "اپنی پسند سے۔"

اس کا موڈ کچھ ٹھیک ہوا اور وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ اگلے پورے دو گھنٹے ہم نے مال کی مختلف دکانوں سے شاپنگ میں گزار دیے۔ شبنم نے میرے لیے کوئی ایک درجن شرٹس اور اتنی ہی پتلونیں خریدیں پھر میں نے چار سوٹ خریدے اور درجن بھر ٹائیاں لیں۔ شبنم خوش ہوگئی کہ میں نے ہر چیز اس کی پسند کے مطابق لی تھی لیکن لباس کے معاملے میں اس کی چوائس پر بھروسا کیا جاسکتا تھا۔

شام کے چھ بجے ہم نے شیزان میں چائے پی۔ مجھے ہر لحظہ یہ ڈر تھا کہ کہیں کوئی شبنم کا جاننے والا نہ مل جائے مجھے اس کے ساتھ دیکھنے والے کا ذہن خود بخود شاہ عالم کی طرف جاسکتا تھا اور میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے صورت حال کی کوئی ناقابلِ فہم وضاحت پیش کرنی پڑے کہ میں شاہ عالم نہیں اس کا ہم صورت ناصر عظیم ہوں۔ کسی کا ذہن بھی اس اتفاق کو تسلیم نہیں کرسکتا تھا کہ شبنم کا ایک شناسا شاہ عالم ہے تو دوسرا اس کی کاربن کاپی ناصر عظیم۔

میں نے اس اندیشے کا اظہار کیا تو شبنم ہنسنے لگی "یہ رسک تو ہمیشہ رہے گا۔"

میں نے کہا "ہم اسے نظرانداز نہیں کرسکتے شبنم۔ میرے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ میں ناصر عظیم کی بالکل جداگانہ شناخت بناکے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر شاہ عالم کے کسی دشمن کو یہ شک بھی ہوگیا کہ ناصر عظیم ہی اس کا ڈپلی کیٹ بنا ہوا تھا تو میرے لیے سنگین مسائل پیدا ہوجائیں گے۔"

"کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں ملنا ہی نہیں چاہیے۔"

میں نے کہا "زندگی آزمائشوں کا نام ہے۔ ہم بھی سال چھ مہینے نہ ملیں تو مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا مگر مجبوری میں حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے مگر سال چھ مہینے بعد بھی یہی حالات ہوں گے۔ شبنم کے لیے ناصر عظیم آج اجنبی ہے تو اس وقت بھی ہوگا۔"

میں نے کہا "پہلے لوگ شاہ عالم کو بھول جائیں پھر ہم ان کے درمیان شناسائی کی کوئی صورت نکال لیں گے۔"

"کیا صورت نکال لیں گے۔"

میں نے سوچ کے کہا "ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ میں تمہارا اخبار خرید لوں۔ شبنم کا ایک بزنس مین اور ہمدرد جو ایک مثالی یتیم خانہ چلا رہا ہے اور کمال اسپتال کو کروڑوں کی ڈونیشن دے چکا ہے۔ کوئی اخبار کیوں نہیں خرید سکتا جس کے مالی اور انتظامی حالات اچھے نہیں اور اسے بطریق احسن چلانے کے لیے تم جیسی باصلاحیت ایڈیٹر کو ساتھ کیوں نہیں رکھ سکتا۔ ہم ایک ٹیم بن جائیں گے۔"

"اتفاق تو یہ تب بھی لگے گا۔"

میں نے کہا "ہاں مگر ایک فطری اتفاق۔"

"سب سے بڑی بات یہ ہے جناب کہ ایسا فرض کرنا ہی بالکل غلط ہے۔ آزاد صاحب کے لیے یہ اخبار ان کی اولاد کے جیسا ہے۔ کئی لوگ اسے خریدنے کی کوشش کرچکے ہیں۔ سب کو ایک ہی جواب ملتا ہے کہ اولاد برائے فروخت نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "چلو ہم کچھ اور فرض کرلیتے ہیں۔ شہر کا ایک متمول شخص اخبار نکالنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے تجربہ کار لوگ وہ ادھر ادھر سے کھینچے گا۔ وہ شبنم کو چیف ایڈیٹر بنادیتا ہے دگنی تنخواہ پر۔ نہیں۔ ایڈیٹر۔ چیف ایڈیٹر تو پھر وہ خود ہوگا۔"

شبنم ہنسی "یہ مزید ناممکن ہے کہ میں تمہاری ماتحت اور ملازم بن کے رہوں۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم کے جو آئندہ کے منصوبے ہیں اور وہ خیالی پلاؤ پکانے کے منصوبے نہیں ہیں۔ تم ان میں پارٹنر بن سکتی ہو۔ اسے مفروضہ مت سمجھو۔ میں تمہیں سنجیدگی سے ایک آفر دے رہا ہوں۔ سوری۔ آفر کا لفظ میں غلط بول گیا۔ تمہیں انوائٹ کررہا ہوں کہ میرے لیے یہ ذمے داری تم سنبھال لو۔"

"تم سیریس ہو۔"

میں نے کہا "میں اس سے زیادہ سیریس ہوں جتنا مجھے ہونا چاہیے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آزاد صاحب کے اس اخبار میں تم اپنی صلاحیتوں کو ضائع کررہی ہو۔ بے شک ذاتی کارکردگی کی بنا پر تم نے صحافت کی دنیا میں اپنی نمایاں پہچان بنالی ہے مگر اس اخبار میں کیا ہے تمہارا مستقبل۔ تم اس سے کہیں زیادہ اور بڑے چیلنج قبول کرکے اپنے POTENTIAL کا بھرپور استعمال کرسکتی ہو اور بہت بڑی کامیابیاں حاصل کرسکتی ہو۔"

"شاید تمہاری بات غلط نہ ہو۔" وہ بولی "لیکن میری اصل وابستگی جذباتی ہے اور آزاد صاحب کے ساتھ ہے۔ اخبار کسی اور کا ہوتا تو میں تمہاری پیشکش بالکل غیر مشروط طور پر قبول کرسکتی تھی مگر میں آزاد صاحب کو نہیں چھوڑ سکتی۔"

"آئی ایم سوری۔ یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

وہ کچھ سنجیدہ ہوگئی "بے شک آزاد صاحب کے اخبار کو مسائل درپیش ہیں لیکن میں کوشش کررہی ہوں کہ آزاد صاحب کو قائل کرلوں۔ وہ اخبار کو حالات کے نئے تقاضوں کے مطابق بنائیں۔ اس میں نیا خون انجیکٹ کریں۔ بہتر مالی وسائل کے ساتھ اخبار کا نیا سیٹ اپ ہو۔ سازو سامان نیا ہو۔ نئے لوگ رکھے جائیں اور اس کی پالیسی کو کاروباری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ مشکل یہ ہے کہ آزاد صاحب نے اپنی عمر اس اخبار کو دی ہے اب اس عمر میں وہ اپنی سوچ نہیں بدل سکتے ہیں۔ چنانچہ اخبار بھی پرانی ڈگر پر چل رہا ہے اور آہستہ آہستہ تنزلی اور DECAY کے عمل میں ختم ہورہا ہے مگر آزاد صاحب اسے اپنے شوق کے لیے چلا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے مرنے کے بعد تم چاہو تو اسے کاروبار بنالینا۔ اب انہیں کون سمجھائے۔ میں بھی گزارا کررہی ہوں بس۔ ان کی اپنی حالت تم جانتے ہو۔ وہ زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں۔"

میں نے کہا "تمہیں اب اپنے آفس جانا ہے۔"

اس نے اپنی کلائی کی نازک سی سنہری گھڑی میں وقت دیکھا "چلو پہلے تمہیں تمہارے آفس دکھادوں۔"

شبنم نے میرے لیے دو آفس لیے تھے۔ ایک میرا کاروباری آفس تھا جو کوئنز روڈ پر پلازا سینما سے کچھ آگے ایک کمرشل بلڈنگ کے آدھے فلور پر پھیلا ہوا تھا۔ اس فلور کا رقبہ دس ہزار فٹ کے قریب تھا۔ چنانچہ میرا آفس پانچ ہزار مربع فٹ پر تھا۔ اس کا رخ مین روڈ کی طرف تھا۔ سیکنڈ فلور تک آنے جانے کے لیے ایک ہی زینہ استعمال ہوتا تھا اور ایک ہی لفٹ کو اس فلور کے دونوں پارٹنر استعمال کرنے پر مجبور تھے۔ جہاں زینہ ختم ہوتا تھا وہاں تقریباً پانچ سو اسکوائر فٹ کا لاؤنج تھا جس میں لفٹ کا دروازہ کھلتا تھا۔ میرا آفس لاؤنج میں دائیں جانب تھا۔ بائیں طرف ایک گارمنٹس فیکٹری تھی جہاں چھوٹے بچوں کے کپڑے تیار ہوتے تھے۔ دونوں آفس بالکل الگ تھے اور ہمارے کام کی نوعیت بھی بالکل الگ تھی۔

شبنم نے ایک دروازہ کھولا اور مجھے سڑک کی طرف لمبائی کے رخ پر پھیلی ہوئی چھ فٹ بڑی بالکونی میں لے گئی "ادھر آپ اپنے سائن بورڈ لگا سکتے ہیں۔ اس کے لیے سڑک کی جانب بالکونی کی پوری دیوار ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ تم نے تو

واقعی کمال کی جگہ انتخاب کی ہے۔"

"مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تمہارے کاروباری ادارے اور کنسٹرکشن کمپنی کا نام کیا ہے تو میں بورڈ بھی لکھوا دیتی۔" وہ خوش ہوئی۔

میں نے کہا "نام سوچ لیں گے کوئی اچھا سا۔ فی الحال میں اس آفس کا نصف حصہ استعمال کروں گا۔ یعنی ایک ہال اور ایک چھوٹا کمرا' ہال میں اسٹاف بیٹھے گا۔ کمرے میں اپنے لیے ڈیکوریٹ کراؤں گا۔ پہلے تعمیراتی کمپنی کا کام شروع ہوگا۔"

"تم نے اس کا کرایہ تو پوچھا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "کرایہ جو بھی ہو مجھے منظور ہے کیونکہ ایسی جگہ شاید پھر ڈھونڈنے سے نہ ملے۔" پھر میں نے پوچھا۔ ...."تم نے اب تک کہاں کہاں ادائیگی کی ہے اور کتنی؟"

"یہ سارا حساب فرید عباسی کے پاس ہوگا۔ اسی نے کرائے نامے وغیرہ بنوائے تھے اور سائن کیے تھے۔ رسیدیں بھی اس کے پاس ہیں۔"

میں نے کہا "اب اس جگہ کو فرنش کرنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم کسی انٹیریر ڈیکوریٹر کی خدمات حاصل کرلو۔ میں تمہیں بتادوں گا۔ تم اسے گائیڈ کردینا۔ میرا خیال ہے کہ پندرہ دن میں کام ختم ہوجانا چاہیے۔"

"بالکل ہوجائے گا۔ اب تم دوسرا آفس بھی دیکھ لو۔ وہ تمہارا پرائیویٹ آفس ہے۔ بزنس آفس سے بالکل الگ ہے اور گزری شاہو میں ہے۔"

اپنا پرائیویٹ آفس مجھے زیادہ پسند آیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے شبنم نے پوری طرح ڈیکوریٹ اور فرنش کرویا تھا۔ آفس میں ایک با بروالا کمرا تھا جو کسی گھر کی اسٹڈی جیسا لگتا تھا۔ اس میں ایک بہت خوب صورت آفس ٹیبل تھی جس کی شکل کچھ گردے جیسی تھی۔ اندرونی حصے میں میرے لیے ایک گدے دار ریوالونگ چیئر لگائی گئی تھی اور باہر کی طرف ایک نیم دائرے میں مہمانوں کے لیے چار کرسیاں تھیں۔ مخالف سمت کے ایک کونے میں ایک مختصر سا مگر آرام دہ اور نئے فیشن کا صوفہ سیٹ تھا جس کے ساتھ ایک نازک سی گلاس ٹاپ سینٹر ٹیبل تھی۔ صوفہ سیٹ ایک گول قالین پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ٹی وی تھا اور ٹرالی کے نچلے حصے میں ڈش ریسیور اور وی سی آر نظر آرہے تھے۔ آفس ٹیبل پر ٹیلی فون۔ فیکس مشین اور آفس کے دیگر لوازمات نے کمرے کی آرائش کو مکمل کردیا تھا۔ دیواروں کو خوب صورت فریم والی تصویروں سے سجایا گیا تھا اور کمرے میں ہر جگہ بے حد نفیس اور حسین ڈیکوریشن پیس نظر آرہے تھے۔ اس کمرے کی سجاوٹ میں خوش ذوقی کا بہترین مظاہرہ نظر آتا تھا ہر چیز جدید اور قیمتی لگتی تھی اور مجموعی تاثر میں تکمیل کا احساس ہوتا تھا۔

میرا انہماک اور چہرے کے تاثرات دیکھ کے شبنم خوش ہوئی "کیسا لگا اپنا پرائیویٹ آفس؟"

میں نے کہا "اس کی میں جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔"

"میں تمہارے ٹیسٹ کو سمجھتی ہوں۔" اس نے دعوے سے کہا۔

میں نے کہا "اس میں کیا شک ہے۔ اگر میں خود بھی یہ آفس سجاتا تو اس سے بہتر اسباب نہیں لا سکتا تھا۔"

"یہ سب تمہیں پسند نہ آتا تو مجھے بڑی مایوسی ہوتی۔"

میں نے کہا "یہ تو اتنا خوب صورت آفس ہے کہ میرا جی چاہتا ہے اپنا سامان لے کر یہاں آجاؤں۔ یہاں تو میں رہ بھی سکتا ہوں۔"

"ہاں۔ تم یہاں رک سکتے ہو۔ اپنے مہمانوں کو کھانے پر مدعو کرسکتے ہو اور پرائیویٹ میٹنگ کرسکتے ہو۔" شبنم نے کہا۔

شبنم کی بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ پرائیویٹ آفس کا تصور اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ شاید شاہ عالم نے اپنی ذاتی مصروفیات کو دنیا سے پوشیدہ رکھنے کے لیے اپنے سیاسی دفاتر اور کاروباری آفس سے الگ کوئی عشرت گاہ بنا رکھی ہوگی۔ جہاں وہ دنیا کی نظر سے چھپ کے اپنی عیاش فطرت کے تقاضوں کی تسکین کے اسباب تلاش کرتا ہوگا۔ میں شاہ عالم نہیں تھا چنانچہ مجھے یہ آئیڈیا قدرے انوکھا اور غیر معمولی نظر آرہا تھا لیکن اچھا بھی لگا تھا۔

سات بجے کے قریب میں نے شبنم کو اس کے آفس ڈراپ کرنے کی پیشکش کی تو اسے اپنی گاڑی یاد آئی جو نیلم کے گھر میں کھڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ میں اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ شبنم کے جانے کے بعد میں نے غسل کرکے لباس تبدیل کیا اور آئینے میں پھر اپنی نئی شخصیت کو دیکھ کے مطمئن ہوا۔ اب یہ ضروری تھا کہ میں جلد از جلد اپنی نئی زندگی کی مصروفیات اختیار کرلوں اور شاہ عالم کی زندگی کے معمولات سے دور ہوجاؤں۔ اس کے لیے سب سے اہم یہ حقیقت تھی کہ میرا شبنم سے کوئی تعلق ان لوگوں کے سامنے نہ آئے جو ان کے مراسم کی نوعیت سے واقف تھے۔

یہ ایک مشکل فیصلہ تھا۔ شبنم کے پاس مجھ سے ملنے کے لیے صرف دن کا وقت تھا کیونکہ اس کی رات تو اخبار کے دفتر میں گزرتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ترکِ تعلق کا یہ ڈراما کیسے چلے گا۔ نہ شبنم مجھ سے ملنا چھوڑ سکتی تھی اور نہ میں اس پر انحصار کم کرسکتا تھا لیکن اب اس فیصلے پر سختی سے عمل کرنا ہم سب کے مفاد میں تھا اور ناگزیر ہوگیا تھا۔

اسی طرح میرا فرید عباسی اور شاہ عالم کی ساتھی شریکِ حیات رخشی سے یکسر بیگانگی اختیار کرنا بھی ناصر عظیم کی زندگی کے ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے ضروری تھا۔ پانچ چھ مہینے بعد جب لوگ شاہ عالم کو پھر بھول جائیں اور اس کے زندہ نہ ہونے کے ناقابلِ تردید ثبوت سامنے آجائیں تو حسنِ اتفاق کے آسرے پر میں اپنے حالات کو ایسی ترتیب دے سکتا تھا کہ ناصر عظیم کا شبنم سے بھی رشتہ استوار ہوجائے اور فرید عباسی سے بھی۔ شبنم ایک اخبار کی ایڈیٹر تھی اور اس کے تعلقات کا دائرہ وقت کے ساتھ ساتھ وسعت اختیار کرتا جارہا تھا۔ چنانچہ یہ ناممکن نہیں تھا کہ کسی مرحلے پر وہ ناصر عظیم کے ساتھ بھی شناسائی کا رشتہ استوار کرلے۔ اس کے جاننے والوں میں شہر کی تمام قابلِ ذکر شخصیات کے ساتھ ناصر عظیم بھی شامل ہوسکتا تھا۔ ایسے ہی فرید عباسی وکیل تھا۔ وہ ایک مشہور لا فرم کی نمائندگی کرتا تھا چنانچہ یہ اتفاق بھی ناممکن نہیں تھا کہ ناصر عظیم اپنے قانونی مسائل اس فرم کے سپرد کردے تو فرید عباسی کے ساتھ اس کی دوستی ہوجائے۔

سارا دن میں نیلم کی گاڑی لے کر پھرتا رہا تھا۔ ظاہر ہے نیلم کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسٹوڈیو میں اور کسی فلم کے سیٹ پر اسے گاڑی پیش کرنے والے بہت تھے۔ وہ جسے اشارہ کردیتی وہ خود ڈرائیور بن کے شبنم کو کہیں بھی لاتا لے جاتا بلکہ اپنی خوش قسمتی تصور کرتا لیکن یہ انتظام عارضی تھا۔ مستقل ضرورت کے لیے مجھے اپنی ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔

کمال کے اسپتال جانے کے لیے بھی میں یہی گاڑی لے جاسکتا تھا مگر میں نے اسے چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور سڑک تک جاکے ایک ٹیکسی لے لی۔ سڑک پر چلتے ہوئے اور لوگوں سے بات کرتے ہوئے میں ابھی تک اعتماد کی کمی کا شکار تھا۔ میرے لاشعور میں یہ خوف جاگزیں تھا کہ کہیں کوئی مجھے شاہ عالم نہ سمجھ لے۔ میرا صرف حلیہ بدلا تھا۔ چہرہ وہی تھا اور اسے بدلا نہیں جاسکتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ لوگ اب شاہ عالم کو بھی بھول چکے تھے۔ آج کے اخبار میں پھر اس نے خبروں میں جگہ پائی تھی لیکن اس سے عام لوگوں کے جذبات نہیں بدلے تھے۔ ان کا مجموعی ردِعمل وہی عدم دلچسپی کا تھا۔ یہ صورتِ حال میرے حق میں جاتی تھی اور مجھے کسی کے عمومی ردِعمل سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا تھا۔

میں کمال اسپتال پہنچا تو رات پوری طرح شہر پر سایہ فگن ہوچکی تھی۔ یہ اسپتال میں داخل مریضوں کے لیے کھانے کا وقت تھا۔ ان کے لیے جلدی کھانا کھاکے جلدی سوجانے کا معمول سردی گرمی میں وقت کے تھوڑے سے فرق کے ساتھ جاری رہتا تھا۔ دور سے میں نے اسپتال کی کھانے کی ٹرالی کو دیکھا جو وارڈز کے کوریڈور میں کھڑی تھی۔ رات کی ڈیوٹی والا اسٹاف مریضوں کو کھانے کی ٹرے ان کے بیڈز تک لے جاکے دے رہا تھا۔

میں آفس کے انتظامی بلاک اور وارڈ نمبر ایک کے درمیان سے گزر کے عقبی حصے کی طرف چلا گیا جہاں رہائشی کوارٹروں کے چار بلاک تھے۔ ہر بلاک میں دو کوارٹرز تھے اور انہی میں ایک میں کمال کی رہائش تھی۔ اس کے مزاج کی فقیرانہ شان اور اس کی زندگی کا پُر قناعت انداز بعض اوقات مجھے بھی حیران کردیتا تھا۔ اس کوارٹر میں صرف دو کمرے تھے جن میں سے ایک کو ان کا بیڈ روم سمجھا جاسکتا تھا۔ دوسرے کو انہوں نے بیٹھنے کے قابل بنالیا تھا لیکن ان دو کمروں میں بھی سامان کم سے کم تھا۔ اس گھر میں کوئی پُرتعیش ڈرائنگ روم نہیں تھا اور اسبابِ ضرورت بھی عام استعمال کا تھا۔ مجھے بعض اوقات ان کی زندگی بے حد خشک ویران اور غیر دلچسپ لگتی تھی۔ وہ بیزار کن حد تک اپنے معمولات کے اسیر تھے اور گھومنے پھرنے بھی بہت کم جاتے تھے مگر وہ اس میں خوش تھے۔

گھر کا دروازہ بند تھا مگر اندر سے قمر کے چلانے کی آواز آرہی تھی وہ اپنے اکلوتے فرزند کی کسی حرکت پر ناراض ہورہی تھی۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو قمر بیٹر پٹر کرتی دوپٹہ سنبھالتی آئی اور دروازے سے سر نکال کے بولی "کون ہے؟" پھر اس نے مجھے دیکھا اور اس نے خوشی سے ایک چیخ ماری "بھائی۔" اور باہر نکل کے مجھ سے لپٹ گئی۔

"بھائی۔ یہ تم ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا ہے اپنی آنکھوں پر۔" اس نے خوشی سے کانپتی آواز میں کہا۔

میں نے اس کے سر کو پیار سے تھپکی دی "یقین آجائے گا۔ چل اندر۔"

وہ مجھے کھینچ کے اندر لے گئی "ٹھہرو۔ پہلے میں تمہیں جی بھر کے دیکھ تو لوں۔ کتنے عرصے بعد تم کو پھر ویسے ہی دیکھ رہی

ہوں۔ جیسے تم تھے۔ بھائی تم اب آ گئے ہو نا ہمیشہ کے لیے؟"

وہ میرے سینے پر سر رکھ کے رونے لگی۔

میں نے اسے تسلی دی "ارے پاگل۔ میں گیا ہی کب تھا۔"

"نہیں بھائی۔" وہ روتے ہوئے بولی "تم کہیں چلے گئے تھے۔ کبھی آتے تھے تو اتنے اجنبی بن کے آتے تھے کہ پہچانے نہیں جاتے تھے۔"

میں نے کہا "اب میں آ گیا ہوں ہمیشہ کے لیے۔ رو مت!"

"جھوٹ بول رہے ہو تم بھائی۔ تم پھر چلے جاؤ گے۔" وہ اسی طرح روتی رہی۔

کمرے میں کھڑا ہوا دو سال کا بچہ اپنی ماں کو ایک اجنبی کے گلے لگ کر روتا دیکھ کے خود بھی رونے لگا تھا۔ میں نے قمر کے آنسو پونچھے اور بچے کو گود میں اٹھایا تو اس نے ایک دل دہلا دینے والی چیخ ماری۔ میں نے گھبرا کے اسے قمر کے حوالے کردیا "یہ تو انجن کا بچہ ہے۔ دیکھنے میں انسان کا بچہ نظر آتا ہے۔"

قمر آنکھیں پونچھ کے مسکرانے لگی "بیٹا یہ تو ماما ہیں۔ ٹافی لانے والے۔ جاؤ ان کے پاس۔"

لیکن بچے نے مجھے ماما تسلیم کرنے سے صاف انکار کردیا اور ماں سے چمٹ گیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "تو موٹی ہو رہی ہے قمر۔"

وہ شرما کے ہنسی "میں نے آج اخبار پڑھا تھا۔ روز تو فرصت نہیں ہوتی مگر آج انہوں نے کہا کہ تمہارے بھائی صاحب نے ایک اور کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ پولیس کو چکمہ دے کر فرار ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا "مگر اخبار تو کچھ اور ہی لکھ رہے تھے۔"

وہ بولی "مجھے پتا تھا وہ سب غلط ہے۔ کمال نے ہی کہا ہے کہ یہ ناصر کا کوئی اور ڈراما ہے۔ فرار ہونے کا منصوبہ تو وہ بنا ہی رہا تھا۔ ہوٹل سے نہ ہوا پولیس کی تحویل سے فرار ہو گیا۔ اب دیکھ لینا کسی دن اچانک آ جائے گا کوئی نیا بھیس بدل کے۔ میں نے فرید عباسی کو بھی فون کیا تھا کہ یہ حراست میں پولیس تشدد سے ہلاکت کا کیا چکر ہے تو اس نے بھی کہا کہ شور مچانا ضروری ہے کہ مار دیا۔ مار دیا۔"

"تو نے خود دیکھا تھا۔ میں تھانے میں کتنے آرام سے مہمانوں کی طرح مقیم تھا۔"

"اسی لیے تو مجھے یقین نہیں آیا تھا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ بھائی نے مل ملا کے یا پیسہ خرچ کر کے کوئی چکر چلایا ہے اور پولیس نے خود بھائی کو فرار کرا دیا ہے۔ کمال بھی یہی کہہ رہے تھے کہ پولیس نے مجرمانہ غفلت نہیں برتی۔ صرف الزام لیا ہے اپنے سر مگر اس الزام کو قبول کرنے کی پوری قیمت بھی وصول کی ہو گی۔"

میں نے قمر کی خوش فہمی کے طلسم کو توڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر میں اسے حقیقت بتاتا تو حاصل کچھ بھی نہ ہوتا۔ وہ روتی اور پریشان ہوتی۔ "میں پکا بندوبست کر کے نکلا تھا۔"

"کل سے اب تک تم کہاں تھے بھائی؟"

میں نے کہا "نیلم کے گھر میں روپوش تھا۔ اپنا حلیہ اور لباس بدل کے یہاں آیا ہوں۔"

وہ ڈر کے بولی "اگر کسی نے تمہیں پہچان لیا بھائی؟"

"کیسے پہچانے گا۔ اب میں وہی ہوں کہ جو تھا۔ میں ناصر عظیم تھا اور رہوں۔" میں نے کہا۔

"خدا کے لیے اب کسی نئی الجھن میں مت پڑنا۔ بس تم یہاں آ جاؤ اور ہمارے ساتھ ہی رہو۔"

میں نے اس کی تجویز کو گول کردیا "کمال ابھی تک مصروف ہے۔"

"ان کا تو یہی ہے۔ آ جاتے ہیں مغرب کے بعد لیکن رات کو کسی بھی وقت کوئی ایمرجنسی ہو تو جانا پڑتا ہے۔" قمر نے کہا "میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔"

میں نے کہا "تجھے چاکلیٹ مل گئے تھے۔"

"مل گئے تھے بھائی۔ تمہارا وہ دوست دے گیا تھا۔" وہ کچن سے بولی "ابھی ایسے ہی رکھے ہیں۔ تم نہیں آئے تھے تو دل بہت اداس تھا۔"

میں نے کہا "تو جانتی ہے اچھی طرح کہ مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔"

بچے نے کچن میں کوئی چیز گرائی پھر اپنی توتلی آواز میں شور کرنے لگا "می گندی بچی ہے۔ بولی کو مارتی ہے۔"

میں نے کچن میں جا کے اس سے دوستی کرنے کی پھر کوشش کی "آؤ ہم باہر چلتے ہیں۔ چڑیا دیکھیں گے۔"

وہ فوراً میرے پاس آ گیا۔ قمر ہنسی "باہر جانے کے لیے فوراً تیار ہے۔"

میں نے کہا "تم اسے بولی کیوں کہتی ہو؟"

وہ بولی "دراصل نام بدل دیا ہے اس کا۔ اب یہ محبوب الحق ہے۔ اسپتال میں ایک بزرگ آئے تھے۔ بہت عرصے سے بیمار تھے۔ یہاں ایک مہینے رہے اور ٹھیک ہو گئے۔ ان کا ایک پیسہ خرچ نہیں ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور بڑی دعائیں دیں۔ ایک دن اسے دیکھا تو بولے کہ اس کا نام کیا ہے۔ کمال نے بتایا تو بولے اس کا نام محبوب الحق رکھ دو۔

بہت مبارک ہے۔ میں ان سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔ ان کی عمر شاید سو سال ہو گی مگر چہرے پر ایسا نور تھا اور ایسی جلالی شخصیت تھی ان کی کہ دل میں خود بخود تعظیم کے جذبات پیدا ہوتے تھے۔ کمال تو قائل نہیں ہیں ایسی باتوں کے مگر میں نے کہا کہ محبوب الحق ہی اچھا نام ہے۔"

"تجھے پسند ہے تو بس ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے چائے بنا کے میرے سامنے رکھ دی "ایک رات تم آئے تھے بھائی۔ چندا سے ملنے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس کا کیا حال ہے؟"

"تم نے کیا محسوس کیا تھا؟"

قمر چائے کا کپ لے کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کا بیٹا اب اپنے کھلونوں میں مصروف ہو گیا تھا "چندا بہت عجیب ہوتی جا رہی ہے۔ کمال کہتے ہیں کہ اس پر اسپتال کا ماحول اثر انداز ہو رہا ہے اور وہ اکیلے پن کا شکار ہے۔ تمام وقت اپنے کوارٹر میں بند رہتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی نہیں آتی جاتی نہیں۔ دور دور رہتی ہے۔"

میں نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی زندگی میں تنہائی کا عذاب بہت سخت ہے۔ یہاں وہ اس لیے نہیں آتی ہو گی کہ تمہاری پرائیویسی میں خلل نہ پڑے۔ خود اس کے پاس اسپتال کے سوا کوئی مصروفیت نہیں۔ کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ کرے تو کیا کرے۔"

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ کمال آ گیا۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ مجھ سے بغل گیر ہوا "تو آ گیا الو کے پٹھے۔ مرا نہیں۔"

میں نے کہا "کسی بدخواہ کے چاہنے سے مجھے کچھ نہیں ہو سکتا۔ سؤر کے بچے۔"

وہ ہنسنے لگا "یہی کہا تھا میں نے قمر سے کہ فکر مت کرو۔ تمہارا بھائی بہت ڈھیٹ چیز ہے۔ مرتے تو ہیں غیرت مند۔ یہ بھی کوئی سوچا سمجھا ڈراما ہو گا تم دیکھ لینا۔"

میں نے کہا "کہتے ہیں نا ولی را ولی می شناسد۔ ولی کو ولی پہچانتا ہے۔ دیکھ لے میں آ گیا۔"

قمر اس کے لیے چائے لینے چلی گئی تو وہ بولا "قمر کا بھی عجیب حال تھا۔ ویسے مانتی تھی کہ پولیس کی حراست سے تیرا فرار ہو جانا کسی طے شدہ پلان کے مطابق ہو گا لیکن مجھ سے چھپ چھپ کے روتی تھی اور نمازیں پڑھ پڑھ کے تیرے لیے دعائیں کرتی تھی۔ اگر وہ تھانے جا کے تجھ سے نہ ملی ہوتی اور اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا کہ تیرے ساتھ وہاں وی آئی پی ٹریٹ منٹ ہو رہا ہے تو شاید میرے یا فرید عباسی کے سمجھانے سے نہ سمجھتی کہ حراست میں تشدد سے ہلاکت کی بات بے بنیاد ہے۔"

میں نے کہا "تو بہنوں کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتا۔"

"اس سے زیادہ عجیب حالت چندا کی رہی۔ اس نے خبر کو منفی انداز میں قابل یقین سمجھ لیا تھا اور گم صم ہو گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ ذہنی طور پر وہ اتنی اپ سیٹ ہے کہ اس کا دماغ کام کی طرف بالکل متوجہ نہیں۔ وہ کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی اور اس کی آنکھیں خلا میں دیکھتی محسوس ہوتی تھیں۔ اس نے ایک دو بار خود کلامی بھی کی لیکن اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دو بار ایسا ہوا کہ وہ میرے ساتھ چلتے چلتے رک گئی اور کچھ سوچنے لگی۔ ہمارے پیچھے ایک نرس دوائیں اور انجکشن لے کے چل رہی تھی۔ وہ چندا سے ٹکرا گئی اور اس کے ہاتھ سے ٹرے گر گئی۔ اس کے بعد میں نے چندا کو زبردستی گھر بھیج دیا۔ وہ اسپتال میں رہتی تو زیادہ خرابی ہوتی۔ مریضوں کو اٹینڈ کرنے کا کام ایسا نہیں کہ آدمی مکمل توجہ اور یکسوئی کے بغیر کر سکے۔ تھوڑی دیر بعد میں نے کوارٹر میں جا کے دیکھا تو وہ منہ لپیٹے پڑی تھی اور کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہی تھی۔ میں نے پاس بیٹھ کے اسے بہت دیر تک سمجھایا کہ "اس خبر میں کوئی صداقت نہیں۔ ناصر پر تشدد کرنا تو دور کی بات ہے پولیس اس پر انگلی نہیں اٹھا سکتی۔"

"وہ مسلسل روتی رہی۔ وہ پوچھتی رہی کہ "اب ناصر کیا کرے گا؟ وہ کب تک مفرور رہے گا؟ اور کیسے روپوش رہے گا؟ ساری عمر کون روپوش رہ سکتا ہے؟ بالآخر وہ پکڑا جائے گا کہیں نہ کہیں۔ کیا پھر اس کے لیے زیادہ مصیبت نہیں ہو گی؟ کیا اس کے لیے یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ ٹاپ کے وکیل کرتا اور عدالت میں اپنی صفائی پیش کر کے ان جھوٹے مقدمات سے جان چھڑا لیتا؟ کیا کوشش کر کے ضمانت پر رہائی حاصل کرنا اس کے حق میں بہتر نہیں تھا؟" چندا کا ذہن جو سوچ رہا تھا وہی سوالات کی صورت میں اس کی زبان پر آ رہا تھا اور وہ بار بار یہی کہتی تھی کہ میں ناصر کو جانتی ہوں۔ وہ سوچے سمجھے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ فرار والی بات غلط ہے۔ اس کا تو مطلب یہی نکالا جا سکتا تھا کہ حراست میں ناصر کی ہلاکت والی خبر صحیح ہو گی مگر چندا کا ذہن اس امکان پر سوچتے ہوئے ہی ڈرتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ وہ شدید ذہنی خلفشار، پریشانی اور مایوسی، خوف اور ڈپریشن کا شکار تھی۔ میں نے بڑی کوشش کر کے اسے ایک ٹرنکولائزر دے دیا تاکہ وہ سو جائے لیکن چندا پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ وہ جاگتی رہی اور

اپنے خوف زدہ کرنے والے خیالوں سے لڑتی رہی۔ سچ بتاؤں مجھے تو اس کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں اس کا ڈیپریشن اتنا نہ بڑھ جائے کہ وہ خود کشی کر لے۔ میں یہ بات پہلے سے محسوس کر رہا ہوں کہ اعصابی دباؤ اس کو ذہنی طور پر خراب کر رہا ہے۔"

میں نے کہا "خرابی سے تیری کیا مراد ہے؟"

"وہ شدید بیزار رہنے لگی ہے۔ بہت بد مزاج اور چڑ چڑی ہوتی جا رہی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھنجلا جاتی ہے۔ مریضوں کی عیادت کے لیے آنے والے تو کسی حد تک ناجائز پریشان کرتے ہیں اور انہیں کنٹرول کرنا پڑتا ہے لیکن مریض تو مریض ہے۔ اس کی غلط بات بھی سننی پڑتی ہے۔ دو ایک بار وہ مریضوں پر برس پڑی۔ یہ رویہ اسپتال میں نہیں چل سکتا۔ دراصل اس خرابی کا ذمے دار بھی اسپتال ہے۔"

"چندا نے تو بڑے شوق اور جذبے کے ساتھ یہ کام شروع کیا تھا۔"

کمال نے سوچ کے کہا "شوق اور جذبہ ایک تو ہوتا ہے طبعی۔ ہم جیسے لوگ ہیں جو اور کچھ سوچتے ہی نہیں۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے یہی ماحول دیکھا ہے۔ گھر میں اماں ابا بھی ڈاکٹر تھے۔ خدمتِ خلق کرتے کرتے مر گئے۔ اس میں نام اور پیسہ بھی بہت کمایا اور سب میرے لیے چھوڑ گئے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میرے خون میں یہ شوق شامل تھا لیکن چندا نے ایک ردِ عمل کے طور پر یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ کرنل خان کی وفات کے بعد وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ تو بھی اسے دغا دے کر شاہ عالم کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس نے کوئی مصروفیت تلاش کرنے کی کوشش میں اسپتال جوائن کر لیا۔ وہ اکیلی کہیں اور جا کے رہ بھی نہیں سکتی تھی مگر یہ بہت مشکل کام ہے برادر۔ سخت اعصاب شکن اور صبر آزما۔ خدمت خلق کا سارا شوق کچھ عرصے بعد ایک پُر اذیت تجربہ بن جاتا ہے جب آدمی کو چوبیس گھنٹے دکھ بیماری اور موت ہی دیکھنے کو ملے۔ یہاں تو دن رات کا معاملہ ہے۔ دوسرے اسپتالوں میں یہ ہوتا ہے کہ آپ نے آٹھ دس گھنٹے ڈیوٹی کی اور اس ماحول سے نکل آئے۔ یہاں چھٹی کا کوئی تصور نہیں۔ ماحول بدلنے کے لیے کہیں جانے کا کوئی سوال نہیں۔ ہر وقت وہی ایک کام ہے۔ روتے چلاتے خستہ حال اور خستہ تن مریضوں سے نمٹنا۔ ان کے کریہہ صورت زخموں سے خون پیپ صاف کرنا۔ گلے سڑے بیمار گوشت کی تراش خراش اور سسکتے تڑپتے انسانوں کو مرتے ہوئے دیکھنا۔ چندا کا نروس بریک ڈاؤن ہونے لگا۔ مزید پرابلم یہ ہوئی کہ اس کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں۔ جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دوست احباب نہیں سوسائٹی نہیں اور ماحول سے فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ وہ گھبرا گئی ہے اس کام سے اور اگر اس نے فوراً کوئی صورت نہ نکالی تو اس کا مکمل نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا۔ اسے کسی نفسیاتی اسپتال کے کلینک میں داخل کرنا پڑ جائے گا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ کا کلینک ایک مثالی جگہ ہے۔"

"ہو گی۔ مگر کیا ضروری ہے کہ وہ نوبت آئے۔"

"تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"تو اسے نکال اس ماحول سے۔ اس کی کچھ مدد کر۔ اسے کہیں لے جا۔"

"مثلاً کہاں؟ تجھ کو پتا ہو تو بول۔"

وہ بولا "تو اپنی جان بچانے کے لیے ایسے سوال کرتا ہے؟" کمال بگڑنے لگا۔

"نہیں یار۔ چندا میری بھی ذمے داری ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا "اس کی کچھ دل جوئی کر۔ اس کو کسی تفریح پر یا ایڈونچر پر اپنے ساتھ لے جا۔ اسپتال کے ماحول سے اسے نکالنے کی ایک صورت یہ ہے کہ تو اسے اپنے کام میں شریک کر لے۔"

"میں تو ابھی ایسا کوئی کام نہیں کر رہا ہوں۔ جس میں چندا میرے لیے کچھ بھی کر سکے۔"

"تیرا یتیم خانے کا پراجیکٹ کب شروع ہو گا آخر۔"

میں نے کہا "عنقریب۔ بہت جلد۔ انشاء اللہ۔"

"تو چندا کو اس کے انتظامی امور سونپ دے۔ اس پراجیکٹ کی ڈیزائننگ سے تکمیل تک ہر مرحلے میں چندا کو ذمے داری میں شامل کر لے تاکہ اس کو مصروفیت بھی ملے اور اس کی توجہ اسپتال سے بالکل ہٹ جائے۔ یہ کام اب اس کے بس کا نہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو میرے لیے بھی بہت اچھا ہو گا اگر وہ میری مدد کرنے کے لیے میرے ساتھ آ جائے۔ میں تو چاہوں گا کہ نہ اس کا آفس یہاں ہو اور نہ اس کی رہائش۔"

کمال نے مجھے غور سے دیکھا "تو اسے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔"

"میری مراد ایک ہی گھر سے نہیں تھی۔" میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

"آخر تو اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا الو کے پٹھے۔"

میں نے کہا "شادی ابھی نہیں یار۔ ذرا پہلے وہ نارمل ہو جائے اور میری طرف سے اس کا دل صاف ہو جائے۔ مجھے پھر وہی پہلے والا ناصر عظیم خان مان لے۔"

"یہ کیا مشکل ہے۔ اگر تو شرافت کا جامہ پہن لے۔"

میں نے کہا "وہ اس وقت ہے کہاں شرافت کے پاجامے؟"

"کہاں ہوگی اپنے کوارٹر کے سوا۔ اسپتال سے آتی ہے تو کوارٹر میں قید ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "کیا میں اسے باہر لے جاؤں ڈنر کے لیے؟"

"یہ بڑی اچھی ابتدا ہو گی۔" کمال بولا۔

قمر شور مچانے لگی "اب ایسی بھی آفت نہیں آ رہی ہے کہ تم آتے ہی چلے جاؤ بھائی۔ وہ جو میں نے کھانا پکالیا ہے اس کا کیا ہو گا۔"

"وہ میں صبح اٹھتے ہی کھالوں گا ناشتے سے پہلے۔" کمال بولا۔

میں نے کہا "ورنہ میں واپس آ کے دوسرا ڈنر کروں گا۔ کیا ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ ہیضہ۔ بہن کا دل رکھنے کے لیے بھائی اپنی جان پر کھیل جائے گا۔"

کمال ہنسنے لگا "فکر مت کر۔ ہم تجھے مرنے نہیں دیں گے۔ آخر اتنا بڑا اسپتال چلا رہے ہیں۔"

"افسوس ناک اتفاق یہ ہے کہ آج میں پیدل ہی ہوں۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

کمال نے چابیاں میرے سامنے رکھ دیں "لے جا تیری ہے یہ ایمبولینس حاضر ہے۔ ہم خود بھی اس میں گھومتے پھرتے ہیں۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ وہ سمجھے گی یہ دعوت آپ نے نسخے میں لکھی ہے۔"

میں نے دروازے کو دستک دیے بغیر آہستہ سے دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ میں خاموشی سے اندر چلا گیا اور برآمدے میں پہنچ گیا۔ ایک کمرے میں تاریکی تھی۔ دوسرے میں روشنی تھی۔ میں نے دروازے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا تو مجھے لگا یہ حرکت کسی حد تک غیر اخلاقی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ اندر کمرے میں وہ کپڑوں کی طرف سے بے پروا کسی ایزی پوز میں بیٹھی ہوتی یا کپڑے بدل رہی ہوتی مگر اس نے باہر کا دروازہ بند نہیں کیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ کمال یا قمر میں سے کوئی کسی وقت بھی سیدھا اندر آ سکتا ہے۔

وہ بستر پر سیدھی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہاتھ پیشانی پر الٹا رکھا ہوا تھا۔ میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور اس سے چار فٹ کے فاصلے پر جا کھڑا ہوا مگر اسے پتا نہ چلا۔

"چندا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

وہ اس بری طرح اچھلی جیسے میں نے اس کے کان کے پاس رکھ کے ریوالور چلا دیا ہو "کون۔ کون۔ کون؟" اس نے غیر ارادی طور پر پوچھا اور اٹھ کے سیدھی بیٹھ گئی پھر اس کی نگاہ نے مجھے دیکھا اور اس کا وجود جیسے پتھر کا ہو گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بے یقینی کا خوف دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ یہ حقیقت نہیں خیالوں کا سراب ہے۔

چندا کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس پر اندیشوں کے اور تفکرات کے افسردہ سائے صاف نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد رنج و الم کے سرمئی حلقے سے پڑ گئے تھے اور اس کے لبوں کی مسکراہٹ بجھی ہوئی تھی۔ وہ بے ترتیب اور کسی حد تک شکن آلود اور بے قرینہ لباس میں تھی اور اس کے بال پریشان تھے۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا "چندا۔ کیا بات ہے؟"

اس نے پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھنا جاری رکھا "تم آ گئے ہو یا میری نظریں مجھے دھوکا دے رہی ہیں؟"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ ہاتھ ٹھنڈا اور زندگی کی حرارت سے محروم تھا "اس میں بے یقینی کی کون سی بات ہے؟"

"لیکن۔ لیکن۔ تم تو۔"

میں نے کہا "کیا ہو گیا ہے تمہیں چندا۔ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

چندا نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے بال پیچھے کیے اور دوپٹہ اٹھا لیا "تم اچانک سامنے آ گئے تو مجھے یقین نہیں آیا اور پھر اتنے عرصے بعد میں نے تمہیں ایسے دیکھا۔ تو مجھے ایسا لگا جیسے میں کوئی پرانا خواب دیکھ رہی ہوں۔ کب آئے تم؟"

میں نے کہا "ایک گھنٹا ہو گیا ہے مجھے آئے ہوئے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک منٹ ہوا ہو گا۔"

میں نے کہا "میں کمال اور قمر کے ساتھ تھا۔"

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا "تم پولیس کی تحویل سے فرار ہو کے آئے ہو؟"

میں نے کہا "میں نہیں۔ پولیس کی حراست سے شاہ عالم فرار ہوا ہے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ناصر عظیم ابھی تک شاہ عالم کی حراست میں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ وہ بھی آزاد ہو گیا ہے۔ میں ہمیشہ

کے لیے تمہارے پاس آگیا ہوں چندا۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔ اس کی بات بھی کرنا نہیں چاہتا۔"

"کیا یہ تمہارے اختیار میں ہے؟" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"ہاں اب ہے۔ میں واقعی لوٹ آیا ہوں۔"

وہ سرہلا کے بولی "میں کیسے مان لوں۔ تم کتنے بے بس ہو۔ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ تم اپنی زندگی جینے کے حق سے بہت پہلے محروم ہو چکے تھے۔"

میں نے کہا "میں نے یہ حق پھر حاصل کرلیا ہے۔ مجھ پر یقین کرو۔"

وہ مجھے اسی طرح خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی "مجھے کل بھی یقین نہیں تھا کہ تم پولیس کی حراست سے فرار ہوگئے ہو۔ مجھے اس وقت بھی یقین نہیں ہے کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہی حقیقت ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے ناصر۔"

میں نے کہا "اب خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہیں سب بتا دوں گا۔ چلو اٹھو۔"

"اٹھ کے کیا کروں؟"

"میرے ساتھ چلو۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔ بہت کچھ کہنا ہے اور بہت کچھ سننا ہے تم سے۔"

وہ مایوسی سے بولی "نہیں ناصر۔ مجھے ڈر لگتا ہے باہر جاتے ہوئے اور تم باہر جاؤ گے تو تمہیں پولیس پکڑ لے گی۔"

"پولیس اب مجھے نہیں پکڑ سکتی۔ فرار شاہ عالم ہوا ہے تو وہ ناصر عظیم کو کیوں پکڑے گی۔ اٹھ کے کپڑے بدلو۔ تیار ہو جاؤ۔"

اس نے پھر پس و پیش کیا "دیکھو۔ جو باتیں کرنی ہیں یہاں بیٹھ کے کرو۔ باہر جانا کیا ضروری ہے۔"

میں نے کہا "باہر جانا بے حد ضروری ہے۔"

"میرا دل نہیں چاہتا۔"

میں نے کہا "دل کی مت مانو۔ عقل کی بات سنو۔ مجھے سب بتایا ہے کمال نے کہ کیسے تم نے تارک الدنیا ہو کے اس کوارٹر میں بند کرلیا ہے خود کو۔ قمر نے بتایا ہے مجھے کہ تم نے خود کو زندگی کی خوشیوں سے دور کرلیا ہے۔"

وہ اداسی سے مسکرائی "وہ ایسے ہی پریشان ہوتے رہتے ہیں۔"

"نہیں چندا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور اسے کھڑا کردیا "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"ساتھ چلنا ہوگا؟" اس نے جیسے خود سے پوچھا "مگر کہاں تک؟"

میں نے کہا "جہاں بھی میں کہوں۔ جہاں تک بھی میں چاہوں۔ تم کو میرا ساتھ دینا پڑے گا چندا۔ تمہیں میری قسم۔"

اس کے بعد چندا نے مزاحمت ترک کردی۔ اس نے دس منٹ میں لباس بدلا اور ہلکا سا میک اپ کرکے بولی "اب بتاؤ کہاں جانا ہے؟"

میں نے کہا "میرے پاس گاڑی نہیں ہے آج۔ ہم پیدل جائیں گے اور تھک جائیں گے تو ٹیکسی میں بیٹھ جائیں گے یا تانگے میں۔"

آہستہ آہستہ چندا کے بے رونق بے جان چہرے پر شادمانی کی مسکراہٹ صبح کی پہلی کرن کی طرح پھوٹ رہی تھی۔ ہم چلتے گئے اور باتیں کرتے گئے۔ چندا کا لہجہ اور رویہ پہلے ناراضی، مایوسی اور افسردگی کا آئینہ دار تھا تو رفتہ رفتہ اس میں ایک خوشگوار تبدیلی آتی گئی یہاں تک کہ وہ بالکل نارمل ہوگئی۔ وہ اعتماد کے ساتھ بات کرنے لگی۔ مسکرانے لگی اور ہنسنے لگی۔

میں نے اسے سب بتا دیا۔ اپنی گرفتاری سے رہائی تک پیش آنے والے واقعات اسی طرح سنا دیے جیسے وہ پیش آئے تھے۔ میں نے اسے اپنے مستقبل کے پروگرام سے بھی آگاہ کردیا اور اپنے عزائم سے بھی۔ وہ رات بڑی دل فریب اور نظر نواز تھی۔ آسمان پر چودھویں شب کا چاند اپنی پوری تابانی کے ساتھ روشن تھا اور شاید یہ میرے احساس کی کرشمہ سازی تھی کہ مجھے ساری فضا حسین لگ رہی تھی۔ رات کا وجود آغاز بہار کی خوشبو سے معمور تھا اور ماحول میں زندگی کا سارا حسن سمٹ آیا تھا۔

ہم پیدل چلتے چلتے کئی میل دور نکل آئے تھے۔ اب چندا بول رہی تھی اور میں سن رہا تھا۔ وہ مجھے ایک پُرسکون، بامقصد اور محفوظ مستقبل کے صراطِ مستقیم پر گامزن رہنے کی ضرورت سمجھا رہی تھی اور مجھے قائل کر رہی تھی کہ میری زندگی پر سب کے ساتھ اس کا کتنا حق بنتا ہے۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری رفاقت کا اعجازِ مسیحائی اتنی جلدی اپنا رنگ دکھائے گا۔ ذرا سی دیر میں چندا وہی پرانی چندا بن گئی تھی۔ اس کی ساری اداسی افسردگی اور مایوسی دیکھتے دیکھتے ایک دلنواز ادائے حسن میں ڈھل گئی اور وہ ایک بار پھر وہی چندا بن گئی جس کو اپنے ناز و انداز اور آدابِ دلبری سے ناصر عظیم کو مسحور و محکوم رکھنا آتا تھا۔ یہ تبدیلی اتنی تیزی سے رونما ہوئی تھی کہ خود میں حیران رہ گیا۔

رات کے دس بجے جب چندا نے کہا کہ اب اس سے مزید نہیں چلا جاتا اور وہ تھک کے گرنے والی ہے تو ہم شملہ پہاڑی کو عبور کرچکے تھے۔ ہم ایک اوپن ائر ریسٹورنٹ میں کھانے کے لیے جا بیٹھے۔

وہاں میں نے چندا سے کہا "چندا۔ میں چاہتا ہوں تم یہ اسپتال کا کام چھوڑ دو۔"

وہ ہنس پڑی "پھر کیا کروں؟ شبنم کی طرح صحافت کروں یا نیر کی جگہ فلموں میں آجاؤں۔ وہ تو ریٹائر ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا "یہاں تم اپنی صلاحیت کو اور اپنے آپ کو ضائع کر رہی ہو۔ تمہاری زندگی کے مقاصد میں صرف ایک نرس بن کے زندگی گزار دینا تو شامل نہیں تھا۔ جو کام تم کر رہی ہو وہ کوئی بھی نرس کرسکتی ہے۔"

وہ بولی "میرا تو خیال ہے کہ میں کچھ بھی نہیں کر رہی ہوں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ تم کچھ نہیں کر رہی ہو سوائے اپنی صلاحیتوں کو ضائع کرنے کے۔ اسپتال کا بیمار ماحول تمہیں بیمار بنا رہا ہے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے اعصاب اتنے مضبوط نہیں ہیں جتنے ڈاکٹر کمال کے۔ لیکن میں یہ کام نہ کروں تو کیا کروں؟"

"تم میرے ساتھ آجاؤ۔" میں نے کہا۔

"تمہارے ساتھ؟"

"ہاں۔ تم میری پارٹنر بن جاؤ۔ مجھے ایک بااعتماد ساتھی، ایک بھروسے کے قابل مشیر، ایک رازدار سیکریٹری اور ایک اچھے دوست کی ضرورت ہے۔"

وہ بولی "لیکن ابھی تو تم خود بھی کچھ نہیں کر رہے ہو۔"

"میں نے اپنا پرانا بلڈنگ اینڈ کنسٹرکشن کا کام پھر شروع کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں یتیم خانے کی تعمیر، تزئین اور تنظیم کے سارے کام مرحلہ وار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی تکمیل کی منزل آئے گی۔ پہلے تشکیل کا مرحلہ ہوگا۔ یتیم خانے کا نقشہ اور ڈیزائن تیار ہوگا پھر تعمیر کا مرحلہ آئے گا۔ اس کی عمارت مکمل ہوگی۔ تعمیر کے بعد تزئین کے مرحلے میں بلڈنگ کے لیے ضرورت کا سارا سامان فراہم کیا جائے گا۔ آخری مرحلہ ہوگا تنظیم کا یعنی اس کے انتظامی معاملات کو سنبھالنے کا۔ یہ سارے کام میں اکیلا نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے مجھے تمہارے جیسے کسی معتمد اور شریک کار کی ضرورت ہے۔"

وہ بڑے غور سے میری بات سنتی رہی اور سوچ میں پڑ گئی۔

"کیا تم واقعی مجھے اس کا اہل سمجھتے ہو؟"

"چندا۔ کیا میں تمہیں سمجھتا نہیں؟ مجھے تمہارا جواب ہاں میں چاہیے۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "میں تمہیں انکار کیسے کرسکتی ہوں۔"

"میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم وہ جگہ چھوڑ دو۔ جہاں تم رہتی ہو۔ اس کوارٹر کے تنہا ویران ماحول سے نکل آؤ۔"

وہ کچھ حیران ہوئی "میرے پاس تو رہنے کی وہی ایک جگہ ہے۔"

میں نے کہا "تمہاری رہائش کے لیے میں نے ایک جگہ لی ہے۔ وہ میرا پرائیویٹ آفس تھا مگر میرا خیال ہے کہ تم وہاں آرام سے رہ سکتی ہو۔"

"کس کے ساتھ؟" اس نے براہ راست سوال سے گریز کیا۔

"کسی کے ساتھ نہیں۔ وہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ تم اپنی حفاظت خود بھی کرسکتی ہو لیکن میں چوبیس گھنٹے کے لیے سیکیورٹی گارڈ رکھ سکتا ہوں۔ تم ایک بار چل کے وہ جگہ دیکھو پھر تم خود ہی قائل ہو جاؤ گی۔"

"ایک بات پوچھوں ناصر۔"

"ضرور پوچھو۔" میں نے کہا۔

وہ میز پر آگے جھک کے بولی "یہ اچانک تمہیں میری زندگی میں اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی ہے؟"

میں نے کہا "یہ دلچسپی ویسے تو ہمیشہ سے تھی لیکن اس کی فوری وجہ تمہاری یہ حالت ہے جس کا ذمے دار میں خود کو سمجھتا ہوں۔ میں اپنی کوتاہی یا نادانی کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میری بدقسمتی نے یا گردشِ حالات نے ہمارے تعلق میں جو دوری پیدا کردی تھی، میں اسے مٹانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں سب کچھ پھر پہلے جیسا ہو جائے۔"

اس نے ایک آہ بھری "وقت جو گزر جاتا ہے واپس کیسے آسکتا ہے؟"

"آسکتا ہے چندا۔ اگر ہم چاہیں۔"

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ نہ جانے کہاں سے اٹھ کے کچھ لوگ ہمارے قریب آگئے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے اور انہوں نے ہماری میز کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ان کے جارحانہ عزائم ان کی صورتوں پر تحریر تھے۔ ان میں سے دو افراد کے چہرے میرے دیکھے ہوئے تھے۔

وہ پیر سبحان شاہ کے مرید اور ملازم تھے اور اس کے سالے اے ایس پی دلاور شاہ کے ماتحت تھے۔ انہوں نے میری گرفتاری اور اغوا میں اہم کردار ادا کیا تھا اور شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ وہ مجھے شاہ عالم فرض کرتے ہوئے پھر کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

میں نے اپنا اعتماد بحال رکھا اور اٹھ کے کھڑا ہوگیا "کیا بات ہے؟"

چندا نے خوف کو اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ "ناصر' جھگڑا مت کرنا۔"

میں نے اسے تسلی دی "میں صرف ان لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ کیا چاہتے ہیں؟"

ان میں سے ایک آگے بڑھا' وہ ان سب کے مقابلے میں صحت مند تھا اور اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اسے بائیں ہاتھ سے ایک مونچھ کو مروڑنے کی عادت تھی۔ اس طرح غیر شعوری طور پر وہ اپنی بدمعاشی کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا "شاہ عالم۔ خود کو قانون کے حوالے کردو۔"

میں نے حتی الامکان سخت حیران نظر آنے کی کوشش کی۔ "شاہ عالم! کون ہے شاہ عالم؟"

وہ ایک قدم اور آگے آیا "میرے ساتھ ڈراما مت کرو۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا "آخر تم ہو کون؟"

"شاہ عالم! میرا نام راؤ سکندر ہے۔" اس نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"مگر میرا نام شاہ عالم نہیں ہے۔" میں نے احتجاج کے انداز میں کہا۔

اب چندا نے مداخلت کی "ان کا نام ناصر عظیم ہے۔"

"ہاں۔ میرا نام ناصر عظیم ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

راؤ سکندر کے جارحانہ انداز نہیں بدلے "جھوٹ بولتے ہو۔ تم ایک مفرور مجرم شاہ عالم ہو۔"

میں نے برہمی سے کہا "مجھے کوئی ضرورت نہیں جھوٹ بولنے کی۔ غلط فہمی تمہیں ہوئی ہے۔"

راؤ سکندر نے میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی "چلو تھانے چلو۔ سب معلوم ہوجائے گا کہ تم کون ہو' غلط فہمی کسے ہے!"

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "تم ہوتے کون ہو مجھے اس طرح زبردستی تھانے لے جانے والے؟ میں ایک آزاد اور امن پسند شہری ہوں اور میرا نام شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہے۔"

چندا نے بھی شور مچایا "یہ کیا بدمعاشی ہے۔"

راؤ سکندر نے اسے گھور کے دیکھا "تم چپ کرکے بیٹھو بی بی۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔"

چندا نے زیادہ اونچی آواز میں کہا "ایسے وارنٹ کے بغیر تم کسی کو گرفتار نہیں کرسکتے۔"

"ایک مفرور مجرم کو ہم کہیں بھی دیکھیں تو گرفتار کرسکتے ہیں۔" راؤ سکندر بولا۔

میں نے کہا "کس نے دیا ہے تمہیں گرفتاری کا اختیار؟"

چندا نے کہا "کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ تم پولیس والے ہو؟"

راؤ سکندر نے جیب سے ایک کارڈ نکالا "میں سی آئی اے کا سب انسپکٹر ہوں۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

اونچی آوازوں کے شور نے اِدھر اُدھر کی میزوں پر بیٹھے ہوئے بہت سے لوگوں کو متوجہ کرلیا تھا۔ میں پوری کوشش کررہا تھا کہ میری صورت سے کسی قسم کی پریشانی یا گھبراہٹ کا اظہار نہ ہو اور میں صورتِ حال کو مزید خراب ہونے سے بچالوں۔ مجھے تھانے جانے میں کوئی عار نہیں تھا کیونکہ میں بہرحال یہ ثابت کرسکتا تھا کہ مجھے پہچاننے والوں نے غلطی کی ہے اور میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں۔ میرے پاس اپنے شناختی کارڈ اور دوسرے دستاویزی ثبوت بھی تھے۔ ایک بار پہلے میں نے عدالت میں جج کے سامنے یہ غلط فہمی رفع کرنے کے لیے دو مستند گواہ طلب کرلیے تھے۔ اس وقت بھی میرے لیے ڈاکٹر کمال فاروقی اور فلموں کی سپر اسٹار نیلم کو بلانا مشکل نہیں تھا مگر میں چاہتا تھا کہ بات اس حد تک نہ بڑھے۔

سب انسپکٹر راؤ سکندر اپنی بات پر اڑا ہوا تھا اور بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے اپنے تمام تر قانونی اور غیر قانونی اختیارات استعمال کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن ضرور لے جائے گا مگر میری پریشانی دور کرنے میں قدرت نے میری مدد کی۔ پہلے تو وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے دو چار اٹھ کے ہمارے قریب آگئے اور انہوں نے معاملہ ختم کرانے کی کوشش کی۔

یہ روز مرہ مشاہدے کی بات ہے کہ اس قسم کی صورتِ حال میں پبلک کا ووٹ ہمیشہ پولیس کے خلاف ہوتا ہے۔ لوگ یہ فرض کرلیتے ہیں کہ قانون کے نام پر پولیس ہمیشہ لاقانونیت کا مظاہرہ کرتی ہے اور اپنی طاقت کے بل پر غلط کام کرتی ہے۔

وہاں جمع ہونے والوں میں تین گورنمنٹ کالج کے لڑکے تھے جو بہت جوشیلے تھے اور میری حمایت میں بولنے لگے تھے مگر ان کے ساتھ آنے والے ایک پروفیسر نے انہیں روک دیا اور اپنا تعارف کرا کے معاملہ ختم کرانا چاہا۔

"انسپکٹر راؤ سکندر' میں گورنمنٹ کالج کا پروفیسر احسان قادری ہوں۔" اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کے کہا "کیا میں یہ مسئلہ حل کرنے میں کوئی مدد کرسکتا ہوں۔"

راؤ سکندر نے بادلِ ناخواستہ پروفیسر سے مصافحہ کیا مگر اسے مداخلت کی اجازت دینے سے صاف انکار کردیا "آپ اپنا کام کریں جناب اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں۔"

میں نے اپنا کارڈ نکالا "آخر یہ کیا دھاندلی ہے۔ یہ زبردستی مجھے شاہ عالم بنارہے ہیں۔ میرا شناختی کارڈ دیکھیں' میں ناصر عظیم ہوں۔"

پروفیسر نے میرا شناختی کارڈ لے کر غور سے دیکھا "یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں انسپکٹر!"

راؤ سکندر کے کچھ بولنے سے پہلے ایک شخص نمودار ہوا "یہاں کیا ہورہا ہے؟ جنٹلمین' آپ لوگ اپنی اپنی جگہ تشریف رکھیں۔ میں اس ہوٹل کا مالک فرمان علی ہوں۔"

میں نے پروفیسر سے شناختی کارڈ لے لیا "مسٹر فرمان! یہ کیا غنڈا گردی ہے آخر؟ میں اپنی بیوی کے ساتھ یہاں کھانا کھانے آیا تھا۔ مجھے یہ لوگ زبردستی پکڑنا چاہتے ہیں کہ تم شاہ عالم ہو۔ حالانکہ میرا نام ناصر عظیم ہے۔ میں کسی شاہ عالم کو نہیں جانتا۔"

فرمان علی نے لوگوں کو واپس ان کی میزوں پر بھیج دیا۔ "آپ پریشان مت ہوں' زبردستی کون گرفتار کرسکتا ہے آپ کو۔ راؤ سکندر! تم بھی ذرا میرے ساتھ آفس میں آؤ۔ آپ بھی آئیں ناصر صاحب! خاتون' آپ یہیں تشریف رکھیں اور گھبرائیں نہیں' ابھی سارا معاملہ سیٹل ہوجائے گا۔"

راؤ سکندر کا اعتماد اب تذبذب میں بدل گیا تھا مگر وہ اتنی آسانی سے اپنی غلطی پر شرمندہ ہونے والا نہیں تھا "یہ ایک قانونی معاملہ ہے۔"

"تم مجھے جانتے نہیں انسپکٹر راؤ سکندر!" فرمان علی نے ناگواری سے کہا "میں بھی پہلے پولیس میں تھا۔ میں ریٹائرڈ ڈی ایس پی ہوں۔"

راؤ سکندر زیادہ متاثر نہیں ہوا مگر فرمان علی اپنے آفس کی طرف چل پڑا تھا۔ میں نے چندا سے کہا "تم بیٹھو دو منٹ میں آتا ہوں" اور فرمان علی کے پیچھے ہولیا۔ اس کا آفس ریسٹورنٹ کے ایک گوشے میں بنا ہوا کمرا تھا۔ مجبوراً راؤ سکندر کو بھی وہاں آنا پڑا۔

"آپ تشریف رکھیں" فرمان علی نے مجھے ایک کرسی پیش کی "راؤ سکندر! تم بھی بیٹھو۔ تمہیں کسی اچھے ہوٹل میں جاکے شریف لوگوں کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔"

"یہ شریف آدمی نہیں ہے۔"

"میرے لیے سب معزز گاہک ہیں" وہ سختی سے بولا "تم اپنے معاملات باہر طے کرو۔ تمہیں کسی کو گرفتار کرنا ہے تو اپنی کارروائی باہر کرو۔ اور اندر کچھ کرنا ہے تو پہلے مجھ سے بات کرو۔ مجھے وارنٹ دکھاؤ' یہ میری گڈول اور ریپوٹیشن کا سوال ہے۔"

میں نے کہا "فرمان علی صاحب' ہم اکثر یہاں آتے ہیں۔"

راؤ سکندر معنی خیز انداز میں مسکرایا "ڈی ایس پی صاحب! اس شخص پر اعتبار مت کریں۔ یہ ایک نمبر کا جھوٹا ہے۔"

"مگر یہ شاہ عالم نہیں ہے۔" فرمان علی نے کارڈ اسے دکھایا۔

میں نے کہا "شاہ عالم ایک سیاست داں تھا۔ اسے مرے ہوئے زمانہ ہوگیا۔ ایک بار پہلے بھی مجھے اس لیے پکڑلیا گیا تھا کہ میری صورت اس سے ملتی ہے۔ مگر میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک بزنس مین ہوں اور بلڈر ہوں۔ میں نے مجسٹریٹ کے سامنے دو گواہ بلائے تھے جو مجھے شناخت کرسکتے تھے۔ وہ مجھے پچھلے دس سال سے جانتے ہیں۔"

"کون ہیں وہ گواہ ناصر صاحب!"

میں نے کہا "ایک تو فلموں کی سپر اسٹار نیلم ہیں۔"

وہ چونکا "نیلم جانتی ہیں آپ کو؟"

"میرے لیے وہ بڑی بہن کی طرح ہیں۔ آپ ان کے گھر فون کریں۔ وہ ابھی آجائیں گی دس منٹ میں۔ ورنہ ان کا سیکریٹری رئیس آجائے گا۔ ان کے گھر کے سارے نوکر مجھے جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ کمال اسپتال کے ڈاکٹر کمال فاروقی ہیں۔ آپ انہیں بلالیں۔"

فرمان علی کو میرے پُریقین لہجے نے متاثر کیا "اب بولو' تم کیا کہتے ہو سکندر۔ گواہوں کو بلانا ضروری ہے؟"

راؤ سکندر اپنی بات پر اڑا رہا "جسے بلانا ہوگا ہم تھانے میں طلب کریں گے ہم انہیں گرفتار تو نہیں کررہے ہیں۔ ان سے صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ چلیں۔"

"کیوں چلوں میں تمہارے ساتھ آخر؟" میں نے بگڑ کے

کہا "میرے ساتھ بیوی ہے میری۔ اسے بھی تھانے لے جاؤں؟"

اچانک راؤ سکندر کے ایک ساتھی نے قریب آ کے اس کے کان میں کچھ کہا۔ راؤ سکندر کا جارحانہ اعتماد پھر بحال ہوگیا "اچھا! یہ بات ہے؟" اس نے اپنے ساتھی سے کہا اور پھر فرمان علی سے مخاطب ہوگیا "دیکھ لیں جناب' یہ شخص کتنا جھوٹا ہے۔ جسے یہ اپنی بیوی بتا رہا ہے' وہ ایک نرس ہے اسی کمال اسپتال میں۔ ڈاکٹر کمال اس کا دوست ہے۔ یہ اسپتال کی نرس کو عیاشی کے لیے لایا ہے اور بکواس کررہا ہے کہ وہ اس کی بیوی ہے۔"

میں نے میز پر مُکا مارا "بکواس تم کررہے ہو۔"

راؤ سکندر کے ساتھی نے کہا "جناب' میں قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ یہ نرس ہے۔ جب ایک بار میں بیمار ہوکے کمال اسپتال میں داخل ہوا تھا تو اس نے میری تیمارداری کی تھی۔ مجھے اس نرس کا نام یاد نہیں مگر یہ وہی ہے۔"

میں نے کہا "یہ کمال اسپتال کے مالکوں میں شامل ہے جسے تم نرس سمجھ رہے ہو۔ یہ کرنل خان کی بیٹی ہے اور نرس کیا کسی کی بیوی نہیں ہوسکتی؟"

فرمان علی چکر میں پڑگیا "میرا خیال ہے کہ یہ معاملہ آپ لوگ باہر طے کرلیں تو اچھا ہے۔ راؤ سکندر! تم ہوٹل کے اندر کچھ نہیں کروگے۔"

میں نے کہا "ہم یہاں کھانا کھانے آئے ہیں اور کھانا کھا کے ہی جائیں گے۔"

راؤ سکندر اپنی کامیابی پر مسکرایا "ٹھیک ہے۔ میں باہر ملوں گا تم سے اور دیکھوں گا تمہیں بچانے کون آتا ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری ساری خوش فہمی دور ہوجائے گی انسپکٹر۔ تم جانتے نہیں کہ نیلم تمہارے کن اعلیٰ افسران سے بات کرسکتی ہے اور ڈاکٹر کمال کی پہنچ کہاں تک ہے۔ فرمان علی صاحب! میں دو فون کروں گا۔ ایک نیلم کو' دوسرا ڈاکٹر کمال کو۔"

"ضرور کریں" فرمان علی مجھ سے متاثر ہوچکا تھا۔

میں نے نیلم کو فون پر اس "غلط فہمی" کے بارے میں بتایا اور اسے ریسٹورنٹ کا فون نمبر دے دیا۔ اس نے دوسری طرف سے مجھے پہلے ڈانٹا کہ میں اپنی بے احتیاطی کی وجہ سے خود کو مشکل میں ڈالتا ہوں اور پھر مجھے تسلی دی "فکر مت کرو' میں دیکھتی ہوں کون ملتا ہے اس وقت۔"

میں نے کہا "اس انسپکٹر کا تعلق سی آئی اے سے ہے۔"

"سی آئی اے کے ایک ایس پی سے میری اچھی شناسائی ہے۔ بس دعا کرو اس سے رابطہ ہوجائے۔"

میں نے کہا "اتنی سی بات کے لیے ایس پی کو زحمت دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم خود آجاؤ تو یہ غلط فہمی رفع ہوجائے گی۔ اس ریسٹورنٹ کے مالک فرمان علی خود بھی ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی ہیں۔"

"ذرا فون دو اسے" نیلم نے کہا۔

نیلم نے دو منٹ فرمان علی سے بات کی ہوگی کہ وہ ریشہ خطمی ہوگیا۔ یہ اس کے لیے بڑے اشتیاق اور اعزاز کی بات تھی کہ اتنی بڑی فلم اسٹار خود چل کے اس کے ریسٹورنٹ میں آرہی تھی۔ وہ بڑی نیازمندی سے اسے یقین دلاتا رہا کہ اس کے آنے تک ناصر عظیم کو کچھ نہیں ہوگا۔

اس نے فون رکھ کے کہا "ہوگئی انسپکٹر صاحب! نیلم خود آرہی ہے گواہی دینے۔ اب تو شک کی بات نہیں رہی۔"

راؤ سکندر نے جس بات کو اپنی افسرانہ انا کا مسئلہ بنالیا تھا' وہ ایک بے بنیاد غلط فہمی ثابت ہورہی تھی۔ چنانچہ وہ خوش نہیں تھا مگر اب اس کے لیے بھی حالات سے سمجھوتا کرنا ناگزیر ہوگیا تھا۔ "فرمان صاحب' شک کرنا پولیس کا کام ہے۔"

"کیا میں دوسرے گواہ ڈاکٹر کمال کو بھی طلب کروں انسپکٹر؟" میں نے کہا۔

سب انسپکٹر اٹھ کھڑا ہوا "وہ آپ کی مرضی۔ ویسے ضرورت کوئی نہیں۔"

میں نے فرمان علی سے کہا "نیلم جہاں جاتی ہے' لوگ پہچان لیں تو مجمع لگ جاتا ہے۔ کوشش کریں کہ اسے پریشانی نہ ہو۔"

اس نے مجھے یقین دلایا "ریسٹورنٹ کے اندر ان کا پورا خیال رکھا جائے گا۔"

سب انسپکٹر راؤ سکندر کو اب وہاں مزید قیام کرنا اپنی سُبکی محسوس ہورہا تھا مگر نیلم کے شوقِ دیدار نے اسے بھی روکے رکھا۔ وہ اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ قریب ہی ایک میز پر موجود رہا لیکن نیلم خود نہیں آئی۔ اس کے بجائے کسی اعلیٰ افسر کا فون آگیا اور ریسٹورنٹ کے مالک نے راؤ سکندر کو آفس میں بُلا کے ریسیور تھمادیا۔

وہ جب فون پر بات کرکے نکلا تو اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔ اس نے بڑی خفت کے ساتھ میری ٹیبل پر آکے مجھ سے رسمی معذرت کی اور اپنے تینوں ساتھیوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔

بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ غلط فہمی کسی کو بھی ہوسکتی

ہے اور جب حقیقت سامنے آجائے تو بات ختم ہوجانی چاہیے مگر نہ جانے کیوں اکثر نچلے درجے کے پولیس افسران اتنے فراخ دل نہیں ہوتے کہ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں عار محسوس نہ کریں۔

ہمارا خوش گوار موڈ بھی راؤ سکندر کی پریشان کن دخل اندازی سے خراب ہوگیا تھا۔ یہ واقعہ پیش نہ آتا تو شاید ہم وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہتے لیکن اس کے بعد چندا بھی کچھ خاموش ہوگئی تھی۔

میں نے کہا "ایک معمولی واقعے پر اتنا سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ بولی "ان میں سے ایک نے مجھے بھی پہچان لیا تھا ناصر!"

میں نے کہا "پھر کیا ہوا۔ تمہیں تو اسپتال آنے والے ہزاروں مریض پہچانتے ہوں گے۔ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے؟"

"مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے لیے شاہ عالم سے جان چھڑانا کبھی آسان نہیں ہوگا۔ یہ دہری شناخت تمہارے لیے مسائل پیدا کرتی رہے گی۔"

میں نے کہا "کچھ عرصے ایسا ضرور ہوگا مگر بالآخر شاہ عالم کی شناخت گم ہوجائے گی۔ ماضی کا بھولا ہوا افسانہ رہ جائے گی۔ اور اس وقت تک ناصر عظیم کی شخصیت دوبارہ بھرپور انداز میں سامنے آجائے گی۔"

ہم واپسی میں بھی پیدل چلتے رہے۔ میں نے چندا کی تھکن کے خیال سے ٹیکسی لینے کی تجویز پیش کی تھی مگر چندا نے کہا "مجھے کھلی رات کی تازگی میں سانس لینا بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تمہارا یہ ساتھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

اچانک چندا میرے کچھ قریب آگئی "ناصر' کوئی ہمارا پیچھا کررہا ہے۔"

میں نے رک کے دیکھا۔ میرے پیچھے پیدل آنے والے بہت لوگ تھے مگر ان میں سے کسی پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا تھا "غالباً وہم ہے تمہارا۔ کوئی ہمارا پیچھا کیوں کرے گا؟"

"وہ پولیس والا مجھے بڑا کینہ پرور لگتا تھا شکل سے۔"

میں نے کہا "اگر وہ اپنی مزید بے عزتی کرانا چاہتا ہے تو ضرور آئے۔"

چندا ہر چند قدم کے بعد مڑ کے پیچھے دیکھتی تھی۔ وہ ایک انجانے سے اضطراب میں مبتلا تھی۔ "رکو مت' چلتے رہو۔

میرا خیال ہے کہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کون ہے وہ؟"

"ایک شخص ہمارے پیچھے چل رہا ہے۔ تقریباً سو قدم کے فاصلے سے۔"

میں نے کہا "پیچھے تو بہت لوگ ہیں۔"

"اس نے جینز کی پتلون پہن رکھی ہے۔ ہلکے نیلے رنگ کی اور بڑے بڑے خانوں والی چیک کی شرٹ ہے۔" چندا نے بتایا۔

میں نے کہا "تمہیں کیسے شک ہوا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہا ہے۔ ہم سے سو قدم پیچھے تو اس کے علاوہ بھی کئی لوگ ہوں گے؟"

"ہم بہت آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ کئی دوسرے لوگ تیز چلتے ہوئے ہمیں کراس کرگئے ہیں مگر وہ ٹہلتا ہوا آرہا ہے۔ اور دو تین بار میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ چور سا بن گیا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا۔"

میں نے کہا "او کے۔ ہم چیک کرلیتے ہیں۔ آگے ایک آئس کریم پارلر ہے۔ ہم وہاں رک جائیں گے۔"

چمن آئس کریم کے اندر بیٹھنے کی جگہ محدود تھی۔ بہت سے لوگ اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کے آئس کریم کھا رہے تھے یا فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ بیڈن روڈ پر ون وے ٹریفک تھی مگر بہت سے لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گاڑی اندر لے آئے تھے۔ اس سے ٹریفک جام ہورہا تھا اور آگے کیری ہوم ریسٹورنٹ تک گاڑیاں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے چندا کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود آئس کریم لینے اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ چیک کی ٹی شرٹ والا آدمی سامنے ڈرائی فروٹس کی دکان پر کھڑا ہے۔

اب چندا کی بات مجھے ٹھیک ہی نظر آرہی تھی۔ چیک شرٹ والا ہمارے پیچھے یہاں تک آگیا تھا۔ شاید ہم سے کچھ دور رہنے کے لیے اس نے آئس کریم نہیں کھائی اور تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر واقع ڈرائی فروٹس کے اسٹور پر رک گیا جہاں سے وہ بہ آسانی ہم پر نظر رکھ سکتا تھا۔

تاہم ابھی میں پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اتفاق نہیں تھا۔ ایک شاہراہِ عام پر کسی کا کچھ دور ساتھ چلنا اور بار بار نظر آنا لازمی طور پر یہ ثابت نہیں کرتا تھا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہا ہے۔ میں اس کے دل میں شک بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے اسے گھورنے سے گریز کیا۔ ہم چمن آئس کریم شاپ پر اس لیے کھڑے تھے کہ ہمیں شیشے کے کپ خالی کرنا تھے مگر وہ ڈرائی فروٹ شاپ پر بلاوجہ

کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مختلف قسم کے بادام چیک کیے پھر شاید بھاؤ تاؤ کرتا رہا اور جب تھوڑے بادام لے لیے تو نمکین پستے اور دوسرے میوے دیکھنے لگا۔ وہ ہماری طرف سے بالکل لاتعلق ظاہر کر رہا تھا مگر اس کے انداز کچھ اور چغلی کھاتے تھے۔ وہ بھی جانتے بوجھتے ہماری طرف دیکھنے سے گریز کرتا رہا اور پھر فراغت سے بادام پستے چھیل چھیل کے کھاتا رہا۔

وہ چھبیس ستائیس برس کا متناسب نقوش والا نوجوان تھا جس نے بھارتی اداکار انیل کپور اسٹائل کے بال بنا رکھے تھے اور غیر ارادی طور پر وہ ایک ہاتھ کی انگلیوں سے انہیں پیچھے کرتا رہتا تھا۔ اپنے درمیانے قد اور اوسط وزن کے ساتھ وہ عام لوگوں میں بالکل غیر نمایاں تھا۔

محض اپنے شک کی تصدیق کے لیے میں نے پلٹ کے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ابھی تک اس جیسے کسی نوجوان کے ٹہلتے ہوئے چمن آئس کریم تک آنے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا تھا۔ خود ہم ان بے شمار جوڑوں میں شامل تھے جو تفریحاً یہاں تک پیدل آجاتے تھے۔ تاہم واپسی میں بھی وہ سائے کی طرح ہمارے ساتھ چلتا تو پھر سوچا جاسکتا تھا کہ اس سے کیسے نمٹا جائے۔

"وہ پھر پیچھے آرہا ہے۔" چندا نے چند قدم چل کے مجھے مطلع کیا۔

میں نے کہا "اب ہم سیدھے راستے پر نہیں جائیں گے۔ ذرا آزماتے ہیں کہ وہ کہاں تک ہمارا ساتھ دیتا ہے۔"

"دیکھو ناصر۔ ایک مشکل سے تو جان بچ گئی۔ اب کسی اور مصیبت میں مت پڑنا۔"

میں نے ہنس کے کہا "تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے وہاں بھی قصور میرا تھا؟"

"میرا مطلب تھا۔ جب تک وہ خود کوئی ایسی ویسی بات نہ کرے‘ اس سے الجھنا مت۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتا ہے؟"

میں نے کہا "یہ ہم اس سے پوچھ سکتے ہیں۔"

کسی وجہ کے بغیر میں مال روڈ کی طرف گیا اور درمیان کی ایک سڑک سے گھوم کے دوبارہ بیڈن روڈ پر آگیا۔ چندا کے چہرے سے اب کچھ تھکن کا احساس ہونے لگا تھا چنانچہ میں اس کھیل کو زیادہ دیر جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ چیک شرٹ والا نوجوان بھی کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ہم یہ چکر کیوں چلا رہے ہیں۔

ایک موڑ پر میں پلٹا اور تیزی سے آگے بڑھا تو چیک شرٹ والا نوجوان اچانک میرے سامنے آگیا۔ میں نے اس کا راستہ روک لیا۔

"نوجوان! تم بہت دیر سے ہمارا پیچھا کر رہے ہو۔"

وہ گھبرا گیا "میں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔"

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا "آخر تم کیا چاہتے ہو؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کے دائیں بائیں دیکھا "وہ دراصل۔۔۔ میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔"

میں نے برہمی سے کہا "بات کرنے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ آدھے گھنٹے سے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہو۔"

اس نے اب خود کو سنبھال لیا تھا "آئی ایم سوری۔ میرا مقصد آپ کو پریشان کرنا نہیں تھا۔ دراصل میں آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ آپ اپنی وائف کے ساتھ تھے۔"

میں نے کہا "یہ تم نے کیسے فرض کرلیا کہ میرے ساتھ میری وائف ہیں؟"

وہ مزید نروس ہوا "آئی ایم سوری۔ میں غلط سمجھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج آپ کا گھر دیکھ لوں گا تو پھر کسی روز حاضر ہوجاؤں گا۔"

"تمہیں ایسا کیا کام پڑگیا تھا مجھ سے؟"

اس نے پھر دائیں بائیں دیکھا "بات یہ ہے شاہ عالم صاحب!"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا "جی۔۔۔!"

میں نے کہا "ہاں۔ اگر تم مجھے شاہ عالم سمجھ کے کوئی بات کرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ تمہیں صورت کی مشابہت سے دھوکا ہوا ہے۔ میرا نام ناصر عظیم ہے‘ شاہ عالم نہیں۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ کو کئی بار ملک رب نواز کے ساتھ دیکھا ہے۔"

میں نے کہا "اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوجاتی ہے لیکن تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میرا شاہ عالم سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔"

اس نے مجھ پر یقین نہیں کیا "آپ مذاق کر رہے ہیں مجھ سے۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بے بسی اور مظلومیت تھی کہ میں شش و پنج میں پڑگیا "آخر بات کیا ہے؟"

میرے حوصلہ افزا رویے نے اس کی آنکھوں میں پھر چمک پیدا کردی "مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے شاہ صاحب!"

میں نے کہا "پھر وہی شاہ صاحب! میں بتا چکا ہوں تمہیں کہ میرا نام شاہ عالم نہیں ہے" میں نے سخت لہجے میں کہا "بلاوجہ میرا پیچھا مت کرو۔ فی الحال میں تمہاری اس سے زیادہ مدد نہیں کرسکتا" میں نے چند نوٹ نکال کے اس کی طرف بڑھائے۔

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "میں آپ سے خیرات نہیں مانگ رہا ہوں۔"

"پھر کیا چاہیے؟" میں نے نوٹ واپس رکھ لیے "اگر بے روزگاری کا مسئلہ ہے تو میں تمہاری کیا مدد کروں۔ میں کوئی صنعت کار یا اعلیٰ سرکاری افسر بھی نہیں ہوں کہ میری سفارش سے تمہارا مسئلہ حل ہوجائے۔"

وہ شدید اضطرابی کیفیت میں اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے میں جھوٹ پر جھوٹ بول رہا ہوں۔ میرے انکار کے باوجود اس کے یقین میں کوئی کمی نہیں آئی تھی کہ میں شاہ عالم ہوں۔ یہ میرے لیے سخت تشویش کی بات تھی۔ ایک گھنٹے میں یہ دوسرا موقع تھا کہ اپنا حلیہ بدلنے کے باوجود شاہ عالم کو پہچان لیا گیا تھا۔ میرے انکار کے باوجود انسپکٹر راؤ سکندر کا اصرار باقی رہا تھا اور اس نوجوان کا ردعمل بھی مختلف نہ تھا۔

میں نے کہا "اب تم میرے پیچھے آئے تو ٹھیک نہیں ہوگا" اور چندا کے ساتھ واپس چل پڑا۔ وہ اپنی صورت پر زمانے بھر کا درد و کرب لیے وہیں کھڑا رہ گیا۔ شاید آہستہ آہستہ اسے اپنے یقین کے غلط ہونے کا اعتبار آنے لگا تھا۔ اب میں نے بہتر سمجھا کہ واپسی کے لیے کوئی رکشا یا ٹیکسی لے لوں۔ رات زیادہ ہوچکی تھی اور میرا تفریحی موڈ بھی غارت ہوچکا تھا۔

خود چندا ذہنی طور پر ڈسٹرب تھی۔ "پتا نہیں وہ کیا چاہتا تھا؟"

میں نے کہا "وہ کچھ بھی چاہے۔ میں اب شاہ عالم نہیں رہا تو اس کی بات بھی کیوں سنوں؟"

"تمہارا انکار کوئی تسلیم نہیں کرتا‘ تم نے دیکھ لیا۔"

"ہاں‘ یہ بات بڑی خطرناک ہے" میں نے کہا۔

"اور اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حلیہ بدلنے سے صورت نہیں بدلتی۔ تمہارے لیے آگے چل کے بھی مسائل پیدا ہوں گے۔ تم کس کس کو انکار کرو گے؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اور میں کیا کروں۔ میں نے چہرے سے داڑھی صاف کرادی۔ بال کٹوا کے ہیئر اسٹائل بدل لیا۔"

"مگر اب تمہارا چہرہ پرانے شاہ عالم کا چہرہ ہوگیا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا ہی تھا۔ داڑھی مونچھوں اور بڑے بڑے بالوں کے ساتھ تم پھر بھی مختلف نظر آتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ شاہ عالم کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ پر جو تصویر ہوگی وہ ایسے ہی چہرے کے ساتھ ہوگی جیسا اب تمہارا ہے" چندا بولی۔

میں نے تسلیم کیا کہ چندا غلط نہیں کہتی "تمہارا خیال ٹھیک ہے مگر میں کیا کرسکتا ہوں۔ اس مصیبت سے نجات کی یہی ایک صورت ہے کہ میں انکار کرتا رہوں اور غلط فہمی میں مبتلا ہونے والوں کو بتاتا رہوں کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں۔"

چندا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا "مجھے ڈر ہے یہ انسپکٹر بعد میں تمہارے لیے پریشانی پیدا نہ کرے۔"

میں نے کہا "ناصر عظیم کی شناخت بہت مضبوط حوالوں پر استوار ہے‘ وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مجھے تو تمہاری فکر ہو رہی ہے۔"

"میری کیا فکر۔۔۔"

"راؤ سکندر کے ایک ساتھی نے تمہیں صحیح شناخت کیا تھا۔ وہ مزید تفتیش کے چکر میں پڑ جائے تو اسپتال آسکتا ہے۔ یہ معلوم کرسکتا ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ اس وقت اگر میں یہ نہ کہتا کہ ہم میاں بیوی ہیں تو ہمارے لیے اور پریشانی پیدا ہوجاتی۔"

"اسپتال میں وہ کچھ نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "میں کمال سے کہوں گا کہ وہ راؤ سکندر کا کوئی بندوبست کرے جس سے وہ رک جائے۔"

"اگر اسے دلاور شاہ کی حمایت حاصل ہوگی تو شاید اس کو تفتیش سے روکنا بھی آسان نہیں ہوگا۔ کیونکہ دلاور شاہ سالا ہے پیر سبحان کا اور پیر صاحب کی سیاسی حلقوں میں بہت اوپر تک رسائی ہے۔"

میں نے کہا "میری مانو تو کل ہی تم یہ جگہ چھوڑ دو۔"

وہ ہنسنے لگی "یہ اتنا آسان نہیں ہے۔"

"اس میں مشکل کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر کمال کبھی نہیں مانیں گے۔"

میں نے کہا "تم اس اسپتال کے بیمار ماحول سے نکل جاؤ۔ یہ انہی کا آئیڈیا تھا۔ میں خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرا ساتھ دے کر تم اپنی صلاحیتوں کا بہتر استعمال بھی کرسکتی ہو اور زیادہ خوش رہ سکتی ہو۔ اس کے علاوہ مجھے تمہاری ضرورت بھی ہے۔ یہ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں۔"

وہ ہنس پڑی "تمہاری عرضی موصول ہوگئی۔ اب ہم غور کریں گے۔"

میں نے کہا "جتنا غور وخوض ہوگیا' وہ کافی ہے۔ زیادہ مت سوچو۔ اتنا عرصہ تم نے کمال کے لیے کام کیا۔ اب اندازہ ہو رہا ہے کہ اس کام کا نفسیاتی دباؤ کتنا زیادہ ہے۔ میں تمہیں مزید اس ماحول میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تمہیں کام ہی کرنا ہے تو میرے ساتھ رہ کر کام کرو جس میں تمہارے لیے دلچسپی بھی ہو اور حصولِ مقصد کا احساس بھی۔ ابھی جو کام تم کر رہی ہو وہ ڈاکٹر کمال کا مقصدِ حیات ہے۔ تم صرف اس کی مدد کر رہی ہو کیونکہ اس سے بہتر کوئی مصروفیت دستیاب نہیں۔"

"میں تمہیں انکار نہیں کر رہی ہوں۔"

"پھر یہ پس وپیش کس لیے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے آفس تیار ہیں۔ میرے پاس ایک پرائیویٹ آفس بھی ہے جہاں تم رہ سکتی ہو۔"

"اور تم خود کہاں رہو گے؟"

"میں نیلم کے ساتھ ہوں' ورنہ وہ مجھے ہرگز اجازت نہیں دے گی کہ میں اور کہیں جا کے رہوں۔ اب رئیس بھی وہیں ہے اور اگلے ایک مہینے میں صورتِ حالات بہت تبدیل ہوجائے گی۔ نیلم نے فلموں میں کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ نئی فلمیں سائن نہیں کر رہی ہے۔ اس کے پاس جو فلمیں ہیں وہ مکمل ہونے کے قریب ہیں۔ پھر وہ بھی ہمارے ساتھ ہوگی۔ اس وقت تک ان دونوں کی شادی بھی ہوجائے گی۔"

"یہ شادی بھی بہت عجیب ہوگی۔ میں جتنا اس کے بارے میں سوچتی ہوں۔"

میں نے کہا "شادی وہ کر رہے ہیں تو آپ اتنا کیوں سوچ رہی ہیں خاتون؟"

وہ ہنسی "خیال تو آتا ہے نا کہ قدرت نے آسمان پر یہ کیسا عجیب جوڑا بنا دیا۔"

"میرا خیال ہے جوڑے سب عجیب لگتے ہیں مگر سب سے عجیب ہوتا ہے رفاقت کو نبھانے کا وہ جذبہ جس کے سہارے لوگ ایک عمر ہنسی خوشی گزار لیتے ہیں۔ باہمی افہام و تفہیم اور ایک دوسرے کے لیے کچھ کرنے کی خواہش دو مختلف نظر آنے والے انسانوں کی زندگی کو ہم آہنگی کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ ابھی سب کو دیکھنے میں یہ لگتا ہے کہ ہر لحاظ سے ناقابلِ فہم نظر آنے والی یہ شادی کیسے کامیاب ہوگی۔ مگر میں بتاؤں' اسے کامیاب بنائے گی نیلم۔"

چندا نے مجھ سے اتفاق کیا "رئیس تو ایسے ہی ہے۔"

"ایسے ہی سے تمہاری کیا مراد ہے۔"

"بونگا۔ غیرذمے دار' پل پل میں بدلنے والا۔"

میں نے کہا "اسے میں تب سے جانتا ہوں جب کوئی اور نہیں جانتا تھا۔ ہم نے ہوش سنبھالا تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ تھے اور دوست تھے اور وہ ایک یتیم خانے کا نفرت انگیز' مکروہ اور سفاک ماحول تھا جس میں ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ کتنا عرصہ ہوگیا ہے آج اس بات کو۔ تقریباً پچیس سال۔ زندگی کی ایک چوتھائی صدی۔ وہ بونگا ہے اور اس کا موڈ بھی بدلتا رہتا ہے۔ وہ شوقین مزاج ہے اور عادات واطوار کے اعتبار سے ایک فقیر منش آدمی ہے۔ اس کے پاس لاکھوں ہوں تب بھی اس کی ضروریات انتہائی محدود رہتی ہیں۔ کھانے پینے کی اس نے کبھی فکر نہیں کی۔ جو مل گیا کھالیا جو مل گیا پہن لیا۔ لیکن یہ جو تم کہہ رہی ہو نا کہ وہ غیر ذمّے دار ہے' یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ نیلم اس کی تنہا اور بے مصرف زندگی میں رونما ہونے والا سب سے حسین انقلاب ہے۔ اس کی تقدیر کا سب سے بڑا انعام ہے۔ اب تم دیکھنا خود رئیس کی شخصیت میں کیسا انقلاب آگیا ہے۔ وہ خود کو بدل رہا ہے۔ نیلم کی مرضی اور خواہش کے مطابق۔ اس نے اپنی ذات کی نفی کر دی ہے اور خود کو نیلم کی پسند کے سانچے میں ڈھالنے کا عہد کرلیا ہے۔ جب ایک آدمی اس حد تک اپنی زندگی کو دوسرے کے حوالے کردے۔ جیسے گندھی ہوئی مٹی خود کو کمہار کے ہاتھوں کے سپرد کردیتی ہے کہ اب تیری مرضی' جس شکل میں چاہے مجھے ڈھال۔ تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔"

"اُف۔ کیا زبردست اندازِ وکالت ہے۔" چندا ہنسی۔

میں نے کہا "دراصل اس شادی سے میں بہت خوش ہوں۔ یہ دو بے سہارا زندگیوں کا ایک دوسرے کا سہارا بننے کا عہد ہے جس کی بنیاد قطعی غیرمادی ضروریات پر ہے۔ اس احساس کی شدت پر ہے کہ ان کی اپنی ادھوری اور بے مقصد زندگی کا خلا صرف اسی طرح پُر ہوسکتا ہے جب وہ ایک دوسرے کی تکمیل کو اپنا مقصد بنالیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات کو۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے زمین اور آسمان جب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں تو کائنات کا وجود سمجھ میں آتا ہے۔ تو رئیس اور نیلم کے ایک ہوجانے کے بعد ان کو ایک مقصدِ حیات مل جانا اور ان کی مشترکہ جدوجہد کا ایک سمت میں ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے۔"

ہم باتیں کرتے کرتے اتنا آگے آگئے تھے کہ اب کمال اسپتال تک پیدل جانا مشکل نہیں رہا تھا چنانچہ جب بالآخر

ایک ٹیکسی ہمارے قریب آکے سلو ہوئی تو میں نے اسے ہاتھ ہلا کے رخصت کر دیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ایک ناخوشگوار واقعے کے اثرات نے چندا کے خوشگوار موڈ کو متاثر نہیں کیا ہے اور ایک طویل فاصلہ پیدل طے کرنے کے باوجود وہ تھکن کا اظہار کرنے سے گریزاں تھی۔ یہ ایک مثبت تبدیلی تھی اور میں مطمئن تھا کہ صرف تین گھنٹے کی رفاقت میں چندا کی شخصیت کے وہ بند دریچے کھل گئے ہیں جن سے احساسِ حسن کی روشنی اور امید کی تازہ ہوا اندر آتی تھی۔ میں کوشش جاری رکھتا تو اس کی مایوسی' احساسِ دل شکستگی اور تنہائی کو دور کرکے اس کی زندگی کو پھر انہی آرزوؤں کے شوخ رنگ اور جذبات کی وہی آب وتاب دے سکتا تھا جو اس کی فطرت کی تشکیل کے بنیادی عناصر تھے مگر جن پر گردشِ حالات اور حادثاتِ زمانہ نے افسردگی اور ویرانی کی گرد ڈال دی تھی۔

ہم رات کے ایک بجے واپس پہنچے تو کمال اور قمر ویڈیو پر کوئی فلم دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کے مگ تھے اور سامنے مونگ پھلی کے چھلکے۔ چندا تو فوراً ہی معذرت کرکے اپنے کوارٹر میں سونے چلی گئی۔

کمال نے مجھے دعوت دی "آ مونگ پھلی کھا' گرم ہے ابھی۔"

قمر اٹھی "میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔"

میں نے کہا "نیلم نے فون تو نہیں کیا تھا؟"

"اس کے دو فون آچکے ہیں۔" کمال نے مطلع کیا "تیسرا فون رئیس کا تھا۔ کہہ رہا تھا ان دونوں کا فون اب کسی تھانے سے آئے گا۔ پولیس پکڑ چکی ہوگی' آوارہ گردی کے الزام میں۔ اور پھر وہی ہوگا جو آج اخبار میں ہے۔"

میں نے کہا "آج اخبار میں ایسی کون سی خبر تھی۔"

"پولیس نے کل رات ایک نوجوان جوڑے کو آدھی رات کے بعد کہیں گھومتے پھرتے پکڑا۔ فی الحال میں یہی کہوں گا' گھومتے پھرتے کیونکہ پولیس نے بھی ایسے ہی شریفانہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ آوارہ گردی یا خرمستی جیسے قابلِ اعتراض الفاظ نہیں کہے۔ پولیس والوں نے حسبِ روایت ان سے نکاح نامہ طلب کیا۔ غالباً جو کچھ ان کی جیب میں تھا وہ پہلے ہی خرچ کرچکے ہوں گے ورنہ مقررہ فیس دیتے اور سب ہنسی خوشی اپنی اپنی راہ لیتے۔ انہیں تھانے جانا پڑا۔ وہاں تھانہ انچارج بھی غالباً چڑھائے بیٹھے تھے اور کچھ خوشگوار موڈ میں تھے۔ اختیارات کے استعمال میں حد سے تجاوز کرنا تو خیر کوئی بات ہی نہیں مگر انہوں نے ایک پریکٹیکل جوک کیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کون ہو؟ میاں بیوی' بھائی بہن' کزن یا عاشق معشوق؟ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ وہی ہیں جو تھانے دار صاحب نے آخر میں فرمایا۔ تھانے دار صاحب متبسم ہوئے اور بولے کہ ہمیں تمہارا یہ جہاد کا جذبہ یعنی ظالم حکمراں کے سامنے کلمۂ حق کہنا پسند آیا مگر تم لوگ صرف عشق پر اکتفا کیوں کیے پھر رہے ہو؟ شادی کیوں نہیں کرلیتے؟ انہوں نے عرض کی کہ جہاں پناہ' یہ ظالم سماج درمیان میں ٹانگ اڑا رہا ہے ورنہ ہم کب کا ایسا کرچکے ہوتے اور اپنی زندگی عین شرع کی پابندی کرتے ہوئے گزارتے۔ تھانے دار صاحب نے گالی دے کے کہا "ایسی کی تیسی اس ظالم سماج کی' اس کی دیدہ دلیری اتنی بڑھ گئی ہے کہ فلموں سے نکل کے اب حقیقی زندگی میں بھی دخل اندازی کرنے لگا ہے۔ ہم یہ ظلم نہیں ہونے دیں گے۔ تمہاری شادی آج ہی ہوگی بلکہ ابھی۔" اب دولھا دلہن بڑے سٹپٹائے کیونکہ ایسا تو ان کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا۔ دونوں نے عرض کی کہ بادشاہ سلامت' ہمارے والدین بھی تو ہیں۔ وہ بہت غل غپاڑہ کریں گے۔ تھانے دار نے کہا کہ جب شادی ہوجائے گی تو وہ کتنی دیر غل غپاڑہ کریں گے اور لاحاصل غل غپاڑے کی تمہیں پروا بھی نہیں کرنی چاہیے۔ ہم نے دو بچھڑے ہوئے دلوں کو ملانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو ہم ایسا ضرور کریں گے۔ بصورتِ دیگر کیا میں تم پر حدود آرڈیننس کی فردِ جرم عائد کرکے ایف آئی آر میں لکھ دوں گا کہ تم نشے میں دھت سرِعام فحاشی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ قلم کی مار صرف صحافی کی نہیں ہوتی۔ ہم چاہیں تو اس سے بڑھ کر بھی لکھ سکتے ہیں کہ تم دونوں قابلِ اعتراض حالت میں پائے گئے۔ ثبوت گواہ سب ہماری جیب میں رہتے ہیں۔ صبح شہر میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گے اور تمہارے خاندان کی وہ تو بالکل ہی کٹ جائے گی' ناک۔ اب بولو' تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ وہ جو نادر شاہ نے دلی کے ساتھ کیا تھا یا وہ جو جمہوریت اور انسانی حقوق کا چیمپئن امریکا فی زمانہ عراق کے ساتھ کر رہا ہے؟ مرتے کیا نہ کرتے۔ کوتوال کے حکم پر عقدِ مسنونہ کے لیے تیار ہوگئے۔ کوتوال نے سرکاری اہلکاروں کو حکم دیا کہ آج تھانے میں رسمِ چھترول کے بجائے نکاح کی تقریب ہوگی۔ اس کا مناسب بندوبست کیا جائے۔ سرکاری اہلکار تعمیلِ حاکم کے لیے دوڑے۔ نصف شب کو ایک نکاح خواں کے گھر چھاپا مارا اور اسے کشاں کشاں اٹھا لائے۔ دو گواہان کہ پیشہ ور تھے اور ہر کیس میں پولیس کی طرف سے پیش ہونے کو وجۂ افتخار جانتے تھے' جائے واردات پر حاضر کیے گئے اور تھانے دار صاحب

نے کمال فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے ملزمان کو رشتہ مناکحت میں باندھ دیا۔ میاں بیوی ہوجانے والوں کے متعلقہ اباؤں کو صبح دم جگا کے تھانے طلب کیا گیا اور تھانے دار کے ساتھ تھانے کے سارے عملے نے انہیں شادی خانہ آبادی پر دلی مبارک باد دی۔ تھانے دار صاحب اس وقت تک نشے میں تھے اور اپنے اس کارنامے پر بہت خوش تھے۔ انہوں نے دلہن کا ہاتھ پکڑا اور ساس کے منصب اعلیٰ پر فائز ہوجانے والی ایک عورت سے کہا کہ لے بھئی' چاند سی ہواب تیرے حوالے۔ اس نے واویلا کیا کہ حضور یہ کیا' میں تو اپنی بہن کی چندے آفتاب چندے ماہتاب دختر نیک اختر کو لانا چاہتی تھی۔ یہ کلموہی بیچ میں کہاں سے آگئی۔ کوتوال نے ڈنڈا بجاکے کہا کہ اب تو اس پر صدقے واری جا ورنہ ہمیں دوسرے طریقے بھی آتے ہیں خوش کرنے کے۔ قصہ مختصر' فریقین اس وقت تو سینے پر صبر کی سل رکھ کے تھانے سے گئے مگر جاتے ہی بادشاہ وقت سے کوتوال کی شکایت کردی۔ اس وقت تک کوتوال کا نشہ اتر چکا تھا۔ اسے اپنی زبردستی کا اندازہ ہوا مگر ایک تھانے دار کا سو فریادی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ صاف مکر گیا کہ اس نے یہ نکاح بزور بازو کرا دیا تھا۔ اس نے کہا کہ میاں بیوی خود مع قاضی برضا و رغبت تھانے میں حاضر ہوئے تھے کہ اپنے سایۂ عاطفت میں ہمارا نکاح پڑھوا دیا جائے کیونکہ باہر اس شرعی فریضے کی ادائیگی میں ہماری جان جانے کا اندیشہ ہے۔ چونکہ دونوں عاقل و بالغ تھے اور اس کار خیر میں قانونی قباحت بھی کوئی نہ تھی اس لیے ہم نے تقریب عروسی حدود تھانہ میں منعقد کرنے کی اجازت دی تو کیا غلط کیا؟ بہی خواہوں نے ظالم سماج کے ان ٹھیکے داروں کو سمجھایا کہ اس ہلاکو خان جیسے تھانے دار سے پنگا نہ لیں ورنہ اس کا کیا ہے زیادہ سے زیادہ معطل ہوجائے گا۔ کب بحال ہوا' یہ تمہیں علم بھی نہ ہوگا۔ اب جو ہونا تھا ہوچکا۔ اور اللہ جو کرتا ہے' بہتر کرتا ہے۔ کیا معلوم اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہو۔ صبر شکر سے کام نہیں لوگے تو پچھتاؤ گے۔ تھانے دار تمہارے سارے خاندان کے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو نادر شاہ نے دلی کے ساتھ کیا تھا یانی زمانے۔"

قمر کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا مگر کمال بڑے موڈ میں تھا۔ اس نے یہ واقعہ ایسے سنایا کہ مجھے بھی ہنسی آئی "یار' وہ تھانہ کہاں ہے؟ مجھے معلوم نہیں تھا ورنہ چلا جاتا۔"

وہ بولا "تجھے تھانے جانے کی کیا ضرورت ہے الو کے پٹھے۔ ہمیں بتا' ہم صبح ہونے سے پہلے تیرا بندوبست نہ کردیں تو کہنا۔"

میں نے کہا "آج تو ہم ایک بار نہیں' دوبار پکڑے گئے۔"

"دوسری بار کس نے پکڑا؟" وہ کچھ حیران ہوا۔

"راہ چلتے ایک نوجوان گلے پڑ گیا کہ تم شاہ عالم ہو۔ میرا ایک کام کردو۔ میں نے بڑی مشکل سے ٹالا۔ قائل وہ پھر بھی نہیں ہوا" میں نے اسے بتایا۔

ساری بات سن کے کمال بھی فکرمند ہوگیا "یہ تو آثار اچھے نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے بھی اصل پریشانی یہی ہے۔ اگر قدم قدم پر مجھے ثابت کرنا پڑا کہ میں شاہ عالم نہیں ناصر عظیم ہوں تو بڑی مشکل ہوجائے گی۔ پہلے یہ تھا کہ میں داڑھی اور مونچھیں لگا کے چہرہ بدل لیتا تھا' اب یہ بھی نہیں کرسکتا۔ میں روپوشی بھی اختیار نہیں کرسکتا۔ دنیا کے کام بہرحال نمٹانے ہیں۔"

"یہ مسئلہ تو کھڑا ہوتا رہے گا اور مانا کہ ناصر عظیم کے گواہ بہت معتبر ہیں اور ہر وقت' ہر جگہ حاضر ہوسکتے ہیں مگر دال میں کالا تو ہے۔ کوئی پیچھے پڑجائے تو اسے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کرکے دیکھنا مشکل نہیں ہوگا" کمال بولا۔

میں نے کہا "کیوں۔ وہ کہاں سے لائے گا شاہ عالم کو؟"

پھر ٹیلی فون کی گھنٹی نے مداخلت کی اور کمال نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہاں' خیر سے دونوں بدھو گھر کو آئے" اور ریسیور مجھے تھمادیا۔

دوسری طرف سے رئیس خفا ہونے لگا "ابے یہ کیا مصیبت ہے' آخر تو شرافت سے نہیں رہ سکتا۔"

میں نے کہا "یار' کوئی مجھے رہنے دے تب نا۔ اور اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر میری صورت اللہ میاں نے شاہ عالم جیسی بنادی۔"

"جب تک یہ شاہ عالم کا معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑجاتا' تو آرام سے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔ مجھے دنیا کو فیس کرنا بھی چاہیے۔ منہ چھپانا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

دوسری طرف سے ریسیور نیلم نے لے لیا "مجھے کمال نے بتایا ہے کہ تم دونوں پیدل گئے تھے؟"

"ہاں' ذرا گھومتے پھرتے چلے گئے' باتیں کرتے ہوئے۔"

وہ ناصحانہ انداز میں بولی "تم اچھے خاصے سمجھ دار ہو۔

بھر یہ بچوں جیسی حرکت کس لیے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ کہیں مت آؤ جاؤ مگر ذرا احتیاط سے کام لو۔ خود کو کم سے کم ایکسپوز کرو' میری گاڑی لے لو۔"

"گاڑی میں ایک دو روز میں خرید لوں گا۔"

"بابا' مجھے معلوم ہے' تم ایک نہیں دس گاڑیاں لے سکتے ہو مگر پھر بھی میری گاڑی استعمال کرو۔ بہت سے لوگ اسے پہچانتے ہیں۔ کسی کا دھیان تمہاری طرف نہیں جائے گا۔ اس کے شیشے بھی سیاہ ہیں۔ تم نظر نہیں آؤ گے۔ پھر ہر جگہ تمہارا جانا ضروری نہیں۔ اور جانا ضروری ہو تو گھر سے نکلو اور سیدھے وہاں جاؤ۔ اِدھر اُدھر مت پھرو بلاوجہ۔"

میں نے کہا "یس سر!"

"ابھی کچھ دن تم آرام سے بھی بیٹھ سکتے ہو۔ ایسے کون سے کام ادھورے پڑے ہیں آخر؟"

میں نے پھر کہا "یس سر!"

"میں جانتی ہوں کہ بے کار بیٹھنا تمہارے لیے بہت مشکل ہے اور تمہیں بڑی جلدی ہے۔ ناصر عظیم کے منصوبے شروع کرنے کی۔"

میں نے کہا "یس سر!"

وہ بولتی رہی "لیکن ابھی تم کمال اسپتال کے اندر ہی رہ کے بہت سے کام کرسکتے ہو۔ وہاں لیبارٹری بن رہی ہے اور جو ساز و سامان تم نے عطیہ کیا تھا وہ نصب ہو رہا ہے۔ یہ کام تم اپنی نگرانی میں کراؤ تو کمال کی کافی مدد ہوگی۔"

میں نے چوتھی بار کہا "یس سر!"

وہ خفا ہونے لگی "تم میری بات کو مذاق میں ٹال رہے ہو۔ اب خدا خدا کرکے حالات صحیح نہج پر آئے ہیں تو خدا کے لیے کچھ سیریس ہوجاؤ۔ اپنے لیے اور ہمارے لیے نئی پریشانیاں مت پیدا کرو۔ مہینے دو مہینے میں شاہ عالم کے معاملات ٹھنڈے پڑجائیں گے۔ اس وقت تک احتیاط سے کام لینے کا کہہ رہی ہوں میں۔"

میں نے کہا "یہ تو میں تم سے نہیں کہہ سکتا کہ میرے لیے پریشان ہونا چھوڑ دو لیکن۔"

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم صبح ادھر آجاؤ۔ اس کے بعد میں فیصلہ کروں گی کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔"

"اچھا میری اماں۔ میں ہاتھ جوڑ کے مانتا ہوں کہ میں ایک ناسمجھ بچہ ہوں۔ کل سے وہی ہوگا جو تم چاہوگی" میں نے کہا۔

"میں نے ایک نئی بات سوچی ہے ناصر!"

"وہ کیا؟"

"تم صبح آؤ پھر بتاؤں گی" وہ بولی۔

"صبح تک میں کوئی نئی حماقت نہ کر بیٹھوں۔ ابھی بتادو۔"

وہ بولی "تم برا مان رہے ہو۔ دیکھو ناصر! مجھے اپنی پریشانی کی کوئی فکر نہیں مگر یہ جو مجھے ذرا ذرا سی بات پر ان پولیس افسروں کو مدد کے لیے فون کرنا پڑتا ہے نا' یہ مجھے گراں گزرتا ہے۔"

میں نے واقعی برا مان کے کہا "اچھا آئندہ نہیں کہوں گا تم سے۔"

"تم سمجھتے نہیں ناصر۔ ایک تو میں ویسے ہی ایکٹریس ہوں۔ لاکھ اہم سہی مگر میری اوقات تو کچھ بھی نہیں۔ اہم ہوتا ہے سیاست کا کوئی مہرہ۔ کوئی بیورو کریٹ' یہ معمولی حیثیت کے انتظامی افسران میرا کام اس لیے نہیں کرتے کہ وہ مجھ سے ڈرتے ہیں یا میری عزت کرتے ہیں' وہ مجھ پر مہربانی کرتے ہیں تاکہ مجھ سے مہربانی طلب کرسکیں۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات کو؟"

میں نے کہا "آئی ایم سوری! یہ بات مجھے بہت پہلے سمجھ لینی چاہیے تھی۔"

وہ بولی "تمہارے لیے میں کسی بھی انتہا تک جاسکتی ہوں ناصر! میں کسی بات میں بے عزتی محسوس کرکے تذبذب کا مظاہرہ نہیں کروں گی مگر میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ ان لوگوں کی ذہنیت کیا ہوتی ہے۔ زبان خلق مجھے جو چاہے کہے۔ میں پروا نہیں کرتی مگر ان سب کی نظر میں جو میرے اپنے ہیں اور خود میری نظر میں' مجھے عزت ملنی چاہیے۔ آخر تم مجھے اپنی بڑی بہن کی جگہ سمجھتے ہو' سمجھتے ہو یا نہیں؟"

میں نے کہا "جتنی عزت میں تمہاری کرتا ہوں' کسی اور کی نہیں کرتا۔"

"پھر وعدہ کرو مجھ سے کہ محتاط رہوگے؟"

"میں وعدہ کرتا ہوں" میں نے کہا۔

"اچھا شب بخیر۔ اب سوجاؤ اچھے بچوں کی طرح۔ صبح ملاقات ہوگی" اس نے فون بند کردیا۔

اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ میں نے حساب لگایا تو لندن میں رات نو بجے کا وقت تھا۔ اگرچہ امکان کم تھا کہ سونی اور عاقل گھر پر ملیں مگر میں نے عاقل کا لندن کا نمبر ملالیا۔ ڈیڑھ گھنٹی کے بعد ہی ریسیور اٹھالیا گیا اور میرے کانوں میں عاقل کی "ہیلو" کی آواز آئی۔

میں نے کہا "ہم تمہارے قائم مقام سسر محترم بول رہے ہیں۔"

وہ خوش ہوکے بولا "السلام علیکم سسر صاحب! خوب فون کیا آپ نے۔"

میں نے کہا "میں تو ڈر رہا تھا کہ پتا نہیں تم اس وقت ملو نہ ملو۔"

وہ بولا "ہم واقعی نہ ملتے' بس ایک اتفاق ہے کہ ہم جا نہیں سکے ورنہ اچھے بھلے ڈنر کے لیے باہر جا رہے تھے۔"

"پھر گئے کیوں نہیں؟"

"اجی حضرت' کیا عرض کروں۔ میں نے تو شادی کی تھی یہ دیکھ کر کہ ساس سسر یا نند بھاوج کا جھگڑا کوئی نہیں۔ پہلے تو سسر کے عہدے پر آپ فائز ہوگئے بلکہ قابض ہوگئے۔ رہی سہی کسر اس بڑھیا لینڈ لیڈی نے پوری کردی۔ اس نے سونی کو بیٹی بنالیا بیٹھے بٹھائے۔ حالانکہ اچھا بھلا میرے جیسا ہمہ صفت بیٹا دستیاب تھا۔ اب ہر وقت بڑی بی کا لیکچر چلتا ہے۔ ہر معاملے میں بیٹی کی طرف داری۔ اب میں ولایت میں ہوں تو کیا' ہوں تو ایک خالص پاکستانی شوہر۔ کیا مجھے بیوی پر ظلم اور زیادتی کرنے کا حق حاصل نہیں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ادھر ہم نے کسی بات پر لڑنا شروع کیا ادھر ساس حاضر ایک جانبدار ریفری بن کے۔ فوراً بیٹی کی طرف داری شروع۔ بات سنے بغیر۔ قسم خدا کی' لڑنے کا بالکل مزہ نہیں آتا۔ بس میں لحاظ کرجاتا ہوں ورنہ صاف کہہ دوں کہ چل نکل بڑھیا' ہمیں ڈھنگ سے لڑنے بھی نہیں دیتی۔ لڑیں گے نہیں تو زندگی کیسے گزرے گی۔"

میں نے کہا "کہیں باہر جاکے لڑلیا کرو۔"

وہ بولا "کیا کروں یار۔ ایک تو مجھے لڑنا نہیں آتا۔ سونی ماہر ہے اس کام میں۔ کسی وجہ کے بغیر بھی لڑ سکتی ہے بلکہ ہمیشہ بے وجہ ہی لڑتی ہے ماشاءاللہ۔"

"تم الزام لگا رہے ہو میری چھوٹی سی بھولی بھالی بہن پر؟"

"ہاں۔ تم اسے بتادو' پھر دیکھو کیا زبردست وجہ بنتی ہے لڑائی کی۔ خیر ہماری چھوڑو' اپنی سناؤ۔"

میں نے کہا "یہاں بفضلِ خدا سب خیریت ہے۔ زندگی معمول کے مطابق گزر رہی ہے۔"

"خیر' یہ تو مت کہیں آپ۔ میں اتنا لاتعلق اور بے خبر بھی نہیں ہوں وہاں کے معاملات سے۔ پاکستان کے اخبارات سب ملتے ہیں۔"

"پھر تو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔"

"ضرورت کیسے نہیں۔ آخری اہم اطلاع یہ تھی کہ شاہ عالم پولیس کی تحویل سے فرار ہوگیا۔"

"اس خبر میں کوئی صداقت نہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "تو کیا تم ابھی تک پولیس کی حراست میں ہو؟"

"میں تو ناصر عظیم ہوں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "پولیس نے پکڑا تھا شاہ عالم کو۔ تین دن اپنے پاس آرام سے رکھا پھر ملک رب نواز کے حوالے کردیا کہ اب آپ اپنے معاملات طے کرلیں۔ اس نے اپنے گھر کے تہ خانے میں رکھا تھا بڑے سخت حفاظتی انتظام کے ساتھ مگر شاہ عالم کو موقع مل گیا مار دھاڑ کرکے نکل جانے کا۔ اس کے بعد سے وہ غائب ہے۔"

"چلو اچھا ہے۔ خدا کرے اب تمہارا اس سے کبھی واسطہ نہ پڑے۔ یہ بتاؤ' تم لندن کب آرہے ہو؟"

میں نے حیرانی سے کہا "ابھی تو ایسا کوئی پروگرام نہیں۔"

"مجھے ملنے والی اطلاع کے مطابق تم سب لوگ اسی ہفتے میں لندن پہنچ رہے ہو' میری آج ہی رئیس سے بات ہوئی تھی۔"

میں نے بات سمجھ کے کہا "وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں کہ میں نے براہِ راست گھوڑے کے منہ سے سنا ہے۔ تو یہ خود دولھا میاں نے فرمایا ہے؟"

"ہاں' تمہیں نہیں معلوم؟"

"یہ پروگرام آج ہی بنا ہوگا۔ ابھی نیلم کہہ رہی تھی کہ صبح آؤ تو ایک بات بتاؤں گی' وہ یہی بات ہوگی۔"

وہ بولا "میں نے سارا سسپنس ختم کردیا۔"

"مجھے خود ہی سمجھ لینا چاہیے تھا۔ وہ لندن جارہے تھے شادی کے لیے جب میں نے انہیں کراچی میں پکڑلیا تھا اور واپس لاہور لے گیا تھا۔ اس کے بعد کچھ ایسے معاملات بگڑگئے کہ ان کا پروگرام خود بخود مؤخر ہوتا چلا گیا۔"

"یہ شادی میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

"آجائے گی' میں تو دنیا کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں۔"

"یہ شادی چلے گی؟" وہ بولا۔

"بے وقوفی اور جہالت کی بات زہر لگتی ہے مجھے۔ یہ شادی چلے گی نہیں دوڑے گی۔ ہم سب سے زیادہ خوش رہیں گے وہ' تم دیکھنا۔"

"سونی نے تو جب سے سنا ہے' اس کی نیند بھوک اڑگئی ہے۔ اتنی ایکسائیٹڈ ہے کہ اور کوئی بات ہی نہیں کرتی۔"

"وہ خود ہے کہاں؟"

"اوپر۔ اپنی اماں کے پاس اور کہاں۔ ورنہ اتنی دیر سکون سے بات کرسکتا تھا میں؟"

میں نے کہا "ان معاملات کا کیا ہوا؟"

"میں ادھر ہی آرہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے ایک راستہ تو نکال لیا ہے۔ اسمگلرز کے گروہ کے ایک رکن سے رابطہ ہوگیا تھا۔ اس نے کہا کہ میں معلوم کرکے بتاؤں گا۔ دراصل ان کے بھی آپس میں لنک ہوتے ہیں۔ اسمگلنگ کا پورا نظام انتہائی مضبوط اور مربوط ہے۔ سب کے علاقے بٹے ہوئے ہیں اور راستے مقرر ہیں۔ اب یہ دیکھنا پڑے گا کہ برطانیہ سے پاکستان کی طرف کون سامان لے جاسکتا ہے۔ یہاں کے قوانین اس معاملے میں بہت سخت ہیں۔ نوادرات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا منشیات کی اسمگلنگ سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ہیروئن تو چھپائی جاسکتی ہے۔ نوادرات کو ایسے نہیں چھپایا جاسکتا۔ خیر نکل آئے گی کوئی صورت۔"

میں نے کہا "جرائم پیشہ لوگوں کے بارے میں تو مشہور ہے کہ وہ شریف آدمی سے زیادہ قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ کسی کی نیت خراب ہوتے دیر نہیں لگتی اور جب کام ہی غیر قانونی ہو تو شرافت کیسی۔ مال جس کے حوالے کیا جائے' وہی غائب ہوجائے تو میں یا تم کیا کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم صبر کرسکتے ہیں۔"

وہ بولا "میں بھی ایسے آنکھیں بند کرکے مال کسی کو نہیں دوں گا۔"

"پھر کیا کروگے۔ ضمانت طلب کروگے۔ سیکیورٹی ڈیپازٹ لوگے۔ اس طرح نہیں ہوتا اس طرح کے کاموں میں۔"

عاقل نے کہا "تم نے بھی کوئی بندوبست کیا ہے؟"

"مجھے کیا کرنا ہے؟"

"یار' مال وصول کرکے کہاں لے جاؤ گے' کہاں رکھو گے اور سب سے بڑی بات یہ کہ چوری ہوجانے والا مال حکومت پاکستان کو واپس کیسے کروگے۔ کیا بتاؤ گے کہ یہ مال تمہیں کہاں سے ملا اور کیسے ملا؟ اصول تو یہ ہے کہ چور وہی جس کے پاس سے چوری کا مال برآمد ہو۔"

میں نے کہا "دنیا میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل نہ ہو۔"

وہ ہنسا "مسئلۂ کشمیر کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

مگر میرے جواب میں کچھ عرض کرنے سے پہلے ہی سونی لائن پر آگئی اور شور مچانے لگی۔ "کیا ہے یہ سب آخر بھیا! آپ نے کیا ایکٹیویٹی شروع کر رکھی ہے وہاں اور کچھ بتاتے بھی نہیں۔ میں اخبار دیکھ دیکھ کے پریشان ہوتی رہتی ہوں۔"

میں نے کہا "اخبار والے ایسے ہی لکھتے رہتے ہیں۔ تو فکر مت کیا کر۔ مجھے کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"فون کرنا تو آپ بھول ہی گئے ہیں۔ مجھے اکیلا چھوڑدیا ہے یہاں۔"

میں نے کہا "عاقل خان ہیں نا تیرے ساتھ۔"

"نہیں بھیا۔ آپ سب لوگوں سے دور رہنا بہت مشکل ہے میرے لیے۔"

میں نے کہا "لاکھوں پاکستانی رہتے ہیں لندن میں۔"

"رہتے ہوں گے' میں کسی کو نہیں جانتی۔"

میں نے کہا "پریشان مت ہو۔ بس اب چند روز میں ہم سب تیرے ساتھ ہوں گے۔ میں اور چندا' رئیس اور نیلم یعنی دولھا دلہن۔"

"کیا یہ خبر سچ ہے بھیا!"

میں نے کہا "مجھے کیا معلوم تیرا میاں سچا ہے کہ جھوٹا۔ مجھے تو اسی نے بتائی ہے یہ بات۔ ویسے شادی کنفرم ہے۔"

"پھر تو بڑا مزہ آئے گا۔ ہم خوب ہلا گلا کریں گے لیکن بھیا!"

میں نے کہا "لیکن کیا؟"

"کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ شادی لندن میں نہ ہو۔ اپنے پاکستان میں ہی ہو۔ یہاں تو پھر ویسی ہی شادی ہوگی جیسی ہماری تھی۔ نہ گانا بجانا' نہ شور شرابا اور نہ باجا گاجا۔ لوگ بھی وہی چار ہوں گے۔ کیوں نہ ہم لاہور آجائیں اور وہاں روایتی انداز میں دھوم دھام کی شادی ہو۔"

میں نے کہا "اور عین نکاح کے وقت پولیس آجائے سونی کو پکڑلے۔"

"سونی' اب کسے یاد ہے' ویسے بھی میں اب بیگم ہوں۔ مسز عاقل۔ لندن سے آؤں گی تو کسی کی مجال ہے جو مجھے سونی کہے۔ میں ثابت کرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا "فضول باتیں مت کرو۔ ثابت کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے دیکھ' میں کب سے ثابت کرنے کی کوشش کررہا ہوں کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں' ناصر عظیم ہوں مگر جس دلدل میں خود میں نے مجبوری میں قدم رکھ دیا تھا' اس سے باہر نکلنا اب میرے لیے کتنا مشکل ہورہا ہے۔ تجھے تو کوئی مجبوری نہیں پھر کیا ضرورت ہے خود کو اس عذاب میں

ڈالنے کی جس سے میں دن رات دوچار ہوں۔ دہری زندگی گزارنے کی جو سزا مجھے ملی ہے' وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میری واپسی بھی اب میرے اختیار میں نہیں رہی۔ پھر تو کیوں ایسا سوچتی ہے۔ واپسی کے راستے کی طرف تجھے غلطی سے بھی نہیں دیکھنا ہے۔ خدا نے تجھے ایک نئی زندگی گزارنے کا جو موقع دیا ہے اس پر خدا کا شکر ادا کر۔ اور سوتی کے سائے سے' اس کے تصور سے اور خیال سے بھی خود کو دور رکھ۔ چل چھوڑ یہ باتیں' یہ بتا تو دن بھر کیا کرتی ہے؟"

"ابھی تو کچھ بھی نہیں کر رہی ہوں۔ بس گھر سیٹ کر رہی ہوں۔ عاقل نے ایک بڑی بی کو لگا دیا ہے میرے پیچھے۔ جیسے بچوں کی گورنس نہیں ہوتی' وہ ایسے ہی صبح سے شام تک میرے ساتھ رہتی ہے اور مجھے انگریزی سکھاتی ہے۔"

میں نے کہا "وہ تو سکھاتی ہے' تو سیکھتی ہے یا نہیں؟"

"اب آپ آئیں گے تو خود ہی دیکھ لینا" وہ ہنسی۔

یہ کوئی پون گھنٹے کی کال تھی۔ جب میں نے ریسیور رکھا تو دیکھا کہ کمال کو نیند آ گئی ہے۔ قمر اس سے پہلے ہی اپنے بچے کو سلاتے سلاتے خود سو گئی تھی۔ میں نے ایک چادر اٹھائی اور سونے کے لیے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے ایک صوفے کے کشن کا تکیہ بنایا اور قالین پر دراز ہو گیا۔ میرے خیالات چند منٹ لاہور اور لندن کے درمیان بھٹکتے رہے پھر تھکن اتنی تھی کہ نیند مجھ پر غالب آ گئی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو دن خاصا نکل آیا تھا۔ کمال تو معمول کے مطابق ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کے آٹھ بجے اسپتال پہنچ گیا تھا۔ قمر گھر کے کام کاج میں لگی ہوئی تھی اور میرے جاگنے کے انتظار میں تھی۔

مجھے دیکھتے ہی بولی "اٹھ گئے آپ بھائی۔ میں تو سمجھی دوپہر تک سوتے رہو گے۔ ناشتا بھی نہیں کرو گے۔"

میں نے کہا "تو نے ناشتا کیا ہے یا نہیں؟"

وہ شرارت سے ہنسی "میں نے کیا' اس نے بھی نہیں کیا ہے' چندا نے۔"

"چندا آج اسپتال نہیں گئی؟"

قمر ہنستی رہی "نہیں بھائی' آج موڈ نہیں بنا اس کا۔"

"تو اس میں دانت نکالنے والی کون سی بات ہے؟"

"یہ موڈ والی بات آج ہی کی ہے اس نے ورنہ تو یہ حال تھا کہ بخار میں بھی آرام سے نہیں لیٹتی تھی کہ گھر میں بوریت ہوگی۔ کام میں دل تو لگا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب سے وہ آئی ہے اس نے ایک دن بھی اسپتال مس نہیں کیا بھائی!"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تو کیا ثابت کرنا چاہتی ہے۔"

"بھائی' جو مجھے معلوم ہے' وہ ثابت کرنے کی ضرورت ہی نہیں" اس نے آخری دھلا ہوا کپڑا الگنی پر پھیلا دیا۔

میں نے کہا "چندا اب اسپتال چھوڑ دے گی۔ یہ جگہ بھی چھوڑ دے گی" میں نے کہا۔

"پھر کہاں جائے گی' کیا کرے گی بھائی؟"

میں نے کہا "ذمے داری وہ میری سنبھالے گی۔ رہائش کا انتظام اس کے لیے میں نے کر دیا ہے۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کے اندر چل پڑی "میں تو کہتی ہوں بھائی' دو بول بھی پڑھوا ہی لو تاکہ تمہارا کام ہی کیا وہ تمہیں بھی سنبھال لے۔"

میں نے کہا "میرا بھی وہی حشر کرنا چاہتی ہے تو جو ڈاکٹر کمال فاروقی کا ہوا۔ اچھا بھلا آدمی تھا میرا دوست۔"

"تو اب کیا ہے؟"

میں نے کہا "دھوبی کا کتا۔ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ گھر میں ہو تو اسپتال کی فکر اور اسپتال میں رہے تو گھر کا خیال۔"

"بھائی' گھر کی کوئی فکر نہیں انہیں۔ گھر چل رہا ہے چوبیس گھنٹے اسپتال ہے بس۔"

میں باتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا "تو شکایت کر رہی ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ کمال ایک مشنری ہے جس نے اپنی زندگی کو ایک مقصد کے لیے وقف کر دیا ہے۔"

"خواہ مخواہ مت ڈانٹو مجھے۔ میں کوئی شکایت نہیں کر رہی ہوں مگر جو ہے سو ہے۔ کمال نے خود پر تو دنیا کے عیش و آسائش کو حرام کر رکھا ہے۔ اپنا سکھ چین سب قربان کر دیا ہے اسپتال پر۔ میں اپنے لیے کچھ بھی نہیں مانگتی۔ بنگلا' کوٹھی' نوکر چاکر۔ زیور کپڑا' ان سب کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں مگر اس بچے کو دیکھ کر میں متفکر ہو جاتی ہوں۔ کیا یہ بھی ایسے ہی رہے گا۔ اسی دو کمروں کے کوارٹر میں۔ گورنمنٹ اسکول میں پڑھے گا جہاں سب عام لوگوں کے بچے پڑھتے ہیں؟ بس سے آئے گا جائے گا۔ کمال کے نزدیک تو قناعت کا یہی تصور ہے۔"

میں نے اسے تسلی دی "ایسا نہیں ہوگا۔ آدمی خود سختی جھیل سکتا ہے' اولاد کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتا۔"

"سوچو بھائی' پانچ کروڑ کا ٹرسٹ تھا جس سے یہ اسپتال چل رہا ہے وہ سب پیسہ کمال کو ملا تھا۔ لیکن اس میں سے اب ہمیں کیا مل رہا ہے' اتنی ہی تنخواہ جتنی دوسرے ڈاکٹر لے رہے ہیں۔ چندا نے اپنا سب کچھ اسپتال کو دے دیا' تم نے ابھی کتنا کیا ہے۔"

"اس کا ذکر مت کر۔"

"ذکر کیسے نہ کروں۔ اسپتال کو ملنے والے ڈونیشن کا کوئی حساب نہیں۔ توسیع کے ساتھ خرچ بڑھتا جا رہا ہے تو آمدنی بھی پہلے سے بہت زیادہ ہو رہی ہے۔ اسپتال کا سب کو خیال ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ وہ جس نے اپنا سب کچھ اسپتال کو دے دیا ہے' اس کے بیوی بچے بھی ہیں۔ تعریف ہوتی ہے ڈاکٹر کمال فاروقی کی' ہماری قربانی کسی شمار میں نہیں آتی۔ ہمیں تو تمغائے خدمت بھی نہیں ملے گا۔"

قمر سخت جذباتی ہو رہی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ اس کی سوچ کا یہ انداز غلط نہیں ہے مگر میں اس کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے شوہر کے سامنے مطالبات کی فہرست لے کر کھڑی ہو جائے۔ شادی سے پہلے خود قمر ایک بوتیک چلاتی تھی اور اس کے پاس اپنے اسمگلر باپ کا چھوڑا ہوا اچھا خاصا پیسہ تھا جو اس نے سب شادی کے بعد کمال کے سپرد کر دیا تھا اور حسب توقع کمال نے وہ بھی ٹرسٹ کے فنڈ میں شامل کر دیا تھا۔ قمر نے جب سے شادی کی تھی مسلسل اپنی قربانیوں کے نتیجے میں ملنے والی تنگ دستی ہی دیکھی تھی۔ شادی کے بعد کچھ عرصے تک محبت میں سب کچھ دے دینے کا جذبہ سرخرو رہا مگر آج دو سال بعد جب وہ صرف ایک ہاؤس وائف اور ایک بچے کی ماں تھی' اس کے احساس محرومی کا شکوہ زبان پر آ گیا تھا۔ شاید قمر خود بھی وہ سب کچھ چاہتی تھی جو وہ بچے کے نام پر مانگ رہی تھی۔

میں نے کہا "قمر' حوصلے سے کام لے۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کمال کو تیری قربانی کا احساس ہوگا۔"

وہ مایوسی سے بولی "کب احساس ہوگا بھائی' پتا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا تو مرنا جینا اسپتال کے لیے ہے۔ بیوی بچوں کی حیثیت تو ثانوی ہے۔"

میں نے کہا "قمر کیا ہو گیا ہے تجھے۔ کیسے بات کر رہی ہے؟ اتنی جلدی گھبرا گئی ہے تو۔ یہ کیوں نہیں سوچتی کہ آخر تو بھی اسپتال کی مالک ہے۔"

"خاک مالک ہوں بھائی۔ ایسے رہتے ہیں اسپتالوں کے مالک۔ شہر میں کتنے ہی اسپتال ہیں۔ ذرا ان کے مالکوں کے ٹھاٹھ باٹ دیکھیں۔"

"وہ سب کمرشل اسپتال ہیں۔ پیسہ کمانے کے لیے کھولے گئے ہیں" میں نے خفگی سے کہا "ان کا کمال اسپتال سے کیا مقابلہ؟"

"آپ تو انہی کی حمایت کریں گے بھائی۔ ان کے دوست جو ہوئے" وہ رونی شکل بنا کے پراٹھے ڈالنے لگی۔ "جائیں جلدی سے نہا لیں' ناشتا بالکل تیار ہے۔"

میں نے قمر کے پاس جا کے اس کے بالوں کو سہلایا۔ "دوست سے زیادہ مجھے اپنی بہن کا خیال ہے۔ تو فکر مت کر' میں بھی بات کروں گا اس سے مگر کہیں تو اس بات کو لے کر گھر میں جھگڑا مت شروع کر دینا۔"

"ایسے جھگڑا کرنے والی ہوتی میں تو اب تک سب ٹھیک کر چکی ہوتی بھائی!" قمر نے اچانک خود کو سنبھال لیا اور دروازے کی طرف دیکھ کے بولی "آؤ۔۔۔ چندا!"

میں نے پلٹ کے چندا کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اچانک میرے ماضی کی حسین یادوں کے البم سے ایک پیکر تصور کی طرح نکل آئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس نے وہ بے داغ سفید لباس پہنا تھا جس میں اس کا ملکوتی حسن پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ نمائی کرتا تھا۔ اس نے سرسراتے ریشم کی سفید شلوار کے ساتھ وہ سفید قمیص پہنی تھی جو اس کے بدن کی دلکشی کو بڑی نزاکت اور دلکشی کے ساتھ ایسے سامنے لاتی تھی کہ دیکھنے والی نظر ایک پُرتقدس سحر میں گرفتار ہو جاتی تھی۔ اس نے سفید دوپٹے کے ساتھ جھلملاتے نگوں والے لمبے لمبے سفید آویزے پہنے تھے جو زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں شرارت سے جھولتے تھے تو مسکراتے ہوئے لگتے تھے۔ سادگی میں پُرکاری کا یہ انداز میرے لیے نیا نہیں تھا مگر میں نے اتنے عرصے بعد چندا کا یہ روپ دیکھا تھا کہ میں مسحور سا کھڑا رہا۔

بالآخر قمر نے مجھے یاد دلایا "آپ نہانے جا رہے تھے بھائی' بھول گئے؟"

میں نے چونک کے خفت سے کہا "ہاں' میں گزرے ہوئے وقت کی ایک نظر نواز تصویر کے نظارے میں گم ہو گیا تھا۔"

قمر نے کہا "آج تو چندا پہچانی نہیں جا رہی۔"

چندا کے چہرے پر ایک حیا آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اب تم دونوں بہن بھائی باتیں ہی کرتے رہو گے یا ناشتے کی فکر بھی کرو گے۔"

میں نے چٹکی بجا کے کہا "تم بیٹھو۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔"

ایک مدت سے چندا نے خود کو روز و شب کی مصروفیات میں بالکل بھلا رکھا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اور اپنی ذات میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ رکھا تھا۔ میں نے اسے جب دیکھا' اسپتال کی اسی بدوضع اور بے رونق نرس کی یونیفارم میں

دیکھا لیکن اسپتال کی ڈیوٹی سے فراغت کے بعد بھی وہ کپڑے ایسی بددلی اور مجبوری کے ساتھ پہنتی تھی کہ زندگی میں اس کی عدم دلچسپی واضح ہوجاتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ کپڑے شوق سے یا آرائش کے لیے نہیں پہنتی بلکہ ضرورتاً جو مل جائے پہن لیتی ہے۔ اس کے کپڑے عموماً بے ترتیب، شکن آلود اور میلے ہوتے تھے۔ لباس کے انتخاب کے معاملے میں وہ پہلے جتنی خوش ذوق تھی، اب اتنی ہی بے پروا ہوگئی تھی۔ اس کے بال بھی سیاہ اور لمبے تھے اور پہلے وہ ان کو بڑے سلیقے سے بناتی تھی مگر وہ وقت بھی آیا جب اس نے بالوں کو توجہ دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔

میری گزشتہ رات کی باتوں کا ردِعمل اب واضح انداز میں سامنے آرہا تھا۔ چندا پھر پرانی چندا بننے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ تھی اور اس نے درمیانی مدت کی تلخ حادثات کو آنے والے وقت میں کوئی جگہ نہ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہ ایک بڑی خوش آئند ابتدا تھی جس کے ساتھ ہی چندا کی خود اعتمادی کا نیا دور شروع ہوگیا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ اسپتال لے گئی اور اسپتال کے توسیعی منصوبے کی تفصیلات بتانے لگی۔ کرنل خان کے ترکے اور چندا کے عطیے سے تعمیر ہونے والا کرنل خان وارڈ ہر طرح سے مکمل ہوچکا تھا اور اس میں سولہ بیڈ زیرِ بچے زیرِ علاج تھے۔ خان اعظم کے نام کی تختی وارڈ کے باہر بڑے نمایاں مقام پر لگی ہوئی تھی۔ چندا کی خواہش پر یہ وارڈ صرف بچوں کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا۔

پھر میں نے لیبارٹری کی بلڈنگ دیکھی جو مکمل ہوچکی تھی مگر اس میں ابھی مشینوں کی تنصیب کا کام چل رہا تھا۔ چندا نے مجھے مختلف شعبے دکھائے جن میں ایکسرے مشین، سی ٹی اسکینر اور ایم آر آئی مشین لگائی جارہی تھی۔ یہ لیبارٹری کا نصف حصہ تھا۔ بقیہ نصف حصے میں بلڈ بینک تھا اور پیتھالوجیکل لیبارٹری تھی۔ یہ حصہ مکمل ہونے کے بعد استعمال کے قابل تھا لیکن فی الوقت اس کا باقاعدہ افتتاح نہیں ہوا تھا۔

"ابھی اس کے لیے عملے کا انتخاب ہو رہا ہے" چندا نے کہا "اس کے بعد ہم خود اپنے دستِ مبارک سے لیبارٹری کا افتتاح کروگے۔"

"میں ان چونچلوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"تمہارے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" وہ بولی۔

میں نے کہا "میں تو اس نمائشی تختی کے بھی سخت خلاف ہوں جس میں میرے نام کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ یہ سب میرا عطیہ کردہ ہے۔"

"یہ سب بھی بے حد ضروری ہے۔ تم نے کبھی گلی محلے میں چندہ جمع کرنے والوں کو دیکھا ہے، وہ کیا کرتے ہیں؟"

"کیا کرتے ہیں؟"

"وہ وصول ہونے والے چندے کا اعلان لاؤڈ اسپیکر پر کرتے جاتے ہیں۔ فلاں صاحب نے اتنی رقم دی ہے۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ فلاں گھر سے اتنا عطیہ موصول ہوا ہے، جزاک اللہ۔ اس سے دوسروں کو تحریک ہوتی ہے۔ کچھ لوگ شرمندگی محسوس کرتے ہیں کہ انہوں نے استطاعت رکھنے کے باوجود کچھ نہیں دیا۔ کچھ لوگ کسی سے مقابلے پر بڑھ کے چندہ دے رہتے ہیں۔ وہی پبلسٹی نام کی تختی سے ہوتی ہے۔ ہر اسپتال میں کسی نمایاں جگہ پر لکھا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر و توسیع میں کس نے کتنی مدد کی۔ اسے دیکھ کر دوسرے پیسے والوں کی غیرت جاگتی ہے۔ ان میں بھی کارِ خیر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "اس فہرست میں سب سے اوپر کمال کا نام ہونا چاہیے۔"

"کمال نے پانچ کروڑ کا ٹرسٹ اپنے والدین کے نام پر قائم کیا تھا۔ جب اسپتال مکمل ہوجائے گا تو ہم داخلے کے مرکزی راستے پر لاؤنج میں یہ تختی لگائیں گے کہ یہ اسپتال کس کے عطیے سے قائم ہوا۔ اس میں ظاہر ہے کمال کے والدین کا نام آئے گا۔ اس کے بعد کرنل خان کا نام آئے گا پھر تمہارا۔"

"اس میں قمر کا نام بھی آنا چاہیے اور تمہارا بھی۔"

"بالکل آئے گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے DONORS ہیں۔ ہم نے ایک اصول بنایا تھا کہ ایک لاکھ سے اوپر عطیہ دینے والے کا نام اس فہرست میں ڈسپلے کیا جائے۔"

"تم نے میری تجویز کے بارے میں کچھ سوچا؟"

وہ چلتے چلتے رک گئی "میں نے تمہارا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"یہ تو اتنی بڑی خوش خبری ہے کہ جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے ایک محاورے کے مطابق تمہارے ساتھ کوئی بدتمیزی کروں" میں نے خوشی سے بے قابو ہو کے کہا۔

اس کا چہرہ گلابی ہوگیا "یاد ہے نا بدتمیزی کی سزا کیا ہوتی تھی؟"

میں نے کہا "میں تو بھول ہی گیا ہوں جوڈو کراٹے کے سارے داؤ پیچ!"

"میں خود آؤٹ آف پریکٹس ہوں" وہ میرے ساتھ چل پڑی۔

"وہ بھی کیا وقت تھا جب خان اعظم خود ہمیں ٹریننگ دیتے تھے اور اپنی نگرانی میں ہمارے درمیان مقابلہ کراتے تھے۔"

چندا کے چہرے پر اُداسی جھلکنے لگی "چلو کسی بہانے تم نے انہیں یاد تو کیا۔"

میں نے کہا "آج میں جو کچھ بھی ہوں انہی کی وجہ سے ہوں۔ میری ساری کامیابیاں انہی کی مرہونِ منت ہیں۔ میں انہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔"

"تم جب سے آئے ہو، ایک بار بھی ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لیے نہیں گئے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "آج ضرور جاؤں گا۔"

لیبارٹری کے اندر ایک نمناک ٹھنڈک تھی، ہر طرف چھلی ہوئی لکڑی کے چھلکے پھیلے ہوئے تھے۔ فرش پر موزیک کا ڈیزائن نمایاں کرنے کے لیے گھسائی ہوئی تھی۔ اس کا سفید میالا سا کیچڑ پانی کے ساتھ باہر جمع ہوگیا تھا۔ دروازوں اور دیواروں پر رنگ و روغن کا کام آخری مراحل میں تھا۔ ایک کارپینٹر کھڑکیوں، دروازوں میں لاک اور ہینڈل وغیرہ فٹ کررہا تھا۔ الیکٹریشن ہر کمرے میں سوئچ بورڈ فٹ کررہے تھے۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا جیسے ایک ہفتے میں یہ سارے کام ختم ہوجائیں گے۔ چندا جہاں سے بھی گزری، کام کرنے والے مؤدب ہوگئے۔ چند ایک نے اسے ہاتھ اٹھا کے سلام بھی کیا اور اس نے ایک دو جگہ رک کے کام کرنے والوں کو ہدایات بھی دیں جس سے یہ ثابت ہوا کہ اس کام کی نگرانی براہِ راست چندا ہی کررہی تھی۔

باہر آکے میں نے کہا "تم نے اسپتال چھوڑ دیا تو کمال کے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔ تم نے اس کا کافی کام سنبھال رکھا تھا۔"

"اس کا اصل کام تو کوثر نے اور اس کے شوہر نے سنبھال رکھا ہے۔ میرے جانے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ آہستہ آہستہ کمال کے ساتھ مخلص اور DEVOTED ساتھیوں کی پوری ٹیم جمع ہوگئی ہے۔ ہر ایک اپنا کام ذمے داری سے کرتا ہے۔ کسی کو نگرانی کی یا کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

"تمہیں کسی کو چارج دینا ہوگا؟"

"میرے ذمے کوئی مخصوص شعبہ نہیں تھا۔ جیسے کوثر کے سپرد دوائیں، ان کی وصولی، خرید اور تقسیم کے سارے کام ہیں۔ وہ اسٹور کی نگراں ہے، اس کا شوہر جارج باہر کے سارے کام دیکھتا ہے۔ ایمبولینس کی مرمت، بلڈنگ کی دیکھ بھال، چیزوں کی خریداری، انتظامی امور براہِ راست کمال کے پاس ہیں۔ میں سب کی مددگار تھی، جس نے جو کہا کردیا۔"

"پھر بھی تم رسماً تو کمال کو مطلع کروگی؟"

"ہاں، اسے بتادوں گی کہ میں اسپتال میں کام نہیں کرسکتی۔ ویسے وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔"

میں نے کہا "وہ تمہاری بھلائی کے لیے ایسا سوچتا تھا۔ تم کچھ عرصہ اور اسی ماحول میں گزارتیں تو زیادہ بیمار ہوجاتیں۔"

چندا مسکرائی "تمہارا مطلب ہے ذہنی طور پر۔ جسمانی طور پر تو میں ٹھیک ہوں۔"

یہ وقت اسپتال میں آؤٹ ڈور مریضوں کے لیے تھا۔ او پی ڈی کے شعبے میں روز کی طرح مفت علاج کی سہولت حاصل کرنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک آٹھ دس ڈاکٹرز اور لیڈی ڈاکٹرز عام قسم کی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کو دیکھتے تھے اور انہیں دوائیں لکھ کردیتے تھے جو اسپتال کی ڈسپنسری یا اسٹور سے انہیں بلامعاوضہ مل جاتی تھیں۔

آنے والوں میں اکثریت غریبوں کی تھی جو تانگے، رکشے یا بس ویگن سے وہاں پہنچتے تھے۔ کوئی کسی کی کار میں یا ٹیکسی میں آتا تھا تو چوکیدار گاڑی کو اندر جانے دیتا تھا مگر مریض کو اتارنے کے بعد گاڑی کو واپس باہر جانا پڑتا تھا کیونکہ اسپتال کے احاطے میں اتنی بڑی فاضل جگہ نہیں تھی جہاں کار پارکنگ ایریا بنایا جاسکتا۔ لیبارٹری اور ڈائیگنوسٹک سینٹر کے لیے پچھلے حصے میں جگہ نکالی گئی تھی۔ سامنے کی طرف اب مشکل سے اتنی جگہ بچی تھی کہ وہاں دو نئے وارڈ بنالیے جائیں۔ اگر درمیان کے باغ کو بھی ختم کردیا جاتا تو دو اضافی وارڈوں کے لیے گنجائش نکل آتی۔ اسپتال کے لیے مستقبل میں بہت سے توسیعی منصوبے تھے جن کے لیے اضافی فنڈز ہی نہیں مزید زمین بھی درکار تھی۔

ہم سامنے والے حصے میں پہنچے تو مجھے نیلم کی گاڑی نظر آئی جو آفس کی سائڈ میں کھڑی تھی۔ رئیس گاڑی کے ساتھ آیا تھا اور اندر کمال کے دفتر میں میرا انتظار کررہا تھا۔ خلافِ معمول وہ سنجیدہ تھا۔

"کیا کررہا ہے تو؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "کوئی خاص کام نہیں، ویسے کام بہت ہیں۔"

"تو چل میرے ساتھ۔"

میں نے کہا "کہاں۔ میرا خیال تھا کہ آج چندا کو اپنے آفس دکھاؤں۔ چندا نے اسپتال چھوڑ دیا ہے۔ یہ اب میرے ساتھ کام کرے گی۔"

"بڑی اچھی بات ہے" رئیس بولا "مگر ابھی تجھے میرے ساتھ جانا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ چندا کے سامنے کوئی بات کرنے سے گریز کر رہا ہے۔ "کوئی حرج ہے اگر چندا بھی ساتھ چلے؟"

"حرج تو کوئی نہیں۔ مگر فائدہ بھی کوئی نہیں۔ یہ بلاوجہ پریشان ہوگی" رئیس نے کہا۔

چندا خود بھی بیک آؤٹ کر گئی۔ "میرا خیال ہے کہ آج میں یہاں کے معاملات سے نمٹ لوں۔"

میں نے کہا "اپنی پیکنگ بھی شروع کردو۔ آج نہیں تو کل تمہیں یہ کوارٹر چھوڑ کے میرے ساتھ جانا ہوگا۔"

"اس کی اتنی جلدی کیا ہے؟" چندا نے کہا اور رئیس مسکرانے لگا کیونکہ مدعا کچھ اور ہونے کے باوجود ہمارے کہے ہوئے الفاظ کا مطلب کچھ اور نکلتا تھا۔ چندا جھینپ کر دوسری طرف چلی گئی اور میں رئیس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"تیری صورت پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟ کیا ہونے والی بیوی نے صبح صبح جُتے سے تواضع کی ہے۔"

وہ بگڑ کے بولا "بکواس مت کر۔ یہ سب تیری وجہ سے ہو رہا ہے سالے!"

میں نے کہا "کیا نیلم ابھی تک کل رات کی بات پر برہم ہے؟"

وہ بولا "نیلم کو کچھ نہیں ہوا۔ تجھے کچھ شبنم کی خبر ہے؟"

میں نے کہا "اتفاق ہے کہ کل سے میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں۔"

"اتفاق کے بچے۔ وہ اسپتال میں داخل ہے۔"

میں چونک پڑا "اسپتال میں۔۔۔ کیوں؟"

"وہ ڈاکٹر عائشہ کے نفسیاتی اسپتال میں داخل ہے۔"

"تو مجھے بتاتا کیوں نہیں کہ اسے کیا ہوا ہے؟"

"قسم اللہ کی پیارے' مجھے معلوم ہوتا تو تجھے ضرور بتاتا۔"

میں نے کہا "تجھے یہ کیسے پتا چلا کہ شبنم ڈاکٹر عائشہ کے نفسیاتی کلینک میں زیر علاج ہے؟"

"یار' فون کیا تھا ڈاکٹر عائشہ نے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ نے کسے فون کیا تھا؟ اس کے پاس نیلم کا نمبر نہیں تھا اور وہ کسی ناصر عظیم کو نہیں جانتی۔"

رئیس سوچ میں پڑ گیا "یار' میری اس سے بات نہیں ہوئی تھی۔ فون آیا تھا گھر پر اور بات کی تھی بانو خالہ نے۔ پتا نہیں ان سے کسی نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "عائشہ نفسیاتی اسپتال سے فون آنے کا لازمی مطلب یہ تو نہیں کہ خود ڈاکٹر عائشہ نے ہی فون کیا تھا۔"

"پتا نہیں یار۔ کسی نے بانو خالہ کو پیغام دیا کہ یہ بات نیلم کو فوراً بتادی جائے۔ انہوں نے اسٹوڈیو میں فون کردیا۔ نیلم کی ان سے بات ہوئی۔ پھر نیلم نے مجھ سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے ڈاکٹر عائشہ کا نفسیاتی کلینک کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے معلوم ہے۔ وہ بولی کہ شبنم وہاں داخل ہے۔ تم فوراً چلے جاؤ اور فون کرنے کی ضرورت نہیں' جاتے ہوئے ناصر کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں نے نیلم سے پوچھا تھا کہ شبنم کو کیا ہوا ہے تو اسے بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ کیونکہ بانو خالہ کو کچھ پتا نہیں تھا۔ ابھی چل کے دیکھ لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "رئیس۔ میں وہاں نہیں جاسکتا۔"

"کیوں نہیں جاسکتا؟"

"ابے گھامڑ! ڈاکٹر عائشہ مجھے شاہ عالم سمجھتی ہے۔ جب کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ میرا شبنم سے کیا تعلق؟"

رئیس گرم ہوگیا "تو کیا سمجھتا ہے سالے۔ ڈاکٹر عائشہ تیری شکل دیکھتے ہی پولیس کو فون کردے گی۔"

میں نے کہا "شاہ عالم کے فرار کی خبر اس نے بھی پڑھی ہوگی۔"

"مگر وہ اسپتال میں پولیس کو نہیں بلائے گی۔"

میں نے کہا "نہیں رئیس۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ تو جا کے شبنم کو دیکھ آ۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھتا ہوں۔"

میری بات رئیس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے گاڑی کو باہر کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار میں کھڑا کیا اور اسپتال کے اندر چلا گیا۔ جیپ کے شیشے اس حد تک سیاہ تھے کہ باہر سے مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ جب تک کوئی قریب آکے اور شیشے سے ناک لگا کے نہ دیکھتا' مجھے پہچان نہیں سکتا تھا۔

میرا ذہن شبنم کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ ابھی گزشتہ روز وہ میرے ساتھ تھی تو بالکل نارمل تھی پھر اچانک اسے کیا ہوگیا تھا؟ میں بار بار کلائی کی گھڑی کو اور اس گیٹ کو دیکھتا رہا جس سے رئیس اندر گیا تھا۔ اندر سے مریضوں کی اور ان کے تیمارداروں کی آمد و رفت جاری تھی۔ دس منٹ بعد ایک ایمبولینس باہر آئی

اور خاموشی سے ایک طرف چلی گئی۔ میں انتظار کے ہر لمحے کو ایک گھڑی کی طرح کاٹتا رہا اور پریشان کن خیالات کی یلغار سے الجھتا رہا۔

باہر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ وقفے وقفے سے سڑک کے کنارے ترچھی کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کوئی گاڑی نکلتی تھی تو فوراً ہی اس کی جگہ دوسری گاڑی لے لیتی تھی۔ رئیس نے گاڑی کو قطار کے آخر میں کھڑا کیا تھا اور کسی حد تک ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی کیونکہ گاڑی اس حد سے آگے کھڑی تھی جہاں "نو پارکنگ" کا بورڈ نظر آرہا تھا۔ بورڈ پر بنا ہوا تیر کا نشان یہ ظاہر کرتا تھا کہ گاڑیاں بورڈ کے دائیں طرف کھڑی کی جاسکتی ہیں۔ بائیں طرف نہیں۔ لیکن تقریباً ایسے ہر بورڈ سے آگے گاڑیاں موجود تھیں۔ پارکنگ کی جگہ نہ ملنے کے باعث لوگ بورڈ کو نظر انداز کردیتے تھے اور مقررہ حد سے آگے گاڑی کھڑی کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں ٹریفک پولیس کا کوئی افسر بھی نہیں تھا کہ خلاف ورزی پر چالان کا خطرہ ہوتا۔

ابھی میں یہ جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک ٹریفک سارجنٹ نمودار ہوگیا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل بالکل گاڑی کے برابر لا کے روکی اور اس گاڑی کی طرف بڑھ گیا جو میرے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی مقررہ حد سے آگے تھی لیکن اس میں ایک ڈرائیور ٹائپ شخص بیٹھا ہوا تھا۔ بند شیشوں سے میں ٹریفک سارجنٹ اور ڈرائیور کے درمیان ہونے والی بحث کو صرف دیکھ سکتا تھا۔ سارجنٹ بار بار ٹریفک سائن کی طرف اشارہ کرتا تھا اور ڈرائیور معلوم نہیں اپنے دفاع میں کیا دلیل دیتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی کوئی بھی دلیل وزن نہیں رکھتی تھی۔ اس نے واضح قانون شکنی کی تھی اور اب کوئی وجہ اس حرکت کا جواز فراہم نہیں کرسکتی تھی۔

مجھے اب اپنی فکر لاحق ہونے لگی تھی کیونکہ اتنے قریب آکے سارجنٹ نے مجھے اندر بیٹھا دیکھ لیا تھا۔ اس کی نظر بار بار میری طرف اٹھتی تھیں اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ ٹھہر جاؤ بچو! ابھی آتا ہوں تمہاری طرف بھی۔

بالآخر یہی ہوا۔ پہلی گاڑی کے ڈرائیور نے مجبور ہوکے کُٹ مُکا کرلیا تھا کیونکہ سارجنٹ نے اس کا چالان نہیں کیا تھا۔ ڈرائیور کی صورت کے تاثرات کچھ ایسے تھے جیسے اس کو مجبوری میں کڑوا کریلا چبا کے نگلنا پڑا ہوا اور سارجنٹ کے ہونٹوں پر ڈھٹائی سے بھرپور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

اس نے آہستہ سے کھڑکی کے شیشے پر دستک دی اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے پاور ونڈو کا بٹن دبا کے شیشہ تھوڑا سا نیچے کیا اور پوچھا "کیا بات ہے؟"

"بات بھی بتائیں گے شہنشاہو۔ ذرا باہر تشریف لاؤ" سارجنٹ نے چالان بک پھر نکالتے ہوئے کہا۔

اب انکار کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ ابھی تک سارجنٹ نے میرا چہرہ دیکھنے کے باوجود کسی شناسائی کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے سامنے آتے ہی وہ مجھے پہچان جائے گا اور پھر وہی ہوگا جو میں نہیں چاہتا تھا مگر نیچے اترنے سے پہلے ہی میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ حالات کے پیش نظر میرا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ میرے خاموشی سے گرفتار ہوجانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں بھی پہلے سارجنٹ سے کُٹ مُکا کروں گا لیکن میرا سودا بڑا ہوگا۔ یہ معاملہ صرف ٹریفک کے ایک قانون کی معمولی خلاف ورزی کا نہیں تھا۔ میں سارجنٹ سے کہوں گا کہ گاڑی میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ پھر اس سے صاف بات کروں گا کہ وہ مجھے نہ دیکھنے کے عوض کیا نذرانہ قبول کرے گا۔ اگر وہ پانچ دس ہزار لے کر خاموشی سے رخصت ہوجانے کی پیشکش کو فائدہ مند سمجھتے ہوئے فرض کرلیتا ہے کہ اس نے آج شاہ عالم کو دیکھا ہی نہیں تو یہ باعزت سمجھوتا دونوں کو راس آئے گا بصورت دیگر اس کی فرض شناسی کا جذبہ جاگ اٹھا تو مجھے اس جذبے کو ناک آؤٹ کرکے سلانا پڑے گا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی تک اس نے گاڑی کے نمبر پر نظر نہیں ڈالی ہے چنانچہ بعد میں گاڑی کا سراغ لگانا اتنا آسان نہیں ہوگا اور بفرض محال اس نے سراغرسی کی اور نیلم کے گھر پہنچ گیا تو وہاں صاف انکار کرنا بھی آسان ہوگا اور اس کی کسی افسر اعلیٰ سے بات کراکے اس "غلط فہمی" کو رفع کرانا بھی ممکن ہوگا۔

نیچے اترنے کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جیپ میں بیٹھنے والوں کی بھرپور نخوت کا مظاہرہ کیا "یس۔ کیا مسئلہ ہے؟"

وہ غالباً ہر روز ایسی ہی صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا عادی ہوچکا تھا۔ گاڑیاں ہر روز ٹریفک سائن سے آگے کھڑی ہوتی تھیں اور وہ ملاقات کے اوقات میں ہر روز چکر لگا کے دو چار گاڑیوں کے چالان کرسکتا تھا یا چالان نہ کرنے کے احسان کی قیمت وصول کرسکتا تھا۔ ہر پھیرے میں اس کے سو پچاس کھرے تھے۔

اس نے ٹریفک سائن کی طرف اشارہ کیا "یہ دیکھا ہے جناب نے؟"

میں نے کہا "گاڑی حد سے آگے کھڑی ہے۔"

اس نے کہا "یہ جرم ہے۔"

میں نے تسلیم کیا "بالکل جرم ہے۔"
"آپ کا چالان ہوگا۔"
میں نے اپنا پرس نکالا "چھوڑو سرجی۔ جتنا جرمانہ چاہو یہیں وصول کرلو، ہمیں کیوں کورٹ کچہری میں کھجل خوار کرتے ہو۔"
وہ کامیابی سے مسکرایا "آپ بڑے سیانے ہو۔"
میں نے اسے بصد احترام سو کا نوٹ پیش کیا جو اس نے شکریہ ادا کیے بغیر اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنی موٹر سائیکل کی طرف بڑھا۔ میں صرف سو روپے میں جان چھوٹ جانے پر بہت خوش اور مطمئن تھا۔ سارجنٹ نے مجھے شناخت نہیں کیا تھا ورنہ شاید پانچ دس ہزار میں بھی میری گلوخلاصی نہ ہوتی۔ اس معمولی واقعے سے مجھے ایک سبق اور ملا تھا کہ آئندہ مجھے اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا ہوگا کہ میرا کہیں بھی پولیس سے رابطہ نہ پڑے۔ مجھے معمولی اور روزمرہ کے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی سے بھی بچنا ہوگا ورنہ کہیں کوئی پولیس مین مجھے ضرور پہچان جائے گا۔
ابھی میں سارجنٹ کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک گاڑی میرے بالکل قریب دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے رک گئی اور میں نے اپنے مقابل ڈاکٹر عائشہ کا ہمیشہ مسکرانے والا شفیق چہرہ دیکھا۔
"ہیلو شاہ عالم!" ڈاکٹر عائشہ نے کھڑکی سے جھانک کے کہا "یہاں کیوں کھڑے ہو؟"
سارجنٹ نے گھوم کے میری طرف دیکھا تو مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میری اور سارجنٹ کی نظر ملی پھر اس نے موٹر سائیکل کو کک لگائی اور گھوم کے واپس چلا گیا۔
میں نے سکون کا سانس لیا اور ڈاکٹر عائشہ کی طرف بڑھا۔ "میں ابھی آیا ہوں۔"
اس نے سر ہلایا "اچھا اندر آؤ، بڑا اچھا ہوا تم مل گئے۔ مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"
ڈاکٹر عائشہ کی گاڑی آگے بڑھ کے اسپتال میں داخل ہوگئی۔ اب میں باہر بیٹھ کے رئیس کی واپسی کا انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ میرے لیے اندر جا کے ڈاکٹر عائشہ سے بات کرنا ضروری اور ناگزیر ہوگیا تھا۔ میں نے ٹیکسی کے دروازے کو لاک کیا اور محتاط انداز میں اندر داخل ہوگیا۔
اسپتال کا نقشہ میرا دیکھا ہوا تھا چنانچہ میں سر جھکائے سیدھا ڈاکٹر عائشہ کے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ گاڑی پارک کر کے کمرے میں پہنچی ہی تھیں کہ میں بھی پہنچ گیا۔

انہوں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا "ٹیک اے سیٹ پلیز!"
عادت کے مطابق وہ اردو میں آدھی بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ انگریزی ملا کے بات کرتی تھیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر عائشہ نے مجھ سے معذرت کی اور پہلے چند فائلوں میں کچھ دیکھا۔ پھر اپنی دراز میں سے ایک رجسٹر نکال کے کچھ لکھا اور ایک بٹن دبا کے انٹرکام پر کسی کو طلب کیا۔
تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے چشمہ اتار کے میز پر رکھا اور کرسی کی پشت کا سہارا لیا "سوری میٹ اگین!"
میں نے کہا "دنیا بہت چھوٹی جگہ ہوگئی ہے ڈاکٹر عائشہ!"
وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی "وہ لڑکی پھر میرے پاس آئی ہے، شبنم!"
میں نے کہا "وہ صحیح جگہ آئی ہے۔"
"لیکن اس مرتبہ حالات تمہارے لیے زیادہ خراب ہیں۔"
میں نے کہا "شاید!"
"YOU ARE A FUGITIVE" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "یہ بات مجھے اس وقت بھی معلوم تھی جب تم باہر اس پولیس مین سے بات کر رہے تھے۔"
میں نے کہا "پھر آپ نے مجھے قانون کے حوالے کیوں نہیں کیا؟"
"اس کی بہت سے وجوہات ہوسکتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ میں نے اخبارات میں متضاد باتیں پڑھی تھیں۔ میں جج نہیں کرسکتی کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ میں خود کو کسی لیگل پرابلم میں INVOLVE کرنا نہیں چاہتی لیکن تیسری وجہ جو میرے لیے سب سے اہم تھی، خود شبنم ہے۔ تمہیں پولیس کے حوالے کر کے میں اس کی مدد نہیں کرسکتی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوجاتا کہ تمہیں پولیس نے گرفتار کیا ہے تو مایوس ہو کے وہ نہ جانے کیا قدم اٹھاتی۔ اس کی یہ حالت تمہیں PROTECT کرنے کے چکر میں ہوئی تھی۔"
میں نے چونک کے کہا "مجھے بچانے کے لیے؟"
"یس۔ ڈونٹ یو نو؟"
میں نے کہا "مجھے کیسے معلوم ہوسکتا تھا ڈاکٹر عائشہ!"
انٹرکام کا بزر بجا تو ڈاکٹر عائشہ نے ریسیور اٹھایا "یس۔ رپورٹر۔۔۔ ابھی جو اخبار والا آئے اسے بتادو کہ شی از او کے! اور میں فی الحال کسی سے نہیں ملوں گی۔ ڈاکٹر سارہ سے کہہ دو

کہ وہ پریس والوں کو مطمئن کردے اور انہیں بتادے کہ شبنم کو ڈسٹرب نہیں کیا جاسکتا اس لیے وہ ملنے پر اصرار نہ کریں۔"
میں نے کہا "کیا میں بھی اسے نہیں دیکھ سکتا۔"
"وائے ناٹ۔ ہم اوپر اس کے کمرے میں جاسکتے ہیں۔ یہاں مسلسل مداخلت ہوگی اور تمہارے لیے بہت رسک ہے کہ تمہیں کوئی صحافی دیکھ لے۔ اس کے لیے تو تم ایک خبر ہو مگر میرے لیے پرابلم کھڑی ہوجائے گی۔" انہوں نے درازوں کو لاک کیا اور کھڑی ہوگئیں۔ "کم ودی!"
میں ان کے پیچھے پیچھے کسی حد تک اس کی آڑ میں چلتا رہا۔ اس وقت وہاں کوئی جرنلسٹ نہیں تھا چنانچہ کسی اور نے میری صورت پر غور نہیں کیا یا مجھے دیکھا تو پہچانا نہیں۔ شاہ عالم کا نام ایک مخصوص حلقے میں شیطان کی طرح شہرت ضرور رکھتا تھا جس میں سیاست داں، وکیل اور صحافی یا پولیس والے شامل تھے مگر عام آدمی کے لیے، جو اپنے کام سے کام رکھتا تھا، شاہ عالم کا نام کسی اشتہاری مجرم کا نام نہیں تھا جسے سب لوگ ہر جگہ شناخت کرسکتے ہوں۔
شبنم اوپر والی منزل پر اسی کمرے میں تھی جس میں وہ پہلے بھی کچھ دن گزار چکی تھی۔ میں ڈاکٹر عائشہ کے ساتھ کمرے میں پہنچا تو شبنم بیڈ پر سکون کی گہری نیند میں تھی اور دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی اور پنکھا بے آواز طریقے سے گھوم رہا تھا۔ کمرے میں بیڈ کے علاوہ دو کرسیاں تھیں۔ ڈاکٹر عائشہ نے ایک کرسی آہستہ سے اٹھائی اور مجھے اشارہ کیا کہ میں دوسری کرسی اٹھالاؤں۔ ہم بیڈ سے کچھ فاصلے پر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔
میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ، اب آپ کو سچ بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ میں یہاں ایک دوست کے ساتھ آیا تھا۔ اسے میں نے اندر بھیجا تھا کہ شبنم کو دیکھ آئے اور خود باہر اس کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ نے مجھے دیکھ لیا۔ میں آپ کے لیے مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔"
"تمہارا وہ دوست کہاں ہے؟"
میں نے کہا "کیا آپ معلوم کراسکتی ہیں۔ ورنہ واپس جا کے وہ مجھے غیر موجود پائے گا تو پریشان ہوگا۔"
"میں دیکھتی ہوں۔" ڈاکٹر عائشہ باہر نکل گئی۔
میں تقدیر کے اس کھیل پر حیران تھا۔ میں نے شاہ عالم کی شخصیت کو پیچھے چھوڑ دیا تھا مگر وہ کسی آسیب کی طرح میرا پیچھا کر رہا تھا اور مجھ پر غالب آرہا تھا۔ گزشتہ شب میں چندا کے ساتھ تھا تو یکے بعد دیگرے دو اتفاقات ایسے ہوئے تھے

کہ میں نے بڑی مشکل سے ناصر عظیم کو محفوظ رکھا تھا۔ آج پھر حالات ایسے تھے کہ میں شاہ عالم ہونے سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ ڈاکٹر عائشہ کے لیے میں شاہ عالم ہی تھا اور انہیں کسی صورت قائل نہیں کرسکتا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ میں شاہ عالم نہ ہوتا تو دوبارہ شبنم کے لیے پریشان ہوکے یہاں کیوں آتا؟ مجھے پورا یقین تھا کہ بدقسمتی سے کسی اتفاق سے پولیس مجھے یہاں گرفتار کرلے تو ڈاکٹر عائشہ کی گواہی میرے خلاف جائے گی اور انہوں نے مجھے شاہ عالم قرار دیا تو یہ ان کے نزدیک سچ ہی ہوگا۔
ڈاکٹر عائشہ چند منٹ کے بعد آئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی "تمہارا دوست واقعی باہر پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنے آفس میں بٹھادیا ہے۔"
میں نے کہا "ڈاکٹر عائشہ۔ شبنم کو کیا ہوا تھا؟"
"جو کچھ شبنم کے ساتھ ہوا۔ افسوس ناک ہی نہیں شرمناک بھی ہے۔ آئی ڈونٹ نو کہ پولیس والے اتنے BRUTE کیوں ہوجاتے ہیں۔ شاید اندر سے ہم سب وحشی ہوتے ہیں۔ پولیس فورس میں جانے سے پہلے وہ بھی ہمارے جیسے نرم دل رکھنے والے اور ڈرپوک، پولیس کے نام سے کانپنے والے اور تشدد سے نفرت کرنے والے عام انسان ہوتے ہیں مگر وردی پہن کے اور تھانے میں کچھ عرصہ رہ کے ان کی فطرت میں ایک حیوانی تبدیلی آجاتی ہے۔ وہ اپنے جیسے بے بس انسانوں پر بڑی سفاکی سے ظلم کرتے ہیں۔ ان کے جسموں کو تشدد سے پامال کرتے ہیں اور توڑتے پھوڑتے ہیں۔ انسان کو ہلاک تک کردیتے ہیں۔ انہیں خیال ہی نہیں آتا کہ کبھی وہ خود بھی انسان تھے۔"
"یہ پولیس کی بربریت کا نتیجہ ہے؟" مجھے طیش آنے لگا۔
"یس۔ شبنم کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔ اس کا ایک ساتھی شبنم کو یہاں لایا تو اس پر ہسٹریا کے دورے پڑ رہے تھے۔"
"لیکن اس نروس بریک ڈاؤن کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟"
"یس۔ پولیس شبنم کو تفتیش کے لیے لے گئی تھی۔ انہوں نے شبنم سے پوچھا کہ شاہ عالم فرار ہوکے کہاں گیا؟ ظاہر ہے، شبنم نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم تو انہوں نے اپنی روایت کے مطابق تھرڈ ڈگری کے طریقے استعمال کیے۔"
میرا خون کھولنے لگا "انہوں نے اس پر جسمانی تشدد کیا؟"
"جسمانی بھی۔۔۔ لیکن جسمانی سے زیادہ نفسیاتی۔ مینٹل

تارچر کی وجہ سے اس کی یہ حالت ہوئی۔"

"او مائی گاڈ!" میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"اور یہ سب میری وجہ سے ہوا؟"

"تمہیں فخر ہونا چاہیے اس لڑکی پر۔ اور اپنے آپ سے شرم آنی چاہیے کہ تم نے اسے عذاب میں مبتلا کیا" ڈاکٹر عائشہ نے پُرملامت لہجے میں کہا۔

میں نے ندامت سے سر جھکا لیا "اگر اسے کچھ ہو جاتا تو میں ساری عمر اپنے آپ کو معاف نہ کر پاتا۔"

"تمہیں قدر کرنی چاہیے اس لڑکی کی۔ ایسی قوتِ برداشت اور مستقل مزاجی کے ساتھ محبت کرنا کوئی آسان نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "کیا اس نے آپ کو کچھ بتایا؟"

"ہاں۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان تھا۔ وہ کوئی فوٹو گرافر ہے۔"

میں نے کہا "اس کا نام بابر وقار تو نہیں ہے؟"

"یس۔ یہی نام بتایا تھا اس نے اپنا' تم جانتے ہو اسے؟"

میں نے کہا "میں اس سے مل چکا ہوں۔ وہ شبنم کے ساتھ بہت مخلص ہے۔"

"اس نے مجھے بتایا کہ پولیس نے کل رات اسے گھر سے آفس جاتے ہوئے راستے سے پک کر لیا۔ یوں' قانونی طور پر اس کو گرفتار کرنا اور تفتیش کے لیے تھانے لے جانا بہت مشکل پروسیجر تھا۔ چنانچہ انہوں نے شبنم کو "ان آفیشلی" گرفتار کر لیا۔ قانونی طور پر اسے KIDNAPING کہا جائے گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ شبنم کہاں ہے ورنہ شاید صحافی ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ کسی تھانے میں اس کے ساتھ اخلاقی مجرموں جیسا سلوک کیا گیا۔ اس کا بھی گواہ کوئی نہیں چنانچہ شبنم کسی کو کچھ نہیں بتا سکتی اور کسی کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے سکتی۔"

"کیا اس نے تمہیں بتایا...؟"

"یس۔ اس نے سب بتایا۔ رات بھر میں انہوں نے سب کچھ کیا۔ انہوں نے کوئی جسمانی تشدد نہیں کیا جس کا ثبوت ہو۔ کوئی ایسی زیادتی نہیں کی جو میڈیکل ایگزامینیشن میں ثابت ہو لیکن انہوں نے اس سے کہیں زیادہ کیا جس کا تم تصور کر سکتے ہو۔ وہ رات بھر شیطان بنے رہے۔ انہوں نے شبنم کو بالکل بے لباس رکھا اور خود بھی اس کے سامنے ننگے ہو کے آتے رہے۔ انہوں نے دل کھول کے بے شرمی اور فحاشی کا مظاہرہ کیا اور شبنم کو ساری رات ہراساں کرتے رہے۔ یہ دھمکی دیتے رہے اور ڈراتے رہے کہ ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ انہوں نے کسی زیرِ حراست ملزم پر شبنم کے سامنے غیر انسانی تشدد کیا اور شبنم نے کئی گھنٹے تک اس کا رونا' چلانا' تڑپنا اور اذیت برداشت کرنا دیکھا۔ پہلے انہوں نے اسے ننگا کر کے الٹا لٹکایا اور اسے مارتے رہے۔ وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح چلاتا رہا اور الٹا لٹکا ہوا پھڑکتا رہا۔ اس کا پیشاب پاخانہ خطا ہوتا رہا اور وہ اپنے ہی جسم کی غلاظت میں لتھڑ گیا۔ پھر انہوں نے اسے فرش پر لٹا کے زیادتی کا نشانہ بنایا۔ شبنم کو دکھانے کے لیے تین پولیس والوں نے اس پر جنسی تشدد کیا اور شبنم سے کہتے رہے کہ اس کی باری بھی آنے والی ہے۔ پھر وہ شخص خون اگلنے لگا۔ پولیس نے اسے بدترین عذاب سے گزارا اور شبنم اس کا چیخنا چلانا سنتی رہی اور اسے مرتا ہوا دیکھتی رہی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ شخص مر گیا۔ وہ نوجوان آدمی تھا اور کار چوری کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ شبنم کے اعصاب تو اس کی موت دیکھ کر ہی جواب دے گئے تھے۔ بعد میں انہوں نے شبنم کے ساتھ اپنے گھناؤنے کھیل شروع کیے۔ شبنم کا کہنا ہے کہ وہ تعداد میں چار یا چھ تھے۔ ان سب نے شبنم کے سامنے ناقابلِ بیان فحاشی کی۔ وہ شبنم کے جسم سے کھیلتے رہے اور اس کے تقدس کی پامالی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے رہے۔ انہوں نے عملاً شبنم کو بے آبرو نہیں کیا مگر اس کے سارے بدن کو گندہ اور ناپاک کر دیا۔ انہوں نے شبنم کے جسم کے نازک حصوں کے ساتھ بے شرمی کی انتہا کر دی اور اس دوران میں مسلسل یہی پوچھتے رہے کہ تیرا یار کہاں ہے؟ شبنم نے ساری رات اس انسانیت سوز شیطانی یلغار کا مقابلہ کیا مگر تمہارے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ پولیس والے یہ ظاہر کرتے رہے جیسے وہ شبنم کو کچھ عرصہ اپنے پاس رکھیں گے پھر دوسروں کے حوالے کر دیں گے۔ کسی کو کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ کہاں گئی' یہاں تک کہ ایک دن اس کی بے آبرو لاش کسی ویران جگہ پر مل جائے گی۔ کوئی صحافی عورت کتنی ہی توپ کیوں نہ بن جائے' رہتی تو ایک عورت ہی ہے۔ اور جب کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوگا تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لے گا۔ تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ انہوں نے شبنم کی بے بسی کا کس حد تک ناجائز فائدہ اٹھایا ہوگا۔ شبنم کو بالآخر یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ محض دھمکیاں دے رہے ہیں اور اسے ہراساں کر رہے ہیں۔ اگر وہ کچھ کرنے والے ہوتے تو انہیں روکنے والا کوئی نہیں تھا مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں کسی کا ڈر تھا۔ شبنم کو انہوں نے سڑک سے اٹھایا تھا تو دیکھنے والا کوئی نہیں تھا مگر غالباً ان کے کسی افسرِ اعلیٰ کو اس اغوا کا علم تھا۔ افسرانِ بالا کی آشیرباد کے بغیر ماتحت یہ کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ اس افسرِ اعلیٰ نے کہا ہوگا کہ زبانی کلامی جو چاہو کرو مگر عملاً شبنم کے ساتھ کوئی جسمانی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ بعد میں سب مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جسمانی گزند سے محفوظ رہی مگر جو ذہنی تشدد اس نے برداشت کیا وہ حد سے زیادہ تھا۔ اس کے نتیجے میں نروس بریک ڈاؤن ہونا تو معمولی بات ہے۔ وہ پاگل بھی ہو سکتی تھی۔"

میں سخت شاک کی کیفیت میں بیٹھا رہا "یہ تو لاقانونیت کی انتہا ہے۔"

"تم اس کے خلاف کیا کر سکتے ہو۔ آواز تک نہیں اٹھا سکتے۔" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "تم شبنم سے زیادہ بے بس ہو۔ اس واقعے کے خلاف رپورٹ ابھی تک نہیں لکھوائی گئی ہے۔ اس کا علم گنے چنے صحافیوں کو ہے۔ وہ سنجیدہ اور ذمے دار لوگ ہیں۔ میری ان سے بات ہو چکی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رپورٹ ضرور لکھوائی جانی چاہیے مگر اس کا انحصار شبنم کے رویے پر ہے۔ فیصلہ بہرحال وہ خود ہی کرے گی۔ ابھی تو خود شبنم کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کون لوگ تھے اور اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔ وہ یقیناً کوئی تھانہ تھا مگر اندر باہر سے سارے تھانے ایک جیسے لگتے ہیں۔ آج کل ایسی لاقانونیت کا مظاہرہ بھی عام سی بات ہو گئی ہے جس کے خلاف نہ داد ہے نہ فریاد۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ میں اس واقعے کے ذمے داروں کو پہچان سکتا ہوں۔"

"لیکن تم سامنے نہیں آ سکتے۔ تم خود روپوش ہو۔"

"شبنم کے ہوش میں آنے کے بعد معلوم ہوگا کہ وہ کسی پر شک ظاہر کرتی ہے یا نہیں" میں نے کہا۔

"کیا میں تم سے ایک درخواست کر سکتی ہوں؟"

میں نے کہا "آپ حکم کریں۔"

"میرے لیے دوبارہ یہ آزمائش کی صورتِ حال پیدا مت کرنا۔ میں کسی قانونی مشکل میں پڑنا افورڈ نہیں کر سکتی۔ مجھے کام کرنا ہے اور اپنی کنڈول کی بہرحال فکر ہے۔ مجھ پر یہ الزام نہ آئے کہ میں قانون کے خلاف کام کرتی ہوں۔ آج میں نے تمہیں اس لیے بچایا کہ میں مریض کے انٹرسٹ میں مجبور ہو گئی تھی۔ میں تمہیں گرفتار کرا دیتی تو شبنم کی قربانی رائگاں جاتی اور اس کا منفی اثر شبنم کے ذہن پر بہت برا ہوتا۔ تمہیں بچانے کے لیے اس نے بہت ٹارچر برداشت کیا تھا۔"

میں نے کہا "یہ آپ کا احسان ہے مجھ پر۔"

"مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔ لیکن کل جو شبنم کے ساتھ ہوا' وہ کل پھر ہو سکتا ہے۔ اور اگلی بار اس بربریت کا شکار کوئی اور بھی ہو سکتا ہے جو تمہیں اتنا ہی عزیز ہو۔ یہ رشتوں کی زنجیریں آدمی کے ارادے کو سب سے زیادہ کمزور کرتی ہیں۔ تم بھی بالآخر مجبور ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا "میں نے سیاست کے اس کھیل کو خیرباد کہہ دیا ہے جس میں میری حیثیت شطرنج کی بساط پر رکھے ہوئے پیادے جیسی ہو گئی تھی جسے نادیدہ ہاتھ اپنے مالی مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ اب میں نے مزید استعمال ہونے سے انکار کر دیا ہے تو بڑے بڑے شاطروں کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ کہیں ایک معمولی پیادے کی بغاوت سے ان کی بازی مات نہ ہو جائے۔"

"ایسا تو ہوتا ہے ایسے کھیل میں۔ کیا تمہیں کھیل میں شریک ہونے سے پہلے اس کا اندازہ نہیں تھا؟"

میں نے کہا "اندازہ ہونے کے باوجود میں مجبور تھا۔ لیکن جب تک میں کھیل میں شامل تھا مجھے استعمال کرنے والے ہاتھ ہی میرے محافظ تھے۔ اب میں اس دلدل سے نکلنا چاہتا ہوں تو مجھے ہر طرف دشمنی کے خارزار پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شبنم کے ساتھ جو بھی ہوا بالکل غیر متوقع نہیں تھا مگر ایسے ہتھکنڈے مجھے بے حوصلہ نہیں کر سکتے۔"

ڈاکٹر عائشہ نے سر ہلایا "وش یو دی بیسٹ آف لک۔ تم جب تک چاہو یہاں رک سکتے ہو مگر میرا مشورہ ہے کہ تم خود کو بھی بچاؤ اور شبنم کو بھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ پولیس بالآخر شبنم کو یہاں LOCATE کر لے۔ ابھی شاید وہ سرکاری اسپتالوں میں دیکھ رہے ہوں گے۔ یہ شبنم کے اس ساتھی بابر وقار کی دور اندیشی ہے کہ وہ اسے یہاں لے آیا۔ یہ ذرا گمنام سا اسپتال ہے۔ لیکن پولیس کو انڈر ESTIMATE مت کرو۔ شبنم تمہارے لیے ایک جال ثابت ہو سکتی ہے۔ وہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ شبنم کی اس حالت پر تم خود بے چین ہو کے دوڑتے ہوئے آؤ گے۔ اور تم آ گئے ہو۔ اگر یہ کوئی مشہور یا سرکاری اسپتال ہوتا تو اب تک تم پکڑے جا چکے ہوتے۔"

میں نے کہا "یو آر رائٹ۔ مجھے زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔"

"میری مانو تو تم یہاں مت رکو۔ شبنم کو اب کوئی خطرہ نہیں۔"

میں نے کہا "شبنم آپ کے پاس ہے تو مجھے کوئی فکر نہیں۔"

"پھر تم جاؤ۔ کیونکہ خدانخواستہ پولیس یہاں آپہنچی تو میں کسی طرح بھی تمہیں نہیں بچاسکوں گی۔ شبنم ابھی سو رہی ہے اور شام تک سوتی رہے گی۔ آج رات بھی ہم اسے SEDATION میں رکھیں گے۔ کل دیکھیں گے کہ اسے جانے کی اجازت دی جاسکتی ہے یا نہیں" وہ باہر جانے کے لیے اٹھی۔

میں اس کے ساتھ کھڑا ہوگیا "آپ جیسے خیرخواہ کی بات نہ مان کے میں مزید خرابی کے اسباب پیدا نہیں کرسکتا۔"

"تم تھوڑی دیر یہاں رکو۔ پہلے میں دیکھ لوں باہر کوئی خطرے والی بات تو نہیں ہے۔ میں تمہیں ابھی اپنے آفس سے فون کرتی ہوں" ڈاکٹر عائشہ نے باہر سے دروازہ بند کردیا۔

میں شبنم کو دیکھتا رہا۔ اپنی تمام بلند ہمتی اور قوتِ ارادی کی مضبوطی کے باوجود وہ مجھے ایک چھوٹی سی سہمی ہوئی بچی لگی جس نے بربریت کے جنگل کی ایک سفاک رات کا سفر اکیلے طے کیا تھا اور خوف زدہ کرنے والے ہر درندہ صفت عفریت کا مقابلہ کرکے سلامتی کی منزل تک تو پہنچ گئی تھی لیکن اس کے بعد بے ہوشی ہوگئی تھی۔ اس کی بے زبانی صدا دیتی تھی کہ دیکھو' مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ اور میری سنو کہ میرا یہ حال صرف محبت نے کیا۔ وہ محبت جو مجھے شاہ عالم سے تھی' ہے اور رہے گی۔

سرخ کمبل کے نیچے اس کا جسم بالکل ساکت تھا اور چہرہ کچھ زرد نظر آرہا تھا۔ میں نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا تو اس کے بدن میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ شاید لاشعوری طور پر اس نے میرے لمس کو محسوس کیا تھا۔ اس کی حالت نے مجھے افسردہ بھی کیا اور میرے وجود میں ایک خواہش کو بھی بیدار کیا کہ میں اس ظلم اور لاقانونیت کے ذمے داروں کو سزا دوں مگر وہ لوگ بے چہرہ تھے اور اپنی شناخت رکھنے کے باوجود روپوشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

کمرے میں رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کا بزر آہستہ سے بولا تو میں نے ریسیور اٹھالیا "لیس۔ یو کین کم!" ڈاکٹر عائشہ کی آواز آئی "ابھی مجھے کوئی مشکوک چہرہ نظر نہیں آرہا ہے۔"

میں شبنم پر آخری نظر ڈال کے باہر نکلا اور ڈاکٹر عائشہ کے آفس میں پہنچ گیا جہاں رئیس میرا منتظر تھا مگر اندر قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ میں نے اپنے سامنے اسی نوجوان کو دیکھا جس نے گزشتہ شب مجھے شاہ عالم سمجھ کے میرا تعاقب کیا تھا۔ اس وقت میں نے جھڑک کے اسے بھگادیا تھا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں' ناصر عظیم ہوں اور اس کی ایک نہیں سنی تھی' اب اس کی نظر مجھ پر جم گئی۔ لیکن میرے لیے اس سے نظر ملانا مشکل ہوگیا۔ فوری طور پر ڈاکٹر عائشہ کے کمرے سے فرار بھی مشکل تھا کیونکہ چائے کا ایک کپ میرے انتظار میں تھا۔

"بیٹھو شاہ عالم!" ڈاکٹر عائشہ نے کرسی کی طرف اشارہ کیا "چائے پیو۔"

میں شکریہ ادا کرکے بیٹھ گیا اور اس نوجوان سے نظریں چراتا رہا جس کے سامنے اب میرا جھوٹ پوری طرح کھل گیا تھا۔

ڈاکٹر عائشہ نے اس نوجوان سے مخاطب ہوکے کہا۔ "دیکھو اسلم' مجھے تمہارے حالات سے پوری ہمدردی ہے لیکن مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟ تمہاری ماں کی بیماری ایسی نہیں ہے کہ ہفتہ دس دن یا مہینے دو مہینے کے علاج سے وہ صحت یاب ہوجائیں۔ میرا اندازہ ہے کہ انہیں چھ مہینے سے ایک سال تک مسلسل علاج کی ضرورت ہوگی۔ جہاں تک میرا تعلق ہے فرض کرو میں تم سے کوئی فیس نہ لوں' تمہاری والدہ کو جنرل وارڈ میں ایک بیڈ بھی دے دوں لیکن دواؤں کا انتظام تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ اور اگر دواؤں کا بندوبست نہیں ہوگا تو پھر ان کو یہاں لٹا کے رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟"

ڈاکٹر عائشہ کی بات اسلم نام کے اس نوجوان نے ضرور سنی ہوگی مگر وہ میری طرف متوجہ تھا "سر' آپ شاہ عالم ہی ہیں نا؟"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ڈاکٹر عائشہ نے کہا "یہ تو شاہ عالم ہیں مگر تم ادھر دیکھو' میری طرف۔"

میری پوزیشن سخت خراب ہوگئی تھی۔ لیکن میں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی "دیکھو۔ ہم باہر جاکے بات کریں گے۔"

وہ بولا "سر' آپ نے میرے ساتھ..."

میں نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی "آخر تم سمجھتے کیوں نہیں۔ ہر بات کا ایک موقع محل ہوتا ہے۔ پہلے تم ڈاکٹر عائشہ کی بات سن لو۔"

ڈاکٹر عائشہ کچھ حیران ہوئی "تم جانتے ہو اسے شاہ عالم؟"

میں نے کہا "ایسے تو نہیں جانتا جیسے آپ کو جانتا ہوں۔ کل رات یہ مجھے ملا تھا اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اس وقت موقع نہیں تھا کہ میں اس کی سن سکتا۔ میرے ساتھ کوئی اور تھا۔"

ڈاکٹر عائشہ نے سرہلایا "اسلم! میں نے تمہیں بتادیا تھا کہ علاج مہنگا بھی ہے اور طویل بھی۔ تم یہ کرسکتے ہو کہ میو اسپتال چلے جاؤ یا گنگا رام۔ وہاں مریضوں کی فلاح کے لیے بہت سے ادارے کام کررہے ہیں۔ بڑے اسپتالوں میں ویلفیئر ایسوسی ایشنز ہوتی ہیں جو مخیر حضرات سے عطیات وصول کرتی ہیں۔ دوائیں اکٹھی کرتی ہیں اور غریب اور مستحق مریضوں کو فراہم کرتی ہیں۔ ہوسکتا ہے تمہیں وہاں سے اپنی ماں کے لیے دوائیں مل جائیں یا کوئی تمہاری مدد کرے۔ یہ تقریباً دو ہزار روپے ماہانہ کا خرچ ہے۔"

اسلم کی صورت پر مجھے وہی بے بسی اور مظلومیت نظر آرہی تھی جس کا مشاہدہ میں نے گزشتہ رات کیا تھا۔ شاید وہ مجھ سے اپنی ماں کے علاج کے لیے دوائیں ہی مانگنا چاہتا تھا مگر اس نے وہ خیرات قبول کرنے سے انکار کردیا تھا جو میں اسے دے رہا تھا۔ اپنے گزشتہ شب کے بدسلوکی والے رویے کی تلافی کرنے کے لیے اور اسے خاموش کرنے کے لیے میں نے کہا "دو ہزار روپے مہینے کی بات ہے۔ ڈاکٹر عائشہ! یہ ذمے داری میں قبول کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "لو۔ تمہارا مسئلہ تو حل ہوگیا۔ اب ان کا شکریہ ادا کرو۔"

اسلم نے مجھے بے بسی کے ساتھ دیکھا۔ گزشتہ رات میں اس سے بات بھی کرنے کا روادار نہ تھا اور آج میں نے ایک احسان کرکے اسے خرید لیا تھا۔ "شاہ عالم صاحب! میں آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔"

میں نے کہا "کل رات تم یہی کہنا چاہتے تھے؟"

"نہیں سر۔ وہ دوسری بات تھی۔"

میں نے پرس نکالا اور دو ہزار روپے اس کے سامنے رکھ دیے "یہ لو' اس مہینے کی دواؤں کا خرچ۔ آئندہ تمہیں ہر مہینے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں۔ میرا سیکریٹری یا کوئی ملازم تمہارے گھر خود جاکے رقم دے آئے گا۔"

"میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

میں نے کہا "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم باہر میرا انتظار کرو۔ میں ابھی تم سے بات کرتا ہوں۔"

وہ خاموشی سے دو ہزار روپے اٹھا کے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "اسلم سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا "دراصل کل رات یہ ملا تو میں نے خود کو شاہ عالم تسلیم کرنے سے انکار کردیا تھا۔"

"یعنی وہ تمہیں پہلے سے جانتا تھا؟"

"مگر میں اسے نہیں جانتا۔" میں نے کہا "اور اسی لیے میں کچھ گھبرا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا نام شاہ عالم نہیں ہے۔ اب یہ اتفاق ہے کہ آج پھر اس سے ملاقات ہوگئی اور آپ کے منہ سے اس نے میرا نام سنا تو چکر میں پڑگیا۔"

"شاہ عالم! آخر تم کب تک ایسے زندگی گزارو گے؟"

میں نے کہا "یہ تو مجھے بھی علم نہیں۔"

"تم اپنے خلاف مقدمات کو عدالتوں میں فیس کیوں نہیں کرتے۔ اگر تم بے قصور ہو تو رہا ہوجاؤ گے باعزت طور پر۔"

میں نے تلخی سے کہا "جس کا اس نظامِ انصاف سے کبھی واسطہ نہ پڑا ہو وہ اسی خوش فہمی میں رہتا ہے کہ عدالتوں سے انصاف مل جاتا ہے۔ جھوٹے کا منہ کالا اور سچے کا بول بالا ہوتا ہے۔ لیکن جو میری طرح اس دلدل میں پھنس جائے اس کے لیے ہر قدم پر دلدل اور گہری ہوتی جاتی ہے۔ میرے خلاف سازشوں کا جال بڑا مضبوط ہے اور جال بننے والے ہاتھ اس سے بھی زیادہ مضبوط ہیں۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟ ساری عمر بھاگتے رہو گے؟" اس نے افسوس سے سرہلایا۔

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے۔"

رئیس نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا "اس نوجوان کی ماں کا کیا کیس ہے؟"

ڈاکٹر عائشہ نے کہا "ایک عام سا گھریلو مسئلہ ہے جس سے غریبی میں نمٹنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اسلم اپنی ماں کا ایک ہی بیٹا ہے۔ چار بہنیں تھیں جن کی شادی ہوگئی۔ یہ خود معمولی پڑھا لکھا ہے اس لیے نوکری ملتی نہیں یا ملتی ہے تو عارضی قسم کی محنت مزدوری والی۔ اس کا باپ ہاتھ کی کمائی سے گزارے لائق کمائی کرلیتا تھا۔ وہ تانبے پیتل کے برتنوں پر نقش و نگار بنانے اور کندہ کاری کا ماہر تھا۔ اس نے بیٹے کو بھی یہ ہنر سکھانے کی کوشش کی تھی مگر اسلم نے سیکھنے سے انکار کردیا۔ دراصل اس نے دیکھ لیا تھا کہ یہ کام کرنے کی وجہ سے ہی باپ پچاس سال کی عمر میں اندھا ہوگیا تھا۔ وہ دن رات دھات کے برتنوں پر جھکا ہتھوڑا چھینی سے کھدائی میں مصروف رہتا تھا۔ یہ بہت باریک اور نفیس کام ہوتا تھا مگر اس کے لیے وہ دن رات محنت کرتا تھا۔ دن میں وہ اپنی جھونپڑی کے باہر چبوترے پر بیٹھتا تھا تو سورج کی روشنی دھات کے برتن پر سے منعکس ہوکے اس کی نظروں کو خیرہ کرتی تھی اور

رات کے وقت وہ جھونپڑی کے اندر لالٹین کی روشنی میں کام کرتا تھا تو ناکافی روشنی میں آنکھوں پر بہت زور پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ اس کی آنکھیں بے کار ہوگئیں اور اس کے ساتھ ہی وہ بے روزگار ہوگیا۔ جس شخص کے لیے وہ کام کرتا تھا اس نے آنکھوں کا علاج بھی نہیں کرایا۔ لیکن علاج سے فائدہ کوئی نہ ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح ٹیکسلا کے مشن اسپتال پہنچا جہاں اس کی آنکھوں کا معائنہ غیر ملکی ڈاکٹروں نے کیا۔ اگر ممکن ہوتا تو وہاں اس کا مفت علاج ہوجاتا لیکن اس کی آنکھیں بالکل ہی جواب دے چکی تھیں۔ آخری علاج آپریشن تھا مگر قرنیہ کی تبدیلی کے خواہش مند بہت تھے۔ اس کا نام ویٹنگ لسٹ میں لکھ لیا گیا اور اسے بتادیا گیا کہ جب اس کی باری آئے گی اور قرنیہ دستیاب ہوگا تو اس کی ایک آنکھ میں لگادیا جائے گا۔ اندازہ یہ ہے کہ اگر وہ انتظار کرتا تو شاید دس برس میں اس کا نمبر آجاتا مگر وہ دس سال کیسے بیٹھا رہتا اور بیٹھا رہتا تو کھاتا کہاں سے۔ خیال یہ ہے کہ کچھ عرصہ فاقہ کشی اور تنگی میں گزار کے وہ حوصلہ ہار گیا۔ وہ ایک دن اچانک کہیں غائب ہوگیا۔ اسلم کا کہنا ہے کہ وہ اسی شخص کے پاس گیا تھا جس کے لیے وہ ساری عمر کام کرتا رہا تھا اور جس کے لیے اس نے اپنی زندگی کے تیس سال اور اپنی آنکھیں گنوادی تھیں۔ لیکن وہ لوٹ کے نہیں آیا۔ اس کے لاپتا ہونے کی رپورٹ پولیس میں بھی لکھوادی گئی مگر لاحاصل۔ لوگوں نے فرض کرلیا کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوگیا یا اس نے خودکشی کرلی۔ وہ اکثر مرنے کی باتیں کرتا رہتا تھا۔ اسلم نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور اس شخص کے پاس بھی گیا جس کے پاس اس کا باپ کام کرتا تھا مگر اسے کوئی مدد نہ ملی۔ اسلم مایوسی کی کیفیت میں چوری چکاری کرنے لگا۔ اس نے گاڑیوں میں سے ریڈیو ٹیپ نکالنے شروع کردیے لیکن ابھی یہ کام شروع ہی کیا تھا کہ پکڑا گیا اور چھ مہینے کے لیے جیل چلا گیا۔ جیل سے نکل کے اس نے چوری چکاری سے توبہ کی اور کہیں محنت مزدوری کرنے لگا مگر اس کی بدقسمتی کہ پے در پے حادثات نے ماں کا دماغ خراب کردیا۔ اس نے ماں کا علاج سرکاری اسپتالوں سے کرانے کی کوشش کی مگر وہاں غریبوں کو پوچھتا کون ہے۔ نہ جانے کس نے اسے میرا پتا بتادیا اور وہ یہاں پہنچ گیا۔ اب یہ بڑی مشکل ہے۔ ہم میاں بیوی مقدور بھر کوشش ضرور کرتے ہیں کہ غریبوں کا بھی علاج کریں۔ ہم ان سے فیس مشورہ نہیں لیتے اور دوائیں لکھ کر دے دیتے ہیں مگر ان بیماریوں کا علاج بھی بہت مہنگا ہے۔ ہم سب کو یہاں داخل بھی نہیں کرسکتے۔ ہمارے پاس بہت محدود جگہ ہے۔ اس نوجوان اسلم کی ماں کو میں نے ترس کھا کے ایک سرونٹ کوارٹر میں رکھ لیا تھا جو اس وقت خالی پڑا تھا۔ یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ اب علاج سے فرق پڑا ہے تو اسلم کے پاس دواؤں کے پیسے نہیں رہے۔"

میں نے پوچھا "اس کی ماں ٹھیک تو ہوجائے گی؟"

"مجھے پوری امید ہے۔"

میں نے کہا "چلیں پھر آپ علاج جاری رکھیں۔ آپ کہیں تو میں سال بھر کا خرچ آپ کو ایڈوانس دے جاؤں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں چاہتی ہوں اسلم اب اپنی ماں کو گھر لے جائے۔ اس کی کنڈیشن اس حد تک STABLE ہے کہ اس کا علاج گھر پر جاری رہ سکتا ہے لیکن گھر میں اسلم کے سوا کوئی ہے نہیں۔ وہ صبح سے شام تک کام کے سلسلے میں باہر رہتا ہے۔ گھر پر مریض کی دیکھ بھال کون کرے لیکن یہ ایسے مسائل ہیں جن کا حل اسپتال والوں کے پاس نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا "شبنم کے علاج معالجے کے اخراجات بھی ہوں گے۔"

وہ بولی "اس کی تفصیل تمہیں اکاؤنٹنٹ سے مل جائے گی۔" ڈاکٹر عائشہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں بھی اپنی چائے ختم کرچکا تھا۔ میں نے ڈاکٹر عائشہ کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر آگئے۔ وہاں میں نے اکاؤنٹنٹ کے پاس پانچ ہزار روپے جمع کرادیے اور اس نے مجھے رسید بنادی۔ مختصر سے لاؤنج نما ویٹنگ روم میں اس وقت بھی چار پانچ افراد بیٹھے تھے۔ ان میں اسلم بھی شامل تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ آگے آیا اور پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

میں نے کہا "اسلم تمہارا مسئلہ تو حل ہوگیا۔ مجھے بتاؤ تم کہاں رہتے ہو۔ رقم ہر مہینے تمہارے گھر پہنچتی رہے گی۔"

وہ بولا "یہ بات نہیں شاہ جی!"

"پھر کیا بات ہے؟"

"میں آپ سے اپنے والد کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔" اس نے گاڑی کے پاس رک کے کہا۔

میں نے کہا "میں اس سلسلے میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔ اگر وہ لاپتا ہوگئے ہیں تو ان کا سراغ پولیس لگاسکتی ہے۔"

وہ بولا "یہ بات نہیں سر۔ مجھے شک ہے کہ انہیں ملک رب نواز نے قتل کرادیا ہے؟" اسلم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں چونک پڑا "یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو۔"

"وہ ملک رب نواز کے لیے کام کرتے تھے اور آخری بار اس سے ملنے گئے تھے۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ وہ کوٹھی کے اندر گئے تھے لیکن اس کے بعد انہیں باہر جاتے کسی نے نہیں دیکھا۔"

میں نے کہا "فرض کرو ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن کسی ثبوت یا گواہ کے بغیر تم ملک رب نواز کے خلاف کوئی الزام کیسے عائد کرسکتے ہو۔"

اس نے سر جھکالیا "یہ تو مجھے معلوم ہے جناب! لیکن وہ آپ کے دوست ہیں۔ آپ ان سے معلوم کرسکتے ہو۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ کیا میرے پوچھنے سے ملک رب نواز بتادے گا کہ اس نے تمہارے والد کو کہاں اور کیسے غائب کیا تھا۔ اس کے علاوہ یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ رب نواز میرا دوست ہے۔"

رئیس نے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا "یار، ہم یہاں کھڑے رہ کے باتیں نہیں کرسکتے۔"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسلم سے کہا "اندر بیٹھو۔" اور پھر خود بھی اس کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"آپ کا اور ان کا بزنس ایک ہے" وہ بولا۔

میں نے کہا "پہلے ایسا ہی تھا مگر اب ہم الگ ہوگئے ہیں اور سچ پوچھو تو آج ہم ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔"

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگا "آپ میری مدد کرنا نہیں چاہتے، کل رات بھی آپ نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔"

میں نے کہا "کل رات میری ایک مجبوری تھی۔ اس لیے میں نے تمہیں ٹال دیا تھا۔ لیکن تم ایسا نہیں کہہ سکتے کہ میں تمہاری مدد نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے ڈاکٹر عائشہ نے تفصیل سے تمہارے حالات کے بارے میں بتادیا ہے۔"

اس وقت تک رئیس نے گاڑی باہر نکال لی تھی اور ہم اسپتال سے کچھ دور آگئے تھے۔ باہر ابھی دھوپ تھی لیکن گاڑی کے سیاہ شیشوں سے ماحول ابر آلود دکھائی دیتا تھا۔ تجوری کے انرتائٹ شیشوں نے باہر کا سارا شور دھواں اور گرد و غبار روک لیا تھا اور اندر خاموش سرسراہٹ کے ساتھ گاڑی کا اے سی اپنی خوشگوار ٹھنڈک پھیلا رہا تھا۔

میرا ذہن شبنم کے معاملات میں الجھا ہوا تھا اور فی الحال میں دیگر مسائل کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اسلم اپنے مسئلے کے ساتھ میرے سامنے تھا اور اس سے نجات کی یہی ایک صورت تھی کہ میں اس کی بات سن لوں۔

"مجھے شک ہے جی کہ رب نواز نے میرے والد کو قتل کرادیا ہوگا۔"

میں نے کہا "شک کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے مگر شک کی کوئی وجہ؟"

رئیس نے بھی کہا "تمہارے والد نے ملک رب نواز کا کیا بگاڑا تھا آخر؟"

"ہوسکتا ہے میرے والد نے ملک رب نواز کو دھمکی دی ہو؟" اسلم نے کہا۔

"دھمکی کیسی؟"

"دراصل وہ اپنی بینائی جانے کے بعد حد سے زیادہ مایوسی کا شکار تھے اور گلہ کرتے رہتے تھے کہ ملک رب نواز نے ان کی جوانی لے لی۔ ان کی آنکھوں کا نور چھین لیا اور اس کے بدلے میں انہیں کچھ بھی نہیں دیا۔ ان کی محنت سے رب نواز نے لاکھوں کا فائدہ حاصل کیا مگر محنت کرنے والے کو روکھی سوکھی بھی پیٹ بھر کے نصیب نہ ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ رب نواز نے میرا بہت استحصال کیا ہے اور اب میں کسی قابل نہیں رہا تو اسے یہ خیال رکھنا چاہیے کہ مجھے وہی روکھی سوکھی پانے کے لیے کسی کے سامنے بھیک نہ مانگنی پڑے۔ وہ کئی بار ملک رب نواز سے ملے مگر اس نے میرے والد کی بات بھی سننے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ پیسے کام کے ملتے تھے اور اب کام نہیں تو پیسے کیسے۔ یہ کوئی سرکاری نوکری نہیں تھی جس میں بڑھاپے کی پنشن ہو۔"

میں نے کہا "ہر آجر اور صنعت کار ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔"

"میرے والد نے ایک بار گھر میں ذکر کیا تھا کہ رب نواز بڑا چور اور جعلساز ہے لیکن اس کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ پھر ایک دن وہ چلانے لگا کہ اگر ملک رب نواز نے میری بات نہ مانی تو میں اس کے بارے میں سب کو بتادوں گا کہ وہ کیا کرتا ہے۔"

"کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے والد نے ملک رب نواز کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہوگی؟" رئیس نے پوچھا۔

"اسے بلیک میلنگ تو نہیں کہا جاسکتا۔" اسلم نے خفگی سے کہا "انہوں نے تیس سال ملک صاحب کی خدمت کی تھی۔ کیا اس کے بدلے میں انہیں کچھ مانگنے کا حق نہیں تھا؟"

میں نے کہا "اسلم۔ اتنا تو تمہیں بھی سمجھنا چاہیے کہ بھیک مانگنے، حق مانگنے اور دھمکی دے کر مانگنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

رئیس نے سوال کیا "آخر تمہارے والد کو ایسی کیا بات معلوم تھی جو لوگ نہیں جانتے تھے۔"

وہ کچھ سوچنے لگا "اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو میں آپ کو کچھ دکھاؤں۔"

میں نے کہا "ابھی اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ تم ایسے ہی بتاؤ۔"

وہ بولا "میرے والد کمال کے کاریگر تھے۔ وہ دھات پر ہر قسم کے نقش و نگار ابھارنا جانتے تھے لیکن وہ ایک اور کام کے بھی ماہر تھے۔ وہ پرانی چیزوں کی نقل بنا لیتے تھے۔"

میں نے رئیس کی طرف دیکھا "تمہاری مراد نوادرات سے ہے؟"

"نہیں جی۔ ان کو انگریزی میں این ٹیک کہتے ہیں" وہ بولا۔

میں نے کہا "میری مراد انہی چیزوں سے تھی۔"

رئیس نے گاڑی کو ایک جگہ روک لیا "وہ کیا کرتے تھے؟"

"وہ نئی دھات کو پگھلا کے ایسے برتن بناتے تھے اور بھی بہت سی چیزیں مثلاً زیورات۔ سکے، خنجر اور تلواریں جو دیکھنے میں بہت پرانی لگتی تھیں۔ اس کے لیے وہ اپنے خاص طریقے سے نئی دھات میں کچھ چیزیں شامل کرتے تھے مثلاً ریت، مٹی، کوئلہ اور چونا اور زنگ کھایا ہوا لوہا۔ مجھے صحیح فارمولا معلوم نہیں مگر جب وہ چیزیں تیار ہوتی تھیں تو ایسا لگتا تھا جیسے کئی سو سال پرانی ہیں۔ ان پر وہ خاص طریقے سے کام کرتے تھے۔ ان پر خاص قسم کے کیمیکل لگاتے جاتے تھے اور انہیں کبھی بھٹی میں پکایا جاتا تھا کبھی پانی میں ڈال کے رکھا جاتا تھا تو کبھی زمین میں دبا کے۔ بالآخر جو چیز تیار ہو کے سامنے آتی تھی وہ این ٹیک کا نمونہ ہوتی تھی۔ ماہرین کی بات الگ ہے، عام لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے تھے اور ان کی قیمت اصل لاگت سے کئی ہزار گنا زیادہ مل جاتی تھی۔ مگر یہ سارا فائدہ رب نواز اٹھاتا تھا جو ان چیزوں کو غیر ملکی گاہکوں کے ہاتھ فروخت کرتا تھا۔ میرے والد نے ایک بار مجھے ایک چاقو دکھایا تھا جو انہوں نے اپنے مخصوص طریقے سے تیار کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ویسے تو یہ بے کار ہے، اس سے آدمی سیب تک نہیں کاٹ سکتا مگر شوقین لوگ اسے دس بیس ہزار میں لے جائیں گے۔ پہلے ان کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں مگر بعد میں والد کے ایک دوست نے مجھے تفصیل سے سمجھایا تو مجھے پتا چلا کہ دنیا میں این ٹیک اور تاریخی حیثیت رکھنے والی چیزوں کا کیا مول ہے۔ میں نے سنا ہے باہر کے ملکوں میں جا کے یہ چیزیں اور مہنگی فروخت ہوتی ہیں۔"

میں اس کی بات غور سے سنتا رہا تھا "ٹھیک سنا ہے تم نے مگر ایک بات بتاؤ۔ کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ تمہارے والد خود ایک جعلساز تھے؟"

"انہیں جعلساز بنایا گیا۔ وہ خود صرف ایک ماہر کاریگر تھے اور ڈھلائی کا کام جانتے تھے۔ ان کو اس لائن پر لگانے والا ملک رب نواز تھا مگر اس نے لاکھوں کمائے اور میرے والد کو پوری مزدوری بھی نہیں دی۔ اگر آنکھیں کھو دینے کے بعد میرے والد نے اس سے کچھ مانگ لیا۔"

"کچھ؟"

"میرے والد نے صرف دو لاکھ مانگے تھے۔"

میں نے کہا "صرف دو لاکھ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کتنے غریبوں کا لہو چوس کر یہ دو لاکھ جمع ہوتے ہیں اور ملک رب نواز جیسے خون پی کر اپنی دولت مندی کے غرور کو پروان چڑھانے والے کسی کو دو روپے کی خیرات بھی دیتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ ان کے نامۂ اعمال میں اس نیکی کا اندراج دوبار ہو جائے۔ تمہارے والد نے یہ کیا بے وقوفی کی کہ ساری عمر کنگال رہنے کے بعد ملک رب نواز کے سامنے لکھ پتی بننے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور انکار پر اسے دھمکی بھی دے دی۔"

"انہوں نے کوئی بے وقوفی نہیں کی تھی۔ ان کا حق مار مار کے ملک رب نواز نے لاکھوں نہیں کروڑوں کمائے تھے۔ کیا تھا اگر ان کا بڑھاپا آرام سے گزر جاتا۔ وہ کوئی عیاشی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ایک لاکھ میں اپنے لیے ایک کمرے کا پکا مکان بنانا چاہتے تھے۔"

میں نے تلخی سے کہا "ساری عمر جھونپڑی میں گزارنے کے بعد۔ جب ان کی آنکھوں میں روشنی تھی اور وہ دیکھ سکتے تھے کہ رب نواز انہیں مزدوری کے چند ٹکے دے کر ہزاروں کی چیز بنوا رہا ہے تو انہوں نے اپنے حق کا سودا نہیں کیا اور جب آنکھوں کی روشنی چلی گئی تو وہ بھیک کی طرح یہ حق مانگنے چلے گئے اور پھر اتنی جرأت کی کہ ملک رب نواز جیسے مہا غنڈے سے دو لاکھ غنڈا ٹیکس کی طرح مانگے۔"

"آپ بار بار مجھے ان کی غلطی کا احساس دلا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "اس غلطی کا خمیازہ وہ بھگت چکے ہیں۔ کیا اب بھی تم حق اور انصاف کے چیمپئن کہلانا چاہتے ہو۔ تمہارے دل میں یہ خواہش بیدار نہیں ہوتی کہ تم ظلم اور زیادتی کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کرو؟ تم انتقام کی بات کیوں نہیں کرتے؟"

اس کا چہرہ خفت اور کم ہمتی کے جذبات کی تصویر بن گیا "ہم جیسے لوگ ملک رب نواز جیسے طاقتور کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟"

میں نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا "پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا یا ہو گا اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے خوش رہو۔ صبر کرو اور دعا کرو کہ خدا تمہارے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔"

احساسِ ذلت سے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا "سر۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

میں نے کہا "یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ کوئی میرے والد کو قتل کر دیتا تو میں عدالتوں میں انصاف کے لیے خوار ہونے کے بجائے خود اسے جان سے مار دیتا۔ تم کیسے نوجوان ہو کہ ایرے غیرے کے سامنے روتے پھرتے ہو؟"

اس نے اپنا سر جھکا لیا "میں آپ سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ میرے والد اب واپس نہیں آ سکتے اور مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ ملک رب نواز کے خلاف انتقام کی بات بھی کروں۔ میرے پاس ان کی کچھ چیزیں پڑی ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر علامہ اقبال کا فرمودہ دہرایا۔ خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی، نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت بدلنے کا۔ غریب اس لیے غریب رہتا ہے کہ وہ غریبی کو اپنا مقسوم سمجھ لیتا ہے۔ مظلوم کو انصاف اس لیے نہیں ملتا کہ اس کے لب پر بدبختی کو اپنی تقدیر سمجھ کے خاموش رہتے ہیں۔ معاشرتی رویے ایک انقلابی اور انتقامی سوچ کے بغیر نہیں بدلتے۔

رئیس نے کہا "کیا چیزیں ہیں؟"

"دراصل، بعد میں انہوں نے یہ کیا کہ جتنی چیزیں ملک رب نواز ان سے بنواتا تھا وہ اس جیسی دو بنا لیتے تھے۔ ایک رب نواز کو دے دیتے تھے اور دوسری اپنے پاس محفوظ رکھ لیتے تھے۔ ایسی بے شمار چیزیں ان کے پاس جمع ہو گئی تھیں جن کو آپ نوادرات کہتے ہو۔ ملک رب نواز کے ڈر سے وہ ان چیزوں کو اپنے گھر میں نہیں رکھتے تھے۔"

"پھر کیا انہوں نے کوئی گودام کرائے پر لے رکھا تھا۔"

"ایک جگہ تھی ان کے پاس" وہ بولا "اس گاؤں میں ہمارا گھر تھا جہاں سے ہجرت کر کے ہم شہر آئے تھے۔ وہاں میرے دادا اور دادی رہے تھے۔ وہ دونوں بھی مر گئے۔ ان کی یہ جگہ خالی پڑی تھی۔"

میں نے کہا "اچھا پھر؟"

وہ بولا "میں چاہتا تھا، آپ اس ذخیرے کو دیکھ لیتے۔"

"اس سے کیا ہو گا، ہم یہ کام نہیں کرتے۔ نہ جعلی نوادرات خریدتے ہیں، نہ بیچتے ہیں" رئیس بولا۔

"سر، اگر آپ مجھے کسی کا پتا بتا دیں، آپ تو لوگوں کو جانتے ہیں؟"

پہلے تو مجھے خیال آیا کہ میں اسے جعلی نوادرات بنانے اور بیچنے کے مذموم کاروبار کی قانونی نوعیت سے آگاہ کر دوں لیکن پھر مجھے اس کے باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم اور اس کی ماں کی قابلِ رحم حالت کا خیال آ گیا اور میں نے سوچا کہ دنیا کے بازار میں ملک رب نواز اور پیر سبحان جیسے نہ جانے کتنے یہ جعلی نوادرات بھرتے جا رہے ہیں اور اس کے عوض ملنے والی دولت سے اپنے خزانے بھر رہے ہیں تو اگر اس جعلسازی کے کاروبار میں یہ لڑکا بھی تھوڑے سے نوادرات کے ساتھ چلا گیا تو اس سے اتنا بھی فرق نہیں پڑے گا جتنا سمندر میں ایک لوٹا پانی ڈالنے سے پڑ سکتا ہے۔

میں نے کہا "کہاں ہیں تمہارے یہ نوادرات؟"

وہ کچھ پُر امید ہوا "ہمارا گاؤں یہاں سے چالیس میل دور ہے، میں آپ کو لے جا سکتا ہوں، آپ خود دیکھ لیں۔"

میں نے کہا "تم مجھے اپنا پتا بتا دو۔ جیسے ہی مجھے کسی ڈیلر کا پتا معلوم ہو گا جو تمہارے مال کی اچھی قیمت دے سکے۔ میں اسے لے کر تمہارے پاس آ جاؤں گا۔"

"مجھے کوئی اندازہ نہیں جناب عالی کہ ان چیزوں کی کیا قیمت ہو گی۔ مجھے تو مول تول کرنا بھی نہیں آتا لیکن مجھے ان کی صحیح قیمت مل جائے تو میرے دن پھر سکتے ہیں، میں آپ کا ہمیشہ احسان مند رہوں گا۔"

میں نے اسے سمجھایا "دیکھو اسلم۔ تمہارا یہ مال ایسا نہیں ہے کہ تم مارکیٹ میں سپلائی کر دو۔ کیا تم نے آج تک نوادرات کی کوئی دکان دیکھی ہے؟"

"دکان تو نہیں دیکھی جناب!"

"دکان ہے بھی نہیں لاہور میں۔ اس کے ڈیلر ہوتے ہیں جو سودے کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ ایسی چیزوں کے گاہک بہت دولت مند لوگ ہوتے ہیں یا پھر غیر ملکی سیاح، یہ چیزیں ملک سے باہر لے جا کے بیچی جاتی ہیں۔ یورپ، امریکا کے بڑے بڑے شہروں میں۔ تم خود وہاں نہیں جا سکتے اور تمہیں تجربہ بھی نہیں ہے کوئی۔ اس لیے تم کو اپنا مال مجبوراً یہاں کے کسی ڈیلر کو دینا پڑے گا۔ ملک رب نواز ایک ڈیلر ہے، ایسے ہی پیر سبحان شاہ ہے اور اس جیسے چھ سات دوسرے لوگ ہیں جن کو میں نہیں جانتا۔ اگر تم ہوشیاری سے کام لو تو ایک ایک کر کے اپنی چیزیں اچھی قیمت پر ان کے حوالے کر سکتے ہو۔ تمہارا ذخیرہ دیکھنے کے بعد میں اپنے

اندازے سے ہر چیز کی ایک قیمت لگا سکتا ہوں۔ اگر تمہاری تقدیر نے ساتھ دیا تو ڈیلر سے تمہیں اچھے پیسے بھی مل جائیں گے۔ ڈیلر ایک چیز کے گاہک سے دس ہزار سے ایک لاکھ تک وصول کر سکتا ہے۔ اس کا انحصار چیز سے زیادہ گاہک پر ہے کہ وہ کتنا بے وقوف ہے اور کتنا دولت مند ہے لیکن ڈیلر تمہیں اسی چیز کے ہزار دو ہزار یا زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار دے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تمہارا مال جعلی ہے جو وہ گاہک کو اصلی بتا کے فروخت کرتا ہے۔ اس لیے تمہیں زیادہ لالچ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور ایسے سر ہلاتا رہا جیسے سب سمجھ گیا ہو۔ اسے نہ دنیاداری کا کوئی تجربہ تھا نہ کاروبار کا۔ اپنے باپ کی طرح اسے زمانے کی ٹھوکریں کھا کے بہت کچھ سیکھنا تھا اور پھر پچھتانا تھا۔

"میں آپ سے کہاں ملوں جی؟" وہ سادگی سے بولا۔

میں نے کہا "ہم یہاں اسپتال آتے ہیں' تم سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"لیکن ڈاکٹر عائشہ کہہ رہی ہیں کہ اپنی ماں کو گھر لے جاؤ" وہ بولا۔

میں نے کہا "چلو پھر اپنے گھر کا پتا مجھے سمجھا دو۔"

اس نے ہم سے ایک کاغذ مانگا پھر بال پوائنٹ سے اس پر کچھ لکھتا رہا اور ایک نقشہ بناتا رہا "یہ ہے جی میرے گھر کا پتا۔"

میں نے کاغذ لے کر دیکھے بغیر جیب میں رکھ لیا "ٹھیک ہے' اب تم جاؤ۔ اور دیکھو' کسی سے بھی اس معاملے کا ذکر مت کرنا۔ تمہارا کام غیر قانونی اور خطرناک ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا کام بننے سے پہلے بگڑ جائے۔ کسی کو یہ بتانے کی ضرورت بھی نہیں کہ تمہاری شاہ عالم سے ملاقات ہوئی تھی۔"

جب وہ سر ہلا کے چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ "کل سے کیسے عجیب اتفاقات ہو رہے ہیں۔ ہر جگہ مجھے شاہ عالم کی حیثیت سے شناخت کرنے والے مل رہے ہیں۔"

رئیس بولا "یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔"

میں نے کہا "کیسی عجیب بات ہے کہ جب میں شاہ عالم نہیں تھا تو کوئی مجھے شاہ عالم ماننے کے لیے تیار نہ تھا اور آج میں ناصر عظیم بننا چاہتا ہوں تو کوئی یہ بات بھی تسلیم نہیں کرتا۔"

"ہنس کی چال چلنے والے کوے کا یہی حال ہوتا ہے بیٹے۔ تو نہ کوا رہا نہ ہنس بنا۔"

"کل پہلے وہ پولیس انسپکٹر راؤ سکندر میرے پیچھے پڑ گیا تھا اور مجھے شاہ عالم ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ مل گیا' اسلم۔ آج مجھے ڈاکٹر عائشہ کے سامنے تسلیم کرنا ہی پڑا کہ میں شاہ عالم ہوں۔ وہ ضرور سوچے گی کہ شاہ عالم کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو بڑا باا‌ثر سیاست داں تھا۔ اس کے پاس کارکنوں اور غنڈوں کی ایک فوج تھی اور اس کے اثر رسوخ کا دائرہ ایوانِ اقتدار کو چھوتا تھا۔ پھر آج وہ ایسے چوہے کی طرح کیوں چھپتا پھر رہا ہے اور شبنم کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر بھی خاموش ہے۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں اب ناصر عظیم ہوں' جس کا شبنم سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔"

رئیس نے کہا "یہ مسئلہ تو آگے بھی رہے گا۔ اسی شہر میں کچھ لوگ تجھے شاہ عالم سمجھیں گے تو کچھ ناصر عظیم۔"

میں نے کہا "کاش کسی طرح مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ کون تھے جو شبنم کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔"

"پھر کیا کرے گا تو' ان کے خلاف رپورٹ لکھوائے گا؟"

"یہی تو ساری خرابی ہے۔ ثبوت باقی نہ رہے اور گواہ کوئی نہ ہو تو کوئی جرم بھی جرم نہیں رہتا۔ تفتیش کر کے جرم کا سراغ لگانے کا یہاں کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اور پھر اس کیس میں رپورٹ لکھنے والے خود ہی مجرم ہیں تو رپورٹ لکھنے سے کیا ہو گا۔ ہوتے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی۔ ایسی ہی صورتِ حال مزید لاقانونیت کو جنم دیتی ہے۔ مظلوم بھی قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود ہی مجرموں کو سزا دینے پر تل جاتا ہے۔"

"تجھے کس پر شک ہے؟ دلاور شاہ پر یا راؤ سکندر پر؟"

میں نے کہا "راؤ سکندر' اس حد تک آگے نہیں جا سکتا۔ وہ ایک معمولی انسپکٹر ہے اور کل رات اس کی خاصی توصلہ شکنی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اگر وہ کوشش کرے گا تو میرا تعاقب کر کے میری اصلیت معلوم کرے گا۔"

"اس کے ایک ساتھی نے چندا کو پہچان لیا تھا۔"

میں نے کہا "ہاں' یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ وہ دوبارہ مجھ تک پہنچنے کے لیے اس ذریعے (LINK) کو استعمال کر سکتا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ فوری طور پر چندا کو وہاں سے ہٹا دوں۔"

"اس سے زیادہ فرق نہیں پڑ سکتا۔ اگر کوئی پیچھے پڑ جائے تو وہ ڈاکٹر کمال سے بھی پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ اس اسپتال میں چندا نام کی جو نرس کام کرتی

تھی وہ اب کہاں ہے۔ وہ ڈاکٹر کمال سے بھی پوچھ سکتا ہے کہ تمہارا بچپن کا دوست ناصر عظیم کہاں ہے؟"

"یہ تفتیش تو نیلم سے بھی ہو سکتی ہے مگر اس میں ڈر کی کوئی بات نہیں۔ میں خود کو ناصر عظیم پہلے بھی ثابت کر چکا ہوں اور دوبارہ بھی کر سکتا ہوں۔ مجھے اصل خطرہ ہے دلاور شاہ سے۔ وہ شاہ عالم کا سراغ لگانے کے لیے لندن تک جا سکتا ہے۔ اس کے پاس اختیارات بھی ہیں اور سبحان شاہ کی وجہ سے اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔" میں نے کہا۔

اس پریشانی میں سہ پہر ہو گئی تھی۔ میں رئیس کو اسٹوڈیو میں نیلم کے پاس چھوڑنے گیا تو وہ سین چھوڑ کے میرے پاس آ گئی۔ ہم ایک پروڈیوسر کے آفس میں جا بیٹھے۔

"کہاں پھر رہے ہو تم لوگ؟" نیلم نے تشویش سے پوچھا۔

میں نے کہا "کچھ لوگ شاہ عالم کو تلاش کر رہے ہیں۔ کچھ ناصر عظیم کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں دونوں سے چھپتا پھر رہا ہوں۔"

"شبنم کا کیا حال ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"خود اس نے تو کچھ بھی نہیں بتایا۔ وہ سو رہی ہے لیکن اس کی معالج ڈاکٹر عائشہ نے سب بتا دیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"کھانا کھایا ہے تم نے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "صبح سے اب تک خیال ہی نہیں آیا۔"

"اچھا تو پھر میرے ساتھ کھا لو۔ مجھے بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ میں ڈائریکٹر سے کہہ دیتی ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے شوٹنگ روک دیں" نیلم نے کہا اور باہر چلی گئی۔

شفٹ میں کام کرنے والے یونٹ کے باقی ارکان بھی صبح سے شوٹنگ میں مصروف تھے اور وقفہ چاہتے تھے مگر ڈائریکٹر کے آگے کسی کی ایک نہیں چلتی تھی۔ اب خود ہیروئن نے لنچ کا وقفہ لے لیا تو باقی لوگوں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا اور ادھر ادھر پھیل گئے۔

نیلم اپنا کھانا گھر سے لے کر آنے کی عادی تھی۔ اسٹوڈیو کی ایک ملازمہ نے' جو نیلم کے ذاتی کاموں کے لیے مخصوص تھی' کھانا گرم کر کے لگا دیا اور ہم اپنی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے نیلم کو تفصیل سے وہ سب بتا دیا جو مجھے ڈاکٹر عائشہ سے معلوم ہوا تھا۔

"تمہارے خیال میں شبنم کیا کرے گی؟" نیلم نے پوچھا۔

میں نے کہا "وہ کیا کر سکتی ہے' کچھ بھی نہیں۔ اگر وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی داستان سب کو سنائے گی تو لوگ محض لطف لیں گے۔ اس ظلم کے کسی ذمے دار کا اسے نام تک معلوم نہیں۔ وہ سفاک لوگ بہت چالاک تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کسی کی شناخت ظاہر ہو گئی تو اس کی خیر نہیں۔ پاکستان کے سارے صحافی نیلم کے ہمنوا ہو کے سخت ترین سزا کے لیے سراپا احتجاج بن جائیں گے۔"

"میں تمہیں موردِ الزام قرار نہیں دیتی" نیلم نے کہا "مگر تمہیں شبنم کے لیے کچھ ضرور کرنا چاہیے۔"

"مجھے احساس ہے کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا لیکن تم ہی بتاؤ' میں کیا کروں؟ ہو سکتا ہے شبنم ہوش میں آ کے مجھے اس بدمعاشی کے ذمے داروں کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ اس نے کچھ سنا ہو یا نوٹ کیا ہو۔ جو ان کا سراغ لگانے میں مددگار ثابت ہو۔ مجھے صرف اتنا پتا چل جائے کہ وہ تھانا کون سا تھا تو میں ایک ایک کی صورت شبنم کو دکھا دوں۔ ان کی آواز سنا دوں اور پھر وہ جس پر شک کا اظہار کرے' اسے ایسی سزا دوں کہ اس کی آنے والی نسلیں یاد رکھیں۔ مگر ایسے ہوا میں تو تیر نہیں چلایا جا سکتا۔"

"اس بدمعاشی کا کچھ تو سدباب ہونا چاہیے ناصر!"

میں نے کہا "ابھی دیکھو شبنم کا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے' وہ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس سے احتجاج کرنے کی اپیل کرے۔ وہ کسی کا نام لیے بغیر یا تفصیل میں جائے بغیر پولیس کی غنڈا گردی کی شکایت کرے اور بتائے کہ اسے غیر قانونی طور پر اغوا کر کے کسی نامعلوم مقام پر رات بھر تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور اس سے پوچھا گیا کہ شاہ عالم کہاں ہے؟ شاہ عالم پولیس کی تحویل سے فرار ہوا تھا اور اب پولیس اسے دوبارہ گرفتار کرنے میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے کے بجائے ایسے ہتھکنڈوں پر اتر آئی ہے۔"

"لیکن جرنلسٹوں کے احتجاج سے وہ محفوظ تو نہیں ہو گی۔"

"لاقانونیت سے یہاں کس کو تحفظ ہے۔ تمہارے ساتھ سیکیورٹی گارڈ کیوں رہتے ہیں؟ اس لیے کہ تم بھی غنڈا گردی سے ڈرتی ہو۔ غنڈے کہاں نہیں ہوتے اور جہاں کی پولیس خود غنڈا گردی پر اتر آئے' وہاں شہریوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اگر میں بھی شبنم کے ساتھ ایک یا دو سیکیورٹی گارڈ رکھنا چاہوں تو یہ میرے لیے کوئی مشکل نہیں۔ میں افورڈ کر سکتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے شبنم اس پر راضی نہیں ہو گی۔ دن کے چوبیس گھنٹے کون

قیدیوں کی طرح رہ سکتا ہے؟ اور پھر یہ دو چار دن کی بات نہیں، وہ شبنم پر نظر رکھیں گے۔"

"بعد میں کیا ہوگا؟ یہ چھوڑو، میں بھی ساری عمر اپنے ساتھ سیکیورٹی گارڈ نہیں رکھوں گی۔ لیکن جب خطرہ ہو تب تو کوئی حرج نہیں۔"

میں نے کہا "اگر شبنم نے مخالفت نہ کی تو میں اسے پرائیویٹ سیکیورٹی فراہم کروں گا۔"

"جس کمپنی کے گارڈ میں نے لیے ہیں وہ بہت قابلِ اعتماد ہیں۔"

میں نے کہا "یہ کہو کہ تمہارا دل اس انتظام سے مطمئن ہے۔ ورنہ اصل حفاظت کرنے والا تو خدا ہے۔"

"چلو یہی سمجھ لو۔ خدا نے یہ تو نہیں کہا کہ تم خود کچھ مت کرو کیونکہ تمہاری حفاظت کے لیے میں جو موجود ہوں" نیلم خفا ہونے لگی۔

میں نے کہا "اوکے اوکے! شبنم کے لیے سیکیورٹی گارڈ ہو جائیں گے لیکن مجھے بتاؤ کہ اور کس کس کی حفاظت کے لیے سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کی جانی چاہئیں۔ خطرہ تمہیں بھی ہے، چندا کو، کمال اور قمر یار رئیس۔ سب کے ساتھ وہی ہو سکتا ہے جو شبنم کے ساتھ ہوا۔"

"کیا ہم سب کو اس بات کا خیال نہیں رکھنا چاہیے؟"

میں نے کہا "دیکھو نیلم یہ چند دن کی بات ہے۔ اس کے بعد شاہ عالم ایک ماضی کی داستان ہو جائے گا۔ لوگ اسے بھول جائیں گے۔ اس کے دوست اور دشمن سب کے لیے اسے یاد رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔"

"اگر چند دن کی بات کرتے ہو تو پھر چند دن کے لیے تم گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "نہیں نیلم! میں دنیا سے منہ چھپا کے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے یعنی ناصر عظیم کو اپنی شناخت پھر سے قائم کرنی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ناصر عظیم کو شاہ عالم سمجھے جانے کا اندیشہ ہی باقی نہ رہے۔ وہ شاہ عالم کے خوف سے بے نیاز ہو کے آزادانہ اس شہر میں رہنے کا حق حاصل کر سکے۔"

ہم ابھی کھانا کھا کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ باہر ایک شور مچ گیا۔ اسٹوڈیو کے ملازموں میں سے ایک نے آفس میں جھانک کے دیکھا اور پھر اندر آ گیا۔

"میڈم۔۔۔ وہ پھر آ گیا ہے۔"

"کون۔۔۔؟ اور تم اتنے بدحواس کیوں ہو؟" نیلم نے کہا۔

"میڈم جی! اس کا گیٹ پر بھی بڑا جھگڑا ہوا ہے" دبلے پتلے مدقوق سے ملازم نے خوف زدہ لہجے میں بتایا۔

"بے وقوف۔ تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"وہ جی۔ استاد موج دین قصور والا۔ اپنے ہدایت کار ہمراز صاحب نے کہا کہ میں آپ کو بتا دوں۔"

نیلم کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے اڑا "ٹھیک ہے، تم نے بتا دیا۔ اب جا کے ہمراز صاحب کو بتا دو کہ میں سیٹ پر کسی سے ملنا نہیں چاہتی۔"

حواس باختہ ملازم نے کچھ اور کہنے کی خواہش پر قابو پایا اور کچھ پریشان سا باہر نکل گیا۔

استاد موج دین قصور والا کا نام میں نے بھی سن رکھا تھا۔ وہ آج کل لاہور کا بدمعاش نمبر ون بنا ہوا تھا کیونکہ اسے ایک سابق وزیرِ اعلیٰ کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی اور اس نے اپنے چیلوں چانٹوں کے ساتھ لاہور میں غنڈا گردی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ کہا یہ جاتا تھا کہ اس کے جوئے اور سٹے کے کئی اڈے چل رہے تھے اور اس کی بسوں کو لاہور سے مضافات تک جانے والے ہر روٹ پر اجارہ داری حاصل تھی۔ اس کے ٹرک لاہور سے کراچی تک ہر قسم کا مال لاتے لے جاتے تھے۔ پہلے اس کے خلاف ہر تھانے میں چوری ڈکیتی اور مار پیٹ کے درجنوں مقدمات درج تھے مگر اب وہ سب قصۂ پارینہ ہو گئے تھے۔ موج دین قصوری آنے والے انتخابات میں زیادہ اونچی پرواز کے لیے پر تول رہا تھا۔ ابھی وہ لاہور کارپوریشن کا ممبر تھا مگر اب اسے اپنے مربی اور محافظ سابق وزیرِ اعلیٰ کی پشت پناہی سے صوبائی اسمبلی کے لیے آگے بڑھایا جا رہا تھا۔ جی ٹی روڈ پر اس کے دو پیٹرول پمپ تھے جہاں سے سرکاری گاڑیوں اور روڈ ٹرانسپورٹ والوں کے لیے ڈیزل پیٹرول لینا گویا لازمی تھا۔ دولت مندی کے اعتبار سے طبقۂ اشراف میں شامل ہونے کے باوجود وہ ابھی تک استاد کہلانا پسند کرتا تھا اور بدمعاشوں کے حلقے میں ابھی تک اس کی شہرت موجود بدمعاش کی حیثیت سے قائم تھی۔

نیلم کی پریشانی اور رئیس کے چہرے پر ناگواری کے آثار دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ موجو کا مقصد صرف نیلم سے شرفِ ملاقات حاصل کرنا ہی نہیں ہوگا ورنہ سب سے ملنے والی نیلم اسے کیوں انکار کرتی۔

میں نے کہا "استاد موج دین قصور والے کو کیا پریشانی ہے؟"

رئیس نے برہمی سے کہا "میں بہت برداشت سے کام لے رہا ہوں۔"

نیلم نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی "تمہیں ایسے

معاملات کو ڈپلومیسی سے حل کرنے کی عادت ہونی چاہیے۔"

"اس لیے کہ میں تمہارا سیکریٹری ہوں؟" رئیس کا غصہ کم نہیں ہوا۔

"ہاں۔ اس لیے کہ تم میرے سیکریٹری ہو" نیلم نے پرسکون رہتے ہوئے کہا۔

ایک شخص اندر آیا جس کا سر انڈے کی طرح صاف تھا اور اس پر پسینہ چمک رہا تھا۔ اس نے ڈھیلی اور میلی پتلون پر رنگین بشرٹ پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں ایک فیلٹ ہیٹ تھام رکھا تھا۔ اپنے حلیے اور تیور سے وہ خود اپنے ہدایت کار ہونے کا اشتہار نظر آتا تھا۔

"میڈم! ابھی یہ مسئلہ حل کریں۔" اس نے ہیٹ کو میز پر رکھا اور جیب سے رومال نکال کے سر کا پسینہ صاف کرنے لگا۔

"سیٹ پر اور اسٹوڈیو میں ایسے مسئلے حل کرنا میرا کام نہیں ہے ہمراز صاحب!" نیلم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"آپ خود ہی اسے سمجھا دیں کہ گڑبڑ نہ کرے۔" رئیس بولا۔

ڈائریکٹر صاحب ایک اسٹول پر ٹک گئے۔ "ایسے سمجھنے والے لوگ ہوتے تو یہ نوبت ہی کیوں آتی۔ ابھی تو میں نے اسے باعزت طور پر دوسری جگہ بٹھا دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ میڈم کھانا کھا رہی ہیں۔ لیکن وہ ایسے ٹلنے والا نہیں ہے۔ وہ آپ سے مل کے ہی جائے گا۔"

"میں اس سے نہیں ملوں گی" نیلم نے قطعی لہجے میں کہا۔

"بس۔ اسے ایک بار نہیں دس بار جو بات سمجھا دی گئی ہے، وہ اسے شرافت سے سمجھ لینی چاہیے" رئیس نے کہا۔

"شرافت سے" ہمراز صاحب نے ٹھنڈی سانس لی "آپ بھی لطیفہ پیدا کرتے ہیں رئیس صاحب۔ ایسے بدمعاشوں کا شرافت سے اتنا بھی رشتہ نہیں ہوتا جتنا طوائف کا پاکیزگی سے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اس سے مل لیں اور اسے سمجھا بجھا کے قائل کریں۔"

"آخر کیسے قائل ہوگا وہ۔ میں نے اسے بتا دیا، سمجھا دیا۔ وہ اخبارات دکھا دیے جن میں میرے فلموں سے ریٹائر ہونے کی خبر شائع ہوئی تھی۔"

"میڈم، اب اس مصیبت کو کسی طرح ٹالنا تو ہوگا" ڈائریکٹر صاحب نے لجاجت سے کہا۔

رئیس خان خود ایک زمانے میں ہر قسم کی بدمعاشی کر چکے تھے اور کسی بدمعاش کے رعب میں آنے والے نہیں تھے۔ وہ استاد موج دین سے اپنے انداز میں نمٹنا چاہتا تھا جب کہ ہدایت کار کی خواہش تھی کہ مسئلہ افہام و تفہیم سے حل ہو جائے اور دونوں بڑی طاقتوں کے ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔

نیلم کا موڈ بہت خراب ہو چکا تھا اور آثار یہ تھے کہ صورتِ حال بہتر ہونے کے بجائے زیادہ خراب ہو جائے گی۔ میں وہاں سے ٹل جانے کا سوچ رہا تھا کہ استاد موج دین خود وہاں آ گیا۔

باہر کسی نے کہا۔ "جنابِ عالی! میڈم کے پاس مہمان ہیں۔"

"او یار، ہم بھی مہمان ہیں" موج دین نے بھاری بھرکم آواز میں کہا "اور ان کے مہمان تو ہمارے مہمان!" پھر وہ اندر آ گیا۔

استاد موج دین قصور والا کو میں نے پہلے کہیں دیکھا نہیں تھا لیکن اس کا نام پہلے سے سن رکھا تھا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے قد کا اور شاید پینتیس چالیس سال کے درمیان کی عمر کا صحت مند آدمی تھا مگر اس کی صحت مندی نمائشی چیز زیادہ تھی۔ عام پہلوانوں کی طرح اس کا بدن بھاری تھا اور اس پر گوشت اور چربی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے ڈیل ڈول کی طرح اس کی مونچھیں بھی دوسروں کو مرعوب اور دہشت زدہ کرنے کے لیے تھیں۔ اس کا چہرہ تخریبی حالات کی تصویر تھا۔ اس کی صورت کے نقوش میں پُر آسائش اور مہذب زندگی کی نرمی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور غصیلی نظر آتی تھیں اور ان میں نشے کی لالی سی دکھائی دیتی تھی۔ اس نے چارخانے والے ریشمی کپڑے کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی جس کی ایک جیب بہت بوجھل نظر آتی تھی۔ غالباً اس میں ریوالور جیسا اسلحہ تھا۔ اپنی عمرِ گزشتہ کے کارناموں کا عکس ان نشانات کی صورت میں بھی نظر آتا تھا جو اس کے چہرے پر میڈلوں کی طرح سجے ہوئے تھے۔ کسی کلہاڑی جیسے ہتھیار کا ایک زخم عین دائیں آنکھ کے اوپر تھا۔ اس کے مقابل بائیں آنکھ کے نیچے گھاؤ کا دوسرا نشان تھا۔

موج دین اکیلا نہیں تھا۔ استاد ہونے کی وجہ سے شاگرد اس کے ہمرکاب ہوتے تھے اور وہ ان کے جلو میں بدمعاشی کی پوری شان کے ساتھ چلتا تھا۔ اس کے شاگرد بھی حلیے اور انداز سے بدمعاش نظر آنے کی پوری کوشش کرتے تھے اور یہ ظاہر کرتے تھے کہ استادِ محترم کی آن بان اور شان کی حفاظت پر وہ اپنی جان قربان کرنا عین سعادت سمجھتے ہیں۔

"اوجی خیر ہووے سب کی۔ سلاماں لیکم جناب!" موج دین نے اندر آکے اپنی خوش اخلاقی اور خوش گفتاری کا مظاہرہ کیا۔

اس کے سلام کا جواب صرف میں نے سر کے اشارے سے دیا۔ رئیس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ ضبط سے کام لے رہا ہے ورنہ اس سلام کے جواب میں وہ کہتا کہ لعنت ہو تمہاری صورت پر۔ نیلم کے چہرے پر خفگی آمیز متانت بھی بہت واضح تھی لیکن موج دین ڈھیٹ اور ضدی آدمی تھا۔ وہ اندر آکے ایک صوفے میں سما گیا۔

"چلو بھئی تم لوگ ذرا باہر بیٹھو" اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "ادھر تو اتنی جگہ نہیں ہے کہ ہم سب کی تشریف کا ٹوکرا رکھا جائے" وہ اپنے مذاق پر خود ہی ہنسا۔ اس کے ساتھی سب کو گھورتے ہوئے یوں باہر چلے گئے جیسے کمرے میں جگہ کا نہ ہونا ہمارا قصور تھا۔ کمرا خاصا بڑا تھا مگر اس میں بہت وسیع آفس ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر زمانے بھر کا الم غلم ڈھیر تھا۔ کمرے کے مختلف گوشوں میں بھی پروڈکشن میں کام آنے والا سامان رکھا ہوا تھا۔ صرف ایک گوشہ محفوظ تھا جس میں ایک صوفہ سیٹ کے ساتھ ایک سینٹر ٹیبل لگا دی گئی تھی جہاں پروڈیوسر کے دو چار مہمان بیٹھ سکتے تھے۔

"کہئے موج دین صاحب! دوبارہ کیسے زحمت کی؟" نیلم نے کہا۔

"زحمت۔۔!" وہ منہ کھول کے ہنسا "اوجی بادشاہو آپ سے ملنا تو دل کے لیے بڑی رحمت ہے۔"

"میرا مطلب تھا اب کیا کام ہے آپ کو مجھ سے؟"

"دیکھو جناب عالی! اپنا تو ایک ہی کام ہے' آپ جانتے ہو۔"

"اور وہ میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ مجبور ہوں۔ میں نے فلمیں لینا بند کردی ہیں اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

وہ مسکرانے لگا "ایسا مت کہو میڈم! کوئی فیصلہ آخری فیصلہ نہیں ہوتا بندے کا۔ یہ کوئی رب کا فیصلہ نہیں ہے کہ بدلا نہ جاسکے۔"

"ابھی تک میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں۔ بہت پروڈیوسر آتے ہیں میرے پاس' میرا سب کے لیے ایک ہی جواب ہے۔"

"اوجی' ایسا ظلم مت کرو۔ ہم دوسروں کی بات نہیں کرتے۔ ہمارا کام کردو آپ' تو آپ کی بڑی مہربانی۔ اب ہم نے فیصلہ کرہی لیا ہے فلم بنانے کا اور آپ کو ہیروئن لینے کا' تو آپ انکار مت کرو۔"

"استاد جی! آپ پیار کرلو۔ پچھلے دو مہینے سے میں نے ایک بھی نئی فلم سائن کی ہو تو میں مجرم۔ میں نے بہت پہلے فیصلہ کرلیا تھا کہ جو فلمیں زیر تکمیل ہیں انہیں مکمل کرانے کے بعد فلم لائن چھوڑ دوں گی اور اب میری آخری چھ فلمیں سیٹ پر ہیں۔ اس وقت میں کوئی بھی نئی فلم کیسے لے لوں۔ میرے سارے پلان ادھورے رہ جائیں گے' آئی ایم سوری!"

موج دین سپاٹ چہرے سے کوئی تاثر ظاہر کیے بغیر مسکراتا رہا اور نیلم کو ایسے دیکھتا رہا جیسے وہ فارسی بول رہی ہے "دیکھو جناب' ہم تو ایک بات جانتے ہیں۔ ہماری فلم مکمل ہوجائے گی تین چار مہینے میں۔ آپ اس کے بعد ریٹائر ہوجاؤ گے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ اور سچ مانو' ہماری بات تو ہم عرض کریں کہ آخر آپ کو ضرورت کیا ہے فلمی دنیا چھوڑنے کی؟"

"یہ میرا پرائیویٹ معاملہ ہے موج دین صاحب!" نیلم نے سخت لہجے میں کہا۔

رئیس اب خاموش نہ رہ سکا "اور تم کون ہوتے ہو نیلم کو مجبور کرنے والے؟"

موج دین کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی "دیکھ یار۔ کیا نام ہے تیرا۔۔۔ رئیس' ہم جانتے ہیں تجھے بھی اچھی طرح۔ تو بیچ میں مت بول۔"

نیلم نے اچانک مضبوط لہجے میں کہہ دیا "رئیس کو آپ صرف میرا سیکریٹری مت سمجھیں۔ میں رئیس سے شادی کررہی ہوں۔"

نیلم اگر اپنے چھوٹے سے ہینڈ بیگ سے کلاشنکوف نکال لیتی تو کسی کا بے یقینی اور صدمے سے وہ حال نہ ہوتا جو اس اعلان سے ہوا۔ چند لمحوں کے لیے وہاں سناٹا چھا گیا۔ استاد موج دین کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ رئیس کی حیثیت یکلخت بدل کے بہت برتر و افضل ہوگئی اور میں اس "انکشاف" پر خاموشی سے مسکراتا رہا۔

بالآخر رئیس نے کہا "اب بات تمہاری سمجھ میں آجانی چاہیے۔ نیلم کے پاس ٹائم نہیں ہے ایک بھی فلم کے لیے۔"

موج دین اسے گھورتا رہا "ٹائم تو خیر اسے نکالنا پڑے گا۔ اس کی مرضی ہے جس ایرے غیرے سے چاہے شادی کرلے مگر استاد موج دین کی فلم تو بنے گی اور اس میں ہیروئن بھی نیلم ہی ہوگی۔"

"میرا خیال ہے تم اب جاؤ" رئیس نے چٹکی بجائی۔

موج دین کی آنکھوں میں غیظ و غضب کے آثار نمودار ہوئے "کسی کی مجال ہے کہ ہمیں ایسے کتے کی طرح دھتکار دے۔"

نیلم نے پھر معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی "استاد جی۔ ایک میرے نہ ہونے سے فلمی دنیا کو کیا فرق پڑتا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک ہیروئن موجود ہے اور میں تو کہتی ہوں کہ یہ جو نئی لڑکیاں آئی ہیں' یہ بہت اچھی ہیں۔ اب ریما کو لے لیں' میرا ہے اور ریشم ہے۔"

"تم اپنا لیکچر رہنے دو۔ سیدھی طرح شرافت سے بتاؤ کہ میری فلم سائن کروگی یا نہیں؟" موج دین دھاڑنے لگا۔

رئیس نے آگ بگولا ہوکے کہا "دھمکی دیتا ہے نیلم کو میرے سامنے۔ چل اٹھ' اٹھ تیری تو۔۔۔"

استاد اچھل کے کھڑا ہوگیا اور چیخ کے بولا "میرے سامنے بھونکتا ہے کتے!"

اب میرے لیے دخل اندازی ناگزیر ہوگئی۔ میں فوراً ان کے بیچ میں آگیا ورنہ استاد کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھ چکا تھا اور رئیس کا اپنی جیب کی طرف۔

میں نے دونوں طرف سے دھکے کھائے۔ رئیس اور موج دین اعلانیہ ایک دوسرے کے مقابل آچکے تھے۔ میں نے کہا "خدا کے لیے آپ دونوں عقل سے کام لیں۔"

موج دین نے مجھے دھکا دیا "تو ہٹ جا بیچ میں سے۔"

رئیس نے بھی مجھے ایک طرف کرنے کی کوشش کی۔

"میں ابھی اس کی ساری بدمعاشی نکال دیتا ہوں۔"

ہنگامہ سن کے موج دین کے ساتھی اندر گھس آئے اور کتے کے ساتھ بھونکنے والے پلوں کی طرح بولنے لگے "اوئے میں تیری زبان کھینچ کے ہاتھ پر رکھ دوں گا" ایک نے رئیس کو گالی دے کر کہا۔

دوسرے نے کہا "تو ہے کون۔۔۔؟"

میں نے بحالیٔ امن کی کوشش جاری رکھی "استاد موج دین۔ آپ اپنے ساتھیوں سے کہیں باہر جائیں۔ میں ابھی معاملہ سلجھا دیتا ہوں۔"

اچانک موج دین نے کہا "اوئے شاہ عالم۔ تو اپنی سیاست کر' ہمارے معاملات میں ٹانگ مت اڑا۔"

میں نے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔"

اس نے مجھے بھی ایک گالی دی "اپنا نام ہی نہیں ولدیت بھی بدل لے تو' مگر ہم کیا جانتے نہیں تجھے۔ تو مفرور ہے' ہے یا نہیں؟"

موج دین کے ایک ساتھی نے سرہلایا "یہ تو پولیس کی حراست سے فرار ہوا تھا۔"

دوسرے نے کہا "بلاؤ پولیس کو۔"

اب موقع نہ تھا کہ میں اپنے شاہ عالم ہونے یا نہ ہونے کے معاملے کو زیر بحث لاؤں۔ اصل مسئلہ اس جھگڑے کو ختم کرنے کا تھا جو سنگین صورت بھی اختیار کرسکتا تھا۔ چنانچہ میں ساری بے عزتی کو برداشت کرگیا۔

میں نے کہا "استاد جی۔ ایگری منٹ ہے آپ کے پاس؟"

"ایگری منٹ۔۔؟" استاد کے غصے کی آگ پر جیسے پانی پڑ گیا۔

میں نے کہا "ہاں' ایگری منٹ تیار ہے تو نکالیں' میں سائن کرادیتا ہوں۔"

"تو کیسے سائن کرادے گا؟"

میں نے کہا "یہ آپ مجھ پر چھوڑیں"

نیلم نے پھر کہا "میں ہرگز یہ ایگری منٹ سائن نہیں کروں گی۔"

استاد نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا "اوئے ایگری منٹ لایا ہے اپنے ساتھ؟"

"لایا ہوں استاد جی!" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

میں نے ایگری منٹ لے لیا "بیٹھ جائیں آپ استاد جی۔ اور اپنے ساتھیوں سے کہیں کہ باہر جائیں۔"

رئیس نے کہا "یار' یہ کیا کررہا ہے تو؟"

استاد موج دین نے اپنے ساتھیوں کو باہر بھیج دیا "چلو' تم لوگ باہر انتظار کرو۔"

وہ رئیس کو گھورتے ہوئے چلے گئے۔ استاد موج دین اور رئیس بھی بیٹھ گئے تو میں نے کہا "استاد جی۔ ایک بات بتاؤ' یہاں تم نے نیلم سے زبردستی ایگری منٹ سائن کرالیا تو اس کی قانونی حیثیت کیا ہوگی؟"

"کیا مطلب؟" وہ بھڑک اٹھا۔

میں نے کہا "مطلب یہ کہ گن پوائنٹ پر سائن کرائے ہوئے کسی ایگری منٹ کی حیثیت کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ دستخط تو میں ابھی کرادیتا ہوں۔"

موج دین بدمعاشی سے مسکرایا "شاہ عالم۔ ہمارے ساتھ سیاست مت کھیل' تو سائن کرا' آگے ہم نمٹ لیں گے۔"

اس وقت اچانک ہدایت کار ہمراز صاحب اندر آگئے۔ موج دین کی آخری بات سن لی تھی۔ "بھئی بہت خوب۔ آپ شاہ عالم ہیں۔ ہم بھی سوچ رہے تھے کہ آپ کو کہاں دیکھا ہے۔ آپ سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی۔"

موج دین معنی خیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے ایک سوال بہت واضح نظر آیا۔

استاد موج دین کی آنکھوں کا سوال واضح تھا لیکن مجھے اس وقت ہمراز صاحب کی فکر ہو گئی تھی۔ اس نے جس طرح نازک موقع پر مجھے شناخت کرنے اور نیلم کے ساتھ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ اگر یہ بات لیک آؤٹ ہو جاتی تو پنڈورا بکس کھل جاتا۔ نیلم کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا' وہ اطمینان سے کہہ سکتی تھی۔ شاہ عالم میرا فین ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے اکثر فلمی اداکاراؤں کے ساتھ کسی نہ کسی طاقت ور سیاست داں کا نام نتھی ہوتا رہا ہے۔ البتہ نیلم ایک سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی کہ شاہ عالم کے ہم شکل سے اس کا کیا تعلق ہے۔ ناصر عظیم کون ہے۔ اسے کب سے جانتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ شاہ عالم کا ہم شکل ہے۔ سوال سے سوال نکلتے چلے جاتے اور میں ان سوالوں میں اس طرح پھنس جاتا ہے جیسے کوئی بدنصیب دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ جتنا ہاتھ پاؤں مارتا ہے اس میں اور دھنستا چلا جاتا ہے۔ استاد موج دین جیسے بدمعاش سے زیادہ بے ضرر نظر آنے والا یہ ہدایت کار میرے لیے خطرناک ثابت ہوا تھا۔ وہ شوبزنس سے تعلق رکھتا تھا اور یہاں خبریں جنگل کی آگ سے زیادہ تیزی سے پھیلتی ہیں۔ اگر میں تسلیم کر لیتا کہ میں شاہ عالم ہوں تو نیلم مصیبت میں پڑ جاتی۔ وہ کتنی ہی بڑی اداکارہ سہی لیکن میرے بلکہ شاہ عالم کے مخالفین بھی کمزور نہیں تھے۔ پولیس ضرور آتی اور یہ سوال بھی کرتی کہ نیلم ایک مفرور ملزم شاہ عالم کے ساتھ کیا کر رہی تھی۔ اس سے کوئی جواب بن نہ پڑتا۔ میرے ذہن میں جو تھا وہی نیلم بھی سوچ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے پہلے کہا۔

"ہمراز صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ شاہ عالم نہیں۔ ناصر عظیم ہے۔"

ہمراز صاحب مربیانہ انداز میں مسکرائے "لو جی غلط فہمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سو فیصد شاہ عالم ہے۔ میرا ذہن کیمرا ہے ایک بار جو صورت دیکھ لی سمجھو ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی۔"

پہلے استاد موج دین نے تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا لیکن اب نیلم نے بھی تردید کر دی تھی۔ وہ صورت حال میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھایا "میں ثابت کر سکتا ہوں کہ میں شاہ عالم نہیں بلکہ ناصر عظیم ہوں۔ اس شہر کا ایک پرانا بزنس مین۔ میرا کنسٹرکشن کا بزنس تھا اور میں اسے دوبارہ اسٹیبلش کر رہا ہوں۔ میرے بچپن کے حوالے ہیں۔"

ہمراز صاحب کھی کھی کر کے ہنسے ان کی بقیہ ہنسی کہیں گلے میں ہی رہ گئی "خوب گویا یہ تو فلمی کہانی ہو گئی۔ بائے دا وے ناصر صاحب آپ اب تک کہاں تھے؟"

"اسی شہر میں۔" میں نے بے خوفی سے کہا "میرے پرانے کاروباری ساتھی' دوست احباب اور جاننے والے گواہی دیں گے۔ رشتے دار کوئی ہے نہیں۔ کیونکہ میں نے ایک یتیم خانے میں پرورش پائی ہے۔"

موج دین حقارت سے مسکرایا "یعنی تیرے باپ کا پتا ہے نہ ماں کا۔"

میں نے تحمل سے جواب دیا "دنیا والے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔ استاد موج دین صاحب' بھونکنے والے تو یہ بھی بھونکتے ہیں کہ آپ کی ولدیت میں اصل نام اس سابق وزیر اعلیٰ کا لکھنا چاہیے جو آج کل آپ کا سرپرست ہے لیکن اس سے آپ کی ولدیت پر کوئی حروف نہیں آتا۔"

استاد موج دین کی آنکھ میں شعلہ سا لپکا لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔ پہل اس نے کی تھی۔ اسے نظر انداز کر کے میں نے ہمراز صاحب کے ملاحظے کے لیے اپنا شناختی کارڈ' چیک بک اور کچھ دیگر کاغذات پیش کیے "یہ کاغذات ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ آپ چاہیں تو کسی بھی جگہ سے اس کی تصدیق کرا سکتے ہیں۔ بینک منیجر میرا پرانا جاننے والا ہے۔ بیس سال پہلے اس نے میرا اکاؤنٹ کھولا تھا جب میں میٹرک کر رہا تھا۔ یہ اکاؤنٹ شادو نے کھلوایا تھا۔ وہی میری زندگی کو اس راہ پر لے کر آئی تھی جس پر چل کر میں ناصر عظیم بنا اور خود میری راہ سے خاموشی سے ہٹ گئی تھی۔ کتنی بے غرض اور بے لوث محبت تھی۔ میں خوش نصیب تھا کہ ایک بھی خونی رشتہ نہ رکھنے کے باوجود مجھے اتنے بے لوث اور پر خلوص چاہنے والے ملے تھے۔"

ہمراز صاحب کے چہرے پر تذبذب کے آثار نظر آنے لگے تھے اور ان کا اپنے کیمرا صفت دماغ پر اعتماد متزلزل ہو گیا تھا۔

"ایسے کتنے ہی شناختی کارڈ اور کاغذات موج دین کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔"

"استاد موج دین تمہارے حوالے اور پس منظر بھی کیا جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ سچ ایک ہی ہوتا ہے اور سچ یہ ہے کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ تم جس طرح چاہے تصدیق کر لو۔ شاہ عالم سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور سوائے تصویروں کے میں نے کبھی اسے آمنے سامنے سے نہیں دیکھا ہے۔"

"لیکن لندن میں۔۔۔" ہمراز صاحب نے کہنا چاہا۔

نیلم نے اس کی بات کاٹی "وہ شاہ عالم ہی تھا۔ وہ میرے

فن کے پرستاروں میں تھا اور اتفاق سے لندن میں ملاقات ہو گئی۔ اس نے وہاں مدد کی درخواست کی تو میں مسترد نہ کر سکی تھی۔"

"فن کا یا تمہارا پرستار" موج دین معنی خیز انداز میں بولا "شاہ عالم کی عیش پرستی سے تو ایک زمانہ واقف ہے۔"

رئیس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا لیکن اس سے پہلے ہی نیلم نے جواب دیا "جب وہ لندن میں ملا تو بالکل بدل گیا تھا اور مشکل میں بھی تھا۔ اب میں سیاست داں تو ہوں نہیں کہ کسی پر برا وقت آئے تو نظریں پھیر لوں۔ استاد موج دین صاحب!"

"چلو جی ہمیں کیا کہ یہ ناصر عظیم ہیں یا شاہ عالم۔ آپ ایگری منٹ پر دستخط کرو۔"

"نیلم کوئی سائن نہیں کرے گی۔" رئیس نے تیز لہجے میں کہا۔

"یار' اتنا پریشان مت ہو۔" میں نے رئیس کو آنکھ ماری "جہاں نیلم چھ فلموں میں کام کر رہی ہے وہاں ساتویں بھی سہی۔ بلکہ یہ ساتویں فلم بھی اسی مدت میں بن جائے گی۔ باقی فلموں میں نیلم کا اکثر کام مکمل ہو چکا ہے۔"

ہمراز صاحب نے سکون کا سانس لیتے ہوئے اعلان کیا "میری فلم تو مکمل ہی سمجھو آپ لوگ!"

رئیس نے اشارہ سمجھ لیا تھا لیکن دکھاوے کے لیے تھوڑی بہت مزاحمت کی۔ نیلم نے ایگری منٹ لے کر اس پر سائن کر دیے لیکن چالاک موج دین کچی گولیاں کھیل کر استادی کے درجے تک نہیں پہنچا تھا۔ اس نے اپنے خاص گرگے کو آواز دی۔ وہ شاید دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ فوراً اندر آ گیا "موجے۔ گڈی اور رسید نکال۔"

موجے نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی اور ایک پکی رسید نکال کر نیلم کے سامنے رکھ دی "لیں جی' بسم اللہ کریں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے موج دین صاحب۔" نیلم نے کہا۔

"نہ جی انکار نہ کریں۔ یہ تو انڈسٹری کی ریت ہے۔" موج دین کا لہجہ معنی خیز تھا "اداکارائیں تو کوشش کرتی ہیں کہ سارا معاوضہ ایڈوانس لے لیں۔ رقم اٹھائیں اور مجھے ڈیٹس دے دیں۔"

بادل ناخواستہ نیلم نے نوٹ اٹھا لیے اور رسید پر دستخط کر دیے "تاریخیں میں آپ کو اپنا شیڈول چیک کرنے کے بعد دوں گی۔"

"چنگا جی۔" استاد موج دین اٹھ کھڑا ہوا "پر ایک خیال رکھیے گا میری فلم کے سیٹ پر آپ اکیلی آئیں گی۔ کسی ایرے غیرے کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کا اشارہ واضح طور پر رئیس کی طرف تھا۔

رئیس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نیلم نے ایک بار پھر پرسکون انداز میں جواب دیا "موج دین صاحب۔ میں ویسے بھی سیٹ پر فالتو لوگ لانے کی قائل نہیں ہوں۔ میرے ساتھ میرا سیکریٹری ہوتا ہے جو میرے تمام معاملات دیکھتا ہے اور کبھی کبھی ایک ملازمہ ہوتی ہے۔ جو چائے اور کھانا وغیرہ سرو کرتی ہے۔"

"میری فلم میں آپ کو ان لوگوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" موج دین نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آپ کے ابرو کا ایک اشارہ کافی ہوگا۔ ہر شے حاضر ہو جائے گی۔"

نیلم نے ناگواری سے اسے دیکھا "موج دین صاحب اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ آپ نے ابھی سے شرطیں لگانا شروع کر دی ہیں۔ آپ کا ایڈوانس واپس بھی ہو سکتا ہے۔ میں شرائط کے ساتھ کام نہیں کرتی۔"

موج دین نے فوراً پینترا بدلا "او جی آپ تو ناراض ہو گئیں۔ چلیں جیسے آپ کی خوشی۔ آپ چاہو تو بے شک پوری برات لے آؤ۔"

جب تک موج دین موجود رہا' رئیس غصے سے بل کھاتا رہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ موج دین کی چرب گردن دبا دے یا اس کی گالوں میں دھنسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکال لے۔ جن میں نیلم کے لیے ہوس بھری ہوئی تھی مگر وہ میری وجہ سے مجبور تھا۔ اس کے جاتے ہی وہ پھٹ پڑا۔ اس نے نیلم اور ہمراز صاحب کی پروا کیے بغیر موج دین کو ایک سے ایک گالی دی اور اس کی ایسی کم تیسی کرنے کا اعلان کیا۔ نیلم نے بمشکل اسے ٹھنڈا کیا تھا۔ ہمراز صاحب اب تک مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ ماحول کی گرمی سے ان کی صاف شدہ چاند پر پسینہ آ رہا تھا۔ انہوں نے ایک گلاس پانی پیا۔

"اتنی مشابہت میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھی۔" ان کے لہجے میں شک تھا۔

"حالانکہ فلموں میں آئے دن ڈبل کردار پیش کیے جاتے ہیں۔" میں نے کہا "ملتی جلتی شکلیں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جب ناقابل یقین حد تک مشابہ لوگ سامنے آئے۔ جن کا آپس میں کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ ہٹلر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے کئی ہم شکل تھے جنہیں وہ استعمال کرتا تھا۔ امریکا کے صدر لنڈن بی

جانسن اور چرچل کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے۔ نپولین بھی اپنا ڈبل رکھتا تھا۔ بے شمار معروف فنکار، اداکار اور کھلاڑی ایسے گزرے جن سے ناقابل یقین مشابہت رکھنے والے افراد سامنے آئے۔ اب اگر میں شاہ عالم کا ہم شکل ہوں تو اسے سوائے اتفاق کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔"

"ہمراز صاحب آپ یہ بھی سوچیں کہ کیا شاہ عالم اتنا ہی احمق ہوگا کہ پولیس کی قید سے فرار ہونے کے بعد یہاں اسٹوڈیو میں آئے گا۔ ایسا تو احمق ترین مجرم بھی نہیں کرتا۔ وہ تو پھر بھی شاہ عالم ہے۔" نیلم نے دلیل دی۔

"اور شاہ عالم کو پولیس نے مار دیا ہے۔ اس کی لاش غائب کرکے مفرور مشہور کردیا ہے۔ شامت بے چارے ناصر کی آرہی ہے۔" رئیس نے کہا تو ہمراز صاحب قائل نظر آنے لگے۔ غنیمت رہا کہ انہوں نے شاہ عالم والی بات خود تک محدود رکھی۔ پورے اسٹوڈیو میں اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ دیا۔ موج دین کی آمد سے پہلے ہم کھانا تقریباً ختم کرچکے تھے۔ اس کے بعد موج دین نے آکر بدمزگی کردی۔ اب ہم میں سے کسی کا کھانا ختم کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لہٰذا نیلم نے خادمہ کو برتن سمیٹنے کا کہا۔

"کیا خیال ہے میڈم شوٹنگ شروع کی جائے۔" ہمراز صاحب بے چین لگ رہے تھے۔

"آپ سیٹ پر چلئے۔ میں آتی ہوں۔" نیلم نے کہا تو وہ سرہلاتے ہوئے چلے گئے۔ نیلم نے خفگی سے کہا "یہ کیا حماقت کی مجھ سے اگریمنٹ سائن کروادیجے۔ اس کمینے سے ایڈوانس بھی لینا پڑا۔ قلم کا تو بہانہ ہے ورنہ اس کی نظر۔"

نیلم بات مکمل نہ کرسکی تھی لیکن میں نے اور رئیس نے اس کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ رئیس نے ایک بار پھر موج دین کی ایسی کم تیسی کرنے کا اعلان کیا۔ میں نے نیلم سے کہا "تم اس قلم میں کام نہیں کروگی۔ میں نے اسے ٹالنے کے لیے تم سے سائن کرائے ہیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ ہمراز صاحب نے آکر کام خراب کردیا۔ ورنہ اسے صاف انکار بھی کیا جاسکتا تھا۔"

"بکواس نہ کر۔" رئیس بھڑک اٹھا "تونے پہلے ہی سائن کرنے کی بات کردی تھی۔ میں اس حرامی کی ٹانگیں چیر کر۔"

رئیس نے جو کہا اسے سن کر نیلم کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔

"میں کسی طرح اسے ٹالنا چاہتا تھا۔ اس وقت موج دین جیسے آدمی سے جھگڑا ہمارے مفاد میں نہیں ہے۔"

"ناصر صحیح کہہ رہا ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔" نیلم نے میری تائید کی۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔" رئیس فیصلہ کن انداز میں بولا "تم لوگ جو چاہے کرو لیکن تم اس کی قلم میں کام نہیں کرو گی۔"

"مجھے بھی کام کرنے کا شوق نہیں ہے۔" نیلم رسانیت سے بولی "مگر ہمیں حالات دیکھ کر چلنا ہوگا۔ اچھا اب میں چلتی ہوں چار گھنٹے کی شوٹنگ اور ہے۔ تم ناصر کو چھوڑ کر شام سات بجے تک مجھے لینے آجانا۔"

میں اور رئیس باہر نکلے تو اس کا موڈ سخت آف تھا۔ نیلم کے سامنے تو وہ مجبور تھا لیکن میرے سامنے اسی نے موج دین کے شجرۂ نسب کو خاصا زیر وزبر کیا تھا۔ نیلم کی بجارو اسٹوڈیو کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ گیٹ سے باہر نکل کر رئیس نے گاڑی روکی "میں سگریٹ لے کر آتا ہوں۔"

وہ سڑک پار کرکے اسٹوڈیو کے سامنے موجود پان فروش کی طرف گیا تھا۔ موج دین ایک معمولی درجے کا بدمعاش تھا۔ اس کی ماں شاہی محلے میں دھندا کرتی تھی مگر موج دین نے بھاٹی گیٹ کے ایک استاد کے ڈیرے پر پرورش پائی تھی۔ نوعمری سے وہ جرائم کی راہ پر چل نکلا تھا۔ جب اڈے کا استاد ایک قتل کے الزام میں عمر قید کی سزا پاکر جیل چلا گیا تو موج دین نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس کے اڈے پر قبضہ کرلیا۔ اسے اپنی ماں سے باپ کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے باپ سے رابطہ کیا جو ایک بڑے جاگیردار گھرانے کا سیاست داں تھا۔ انہی دنوں حکومت ختم ہونے سے اس کی وزارت اعلیٰ ختم ہوئی تھی اور اس نے حکومت میں جن لوگوں کا جینا حرام کیا تھا، وہ اس سے بدلہ لینے کی تیاری کررہے تھے۔ ایسے میں موج دین اس کی ڈھال بن گیا اور اس نے اپنے ناجائز باپ کے دشمنوں کو چن چن کر نشانہ بنایا اور اب وہ اس کے لیے اس کے سگے بیٹوں سے زیادہ ناگزیر ہوگیا تھا۔ اس کی سرپرستی میں موج دین نے تیزی سے ترقی کی تھی۔ اب وہ بدمعاش ہی نہیں بلکہ صنعت کار، ٹرانسپورٹر اور تاجر بھی تھا۔ قصور کی طرف بارڈر کے ساتھ اس کی وسیع و عریض زمینیں بھی تھیں۔ جن پر اگنے والا اناج بھارت اسمگل کردیا جاتا تھا۔ گویا موج دین صاحب اسمگلر بھی تھے۔

"اللہ کے نام پر بابا۔" اچانک ایک بھٹے کٹے فقیر نے کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اسے جانے کا اشارہ کیا لیکن وہ مستقل مزاجی سے ڈٹا رہا۔ میں نے اسے ڈانٹنے کے لیے شیشہ نیچے کیا ہی تھا کہ اس نے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے عین

میرے چہرے پر کوئی شے اسپرے کی۔ اس کی بو اتنی تیز اور زود اثر تھی کہ میں فوراً ہی بے ہوش ہوگیا تھا۔ مجھے سوچنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔ دشمن اتنے مستعد ہوں گے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا لیکن شاید میں غلط فہمی میں مارا گیا تھا۔ رب نواز اور پیر سبحان کے علاوہ اب موج دین جیسے لوگ میرے دشمنوں میں شامل ہوگئے تھے۔ یہ سب دست دراز اور سفاک لوگ تھے۔ بے شک میں تصدیق شدہ طور پر ناصر عظیم تھا لیکن میرے دشمن بشمول پولیس کے صرف میری بات پر یقین کرکے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

انہوں نے حیرت انگیز پھرتی کا ثبوت دیا تھا۔ وہ موقع کی تاک میں تھے۔ رئیس کی سگریٹ نوشی کی عادت نے انہیں موقع دیا اور وہ مجھے بے ہوش کرکے لے اڑے تھے۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک تنگ دیواروں والے کمرے کے فرش پر پڑا تھا۔ دیواروں پر پلاسٹر تھا لیکن رنگ نہیں ہوا تھا۔ کمرا چاروں طرف سے بند تھا سوائے ایک دروازے کے جو ظاہر ہے کہ بند تھا۔ بے ہوشی کی دوا جتنی زود اثر تھی اتنی ہی مضر اثرات سے پاک تھی کیونکہ ہوش میں آتے ہوئے نہ تو میرا سر چکرایا تھا اور نہ ہی متلی کی کیفیت محسوس کی تھی۔ بلکہ یوں لگا جیسے میں طویل اور پرسکون نیند کے بعد بیدار ہوا ہوں۔ صرف سخت فرش نے میری کمر کو اکڑا دیا تھا۔ بمشکل میں اٹھا اور ہاتھ پیر چلا کر جسم کھولا۔ کمرا کسی قسم کے فرنیچر یا سامان سے بالکل خالی تھا۔ یہ غالباً کسی زیر تعمیر مکان کا حصہ تھا۔ میں نے دروازہ کھولنے کی بے سود کوشش کی۔ حسب توقع وہ باہر سے بند تھا۔ ٹھوس لکڑی کے اس دروازے کو رستم زماں بھی نہیں توڑ سکتا تھا۔

دروازے سے مایوس ہوکر میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میں کہاں ہوسکتا ہوں۔ اردگرد مکمل خاموشی تھی نہ تو ٹریفک کی آواز تھی۔ نہ کوئی انسانی آہٹ اور نہ ہی کوئی اور آواز۔ جس سے میں اندازہ لگا سکتا۔ عین ممکن تھا کہ آوازیں تو ہوں لیکن کمرا ہی ساؤنڈ پروف ہو یا گھر میں ایسی جگہ ہو جہاں باہر کی آوازیں آنا ناممکن ہو۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گرمی کا موسم تھا اور بند کمرے کے حبس میں ذرا سی دیر میں پسینہ سر سے پاؤں تک بہنے لگا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ رات کا کوئی پہر تھا۔ کیونکہ میرے جسم سے سوائے لباس کے سب کچھ اتار لیا گیا تھا۔ اس میں گھڑی بھی شامل تھی۔ جیب سے بٹوا اور ناصر عظیم کے تمام کاغذات بھی غائب تھے۔ اس کے دو مطلب ہوسکتے تھے یا تو دشمن نے روایت کے مطابق مجھے ہر شے سے محروم کردیا تھا یا

وہ ان کاغذات کی جانچ کرنا چاہتے تھے۔ دوسری صورت بہتر تھی کیونکہ ریکارڈ میں ہر جگہ ناصر عظیم کا نام موجود تھا اور اس کی تصدیق بہ آسانی کرائی جاسکتی ہے۔

اغوا کرنے والوں پر سرکھپانے کے بجائے میں نے اس کہانی پر غور کرنا شروع کردیا جو انہیں سنائی تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ مجھے ناصر عظیم ہونے پر اصرار کرنا تھا۔ بس ایک ہی خطرہ تھا۔ اگر میں رب نواز کے ہتھے چڑھا تھا تو میری کمر اور سینے پر موجود ہنٹر کی ضربوں کے نشان دیکھ سکتے تھے۔ قید کے دوران دلنواز نے بے رحمی سے مجھے مارا تھا۔ وہ فوراً سمجھ جاتے کہ میں شاہ عالم ہوں اور پھر کسی صورت مجھے ناصر عظیم تسلیم نہ کرتے۔ امکان یہی تھا کہ میں رب نواز کے بجائے کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ لگا تھا۔ ورنہ مجھے شاید کسی عقوبت خانے میں ہوش آتا۔ میں الٹا لٹکا ہوتا اور اب تک رب نواز کے کتے میری بوٹیاں نوچ چکے ہوتے۔ دلنواز کی بیوی فریال کو یرغمال بنا کر فرار ہو کے میں نے اتنا بڑا جرم کیا تھا کہ میں اگر ان کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ میرے ٹکڑے کرکے اور اپنے کتوں کو کھلا کر بھی مطمئن نہ ہوتے۔

مجھے رئیس کا خیال آیا۔ سگریٹ لے کر واپس آنے پر اس نے مجھے غائب پایا ہوگا تو تشویش سے اس کا برا حال ہوگیا ہوگا۔ ابھی مجھے رب نواز کی قید سے نکلے چند ہی دن تو گزرے تھے اور میں دوبارہ کسی کی قید میں پہنچ گیا تھا۔ نیلم، چندا اور قمر سب رو رو کر برا حال کرلیں گی۔ کمال میرے لیے کچھ نہیں کرسکے گا لیکن پریشان تو وہ بھی ہوگا۔ صرف رئیس سے ہی امید کی جاسکتی ہے وہ میری رہائی کے لیے عملاً کچھ کرسکے گا۔ شبنم اپنے اخبار کے ساتھ میرا بہت بڑا سہارا ہے لیکن وہ خود چند درندہ نما انسانوں کی بربریت کا شکار ہوکر ہوش و حواس سے بیگانہ ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں پڑی تھی۔ وہ میری کیا مدد کرسکتی تھی۔

وقت رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ جب میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر پنجرے میں بند جنگل سے تازہ درآمد شدہ شیر کی طرح ٹہلنے لگا اور جب ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تو دوبارہ بیٹھ گیا۔ گرمی کی شدت سے پسینہ دھاروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ قمیص اتاروں لیکن زخم نظر آنے کے خوف سے میں نے ایسا کرنے سے گریز کیا۔ اگر میں بدقسمتی سے رب نواز کی قید میں آ ہی پھنسا تھا تو یہ زخم مجھے مروا دیتے۔ یہ وقت میں نے کس اذیت سے گزارا میں ہی جانتا ہوں۔ دفعتاً ہلکی سی آواز آئی۔ میں نے کان لگا کر سنا دور کہیں موذن اللہ کے بڑے ہونے کا اعتراف کررہا تھا جب کہ بہت

سارے لوگ اپنی خدائی کے نشے میں چور تھے۔ ان کے بے حس کانوں کے لیے خدا کی کبریائی کے یہ الفاظ بے معنی تھے۔ بے اختیار میں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"میرے رب تو جانتا ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ بے قصور ہوں۔ اے اللہ مجھے ان ظالموں سے بچا۔"

دعا مانگ کر میں نے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس کیا تھا۔ میں نے پہلی بار دروازہ کھٹکھٹایا پھر زور سے دھڑ دھڑایا۔ چند لمحے بعد دوسری طرف سے قدموں کی آہٹ سنائی دی "کیا بات ہے۔ کیوں شور کرتا ہے؟" کسی نے کرخت لہجے میں کہا۔ لہجے سے وہ پٹھان لگ رہا تھا۔

"مجھے کیوں بند کر رکھا ہے۔" میں نے چلا کر کہا "اب تک ایک گلاس پانی بھی نہیں دیا ہے۔ کیا تم لوگ مسلمان نہیں ہو۔"

"ہم کو کمرا کھولنے کا آرڈر نہیں ہے۔ انتظار کرو ابھی ہمارا صاب آئے گا تو تمہیں پانی کھانا سب مل جائے گا۔"

"تمہارا صاحب کون ہے؟"

لیکن جواب میں جاتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ واپس چلا گیا تھا۔ ایک انسان کی آواز سن کر میں نے اپنے اندر تازہ حوصلہ امنڈتے محسوس کیا۔ بے شک وہ دشمن سہی لیکن میں یہاں اکیلا نہیں تھا۔ دشمن مجھے بند کرکے بھول ہی گیا تھا' ایسا نہیں تھا۔ میں صبر اور سکون سے دوبارہ انتظار کرنے لگا۔ شاید دو گھنٹے بعد دروازے پر آہٹ ہوئی اور میں نے تالا کھولنے کی آواز سنی۔ دروازہ کھلا اور سامنے ایک پستہ قد پٹھان گن تانے کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کوئی کھڑا تھا جس کا سایہ مجھ تک آ رہا تھا لیکن صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

"شاہ عالم کھڑے ہو جاؤ اور دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔" آواز آئی تو میں نے بمشکل خود کو اچھلنے سے روکا۔ آواز دلاور شاہ کی تھی۔ سبحان شاہ کا سالا۔ میں نے جواب دیا۔

"یہاں کوئی شاہ عالم نہیں ہے۔ اگر یہ حکم میرے لیے ہے تو میں سر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہوں۔"

دلاور اندر آیا تو اس کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی "تم دنیا کو بے وقوف بنا سکتے ہو' مجھے نہیں۔"

دلاور کو دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ یعنی میرے اغوا سے رب نواز اینڈ کمپنی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ساتھ ہی میں نے خود کو زیادہ با اعتماد محسوس کیا "آخر تم لوگ شاہ عالم سے میرا تعلق جوڑنے پر کیوں مصر ہو۔ پولیس کو دیکھو۔ لوگوں کو دیکھو سب مجھے شاہ عالم سمجھنے پر مصر ہیں۔ میرا قصور اتنا ہے نا کہ میری صورت اس سے ملتی ہے۔ ورنہ میں ناصر عظیم ہوں اور میرے سارے حوالے موجود ہیں۔"

دلاور شاہ عیاری سے مسکرایا "تمہیں کیسے پتا چلا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے؟"

"میں نے عام لوگوں کا حوالہ بھی دیا تھا اور جہاں تک تمہارے پولیس سے ہونے کا تعلق ہے تو تمہارے بالوں کا کٹ اور چہرے پر نظر آنے والی سفاکی یہ بتانے کو کافی ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا "یہ بتاؤ کہ کیا مجھے کچھ کھانے پینے کو ملے گا۔ میں پیاسا ہوں اور بھوک بھی لگ رہی ہے۔"

دلاور شاہ نے سر ہلا کر پٹھان سے کہا "قابل خان جا کر پانی اور کچھ کھانے کو لے آؤ۔ گن مجھے دے دو۔"

قابل خان نے گن اسے تھمائی اور باہر چلا گیا۔ دلاور شاہ دروازے کے برابر میں دیوار سے لگا کھڑا تھا اور اس کے اور میرے درمیان دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں بازو سر پر رکھے رکھے تھک گیا تھا۔

"کیا میں ہاتھ نیچے کر سکتا ہوں۔"

اس نے غور کیا اور اثبات میں سر ہلا دیا "لیکن کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں بے دریغ گولی مار دیتا ہوں۔ اب تک چھ بندے اپنے ہاتھ سے مار چکا ہوں۔ میرا نشانہ خطا نہیں جاتا۔"

میں نے خود کو سہما ہوا ظاہر کیا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ آواز اور لہجے کے ساتھ گفتگو کے انداز سے بھی مختلف نظر آؤں۔ دلاور شاہ ایک گھاگ پولیس افسر تھا۔ وہ میری ذرا سی غلطی سے مجھے پکڑ سکتا تھا۔

"پیر سبحان نے کہا ہے کہ تو اور رات والا معاملہ ختم کرکے ہم پہلے کی طرح دوست بن سکتے ہیں۔"

"میں کسی پیر سبحان کو نہیں جانتا۔ غالباً یہ بھی شاہ عالم کا کوئی جاننے والا ہے۔" میں نے فوراً کہا۔

دلاور شاہ کے چہرے پر سفاک چمک لہرائی "میں شاہ صاحب کے حکم سے مجبور ہوں ورنہ تم خود شاہ عالم ہونے کا اعتراف کرتے تم۔۔۔"

"شاہ عالم کو پولیس نے مار کر غائب کر دیا ہے۔"

"شاہ عالم فرار ہوا ہے۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا "میں نے خود تصدیق کی ہے۔ اے ایس آئی سلامت علی نے اسے رب نواز کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ اس کی کوٹھی سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ بتاؤ کہ رئیس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

یہ سوال اس نے اچانک ہی کیا تھا۔ اس کے لہجے سے میں کھٹک گیا۔ رئیس کے ناصر عظیم سے تعلقات مسلمہ تھے لیکن کچھ دنوں پہلے جب شاہ عالم تھانے میں تھا تو رئیس اس کے پاس مسلسل آ جا رہا تھا۔ اگر دلاور شاہ کے علم میں یہ بات آ چکی تھی تو میری خیریت مشکوک تھی۔ میں نے جواب دیا۔

"رئیس میرا بچپن کا دوست ہے ہم دونوں نے ایک ہی یتیم خانے میں پرورش پائی ہے۔ بڑے ہونے کے بعد ہم نے مختلف شعبے اپنائے لیکن اس سے ہماری دوستی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں آج بھی رئیس کو اپنا سب سے اچھا دوست سمجھتا ہوں۔"

"یہ رئیس پچھلے دنوں اس تھانے میں کیا کرنے جاتا رہا تھا۔ جس میں گرفتاری کے بعد شاہ عالم کو رکھا گیا تھا۔" آخر میرے دل کا اندیشہ اس کی زبان پر آ گیا تھا۔

میں ہنسا "رئیس تو اکثر تھانے جاتا ہی رہتا ہے۔ اس کے کرتوت ہی ایسے ہیں۔"

"میری اطلاعات کے مطابق وہ اسی دوران میں شاہ عالم سے ملتا رہا تھا۔ آخر کیوں؟"

"تمہاری معلومات درست نہیں ہیں۔ اگر رئیس شاہ عالم سے ملتا تو مجھے ضرور بتاتا۔"

اس نے میری بات نظر انداز کی "شاہ عالم سے کچھ عورتیں بھی ملنے آئی تھیں جبکہ میری معلومات کے مطابق شاہ عالم کی دنیا میں ایسی کوئی رشتے دار عورت نہیں ہے جو اس سے تھانے میں ملنے آئے۔ اس کی ایک سابقہ بیوی ہے جو اس کی اب صورت دیکھنا پسند نہیں کرتی لیکن کتنی عجیب بات ہے۔ اس کا دوسرا خصم فرید عباسی' شاہ عالم کا وکیل تھا بلکہ اب بھی ہے۔ اس نے ایک شور مچا رکھا ہے کہ پولیس نے شاہ عالم کو قتل کر دیا ہے۔"

دلاور شاہ کا نہیں بلکہ حالات کا پھندا میرے گرد سخت ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے مسلسل غلطیاں کی تھیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہا تھا کہ ان پر پردہ پڑا رہے گا۔ دشمن احمق نہیں تھا۔ واقعات کی کڑیوں کو ملا کر وہ اس طرح نتیجہ نکال رہا تھا جیسے طالب علم مساوات کی مدد سے ریاضی کا سوال حل کرتا ہے۔

"اس بارے میں' میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے شانے اچکائے "یہ بات شاہ عالم یا اس کا وکیل ہی بتا سکتا ہے ویسے یہ کوئی اتنی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ رقابت اپنی جگہ اور بزنس اپنی جگہ۔ شاہ عالم دولت مند شخص تھا اور وہ اپنے وکیل کو کیا نام بتایا تم نے۔ ہاں فرید عباسی کو اچھا معاوضہ دیتا ہوگا۔"

دلاور شاہ ٹٹولنے والے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں قابل خان ایک ٹرے میں پانی کا جگ گلاس' پلیٹ میں آلو گوشت کا سالن اور تندوری روٹی لے آیا۔ اس نے دلاور شاہ کے اشارے پر ٹرے ایک کونے میں رکھ دی اور دوبارہ اپنی گن سنبھال کر مستعد ہو گیا۔ میں اس کی طرف توجہ دیے بغیر کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم ناصر عظیم ہو؟" دلاور شاہ نے اچانک کہا۔

میں ہنسا "ثبوت تو تمہیں دینا چاہیے کہ میں شاہ عالم ہوں لیکن تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ البتہ میرے سارے حوالے موجود ہیں۔ تم یتیم خانے سے معلوم کر سکتے ہو۔ جہاں میں نے پرورش پائی پھر میں ڈاکٹر مشہود کے گھر رہا۔ اس کے بعد مجھے کرنل خان نے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا۔ آج میں جو کچھ ہوں ان کی وجہ سے ہوں۔ تم خان اعظم کے گھر کے اردگرد رہنے والوں سے میرے بارے میں معلوم کر سکتے ہو۔ کرنل خان کی بیٹی مجھے جانتی ہے۔ ڈاکٹر کمال' [illegible] اسپتال والا میرے بچپن کا دوست ہے۔ میری منہ بولی بہن قمر جس کی میں نے ایک طرح سے پرورش بھی کی ہے کمال کی بیوی ہے۔ رئیس کا نام میں اس لیے نہیں لوں گا کہ وہ ہسٹری شیٹر تھا۔ اب وہ شریف ہو چکا ہے لیکن پولیس اسے شریف ماننے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آئے دن اسے تھانے میں حاضری دینا پڑتی ہے۔ تم اداکارہ نیلم سے پوچھ سکتے ہو۔ وہ دس سال سے مجھے جانتی ہے۔ ان ساری راہوں سے شاہ عالم کا کبھی گزر نہیں ہوا۔ وہ ایک اکیلا اور خود غرض شخص تھا جس کا دنیا میں ایک بھی خلوص کا رشتہ نہیں تھا۔ میں نے اس کے بارے میں سنا ہے کہ سیاست کے ساتھ اس نے مافیا نوعیت کے جرائم میں بھی ہاتھ ڈال رکھا تھا۔ اس کی بیوی اسی وجہ سے اس سے نالاں تھی اور بالآخر اس نے شاہ عالم سے چھٹکارا پا لیا۔ شاہ عالم مجرمانہ زندگی گزارتا تھا۔ اس کے لیے پر خلوص دوست ملنا محال تھا۔ میں نے جن لوگوں کا حوالہ دیا ہے' ان میں سے ہر ایک ضرورت پڑنے پر میرے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو جائے گا "تمہارے خیال میں شاہ عالم کا کوئی ایسا دوست ہو سکتا ہے جو اس کے لیے جان دے سکے۔"

"شبنم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کون شبنم؟" میں بولا "اچھا تم اس صحافی کی بات کر رہے ہو جو ایک زمانے میں شاہ عالم کے لیے دیوانی پھرا

کرتی تھی۔ میرا خیال ہے اب اسے عقل آگئی ہوگی۔"

"اس کے برعکس وہ پہلے سے زیادہ اس کی دیوانی ہوگئی ہے۔ اس نے شاہ عالم کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا۔"

میں چونکا "کیا مطلب کیا تم نے اس سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔"

وہ خبیثانہ انداز میں مسکرایا "میں نے تو نہیں لیکن کچھ اور لوگ ہیں۔ وہ انسپکٹر سلامت کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس کا حشر نشر کر دیا۔"

میں نے اشتعال کی شدید لہر کو بمشکل اپنے چہرے پر آنے سے روکا۔ اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ شبنم کے ساتھ کیے جانے والے سلوک سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور عین ممکن تھا اسے موقع ملتا تو شبنم کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتا۔

مگر ناصر عظیم سے شبنم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ لہٰذا اس کی صورت پر اس کے لیے کوئی تاثرات بھی نہیں آنے چاہیے تھے۔ میں نے کہا "پولیس کا یہ حال ہوگیا ہے بدمعاش اور غنڈے ایک طرف رہے اب یہ بزنس مین اور صحافی جیسے لوگوں کو اٹھالاتے ہیں۔"

دلاور فاتحانہ غرور کے ساتھ مسکرایا تھا۔ اس نے میری بات کی تردید نہیں کی تھی۔ اس نے شبنم کو ایک گندی سی گالی دی "اس کنجری نے کچھ نہیں بتایا۔ شاہ عالم کے لیے سب برداشت کرلیا۔"

"ممکن ہے اسے شاہ عالم کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہ ہو۔" میں نے تبصرہ کرنے کے انداز میں کہا "شاہ عالم اگر پولیس کی حراست سے فرار ہوا بھی ہو تو اتنا احمق نہیں ہوسکتا کہ ایک کمزور عورت کو اپنا ٹھکانا بتائے۔"

"وہ کمزور عورت نہیں ہے۔" دلاور شاہ کے لہجے میں اشتعال تھا "اس نے شاہ عالم کے لیے جو برداشت کیا ہے وہ کوئی اور برداشت نہیں کرسکتا۔ اس نے منہ سختی سے بند کر رکھا سب کچھ برداشت کرتی رہی لیکن ایک لفظ نہیں نکالا۔ مجھے یقین ہے وہ شاہ عالم کے ٹھکانے سے ضرور واقف ہوگی۔ اس سے تفتیش کرنے والوں میں میرا ایک آدمی بھی شامل تھا۔ اگر وہ بتاتی تو سب سے پہلے مجھے پتا چل جاتا۔"

میرا خون کھول رہا تھا لیکن میں اوپر سے سمندر کی طرح پرسکون رہنے پر مجبور تھا۔ اگر مجھے موقع ملتا تب بھی میں دلاور شاہ کی گردن نہیں توڑ سکتا تھا کیونکہ ایسا صرف شاہ عالم کرسکتا تھا۔ ناصر عظیم کا شبنم سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ وہ جذباتی ہوتا۔ مجھے اشتعال دلانے کے لیے دلاور شاہ تفصیل سے بتاتا رہا کہ پولیس والوں نے شبنم کے ساتھ کتنا شرمناک سلوک کیا تھا۔ میں ایسے سنتا رہا جیسے میں ایک غیر متعلق فرد ہوں۔ البتہ ملامتی انداز میں اس سے اتنا ضرور کہا۔

"کیا ایک عورت سے یہ سلوک کرنے والوں کی ماں بہنیں نہیں تھیں یا وہ اپنی ماں بہنوں سے بھی ایسا سلوک کرتے ہیں۔"

ایک لمحے کو دلاور شاہ کا رنگ متغیر ہوا لیکن وہ ڈھٹائی سے بولا "شبنم کون سی پارسا ہے۔ وہ خود سب کے سامنے کھل کر اعتراف کرتی ہے کہ وہ شاہ عالم کی رکھیل ہے اور نہ جانے کتنے لوگوں سے اس کے تعلقات رہے ہوں گے پولیس بھی بندہ دیکھ کر سلوک کرتی ہے۔"

میں نے پر تاسف لہجے میں کہا "اگر وہ شاہ عالم سے محبت کرتی ہے تو اسے اتنا بڑا جرم نہیں سمجھنا چاہیے۔ تم لوگوں کے تشدد سے وہ ہمیشہ کے لیے پاگل بھی ہوسکتی ہے۔"

"تم اپنی فکر کرو شاہ عالم۔" اس نے اچانک لہجہ بدل کر کہا "یہاں تمہیں مذاکرات کرنے کے لیے نہیں بلایا گیا ہے۔"

"اگر تم مجھے شاہ عالم سمجھنے پر مصر ہو تو میں کیا کرسکتا ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ میں نے کھانا ختم کرلیا تھا۔ یہ سالن اور روٹی یقیناً کسی ہوٹل سے آئی تھی گویا یہ مکان بالکل غیر آباد تھا۔ شاید یہاں قابل خان کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ عین ممکن تھا دلاور شاہ نے یہ مکان اپنی غیر قانونی تفتیش کے لیے لے رکھا ہو۔ یہاں ان لوگوں کو لایا جاتا ہوگا۔ جنہیں تھانے میں نہیں رکھا جاسکتا ہوگا۔ سیاسی لیڈر، اخباری کارکن اور حکومت کے مخالفین ایسے لوگ تھے جنہیں اختیارات سے ماورا فورسز اٹھا کرلے جاتی ہیں۔ ان کی گرفتاری کہیں نہیں دکھائی جاتی ہے۔ ان لوگوں کو ایسے ہی ٹھکانوں پر رکھا جاتا ہے اور یہاں ان کے ساتھ سب کچھ روا تھا۔ کیونکہ اس ظلم کی فریاد وہ کہیں نہیں کرسکتے تھے۔

"دیکھو تمہارے بارے میں کسی کو نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو۔ اگر میں تمہیں مار کر کہیں گاڑ دوں تو قیامت سے پہلے تمہارا سراغ نہیں ملے گا۔"

"میں تمہارے قبضے میں ہوں۔ تم چاہو تو ایسا کرسکتے ہو۔"

"تمہارے پاس چند گھنٹے کی مہلت ہے۔ اگر پیر سبحان آگئے تو میں بھی کچھ نہیں کرسکوں گا۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

"میرا خیال ہے یہ پیر سبحان جو بھی ہے میری بات زیادہ معقولیت سے سنے گا۔"

"تم دیکھ لو۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا "بہتر ہوگا اب تم آرام کرو۔"

اس کی بات کا مفہوم اس وقت واضح ہوا جب اچانک میرا سر چکرانے لگا تھا۔ کھانے میں بے ہوشی کی کوئی دوا ملی تھی۔ وہ لوگ جا چکے تھے اور میرے پاس سوائے بے ہوش ہوجانے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں چت لیٹ گیا اور کمرا گھومتے گھومتے اچانک تاریک ہوگیا۔ دوسری بار ہوش میں آنے پر میں نے خود کو ایک صاف ستھری اور سجی ہوئی خواب گاہ میں پایا۔ ہوش میں آنے کے بعد بھی خاصی دیر تک میرا سر گھومتا رہا تھا جب طبیعت ذرا بہتر ہوئی تو میں اٹھ بیٹھا۔ سامنے دیوار پر وال کلاک تین بجا رہا تھا۔ بند کمرے میں میرا اندازہ تھا کہ اس وقت دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ رات کے تین بجے تک میرا بے ہوش رہنا ممکن نہیں تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور ایک طرح دار دیہاتی حسینہ اندر داخل ہوئی وہ صحت اور دلکشی کا دیہاتی شاہکار تھی جس کی جوانی اس کے تنگ کپڑوں سے ابلی پڑ رہی تھی۔

"آپ اٹھ گئے جی۔" اس نے شوخی سے کہا "بڑی گہری نیند ہوتی ہے آپ کی۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی۔ گویا اسے یہ معلوم تھا کہ میں سو رہا تھا "کون ہو تم؟"

"میں۔ شاداں ہوں۔ پیر جی کی خادمہ۔"

پیر جی سے مراد یقیناً پیر سبحان تھا۔ اس نے جس انداز سے خادمہ کہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ پیر سبحان کے لیے کس قسم کی خدمات انجام دیتی ہوگی۔ اس عمر میں پیر سبحان کا ذوق اچھا تھا۔ شاداں نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"آپ تیار ہوجاؤ جناب۔ پیر جی آپ سے ملیں گے۔"

وہ مجھے بے ضرر سمجھ رہی تھی۔ لہٰذا جب میں نے اسے اچانک دبوچا تو اس کی آواز بھی نہ نکل سکی تھی اور جب تک وہ چیخ مارنے کے لیے منہ کھولتی' میں اس کا منہ دبا چکا تھا۔ اس کا صحت مند جسم میری گرفت میں پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔ اس نے کوئی سستا قسم کا تیز عطر لگا رکھا تھا جس کی بو اس کے بدن کی بو میں مل کر میری ناک تک آرہی تھی۔

"آواز نکالی تو گلا دبا دوں گا۔" میں نے اب کے اس کا گلا پکڑ لیا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے بمشکل سر ہلا کر اشارہ کیا کہ وہ کوئی آواز نہیں نکالے گی۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے گرفت ذرا نرم کرتے ہوئے کہا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا "کوجی۔ آپ کو نہیں معلوم؟"

"تبھی تو تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

کسی قدر تذبذب کے ساتھ اس نے اقرار کیا کہ اس وقت میں پیر سبحان کی حویلی میں ہوں جو لاہور سے پاک پتن جانے والی سڑک پر ہے۔ لاہور یہاں سے کوئی چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔

"پیر سبحان کہاں ہے؟"

"وہ جی خاص کمرے میں ہیں۔" اس نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا پھر مچلنے لگی "چھوڑ مجھے۔"

میں نے اسے آزاد کیا تو وہ حیران رہ گئی پھر خفگی سے بولی۔

"یہ کیا حرکت تھی جی۔ حویلی میں آنے والے کسی مہمان نے میرے ساتھ ایسا نہیں کیا۔"

"چل اس بہانے تجھے چھولیا۔" میں نے مسکرا کر کہا "پوری بھٹی بنی ہوئی ہے۔"

وہ بھونڈے پن سے شرمائی "کوجی' تو کہنا تھا اس طرح جھپٹا مارنے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس کی بات سے واضح تھا کہ وہ اس حویلی میں آنے والے مہمانوں کی "خاطر مدارات" پر بھی مامور تھی "آپ نہالو جی۔ میں کپڑے لادیتی ہوں۔" اس نے الماری کھول کر اس میں ٹنگے جوڑوں میں سے ایک شلوار قمیص نکالی اور تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیا "یہ جوڑا ٹھیک رہے گا نا جی۔"

"بالکل جی۔" میں اٹھ کر غسل خانے میں آگیا۔ کمرے کے برعکس غسل خانہ عام سا ثابت ہوا تھا لیکن نہا کر میری طبیعت کی رہی سہی کسل مندی بھی دور ہوگئی تھی۔ دروازے کی اوٹ سے میں نے کپڑے لے کر پہنے باہر آکر میں نے بال بنائے اور شاداں کے ہمراہ چل پڑا۔ وہ مجھ سے آگے اپنے بے حجاب بدن کو لچکاتی چل رہی تھی۔ پیر سبحان ایک دربار نما کمرے میں میرا منتظر تھا۔ وہ چوکی پر بیٹھا تھا جس پر قالین تھا اور اس نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ خوشبودار حقے کی نے اس کے ہاتھ میں تھی اور کمرے میں تمباکو کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ میں نے پیر سبحان کو یوں دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ ہی پیر سبحان ہیں۔ مجھے ناصر عظیم کہتے ہیں۔"

پیر سبحان نے ہاتھ ضرور ہلایا لیکن مجھ سے ملانے کے

لیے نہیں بلکہ شاداں کو وہاں سے رخصت ہوجانے کا اشارہ کرنے کے لیے۔ شاداں کے جاتے ہی اس نے منہ سے حقے کی نے نکالی "میرے سامنے ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے شاہ عالم۔ بیٹھ جاؤ۔"

میں اس کی چوکی کے سامنے نیچے قالین پر بیٹھ گیا "چلیے شاہ عالم ہی سہی لیکن آپ میرا قصور بتائیں گے۔ مجھے اس طرح کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ جیسے ڈاکو تاوان کے لیے لوگ اٹھالے جاتے ہیں۔"

اس کے چہرے پر غیظ کی بجلیاں سی کوندی تھیں لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز پرسکون تھی "ہم نے تمہیں تاوان کے لیے نہیں اٹھوایا ہے بلکہ ہمارا تم سے کچھ حساب کتاب نکلتا ہے۔"

"جب میں شاہ عالم نہیں ہوں تو مجھے حساب کتاب کا کیا معلوم؟" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "آپ جس طرح چاہیں تصدیق کرالیں۔ سوائے شکل کے میں کہیں سے بھی شاہ عالم ثابت ہوجاؤں تو آپ میرے ساتھ ہر سلوک کرنے کے لیے آزاد ہیں۔"

"تمہارا دعویٰ بودا ہے۔ ناصر عظیم کو کوئی نہیں جانتا اور شاہ عالم کو سب جانتے ہیں۔"

"ناصر عظیم کے حوالے موجود ہیں جو شاہ عالم سے یکسر مختلف ہیں۔" میں نے اصرار کیا۔

"شاہ عالم جیسے شاطر سے کچھ بعید نہیں ہے۔ وہ اپنے لیے ایک اور شناخت تیار کر سکتا ہے۔" سجان شاہ نے حقہ گڑ گڑایا۔

"جس وقت شاہ عالم لندن میں پھنسا ہوا تھا اس وقت میں یہیں تھا۔ اس کی گواہی بہت سارے لوگ دیں گے۔ یہ وہ سب لوگ ہیں جو مجھے بچپن سے جانتے ہیں اور معاف کیجیے گا۔ یہ احمقانہ بات ہے۔ شاہ عالم بیک وقت دو زندگیاں نہیں گزار سکتا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ بیک وقت دو مختلف ناموں سے مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف حوالوں سے زندگی گزار سکے۔ ہمارے سیاست داں عام طور سے برے وقت کے لیے بیرون ملک انتظام کرکے رکھتے ہیں۔ شاہ عالم کا اکثر وقت ملک سے باہر ہی گزرتا تھا۔ ملک میں وہ کم رہتا تھا۔ لازمی بات ہے اس نے اپنی محفوظ پناہ گاہ بھی کسی دوسرے ملک میں تیار کی ہوگی۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اسے اتنے احمقانہ انداز میں اس شہر میں اپنی دوسری شناخت بنانے کی کیوں سوجھی۔"

پیر سجان شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سوچتے ہوئے حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری باتوں نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے دلیل کے ساتھ بات کی اور اپنے سالے کی نسبت سجان شاہ معقول آدمی تھا۔ اس کی پیری مریدی کے دھندے اس کی مجبوری تھے۔ جن کے بغیر وہ اپنی روحانی سلطنت پر اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ جبکہ دلاور شاہ ایک سفاک شخص تھا۔ پولیس نے اس کی سفاکی کو صیقل کیا تھا۔ اگر سجان شاہ مجھے اس کے حوالے کردیتا تو وہ بلا تکلف مجھے ادھیڑ کر رکھ دیتا۔ اسے قطعی غرض نہیں ہوتی کہ میں شاہ عالم ہوں بھی یا نہیں۔ اگر میں اس کی تفتیش کے دوران میں ہلاک ہوجاتا تو اسے ذرا بھی دکھ نہیں ہوتا۔ میری کوشش تھی کہ سجان شاہ مجھ پر تشدد کا حربہ آزمانے کا فیصلہ نہ کرے۔

"یہ تو بڑا طویل چکر ہوجائے گا بابا۔" بالآخر اس نے حقہ منہ سے ہٹا کر کہا "اگر ہم نے ناصر عظیم کے ماضی کی کھوج شروع کردی۔"

"بے شک یہ ایک طویل عمل ہوگا لیکن اس سے آپ حقائق تک پہنچ سکیں گے۔"

اس نے سر ہلایا "چلو ایسا بھی کرکے دیکھتے ہیں۔ اس وقت تک تم ہمارے پاس رہو گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "بلکہ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ کی وجہ سے اس منحوس شاہ عالم کے لیبل سے میری جان چھوٹ جائے۔"

"زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" پشت کی طرف سے دلاور شاہ کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کب سے پیچھے کھڑا تھا "جب تفتیش ہوگی تو بہت ساری باتیں سامنے آجائیں گی۔ جو تم نے اب تک چھپائی ہیں۔ شاہ عالم کے قتل سے لے کر اب تک پیش آنے والے واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ تمہیں وضاحت کرنا ہوگی کہ اب تک تم کیا کرتے رہے تھے۔ تمہیں اپنے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہوگا۔"

"میں تیار ہوں۔" میں نے پوری بے خوفی سے کہا لیکن دلاور شاہ کی بات نے مجھے اندر سے متفکر کردیا۔ اگر انہوں نے سچ مچ گہرائی میں جاکر تفتیش کی تو میرے بہت سارے کمزور پہلو سامنے آسکتے تھے جو شاہ عالم سے میرے تعلق کی نشان دہی کرسکتے تھے۔ اگر ایک بار ان کا شک مخصوص درجے تک پہنچ جاتا تو انہیں مجھ پر تشدد سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی۔ اچانک دروازے سے دو ملازم ایک ٹی وی ٹرالی کھینچتے ہوئے اندر لائے۔ اس کے نچلے حصے میں وی سی آر

بھی رکھا تھا۔ دلاور شاہ کی مسکراہٹ نے احساس دلایا کہ مجھے کسی خاص آزمائش سے گزارا جانے والا ہے۔

"ابھی تمہیں دکھاتا ہوں کہ اپنے مخالفین کے ساتھ میں کس قسم کا سلوک کرتا ہوں۔"

دلاور شاہ نے ایک وڈیو کیسٹ وی سی آر میں ڈال کر ٹی وی آن کردیا۔ یہ چھتیس انچ کا ٹی وی تھا۔ جس کی اسکرین منی سینما کی طرح کی تھی۔ اس نے ریموٹ کا بٹن دبایا اگلے ہی لمحے اسکرین پر جو منظر نمودار ہوا اسے دیکھ کر میرا دل رکنے سا لگا تھا۔ شبنم درندہ نما انسانوں میں گھری ہوئی تھی۔ وہ فحش بیانی کرتے ہوئے اسے نوچ کھسوٹ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اس کے کپڑے تار تار کردیے تھے۔ شبنم چیختی چلاتی رہی۔ انہیں گالیاں دیتی رہی لیکن وہ کمزور سی عورت ان چھ ہٹے کٹے مردوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ جو اس وقت شیطان کو مات کررہے تھے۔ اس وڈیو میں وہی سب کچھ تھا جو میں نے ڈاکٹر عائشہ کی زبانی سنا تھا۔ بس فرق وہی تھا جو سننے اور خود دیکھنے میں تھا۔ وہ درندے شبنم سے کھیلتے ہوئے بار بار ایک ہی سوال دہرا رہے تھے کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ انہوں نے بے شرمی کی انتہا کردی تھی۔ میں بے اختیار چیخ اٹھا "بند کرواسے۔ بند کرواسے۔"

دلاور شاہ معنی خیز انداز میں مسکرایا "تم برداشت نہیں کرسکے شاہ عالم۔ اپنی محبوبہ کے ساتھ یہ سلوک۔"

"لعنت ہو شاہ عالم پر۔" میں چلایا "کاش کہ میں شاہ عالم ہوتا تو یہ منظر میرے لیے اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا مگر میں ناصر عظیم ہوں۔ اس ملک کا ایک عام شہری' میرا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی میں بے حس ہوں۔ میری بدقسمتی کہ میرا تعلق انسانوں سے ہے درندوں سے نہیں۔ ورنہ اتنی درندگی تو جنگل کے درندے بھی نہیں دکھاتے۔ کیا تم پولیس والوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔"

میرے لہجے اور الفاظ نے ایک لمحے کو دلاور شاہ کو شرمندہ کردیا تھا لیکن فوراً ہی وہ سنبھل کر بولا "مجرموں کے لیے ہمیں اپنا دل سخت کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"اور مجرم بھی وہی ہوتا ہے جسے تم لوگ مجرم قرار دیتے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا "یہ نظام انصاف اور عدالتیں تو بیکار ہیں۔ انصاف کا سارا کام پولیس پر چھوڑ دینا چاہیے جو خود ہی مدعی ہے خود ہی منصف بلکہ گواہ اور جلاد کا کردار بھی خود ادا کرلیتی ہے۔"

"میں تم سے پولیس سسٹم کے بارے میں بحث نہیں کروں گا۔"

"پھر تم یہ وڈیو دکھا کر مجھ سے پولیس کے لیے کلمات ہائے تحسین کہلوانا چاہتے ہو۔" میں نے طنز کیا۔

پیر سجان بے تاثر نظروں سے ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اس منظر میں اس کے لیے دلچسپی کا کوئی سامان نہ ہو اور نہ ہی وہ اسے انسانیت سے گرا ہوا محسوس کررہا ہو۔ وقفے وقفے سے وہ حقہ بھی پی رہا تھا۔ ابتدائی جذباتیت کے بعد میں نے خود پر قابو پالیا تھا اور اب ایسا ظاہر کررہا تھا کہ ایک عام انسان ہونے کے ناتے مجھ سے انسانیت کی تذلیل کا یہ تماشا دیکھا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے پیر سجان سے کہا "پیر صاحب آپ جانتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں عورت کا کیا مقام ہے۔ وہ پیر پیغمبروں کی ماں ہے۔ اس کی اس حد تک تذلیل۔"

"اس کنجری کو ان سے نہ ملاؤ۔" پیر سجان نے ناگواری سے کہا لیکن اس کے اشارے پر دلاور شاہ نے وی سی آر آف کردیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ اگر شبنم سے میرا جذباتی تعلق نہ ہوتا اور اس وڈیو میں کوئی اجنبی عورت ہوتی تب بھی یہ میری برداشت سے باہر ہی ہوتا۔ اچانک پیر سجان کے پاس چوکی پر رکھا وائرلیس واکی ٹاکی سیٹ بول اٹھا۔ اس نے سیٹ اٹھایا "ہاں بابا۔ کیا بات ہے؟"

دوسری طرف سے جو کہا گیا اسے سن کر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اس نے کہا "ایس ایس پی سے بات کراؤ۔"

ایس ایس پی کا سن کر دلاور شاہ چونکا تھا۔ پیر سجان کہہ رہا تھا "ہاں سناؤ ایس ایس پی' کیسے زحمت کی؟" ایک بار پھر اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا تھا "کون حرامی کہتا ہے۔" اس نے دھاڑ کر کہا "جھوٹ ہے بابا' بکواس ہے جس نے بھی اطلاع دی ہے اس نے اپنی عاقبت کے ساتھ دنیا بھی خراب کرلی ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔" اس نے سیٹ پٹخ دیا اور دلاور شاہ سے بولا "اسے اندر لے جاؤ بلکہ نیچے لے جاؤ۔ خاص تہ خانے میں۔"

دلاور شاہ نے دو مسلح افراد بلاکر مجھے ان کے سپرد کردیا۔ وہ مجھے حویلی کے نچلے حصے میں واقع ایک تہ خانے میں لے گئے۔ تہ خانے میں ایک راہداری کے دونوں اطراف کمرے بنے تھے۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لائے۔ اپنی سجاوٹ سے یہ کمرا نشست گاہ لگ رہا تھا۔ درمیان میں گردے کی شکل کے دو صوفے آمنے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان گول میز تھی۔ نہ جانے انہوں نے کیا کیا کہ ایک صوفہ فرش سمیت سرک کر ایک طرف ہوگیا۔ اس کے نیچے خلا نمودار

ہوا تھا "نیچے اتر جاؤ۔" ایک نے مجھے حکم دیا اور میں سیڑھیاں اتر گیا۔ فوراً ہی اوپر کا خانہ بند ہو گیا۔

بظاہر اندر سے تہ خانے کا دروازہ کھولنے کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ یہ ایک مختصر سا کمرا تھا۔ بمشکل بارہ بائی بارہ فٹ کا۔ اس کی چھت البتہ اونچی تھی۔ نیچے سوائے ایک سادہ سے بستر کے کچھ نہیں تھا۔ کمرا چاروں طرف سے بند تھا لیکن اس میں گھٹن نہیں تھی۔ شاید کہیں سے تازہ ہوا کی آمدورفت جاری تھی۔ تہ خانہ ٹھنڈا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ یہ زمین دوز تھا۔ ورنہ اوپر اس وقت بے پناہ گرمی تھی۔ میں چارپائی پر بچھے بستر پر گر پڑا۔ چند منٹ پہلے جو مجھ پر سخت وقت گزرا تھا' اس نے میرے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا۔ دلاور شاہ نے کمینگی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا بلکہ مجھے شبہ تھا کہ شبنم پر ہونے والے تشدد میں اس کا ہی ہاتھ تھا۔ ورنہ اس کے پاس یہ ویڈیو کیسٹ کہاں سے آئی۔

میرا ذہن ذرا سوچنے کے قابل ہوا تو میں سبحان شاہ کے بارے میں غور کرنے لگا' ایس ایس پی کی آمد پر اس نے جو ردعمل ظاہر کیا تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ ایس ایس پی کی آمد خوشگوار نہیں تھی پھر اس نے مجھے جس طرح اس خفیہ تہ خانے میں پہنچانے کی ہدایت کی تھی' اس سے بھی دال میں کالا ظاہر تھا۔ کیا اسے خدشہ تھا کہ پولیس حویلی کی تلاشی لے گی مگر پولیس پیر سبحان جیسے بااثر شخص کی حویلی کی تلاش لینے کی جرأت کیونکر کر سکتی تھی۔ یہ کسی غریب کی بھونپی یا موٹی کا معاملہ نہیں تھا۔ جسے پیر سبحان کے ہرکارے اٹھا لائے ہوں۔ اول تو پولیس ایسی کسی شکایت پر پیر سبحان کی حویلی کا رخ ہی نہ کرتی اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے آتی بھی تو ایس ایس پی صاحب بذات خود آنے کے بجائے خانہ پری کے لیے کسی معمولی افسر کو بھیج دیتا۔ اچانک میرے ذہن میں الہام کی طرح خیال آیا۔ پولیس صرف شاہ عالم کے لیے آ سکتی تھی۔ کسی ذریعے سے پولیس کو معلوم ہو گیا تھا کہ شاہ عالم پیر سبحان کی حویلی میں تھا۔ بے شک پیر سبحان اہم تھا لیکن شاہ عالم کے فرار کی وجہ سے پولیس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ پریس نے الزامات کی بوچھاڑ کر کے ان کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ وہ شاہ عالم کی دوبارہ گرفتاری کے لیے پاگل ہو رہے تھے تاکہ ایک بار اسے عدالت کے روبرو پیش کر کے سرخرو ہو سکیں۔ معاملہ اتنی اونچی سطح کا تھا کہ ایس ایس پی نے خود آنا ضروری سمجھا۔ پیر سبحان کی حویلی کی تلاشی معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے اس کے مریدوں اور ارادت مندوں میں اشتعال پھیل سکتا تھا۔

ممکن ہے کہ یہ صرف ایک غلط فہمی ہو۔ میں نے خود سے کہا۔ زمین سے کوئی تیس فٹ نیچے اس تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر میں سوائے خیالی گھوڑے دوڑانے کے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی لیکن نیند بھی نہیں آئی تھی۔ شاید بھوک کی وجہ سے۔ آخری بار میں نے دلاور شاہ کے سامنے اس ویران مکان میں کھانا کھایا تھا۔ اس بات کو بھی غالباً بارہ گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں بستر پر لیٹا رہا۔ وقت سستی سے گزر رہا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اوپر سے سرسراہٹ کی آواز آئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ دلاور شاہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

"پولیس شاہ عالم کی تلاش میں آئی تھی۔" میں نے کہا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"تمہیں کیسے پتا۔" پھر بات ادھوری چھوڑ کر اس نے جھلاتے ہوئے انداز میں کہا "ہاں وہ حرامی ایس ایس پی شبیر حسین آیا تھا۔ اس کے پاس حویلی کی تلاش کا وارنٹ بھی تھا۔"

"اپنے ہم جنسوں کو خوب پہچانتے ہو۔ کیا اس نے حویلی کی تلاشی لی؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کوئی پیر سبحان کی حویلی کی تلاشی لینے کی جرأت کرے۔ پولیس ناکام واپس گئی ہے۔" اس نے تکبر سے کہا پھر گالی دے کر بولا "میں اس شخص کو دیکھ لوں گا جس کی یہ ایس ایس پی چھچھ گیری کر رہا ہے۔"

میں نے قہقہہ لگایا "تم انہیں نہیں دیکھ سکتے۔ سبحان شاہ کی حویلی پر پولیس بھیجنے والے معمولی لوگ نہیں ہو سکتے۔"

"بھونکنا بند کرو۔" اس نے دہاڑ کر کہا "جانو ادھر آ۔"

اوپر سے وہی شخص اترا جو مجھے اس تہ خانے تک لایا تھا اس کا جوڑی دار ابھی نظر نہیں آ رہا تھا "حکم سرکار۔"

"اسے ہتھکڑی لگا دو۔" دلاور شاہ نے حکم دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جانو سے اس کی کلاشنکوف لے لی تھی "شاہ عالم شرافت سے ہتھکڑی لگوا لو۔" اس کے لہجے میں سفاکی محسوس کر کے میں نے خود ہاتھ آگے بڑھا دیے۔ مجھے ہتھکڑی لگانے کے لیے جانو آگے آیا تو وہ ایک لمحے کو میرے اور دلاور شاہ کے درمیان آ گیا۔ اگر میں چاہتا تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس شخص کو دلاور شاہ پر دے مارتا لیکن اول تو مجھے یقین تھا کہ میری کسی غلط حرکت پر دلاور شاہ اپنے آدمی کی پروا کیے بغیر بے دریغ فائر کر دے گا۔ دوسرے میں ان پر قابو پا لیتا تب بھی اس جگہ سے میرا نکلنا محال تھا۔ مجھے حویلی کے بارے میں علم نہیں تھا اور سبحان شاہ کے محافظین اس کے چپے چپے پر موجود ہوتے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس فرار سے میرا شاہ عالم ہونا ثابت ہو جاتا اور میرے ساتھ وہ تمام لوگ عتاب میں آ جاتے جن سے ناصر عظیم کا تعلق تھا۔ لہٰذا میں نے ضبط کر کے ہتھکڑی لگوا لی۔

"اوپر چلو۔" دلاور شاہ نے کلاشنکوف سے اشارہ کیا۔

"ہتھکڑی کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو ویسے ہی قید میں ہوں۔" میں نے احتجاجی انداز میں مارچ شروع کیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس طرح ہتھکڑی لگانے کا مقصد مجھے یہاں سے کہیں اور منتقل کرنا تھا۔ ایس ایس پی ناکام واپس گیا تھا اور وہ دوبارہ آ سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس بار وہ تلاشی پر اصرار کرتا اور سبحان شاہ مجبور ہو جاتا۔ لہٰذا مجھے کسی اور مقام پر منتقل کرنا ضروری تھا۔ حویلی کی ویران راہداریوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک پورچ تک پہنچے۔ وہاں سیاہ شیشوں والی ایک پجارو کھڑی تھی۔ بالکل ویسی ہی گاڑی جس سے مجھے اغوا کیا گیا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ وہی پجارو نہ ہو لیکن جب میں نے اس کی نمبر پلیٹ دیکھی تو وہ بالکل مختلف تھی۔ یہ ملتان کی رجسٹرڈ گاڑی تھی۔ اس کی اندر کی آرائش بھی مختلف تھی۔ دلاور شاہ آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں پچھلی سیٹ پر اس کلاشنکوف بردار کے ساتھ بیٹھا تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے دلاور شاہ کے اشارے پر ایک موٹے سیاہ کپڑے کا غلاف میرے سر پر چڑھا دیا تھا۔ جیسے سزائے موت کے مجرموں کے سر پر چڑھایا جاتا ہے۔

پجارو سبک خرامی سے آگے بڑھی۔ سورج غروب ہونے والا تھا لیکن گرمی ابھی تک برقرار تھی یہ اور بات تھی کہ اس ائرکنڈیشنڈ گاڑی کے اندر اس کا اثر محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میری درخواست پر دلاور شاہ نے مجھے پانی تو پلوا دیا تھا لیکن کھانے کو کچھ نہیں دیا تھا۔ وہ جلد از جلد مجھے حویلی سے نکال لے جانے کی فکر میں تھا۔ مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ ہم کس طرف جا رہے تھے مجھے سمتوں کا بھی پتا نہیں تھا۔ یہ جاننا ناممکن تھا کہ ہم لاہور کی طرف جا رہے تھے یا اس سے مخالف سمت میں کسی طرف۔ سفر خاموشی سے جاری تھا۔ ہمیں روانہ ہوئے آدھ یا پون گھنٹا ہو گیا تھا۔ اچانک دلاور نے چلا کر کہا۔

"جانو ہوشیار ہمارا پیچھا کیا جا رہا ہے۔"

کوئی گاڑی زن سے برابر سے گزری تھی اس کے ساتھ ہی میرے کانوں نے برسٹ چلنے اور شیشے بکھرنے کی آواز سنی۔ گاڑی میں کسی نے بھیانک آواز نکالی۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی ڈولنے لگی اور پھر پھر الٹ پلٹ ہونے لگی۔ میں اندر ہی اندر زیرو زبر ہو گیا۔ میرا سر کسی سخت شے سے ٹکرایا اور بے ہوش ہوتے ذہن سے میں نے ایک زوردار دھماکا سنا۔ شاید پجارو کا پیٹرول ٹینک پھٹ گیا تھا اور اب مجھے جل کر مرنے سے سوائے خدا کے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے یہ آخری سوچ تھی جو میرے ذہن میں آئی تھی۔

○☆○

یہ بے ہوشی نہیں تھی بلکہ الٹنے پلٹنے اور پھر سر کسی شے سے ٹکرانے کی وجہ سے مجھے ذرا زیادہ ہی چکر آ گیا تھا۔ میں شاید دس پندرہ منٹ سے زیادہ بے ہوش نہیں رہا تھا۔ ہوش میں آتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میں خاصی مضحکہ خیز حالت میں ہوں۔ میری ٹانگیں اوپر کی طرف تھیں اور گردن کسی شے میں پھنسی ہوئی تھی میرے اوپر کسی جسم کا بوجھ بھی تھا۔ میں نے بمشکل سب سے پہلے اپنا نقاب اتارا۔ جانو میرے اوپر سوار تھا۔ پجارو بائیں کروٹ پر پلٹی تھی۔ جانو دائیں طرف تھا اس لیے وہ مجھ پر سوار تھا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس کی لاش مجھ پر سوار تھی۔ گولیوں نے اس کا سر تقریباً غائب کر دیا تھا اور اس کا خون مجھے تربتر کر رہا تھا۔ میں نے وحشت کے عالم میں اسے دھکا دے کر ایک طرف کیا لیکن وہاں جگہ کہاں تھی۔ مجبوراً میں اس کی لاش پر سوار ہو گیا۔ ہاتھوں میں لگی ہتھکڑی کی وجہ سے رکاوٹ ہو رہی تھی۔ میں نے شیشہ کھولنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ شیشہ غائب ہے۔ غالباً جانو جن گولیوں سے مارا گیا تھا' انہوں نے اسی شیشے سے راہ گزر بنائی تھی۔ الٹنے پلٹنے سے مجھے خاص نقصان نہیں ہوا تھا کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔ ہلکی پھلکی چوٹیں آئی تھیں۔ بمشکل میں نے خود کو پجارو سے باہر نکالا۔

سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ پجارو سڑک سے اتر کر کچے میں الٹی پڑی تھی اور سامنے سڑک پر ایک پرانے ماڈل کی جہازی سائز بیوک دھڑا دھڑ جل رہی تھی۔ میں نے جو دھماکا سنا تھا وہ پجارو نہیں بلکہ بیوک کے پیٹرول ٹینک کے پھٹنے کا تھا۔ شاید جانو اور دلاور شاہ نے بیوک پر فائرنگ کی تھی جو پجارو کا راستہ روکنے کے لیے کھڑی تھی۔ مجھے دلاور شاہ کا خیال آیا۔ میں گھوم کر سامنے کی طرف آیا۔ پجارو کی ونڈ شیلڈ ٹوٹ گئی تھی اور دلاور شاہ کچھ عجیب سے انداز میں پڑا تھا۔ اس کی شاید ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور وہ مر چکا تھا۔ ڈرائیور سیٹ بیلٹ سے بندھا ہونے کی وجہ سے مرنے کے بعد بھی نشست پر رہنے پر مجبور تھا۔ میں نے ذرا آگے جھک کر

دلاور شاہ کو دیکھا۔ معاً میری نظر ڈیش بورڈ کے ساتھ پڑی ویڈیو کیسٹ پر پڑی تھی۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ یہ شاید وہی کیسٹ تھی۔ جس میں شبنم پر ہونے والے انسانیت سوز مظالم کی ریکارڈنگ تھی۔ اچانک دلاور شاہ کراہا۔ اس نے کروٹ لینے کی کوشش کی اور اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ میں نے اسے کھینچ کر پجارو سے باہر نکالا۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔ گولیوں نے اس کے درمیانی دھڑ میں کئی سوراخ کردیے تھے۔ وہ چند لمحوں کا مہمان نظر آرہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور کراہا "شاہ عالم۔"

"ہاں۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "میں شاہ عالم ہی ہوں۔ جس کا پتا معلوم کرنے کے لیے تم نے ایک کمزور سی عورت پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیے تھے۔"

"سنو۔ مجھے کسی طرح اسپتال تک لے چلو۔ میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔"

"موت کو سامنے دیکھ کر بھی تمہاری مکاری نہیں گئی۔ معافی مانگنے سے کیا شبنم کے ساتھ ہونے والے سلوک کی تلافی ہوجائے گی۔" میں نے طنز کیا۔

"پلیز مجھے طبی امداد دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری۔۔۔ مدد کروں گا۔"

"تم میری کیا مدد کرسکتے ہو؟" میں نے اس کے زرد ہوتے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ رب نواز۔ تمہارا۔ دشمن ہورہا ہے۔ میرے پاس ایسے ثبوت ہیں جن سے اس پر ملک سے نوادرات اسمگل کرنے کا جرم ثابت ہوجائے گا۔"

"وہ ثبوت کہاں ہیں؟"

"میں دے دوں گا لیکن۔۔۔ پ۔۔۔ پہلے مجھے اسپتال لے چلو۔"

میں نے چاروں طرف دیکھا اور مایوسی سے بولا "یہاں تو دور دور تک کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم ہیں کہاں؟"

دلاور شاہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے آواز کے بجائے خون ابل پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور خون کا ایک بلبلا سا آکر اس کے ہونٹ سے گوشے پر ٹک گیا تھا۔ وہ مرچکا تھا۔ میرا لباس جانو کے خون میں تر تھا۔ اس لیے میں نے دلاور شاہ کے خون میں لت پت ہونے کا خیال کیے بغیر اس کے لباس کی تلاشی لی اور سب چیزیں نکال لیں۔ ان کا معائنہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ سڑک اگرچہ سنسان تھی لیکن کسی وقت بھی کوئی آسکتا تھا اور اگر پولیس آجاتی تو یہ میرے لیے آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات ہوتی۔ میں نے ایک نظر پیوک والوں پر ڈالی۔ اس میں تین افراد سوار تھے اور تینوں ہی اندر جل مرے تھے۔ ان کے جلتے گوشت سے اٹھنے والی چراند ناقابل برداشت تھی۔ میں بے اختیار ابکائیاں لیتا بھاگا۔ ذرا دور صاف ہوا میں سانس لے کر میری طبیعت بحال ہوئی تھی۔ سورج سے میں نے مغرب کی سمت کا اندازہ لگایا اور اس کے مخالف سمت میں چلنا شروع کردیا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔ میں واپس آیا۔ میں نے دلاور شاہ کی لاش کے پاس پڑا اس کا ریوالور اٹھایا۔ یہ بھرا ہوا تھا مگر تلاش کرنے پر بھی مجھے اضافی گولیاں نہیں ملی تھیں۔ پجارو میں جانو کی کلاشنکوف پڑی تھی۔ اس کا میگزین بھی مل جاتا لیکن میں نے اسے نہیں اٹھایا۔ بڑا ہتھیار اٹھا کر چلنا خود کو مشکوک بناتا تھا۔ پستول میں آسانی سے لباس میں چھپا سکتا تھا۔ لباس پر لگا خون مجھے پریشان کررہا تھا۔ اس سے لوگ شکوک میں مبتلا ہوجاتے مگر خوش قسمتی سے لباس گہرے نیلے رنگ کا تھا اور سورج غروب ہونے کے بعد اس پر خون کے دھبے نہیں دیکھے جاسکتے تھے۔ میں سڑک سے ذرا ہٹ کر درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چل رہا تھا۔

صبح سے کچھ نہ کھانے کی وجہ سے مارے بھوک کے آنتوں میں بل پڑ رہے تھے۔ اب پیاس بھی شدت کی لگ رہی تھی۔ خاصی دور نکلنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ مجھے پجارو کی تلاشی لینی چاہیے تھی۔ ممکن تھا کہ وہاں سے کھانے پینے کی کوئی شے نکل آتی لیکن اب میں خاصی دور نکل آیا تھا اور جائے حادثہ پر دوبارہ جانے کا مطلب خود کو گرفتار کرانا تھا وہاں اب تک پولیس آچکی ہوگی اور وہاں جمع ہونے والے تماش بینوں کو سمیٹ رہی ہوگی۔

دلاور شاہ کی کلائی سے اتاری گھڑی میں رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ یہ خاصی سنسان سی سڑک تھی اتنی دیر میں صرف چند ایک گاڑیاں ہی گزری تھیں۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی پر بھوسا جارہا تھا اس کے عقبی حصے میں دو کم عمر بچے خطرناک انداز میں کھیل رہے تھے پھر ایک پک اپ گزری۔ جس پر کوئی برات لدی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک نوجوان ڈانس کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ان کی بے فکری دیکھ کر اور قہقہے سن کر مجھے خلش سی ہوئی تھی کہ کاش میں بھی ایک عام دیہاتی ہوتا۔

اچانک بہتے پانی کی جاں فزا آواز نے مجھے رک جانے پر مجبور کردیا تھا۔ جھاڑیوں کی دوسری طرف ایک رہٹ تھا جسے دو بیل چلا رہے تھے۔ کنوئیں سے نکلنے والا پانی ایک نال سے

ہوتا ہوا دور کھیتوں کی طرف جارہا تھا۔ میں نے دوڑ کر سب سے پہلے پیاس بجھائی۔ شدید پیاس کے عالم میں کنوئیں سے نکلنے والا یہ پانی جیسے آب حیات ثابت ہوا تھا۔ پیاس بجھا کر میں نے کپڑوں پر لگے خون کے داغ صاف کرنے کی کوشش کی اور ناکام ہو کر انہیں اتار کر دھولیا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں نے سامان ایک طرف رکھا اور کپڑے اتار کر اس مختصر سے حوض میں گھس گیا۔ جس میں رہٹ کا پانی گر رہا تھا۔ گرمی خاصی تھی اور سرد پانی نے مجھے ترو تازہ کردیا تھا۔ نہ صرف جسمانی کلفت دھو ڈالی تھی بلکہ میں ذہنی طور پر بھی خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔

"اے کیا کر رہے ہو؟" اچانک آواز آئی تو میں اچھل پڑا تھا۔ یہ ایک سولہ سترہ سالہ صحت مند دیہاتی لڑکا تھا۔ میں نے شرمندگی محسوس کی کیونکہ سوائے انڈرویئر کے میرے جسم پر کچھ نہیں تھا "باہر نکلو۔"

"معاف کرنا بھائی۔" میں نے باہر آکے کہا "ایک کتا پیچھے لگ گیا تھا' اس سے بچتے ہوئے ایک جوہڑ میں جاگرا تھا۔ سارے کپڑے خراب ہوگئے تھے۔"

لڑکا میری وضاحت سے کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا تھا لیکن ریوالور پر نظر پڑتے ہی وہ پھر مشکوک ہوگیا۔

"تم چور۔۔۔ ڈاکو ہو؟"

"میں شکل سے تمہیں چور یا ڈاکو نظر آتا ہوں۔" میں نے ہنس کر کہا "میں ایک شریف آدمی ہوں۔ محکمہ انہار میں افسر ہوں۔ پیچھے سڑک پر میری گاڑی کھڑی ہے پیٹرول ختم ہوگیا تھا۔ آگے کسی پیٹرول پمپ کی تلاش میں تھا کہ کتا پیچھے لگ گیا۔ یہ ریوالور میں نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا ہے اس کا لائسنس بھی ہے میرے پاس۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب لڑکا مطمئن نظر آنے لگا تھا۔ اس نے لائسنس بھی نہیں مانگا تھا "میرا نام رحیم داد ہے پرلی طرف گاؤں میں گھر ہے۔"

"یار رحیم داد سخت بھوک لگی ہے۔ صبح ناشتا کیا تھا۔ اگر یہاں کھانے کو مل جائے تو میں معاوضہ بھی دوں گا۔"

"تو بہ جی کھانے کا معاوضہ۔" اس نے کہا "ہمارے ہاں مہمانوں سے کھانے کے پیسے نہیں لیے جاتے۔"

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی تھی۔ کھیتوں کے پار رحیم داد کا گاؤں تھا۔ میں گیلے کپڑے پہن کر اس کے ساتھ چل دیا تھا۔ وہ جتنا سیدھا تھا' اس کا باپ اتنا ہی ٹیڑھا ثابت ہوا۔ اس نے مجھے گھر میں بٹھا کر کھانا کھلایا مگر ساتھ ہی اس نے سوالات شروع کردیے اور ہر سوال سے ذیلی سوال پیدا کرنا اس کی پیدائشی عادت تھی۔ رحیم نے اسے روکنے کی کوشش کی "ابا اسے سکون سے کھانا تو کھالینے دے۔"

"بکواس نہ کر حرامی۔ جا کر دیکھ وہ تیرے باپ نہ کوئی لے جائے۔ گاؤں میں مویشی چوری بڑھتی جارہی ہے۔"

والد ماجد کا اشارہ بیلوں کی طرف تھا۔ بڈھے کے سوالوں سے تنگ آکر میں نے الٹے جواب دینا شروع کردیے۔

"آپ کہاں سے آئے ہو؟"

"لاہور سے۔ دو سال ہوگئے۔ اس سے پہلے میں ایک پاگل خانے میں تھا۔"

"پاگل خانے میں۔" وہ حیران ہوا "مگر آپ تو بابا ٹھیک نظر آتے ہو۔"

"نظر آتا ہوں۔" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا "پاگل تو وہ ڈاکٹر تھے جو مجھ سے روز پوچھتے تھے کہ میں نے اس بندے کو کیوں مارا۔"

"بندے کو۔" اس کی جان نکل گئی تھی "قتل کردیا۔ سچ مچ مار دیا۔"

"نہیں کیا جھوٹ موٹ مارتا۔"

"لیکن کیوں جناب؟"

"اب یہ تو یاد نہیں ہے۔ اس وقت میں پاگل تھا۔ ممکن ہے مجھے اس کی کوئی بات پسند نہ آئی ہو اور میں نے اسے گولی ماردی۔"

"گگ۔۔۔ گولی ماردی؟" آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی۔ اس نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا "مم۔۔۔ آپ کے لیے۔۔۔ پانی لاتا ہوں۔"

بڈھے کی حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آرہی تھی لیکن یہ زیادہ ہی مذاق ہوگیا تھا۔ ممکن تھا' وہ خوف زدہ ہو کر گاؤں والوں کو بلا لاتا اور میں کسی نئی مصیبت میں پڑجاتا۔ میں نے جلدی جلدی کھانا کھایا۔ بڈھے کو آواز دی کہ برتن واپس لے جائے' وہ پانی لینے گیا تھا تو واپس ہی نہیں آیا تھا۔ ڈرتے ڈرتے آیا تو میں نے اسے سو کا ایک نوٹ دیا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ وہ دعائیں دینے لگا تھا "اب میں چلتا ہوں' تمہارا شکریہ۔"

"اتنی رات گئے آپ کہاں جاؤ گے؟" اس نے جلدی سے کہا "رات یہاں ٹھہر جاؤ۔ صبح چلے جانا۔ اس وقت تو گاڑیاں بھی بند ہوگئی ہوں گی۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ واقعی اتنی رات گئے میں یہاں سے نکلتا تو کہاں جاتا۔ تھکن سے چور میرا جسم اب آرام طلب

کر رہا تھا۔ رحیم داد کا باپ لالچ میں آگیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں رات بھر ٹھہرنے کا معاوضہ الگ سے دوں گا اور ناشتے کا الگ ہے۔ میرا کوئی نقصان نہیں تھا۔ رقم بھی دلاور شاہ کی جارہی تھی۔ اس کے بٹوے میں پچیس ہزار سے اوپر ہی رقم تھی۔ ایک ڈی ایس پی کی جیب میں اتنا کیش تو ہونا ہی چاہیے۔ میں رکنے پر تیار ہوا تو وہ خوش ہوگیا تھا۔ اس نے جلدی سے اس چارپائی پر ایک کھیس لاکر بچھادیا اور مچھروں سے بچنے کے لیے ایک چادر بھی لادی۔ اتنی دیر میں میرے کپڑے تقریباً خشک ہوچکے تھے لہٰذا میں نے اس سے کوئی خشک جوڑا مانگنے کا ارادہ ترک کردیا۔ میں چادر اوڑھ کر لیٹ گیا۔ مگر چادر کا مورچا بھی مچھروں کی یلغار کے آگے بے بس ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے کاٹنا اور گانا سنانا شروع کردیا۔ تھکن اتنی زیادہ تھی کہ میں ان کی پروا کیے بغیر ہی سوگیا۔

رات کے نہ جانے کس پہر میری چھٹی حس نے چونکا دیا۔ جیسے پاس ہی کوئی خطرہ ہو۔ میں چونک کر اٹھا تو ایک سایہ بھڑک کر بھاگا۔ میں نے اسے للکارا "خبردار، رک جاؤ۔ ورنہ گولی ماردوں" حالانکہ میرے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا۔ وہ رک گیا۔ "خدا کے لیے گولی نہ چلانا" آواز رحیم داد کے باپ کی تھی۔ صحن میں لگی لالٹین بجھ گئی تھی۔

"کیا کررہے تھے تم میرے بستر کے پاس۔ پرس سے رقم چرانا چاہتے تھے۔"

"مجھے معاف کردو" اس نے کہا اور یک دم دھاڑیں مار کر رونے لگا "میں اور کیا کروں۔ بیٹی کا گھر بسانے کے لیے چوری نہ کروں تو کیا کروں۔ گھر اور زمین پہلے ہی رہن رکھ چکا ہوں۔"

"بے وقوف بناتے ہو مجھے، تمہارے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے" میں نے اسے شانے سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"بیٹی، اپنے گھر میں ہے لیکن اس کا کمینہ شوہر دھمکی دے رہا ہے اگر میں نے موٹر سائیکل نہ دلائی تو وہ اسے اور اس کے چار بچوں کو گھر سے نکال دے گا۔"

"اور تم اس کی بلیک میلنگ میں آگئے" میں نے تلخی سے کہا "شاید پہلے بھی وہ تمہیں اس طرح دھمکیاں دے کر اپنے مطالبات منواتا رہا ہے۔ یہ بتاؤ زمین اور گھر کیوں رہن رکھی ہے؟"

"اس کمینے کو بیلوں کی جوڑی دینے کے لیے" اس نے نفرت بھرے انداز میں کہا "پٹواری نے دونوں کے صرف بارہ ہزار روپے دیے تھے۔"

"آج تم چوری کررہے ہو، کل داماد کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے ڈاکا مارو گے۔ اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ تم جاکر اپنی بیٹی اور اس کے بچوں کو لے آؤ اور اپنے کمینے داماد سے وہ سب کچھ چھین لو جو تم نے اسے دیا تھا۔ اس کا دماغ ٹھکانے پر آجائے گا۔"

"شاید اب ایسا ہی کرنا پڑے" اس نے کہا پھر میرے سامنے ہاتھ جوڑدیے "خدا کے لیے مجھے معاف کردو۔ پولیس میں رپورٹ نہ کرنا ورنہ میں بالکل ہی برباد ہوجاؤں گا۔"

مجھے بے اختیار اس پر ترس آنے لگا۔ وہ اس ملک کی کچلی ہوئی بے بس عوام کا ایک نمونہ تھا جو خدا سے زیادہ اس کی زمین پر فرعون بن جانے والوں سے ڈرتا تھا۔ وہ ہر طاقت ور سے دبتا تھا۔ اپنا حق احسان سمجھ کر لیتا تھا۔ حق غصب کرنے پر صبر کا سہارا لیتا تھا۔ "اگر تمہارا گھر اور زمین تمہیں واپس مل جائے تو؟"

اس کا چہرہ چمک اٹھا "تو مجھے پٹواری کو آدھی پیداوار نہیں دینا ہوگی۔"

میں نے اسے بٹوے سے پندرہ ہزار نکال کردیے "یہ رکھو۔ اپنی زمین اور مکان چھڑاؤ اور میرا مشورہ ہے کہ داماد پر لعنت بھیج کر بیٹی کو گھر لے آؤ۔ اس طرح تو تم اسے تباہ کررہے ہو۔ تمہارا لالچی داماد ایک دن اسے بھی بیچ کر کھاجائے گا۔"

اس پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اس کی ذلیل حرکت کے بدلے میں سزا کے بجائے اسے رقم بطور انعام تھمادوں گا۔ اس نے گھگیا کر کہا "نہیں صاحب، میں یہ رقم نہیں لوں گا۔"

"کیوں نہیں لوگے" میں نے ڈانٹ کر کہا "چوری کرنے کو تیار ہوگئے تھے اور اب میں دے رہا ہوں تو انکار کررہے ہو" میں نے نوٹ اس کے ہاتھ میں زبردستی تھمادیے۔ وہ ایک بار پھر رونے لگا تھا۔ اس نے اتنی بار میرا شکریہ ادا کیا کہ میں شرمندگی محسوس کرنے لگا تھا۔ رات خاتمے کے قریب تھی۔ میں تقریباً چھ گھنٹے سویا تھا اور تازہ دم ہوگیا تھا۔ لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ اب روانہ ہوجاؤں مگر رحیم داد کا باپ مجھے چمٹ گیا۔ اس نے ناشتا کیے بغیر جانے کی اجازت دینے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے خود میرے لیے دیسی گھی میں پراٹھے بنائے، انڈے تلے اور چائے بنائی۔ اسی وقت رحیم داد آگیا تھا۔ وہ ساری رات زمینوں کو پانی دیتا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے خوشی کا اظہار کیا لیکن وہ تھکا ہوا تھا اس لیے ناشتا کرتے ہی سونے چلا گیا۔ رحیم داد کا باپ مجھے سڑک تک چھوڑنے آیا تھا۔ اس کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر میں

نے اس سے ایک کرتا اور لنگی حاصل کرلی تھی۔ لباس پرانا اور بوسیدہ لیکن صاف ستھرا تھا۔ مجھے شلوار قمیص سے دھل جانے کے باوجود کراہیت ہورہی تھی۔ اس نے میری درخواست پر اپنی چارخانے کی سر پر باندھنے والی چادر بھی میرے حوالے کردی تھی اس طرح میرا حلیہ خاصی حد تک بدل گیا تھا۔ چہرے پر چار دن کی بڑھی ہوئی شیو تھی۔

لاہور جانے والی بس خلاف توقع خالی تھی۔ صبح ہی صبح کم لوگ سفر کرتے ہیں۔ لاہور قریب آیا تو ایک جگہ پیشاب کے بہانے بس رکوا کر میں نے ریوالور سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ اگر کسی چیک پوسٹ پر تلاشی لی جارہی ہوتی تو یہ ریوالور مجھے پکڑوا دیتا اور پھر پولیس کو شاہ عالم کو پہچاننے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ انارکلی سے کچھ دور بس اڈے پر اتر کر میں نے سب سے پہلے ایک ہوٹل میں چائے پی اور تازہ اخبار دیکھا جسے درجنوں لوگوں نے باسی کردیا تھا۔ شاہ عالم کی مفروری کی خبر ابھی تک گرم تھی۔ شاید اس وجہ سے بھی کہ شاہ عالم کی تلاش میں مصروف پولیس نے شبنم کو گرفتار کرکے اور پھر انسانیت سوز تشدد کرکے پورے پریس کو اپنے خلاف کرلیا تھا۔ دو اخباروں نے پولیس کی اس لاقانونیت کے خلاف زوردار اداریے لکھے تھے جبکہ پنجاب کے ایڈووکیٹ جنرل نے اس الزام کی تردید کی تھی۔

ایڈووکیٹ جنرل نے حکومت کی طرف سے عدالت میں بیان دیا تھا کہ پولیس یا کسی صوبائی ایجنسی نے شبنم کو گرفتار نہیں کیا، اس لیے بہیمانہ سلوک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس سفید جھوٹ پر تلخی سے مسکرادیا تھا۔ مجھے اس ویڈیو کیسٹ کا خیال آیا جس میں ان لوگوں کے مکروہ چہرے محفوظ تھے جو شبنم پر ظلم میں پیش پیش تھے اور اس ظلم کا ایک کردار کیفر کردار تک پہنچ چکا تھا یعنی دلاور شاہ۔ اگرچہ اس کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا لیکن قدرت نے اسے جو عبرت ناک موت دی تھی، اس سے میں نے اندر سے اطمینان محسوس کیا تھا۔ اب میرے پاس ایسا ثبوت بھی آگیا تھا کہ شبنم کے ساتھ درندگی کرنے والوں کو قانون کے ذریعے سزا دلوا سکتا لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ اس وقت سب سے پہلے مجھے کسی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچنا تھا۔ پولیس کے ساتھ دشمن بھی کتے کی طرح شاہ عالم کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔

ہوٹل سے میں ایک پی سی او تک گیا۔ میں نے نیلم کے گھر کا نمبر ملایا۔ فون خالہ بانو نے اٹھایا "میاں جی، کون ہو تم؟"

"ایک بھوت!" میں نے قہقہہ لگا کر کہا "اب میں تمہارے پاس آرہا ہوں۔"

"ناصر میاں!" خالہ نے چیخ ماری "کہاں ہو؟ یہاں سب کو پریشان کر رکھا ہے۔"

"ناصر!" عقب میں نیلم کی چیخ سنائی دی اور وہ ریسیور لینے بھاگی۔ پس منظر میں کسی شے کے لڑھکنے کی آواز آئی پھر اس نے خالہ سے ریسیور چھین لیا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی "ناصر، کہاں ہو تم؟"

"اسی دنیا میں" میں نے فلسفیانہ انداز میں حقیقت کا اظہار کیا "ظاہر ہے دوسری دنیا سے ابھی تک کسی مواصلاتی رابطے کا سلسلہ نہیں چلا ہے۔"

"بکومت، تمہیں احساس ہے کہ ہم سب کس قدر پریشان رہے ہیں، کہاں چلے گئے تھے تم؟" اس نے برہمی سے کہا۔

"خادم کہیں نہیں گیا تھا بلکہ لے جایا گیا تھا اور بڑی مشکل سے چھوٹ کر واپس آیا ہے۔ خیر باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی، یہ بتاؤ کہ رئیس کہاں ہے؟"

"رئیس یہ رہا لیکن تم۔۔۔" اس سے ریسیور رئیس نے چھین لیا اور گالیوں سے آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"قسم اللہ کی یارے، آج تو میرے ہاتھوں قتل ہوجائے گا" وہ بہت کچھ کہتا رہا اور عقب میں نیلم اسے ڈانٹتی رہی تھی، میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بکواس نہ کر۔ باقی گالیاں منہ پر دے لینا۔ ابھی تو مال روڈ پر میکڈونلڈ کے سامنے والے پی سی او پر آجا۔"

دوسری کال میں نے دن میں سیون کی ملائی اور اس سے پیر سبحان شاہ کا لاہور کا نمبر مانگا۔ پیر سبحان صوبائی اسمبلی کا ممبر بھی تھا لہٰذا اس کا نمبر ملنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ میں نے وہاں فون کرکے پیر سبحان کی لاہور پاک پتن روڈ والی کوٹھی کا نمبر حاصل کیا۔ آخری فون میں نے اسے ہی کیا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ گالیاں بکنے لگا تھا۔

"میں تجھ سے متعلق ہر فرد کو مٹادوں گا" اس نے دھمکی دی۔

"آپ ایسا کرسکتے ہیں لیکن میں نے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ اس حادثے سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ جو بھی تھے، ان کا مقصد مجھے قتل کرنا تھا۔ انہوں نے اسٹریٹ فائرنگ کی تھی لیکن قضا دلاور شاہ اور دوسرے لوگوں کو آگئی۔ جانو کے مرنے کے بعد میں نے اس کی کلاشنکوف سے سفید بیوک والوں پر فائر کیے تھے۔ اس سے کار کے پیٹرول ٹینک میں آگ لگ جانے سے وہ سب جل مرے۔ اگر

کررہا تھا۔ رشت یا حمایتی ہوتے تو میں ان پر فائر کیوں کرتا۔ کہ میں رپورٹ آپ کو بتائے گی کہ جانو اور ڈرائیور فوراً ہلاک ہو گئے تھے۔ دلاور شاہ نے میرے سامنے دم توڑا تھا لیکن اُس کے پاس صرف ریوالور تھا اور وہ پیوک پر فائرنگ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ اس سے میری بے گناہی ثابت ہوتی ہے۔"

"تم دلاور شاہ کا ریوالور اور اس کے پاس موجود دوسری اشیا بھی لے گئے تھے۔"

"جی نہیں" میں نے جلدی سے کہا "میں نے اس کے پاس سے کوئی شے نہیں اٹھائی تھی۔ ویسے بھی مجھے پولیس کے آنے سے پہلے وہاں سے بھاگ جانے کی جلدی تھی۔"

"اس کی ساری اشیا غائب ہیں۔ ان میں پرس اور ریوالور کے ساتھ دوسری اہم چیزیں بھی تھیں" سبحان شاہ نے وڈیو کیسٹ کا نام لینے سے گریز کیا۔

"ممکن ہے' یہ کسی اُچکے کا کام ہو۔ پولیس کی آمد سے پہلے کسی نے ہاتھ کی صفائی دکھادی ہو۔ حادثات کے بعد عام طور سے اس قسم کے کام ہوجاتے ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" وہ عیاری سے بولا۔

"معاف کیجئے گا پیر صاحب! ابھی میں خود کو خطرے میں محسوس کررہا ہوں۔ کسی کو اپنے بارے میں نہیں بتا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن آپ کا دل میری طرف سے صاف ہوجائے گا۔ آپ ہی نہیں سارا زمانہ تسلیم کرے گا کہ شاہ عالم اور ناصر عظیم دو الگ اور منفرد انسان ہیں۔ مجھے خطرہ شاہ عالم کے خون کے پیاسے دشمنوں سے ہے جو مجھے دیکھتے ہی ماردیں گے۔ ان سے بچنے کے لیے میرا روپوش ہونا ضروری ہے۔"

"اس کے لیے تم ہماری پناہ میں آسکتے ہو۔ یہاں کوئی تمہارا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔"

میں نے اس کی مکاری پر دل ہی دل میں ہنستے ہوئے اسے انتہائی منافقت سے پر جواب دیا۔ "آپ کی پیش کش کا شکریہ پیر صاحب! لیکن میرے اپنے بھی کچھ وسائل ہیں۔ اگر میں نے کبھی ضرورت محسوس کی تو آپ کی پیش کش سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ اچھا خدا حافظ!" اس سے پہلے وہ کچھ کہتا' میں فون رکھ چکا تھا۔ پی سی او والے نوجوان کو کالوں کی ادائیگی کرکے میں باہر آگیا۔ ابھی صبح کے سوا نو بجے تھے اور مال روڈ سوئی ہوئی تھی۔ ٹریفک جاری تھا لیکن دکانیں اور شاپنگ سینٹرز ابھی نہیں کھلے تھے۔ رئیس ایک چھوٹی سوزوکی سو نفٹ دوڑاتا نمودار ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا اور میں فوراً اندر بیٹھ گیا۔ میں نے سر سے بندھی چادر اتار دی تھی۔

"کسی نے تیرا پیچھا تو نہیں کیا۔"

"ہاں' موت کا فرشتہ آرہا ہے' تیرا پتا پوچھ رہا تھا" اس نے بھنا کر کہا۔

میں ہنس دیا "کیا بات ہے پیارے' بڑے تپے ہوئے لگ رہے ہو۔"

"الو کے پٹھے' تجھے کیا ضرورت تھی گاڑی سے باہر جانے کی۔"

"میں باہر نہیں گیا تھا بلکہ مجھے پجارو سے ہی اغوا کرلیا گیا تھا۔" میں نے کہا پھر اسے اپنے اغوا کی روداد سنائی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ میں کس کی قید میں تھا اور وہاں سے میری رہائی کیوں کر ہوئی لیکن میں نے کہہ دیا کہ ایک ہی بار سب کے سامنے بیان جاری کروں گا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ باری باری سب کو سناؤں۔ رئیس نے بتایا کہ میرے غائب ہونے کے بارے میں اسے اور نیلم کے علاوہ صرف کمال' عباسی اور رخشی کو علم تھا۔ چندا اور قمر کو نہیں بتایا تھا اور شبنم بدستور ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں تھی' اس کی حالت ابھی سنبھلی نہیں تھی۔

"شبنم کو مسلسل ہسٹریا کے دورے پڑرہے ہیں" رئیس نے کہا "ڈاکٹر عائشہ کو خطرہ ہے کہ اس کا دماغ زیادہ ہی متاثر نہ ہوجائے۔"

"اس پر ہونے والے ظلم کا مداوا تو نہیں ہوسکتا لیکن اس کے ذمے داروں کو ضرور کیفرکردار تک پہنچایا جاسکتا ہے" میں نے کرتے کی جیب میں رکھی وڈیو محسوس کی۔

"ذمے دار!" رئیس تلخی سے بولا "پولیس والوں کے خلاف آج تک کوئی کارروائی ہوئی ہے' پولیس پہلے ہی شبنم کی گرفتاری اور اس پر ہونے والے تشدد سے انکار کرچکی ہے۔"

"اب نہیں کرسکے گی۔" میں نے اعتماد سے کہا اور اسے وڈیو کیسٹ کے بارے میں بتایا جس میں شبنم پر ہونے والے تشدد کے ذمے دار شیطانوں کے چہرے واضح تھے۔ رئیس اچھل پڑا۔

"یہ کیسٹ تیرے ہاتھ کہاں سے لگی؟"

"صبر یار! بس گھر پہنچنے والے ہیں پھر ایک ساتھ ہی بتاؤں گا۔ یہ بتا کہ جب تونے مجھے واپسی پر غائب پایا تو کیا کیا؟"

"پجارو کا دروازہ کھلا دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ تو اس طرح غیر ذمے داری سے نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے اردگرد والوں سے پوچھا لیکن کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔"

"دیکھا بھی ہوگا تو انجان بن گئے ہوں گے" میں نے تلخی سے کہا "ہمارے معاشرے میں بے حسی کی بیماری زیادہ ہی سرایت کرگئی ہے۔"

"تونے ٹھیک کہا۔ پجارو جس دکان کے سامنے کھڑی تھی' اس کے مالک نے بھی انکار کیا تھا لیکن جب میں نے اپنے انداز میں پوچھا تو اس نے اقرار کرلیا۔ دو افراد تجھے ایک سوزوکی میں ڈال کر لے گئے تھے۔ یہ ہائی روف تھی۔ انہوں نے گاڑی بالکل پجارو کے ساتھ روکی تھی۔ سائیڈنگ ڈور سے تجھے ہائی روف میں منتقل کیا اور لے گئے لیکن اس نے پولیس کے سامنے بیان دینے سے انکار کردیا۔"

"ظاہر ہے پولیس مجھے خاک تلاش کرتی۔ اسے ضرور اٹھوا لے جاتی" میں نے افسوس سے کہا۔

نیلم ہاؤس کے مستعد گارڈ نے سوزوکی اور رئیس کی صورت دیکھ کر گیٹ کا الیکٹرانک لاک کھولا تھا۔ نیلم نے پچھلے کچھ عرصے سے گھر کی سکیورٹی میں خاصا اضافہ کردیا تھا۔ چاردیواری بلند کرا کے اس پر خاردار تاریں بھی لگوالی تھیں' ایک زمانے میں ماڈل ٹاؤن خوب صورت اور کھلے مکانوں کا مسکن تھا' جن کی چاردیواری پانچ فٹ سے زیادہ اونچی نہیں ہوا کرتی تھی لیکن حالات نے اب اسے جنگی قلعوں کا علاقہ بنادیا تھا۔ خاردار تاروں میں سمٹے مکانات جنگی مورچوں کا سا منظر پیش کرنے لگے تھے۔

بے تاب نیلم لان میں ہی ٹہل رہی تھی' مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی اور میرے بازو تھام کر بولی "کہاں تھے تم' کیوں اتنا ستانے لگے ہو ہم سب کو؟"

"میرا مقدر ہی خراب ہے" میں نے تلخی سے کہا "اب میں اس سے تو لڑنے سے رہا۔"

"اسے اندر تو آنے دو۔ نہ جانے کن حالات سے گزر کر آیا ہے" رئیس نے نرمی سے کہا۔

ہم اندر چھوٹے ڈرائنگ روم میں آگئے جو مشرقی انداز میں سجا تھا۔ دبیز قالین کے ساتھ گاؤ تکیے تھے۔ میں نے جوتے اتار پھینکے اور قالین پر دراز ہوگیا۔ نیلم نے خالہ بانو سے ناشتا لانے کو کہا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ "نہیں' صرف کافی منگوالو اور پھر جگر تھام کر میری داستان سنو۔"

"تھوڑی دیر کے لیے رک جاؤ۔ میں نے فرید عباسی اور کمال کو فون کردیا ہے۔ وہ آنے والے ہوں گے۔ ان کے سامنے یہ داستان جگر سنانا۔"

"کہاں ہے وہ الو کا پٹھا" کمال نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا "بہت ڈھیٹ آدمی ہے دشمن بھی نہیں مارتے۔ کبھی تو ہی ذرا سکون سے رہ سکیں۔"

"یہ کیا طریقہ ہے۔ سلام نہ دعا۔ آتے ہی الٹی سیدھی شروع ہوگئے" نیلم نے خفگی سے کہا۔

"میڈم! آپ نہیں جانتیں' یہ شخص اسی قابل ہے" اس بار فرید اندر آیا "یہ شخص یہاں زندہ بیٹھا ہے اور میں عدالت میں اس کی مرگِ ناگہانی کا واویلا مچا رہا ہوں۔"

نیلم اتنی خفا ہوئی کہ کافی لانے کے بہانے بائیکاٹ کرگئی۔ کمال اور فرید نے کافی پینے سے انکار کرتے ہوئے ناشتے کا مطالبہ کیا۔ "اس الو کے پٹھے کی وجہ سے نہار منہ تمہاری طرف دوڑنا پڑا۔"

"یہ دوست ہیں تمہارے؟" نیلم نے جاتے جاتے کہا "مجھے تو بچپن کے دشمن لگتے ہیں۔"

"قسم اللہ کی' اپنے پیٹ میں بھی کچھ نہیں گیا ہے" رئیس نے سرد آہ بھری "صبح صبح ناشتے کے بغیر تیرا منحوس چہرہ دیکھنا پڑا۔ یار! یہ نیلم مستقبل میں بھی اسی طرح تیرے پیچھے خالی پیٹ دوڑائے گی؟"

"تو شوہر بن کر زیادہ مجبور ہوگا میرے یار!"

کافی پیتے ہوئے میں نے انہیں اپنے اغوا اور قید کی داستان سنائی۔ درمیان میں یوں بار بار اغوا ہونے پر مجھے ان کی طرف سے لعنت ملامت کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن بالآخر انہوں نے مجھے خراج تحسین پیش کیا کہ میں نے اپنی ذاتی عقل سے کام لے کر معاملے کو مزید بگڑنے سے بچالیا۔ خاص طور سے وڈیو کیسٹ کے بارے میں سن کر وہ اچھل ہی پڑے تھے۔ عباسی نے جوش سے کہا "اب میں دیکھتا ہوں' وہ حرام زادے کس طرح بچتے ہیں۔"

"زیادہ خوش فہمی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے" میں نے اسے خبردار کیا "اول تو یہ شرمناک وڈیو دیکھنا ہی ایک مشکل مرحلہ ہوگا پھر اسے دوسروں کو دکھانا اور میڈیا میں اس کی پبلسٹی۔۔۔ یہ سب باتیں شبنم کے لیے آئندہ ایک آزار بن جائیں گی۔"

"قانون کا راستہ اختیار کرنا مشکل اور صبر آزما ہوگا" کمال نے میری تائید کی "انصاف ملنے کی امید پھر بھی نہیں ہوگی۔ پولیس کا پورا محکمہ اپنے ساتھیوں کو بچانے کے لیے متحد ہوجائے گا۔ ماضی میں ایسی مثالیں عام رہی ہیں جب سنگین ترین جرائم میں ملوث پولیس والوں کو ثبوت اور گواہ ہونے کے باوجود عدالت سے کوئی سزا نہیں ہوئی۔"

"اس کا ایک راستہ اور بھی ہے" عباسی نے تلخی سے

کررہا تھا مارشل آرٹ اور لڑائی کے ماہر اپنے ناصر صاحب کہ شے خود ان لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیں۔"

"تم لوگ اتنے مایوس کیوں ہو؟" نیلم نے ہمیں ڈانٹا "شبنم مشہور صحافی ہے۔ اگر ہم پریس کی مدد حاصل کریں تو حکومت بھی ان مجرموں کو نہیں بچا سکے گی۔"

"اس صورت میں وہ غائب ہو جائیں گے۔" فرید نے تلخی سے کہا "نہیں بیوی بچوں سمیت دوسرے علاقوں میں یا باہر بھیج دیا جائے گا۔ پولیس کو ہر اعتبار سے محفوظ رکھنا بیوروکریسی کی مجبوری ہے تاکہ پولیس ان کے ہر جا و بے جا حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کر سکے۔ احتساب کے خوف سے آزادی پولیس کو ایک بے لگام فورس بنا دیتی ہے جیسی کہ پاکستانی پولیس ہے۔ یہاں آج تک پولیس کا احتساب نہیں ہوا۔ جو وزیر اعظم کے بھائی کو بھی نہیں بخشتی۔"

میں نے مایوسی سے ویڈیو کیسٹ کی طرف دیکھا "یعنی یہ بالکل بے کار ہے؟"

"نہیں' ایسا نہیں ہے۔ اس کی مدد سے ہم کم از کم ظلم کے خلاف آواز تو اٹھا سکتے ہیں۔ انصاف کا آغاز طلب کرنے سے ہوتا ہے' جب کوئی مانگے گا ہی نہیں تو انصاف ملے گا کیسے؟" کمال نے کہا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ عام طور سے ہمارے مسئلوں میں بولنے سے گریز کرتا تھا۔ ہاں وہ ہر قسم کی مدد کے لیے ضرور تیار رہتا تھا لیکن اس وقت اس نے یہ بات کہہ کر ہمارے حوصلوں کو بالکل ہی ختم ہونے سے بچا لیا تھا۔

میں نے کہا۔ "دوسرے یہ کہ میں ان چھ شیطانوں کو سزا دے سکتا ہوں لیکن اس کا فائدہ کچھ نہیں ہے۔ یہ صرف مہرے ہیں جن کو چلانے والے لوگ کوئی اور ہیں۔ ان کے ہٹ جانے سے انہیں کوئی فرق نہیں ہوگا۔"

نیلم نے گہری سانس لی "رب نواز جیسے لوگوں سے ٹکرانا آسان کام نہیں ہے۔ ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا پڑے گا۔ ناصر کی پوزیشن سب سے نازک ہے۔ اس پر شاہ عالم کا ٹھپا باقی ہے۔ اسے اترنے میں وقت لگے گا۔ خوش قسمتی سے رب نواز اب تک شاہ عالم اور ہمارے تعلق کے بارے میں نہیں جان سکا ہے۔ ورنہ وہ ہمیں بھی تنگ کر سکتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ابھی تم روپوش رہو۔ عوامی جگہوں پر جانے سے گریز کرو۔ میں تمہارے لیے بندوبست کرتی ہوں۔ تم کچھ اہم تقریبات اور پارٹیوں میں جاؤ گے اور وہاں ناصر عظیم کے نام سے اپنا تعارف کراؤ گے۔ اسی طرح ایک خاص حلقے سے ہٹ کر بھی لوگ تمہیں جاننے لگیں گے۔ ضرورت پڑنے پر یہ لوگ گواہی دیں گے جس وقت پولیس شاہ عالم کی تلاش میں سرگرداں تھی' تم ان کے ساتھ موجود تھے۔"

"رائٹ! دوسرے ناصر کا یہاں رہنا بھی درست نہیں ہے" فرید عباسی نے کہا "اسے کہیں اور رہنا چاہیے۔"

"نہیں' ناصر یہیں رہے گا" نیلم نے اصرار کیا۔

"میڈم' اگر پولیس شاہ عالم کے وارنٹ گرفتاری لے کر یہاں آگئی تو آپ اسے ناصر عظیم کہہ کر نہیں بچا سکیں گی۔"

"اس پر یاد آیا' میرے شناختی کاغذات دلاور شاہ کے قبضے میں تھے۔ اب میرے پاس ناصر عظیم کے پاسپورٹ کے سوا اپنی شناخت پیش کرنے کا کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔"

"تم نے اس کا پرس چیک کیا؟" نیلم نے اچانک ہی پوچھا۔

"نہیں' موقع نہیں ملا۔ میں نے سوچا تھا کہ فرصت سے بیٹھ کر دیکھوں گا۔" میں نے جیب سے ڈی ایس پی دلاور شاہ کا بھاری بھر کم پرس نکالا۔ اس میں رقم تو کم ہی رہ گئی تھی لیکن پرس کی اندرونی تہوں میں خاصے کاغذات بھرے ہوئے تھے میں نے پرس خالی کر دیا۔ اس کی ایک ایک تہ ٹٹول لی۔ وہ لوگ کاغذات چھاننے میں لگ گئے معاً مجھے پرس کی نچلی تہ میں کسی ٹھوس شے کا احساس ہوا۔ خاصی کوشش کے بعد میں اسے نکالنے میں کامیاب ہوا۔ یہ ایک چابی تھی لیکن محض چابی۔ اس کے ساتھ اور کچھ نہیں تھا۔ کمال نے چابی دیکھی۔

"ارے' یہ تو لاکر کی چابی ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا؟" رئیس نے اعتراض کیا۔

"خود میرے پاس بھی ایسی ہی چابی ہے۔ اسی بینک کا لاکر ہے۔ اسپتال اور ٹرسٹ کے سارے کاغذات میں وہیں رکھتا ہوں۔ دیکھو اس پر نمبر ہوگا۔" اس نے چابی مجھ سے لے لی "اس پر دو سو بارہ نمبر کندہ ہے۔"

"یہ کیسے معلوم ہوگا کہ بینک لاکر کس شاخ میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس بینک کی لاہور میں دو ہی شاخیں ہیں اور لاکر صرف اس شاخ میں ہے جو ملتان روڈ پر ہے۔ لاکر وہیں ہوگا۔"

"اسے بعد میں دیکھیں گے۔" میں نے چابی ایک طرف رکھ دی "کاغذات میں کوئی کام کی شے ملی؟"

"ایک تو تیرے کاغذات مل گئے ہیں' یہ رہا شناختی کارڈ اور یہ رہا تیرا ڈرائیونگ لائسنس" رئیس نے دونوں چیزیں

میری طرف پھینکیں۔

"اور یہ رہا اس لاکر کو استعمال کرنے کا اجازت نامہ" کمال نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ اس پر دلاور شاہ نے بینک منیجر کو کہا تھا کہ یہ کاغذ لانے والے کو اس کا بینک لاکر استعمال کرنے کی اجازت دی جائے۔

"یہ قطعی غیر قانونی ہے۔ اسے بینک منیجر کو ایسا حکم دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ لاکر صرف وہی افراد کھول سکتے ہیں جنہیں لاکر حاصل کرتے وقت مجاز قرار دیا ہو یا لاکر ہولڈر نے بذات خود جا کر اس فرد کو بینک والوں سے متعارف کرایا ہو۔ اس طرح کاغذ دکھا کر کوئی لاکر نہیں کھلوا سکتا" فرید عباسی نے اعتراض کیا۔

"بھائی' تم ایک بات بھول رہے ہو" میں نے اسے یاد دلایا "یہ لاکر ایک ڈی ایس پی کا ہے جو ماشاء اللہ فرعون صفت بھی تھا' اس کے لیے قانون توڑنا ایسے ہی ہے جیسے بچے کے لیے کھلونا توڑنا۔ بینک منیجر کا باپ بھی اس کا حکم مانے گا۔"

"ناصر صحیح کہہ رہا ہے" رئیس نے تائید کی۔

"آدمی ہے ناں" عباسی نے سرد آہ بھری "شوہر ہوتا تو اس کی بات صحیح ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ رخشی کو اسی شرط پر گھر چھوڑ کر آیا تھا کہ واپسی پر ناصر کو لے کر آؤں گا۔ اب تو چل رہا ہے یا میں گھر کے بجائے سیدھا کورٹ چلا جاؤں؟"

"آپ فوری طور پر کورٹ کا رخ کریں۔ رخشی سے میں خود بات کر لیتا ہوں۔"

"تم تو کورٹ چلے جاؤ گے' مجھے ابھی گھر جانا ہے اور قمر کے سامنے وضاحت کرنی ہے کہ صبح صبح کس کا فون آگیا تھا جو میں بتائے بغیر گھر سے نکل گیا۔ ناشتا میز پر چھوڑ کر" کمال نے فریاد کی۔

عباسی اور کمال کے جانے کے بعد میں نے رخشی کے گھر کا نمبر ملایا۔ خلاف توقع اس نے ملامت کرنے کے بجائے مجھے بچ کر واپس آنے پر مبارک باد دی۔ "ناصر' بہتر ہوگا اب تم کچھ دن باہر نکلنے سے گریز کرو اور اپنے گیٹ اپ میں بھی تبدیلی لاؤ۔ جس میں تم شاہ عالم سے بالکل الگ لگو۔ اس سے تمہاری غیر معمولی شباہت لوگوں کو چونکا دیتی ہے۔"

"مشورے کا شکریہ۔ میں سو کر اٹھنے کے بعد اس پر عمل کروں گا" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ نیلم نے سونے سے پہلے غسل کر کے مجھے کپڑے بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میری زندگی میں ماں اور بہن جیسے رشتوں کی کمی رہی تھی مگر اب نیلم بیک وقت ان رشتوں کی کمی پوری کر رہی تھی۔ اس کی محبت میں بیک وقت ماں کی ممتا اور بہن کی چاہت تھی۔ میرے آنے کی خوشی میں وہ شوٹنگ کینسل کرنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے اسے جانے پر مجبور کر دیا۔

"تمہارا معمول کے مطابق شوٹنگ پر جانا ضروری ہے ورنہ یہ تبدیلی دشمنوں کو چونکا دے گی بلکہ اب مجھے شبہ ہے کہ رب نواز کی پارٹی بھی میرے اور تمہارے تعلق کے بارے میں جان گئی ہے۔ تمہیں پہلے سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اپنے گارڈز کو الرٹ رکھا کرو۔"

"میرا محافظ تو خدا ہے اور پھر رئیس۔!" وہ ہنسی "مجھے کسی اور محافظ کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں گیارہ بجے کے قریب سویا تھا۔ پھر آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ سوا سات بج رہے تھے۔ آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند نے مجھے تازہ دم کر دیا۔ نیلم اور رئیس ابھی تک نہیں آئے تھے۔ خالہ بانو نے بتایا کہ میرا ابھی تک کوئی فون بھی نہیں آیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک کا نمبر ملایا۔ وہ موجود نہیں تھی لیکن ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے مجھے شبنم کے بارے میں بتایا کہ اب اس کی حالت بہتر تھی۔ چار گھنٹے تک جاگنے کے باوجود اسے مزید کوئی دورہ نہیں پڑا تھا۔ اس وقت وہ سو رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے شاہ عالم کے بارے میں پوچھا تھا اور ڈاکٹر عائشہ نے اسے بتایا تھا کہ میں زندہ اور خیریت سے ہوں۔ یہ سن کر میں نے سکون کا سانس لیا کہ اس نے ناصر عظیم کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے ذہن پر شاہ عالم حاوی تھا۔ لہٰذا شعوری طور پر مجھے ناصر عظیم مان لینے کے باوجود وہ مجھے شاہ عالم ہی سمجھتی تھی اور دیوانگی کے عالم سے باہر آنے کے بعد اس نے شاہ عالم کا نام لیا تھا۔ خالہ بانو کا اندازہ تھا کہ میں بھوکا ہوں لہٰذا اس نے میرے جاگتے ہی میز پر کھانا لگوا دیا تھا۔ میں نے خالہ بانو سے کہا۔

"کسی ملازم سے کہہ کر باربر کو بلوا لیں اور ہاں' یہاں کیا میرے کپڑے پڑے ہیں؟"

"پورا سوٹ کیس بھرا ہے۔ کتنے شوق سے لائے تھے اب تک ایک بھی نہیں پہنا۔"

"یہ تو اچھا ہوا ورنہ مجھے جا کر خریدنا پڑتے اور ہاں باربر کو سارے سامان کے ساتھ بلوائیے' صرف قینچی استرا لیے نہ چلا آئے' مجھے ہیئر اسٹائل بھی بنوانا ہے اور بال رنگوانے ہیں۔"

میرے کھانے سے فارغ ہوتے ہی باربر آگیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے بالوں میں کیا تبدیلی چاہتا ہوں۔ اس نے سر ہلایا "کوئی مسئلہ نہیں ہے لیکن مشورہ ہے کہ بال

بھورے کے بجائے ہلکے سنہری رنگ میں ہائی لائٹ کرا لیں' یہ زیادہ اچھے لگیں گے۔"

لیکن میں نے اس کا مشورہ مسترد کر دیا۔ ہمارے ہاں سنہری بال نہیں پائے جاتے اور یہ اپنی مصنوعی چمک سے فوراً متوجہ کرتے ہیں۔ میں اپنے حلیے میں تبدیلی کے ساتھ یہ بھی چاہتا تھا کہ کم سے کم لوگ میری طرف متوجہ ہوں۔ اس نے پہلے میرے بال ترا شے' میں بائیں طرف سے مانگ نکالتا تھا۔ اس نے درمیان سے مانگ نکال دی۔ میں مناسب سائز کی قلمیں رکھتا تھا مگر قلمیں بھی مختصر کرا لیں اور گدی سے بال بھی چھوٹے کرا لیے۔ میری بڑھی ہوئی شیو اس نے مہارت سے بناتے ہوئے فرنچ داڑھی چھوڑ دی۔ ایک گھنٹے میں' میں اتنا بدل چکا تھا کہ جب میں نے خود کو آئینے میں دیکھا تو ایک لمحے کو خود سے نامانوس محسوس کیا۔ باربر کمال کا آدمی تھا اس نے محض سر کے بالوں اور فرنچ کٹ کی مدد سے میرے حلیے میں اتنی تبدیلی پیدا کر دی تھی کہ سرسری نظر سے دیکھنے والا مجھے شاہ عالم یا ناصر عظیم سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ غسل کر کے میں نے پتلون کے ساتھ نئی شرٹ لی تھی۔ نیلم اور رئیس آ چکے تھے۔ نشست گاہ سے ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"ہیلو!" میں نے اچانک جا کر کہا تو وہ سب اچھل پڑے پھر مجھے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

"ابے تو ناصر ہے یا اس کا بھوت!" رئیس نے چلا کر کہا۔ ہنستے ہنستے اس کا برا حال ہو گیا۔ نیلم بھی ہنس رہی تھی۔

"بھوت" میں نے متانت سے کہا اور ایک دم رئیس کو اٹھا کر پٹخ دیا۔

"ارے بچاؤ۔ نیلم' تمہارے ہونے والے سہاگ پر قاتلانہ حملہ' اسے روکو۔"

خالہ بانو نے آ کر یہ طوفان بدتمیزی روکا۔ وہ چائے لے آئی تھیں۔ کھانے کا کسی کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے تو خیر ابھی کھانا کھایا تھا۔ نیلم اور رئیس بھی مزنگ چوک سے فرائی مچھلی کھا کر آ رہے تھے۔

"میں کیسا لگ رہا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"میں بتاؤں" رئیس ہنسا "تو اس وقت کسی فرنگی سے ملا ہوا لگ رہا ہے۔"

"لیکن شاہ عالم یا ناصر سے کتنا مختلف لگ رہا ہے" نیلم نے رئیس کو گھورا۔

"بس' اب میں نے مستقل طور پر یہی حلیہ رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"ایکسی لنٹ" رئیس نے کہا تو میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ انگریزی تو ایک طرف رہی' اسے درست اردو بھی بولنا نہیں آتی تھی لیکن اب وہ انگریزی کے بعض بڑے پیچیدہ الفاظ بھی روانی سے بول جاتا تھا۔ نیلم کی اس پر محنت رنگ لا رہی تھی۔

"ابے ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟" رئیس جھینپ گیا۔

میں ہنس دیا "میں دیکھ رہا ہوں نیلم نے تجھے سدھا لیا اور محاورے کو غلط کرتے ہوئے کتے کی دم کو سیدھا کر دیا ہے۔"

"اب تم بھی اس سے اپنا انداز گفتگو بدلو" نیلم نے مجھے ٹوک دیا۔ "ورنہ اس پر کی گئی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا۔ اس سے ایسے بات کرو جیسے کمال یا عباسی سے کرتے ہو۔"

"یہ عباسی اور کمال سے مختلف ہے۔"

رئیس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ "ہاں یار' میں ان جیسا پڑھا لکھا کہاں۔ ایک ڈاکٹر ہے دوسرا وکیل۔ میں نے تو میٹرک بھی پاس نہیں کیا۔"

"ابے تجھے کیا ہو گیا' میرا مطلب تھا کہ دوستی میں وہ رئیس سے مختلف ہیں۔ ان سے میری دوستی میں وہ گہرائی اور معنویت نہیں ہے جو رئیس سے ہے۔ ہم بچپن سے ایک ساتھ رہے ہیں۔ سخت حالات ایک ساتھ برداشت کیے۔ ایک دوسرے کو اس طرح جانتے ہیں جیسے اپنے بدن کو جانتے ہیں۔ میں رئیس سے مصنوعی انداز میں بات نہیں کر سکتا۔"

رئیس کا چہرہ دوبارہ روشن ہو گیا "ابے ہاں' اسے کہتے ہیں دوستی قسم اللہ کی۔"

میں نے نیلم سے سنجیدگی سے کہا۔ "نیلم' رئیس صرف میرا دوست ہے۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ یہ کم پڑھا لکھا ہے' صورت شکل کا اچھا نہیں ہے۔ بدمعاشوں میں اٹھتا بیٹھتا رہا ہے اور کچھ عرصے پہلے تک خود بھی سکہ بند بدمعاش تھا۔ میری اور رئیس کی دوستی ہر غرض اور ہر مفاد سے بلند ہے۔"

"لیکن تم دوسروں کے سامنے اس سے پرانے انداز میں نہیں پیش آؤ گے؟" نیلم نے اصرار کیا۔ "ورنہ یہ بھی پٹڑی سے اترنے لگے گا۔ تم نہیں جانتے۔ اگر میں اسے ذرا۔ دھمکا کر نہ رکھوں تو یہ بیل کی طرح رسی تڑا کر بھاگ جائے۔"

"ابے ہاں' اپن کی طبیعت بیزار ہو جاتی ہے بعض اوقات اس مصنوعی زندگی سے" رئیس بولا "اب بندہ ہر وقت تو ایکٹنگ نہیں کر سکتا۔"

"کر سکتا ہے۔" میں نے شرارت سے کہا۔ "ہمارے

ہاں بعض اداکار چوبیس گھنٹے اداکاری کرتے ہیں۔ تین شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔"

"ان کی اداکاری بھی بدترین ہو جاتی ہے" نیلم مسکرائی "لیکن کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف ایک فلم اور ایک ہی شفٹ میں کام کرتے ہیں' جیسے ندیم۔"

"کل رات عینی اور عاقل کا فون آیا تھا" رئیس بولا "میں نے بتایا نہیں عینی کو' فون پر ہی رونے لگ جاتی مگر وہ جو تیرا داماد ہے عاقل' وہ تاڑ گیا۔ بعد میں اس نے کہیں باہر سے فون کیا تھا۔ مجھے تیرے بارے میں بتانا پڑا۔"

"اچھا یاد دلایا' یہ بتا کہ تم لوگوں کا لندن جانے کا پروگرام کب تک کا ہے؟"

"تو بھول رہا ہے' تو نے اس سور کے بچے سے نیلم کا ایگری منٹ سائن کرایا تھا۔ اب وہ نیلم کے پیچھے پڑا ہے' ڈیٹ مانگ رہا ہے۔ نیلم اسے ٹال رہی ہے۔"

"ٹالتی رہو' جب تک ممکن ہے بلکہ کوئی بہانہ کر کے ایڈوانس واپس کر دو۔ جب وہ اپنی کرے گا تو دیکھی جائے گی۔"

"یہ کہنا آسان ہے۔ وہ بڑا ضدی اور کینہ پرور آدمی ہے۔ اس نے آ کر فلم انڈسٹری کے ماحول کو خراب کر دیا ہے" نیلم متفکر لگ رہی تھی۔

"فلم انڈسٹری کا حال اچھا کب رہا ہے۔ جب یہاں پڑھے لکھے اور باصلاحیت لوگوں کی اکثریت تھی' تب بھی لوگوں کی اکثریت فلم کی شوٹنگ کو طوائف کے کوٹھے سے کم نہیں سمجھتی تھی۔"

"ماحول پھر بھی بہتر تھا بلکہ ابھی چند سال پہلے تک غنیمت تھا۔ لیکن اب یہاں موج دین جیسے لوگوں کی بھرمار ہو گئی ہے جو فلم اسٹوڈیو کو بھی بدمعاشی کے اڈے کی طرح چلانا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے بچے کھچے لوگ بھی رخصت ہو رہے ہیں۔ لگتا ہے کچھ عرصے بعد فلم اسٹوڈیوز کی جگہ بھی شاپنگ سینٹرز بننے لگیں گے۔" نیلم نے سرد آہ بھری۔

"اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابتری تو ملک کے ہر شعبے میں آ رہی ہے۔ جب تک معاشرہ نہیں سدھرے گا' یہ ابتری قائم رہے گی۔"

"تو اب شاہ عالم نہیں رہا" رئیس نے یاد دلایا "سیاسی باتیں مت کر۔"

ہم سب ہنس دیے "تو نے اچھا یاد دلایا۔ ویسے میں شاہ عالم کبھی رہا بھی نہیں تھا۔"

انہیں باتوں میں لگا چھوڑ کر میں نے فون اٹھایا اور لندن عاقل کے گھر کا نمبر ملایا۔ اس وقت لندن میں شام ہو رہی ہوتی اور امید تھی کہ عاقل گھر آ چکا ہو گا۔ میری توقع درست ثابت ہوئی تھی۔ "آ خاہ۔ سسر محترم! ایک بار پھر زندہ واپس آ گئے۔ میں خاصا بد قسمت داماد ہوں۔"

"کیا تو میری زندہ واپسی کو اپنی بدقسمتی سے تعبیر کر رہا ہے؟" میں نے غور کیا۔

"ہاں' اگر تمہارا ترکہ مل جاتا تو میں نیویارک ٹائمز یا واشنگٹن پوسٹ جیسا اخبار بھی نکال سکتا ہوں۔ جو ملت اسلامیہ کا ترجمان ہوتا' افسوس کہ تم نے مر کر ملت پر احسان نہیں کیا۔"

"بکواس مت کر' یہ بتا کہ نوادرات والے معاملے کا کیا بنا؟"

"یار' اتفاق سے یہاں پر محکمہ آثار قدیمہ کا ایک اعلیٰ افسر آیا ہوا ہے' پاکستان سے۔ تو نے شاید نام سنا ہو۔ احمد الدین قدوائی۔ پچھلے دنوں اس نے بیرون ملک اسمگل کی جانے والی نوادرات کی بڑی کھیپ پکڑوائی تھی۔"

"نہیں' میں نے نہیں سنا۔ عام لوگوں کو تو چھوڑو' تم میڈیا والے بھی ایسے نایاب افسران کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔"

"میں نے اس سے بات کی ہے۔"

"کیا؟" میں نے چلا کر کہا "تو نے اسے نوادرات کے بارے میں بتا دیا؟"

اس نے برا منایا "بندہ شوہر ہے لیکن احمق نہیں ہے۔ میں نے ذرا گھما کر پوچھا تھا کہ اگر پاکستان سے کوئی نادر شے اسمگل ہو کر یہاں آئے تو اسے واپس کیسے لے جایا جا سکتا ہے۔ اس نے خاصا لمبا چوڑا پروسیجر بتایا ہے۔ لیکن یہ کام آسان ہے بہ نسبت ان نوادرات کو اسمگل معکوس کرنے کے۔ یہ خطرہ بھی کم ہو گا کہ یہ خرد برد ہو جائیں گے۔"

"وہ تو ہو جائیں گے" میں نے سرد آہ بھری "ایک احمد الدین قدوائی کے مقابلے میں سو لٹیرے تو ہوں گے خیر اللہ ہماری نیت دیکھ رہا ہے۔ تو یہ بتا کہ عینی کہاں ہے؟"

"وہ اپنی قائم مقام اور منہ بولی والدہ سے ذرا تربیت لے رہی ہے۔"

"امور خانہ داری کی' وہ تو اس بڑھیا کو بھی نہیں آتی ہو گی" میں نے کہا۔

"ارے نہیں قائم مقام سسر صاحب!" عاقل نے شرماتے ہوئے کہا "دراصل عینی ان مسائل سے نمٹنے کی تربیت لے رہی ہے جو عام طور سے شادی کے بعد خواتین کو

بھی آتے ہیں۔"

"کیا؟" میں پھر چلایا "کیا تو مجھے قائم مقام سسر سے اعزازی نانا کے عہدے پر ترقی دے رہا ہے؟"

"دیکھا' ابھی سسر بنے ہو تو عقل آگئی۔ نانا بن کر نہ جانے کیا کرو گے۔"

"بکواس مت کر۔ میں ابھی اس عہدے سے استعفیٰ دیتا ہوں" میں نے بھنا کر کہا "تو رئیس کو نانا بنا لے۔ ویسے بھی یہ شوہر بننے والا ہے' میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔"

"اور ہوگی بھی نہیں۔ ساری عمر فیصلہ کرتے گزر جائے گی۔ خیر یہ بتاؤ کہ شبنم کی حالت کیسی ہے؟"

نانا کا لفظ سن کر نیلم کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ اس سے پہلے میں عاقل کو جواب دیتا' اس نے لپک کر ریسیور چھین لیا اور عاقل پر سوالوں کی بوچھاڑ کردی کہ خوشخبری کب ملی اور ہمیں کیوں نہیں بتایا۔ عینی کیسی ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس نے ہدایات جاری کرنا شروع کردیں' اس پر عاقل نے جھلا کر پوچھ لیا کہ اسے کتنے بچوں کا تجربہ ہے۔ نیلم خفگی سے بولی "تجربہ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ دنیا تو دیکھی ہے۔ عینی سے کہو کہ زیادہ سے زیادہ آرام کرے اور اپنا یہ فلیٹ چھوڑ کر کوئی مناسب سا مکان لے لو۔"

بہ مشکل میں نے اس سے ریسیور واپس لیا۔ عاقل سخت گھبرایا ہوا تھا "خدا کے لیے قائم مقام سسر صاحب! مجھے اس ساس سے بچاؤ' یہ تو اس بڑھیا لینڈ لیڈی سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔"

"خبردار جو تم نے نیلم کی شان میں گستاخی کی۔ اور جہاں تک ساس ہونے کا تعلق ہے تو یہ ساس ہے۔ یاد ہے کہ عینی نے نیلم کو بڑی بہن بنایا ہے اور اس سے ماں کی طرح پیار کرتی ہے۔"

عاقل نے سرد آہ بھری "ایک نوجوان سسر ہی کم نہیں تھا کہ ایک کمسن ساس بھی مل گئی۔ ان دونوں سے پہلے میں ہی اللہ کو پیارا ہوجاؤں گا۔"

"کیا بک بک کرتے رہتے ہو" عقب سے عینی کے ڈانٹنے کی آواز آئی۔ اس نے ریسیور چھین لیا "بھیا' آپ کیسے ہیں؟ اور نیلم باجی کہاں ہیں؟"

"یہیں ہیں اگر تو اس کے ذریعے خوشخبری سنانا چاہتی ہے تو وہ میں پہلے ہی تیرے میاں کی زبانی سن چکا ہوں۔"

"صحافی ہے نا" وہ شرما کر ہنسی "ہر تازہ خبر فوراً نشر کردیتا ہے۔"

عینی کی آمد کا سن کر نیلم نے ایک بار پھر ریسیور لے لیا اور ایک بار پھر جوش و خروش سے باتوں' ہدایتوں اور نصیحتوں کا سلسلہ شروع کردیا۔ وہ اتنی پرجوش ہورہی تھی جیسے اس کی سگی بہن ماں بننے جارہی ہو۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ نیلم کا وجود ہم سب کے لیے ماں جیسا یا خاندان کے بزرگ جیسا تھا۔ کوئی رشتہ نہ ہونے کے باوجود اس نے یوں ہمیں اپنا لیا تھا جیسے سگے ہوں۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک بات کرکے نیلم نے فون بند کیا اور اعلان کیا کہ کل سے آنے والے مہمان کے لیے تیاری شروع کی جائے۔

"کیا مطلب' ابھی تو اسے آنے میں آٹھ نو مہینے ہیں" میں نے اعتراض کیا۔

"تو کیا ہوا۔ میں پاکستان سے اس کے لیے ڈھیر ساری چیزیں لے جانا چاہتی ہوں" نیلم زیادہ ہی ایکسائیٹڈ ہورہی تھی۔

"جو تمہاری مرضی" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اب مجھے اجازت دو۔"

"کہاں چلے؟" نیلم نے مجھے گھورا۔

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے شاہ عالم والے پرائیویٹ آفس میں جاکر رہوں۔ شبنم نے وہ میرے لیے ایک محفوظ ٹھکانا تلاش کیا تھا۔ اس کی چابی تمہارے پاس ہے نا؟"

"لیکن میں تمہیں نہیں جانے دوں گی ورنہ تم پھر کسی چکر میں پڑجاؤ گے۔"

"میں خود تو چکروں کو دعوت نہیں دیتا۔ اب پولیس یہاں چھاپا مارے تو تم کیا کروگی؟ بلکہ مجھے شک ہے کہ نیلم ہاؤس کی نگرانی کی جارہی ہوگی۔"

"تو اب تک چھاپا کیوں نہیں پڑا؟" نیلم نے اعتراض کیا۔

"تم کوئی معمولی ہستی نہیں ہو جس کے گھر پولیس دندناتی ہوئی گھس جائے بلکہ تمہارے گھر کی تلاشی کا وارنٹ حاصل کرنے کے لیے بھی اسے خاصی معقول وجہ بتانی ہوگی لیکن مخالف بھی کم بااثر نہیں ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح وارنٹ حاصل کرلیں گے اور مجھے گرفتار کرکے لے جائیں گے تب تم کیا کروگی۔ نیلم میرا تمام جانی پہچانی جگہوں سے غائب ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے میں یہاں سے جارہا ہوں۔"

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے" رئیس نے سوچ کر کہا "اس کا کسی نامعلوم جگہ رہنا ضروری ہے۔"

"لیکن تم باہر نکلو گے اور کسی نہ کسی مصیبت میں پڑجاؤ گے۔"

"میں قطعی باہر نہیں نکلوں گا میری ماں" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

وہ ہنس دی "اوکے' لیکن میں ہر گھنٹے بعد فون کرکے چیک کروں گی۔"

"ایسا کرو کہ تم بھی وہیں چلو۔ براہ راست نگرانی کرتی رہنا" میں نے بھنا کر کہا "رئیس میرے ساتھ چل ایک کام ہے۔"

"کیا؟" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"مجھے اس صورت کے ساتھ پاسپورٹ بنوانا ہے۔ نیلم میرا پاسپورٹ بھی لادو ناصر عظیم والا۔"

اس نے مجھے پاسپورٹ اور دفتر کی چابی کے ساتھ نوٹوں کی ایک گڈی بھی تھمادی "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے" اس نے ڈانٹ کر کہا "بعض اوقات تھوڑے سے نوٹ آدمی کو بہت بڑی پریشانی سے بچالیتے ہیں۔"

"ہم پیدل نکلیں گے۔ باہر جاکر ٹیکسی کرلیں گے" میں نے رئیس سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے" نیلم نے کہا "یہ سوزوکی لے جاؤ۔ میں نے ایک ہفتے پہلے ہی اوپن لیٹر پر خریدی ہے گاڑی اب تک مالک کے نام پر ہے۔"

میں کار کی پچھلی نشست پر دراز ہوگیا۔ رئیس نے ڈرائیونگ سیٹ سے مڑ کر دیکھا "یہ کیا کررہا ہے؟"

"میں نگرانی کرنے والوں کی آنکھ سے بچنا چاہتا ہوں۔ تو بھی ذرا آگے پیچھے نظر رکھ۔"

رئیس نے گاڑی نیلم ہاؤس سے نکالی اور دائیں بائیں دیکھتا ہوا مین روڈ پر آگیا۔ "نیلم ہاؤس کے سامنے ایک فقیر ہے۔ کل تک یہاں پر نہیں تھا۔"

"یہ یقیناً پولیس کا مخبر ہوگا" میں نے کہا "کوئی پیچھا تو نہیں کررہا ہے۔"

رئیس نے دو تین بار کار کو مختلف سڑکوں پر موڑا اور مطمئن ہوکر بولا "اب اٹھ جا کوئی نہیں ہے۔"

میں لپک کر اگلی نشست پر آگیا۔ رئیس نے گاڑی پاسپورٹ آفس کے سامنے روکی۔ آفس تو بند ہوچکا تھا لیکن ایجنٹ گھوم رہے تھے۔ کئی لوگوں سے پوچھ کر رئیس نے بالآخر اس ایجنٹ کو تلاش کرلیا جس سے وہ یہ کام کرانا چاہتا تھا۔ وہ ایک ہوٹل میں بیٹھا پائے کھا رہا تھا۔ اس نے رئیس کو گرم جوشی سے گلے لگایا۔ "خان صاحب کدھر تھے۔ آنکھیں ترس گئیں۔"

"مصروف تھا۔ قدیر تم سناؤ۔"

"بس جی آپ کی دعائیں ہیں رب کا کرم ہے۔" اس نے کہا اور ہمارے منع کرنے کے باوجود کھانے کا کہہ دیا۔ پائے اتنے لذیذ تھے کہ بھوک نہ ہونے کے باوجود میں خاصا کھا گیا۔ رئیس نے کھانا نہیں کھایا تھا لہٰذا اس نے ڈٹ کر کھایا۔ قدیر خالص لاہوری تھا۔ ہنسنے ہنسانے والا اور کھانے کا شوقین۔ کھانے کے بعد اس نے لسی منگوائی۔ میں نے کہا۔

"ہمیں ایک کام ہے۔"

"حکم کرو جی۔ آپ رئیس خان صاحب کے دوست ہو تو ہمارے بھی سر ہوگئے۔"

"میں نیا پاسپورٹ بنوانا چاہتا ہوں۔"

"شوق سے بنواؤ۔" اس نے لسی کا کنگ سائز گلاس اپنے پیٹ میں انڈیلنا شروع کردیا۔

"یہ کام تم نے کرنا ہے۔" رئیس بولا۔

"آئیں جی۔ باہر چل کر بات کرتے ہیں۔ یہاں تو سب ویلے بیٹھے ہیں۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

ہم آفس کے سامنے والے پارک میں آبیٹھے۔ میں نے اسے اپنا پاسپورٹ دیا۔ "یہ ابھی باقی ہے لیکن میں نے گیٹ اپ بدل دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ پاسپورٹ اس کے مطابق اپ ڈیٹ ہوجائے۔"

اس نے پاسپورٹ پر لگی تصویر سے میرا موازنہ کیا اور مطمئن ہوکر بولا "کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ بتایئے کہ نیا پاسپورٹ کب تک چاہیے۔"

"جتنی جلدی مل جائے۔" رئیس بولا۔

"پرسوں تک مل جائے گا۔ لیکن فیس دگنی ہوگی۔"

"فیس اتنی ہی ملے گی۔" رئیس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "بس پرسوں پاسپورٹ لینے آؤں گا۔"

"جیسی خان صاحب کی مرضی۔" اس نے کہا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔

"فیس تمہیں دگنی ملے گی۔" میں بولا "لیکن پاسپورٹ ہر لحاظ سے درست ہونا چاہیے۔ اصلی اور اس کا ہر جگہ پر ریکارڈ ہو۔"

"فکر ہی نہ کریں جی' بالکل قانونی کام ہوگا۔ کوئی مائی کا لال اس پر شک نہیں کرے گا۔"

میں نے اسے ہزار روپے دیے۔ پھر اس کے ساتھ جاکر

ایک چوبیں گھنٹے کھلی رہنے والی فوٹو گرافی کی شاپ سے چار عدد تصویریں بنوائیں۔ قدیر سے رخصت ہو کر ہم نے شاہ عالمی کا رخ کیا۔ وہیں ایک عمارت کے دوسرے فلور پر شبنم نے میرے لیے دفتر لے کر اسے خصوصی طور پہ ڈیکوریٹ کرایا تھا۔ یہ کوئی کاروباری دفتر نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا پرائیویٹ آفس تھا۔ میں یہاں لوگوں سے ملاقات کر سکتا تھا اور رہ بھی سکتا تھا۔ شبنم نے بلاشبہ ایک ایک چیز کا خیال رکھا تھا۔ شاہ عالم کے لیے دیوانی اس عورت نے اس کے لیے خود کو مٹا لیا تھا اور محبت میں ایسی مثال قائم کردی تھی جس کا تصور بھی محال تھا۔

"کہاں کھو گئے؟" رئیس نے میرے چہرے کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"یار میں شبنم کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ کس قدر بد نصیب ہے۔ ماں باپ بچپن میں ساتھ چھوڑ گئے۔ آزاد صاحب نے پرورش کی۔ اسے صحافت کے اسرار و رموز سکھائے۔ وہ بے حد ذہین ہے لیکن محبت کے معاملے میں عام عورت ثابت ہوئی۔ محبت بھی کی تو شاہ عالم جیسے بندے سے جو کسی کا نہیں ہو سکتا تھا اسے صرف شبنم کے خوب صورت بدن سے دلچسپی تھی۔ پھر شبنم اس کے لیے بہترین پی آر او ثابت ہوئی تھی۔ وہ اس سے دونوں طرح فائدے اٹھاتا رہا۔ محبت میں دیوانی شبنم اس پر سب کچھ نچھاور کرتی رہی۔ اس سے کچھ مانگے بغیر۔ جب شاہ عالم اپنی ہی بچھائی ہوئی سازشوں کے جال میں پھنس کر مارا گیا تو شبنم کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ اگر اسے میری صورت میں شاہ عالم دوبارہ واپس نہ ملتا تو وہ سچ مچ پاگل ہو جاتی۔ مجھے شاہ عالم سمجھ کر میرے پیچھے دیوانی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میرا اس سے دل بھر گیا ہے اور میں پرانی زندگی کی طرح اس سے بھی پیچھا چھڑانے کی فکر میں ہوں۔ لیکن اس کے پاگل پن میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس نے میری خاطر وہ تشدد بھی برداشت کر لیا جسے کوئی عورت برداشت نہیں کر سکتی۔"

"اس کی قوت برداشت نے ہم جیسے مردوں کو شرمندہ کر دیا۔" رئیس نے سرد آہ بھری۔

"کاش کے وہ لوگ میرے سامنے آ جائیں جنہوں نے شبنم پر انسانیت کو شرما دینے والا تشدد کیا۔"

"یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ اپنا یار جیرا بلیڈ لاہور کے ہر تھانے میں آتا جاتا رہتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی کو ضرور پہچان لے گا۔"

"لیکن یار مسئلہ ویڈیو دکھانے کا ہے۔ وہ اتنی شرمناک ہے کہ میں اسے دیکھنے کی ہمت نہیں رکھتا۔"

"مگر یار کسی نہ کسی کو تو اسے دیکھنا ہوگا' ورنہ اس کے ذمے دار کیسے سامنے آئیں گے۔" رئیس بولا۔

"میرا خیال ہے نیلم سے مشورہ کرلیں۔" میں نے کہا۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف نیلم تھی۔

"کہاں تھے تم دونوں۔ میں تین بار فون کر چکی ہوں۔"

"پاسپورٹ کے چکر میں تھے۔" میں نے کہا پھر جھجکتے ہوئے اس سے ویڈیو کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس ویڈیو کو دکھانے میں حرج نہیں ہے لیکن صرف اس شخص کو جو شبنم پر تشدد کرنے والوں کو شناخت کر سکے۔"

"رئیس کہہ رہا ہے کہ اس کا دوست جیرا بلیڈ میرا مطلب ہے نذیرا محمد لاہور کے اکثر تھانوں کی نفری کو جانتا ہے۔ یہ ویڈیو اسے دکھائی جا سکتی ہے۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ لیکن میرا خیال ہے ایک بار شبنم سے پوچھ لینا چاہیے۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "اگر اسے علم ہو گیا کہ میں اس پر ہونے والے ظلم کی فلم بھی بنائی گئی ہے اور وہ ہم دیکھ چکے ہیں تو اس کی ذہنی حالت دوبارہ خراب ہو جائے گی۔ عین ممکن وہ پھر ساری عمر ہم سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکے۔ بہتر ہوگا کہ اسے ویڈیو کے بارے میں سرے سے نہ بتایا جائے۔"

"اگر ان لوگوں کے خلاف کارروائی ہوئی تو اسے معلوم ہو ہی جائے گا۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے جب ہم انہیں تلاش کرلیں گے تو ان پر الزام لگائیں گے۔ انہیں شناختی پریڈ کے لیے شبنم کے سامنے لایا جائے گا اور وہ انہیں شناخت کر لے گی۔"

"چلو تم ایسا بھی کر کے دیکھو۔" نیلم نے بے دلی سے کہا "رئیس کہاں ہے؟"

"بلاوجہ مجھ غریب کو بدنام کر رہی تھیں یہ کہو کہ اصل میں تمہیں رئیس کی فکر تھی۔"

"فضول کم بولا کرو۔" اس نے خفگی سے کہا۔ میں نے رئیس کو فون پکڑا دیا تو وہ بوکھلا کر بولا۔

"میں نے کیا فضول کہا ہے۔" پھر اس نے کھا جانے والے انداز میں مجھے گھورا اور سر ہلا کر بولا "بس نکلنے ہی والا تھا۔"

اس نے فون بند کیا تو میں نے اسے چھیڑا "اب تو ابھی سے جورو کا غلام بن گیا ہے۔ ہمت ہوتی تو صاف کہہ دیتا آج رات گھر نہیں آ سکتا ہو جو کر سکتی ہے کر لے۔"

"پیارے اگر بیوی نیلم جیسی ہو تو جورو کا غلام بننا ہی پڑتا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ یہ کار کی چابی ہے۔ میں نے ڈکی کی سیٹ کے نیچے دو جعلی نمبر پلیٹس بنوا کر رکھ دی ہیں اگر چاہے تو نہیں لگا لینا۔"

"تو کیسے جائے گا۔ ابھی کوئی ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔"

"چل جائے گی یار۔ ذرا پلٹنا پڑے گا۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔

"چل میں تجھے ٹیکسی دلا کر آتا ہوں۔" میں نے چابی اٹھاتے ہوئے کہا۔

آفس بند کر کے ہم نیچے آ گئے۔ میں نے رئیس کو تھوڑی دور تک چھوڑا۔ ٹیکسی ملتے ہی وہ روانہ ہو گیا تھا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں ایک معیاری کیفے میں جا بیٹھا جہاں ادب سے تعلق رکھنے والے افراد اکثر آیا کرتے تھے۔ وہاں کی چائے لاجواب ہوا کرتی تھی۔ اب بھی اس کا ذائقہ خاصا بہتر تھا۔ چائے پی کر باہر نکلا تو اچانک دیوار کے سائے سے ایک وجود میرے سامنے آ گیا۔ "شاہ عالم صاحب۔" اس نے کہا۔

میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ روشنی میں آیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو نہ جانے کب سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔ اس کا باپ تانبے کا کاریگر تھا اور رب نواز کے لیے جعلی نوادرات تیار کرتا تھا۔ جب نابینا ہونے کے بعد غربت نے اس کا پیچھا لیا تو اس نے رب نواز سے اپنی زندگی بھر کی محنت کا صلہ مانگنے کی جرأت کی۔ انکار پر اسے دھمکی دی اور نتیجے میں صفحہ ہستی سے یوں نابود ہو گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اس لڑکے کی ماں شاید بیمار تھی اس کے علاج کے لیے ماہانہ دو ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے کچھ دن پہلے ہی دو ہزار روپے دیے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ آئندہ اسے یہ رقم باقاعدگی سے ملتی رہے گی۔

"احمق آدمی۔ اس طرح سرعام پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ اور بازو سے پکڑ کر ایک ویران گوشے کی طرف لے گیا۔ "ہاں بولو۔ کیا بات ہے۔ کیا اور رقم کی ضرورت ہے۔"

"نہیں۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا "جس کے لیے رقم کی ضرورت تھی وہی نہیں رہی بلکہ کوئی بھی نہیں رہا۔" وہ رونے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے اوپر کوئی سانحہ گزر چکا تھا۔

"کیا بات ہے۔ مرد ہو کر روتے ہو۔ خدا کے لیے کوئی بلاوجہ آ جائے گا۔" میں نے کہا "خاموش ہو جاؤ۔"

میں اسے کار تک لے آیا۔ کار میں نے تاریکی میں کھڑی کی تھی اس لیے امید تھی کہ اس کی نمبر پلیٹ نہیں دیکھ سکے گا۔ میں نے کار شاہ عالمی کی طرف موڑ دی۔ "ہاں اب بولو کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ۔"

"ان حرامیوں نے میرے سارے گھر والوں کو مار دیا۔ چار بہنیں۔ مارنے سے پہلے ان کے ساتھ......" وہ دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ لیکن بند کار سے اس کی آواز باہر جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں اس کے کہے بغیر سمجھ گیا۔ رب نواز کے کتوں نے اس کی بہنوں کو مارنے سے پہلے پامال کیا ہو گا۔

"ایسا کیوں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میری وجہ سے۔ میں نے رب نواز کو فون پر دھمکی دی تھی۔" اس نے آنسو صاف کیے۔

میں دنگ رہ گیا۔ "تم نے اپنے باپ سے سبق حاصل نہیں کیا تھا۔"

"ابا کی گمشدگی نے میرے حواس خراب کر دیے تھے۔ میں اس حرامی کو چھوڑوں گا نہیں۔ اس کے خاندان کے ایک ایک شخص کو مار دوں گا۔"

"اب آ رہی ہے جرأت۔" میں نے تلخی سے کہا "میرا خیال ہے تم ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں' یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تو میں ایک کام سے آپ کی تلاش میں تھا۔ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کسی نوادرات کے ڈیلر سے مجھے ملوائیں گے۔"

"یہ سودا تمہارے ذہن سے نکلا نہیں؟"

"نہیں جناب۔" اس نے سرد آہ بھری۔ "بلکہ اب تو مجھے رقم کی اور بھی ضرورت ہے لیکن میرا مقصد وہ نہیں ہے جو پہلے کبھی ہوا کرتا تھا۔"

باہر سے آتی اسٹریٹ لائٹس کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے علاوہ ایک عزم بھی جھلک رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ یہ پورا خاندان ہی رب نواز کی ہوس اور انانیت کا شکار ہو گیا تھا۔ زمین پر خدا بن جانے والے یہ فرعون کسی کی ذرا سی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ ان کے لیے موسیٰ کی ضرورت تھی۔ ممکن تھا یہ نوجوان ہی ان کے لیے موسیٰ ثابت ہوتا۔ مجھے یاد تھا کہ پچھلی ملاقات میں اس نے اپنا نام اسلم بتایا تھا۔

"اسلم میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ لیکن فی الوقت میرا کسی ڈیلر سے رابطہ نہیں ہے۔ میں اپنے ہی مسائل میں الجھا ہوا ہوں۔ لیکن یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا کام بھی ضرور کردوں گا۔"

"نہیں جناب۔ میرے لیے ایک ایک لمحہ گزارنا دشوار ہے۔ ایسا کریں یہ سب آپ ہی خرید لیں۔ آپ جو دیں گے مجھے منظور ہو گا۔ میں مزید صبر نہیں کر سکتا۔ اگر کچھ وقت اور گزرا تو میں چوری ڈکیتی کر گزروں گا۔"

"ایسا کرکے سوائے تم جیل جانے کے کچھ نہیں کر سکو گے۔ جہاں رب نواز کے اشارے پر تم پر اتنے کیس ڈال دیے جائیں گے کہ تاعمر جیل سے باہر نہیں آسکو گے اور اگر آئے بھی تو تمہارا سارا جوش وولولہ ختم ہو چکا ہو گا۔"

"اسی چیز نے تو مجھے روکا ہوا ہے۔"

اچانک مجھے خیال آیا۔ "یہ بتاؤ کہ تم مجھ تک کیسے پہنچے۔"

"اتفاق سے۔ آپ جس ہوٹل میں کھانا کھا رہے تھے میں بھی وہاں تھا۔ میں نے آپ کا پیچھا کیا۔ لیکن رکشا ہی خراب ہو گیا۔ میں ان سڑکوں پر پھر رہا تھا کہ خوش قسمتی سے دوبارہ آپ پر نظر پڑ گئی جب آپ ہوٹل میں جا رہے تھے میرا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں اندر جا کر آپ سے ملتا اسی لیے میں باہر ہی انتظار کرتا رہا۔"

"اس وقت تم کہاں ٹھہرے ہو؟"

"کہیں نہیں۔ دو راتیں میں نے پارک میں سو کر گزاری ہیں۔"

"تم نے کھانا کھایا؟"

"میری جیب میں جو رقم تھی اس سے میں نے کھانا کھا لیا تھا۔ باقی دس روپے بچے تھے جو میں نے رکشے والے کو دے دیے۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"تب تم میرے ساتھ چلو۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اعتراض بھی نہیں کیا۔ میں اسے دفتر لے آیا۔ مجھے تسلیم ہے کہ اس کی وجہ اس سے ہمدردی سے زیادہ یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ اپنی کسی حماقت سے رب نواز کے ہتھے چڑھ گیا تو اسے میرے بارے میں اگلتے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ جان جائے گا کہ میں نہ صرف رئیس بلکہ ڈاکٹر عائشہ سے بھی رابطے میں ہوں اور وہ کینہ شخص کچھ بھی کر سکتا تھا اسلم کے خاندان کے ساتھ ہونے والی بربریت اس کی سفاکی کا تازہ شاہکار تھی۔

میں اسے لے کر دفتر تک آیا۔ اس نے حیرت سے کہا "آپ کسی گھر میں نہیں رہتے۔"

"میں ان دنوں کسی ایک جگہ نہیں رہتا۔" میں نے گول مول سے انداز میں کہا "آج یہاں تو کل وہاں۔"

رات خاصی ہو گئی تھی لہٰذا اسے آفس میں دائیں طرف رکھے صوفے پر سونے کا کہہ کر میں بیڈ روم میں چلا آیا۔ آفس میں کوئی شے ایسی نہیں تھی جسے وہ چھیڑ سکتا۔ احتیاطاً میں نے بیڈ روم اندر سے بند کر لیا۔ بستر پر لیٹ کر بھی مجھے فوراً نیند نہیں آئی تھی۔ سوچوں میں گھرا نہ جانے کب میں سو گیا تھا۔ صبح فون کی گھنٹی نے مجھے جگایا تھا۔ دس بج رہے تھے حسب توقع دوسری طرف نیلم تھی۔

"رات کیسی گزری؟"

"خیریت سے۔" میں نے جماہی لی۔ "یہاں تو کوئی بیڈ ٹی دینے والا بھی نہیں ہے۔"

"بس کچھ دن کی بات ہے پھر ہم لندن فلائی کر جائیں گے۔ اس بار تم ناصر عظیم کی حیثیت سے جاؤ گے جسے لندن میں کوئی نہیں جانتا ہے۔" اس نے تسلی دی۔ کچھ دیر بات کر کے اس نے فون رکھ دیا۔ میں اٹھ کر باہر آیا۔ اسلم صوفے پر خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ستے چہرے اور سرخ آنکھوں سے ظاہر تھا کہ رات اسے کم ہی نیند آئی تھی۔ شاید وہ ساری رات ہی جاگتا رہا تھا۔ ظاہر ہے اس پر جو سانحہ گزرا تھا اور اس کا دل جس طرح انتقام کی آرزو سے لبریز تھا، سکون کی نیند اس کے نصیب میں کہاں تھی۔

"سوری مجھے خیال نہیں رہا کہ تم بھوکے بیٹھے ہو گے۔" میں نے شرمندگی سے کہا اور اسے سو کا ایک نوٹ دیا۔

"ایسا کرو کہ نیچے کسی پاس کے ہوٹل سے حلوا پوری اور چھولے لے آؤ۔ جب تک میں چائے بناتا ہوں۔"

وہ سعادت مندی سے نوٹ لے کر چلا گیا۔ میں نے جلدی سے ایک مختصر شاور لیا اور چائے چڑھا دی۔ تولیہ باندھ کر میں راگ ملہار گاتے ہوئے جو میں نے فلم تان سین میں سنا تھا چائے بنا رہا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں سمجھا کہ اسلم لوٹ آیا ہے۔ "آیا بھائی۔" میں نے چلا کر کہا اور جا کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے چندا کو کھڑا دیکھ کر میں اتنا بوکھلایا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ اندر بلاؤں یا روک کر خود جا کے میں آؤں۔ وہ مسکرا کر خود اندر آ گئی۔ میں نے سر کھجا کر کہا۔ "وہ میں سمجھا تھا کہ اسلم ہے۔"

"یہ اسلم کون ہے؟"

"اسلم، وہ ابھی آکر بتاتا ہوں۔" میں نے کہا اور بیڈ روم میں... آکر کپڑے پہنے۔ جب واپس آیا تو حیران پریشان اسلم چندا کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ مجھے چائے یاد آئی۔

"اف چائے تو کھول کھول کر خشک ہو گئی ہو گی۔" میں کچن کی طرف بھاگا۔ چندا میرے پیچھے چلی آئی۔

"ادھر ہٹو۔" اس نے کیتلی کی چائے سنک میں ڈال کر اس میں تازہ پانی ڈالا اور دوبارہ چولھے پر چڑھا دی۔ "تم جا کر ناشتا کرو۔ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

وہ حسب معمول سفید بے داغ لباس میں تھی۔ ڈھیلے سے بندھے بالوں کے ساتھ وہ جان لیوا حد تک معصوم اور دلکش لگ رہی تھی۔ میری محویت دیکھ کر وہ سرخ ہو گئی تھی۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"اپنا مستقبل۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں مستقبل میں یونہی تمہیں اپنے گھر میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کی تمہیں فرصت ملے گی؟"

"میرا اپنے خدا پر ایمان ہے کہ آزمائش کی یہ گھڑیاں بالآخر گزر جائیں گی۔ سب کچھ پھر سے ویسا ہی ہو جائے گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔ خان جی کو کہاں سے لاؤ گے؟" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"خان جی اس دنیا میں نہ سہی لیکن اُس دنیا میں ضرور ہمارے ملن سے خوش ہوں گے۔"

یک دم اس کی آنکھوں میں خوابوں کے دیپ جل اٹھے تھے۔ "کیا یہ ممکن ہے ناصر؟"

"کیوں نہیں میری جان۔" کتنے عرصے بعد میں نے جسارت سے کام لیا تھا اور اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا خاموشی سے میری بانہوں میں سمٹ آئی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی پھر آہٹ نے ہمیں الگ ہو جانے پر مجبور کر دیا یہ اسلم تھا جو اپنے آجانے پر شرمسار تھا۔ "وہ۔۔۔ میں ناشتے کا کہنے آیا تھا۔ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"اچھا یاد دلایا۔" میں نے ہنس کر کہا "میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ناشتا بھی کرنا ہے۔"

چندا جھینپ گئی...... "تم چلو میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

میں نے برتن لے جا کر رکھے اور اسلم نے ناشتا نکالا پھر ہم چندا کا انتظار کرنے لگے۔ وہ چائے لے کر آئی۔

"تم لوگوں نے اب تک ناشتا شروع نہیں کیا؟"

"تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں تو صبح ہی ناشتا کر لیتی ہوں۔ ابھی صرف چائے لوں گی۔"

چندا ایک بار پہلے بھی اسلم سے مل چکی تھی۔ اس کے خاندان پر گزرنے والی بپتا سن کر اس نے رسمی تعزیت کی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اسلم کے آنے سے خوش نہیں تھی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب ناشتا کے بعد میں بیڈ روم میں آیا۔ اس نے کہا "اس شخص کو کہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہمارا خفیہ ٹھکانا ہے اور تم دوسروں کو لا کر دکھا رہے ہو۔"

"میرے خیال میں اسلم قابل بھروسا ہے۔"

"جب رب نواز کے آدمی اس کی قوت برداشت آزمائیں گے تو یہ سب اگل دے گا۔"

"اسی خدشے کی وجہ سے میں اسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔ یہ جوش انتقام میں پاگل ہو رہا ہے اور مجھے ڈر تھا کہ یہ کہیں رب نواز کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اس کا جوش ذرا ٹھنڈا ہو تو اسے نیلم کے گھر بھجوا دیں گے۔"

"میرا خیال ہے اسے فوراً وہاں بھیج دو اور نیلم سے کہو کہ اسے کہیں آنے جانے نہ دے۔ مجھے ڈر ہے یہ تمہارے لیے خطرہ بن جائے گا۔"

"ابھی نہیں۔ فی الوقت میں اس کے ساتھ جا کر نوادرات دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔" چندا نے مخالفت کی۔ "ناصر تم بلاوجہ کے معاملوں میں ہاتھ ڈال رہے ہو۔ اس طرح تو تم الجھتے چلے جاؤ گے۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔ اسلم رب نواز کے خلاف ایک اہم گواہ ہے اس کی مدد سے ہم اس کے خلاف دباؤ بڑھا سکتے ہیں دیکھو چندا میں تم سب کو بار بار سمجھا چکا ہوں کہ کہیں چھپ کر بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اس سے دشمنوں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ یہ بلی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے۔"

"لیکن اس سے شاہ عالم والا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ تم بھول رہے ہو کہ جتنی تلاش رب نواز کو ہے اس سے کہیں زیادہ تلاش پولیس کو ہے تمہاری۔ اگر تم پولیس کے ہاتھ لگ گئے تو وہ تمہیں ہلاک کر کے پولیس مقابلے میں مارے جانے کا اعلان کر دیں گے۔"

"تم دیکھ رہی ہو... کہ میرا حلیہ کس قدر بدل چکا ہے۔

دوسرے میں اسلم کے ساتھ جاتے ہوئے اپنے حلیے میں مزید تبدیلی کرلوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

اس نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "تم ہمیشہ اپنی کرتے ہو۔ اسی وجہ سے اس حال کو پہنچے ہو۔"

"چندا یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ اس سے کوئی بھاگ نہیں سکتا ہے۔" میں نے سرد آہ بھری اور فون اٹھا کر نیلم کا نمبر ملا دیا۔ وہ اسٹوڈیو جا چکی تھی۔ میں نے اس کے موبائل پر کال کی تھی۔ کال رئیس نے ریسیو کی۔ نیلم میک اپ کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔ "یار مجھے ایک میک اپ مین کی ضرورت ہے جو میرے حلیے میں اتنی تبدیلی کردے کہ میں آزادی سے باہر گھوم پھر سکوں۔"

"تجھے باہر گھومنے کی ضرورت کیا ہے۔ چین سے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا۔" اس نے کہا۔

"۔۔۔ چین سے بیٹھنے کے لیے ہی تو یہ سب کر رہا ہوں۔ میرا باپ بننے کے بجائے یہ بتا کہ کام کر سکتا ہے یا نہیں؟"

"ایسا کر میں تجھے ایک شخص کا نمبر دے رہا ہوں۔ کسی زمانے میں مشہور میک اپ کرنے والا تھا لیکن زبان بے قابو تھی اب کوئی کام نہیں دیتا۔ اس سے بات کرلے۔ نیلم کی عزت کرتا ہے اس کا نام لے گا تو تیرے پاس آنے کے لیے بھی تیار ہو جائے گا۔"

میں نے رئیس کا دیا ہوا نمبر ملایا۔ "ہاں کون ہے یہاں؟" ایک بیزار سی آواز آئی۔

"میں ناصر عظیم بات کر رہا ہوں۔ میڈم نیلم کے حوالے سے۔"

"اچھا۔" آواز سے بے زاری غائب ہو گئی۔ "حکم کریں جناب۔"

"مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے میک اپ کے معاملے میں اگر آپ میرے آفس تک آسکیں؟"

"آ جائیں گے میاں۔ آپ نے میڈم نیلم کا نام جو لے دیا ہے۔"

میں نے اسے پتا سمجھا کر فون بند کر دیا۔ چندا بہ غور مجھے دیکھ رہی تھی۔ "تو تم نہیں مانو گے؟"

"بات ماننے یا نہ ماننے کی نہیں ہے یہ بتاؤ کہ میں کب تک منہ چھپا کر بیٹھا رہوں گا۔ آخر ایک دن مجھے باہر کے حالات کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔"

"اچھا" اس نے مایوسی سے کہا۔ "میں چلتی ہوں۔ آج سی ٹی اسکین مشین نصب کی جائے گی۔ خاصا کام ہے۔ میں اب شام کو آؤں گی۔"

چندا کے جانے کے بعد میں نے اسلم سے پوچھا۔ "نوادرات کا ذخیرہ تم نے کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"میرے ایک رشتے کے ماموں کے گھر ہے۔ اپنے گھر تو کیا میں گاؤں بھی نہیں جا سکتا۔ وہاں کا نمبردار رب نواز کے چمچوں میں شامل ہے۔"

"میں وہ نوادرات دیکھنا چاہوں گا۔" میں نے کہا تو وہ کھل اٹھا۔

"کیوں نہیں جناب۔ صرف دو گھنٹے لگیں گے۔ اگر ہم ابھی نکلیں تو شام تک واپس آ سکتے ہیں۔" اس نے جوش سے کہا۔

"صبر، اتنی جلدی بھی نہیں ہے۔ مجھے کسی کا انتظار ہے۔"

میک اپ مین عیسیٰ خان ایک گھنٹے بعد آیا تھا۔ وہ مختصر سے قد کا دبلا سا بوڑھا تھا اس کی عمر شاید ساٹھ برس کے قریب تھی۔ چہرے سے سخت مزاج نظر آتا تھا۔ اس نے ایک میلا سا کرتہ شلوار پہن رکھا تھا جس کے اوپر کے بٹن غائب تھے۔ سر کے بالوں میں شاید مہینے بھر سے کنگھی نہیں کی گئی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں ایک شاندار قسم کا میک اپ بکس ضرور تھا۔ میں اسے بیڈ روم میں لے گیا۔

"کس کا میک اپ کرنا ہے؟" اس نے بلا تمہید پوچھا۔

"میرا ۔۔۔ لیکن میک اپ نہیں کرنا ہے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے میک اپ بدلنے کی تھوڑی سی تربیت دو تاکہ میں جب چاہوں فوری طور پر اپنا حلیہ بدل لوں۔"

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ہاتھوں میں لے کر میرے چہرے کا معائنہ کرتا رہا پھر بولا "کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے چھوٹی موٹی چند تبدیلیوں کی مدد سے آپ کے حلیے میں اتنی تبدیلی آجائے گی کہ قریبی جاننے والے بھی نہیں پہچان سکیں گے۔" اس نے اپنا بکس کھولا۔ اس میں سے ایک مختصر سی ڈبیا برآمد کی۔ اس میں سے اس نے لینس نکال کر میری آنکھوں میں فٹ کیے پھر شاندار قسم کی گھنی مونچھیں نکال کر میرے بالائی لب پر چپکائیں۔ مونچھیں میری فرنچ کٹ سے میچ کر رہی تھیں۔ آخر میں اس نے ربڑ جیسے کسی مادے سے بنی مصنوعی بتیسی نما دو چیزیں نکالیں اور انہیں میرے دونوں طرف کے نچلے جبڑوں میں لگا دیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے آئینہ دکھایا تو میں خود کو بہ مشکل شناخت کر پایا۔ میری ہلکی براؤن آنکھیں اب سیاہ رنگ کی ہو گئی تھیں۔ گھنی مونچھوں کے لگنے سے بالائی لب چھپ گیا تھا اور دونوں طرف سے جبڑے نکل آئے تھے جن کی وجہ سے میرا چہرہ مجموعی طور پر

اتنا تبدیل ہو گیا تھا کہ جاننے والوں کے لیے بھی غور سے دیکھے بغیر مجھے شناخت کرنا ممکن نہیں تھا۔

"بالکل آسان میک اپ ہے۔ صرف لینس لگانے اور نکالنے کی تھوڑی سی پریکٹس کرنا ہوگی۔ بہتر ہوگا آپ بائیو لینس لے لیں انہیں اتارنا ضروری نہیں ہوتا۔ ایک مہینے کے بعد انہیں پھینک کر دوسرے لگا لیں۔ یہ ذرا مہنگے پڑتے ہیں۔"

"پروا نہیں۔ کیا تمہارے پاس ہیں؟" میں نے کہا۔

"اتفاق سے ایک جوڑی پڑی ہے۔ اس کے ختم ہونے کے بعد آپ کو دوسری لینی ہوگی۔"

"ابھی تو ایک ہی کافی ہے۔" میں نے اس سے لینس لے لیے۔ اس نے کئی بار مجھے لینس نکالنے اور لگانے کی مشق کرائی، مونچھیں لگانا اور اتارنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ خاص قسم کے میٹریل سے بنی مونچھیں تھیں جو انسانی جلد پر چپک جاتی تھیں اور انہیں آسانی سے اتارا جا سکتا تھا۔ یہی معاملہ جبڑوں میں لگائی جانے والی مصنوعی بتیسی کا تھا۔ اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا بلکہ عیسیٰ خان کے مطابق اسے لگا کر کھانا بھی کھایا جا سکتا تھا۔ بہ شرط کہ کھانے میں کوئی سخت شے نہ ہو۔ اس نے میرا مسئلہ اتنی آسانی سے حل کر دیا تھا کہ میں نے شکر گزار ہو کر اسے معاوضے میں دس ہزار روپے دیے۔ وہ ضرورت مند تھا۔ اسی لیے خوش نظر آ رہا تھا۔ اسے رخصت کر کے میں نے اسلم سے کہا۔ "میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں تم یہیں رکو۔ فون آئے تو اٹینڈ کرنا اور میرے بارے میں بتانا کہ کھانا کھانے گیا ہوں۔ سمجھ گئے۔"

"سمجھ گیا جی۔ آپ تو بالکل بدل گئے ہیں۔ شاہ جی لگ ہی نہیں رہے۔"

"ایک بات اور یاد رکھو۔ اب میرا نام ناصر عظیم ہے۔ کبھی بھول کر بھی مجھے شاہ عالم نہ کہنا۔"

"بالکل سمجھ گیا۔" اس نے مستعدی سے کہا۔

شاہ عالمی ایک معروف علاقہ تھا۔ لہٰذا میں نے ماڈل ٹاؤن کے پاس پہنچ کر ایک پارک کے ویران کنارے پر کار کی نمبر پلیٹیں تبدیل کیں۔ یہاں سے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ احتیاطاً میں نے کار کو ذرا دور پارک کیا تھا اور پیدل ہی کلینک پہنچ گیا۔ ڈاکٹر عائشہ اپنے دفتر میں تھیں۔ انہوں نے مجھے شناخت کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن جب میں نے مونچھیں اتار کر اور ربر پیڈ نکال کر دکھائے تو اسے یقین آیا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے خفگی سے کہا۔

"ضرورت تھی ڈاکٹر عائشہ میرے خون کے پیاسے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ اگر شبنم کا معاملہ نہ ہوتا تو اب تک میں ملک سے باہر جا چکا ہوتا۔"

"شبنم۔" اس نے آنکھوں سے عینک اتار دی۔ "مجھے اس کی قوتِ برداشت پر رشک آتا ہے۔ اس نے خود کو اس شاک سے بچا لیا ہے کوئی اور عورت ہوتی تو شاید عمر بھر کے لیے ذہنی توازن کھو دیتی۔"

"کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔ بلکہ تم سے ملنا اس کے لیے بہتر ہوگا۔ وہ کئی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہے۔ وہ تمہارے لیے فکر مند ہے۔ اس کی فکر دور ہو جائے گی اور اس کی ریکوری کی رفتار تیز ہو جائے گی۔"

میں ڈاکٹر عائشہ کی رہنمائی میں اس کے اسپتال نما کلینک کے عقبی حصے میں پہنچا۔ جہاں مریض رکھے جاتے تھے یہاں کا ماحول کلینک کے ماحول سے بالکل مختلف تھا۔ دیواروں پر ہلکا آسمانی یا سی گرین کلر تھا۔ جا بہ جا پھول دار پودوں کے گملے رکھے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت مناظر کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ راہداری میں اوپر سیلنگ لائٹس تھیں ڈاکٹر عائشہ نے ایک کمرا کھولا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں اندر گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ شبنم جاگ رہی تھی اور کھڑکی میں بیٹھی باہر سرسبز باغ کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں ایک مصنوعی پہاڑی کے اوپر سے چشمہ ابل رہا تھا اور پتھروں پر بہتا نیچے آ کر غائب ہو جاتا تھا۔

"شبنم۔" میں نے آہستہ سے پکارا تو وہ تڑپ کر اٹھی پھر سامنے ایک اجنبی چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"ک ۔۔۔ کون ہو تم؟ ۔۔۔ تم شاہ عالم ہو؟"

میں نے مونچھیں اتار دیں اور جبڑوں سے ربر پیڈ بھی نکال لیے تو وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی اور میں اسے تسلی دیتا رہا۔ سہلاتا رہا۔ ان چند دنوں میں وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ اس کی سنہری رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ اسے ذرا سکون ہوا تو وہ سر اٹھا کر بولی "کیا وہ کتے یونہی آزاد رہیں گے؟"

اس کا اشارہ پولیس والوں کی طرف تھا جنہوں نے اس پر وحشیانہ ظلم کیا تھا۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے "نہیں ہم سب مل کر انہیں کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے۔ انہیں عدالت سے ان کے کرتوتوں کی سزا ملے گی۔"

"عدالت۔" وہ ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہو گئی تھی۔ "کوئی عدالت انہیں سزا نہیں دے سکتی۔ انہوں نے کوئی ثبوت نہیں چھوڑا۔ میری گواہی کوئی عدالت تسلیم نہیں کرے گی کیوں کہ میں تصدیق شدہ ذہنی مریضہ ہوں۔" اس کے لہجے میں زہر تھا "میں ان کتوں کو اپنے ہاتھ سے ایک ایک کرکے گولی مارنا چاہتی ہوں۔"

شبنم کے غیظ و غضب نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی تھی اور ان لوگوں کو راکھ کر دینا چاہتی تھی جو اس پر تشدد کے ذمے دار تھے۔ مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ انتقام کی یہ آگ کہیں پھر اس کی ذہنی کیفیت کو نہ بگاڑ دے۔ میں نے کہا "وقت آنے پر ان سب سے حساب لیا جائے گا لیکن تم پر تشدد کے مرکزی کردار کو میں اپنے ہاتھوں سے ختم کرکے آ رہا ہوں۔"

اس کا چہرہ جگمگانے لگا تھا۔ "سچ! کون ہے وہ حرامی؟"

"ڈی ایس پی دلاور شاہ۔" میں نے روانی سے جھوٹ بولا۔ شبنم کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ میں نے اسے اپنے اغوا اور پھر حادثے کے بارے میں بتا دیا لیکن ویڈیو کیسٹ کا معاملہ گول کر دیا تھا۔ دلاور شاہ کی میرے ہاتھوں عبرت ناک موت کا سن کر اس کے انداز میں تبدیلی آئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ پُر سکون تھی۔

"لیکن باقی کتے؟"

"وہ بھی کیفر کردار تک پہنچیں گے۔" میں نے شبنم کے ہاتھ تھام لیے "تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ تم نہیں جانتیں کہ اس وقت مجھے تمہاری کس قدر ضرورت ہے۔"

"میں نے اپنی ساری زندگی تمہارے نام کر دی ہے۔" اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا پھر سر اوپر کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا "مجھے پیار کرو۔"

میں ایسی صورت حال سے بچنا چاہتا تھا لیکن یہ موقع ایسا تھا کہ میں شبنم کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بادلِ ناخواستہ میں نے اس کی فرمائش کی تعمیل کی اور اس لمحے ڈاکٹر عائشہ اندر آئی تو میں جلدی سے الگ ہو گیا۔ ڈاکٹر عائشہ کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ اس نے اعلان کیا۔

"ملاقات کا وقت ختم ہوا۔"

"پلیز ڈاکٹر تھوڑی دیر اور۔" شبنم نے التجا کی۔

"نو۔ نیور۔ اب تمہارا دوائیں کھا کر آرام کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔"

میں نے موقع غنیمت جانا "ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کرنا چاہیے تاکہ جلدی سے صحت یاب ہو سکو۔ یاد رکھنا مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

"اور مجھے بھی تمہاری ضرورت ہے۔" اس نے پوری بے باکی سے کہا۔

"تم میرے دفتر میں انتظار کرو۔" ڈاکٹر عائشہ نے کہا۔ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ دس منٹ بعد آئی اور آتے ہی کہا "شاہ عالم تمہارے لیے خطرہ ہے ابھی کچھ دیر پہلے دو افراد کلینک کے ریسپشن پر تمہارے بارے میں پوچھ رہے تھے۔"

"یعنی شاہ عالم کے بارے میں؟"

"آف کورس۔ وہ تمہارا نام لے رہے تھے۔" ڈاکٹر عائشہ نے کہا "تمہارا بھیس بدلنا کام نہیں آیا۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے لیکن میں کہنے پر مجبور ہوں کہ آئندہ یہاں مت آنا۔ میں خود کو اور اپنے مریضوں کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی ہوں۔ ایک دو دن میں شبنم کو بھی ڈسچارج کر دوں گی۔"

"یہ زیادتی ہو گی۔" میں نے احتجاج کیا "آپ مجھ پر تو پابندی لگا سکتی ہیں لیکن شبنم آپ کی مریض ہے اسے یوں مکمل علاج کے بغیر ڈسچارج کرنے سے اس کی حالت دوبارہ بگڑ سکتی ہے۔"

"میں مجبور ہوں یہ اسپتال ایک ٹرسٹ ہے۔ اب تک میں اپنے ساتھیوں کے علم میں لائے بغیر تمہاری مدد کر رہی ہوں لیکن کل کو کوئی ہنگامہ ہوتا ہے تو مجھ پر الزام آئے گا۔ تمہارے دشمن تمہیں یہاں اس لیے معاف نہیں کریں گے کہ تم ایک اسپتال میں ہو۔ وہ یہاں بھی قتل و غارت گری کریں گے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں۔ آپ کا خدشہ درست ہے میرے دشمن اتنے ہی کمینے ہیں۔ آپ نے اب تک جو کیا ہے اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے افسوس ہے شاہ عالم لیکن میں مجبور ہوں۔" ڈاکٹر عائشہ نے کہا۔

اسی لمحے دھڑام سے دروازہ کھلا اور ایک مسلح شخص اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں مشین گن تھی اور اس کے قاتلانہ عزائم اس کے چہرے پر لکھے تھے۔ میں ایک دم غوطہ مار کر میز کے نیچے گھس گیا۔ گولیوں کی بوچھار آئی مگر مہاگنی کی مضبوط میز نے مجھے بچا لیا۔ ڈاکٹر عائشہ نے دلدوز چیخ ماری۔ میں میز کے نیچے سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پیر کرسی پر بیٹھے بیٹھے چل رہے تھے۔ وہ ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔ میز پر رکھا

سامان نیچے گر رہا تھا۔ مشین گن بردار اب بھی گولیاں چلا رہا تھا۔ میرے سامنے ماربل کا بنا پیپر ویٹ گرا۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور رینگ کر تنگ خلا سے دوسری طرف نکلنے لگا۔ میری کوشش تھی کہ میں ڈاکٹر عائشہ کی کرسی کو ہلائے بغیر دوسری طرف نکل سکوں۔ تاکہ حملہ آور میز کے نیچے میری پوزیشن کا اندازہ نہ لگا سکے۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ کب اس کی مشین گن کا کلپ ختم ہوتا ہے۔ میز کے نیچے سے میں دیکھ سکتا تھا کہ ڈاکٹر عائشہ کا سینہ چھلنی تھا۔ وہ فوراً ہی مر گئی تھی چند لمحے پہلے وہ جب اپنے کلینک میں قتل و غارت گری کے اندیشے کا اظہار کر رہی تھی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اس کا خدشہ سچ بن جائے گا اور اس قتل و غارت گری کا پہلا نشانہ وہ خود بنے گی۔ بالآخر مجھے ٹیٹ ٹیٹ کی مخصوص آواز آئی۔ مشین گن کا میگزین خالی ہو چکا تھا۔ میں تیزی سے میز کے نیچے سے نکلا۔ وہ میگزین نکال کر دوسرا لگا بھی چکا تھا۔ وقت بالکل نہیں تھا۔ میں نے فاسٹ بالر کے انداز میں ہاتھ گھمایا۔ ماربل کا پیپر ویٹ توپ کے گولے کی طرح نکلا اور حملہ آور کے سر پر لگا۔ اس نے بھیانک چیخ ماری اور مشین گن چھوڑ کر سر تھام لیا۔ وہ خون کے فوارے کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کے سر سے ابل رہا تھا۔ میں نے میز کے اوپر سے جست لگائی اور اس کی گردن پر ہاتھ مارا۔ اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز آئی تو مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ وہ زمین پر گر کر پھڑکنے لگا۔ میں نے اس کی مشین گن اٹھائی اور باہر نکل آیا۔

فائرنگ کی آواز نے کلینک میں زلزلہ پیدا کر دیا تھا۔ لوگ دیوانہ وار چلاتے ہوئے باہر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں راہداری میں تھا۔ ایک کمرے سے ایک نوجوان لیڈی ڈاکٹر برآمد ہوئی۔ مجھے ہتھیار بدست دیکھ کر اس کے حسین چہرے کے خطوط بگڑ گئے اور وہ گھبرا کر واپس اندر گھس گئی۔ سامنے راہداری سے ایک سفید لباس میں ملبوس شخص دوڑتا آ رہا تھا۔ میں سمجھا کہ وہ پیرا میڈک ہے اور اس غلط فہمی کی بنا پر فوت ہوتے ہوتے بچا اس نے اچانک مجھ پر پستول سے فائر کیے تھے۔ اتنے نزدیک سے فائر خطا جانا سوائے تائید خداوندی کے کچھ نہیں تھا جو ابھی مجھے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر مشین گن کا لیور کھینچ لیا اور وہ چھلنی ہو کر گر پڑا۔ فائرنگ کی مہیب آواز نے لوگوں کو جان بچا کر فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

اچانک مجھے شبنم کا خیال آیا۔ میں دیوانہ وار اس کے کمرے کی طرف لپکا۔ اس کے کمرے کا کھلا دروازہ دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا لیکن اندر بھی جھانک لیا۔ بستر کی کھنچی چادر اور الٹی ہوئی کرسی ساری کہانی سنا رہی تھی۔ شبنم غائب تھی۔ حملہ آور یقیناً دو سے زیادہ تھے اور وہ شبنم کو ساتھ لے گئے تھے۔ اچانک میں چونکا۔ اب یہاں ٹھہرنا خود کو پولیس کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر اندر سے کنڈی لگائی اور کھڑکی کے راستے باہر کود گیا۔ کلینک کے عقبی حصے میں ایک شاندار باغ تھا۔ جسے ذرا جنگل کے انداز پر بنایا گیا تھا۔ اس کی عقبی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ مجھے باہر کودنے میں مشکل نہیں ہوئی۔ عقبی حصہ ایک گندی گلی پر مشتمل تھا۔ میں نے تیزی سے مونچھیں چپکا لیں اور ربر پیڈ جبڑے میں رکھ لیے۔ میں تیزی سے گلی سے نکلا اور گھوم کر سامنے والی سڑک پر آ گیا۔ کلینک کے سامنے لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ میں خاموشی سے ان کے تبصرے سنتا رہا۔ لوگ اندازے لگا رہے تھے کچھ کہہ رہے تھے کہ اندر ڈاکو گھس گئے ہیں اور انہوں نے مریضوں اور ڈاکٹروں کو یرغمال بنا لیا ہے کچھ کہہ رہے تھے کہ کسی مریض کے وارثوں نے حملہ کیا ہے۔ البتہ ایک شخص نے صحیح بات کی۔

"او نہیں جی۔ یہ کوئی اور ہی چکر ہے۔ میں نے خود دیکھا۔ ایک سوہنی سی لڑکی کو دو مشٹنڈے گھسیٹ کر لائے اور کار میں ڈال دیا۔ ایک نے لڑکی کے سر پر کچھ مارا۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ اتنے میں اندر سے فائرنگ کی آواز آئی تو وہ کار لے کر بھاگے۔"

لڑکی سے مراد شبنم ہی تھی۔ وہ ابھی کچھ درندوں کی قید میں رہ کر آئی تھی اور امکان یہ تھا کہ وہی لوگ اسے پھر سے لے گئے تھے۔ پولیس کا ابھی کوئی پتا نہیں تھا۔ لیکن اس نے آکر سب سے پہلا کام یہ کرنا تھا کہ رہ جانے والے احمقوں کو سمیٹنا تھا جو وہاں کھڑے تبصرے کر رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور کار اسٹارٹ کرکے وہاں سے کھسک لیا تھا۔ محض دس منٹ کے اندر میرا اعتماد ختم ہو چکا تھا کہ دشمن مجھے نہیں پہچان سکے گا۔ وہ لوگ مسلسل ڈاکٹر عائشہ کے کلینک کی نگرانی کر رہے تھے۔ ظاہر ہے لاہور میں دماغی امراض کے اسپتال ہی کتنے تھے انہوں نے باری باری سب میں پوچھا اور بالآخر شبنم کو تلاش کر لیا۔ انہیں یقین تھا کہ شبنم جہاں بھی ہو گی شاہ عالم وہاں ضرور آئے گا اور انہوں نے مجھے بدلے ہوئے حلیے میں بھی شناخت کر لیا تھا۔ عیسیٰ خان کے میک اپ کی جادوگری دھری رہ گئی تھی۔ مشین گن بردار نے جس طرح مجھ پر اندھا دھند گولیاں برسائی تھیں! اس سے ظاہر تھا کہ وہ ہر صورت میں مجھے ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور

ایسا صرف رب نواز یا اس کا بیٹا دلنواز کر سکتا تھا۔ میں نے ان کو بے حد نقصان پہنچایا تھا۔ آخری بار ان کی کوٹھی سے فرار ہوتے ہوتے ایک گارڈ میرے ہاتھوں مارا گیا تھا پھر میں نے دلنواز کی بیوی کو یرغمال بنا لیا تھا۔ یہ سب باتیں ان کے غیظ و غضب کو بھڑکانے کے لیے کافی تھیں مجھے ڈاکٹر عائشہ کے مارے جانے کا افسوس تھا لیکن جس کی جہاں قضا آئی ہوتی ہے وہ وہیں مرتا ہے۔

اب مجھے شبنم کی فکر ہو رہی تھی۔ رب نواز کے ہرکارے اسے اٹھا کر لے گئے تھے اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ میری ذات کا سارا بدلہ وہ شبنم سے چکا دیتا۔ میں نے کار ایک پی سی او کے سامنے روکی اور شبنم کے دفتر کا نمبر ملایا۔ آزاد صاحب نہیں تھے لیکن میں نے ایک جونیئر ایڈیٹر کو خبر پہنچا دی۔ ساتھ ہی میں نے اسے یہ خبر دوسرے اخبارات تک پہنچانے کو کہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کل کے اخبار میں صحافی اتنا واویلا مچائیں کہ رب نواز ڈر جائے۔ پہلے بھی پریس کے ڈر سے ہی پولیس والوں نے شبنم پر جسمانی تشدد یا جنسی زیادتی سے گریز کیا تھا۔ میں واپس آفس پہنچا تو اسلم پریشان بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "یہاں دوبار کسی کا فون آچکا ہے۔ شاہ عالم کو پوچھتا ہے اور پھر فون بند کر دیتا ہے۔"

اچانک میری چھٹی حس خطرے کا الارم بجانے لگی۔ دشمن یہاں تک بھی آپہنچا تھا۔ میں نے اسلم سے کہا۔ "فوراً تیار ہو جاؤ ہم ابھی یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔" میں نے اندر جا کر رقم والا پرس لیا۔ مجھے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ بہ وقت ضرورت میرے پاس کوئی ہتھیار ہونا چاہیے تھا۔ آج مجھ پر دوبار گولیاں برسائی گئی تھیں۔ اگر خوش قسمتی اور میری حاضر دماغی ساتھ نہ دیتی تو میں آں جہانی ہو چکا تھا۔ جوابی کارروائی کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ میں نے کوئی ایسی شے نہیں چھوڑی تھی جس سے میری نشان دہی ہو سکتی۔ اسلم کے ہمراہ میں نے آفس بند کیا۔

"تمہیں کار چلانی آتی ہے۔"

"کبھی سیکھی تھی ٹیکسی چلانے کے لیے۔ پر میرے پاس لائسنس نہیں ہے۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے تمہیں صرف اتنا کرنا ہے میری کار لے کر پچھلی سڑک پر آجاؤ۔" میں نے اسے چابی دی اور زینوں سے عقبی طرف ہو لیا۔ شام کے وقت یہ عمارت ویسے ہی سنسان ہو جاتی تھی۔ عقبی حصے تک جاتے جاتے کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ اس طرف کوئی تھا بھی نہیں۔ بجلی کے میٹروں کے ساتھ لٹکتے کھلے تاروں سے بچتا ہوا میں باہر نکلا تو ابھی تک اسلم کار لے کر نہیں آیا تھا۔ عقبی سڑک جو ایک کھیل کے میدان کے ساتھ تھی۔ بہ ظاہر وہاں کوئی مشکوک فرد یا نگرانی کرنے والا نظر نہیں آرہا تھا۔ سامنے میدان میں ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کے میچز بیک وقت جاری تھے۔ جتنے کھلاڑی تھے اتنے ہی تماشائی تھے۔ ان میں کسی نگرانی کرنے والے کو تلاش کرنا دشوار تھا۔ جب دس منٹ گزر گئے تو میرا اضطراب عروج پر پہنچ گیا۔ ممکن ہے کہ دشمن گھات لگا کر بیٹھا ہو اور اس نے اسلم کو چھاپ لیا ہو اس صورت میں وہ یہاں آنے ہی والے تھے۔ میں غائب ہونے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسلم گاڑی سمیت آتا نظر آیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ جیسے ہی اس نے گاڑی روکی۔ میں اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اسلم کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے اس سے پہلے میں کچھ سمجھتا ایک سرد سی شے میری گردن سے آلگی۔

"ہلنا مت ورنہ مارے جاؤ گے۔" کسی نے بھاری لہجے میں کہا۔

"رب نواز کے کتے۔ تم صرف بھونک سکتے ہو مجھے مار نہیں سکتے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "کیا رب نواز تمہاری ولدیت میں شریک ہے۔"

اس کا ردِعمل میری توقع کے مطابق تھا۔ جیسے ہی پستول کی نال ہٹی میں نے سر معمولی سا سرکایا۔ اس کی وجہ سے چوٹ کی شدت کم ہو گئی تھی۔ میں فوراً نشست سے ٹیک لگا کر ایسا نقیل ہو گیا۔ "کتا بھونکے جا رہا تھا۔" اس نے مشتعل لہجے میں کہا پھر کسی سے موبائل پر بات کرنے لگا۔ وہ شاہ عالم کی گرفتاری کی رپورٹ کر رہا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ اسلم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ضرب کی شدت سے ایک لمحے تو مجھے چکر آگیا تھا لیکن...... میں ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے بے ہوش نہیں ہوا۔ رب نواز اس وقت ناقابلِ بیان پھرتی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

ایک بار اسلم نے میری طرف دیکھا تو میں نے اسے آنکھ ماری۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حیرت نمودار ہوئی ـــــ وہ سمجھ گیا کہ میں بے ہوشی کا تاثر دے کر موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ شخص اسلم کو جس طرف کار لے جانے کو کہہ رہا تھا اس طرف کچھ نئی آباد ہونے والی کالونیاں تھیں۔ یہ علاقہ ملتان روڈ سے متصل تھا۔ جہاں ایک زمانے میں ویرانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب وہاں سیمنٹ زمین پر شاندار عمارتیں سر اٹھا رہی تھیں۔

"اس سڑک پر موڑ لو۔" اس نے حکم دیا۔ یہ ذیلی سڑک ویران تھی۔ میں نے لبوں کی مدد سے آواز نکالے بغیر اسلم سے کہا "بریک۔" کئی بار کہنے پر وہ سمجھ گیا۔ اس نے سر ہلایا۔ تو میں تیار ہو گیا۔ میرا منصوبہ تھا کہ اچانک بریک لگانے کی صورت میں وہ آگے گرے گا اور میں اسے چھاپ لوں گا۔ اگرچہ یہ خطرہ تھا کہ وہ فائر کرے گا اور یہ بھی ممکن تھا کہ گولی مجھے یا اسلم میں سے کسی کو لگ جاتی لیکن میں رب نواز کی قید میں جانے کی نسبت خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ رب نواز اب مجھے کوئی رعایت نہ دیتا۔ اسلم نے کار کی رفتار تیز کر دی تھی۔ جیسے ہی اس کے پیر نے بریک دبایا۔ میں نے دونوں پاؤں ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے خود کو پیچھے اچھالا۔ اس لمحے وہ دونوں سیٹوں کے درمیان سے گزرا۔ اچانک بریک لگنے سے وہ خود کو سنبھال نہیں سکا تھا۔ میں نے بہ آسانی اس سے پستول چھین لیا اور اس سے پہلے وہ اٹھتا میں نے اس کے پستول سے اس کا سر بجایا۔ اس نے چلا کر ماں کو پکارا اور ساکت ہو گیا۔ بہ ظاہر وہ بے ہوش ہو گیا تھا لیکن میں کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایسا ہی ڈراما میں خود بھی کر چکا تھا۔ میں نے دوبارہ پستول اسے زیادہ قوت سے مارا اس نے ایک بار پھر اماں حضور کو پکارا اور اس بار سچ مچ بے ہوش ہو گیا۔ بدمعاش میرا جوتا میرے ہی سر پہ مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ مر گیا؟" اسلم نے تشویش سے کہا۔

"اتنا غیرت مند نہیں ہے۔" میں نے کہا "کار روکو۔"

اسلم نے کار روک دی۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے پستول کے تین عدد کلپ اور ملے تھے۔ یہ ایک شاندار قسم کا اعشاریہ بیالیس کا بریٹا تھا۔ اس قسم کے پستول بہت کم نظر آتے تھے اور اسی وجہ سے بہت قیمتی تھے سیاہ فائبر گلاس کے دستے کے ساتھ اس کی نال والا حصہ نیگٹوں دھات کا تھا۔ بڑے کیلی بر کا پستول ہونے کے باوجود یہ خاصا کم آواز تھا۔ اس کی مزید تلاشی لینے پر اس کی پتلون کی جیب سے پستول کا سائلنسر بھی نکل آیا تھا مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے سائلنسر کیوں نہیں لگایا تھا۔ شاید اس لیے کہ پستول کی نال خاصی لمبی ہو جاتی اور اسے لباس میں چھپانا مسئلہ بن جاتا۔ اس کا بٹوا تھا اور اس میں اس کا شناختی کارڈ بھی تھا۔ اس کا نام اکرام الدین تھا۔ مجھے پھر حیرت ہوئی اس قسم کے کاموں میں وہ شناختی کارڈ لے کر جاتا تھا۔ میں نے اس کا پرس اور سوائے پستول، گولیوں کے کلپ اور سائلنسر کے سب کچھ اسلم کے حوالے کر دیا۔

"اسے رکھو یہ مالِ غنیمت ہے۔"

اس نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ چیزیں رکھ لیں۔

"یہاں کوئی ویران اور زیرِ تعمیر مکان تلاش کرو۔ آج ذرا ہم بھی تفتیش کریں گے۔"

اسلم نے کار آگے بڑھائی۔ ذرا سی جستجو کے بعد ایک زیرِ تعمیر مکان نظر آگیا۔ اس کا احاطہ کھلا تھا۔ اسلم کار اندر لے گیا۔ بہ ظاہر کوئی نظر نہیں آرہا تھا لیکن میں نے احتیاطاً پورے مکان کا معائنہ کیا۔ تیار کیے جانے والے حصوں پر تالے لگے تھے البتہ زیرِ تعمیر حصے کھلے تھے اور وہاں کوئی نہیں تھا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ میں نے اسلم سے کہا۔ "تم جا کر ایک لالٹین، ٹارچ، موم بتیاں، دری کھانا اور سر درد کی کوئی دوا لے آؤ۔"

اس نے سر ہلایا اور جانے لگا۔ میں نے آواز دی۔ "پیسے تو لیتے جاؤ۔"

"میرے پاس ہیں جی۔" اس نے کہا۔

"اور ہاں کار کی ٹینکی بھی فل کرواتے آنا۔" مجھے یاد آیا۔ میں نے صبح سے کار میں پٹرول نہیں ڈلوایا تھا اور اس کی ٹینکی خالی ہونے کے قریب ہوگی۔ اسلم کے جانے کے بعد میں نے بے ہوش شخص کا معائنہ کیا۔ بھاری بھرکم آواز کے برعکس وہ عام سی جسامت کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر حالات کی سختی تحریر تھی۔ اس میں ذہانت کی بھی کمی تھی یا ورنہ وہ اپنا شناختی کارڈ لے کر نہ گھومتا اور نہ ہی اتنی آسانی سے میرے داؤ میں آتا۔ مجھے شبنم کا خیال آیا۔ وہ بے چاری اب تک نہ جانے اذیتوں کے کن مراحل سے گزر چکی ہوگی۔ میرا خون کھولنے لگا تھا۔ رب نواز حد سے بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کھلی دشمنی پر اتر آیا تھا۔ اسے اپنا خاندان عزیز تھا اور دشمنی کی یہ آگ اس تک بھی پہنچ چکی تھی۔ بے ہوش شخص کی طرف سے اطمینان کر کے میں نے مکان کے عقبی احاطے میں لگے ہینڈ پمپ سے منہ ہاتھ دھویا جس سے مجھے خاصا سکون ملا تھا۔ سر کے درد میں کمی ہوئی تھی۔

اسلم کو گئے ہوئے ایک گھنٹا ہو چکا تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور کمرے میں تاریکی چھا گئی تھی۔ میں باہر نکل آیا۔ اس شخص کی مجھے فکر نہیں تھی کمرے سے نکلنے کا واحد راستہ یہ دروازہ تھا۔ اس کی کھڑکیوں پر لوہے کی گرل نصب کی جا چکی تھی۔ میں کمرے کے سامنے ریت کے ڈھیر پر نیم دراز ہو گیا۔ آرام کرنے کے ساتھ میں کمرے کی نگرانی بھی کر رہا تھا۔ پستول پر سائلنسر لگا کر اسے میں نے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اسلم سورج غروب ہونے کے آدھے گھنٹے بعد آیا تھا۔ وہ

تمام سامان لے آیا تھا اور کار میں پیٹرول بھی بھروا لیا تھا۔ اسی لمحے کمرے میں موجود شخص کراہا۔ میں اور اسلم تیزی سے لپکے۔ میں نے ٹارچ روشن کرتے ہوئے اسلم کو لالٹین جلانے کو کہا۔ اکرام الدین ہل جل رہا تھا اور ہوش میں آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسلم نے لالٹین جلا کر دیوار سے نکلی ایک کیل سے لٹکا دی۔ میرے کہنے پر اس نے باہر سے پانی لا کر اکرام کے منہ پر پھینکا۔ وہ تیزی سے ہوش میں آیا۔ میرے ہاتھ میں اپنا پستول دیکھ کر اس نے اٹھنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"میرا خیال ہے تم ہوش میں آ چکے ہو۔" میں نے اس کے پیر پر ٹھوکر ماری۔ "اٹھ کر بیٹھ جاؤ اور میں جو پوچھوں اس کا درست جواب دیتے رہو۔ یاد رکھنا جواب میں تاخیر ہوئی تو ایک گولی تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔"

"کک۔۔۔ کیا پوچھنا ہے؟" اس نے خوفزدہ انداز میں کہا۔

"تم رب نواز کے لیے کام کرتے ہو؟"

"نہیں۔" اس نے کہا ہی تھا کہ میں نے گولی چلا دی۔ نشانہ احتیاط سے لیا تھا اس لیے گولی بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے دل خراش چیخ ماری۔۔۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ٹھوکر ماری۔

"آواز نہیں کتے۔ ورنہ اگلی گولی حلق میں اتار دوں گا۔" میرے لہجے میں سفاکی محسوس کر کے اس نے چیخ و پکار یک دم بند کر دی تھی لیکن دبی دبی آواز میں رو رہا تھا۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا۔

"ہاں ملک صاحب کے لیے کام کرتا ہوں۔"

"اسے کتا کہہ۔" میں نے پھر اس کے منہ پر جوتے کی نوک ماری۔ وہ منہ ہاتھ سے دبا کر لوٹ پوٹ ہونے لگا پھر اس نے تھوکا تو خون کے ساتھ اس کے دو دانت بھی منہ سے نکلے تھے۔

"تم مجھے کہاں لے جاتے۔" میں نے اگلا سوال کیا اس نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔

"ملتان روڈ کے ساتھ ایک آبادی میں۔ ملک۔۔۔ کتے نے آپ کو وہاں لانے کو کہا تھا۔"

اس نے پتا بتایا۔ میں نے وہ نمبر پوچھا جس پر اس نے موبائل سے فون کیا تھا۔ اس نے بتایا تو میں نے اسلم سے موبائل لے کر تصدیق کی۔ میرے جارحانہ اور سفاک رویے نے اس کے سارے کس بل نکال دیے تھے۔

"اب اہم ترین سوال۔ وہ لڑکی کہاں ہے جسے ڈاکٹر عائشہ کے کلینک سے اغوا کیا گیا تھا؟" میں نے نظر جما کر کہا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے گولی چلائی جو اس کے سر کے پاس سے گزر گئی۔ وہ مارے خوف کے چلانے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ میں نہیں جانتا۔"

"تم جھوٹ بک رہے ہو۔" میں نے تیسری بار اس کے منہ پر جوتے سے رب نواز جس کمینگی پر اتر آیا تھا اس کے بعد میرے دل میں اس کے یا اس کے گرگوں کے لیے ذرا بھی رحم نہیں رہا تھا۔ تھوڑی سی اور مار کھانے کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ وہ شبنم کے اغوا کے بارے میں جانتا تھا لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اسے کہاں لے جایا گیا تھا۔ وہ رب نواز کے کسی اور ٹھکانے سے ناواقف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سچ کہہ رہا تھا اسے مزید علم نہیں تھا۔ میں نے اسلم سے کہا۔ "اسے باندھ دو اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دو۔ اس کے بارے میں بعد میں فیصلہ کریں گے اگر اس نے ایک لفظ بھی جھوٹ کہا ہو گا تو اسے مار کر یہیں ڈال دیں گے۔"

اکرام الدین نے خاموشی سے ہاتھ پیر بندھوا لیے۔ بازو کا زخم معمولی سا تھا۔ اس نے خود ہی منہ کھول کر کپڑا لے لیا۔

صبح ناشتے کے بعد سارا دن صرف دھکے نصیب ہوئے تھے۔ بھاگ دوڑ نے پیٹ کے چوہوں تک کو نڈھال کر دیا تھا۔ اسلم نان کباب لے کر آیا تھا۔ اسے کھانے کے لیے زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا کھا کر میں نے پانی پیا۔ اسلم پلاسٹک کا ایک گلاس بھی لے آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ذرا اس مکان کا معائنہ کر آؤں جس کا پتا اکرام الدین نے بتایا تھا۔ میں نے اسلم سے کہا "تم یہیں رہ کر اس کی نگرانی کرو میں ذرا اس مکان تک ہو کے آتا ہوں۔"

"وہاں جانا ٹھیک نہیں ہو گا۔" اسلم بولا "رب نواز سفاک آدمی ہے آپ اس کے خلاف کیا کر سکتے ہیں؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن جائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ذرا موبائل دینا۔"

میں نے مکان سے باہر آ کر رئیس کو کال کی۔ اس نے میری آواز سنتے ہی برہمی سے کہا۔ "الو کے پٹھے تجھے کہا تھا نا کہ آرام سے بیٹھ۔"

"یار میں کیا کروں شبنم سے ملنے گیا تھا۔ وہیں سے ساری خرابی ہوئی۔ اطلاع یہ ہے کہ مجھے اغوا کر لیا گیا تھا پھر میں نے اغوا کرنے والے کو اغوا کر لیا۔ اب وہ میرے پاس ہے اس نے خاصی مفید معلومات اگلی ہیں تو فوراً میرے پاس آجا۔" میں نے اسے پتا سمجھایا اور اس کی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔

رئیس صرف بیس منٹ میں آ گیا۔ میں نے اسے اکرام الدین اور اس کے بتائے ہوئے پتے کے بارے میں بتایا۔ رئیس بولا "تو وہاں جانا چاہتا ہے؟"

"ظاہر ہے اگر شبنم کو آزاد کرانا ہے تو ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو بیٹھے نہیں رہ سکتے ہیں۔"

"لیکن خالی ہاتھ۔۔۔" اس نے اعتراض کیا۔

"میرے پاس پستول ہے سائلنسر سمیت۔"

"میں خالی ہاتھ ہوں۔" اس نے کہا۔

"تیرا ساتھ ہی کافی ہے۔" میں نے کہا "تو اپنی کار یہیں چھوڑ دے اس کا نظر میں آنا ٹھیک نہیں ہے۔"

مذکورہ مکان تلاش کرنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ یہ خاصی دور سے واضح تھا۔ اس کی قلعہ نما فصیل اور اوپر لگے خاردار تار سب کو متوجہ کرتے تھے۔ رئیس نے معائنہ کیا۔ "اس میں تو کہیں جانے کا راستہ نہیں ہے۔"

"راستے ہوتے نہیں ہیں نکالے جاتے ہیں۔" میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

بہ ظاہر مکان ویران نظر آ رہا تھا۔ مین گیٹ پر کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اندر کوئی نہ کوئی فرد ضرور ہو گا۔ اچانک رئیس نے اشارہ کیا "وہ دیکھ۔" اس کی انگلی کی سیدھ میں ایک درخت تھا۔ جس کی شاخیں مکان کی فصیل کے اندر تک جا رہی تھیں۔

"سوچ لے ایسا نہ ہو کہ اندر کتے ہوں۔" میں نے رئیس سے کہا۔

"تو پھر دروازے سے چلتے ہیں۔" رئیس نے بھنا کر کہا "وہ خود تجھے کندھے پر بٹھا کر اندر لے جائیں گے۔"

مجھے اس کی بات ماننی پڑی۔ جوتے اتار کر ہم نے جیبوں میں ٹھونسے اور درخت پر چڑھ گئے۔ نیم کا یہ درخت خاصا مضبوط اور گھنا تھا اس کی ایک شاخ اندر تک جا رہی تھی۔ یہ خاردار تاروں کے عین اوپر سے گزر رہی تھی۔ میں نے رئیس کو اشارہ کیا۔ "حضرت پہلے آپ۔"

رئیس سرکتے ہوئے شاخ کے کنارے تک پہنچا اور اندر کود گیا۔ میں اس کے پیچھے تیار تھا۔ نیچے گرتے ہی میں نے پستول نکال لیا تھا اور کسی کتے یا انسان سے نمٹنے کے لیے تیار تھا لیکن کوئی نمودار نہیں ہوا۔

"لگتا ہے مکان میں سچ مچ کوئی نہیں ہے۔" رئیس بولا۔

پودوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے ہم مکان کے عقبی حصے میں پہنچ گئے۔ یہ حصہ روشن تھا لیکن عقبی برآمدے میں فرش پر جمی گرد سے اندازہ تھا کہ کسی نے کم از کم ہفتے بھر سے یہاں قدم نہیں رکھا تھا۔ میں نے ایک دروازے پر طبع آزمائی کی لیکن وہ لاک نکلا۔ رئیس ادھر ادھر زمین پر کچھ دیکھتا پھر رہا تھا پھر اس نے زمین سے کوئی تنکا نما شے اٹھائی۔

"لاؤ میں دیکھتا ہوں۔" اس نے کہا۔ تنکا دراصل ایک فولادی تار تھا۔ اس نے تار موڑ توڑ کر تالے میں داخل کیا۔ پانچ منٹ میں تالا کھل گیا۔ میں نے پیٹھ ٹھونک کر رئیس کی مہارت کی داد دی اور ہم اندر داخل ہو گئے۔ رئیس نے ہتھیار کے طور پر وہیں پڑا لوہے کا ایک پائپ اٹھا لیا تھا۔ اندر سے مکان خاصا شاندار تھا۔ ہم نے ایک راہداری عبور کی جب پہلی بار کوئی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کسی بچے نے غوں کی آواز نکالی ہو۔ میں اور رئیس محتاط ہو کر اس طرف بڑھے جس طرف سے آواز آئی تھی۔ یہ جگہ راہداری کے آخر میں تھی اور سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ آواز دوبارہ اور واضح طور پر آئی تھی پھر کسی کی مردانہ ہنسی کی آواز آئی۔ میں نے اشارے سے رئیس کو وہیں ٹھہرنے کو کہا اور خود نیچے اتر گیا۔ یہ کھلی سیڑھیاں تھیں تہ خانہ بھی خفیہ نہیں تھا۔ سیڑھیاں اتر کر ایک طرف کمرا تھا جس کے سامنے والی دیوار صرف تین فٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں نے احتیاط سے اندر جھانکا۔ ایک شخص کرسی پر بیٹھا تھا اور اس نے بچے کو گود میں لے رکھا تھا۔ کرسی کا رخ دوسری جانب تھا۔ مرد کا عقبی سر اور بچے کے ہلتے پیر نظر آ رہے تھے۔ میں نے ذرا آگے ہو کر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرا کسی اور وجود سے خالی تھا۔ البتہ ذرا آگے ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ مطمئن ہو کر میں نے پستول اس شخص کی گردن سے لگا دیا۔

"ہلنا مت۔ ورنہ گردن میں سوراخ ہو جائے گا۔" میں نے آواز نیچی رکھی۔

وہ واقعی ساکت ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "کون ہو تم؟"

"وہی جسے یہاں لانا تھا۔" میں نے پستول اس کی گردن پر دباتے ہوئے کہا "کھڑے ہو جاؤ۔"

وہ آہستگی سے کھڑا ہوا تو میں نے ہاتھ مار کر اس کے لباس کی تلاشی لی۔ اس کے کوٹ کی جیب سے ایک ریوالور برآمد کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اس کے پاس مزید کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں نے حکم دیا "اب میری طرف گھوم جاؤ۔ آہستہ سے۔ کوئی مکاری مت دکھانا۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ میری طرف گھوما تو میں دنگ رہ گیا تھا۔ وہ پروفیسر ہاشم رضا تھا اس کی گود میں ایک چار پانچ ماہ کا بچہ تھا۔ جو ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ بچے کو دیکھتے ہی مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ وہ انسان کا بچہ تھا لیکن اس کے خدوخال سے ایک نوع کی حیوانیت جھلکتی تھی۔ جیسی نائلی اور اس کے ہمزاد جبو کے چہرے پر جھلکتی تھی۔

"کیا یہ بچہ بھی تمہارے تجربات کا نتیجہ ہے؟"

"ہاں۔" اس نے اطمینان سے بچے کو سامنے میز پر لٹا دیا تھا۔ "یہ میرا ایک اور شاندار تجربہ ہے۔"

"تم اسے شاندار کہتے ہو۔" میں نے اسے گھورا۔ "درحقیقت تم انسانوں پر انسانیت سوز تجربات کر رہے ہو۔"

"تمہاری نظر میں یہ تجربہ انسانیت سوز ہوں۔" اس نے شانے اچکائے "لیکن تجربات تو صرف تجربات ہوتے ہیں۔"

"تو یہ تجربات تم نے اپنے خاندان کی عورتوں پر کیوں نہیں کیے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کیوں کہ مجھے تجربات کے لیے دوسری عورتیں مل جاتی ہیں۔"

"کوئی عورت اپنی خوشی سے جان دینا نہیں چاہتی؟ تم جان بوجھ کر انہیں دھوکے میں رکھتے ہو۔ تم قاتل بھی ہو۔"

"تمہارے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس نے سکون سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔"

"رب نواز نے مجھے اغوا کرنے کے لیے جس شخص کو بھیجا تھا۔ اس نے بتایا کہ مجھے اس مکان میں لایا جانا تھا۔ کیوں؟"

"میں نہیں جانتا۔ یہ جگہ ملک رب نواز کی ہے اور میں نے یہاں پر اپنی لیب بنا رکھی ہے اگر رب نواز اسے دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے تو میں اسے نہیں روک سکتا۔ مجھے نہیں معلوم اس نے تمہیں یہاں لانے کو کہا تھا۔"

میں نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ "بکواس مت کرو۔ شرافت سے بتا دو۔ ورنہ مجھے تمہیں مار کر ذرا بھی افسوس نہیں ہوگا۔ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے تم پہلے ہی موت کی سزا کے مستحق ہو چکے ہو۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کی لیکن ہاشم رضا کے بوڑھے ہاتھوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ اپنا گلا چھڑا سکتا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے مار کر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔"

"کوٹھی میں اوپر کون کون ہے۔ درست بتانا۔" میں نے دباؤ ذرا کم کیا۔

اسی لمحے میز پر لیٹے ہاتھ پاؤں مارتے بچے نے ایک تیز آواز نکالی۔ وہ غصے سے مجھے گھور رہا تھا۔ ایک دم وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے بندر کی سی پھرتی سے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔ میں نے عجلت میں پروفیسر ہاشم رضا کا گلا چھوڑ کر اس سے بچنے کی کوشش کی لیکن اس نے میرا بازو تھام لیا تھا۔ اس سے پہلے میں اسے جھٹکتا وہ میرے بازو میں دانت گاڑ چکا تھا۔ اس کے دانت کسی بندر کی طرح ہی تیز اور نکیلے تھے۔ میں نے کراہ کر اسے دور کرنے کی کوشش کی لیکن وہ جونک کی طرح چمٹ گیا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ میری بوٹی کاٹ لے۔ مجبوراً میں نے پستول کا دستہ اس کے سر پر مارا۔ کھٹ کی آواز آئی۔ اس کے سر کی ہڈی کسی جوان آدمی سے بھی زیادہ مضبوط تھی لیکن اس ضرب نے اس کی گرفت کمزور کر دی تھی دوسری ضرب پر اس نے ایک حیوانی چیخ نما آواز نکالی اور میرا بازو چھوڑ کر چھلانگ لگائی اور میز کے عقب میں غائب ہو گیا۔ میرے بازو سے خون چھلک آیا تھا۔

میری چیخ سن کر رئیس دوڑا چلا آیا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے تشویش سے کہا۔

میں نے اسے مختصراً پروفیسر ہاشم رضا اور اس کی نئی تخلیق کے بارے میں بتایا۔ "اس سے ہوشیار رہنا۔ بندر سے زیادہ خطرناک ہے۔" میں نے میز کے عقب میں جھانکا۔ ہاشم رضا پہلے ہی موقع سے فائدہ اٹھا کر دروازے سے غائب ہو چکا تھا۔ اب بچہ بھی غائب تھا۔ میز کے عقب میں دیوار کے ساتھ ایک لکڑی کا تختہ لگا تھا۔ جیسے لوگ کتے بلیوں کے لیے گھر میں آنے جانے کے لیے بنا دیتے ہیں۔ بچہ اسی سے نکل گیا تھا۔ لیکن میں نے احتیاطاً میز کے نیچے دیکھ لیا۔ رئیس دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "ہاشم رضا یہاں گیا ہے تو اس طرف فرار کا کوئی راستہ ضرور ہوگا۔"

یہ بات میرے ذہن میں تھی لیکن احتیاط کا تقاضا تھا کہ میں اندھا دھند اس کے پیچھے جانے سے گریز کروں۔ "جانے دوسری جانب ہاشم رضا کون سی توپ لیے میرے استقبال کے لیے تیار ہو۔ "تو نے اوپر دیکھا۔"

"ہاں راہداری کے سارے کمرے دیکھ لیے لیکن وہاں کوئی نہیں ہے۔"

"ہمیں اندر جانا ہوگا۔" میں نے فیصلہ کیا "ہاشم رضا اہم آدمی ہے رب نواز اس کے بدلے شبنم کا سودا کرنے کے

لیے تیار ہو جائے گا۔" میں نے ہاشم رضا کا ریوالور رئیس کے حوالے کیا۔ "اشد ضرورت کے بغیر استعمال نہ کرنا اور ہاں تو یہاں رک کر اوپر والوں کا خیال رکھ۔ شاید ہاشم رضا نے انہیں بتا دیا ہوگا۔"

رئیس نے سر ہلا دیا۔ میں نے دوڑ کر دروازے کو ٹکر ماری۔ وہ کھلا تھا اور میں لڑھک کر اندر جا پہنچا۔ زمین پر لڑھکتے ہوئے میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا یہ تجربہ گاہ تھی جہاں میزوں اور شیلف پر بے شمار مرتبان رکھے تھے مختلف شیشے کی صراحیوں میں مختلف کیمیکلز ری ایکشن جاری تھے ایک طرف جدید نوعیت کی مشینری رکھی تھی۔ میرے لڑھکنے نے میری جان بچالی۔ ایک گولی میرے اوپر سے گزری اور پیچھے شیلف پر رکھا ایک مرتبان چکنا چور ہو گیا۔ اسی اثنا میں، میں لڑھک کر ایک میز کے نیچے جا پہنچا تھا۔ ہاشم رضا مشینری کے پیچھے دبکا ہوا تھا وہیں سے اس نے فائر کیا تھا۔ میں نے جواب میں ایک گولی چلائی۔۔۔ جو اس کے عین اوپر رکھے مرتبان کو لگی۔ اس میں رکھا کیمیکل نیچے گرا تو عجیب سی بو پھیل گئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟" ہاشم رضا چلایا۔

"جواب دے رہا ہوں۔ آغاز تم نے کیا تھا۔"

"سنو میرا تم سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ تم میرے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔"

"میرا رب نواز سے جھگڑا ہے اور تم اس کے اتحادی ہو۔ فارمولا ہے دشمن کا دوست بھی دشمن ہوتا ہے۔" میں نے کہا اور ایک اور مرتبان کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ "اگر تم نے ہتھیار نہیں پھینکے تو میں اس طرح ایک ایک کر کے تمہارے سارے کیمیکلز ضائع کر دوں گا۔"

"خدا کے لیے۔" ہاشم رضا کی آواز کانپ رہی تھی۔

"یہ کیا کر رہے ہو۔ ان میں سے بعض بہت خطرناک ہیں کچھ آتش گیر ہیں۔ لیب جل کر راکھ ہو جائے گی۔"

"اس لیب کو تباہ ہو جانا چاہیے جہاں اس قسم کے شیطانی تجربات ہوتے ہیں۔" میں نے ایک اور مرتبان اڑا دیا اس کے نیچے گرتے ہی وہی حیوانی چیخ سنائی دی۔ جو اس بچے کے منہ سے نکلی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ زمین پر اچھلتا اور پھڑکتا نظر آیا۔ کیمیکل اس کے جسم پر گرا تھا۔ اس کی حالت خراب تھی۔ کیمیکل شاید تیزابی اثر رکھتا تھا اس کی کھال پر آبلے نمودار ہو گئے تھے اور اس کی کھال گل رہی تھی۔ کیمیکل نے اس کے جسم کے اکثر حصے کو بھگو دیا تھا۔ ایک لمحے تو مجھے افسوس ہوا کہ حیوانی سہی..... وہ بچہ تھا لیکن اس کا مر جانا بہتر تھا۔ بڑا ہو کر وہ جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر نہ جانے کتنے انسانوں کی موت کا سبب بن جاتا۔ مجھ سے اس کا پھڑکنا نہیں دیکھا جا رہا تھا۔ میں نے تاک کر گولی چلائی اور وہ ایک بار پھڑک کر ساکت ہو گیا۔ ہاشم رضا نے چلا کر مجھے گالی دی اور رونے لگا۔

"شاہ عالم۔۔۔ حرام زادے یہ میری تین سال کی محنت تھی۔"

"تمہاری محنت کے ساتھ میں تمہیں بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔" میں نے اس کے عین اوپر رکھے ایک اور مرتبان کو اڑا دیا۔

اس بار ہاشم رضا کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اپنا پستول پھینک کر اور ہاتھ اٹھا کر سامنے آ گیا۔ میں نے اس کی تلاشی لی اور اسے لے کر اوپر آ گیا۔ رئیس وہاں نہیں تھا۔ میرا دل دھڑکا مگر رئیس اوپر صحیح سلامت مل گیا۔ اس نے دو افراد کو ہینڈز اپ کر رکھا تھا۔ یہ صورت اور حلیے سے عام سے ملازم لگ رہے تھے۔ رئیس نے ان کی ناصی مرمت لگا دی تھی وہ روتے ہوئے گڑگڑا رہے تھے کہ انہیں نہ مارا جائے ان کے بیوی بچے ہیں۔ رئیس نے کہا۔

"کوٹھی میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

مجھے کسی قدر مایوسی ہوئی میرا خیال تھا کہ شاید شبنم بھی یہاں مل جائے۔ اب میں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ رب نواز کو کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا ہو اور وہ اپنی فورس کے ساتھ اپنی ہی کوٹھی پر چڑھائی کی تیاری کر رہا ہو۔ میرے اشارے پر رئیس نے ان کے ہاتھ پیر باندھ کر ایک کمرے میں دھکیل کر باہر سے کنڈی لگا دی ہاشم رضا بہ ظاہر تعاون کر رہا تھا لیکن میں اس پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ سائنس داں تھا اور اس کا ذہن زیادہ خطرناک تھا۔ کوٹھی کے سامنے والے احاطے میں ایک جیپ کھڑی تھی۔ ہاشم رضا سے معلوم ہوا کہ یہ اس کی جیپ ہے۔ رئیس نے اس کی تلاشی لی تو اس کی عقبی سیٹ کے نیچے سے ایک چھوٹی نال والی خودکار رائفل اس کے میگزین اور ایک تھیلا ملا۔ اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ ان کی مالیت کسی طرح پانچ لاکھ روپے سے کم نہیں تھی۔ میں نے پوچھا "یہ رقم یہاں کیوں رکھی ہے؟"

"سوال جواب بعد میں کرتے رہنا۔ ابھی یہاں سے نکلو۔" رئیس جھلا کر بولا۔

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ واپسی کے وقت ہم صدر

دروازے سے نکلے تھے۔ یہ علاقہ تو ویسے ہی سنسان رہتا تھا۔ رات کے بارہ بجے نہ آدم زاد اور نہ ہی کوئی جانور نظر آ رہا تھا۔ ہماری کار کچھ دور کھڑی تھی۔ ہاشم رضا کے ہاتھ اس کی ٹائی سے باندھ دیے تھے۔ اسے کار کی عقبی نشست پر لٹا کر ہم دونوں آگے آ گئے۔ دس منٹ بعد ہم دوبارہ اپنے ٹھکانے پر تھے۔ اسلم بدستور اکرام الدین کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں نے رئیس سے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرنا۔ یہ بتا کہ تیرا کیا ارادہ ہے؟"

"صبح جاؤں گا۔ چھ سات بجے تک آ جانا یہ نہ ہو کہ تجھ سے پہلے یہاں کام کرنے والے مزدور آ جائیں۔"

رئیس چلا گیا۔ میرا تھکن سے برا حال تھا لیکن اس سے پہلے ہاشم رضا سے کچھ پوچھ گچھ ضروری تھی۔ اس کے اعتماد میں کمی آئی تھی اور وہ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ خاص طور سے اکرام الدین کی صورت دیکھ کر جسے میں نے بدصورت بنا دیا تھا۔ میں نے کہا۔ "دیکھو پروفیسر تم ایک ایجوکیٹڈ شخص ہو۔ میں تم پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہتا۔ بہتر ہو گا جو میں پوچھوں اس کا جواب دیتے رہو۔"

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"رب نواز کہاں ہے؟"

"ظاہر ہے اپنے گھر میں ہو گا۔"

"شبنم کہاں ہے؟"

"میں بتا چکا ہوں رب نواز کے ان معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں زیادہ تر اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ رب نواز نے شبنم کو کہاں رکھا ہے۔"

اس کی بات معقول تھی۔ میں نے دوسرا سوال کیا۔

"رب نواز کے اور کتنے ٹھکانوں سے تم واقف ہو؟"

"زیادہ نہیں۔" اس نے جواب دیا "اور وہ بھی رب نواز کے مستقل ٹھکانے نہیں ہوتے بلکہ وہ ایسی ہی آبادیوں میں کوئی زیر تعمیر مکان اونے پونے داموں خرید لیتا ہے۔ جس کو مالک مجبوری میں بیچ رہا ہو۔ وہاں مجھے لیب بنا کر دے دیتا ہے۔ اس قسم کی جگہوں پر میں سکون سے دنیا والوں کی نظروں میں آئے بغیر کام کر سکتا ہوں۔ جب وہ جگہ کسی وجہ سے مشکوک ہو جاتی ہے تو رب نواز مجھے کسی دوسرے ٹھکانے پر منتقل کر دیتا ہے۔"

میں نے مزید نہیں پوچھا۔ اس کا فائدہ نہیں تھا اگر وہ دس جگہوں کے پتے دے دیتا تو میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ ہر جگہ کو فوراً فوراً چیک کرتا۔ لہٰذا میں نے ہاشم رضا سے اس کے کام کے بارے میں سوال شروع کر دیے۔

"یہ بچہ بھی تمہارے تجربات کا نتیجہ ہے اس کی ماں کہاں ہے؟"

"وہ اسے جنم دیتے ہوئے ہلاک ہو گئی۔" ہاشم رضا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"گویا تم نے ایک اور انسان کو اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا دیا۔" میں نے اسے ملامت کی۔

"کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا "میرے تجربات مستقبل میں نسل انسانی کے بہت کام آئیں گے۔ انسانی ڈی این اے میں حیوانی معلومات شامل کرنے سے آج سے زیادہ ذہنی اور طاقت ور انسان وجود میں آئیں گے۔"

"میرا خیال ہے کہ انسان کو اللہ نے جتنی طاقت دی ہے وہ کافی ہے۔ ہاں تم یہ کہہ سکتے ہو۔ مستقبل کے طالع آزماؤں کے لیے جسمانی طور پر مضبوط فوج تیار کر رہے ہو۔ مستقبل کے صنعت کاروں کے لیے انسانی روبوٹ مہیا کرو گے۔ تمہاری کارکردگی کے دو نمونے لالی اور جمبو کی کارگزاری میں دیکھ چکا ہوں۔ رب نواز جیسا شخص انہیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال نہیں کر رہا ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"تم جو چاہو کہو لیکن یہ تجربات مستقبل کے لیے ہیں۔"

"پروفیسر ہاشم رضا تم ببول بو کر گلاب کی آس لگانے والے احمقوں میں سے ہو۔"

اسلم پر نیند سوار تھی لیکن وہ جاگ رہا تھا۔ میں باہر آیا اور موبائل پر رب نواز کا نمبر ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ اسے اطلاع مل چکی ہو گی کہ پروفیسر ہاشم رضا غائب ہے۔ فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا۔

"کون بات کر رہا ہے؟"

"رب نواز کا باپ' جلدی سے اسے بلاؤ ورنہ اسے بھی جہنم بلوا لوں گا۔"

ملازم سمجھ گیا کہ اس لہجے میں بات کرنے والا سرپھرا رب نواز سے بات کر کے ہی رہے گا۔ ایک منٹ بعد رب نواز لائن پر تھا۔ "یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو شاہ عالم؟" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"مجھے تسلیم ہے لیکن میں اچھا کرنے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤ شبنم کہاں ہے؟"

"میرے بیڈ روم میں۔" اس نے ایک فحش بات کی۔

"رب نواز میں سمجھتا ہوں کہ میری طرف سے جتنے تحمل کا مظاہرہ ہو سکتا تھا ہو چکا۔ اب تم اپنے خاندان والوں کی خیر منانے میں جواب دینے کے لیے تیار رہوں۔"

اس نے پُرغرور قہقہہ لگایا۔ "کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ رب نواز کے گھر کے کسی فرد کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔"

"کیا انہیں سات تالوں میں چھپا کر رکھو گے۔ وہ باہر نہیں نکلیں گے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "اس ایک گولی کو صدر کینیڈی کے محافظ بھی نہیں روک پائے تھے جس پر اس کا نام لکھا تھا۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" اس بار اس کا لہجہ مختلف تھا۔

"یہ تو تمہیں بتانا چاہیے۔ میرے درپے تم ہو۔ شبنم کو اس حالت تک پہنچانے اور اسے دوبارہ اغوا کرنے والے بھی تم ہو۔"

"ہاشم رضا کو چھوڑ دو۔ اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"تعلق تو شبنم کا بھی نہیں ہے لیکن تم نے اس کے ساتھ جو کیا ہے وہ شیطان بھی نہیں کر سکتا تھا۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"شبنم آرام سے ہے۔"

"اس میں تمہاری بہتری ہے۔ ہاشم رضا کی واپسی کے لیے تمہیں شبنم کو رہا کرنا ہو گا۔ تم ضمانت دو گے کہ آئندہ بھی تمہاری طرف سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ حادثہ تو کسی کو بھی پیش آ سکتا ہے۔ کیا تم اس کا ذمے دار بھی مجھے ہی قرار دو گے۔"

"صحیح کہا تم نے اگر تمہارے خاندان کے کسی فرد کو کوئی حادثہ پیش آ جائے تو تم یقیناً مجھے الزام نہیں دو گے۔"

"اوکے۔ میں ضمانت دیتا ہوں۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا "یہ بتاؤ کہ تم ہاشم رضا کو کب رہا کر رہے ہو؟"

میں نے قہقہہ لگایا۔ "رب نواز تمہاری ضمانت پر شیطان بھی اعتبار نہ کرے۔"

وہ گالیاں اور دھمکیاں دینے لگا۔ "شاہ عالم یاد رکھو بچو گے نہیں تم۔ تمہارے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے۔"

اس لمحے مجھے مکان کے گیٹ کے آگے ایک گاڑی رکتی نظر آئی جس کے اوپر سرخ اور نیلی روشنیاں گھوم رہی تھیں۔

پولیس کی وین دیکھتے ہی میں نے موبائل بند کروا دیا تھا۔ پولیس وین میں سے ایک موٹا سا اے ایس آئی اترا اگر اس کے وزن میں سے اس کی توند کا گنبد نکال دیا جاتا تو اس میں خاصی کمی آسکتی تھی۔ اس سے پہلے وہ احاطے میں آتا میں خود گیٹ سے باہر آگیا "یس اے ایس آئی۔" میں نے انگریزی میں کہا "اس وقت تمہاری یہاں آمد کا مقصد؟"

میرے حلیے اور انگریزی نے اسے خاصا مرعوب کیا تھا لیکن اس نے توند کے گنبد پر پتلون کے ساتھ خودی کو بھی بلند کرتے ہوئے کہا "سرجی آنا پڑتا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ یہاں پر مشکوک سرگرمیاں جاری ہیں۔"

"مجھے بھی کسی سؤر کے بچے نے فون پر یہی اطلاع دی تھی۔" میں نے بھی آتش زیرپا کا مظاہرہ کرنا ضروری سمجھا۔ "آدھی رات کو بستر سے اٹھ کر اس طرف دوڑتا۔ بڑی رقم خرچ کر رہا ہوں اس مکان کی تعمیر پر۔"

"اچھا جی آپ مالک ہو اس کے؟" اس نے دریافت کیا۔

"ظاہر ہے۔ ورنہ مجھے پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا تھا کہ اتنی رات کو اپنی نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر یہاں آتا۔"

اے ایس آئی کے ساتھ آنے والے سپاہی بلاوجہ دانت نکالنے لگے تھے۔ اے ایس آئی بھی مسکرایا۔

"پھر جی۔ یہاں کوئی ملا؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا "کسی نے شرارت کی تھی۔ اندر بند کمروں میں خاصا سیمنٹ اور سریا پڑا ہے۔ مجھے اس کی فکر تھی لیکن کسی شے کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔"

بظاہر میں پوری طرح بااعتماد تھا لیکن اندر سے میری حالت اتنی اچھی نہیں تھی۔ اندر دو عدد مغوی موجود تھے اور اگر انہیں احساس ہو جاتا کہ باہر پولیس آئی ہے تو وہ اسے متوجہ کرنے کی کوشش ضرور کرتے اور ایسا ہوتا تو میں خاصی مشکل میں پڑ جاتا۔ گرفتار ہونا تو مجھے کسی بھی حالت میں قبول نہیں تھا لیکن اگر میں پولیس سے مار پیٹ کر کے فرار ہو جاتا تو اس سے بھی میرے لیے سنگین مسائل پیدا ہو جاتے۔ مجھے امید تھی کہ اندر اسلم نے انہیں اچھی طرح قابو کر رکھا ہوگا۔ اکرام الدین کے منہ میں کپڑا تھا اور پروفیسر ہاشم رضا سمجھدار آدمی تھا۔ کسی امید کے بغیر وہ کوئی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ کون ہیں جناب؟" اے ایس آئی نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"رانا بشیر احمد۔" میں نے روانی سے ایک فرضی نام بتا دیا "مال روڈ پر میری دکانیں ہیں۔"

"جناب کوئی شناختی کارڈ ہے آپ کے پاس۔" کائیاں اے ایس آئی اپنے شک کا اظہار کیے بغیر اپنی تسلی کر رہا تھا۔

"یار آدھی رات کو آتے ہوئے مجھے شناختی کارڈ کا خیال نہیں رہا۔" میں نے مزید اکتاہٹ آمیز انداز میں کہا "مجھے تو اپنی بیوی کی فکر تھی کہ اتنی رات گئے یوں اٹھ کر دوڑنے پر وہ نہ جانے کیا سمجھے۔ ان عورتوں کا کوئی بھروسا بھی نہیں ہوتا۔"

اے ایس آئی مع پارٹی کے دوبارہ مسکرایا تھا لیکن وہ اپنے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوا تھا۔ "کسی بھی طریقے سے آپ اپنی شناخت کرا سکتے ہیں جناب؟"

"میں کس طریقے سے اپنی شناخت ثابت کروں؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"کوئی معروف بندہ جو آپ کو جانتا ہو۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

میں نے اس بار خفگی دکھائی تھی "کیا مطلب آدھی رات کو میں اپنے کسی جاننے والے کو اٹھا کر کہوں کہ وہ میری شناخت کرا دے۔"

"مجبوری ہے جناب اگر ہم ایسے ہی ہر شخص کی بات کا یقین کرلیں تو کام کرلیا۔ کوئی اپنے منہ سے نہیں بولتا ہے کہ میں بدمعاش ہوں۔"

"میں حلیے اور باتوں سے بدمعاش نظر آتا ہوں!؟" میں نے مزید غصہ دکھایا۔

"سرجی' غصہ نہ کریں۔ مطمئن کرنے کے سو طریقے ہیں۔" اے ایس آئی معنی خیز لہجے میں بولا۔

تب میری سمجھ میں اس کا مطلب آیا۔ اتنی جرح وہ صرف اسی لیے کر رہا تھا کہ میں اس کا مقصد پورا کردوں۔ یعنی رقم سے اس کا منہ بند کردوں۔ اس کی یہاں آمد میں فرض شناسی سے زیادہ مسئلہ زر ملوث تھا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑا "آیئے اس طرف جناب اے ایس آئی صاحب!"

وہ جیسے کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا تھا۔ ایک طرف آنے کا مطلب ہماری پولیس سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ میں نے ایک طرف لے جا کر پانچ سو کا ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا "اب میں کہاں دوسروں کو تنگ کرتا پھروں گا اس سے بندے کی ریپوٹیشن بھی خراب ہوتی ہے۔ آپ یہ رکھ لیں۔"

"میرے ساتھ تین بندے اور بھی ہیں رانا صاحب!" اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

مجھے افسوس ہوا کہ حرام اس حد تک اس کے منہ لگ چکا تھا کہ اب وہ مانگنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ میں نے ظاہر کیا کہ میں بادل ناخواستہ اس کا مطالبہ پورا کر رہا ہوں۔ میں نے پانچ سو کا ایک نوٹ اور دیا جو اس نے اپنی جیب میں منتقل کرلیا۔ حالانکہ یہ نوٹ اس نے اپنے ساتھیوں کے نام پر لیا تھا مگر اس کا ارادہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ یہ نوٹ انہیں دے گا۔ شاید وہ پچاس پچاس روپے پر ٹرخا دے۔ یہ جنگل کے بادشاہ کے موڈ پر ہوتا ہے کہ وہ دوسرے جانوروں کے لیے کتنا حصہ چھوڑتا ہے۔ اے ایس آئی بھی اپنی حد میں شیر تھا۔ وہ گاڑی میں جا بیٹھا "چلو اوئے' ابھی تھانے بھی جانا ہے۔"

موبائل وین کے ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی اسی لمحے مکان کے اندر سے کھٹ کی آواز آئی۔ جو کھلی فضا اور خاموشی میں مجھے واضح سنائی دی تھی۔ میں نے پولیس والوں کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے اے ایس آئی نے میری طرف دیکھا "یہ آواز کیسی تھی جناب؟"

اے ایس آئی تذبذب میں پڑ گیا تھا۔ فرنٹ سیٹ پر ہونے کی وجہ سے اس نے آواز سنی تھی لیکن انجن کے شور میں اسے کم ہی سنائی دی تھی۔ بالآخر اس نے اسے کان کا وہم سمجھا اور گاڑی آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا۔ میں اندر کی طرف لپکا۔ اسلم نے ٹارچ دوبارہ جلالی تھی۔

"یہ آواز کیسی تھی؟" میں نے برہمی سے کہا "ابھی پولیس والے شک میں پڑ جاتے تو مصیبت آجاتی۔"

"یہ حرامی پن کر رہا تھا۔" اسلم نے اکرام الدین کی طرف اشارہ کیا "میں نے اس کے سر پر پستول کا دستہ مارا تھا۔ اس کی آواز آئی تھی۔"

میں نے اکرام الدین کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ بے ہوش تھا۔ ایک لمحے کو مجھے شبہ ہوا کہ اس کی سانس رکی ہے مگر وہ سانس لے رہا تھا۔ اس کی نبض بے ترتیب تھی۔ اسلم نے پستول کا دستہ زیادہ زور سے مارا تھا۔ وہ مر بھی سکتا تھا۔

اگرچہ اکرام الدین رب نواز جیسے شیطان کا کارندہ تھا اور اس کے جرائم اس کی حرکتوں سے عیاں تھے پھر بھی وہ انسان تھا اور اسے یوں بے کسی کی موت نہیں مرنا چاہیے تھا۔ اسے کسی اسپتال تک پہنچانا ضروری تھا مگر اتنی رات گئے میں اسے کہاں لے کر جاتا۔ کسی بھی اسپتال میں لے جاتا تو اس کے علاج سے پہلے مجھ سے سوال و جواب شروع ہو جاتے۔ اچانک مجھے ایدھی والوں کا خیال آیا۔ میں نے ملتان روڈ پر ان کا ایک سینٹر دیکھا تھا۔ میں اکرام الدین کو وہاں لے جا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ لوگ اسے کسی نہ کسی اسپتال تک پہنچا دیتے اور ان کی وجہ سے اس پر توجہ بھی دی جاتی۔

اگرچہ تھکن سے میرا برا حال تھا اور نیند بھی پلکوں پر تکی تھی لیکن ان حالات میں سونا ممکن نہیں تھا۔ میں نے فوری طور پر اسے لے جانے کا فیصلہ کیا۔ جب میں نے اسلم کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ متفکر نظر آنے لگا تھا۔

"دیکھ لیں جی کہیں آپ کسی چکر میں نہ آجائیں اس خبیث کے پتر کے لیے۔"

"کچھ نہیں ہوگا یار۔ بس میں اسے ایدھی سینٹر کے سامنے ڈال کر آجاؤں گا۔ باقی وہ خود دیکھتے رہیں گے۔ اگر اس کی زندگی باقی ہے تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔ اسپتال بھی پہنچ جائے گا اور ڈاکٹر بھی مل جائے گا۔"

اسلم کی مدد سے میں نے اکرام کو گاڑی کی ڈگی میں ڈالا۔ کسی قدر مشکل سے وہ ڈگی میں سما سکا تھا۔ اس میں ہوا کی آمدورفت کے راستے تھے اس لیے مجھے یہ خدشہ نہیں تھا کہ وہ دم گھٹنے سے مر جائے گا۔ اسلم کو ہوشیار رہنے کا کہہ کر میں فوری طور پر روانہ ہوگیا۔ میں اکرام کو جلد از جلد طبی امداد دلانے کا خواہش مند تھا مگر بدقسمتی اسی موبائل کی صورت میں میرے سامنے آئی۔ جو مکان پر آئی تھی۔ وہ غالباً خراب ہوگئی تھی۔ ڈرائیور اسے دیکھ رہا تھا اور توندل اے ایس آئی بیزاری سے ایک طرف ٹہلتے ہوئے گاڑی اور اس کے بنانے والوں کے شجرۂ نسب میں زیادتی کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پھرتی سے سڑک کے درمیان میں آگیا بادل ناخواستہ میں نے کار روکی۔

"اب کیا مسئلہ ہوگیا ہے۔" میں نے جھلائے ہوئے انداز میں کہا "مجھے پہلے ہی خاصی دیر ہوگئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں جی چند منٹ کی اور سہی۔" اس نے بے تکلفی سے کہا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا "مجھے تھانے پر اتار دینا۔ راستے میں پڑتا ہے۔"

جزبز ہوتے ہوئے میں نے سر ہلایا۔ اے ایس آئی نے چلا کر اپنے ماتحتوں سے کہا "اوئے کوئی گاڑی پکڑ کر اس مال کی۔۔ کو تھانے لے آؤ۔"

"خیر سے گاڑی بھی پولیس کی ہے۔" میں نے کہا۔ وہ میرا اشارہ سمجھ گیا تھا لیکن بے غیرتی سے ہنس دیا۔

"بس جی کام چلا رہے ہیں۔ ورنہ باہر کی پولیس کو کیسی شاندار گاڑیاں ملتی ہیں۔"

"ان کی کارکردگی بھی شاندار ہوتی ہے۔" میں نے طنز کیا۔

"بس جی جیسی گاڑی ویسی کارکردگی۔" اس نے دانتوں میں خلال شروع کردیا۔ اس کے منہ سے قورمے کی بو آرہی تھی۔ غالباً گاڑی خراب ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے کھانا کھایا تھا جو یقیناً مال غنیمت میں کسی ہوٹل سے مارلیا گیا تھا۔ میں ہر ممکن تیز رفتاری سے ڈرائیو کررہا تھا۔ مجھے اکرام الدین کی فکر تھی کہ کہیں وہ مر ہی نہ جائے مگر اے ایس آئی کو اچانک سگریٹ یاد آگئے۔ اس نے ٹرکوں کے ایک ہوٹل پر گاڑی رکوائی اور اندازاً دس منٹ بعد سگریٹ کے ساتھ پان بھی بنوا کر لوٹا تھا۔ میرا خون اس دوران میں کھولتا رہا تھا۔

اے ایس آئی کو تھانے کے سامنے اتار کر میں ہر ممکن تیزی سے روانہ ہوا تھا۔ ایدھی سینٹر کے سامنے روشنی کم تھی۔ سینٹر کے احاطے میں دو ایمبولینسز کھڑی تھیں۔ میں نے گاڑی سائڈ میں روک کر ڈکی کھولی۔ اندر اکرام الدین کو ساکت دیکھ کر مجھے شبہ ہوا تھا لیکن اس کی نبض نے تصدیق کردی تھی۔ حیات اس کے جسم سے ناتا توڑ چکی تھی۔ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود میں اسے نہیں بچا سکا تھا۔ موت اپنے اصل وقت پر آگئی تھی۔ میں نے اسے اتارنے کا ارادہ ملتوی کیا اور گاڑی اسٹارٹ کرکے واپس چل دیا تھا۔ راستے میں ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے اکرام الدین کی اکڑی ہوئی لاش نکال کر سڑک کے کنارے ڈال دی۔

جب میں واپس پہنچا تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ اسلم بے چینی سے میرا انتظار کررہا تھا "وہ کہاں ہے؟"

"میں نے ایدھی سینٹر کے سامنے ڈال دیا تھا۔" میں نے اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ اس نے ایک انسانی جان لے لی تھی۔ وہ بلاوجہ ضمیر کی خلش میں گرفتار ہوجاتا۔ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا اس نے وہی کیا تھا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ دو گھنٹے بعد رئیس آجاتا۔ ہاشم رضا قید میں بھی سکون سے گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ سویا تو اسلم بھی نہیں تھا لیکن اسے آرام کا موقع مل گیا تھا۔ لہٰذا جب اس نے مجھے سونے کے لیے کہا تو میں نے حجت نہیں کی۔ کمرے میں پڑی بجری نرم تھی۔ میں لیٹتے ہی سوگیا تھا۔ حتیٰ کہ رئیس نے لات مار کر اٹھایا۔

"اٹھ جائیے عالم پناہ!" اس نے کہا "ورنہ میں دوسری لات ماروں گا۔"

"یہ کیا گدھا پن ہے؟" میں نے خفگی سے کہا۔ سات بج رہے تھے گویا میں صرف تین گھنٹے سویا تھا لیکن اس سے جسم کسی قدر تر و تازہ ہوگیا تھا۔ میں نے اٹھ کر ہینڈ پمپ پر جاکر منہ ہاتھ دھویا۔ رئیس ناشتا لایا تھا۔ میں نے اور اسلم نے ناشتا کیا۔ ہاشم رضا کو ناشتا نہیں دیا کیونکہ رئیس اسے لینے آیا تھا۔ ناشتے کے بعد میں نے اسے باہر لے جاکر رات کے واقعات سنائے۔ اکرام الدین کی موت کا اسے بھی افسوس ہوا تھا لیکن ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک ہی مارے جاتے ہیں "اب تیرا کیا پروگرام ہے؟"

"میں اسلم کے ساتھ جاکر نوادرات کا جعلی ذخیرہ دیکھوں گا۔ ممکن ہے اسے ہم رب نواز کو پھانسنے کے لیے استعمال کرسکیں۔ ہاں تو ذرا چینک لاکر کے بارے میں معلوم کر اور ممکن ہو تو جاکر اس کا معائنہ بھی کرلے۔ دلاور شاہ نے اجازت نامہ لکھ کر ہم پر احسان بھی کیا ہے۔ اس کا فائدہ اٹھا اس سے پہلے کہ اس کا بھتیجا سبحان شاہ کام دکھا جائے۔ مجھے یقین ہے اس لاکر میں رب نواز کے خلاف ثبوت ہوں گے جو دلاور شاہ نے جمع کر رکھے ہیں۔"

"یہ میں کرلوں گا۔" رئیس نے سر ہلایا "اور کچھ۔"

"ہاں یہ رائفل اور پانچ لاکھ روپے بھی لے جا۔ ابھی میرے کسی کام کے نہیں ہیں۔ ایک پستول کافی ہے اور نیلم کے دیئے لاکھ روپے بھی ایسے ہی پڑے ہیں۔ ہاں یہ بتا کہ گاڑی کس نے خریدی ہے۔"

"میں نے لیکن اوپن لیٹر پر ہے۔ کاغذات سارے موجود ہیں۔"

"میں اسے بدلنا چاہ رہا ہوں۔" میں نے کہا "میں کوئی جیپ لینا چاہتا ہوں۔ دیہاتی علاقوں میں وہ زیادہ کام آتی ہے۔"

"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ یہ گاڑی آرام سے ڈھائی لاکھ میں نکل جائے گی۔ جیپ اس سے کم قیمت میں مل جاتی ہے۔"

رئیس ہاشم رضا اور دوسری چیزیں لے کر رخصت ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے تیزی سے وہاں موجودگی کی ہر نشانی مٹائی۔ سارا سامان گاڑی میں رکھا جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو سورج کی روشنی پھیل رہی تھی۔ موسم میں گرمی کی شدت کم ہوئی تھی۔ گاڑیوں کے شوروم کھلنے میں ابھی تین چار گھنٹے باقی تھے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ ہمیں کچھ دیر کسی ہوٹل میں قیام کرنا چاہیے۔ آرام کے بعد ہی ہم اسلم کے ماموں کے گاؤں تک سفر کے قابل ہوں گے۔ ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں بغیر کسی سوال و جواب کے ہمیں ایک ڈبل بیڈ والا روم مل گیا۔ میں نے فوری طور پر غسل کیا اور جب باہر نکلا تو اسلم بے خبر سو رہا تھا۔ کاؤنٹر کلرک کو میں نے دو بجے اٹھانے کو کہا اور میں خود بھی سوگیا۔

دو بجے ایک ویٹر نے دروازے پر دستک دے کر ہمیں جگایا۔ میں نے اسے لنچ لانے کو کہا۔ اسلم بھی اتنی دیر سو کر تازہ دم ہوگیا تھا مگر کھانا کھانے کے بعد وہ دوبارہ سوگیا اور میں کمرا لاک کرکے نیچے آگیا۔ لاہور میں گاڑیوں کی خرید و فروخت کا مرکز کھل چکا تھا۔ میں نے ایک شوروم کے سامنے کار روکی تو بیک وقت دو سیلز مین میری طرف لپکے۔ پہلے پہنچنے والا کامیاب رہا "فرمایئے سر کیا خدمت کریں۔ گاڑی بیچنی ہے یا خریدنی ہے۔"

"دونوں کام کرنے ہیں۔" میں نے گاڑی سے اتر کر کہا۔

"آیئے اندر آئیں۔" اس نے کہا اور مجھے اندر لے آیا۔ ایک بچے کو اس نے ٹھنڈی بوتل لانے کے لیے کہا "جی اب بتایئے آپ کون سی گاڑی پسند کریں گے۔"

میں نے اس شوروم کے سامنے گاڑی اس لیے روکی تھی کہ وہاں مجھے ایک سیاہ رنگ کی سنگل کیبن جیپ کھڑی نظر آئی تھی۔ اس کا پچھلا حصہ کورڈ تھا اور عقب میں کھلنے والا ڈبل ڈور بھی تھا۔ دائیں ڈور پر فاضل ٹائر لگا تھا اور جیپ اچھی حالت میں نظر آرہی تھی "مجھے کوئی مناسب جیپ چاہیے۔ بے شک ماڈل پرانا ہو لیکن کنڈیشن اچھی ہونی چاہیے۔" وہ کھل اٹھا تھا "لیں جی آپ کے مطلب کی شے ہمارے پاس ہے۔"

وہ مجھے جیپ کے پاس لایا "یہ مٹسوبشی کا ماڈل ہے۔ چار سال پہلے کا ہے لیکن بہترین حالت میں۔ ایئرکنڈیشنر اور ڈیک بھی لگا ہے۔ انجن پانی کی طرح چلتا ہے۔ پیٹرول انجن ہے اس کی ریس آپ چلا کر ہی دیکھ سکتے ہیں۔"

اس نے مجھے ٹرائی کرائی۔ واقعی جیپ بہترین حالت میں تھی۔ فور ویل ڈرائیو ہونے کی وجہ سے ناہموار راستوں کے لیے مثالی تھی۔ عقبی حصہ کورڈ ہونے کی وجہ سے ہم اپنا سامان بھی رکھ سکتے تھے۔ اندر سے بھی جیپ کی حالت بہترین تھی اور ٹائر نئے تھے لیکن اس نے قیمت ذرا زیادہ بتائی تھی۔ وہ اس کے ساڑھے تین لاکھ مانگ رہا تھا۔ جبکہ میری کار کے اس نے دو لاکھ چالیس ہزار لگائے تھے۔ یعنی مجھے مزید ایک لاکھ دس ہزار روپے دینا تھے اور میرے پاس تقریباً اتنی ہی رقم تھی۔ خاصی بحث کے بعد طے پایا کہ میں گاڑی کے علاوہ مزید نوے ہزار روپے دوں گا تو وہ کاغذی کارروائی ابھی کروادے گا۔ پانچ بجے میں شوروم سے جیپ لے کر نکلا تھا۔

اسلم جاگ گیا تھا اور میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم اس کے ماموں کے گاؤں جارہے ہیں تو وہ خوش ہوگیا تھا۔ وہ دو دن سے ایک ہی جوڑا پہنے ہوئے تھا۔ ہوٹل سے نکل کر ہم نے ایک ریڈی میڈ گارمنٹس سینٹر کا رخ کیا۔ اسلم شلوار قمیص پہنتا تھا۔ اس نے دو سوٹ لیے۔ میں نے بھی دیہاتی علاقے کی مناسبت سے شلوار کرتے لے لیے تاکہ نمایاں نہ لگوں۔ سر پر میں نے کڑھی ہوئی سندھی اسٹائل کی ٹوپی لی اور آنکھوں پر بڑے سیاہ شیشوں کی عینک لگالی۔ اس سے میرا حلیہ خاصی حد تک مختلف ہوگیا تھا۔

اسلم میری ہیئت کذائی دیکھ کر ہنسنے لگا تھا "آپ تو سندھی وڈیرے لگ رہے ہیں۔"

"بابا ہم مذاق پسند نہیں کرتے۔" میں نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ دو دن کی شیو نمایاں ہونے سے فرنچ کٹ کا تاثر کم ہوگیا تھا اور میں سچ مچ کسی سندھی وڈیرے سے مشابہ لگ رہا تھا۔

راوی کا پل پار کرکے ہم نے فیروز پور روڈ کی طرف سفر جاری رکھا۔ یہ سڑک سیدھی بھارت کے شہر فیروز پور تک جاتی تھی۔ اسلم کے ماموں کا گاؤں اسی سڑک پر واقع تھا۔ جب ہم لاہور سے نکلے تو سورج غروب ہوچکا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا۔ رات کو ہماری طرف کوئی توجہ نہ دیتا اور میں رات میں ہی نوادرات دیکھ کر واپس آسکتا تھا۔ میرے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔ اگر ان نوادرات میں سے کچھ ان نوادرات سے مشابہ نکل آتے جو لندن میں عاقل کے پاس تھے تو میں سبحان شاہ اور رب نواز کو آپس میں کتوں کی طرح لڑوا سکتا تھا۔ دونوں ہی چھ لاکھ پاؤنڈز کے ان نوادرات کے پیچھے پاگل ہورہے تھے۔ میں ان کے پاگل پن سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ رات نو بجے کے قریب ہم اسلم کے ماموں کے گاؤں پہنچے۔ یہ مختصر سا گاؤں تھا جس میں بمشکل سو سوا سو گھر تھے اور یہ پکی سڑک سے کوئی دو میل مغرب میں تھا۔ گاؤں تک کا راستہ بے حد خراب تھا۔ اگر جیپ نہ ہوتی تو جھٹکوں سے ہمارا برا حال ہوجاتا۔

اسلم نے موقع پاکر راستے میں مجھے اپنی داستان حیات سنائی تھی۔ اس کا باپ تانبے کے برتن بنایا کرتا تھا اس کا ہنر دیکھ کر رب نواز نے اس سے کام لینا شروع کردیا۔ لاہور میوزیم میں موجود قدیم دور کے تانبے کے برتنوں اور نوادرات کی وہ ہو بہو نقل تیار کرنے لگا تھا۔ بعد میں اس نے برتنوں اور نوادرات کو قدیم بنانے کے کچھ دیسی نسخے ایجاد کیے تھے۔ وہ برتنوں کو زمین میں دبا کر اور بعض اقسام کے تیزابوں کی مدد سے ایسی صورت دے دیا کرتا تھا کہ وہ صدیوں پرانے نظر آتے تھے۔ نوادرات کی بین الاقوامی مارکیٹ میں

ان کی قیمت بہت زیادہ مل جاتی تھی۔ اسلم کے باپ نے پورے بیس برس رب نواز کے لیے کام کیا تھا اور رب نواز نے اسے بھرپور معاوضہ تو ایک طرف رہا اتنا بھی نہیں دیا تھا کہ اس کا خاندان دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھا سکتا۔ مسلسل بھٹی کے زہریلے دھوئیں میں کام کرنے سے رفتہ رفتہ اس کی بینائی جواب دیتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ وہ کام کرنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا یعنی اسلم۔ باپ کا حشر دیکھ کر اس نے اپنا آبائی کام کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی۔ کچھ عرصے اس نے ایک دو جگہوں پر ملازمتیں بھی کیں مگر زیادہ تر بے روزگار ہی رہا تھا۔ جب خاندان میں فاقوں کی نوبت آ گئی تو اسلم کے باپ نے زندگی میں پہلی بار جسارت سے کام لیا۔ رب نواز بغیر مطلب کے کسی کو دو روپے دینے والا نہیں تھا۔ دو لاکھ روپے دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر اسلم کے باپ نے حماقت کرتے ہوئے ملک رب نواز کو دھمکی دی تھی اس کے بعد وہ یوں غائب ہو گیا جیسے اس کا وجود ہی نہیں تھا۔ ملک رب نواز نے اسلم کو بلا کر دھمکی دی کہ وہ اس معاملے کو پولیس تک لے جانے کی کوشش نہ کرے ورنہ اس کا بھی اس کے باپ جیسا انجام ہوگا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ باپ کا انجام دیکھ کر اسلم کو عقل آ جاتی مگر انتقام نے اسے بھی پاگل کر دیا۔ اس نے ملک رب نواز کے خلاف باپ کے اغوا اور قتل کی ایف آئی آر درج کرانے کی کوشش کی ایف آئی آر تو درج نہیں ہوئی مگر اس رات رب نواز کے کتے اسلم کے گھر آن پہنچے۔ اس کی ماں اور چار بہنیں گھر میں تھیں۔ ان کے ساتھ درندگی آمیز سلوک کرنے کے بعد انہیں قتل کر دیا گیا۔ اسلم اس رات نوادرات کے چکر میں ماموں کے گھر تھا اس لیے بچ گیا۔ اگلے روز وہ گاؤں گیا تو ماں اور بہنوں کی لاشیں دیکھ کر پاگل ہو گیا تھا۔ اگر اس کا ماموں اسے وہاں سے نہ لے جاتا تو وہ بھی رب نواز کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اگلے روز وہ ماموں کے گھر کو چھوڑ کر لاہور آ گیا تھا تاکہ مجھے تلاش کر سکے۔

"ناصر صاحب! اس کتے کے بچے نے مجھے تباہ کر دیا ہے۔" وہ دہاڑیں مار کر رونے لگا تھا "میں اس کے پورے خاندان کو ختم کر دوں گا۔"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا "تم اس صورت میں بدلہ لے سکو گے جب خود کو اس کے قابل بنا لو۔ ابھی تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

اس نے آنسو پونچھ لیے تھے۔ اسلم کے ماموں کے گھر کی طرف جانے والا راستہ قبرستان کے بیچ سے گزر رہا تھا۔

رات ہوتے ہی شہرِ خموشاں میں گہری خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ ماحول بھوت اور چڑیلوں کے شو کے لیے نہایت سازگار تھا۔ پس منظر میں کوئی "الو" بار بار اس طرح آواز نکال رہا تھا جیسے گاؤں کا چوکیدار "جاگتے رہو" کی صدائیں دیتا ہے۔ معاً میری نگاہ دائیں طرف کسی سفید سی شے پر پڑی جو تیزی سے کسی قبر کی اوٹ میں چلی گئی تھی۔ میں نے یک دم بریک لگائے تو اسلم نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے جناب گاڑی کیوں روکی ہے؟"

"اس طرف کوئی ہے۔" میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے جناب! یہ کیا کر رہے ہیں۔ یہ قبرستان ویسے ہی آسیب زدہ ہے۔"

"دیکھنے میں کیا حرج ہے ممکن ہے کوئی کفن چور ہو۔" میں جیپ سے اتر آیا تھا۔ اسی لمحے کوئی تیزی سے اچھل کر بھاگا تھا۔ میں نے ہانک لگائی "خبردار گولی مار دوں گا۔" لیکن وہ رکا نہیں۔ وہ بے فکری سے قبریں پھلانگتا ہوا جنوب کی طرف جا رہا تھا جس طرف گاؤں تھا۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس کی طرح قبروں کے درمیان پیر رکھ کر اس کا تعاقب کرتا اور اس کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے تیزی سے جیپ اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔ قبرستان سے باہر آتے ہی میں نے جیپ اس طرف موڑ دی جس طرف وہ شخص بھاگا تھا۔ روشنی میں وہ کوئی فرلانگ بھر آگے نظر آیا تھا مگر ریس میں جیپ سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ایک منٹ میں جالیا تھا اسے۔ جیپ سر پر دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی۔

"تو۔ تو۔ میرا پیچھا کیوں کر رہا ہے۔" اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تمہاری صورت دیکھنے کو دل چاہ رہا تھا۔" میں نے کہا اور اسلم سے بولا "اس کی تلاشی لو۔"

"خبردار میرے نزدیک نہ آنا۔" اس نے چلا کر کہا لیکن پستول کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

اسلم نے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب سے ایک گراری والا خنجر اور کچھ رقم نکلی تھی لیکن اہم ترین شے ایک ننھا سا پیتل کا حقہ تھا۔ بمشکل چھ انچ لمبا یہ حقہ کاریگری کا شاہکار تھا۔ حقہ دیکھتے ہی اسلم پر جنون سا طاری ہو گیا تھا۔ اس نے اس نوجوان کا گلا دبوچ لیا تھا "یہ تیرے پاس کہاں سے آیا۔ بول؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر اس کی رانوں کے درمیان گھٹنا مارا تھا۔ وہ تڑپ کر زمین پر

اور لوٹ پوٹ ہونے لگا تھا۔

"ہائے میرے ربا۔" اس نے واویلا مچایا تو میں نے پستول کی نال اس کے کھلے منہ میں گھسیڑ دی۔

"اس نے صرف ایک ضرب لگائی ہے، میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ اگر جواب نہ ملے تو گولی مار دیتا ہوں۔ جلدی سے بکو۔ یہ حقہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟" میں نے پستول منہ سے نکال کر اس کی پیشانی سے لگا دی۔

"بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔" اس نے لرزتی آواز میں کہا "خدا کے لیے پستول تو ہٹاؤ۔"

"میں صرف تین تک گنوں گا۔" میں نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں اور گنتی شروع کر دی۔

"بتاتا ہوں۔" اس نے بوکھلا کر کہا "یہ مجھے شوکے نے دیا ہے۔"

اسلم چونکا "کون شوکا، شوکت علی؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا "اکرم علی کا پتر۔"

"یہ شوکا کون ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے ماموں کا بیٹا۔" اس نے فکرمندی سے کہا اور اس سے پوچھا "یہ حقہ لے کر کہاں جا رہے تھے؟"

وہ اب بھی مزاحمت کر رہا تھا لیکن میرے ہاتھوں تھوڑی مار کھا کر اس نے اگل دیا کہ شوکے نے اس کی مدد سے اپنے ہی گھر میں نقب لگائی تھی اور نوادرات کا ذخیرہ اڑا لیا تھا۔ بے چارہ اکرم علی سمجھ رہا تھا کہ اس کے گھر سچ مچ چوری ہو گئی ہے اور وہ پریشان تھا کہ اسلم کو کیا منہ دکھائے گا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ چوری گھر کے بھیدی نے کی ہے۔

"نوادرات کہاں ہیں؟" اسلم نے اس کو ٹھوکر ماری۔

"مجھے نہیں معلوم۔ شوکے نے کہیں رکھے ہیں۔"

"جھوٹ مت بول۔" اسلم نے اس پر ٹھوکروں کی بارش کر دی تھی "تو قبرستان میں کیا کر رہا تھا۔ اپنی ماں کی قبر تیار کر رہا تھا؟"

اس نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی کہ وہ وہاں پیشاب کرنے گیا تھا لیکن بالآخر اسلم کی ٹھوکروں سے اپنے دو دانت اور ناک تڑوانے کے بعد اس نے زبان کھول دی تھی۔ چوری شدہ نوادرات انہوں نے ایک پرانی قبر میں چھپا دیے تھے لیکن یہ نہیں بتایا کہ رات کو اس وقت وہ قبرستان میں کیا کر رہا تھا۔ یہ بات اس نے اپنی ایک پسلی ٹوٹنے کے بعد بتائی تھی۔ وہ شوکت علی کو بھی ڈبل کراس کر رہا تھا اور اس نے نوادرات چرا کر ایک دوسری قبر میں چھپا دیے تھے۔ یہ حقہ اس نے نمونے کے طور پر پاس رکھ لیا تھا۔ اس کا نام علی احمد تھا اور اس کے روابط سرحد پار کے جرائم پیشہ عناصر سے تھے اس نے ان سے ان نوادرات کا سودا کر لیا تھا۔

"تم یہ حقہ انہیں دکھانے کہاں لے جا رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ذرا آگے چوہدری رحمت الٰہی کا ڈیرا ہے۔ وہ لوگ وہیں ٹھہرے ہیں۔"

اسلم بے حد غصے میں تھا۔ وہ اسے گولی مار دینا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا "اس کا حساب بھی شوکت علی کے ساتھ ہی کریں گے۔ ابھی تو اس کے ساتھ چل کر نوادرات نکالتے ہیں۔"

علی احمد مضحکہ خیز آواز میں روتا بادلِ ناخواستہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوا تھا اسے یقین تھا کہ ہم جیسے سفاک لوگ قبر سے نوادرات نکال کر اسے دفن بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر اس نے چال چلنے کی کوشش کی تو ہم ایسا ہی کریں گے۔ کھدائی کے اوزار اس نے قبرستان میں ہی ایک جگہ چھپا دیے تھے۔ ٹوٹی پسلی کے ساتھ اس کے لیے کھدائی مشکل کام تھا لیکن اسلم نے اسے برابر کام میں شریک رکھا۔ نوادرات ذرا ہی نیچے بوریوں میں بھر کر دفن کیے گئے تھے۔ یہ کل چار بوریاں تھیں۔ اسلم نے انہیں اٹھا کر جیپ کے عقبی حصے میں رکھا۔ کھدائی کے دوران وہ مٹی میں اٹ گیا تھا۔ علی احمد کا دہشت سے برا حال تھا۔ جب میں نے مذاق میں کہا۔

"چل بھئی اب قبر میں خالی جگہ لیٹ جا۔ اسے یونہی خالی تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"خدا کے لیے مجھے مت مارو۔" اس نے چلا کر کہا ناک ٹوٹ جانے کے بعد اس کی آواز میں منمناہٹ آ گئی تھی۔

"ہم کہاں سے ماریں گے یہ تو خدا کا کام ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

جب میں نے اسے جیپ میں بیٹھنے کے لیے کہا تو اس کی جان میں جان آئی تھی۔ میرا ارادہ اب اسلم کے ماموں کے گھر جانے کا تھا۔ میں احمد علی کا سامنا شوکت علی سے کرانا چاہتا تھا۔ خود اسلم کا بھی یہی خیال تھا۔ اس کے ماموں کا گھر گاؤں سے ذرا ہٹ کر تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ کوئی ہماری آمد سے واقف نہیں ہو سکتا تھا جیپ کی آواز سن کر گاؤں کے کتے استقبال کے لیے دوڑے تھے لیکن ان سے پہلے ہی اسلم کا ماموں باہر نکل آیا تھا۔ اس نے لاٹھی اٹھا رکھی تھی۔ اسلم جیپ سے اترا تو وہ پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس نے کتوں کو ڈانٹ کر بھگایا۔

"اسلم پتر! اس ویلے۔"

"ہاں ماما۔ میں نے سوچا اپنی امانت لے جاؤں۔"

"امانت!" وہ مزید پریشان نظر آنے لگا "پتر اندر تو آؤ امانت بھی لیتے رہنا۔"

"امانت میں پہلے ہی لے چکا ہوں۔" اسلم نے اس بار زہریلے لہجے میں کہا "شوکا کہاں ہے؟"

"وہ تو سو رہا ہے۔" ماے نے کہا "اور یہ تو کس انداز میں بات کر رہا ہے؟"

"اسے جگاؤ۔ اس کے ایک یار کو لے کر آیا ہوں۔" اسلم نے علی احمد کو جیپ سے باہر کھینچا۔

"یہ تیرے ساتھ کہاں سے آیا؟" ماے نے حیرت سے کہا "یہ تو زخمی بھی ہے۔"

"چاچا مجھے ان لوگوں سے بچاؤ۔ یہ مجھے مار دیں گے۔" اس نے چلا کر کہا۔

"ابھی کہاں مارا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی "ابھی سب مل کر ماریں گے۔"

شور سن کر اندر سے ایک لمبا تڑنگا نوجوان باہر آیا۔ اس کے لمبے بال اور چہرے پر زخموں کے نشانات اس کے بدمعاش ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ اس نے اسلم کو دیکھ کر کہا "کیا بات ہے یہ آدھی رات کو کیا رولا پایا ہے۔"

"رولے کی اولاد۔" یک دم اسلم نے اسے گریبان سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور اس پر بے دریغ ٹھوکریں برسانے لگا۔

"اوئے۔ یہ کیا کر رہا ہے اسلم۔" ماے نے چلا کر آگے بڑھنا چاہا لیکن میں نے پستول دکھا کر اسے روک لیا۔

"آرام سے ماما جی۔ ابھی میں تمہیں اس کے کرتوت اس کے دوست کی زبانی سنواتا ہوں۔ شروع ہو جاؤ۔" میں نے پستول کا رخ علی احمد کی طرف کیا تو اس نے لائق طالب علم کی طرح فر فر سبق سنانے کے انداز میں بولنا شروع کر دیا۔ ماما جی کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔ پوری بات سن کر اس نے اپنے بدمعاش بیٹے کی طرف دیکھا جس کی ساری بدمعاشی اسلم نے نکال دی تھی۔ اب وہ زمین پر لوٹتے ہوئے اس کی ٹھوکروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اسلم کی تبدیلی پر حیرت تھی کل تک وہ مسکین سا اور کمزور نوجوان تھا لیکن اس وقت وہ پوری دل جمعی سے اپنے ماموں زاد کی مرمت لگا رہا تھا۔ اس سے زیادہ لمبا تڑنگا شوکا اس کے سامنے بے بس نظر آ رہا تھا۔ احمد کی زبانی اپنے بیٹے کے کرتوت سن کر ماما بھی غصے سے بے قابو ہو گیا تھا اس نے ہاتھ میں پکڑی لاٹھی سے اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ لاٹھی کی مار زیادہ سخت تھی اس کی چیخ و پکار سن کر اندر سے اس کی ماں نکل آئی۔ اس نے شوہر کو روکنے کی کوشش کی تو اس نے اسے دور جھٹک دیا تھا۔

"مجھے مت روک' اس خبیث نے مجھے اسلم کے سامنے شرمندہ کیا ہے آج میں اس کے ہاتھ پیر توڑ دوں گا۔"

میں دیکھ چکا تھا کہ شوکت کو اس کے کیے کی خاصی سزا مل چکی ہے۔ لہٰذا میں نے ماما جی کو روک دیا "ابھی نہیں ابھی ہمیں اس کی ضرورت ہے۔ بعد میں بے شک تم اس کی ٹانگیں توڑتے رہنا۔"

"آپ کا کیا ارادہ ہے؟" اسلم نے میری طرف دیکھا۔ میں اسے ایک طرف لے گیا "میں ذرا چوہدری رحمت الٰہی کے سرحد پار مہمانوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیوں؟"

"اگر وہ یہ نوادرات خرید لیں تو ہمارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔" میں نے کہا "تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔"

"اچھا خیال ہے جی۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"ہم شوکت کو آگے رکھیں گے۔" میں نے کہا۔ اتنی دیر میں میں سوچ چکا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میں نے واپس آ کر شوکت علی اور علی احمد کو اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا تو وہ خوف زدہ نظر آنے لگے تھے۔ احمد بلبلا کر بولا "نہ جی' رحمت الٰہی خطرناک آدمی ہے اپنے ساتھ دھوکا کرنے والے کو زندہ نہیں چھوڑتا۔"

"ہم اس سے سودا کریں گے' دھوکا نہیں۔" میں نے جواب دیا "بس رقم تمہاری جیب میں نہیں جائے گی۔ اس کا اصل حق دار اسلم ہے۔"

وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ بادل ناخواستہ انہوں نے چلنے پر رضامندی ظاہر کی۔ شوکت نے خبردار کیا "دیکھیں جی' چوہدری اور اس کے مہمان آپ کو نہیں جانتے۔ اگر انہوں نے سودے سے انکار کیا تو ہماری کوئی ذمے داری نہیں ہو گی۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" میں نے سکون سے جواب دیا۔ "ہم نوادرات واپس لے جائیں گے لیکن تم نقصان میں رہو گے اگر کسی آدمی کے گھٹنے پر گولی ماری جائے تو وہ باقی ساری عمر لکڑ بھگے کی طرح چلتا ہے۔"

"آپ... آپ... مجھے گولی... مار دو گے؟" اس نے ہکلا کر کہا۔

"اگر سودا نہ ہوا۔ ورنہ تم دونوں پیر سلامت لے کر اپنے گھر آؤ گے۔"

"دیکھیں جی اس سے قصور ہوا ہے پر اسے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔" ماے نے کہا۔ اس کی بیوی اندر جا چکی تھی ورنہ میری دھمکی سن کر وہ زیادہ واویلا کرتی۔

"سزا اسے ملے گی کام نہ کرنے کی۔ جہاں تک چوری کا تعلق ہے تو اس کی معافی کا اختیار اسلم کو ہے۔ اگر یہ چاہے گا تو معاف کر دے گا۔"

"اگر یہ رحمت الٰہی سے سودا کرا دے تو میں اسے معاف کر دوں گا۔" اسلم نے ماما کی طرف دیکھا۔

ان دونوں کو جیپ میں لاد کر ہم چوہدری رحمت الٰہی کے ڈیرے کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک نیم پختہ سی عمارت تھی۔ جیپ کی آواز سن کر ایک مسلح شخص سامنے آیا "کون ہے؟" اس نے کڑک کر کہا۔

شوکت علی جیپ سے نیچے اترا "چوہدری صاحب کو بولو شوکا آیا ہے مال لے کر۔"

"چوہدری صاحب سو رہے ہیں۔ تم صبح نہیں آ سکتے تھے۔" پہرے دار نے روکھے انداز میں کہا۔

"او یار! اس قسم کے دھندے دن کی روشنی میں نہیں ہوتے۔ تیری مرضی نہ جگا چوہدری صاحب کو بعد میں خود ہی جواب دیتے رہنا۔"

"ایک منٹ!" پہرے دار تذبذب میں پڑ گیا تھا "میں دیکھتا ہوں۔" شوکت علی باہر کھڑا تھا۔ میں نے اسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ وہ مسلسل میرے نشانے پر رہے گا۔ اگر اس نے گڑبڑ کرنے کی کوشش کی تو میں بے دریغ اس کا سر اڑا دوں گا۔ خوف سے اس کی حالت بری ہو گئی تھی۔ جب میں نے سائلنسر لگے پستول سے فائر کر کے اس کے گھر کی منڈیر پر رکھے پانی کے پیالے کو اڑا دیا تھا۔ اس نے مجھے تابعداری کا یقین دلایا تھا۔ علی احمد جیپ میں دم سادھے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد اندر سے پہرے دار کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص برآمد ہوا۔ اس نے لالٹین اٹھا رکھی تھی۔ صحت زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن بھاری بھرکم مونچھوں سے اس نے خود کو کسی قدر بارعب بنا رکھا تھا۔ اس نے آتے ہی اکڑے ہوئے انداز میں کہا۔

"کیا بات ہے شوکے' اب تو مجھے سوتے سے اٹھانے لگا ہے۔"

"چوہدری صاحب۔ میں مال لے آیا ہوں۔ سودا آج رات ہی کرنا ہے۔"

مال کے نام پر اس کے چہرے پر کسی قدر نرمی آئی تھی "اندر آ جاؤ اور جیپ کو احاطے میں لے آؤ۔" پھر اس کی نظر ہم لوگوں پر پڑی "یہ کون ہیں؟"

"میرے ساتھی ہیں جی۔ مال اصل میں انہی کا ہے۔"

چوہدری کے چہرے پر سختی نمودار ہوئی تھی "تو نے تو کچھ اور ہی کہا تھا۔"

"ان کے کہنے پر ہی کہا تھا۔ پہلے یہ سامنے نہیں آنا چاہتے تھے اب خود چلے آئے۔"

"ہم انہیں نہیں جانتے" چوہدری کے لہجے میں برہمی تھی "تو ہر ایرے غیرے کو اٹھا کر لے آتا ہے۔"

میں جیپ سے اتر کر چوہدری کے سامنے جا کھڑا ہوا "رحمت الٰہی اگر تمہیں مال نہیں لینا ہے تو مت لو مگر لہجہ سنبھال کر بات کرو۔"

وہ میرے انداز سے دب گیا تھا "دیکھو جی' اس کام کے کچھ طریقے ہیں۔"

"میں طریقے تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ یہ چھوٹی سی کھیپ ہے۔ میں اس سے کہیں زیادہ مال یورپ اور امریکا بھیج چکا ہوں۔"

"اچھا اچھا ناراض مت ہو اندر آ جاؤ۔ جیپ بھی اندر لے آؤ۔" اس نے دوسری بار کہا تو میں کھٹک گیا تھا۔ آخر وہ جیپ کے اندر لے جانے پر اتنا اصرار کیوں کر رہا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آؤ مال دیکھ لو اور سودا کر لو۔" اس سے پہلے کہ وہ مجھے روکتا میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے جیپ کے عقبی حصے کی طرف لے آیا۔ دروازہ کھول کر میں نے علی احمد سے مال نکالنے کو کہا۔ اس نے بوری سے تانبے کے برتن نکالنا شروع کر دیے اور شوکت علی انہیں چوہدری رحمت الٰہی کو دکھانے لگا۔ اس نے ابھی تک اصل خریداروں کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ خود ان کا سودا کر کے انہیں آگے بیچنا چاہتا تھا۔ رحمت الٰہی جس ماہرانہ انداز میں تانبے سے بنے ان جعلی نوادرات کا معائنہ کر رہا تھا اس سے لگتا تھا کہ اسے اس کام کی شد بد ہے۔ اسلم نے اسے بتایا کہ یہ کل ایک سو بارہ پیس ہیں۔

"بین الاقوامی منڈی میں ان کی قیمت کم سے کم پچاس ہزار ڈالرز ہو گی۔ ایک لاکھ ڈالرز بھی مل سکتے ہیں۔ اگر تم مقامی طور پر بیچو تو کم از کم پانچ لاکھ روپے ملیں گے۔"

"یہ سب نمبر دو ہیں۔" اس نے سپاٹ سے لہجے میں کہا "میں تمہیں اس کے دس ہزار روپے دے سکتا ہوں۔"

"دو نمبر مال۔" میں نے طنز کیا "ذرا ان کی نفاست دیکھو۔ دس ہزار سے زیادہ تو ان کی بنوائی پر خرچ ہوئے ہیں۔ شاید تم لینا نہیں چاہتے۔" میں نے علی احمد اور شوکت سے

انہیں واپس رکھنے کو کہا۔

"ایک منٹ اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بیس ہزار دوں گا۔"

"دولاکھ روپے سے ایک پیسہ کم نہیں لوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اس سے زیادہ تو لاہور میں مل جائیں گے۔"

"چلو پچاس ہزار لے لو۔" چوہدری رحمت الٰہی بولا۔

اسی لمحے ڈیرے میں سے تین افراد نمودار ہوئے ان میں سے آگے والے نے ایک خطرناک رائفل اٹھا رکھی تھی۔

"کوئی جرورت نہیں ہے چوہدری۔" رائفل بردار نے کہا "ہم یہ سب ایسے ہی لے جائیں گے۔"

"ایک منٹ مجھے بات کرنے دو۔" رحمت الٰہی گھبرا گیا تھا "اس کی ضرورت نہیں ہے۔"

"یہ لوگ اپنی اوقات سے آگے بڑھ رہے ہیں۔" رائفل بردار نے جواب دیا "چلو ہاتھ اپنی منڈی پر رکھ لو۔"

"یہ تم اچھا نہیں کر رہے ہو چوہدری۔" میں نے ہاتھ سر پر رکھ لیے تھے میری دیکھا دیکھی اسلم نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے تھے "کاروبار میں اس طرح کی بے ایمانی ہونے لگے تو پھر کاروبار نہیں چلتا۔"

"ہمیں اس کی جرورت بھی نہیں ہے۔" رائفل بردار کے لہجے میں مکاری تھی۔ وہ واضح طور پر بھارتی باشندہ تھا اس کے لہجے سے واضح تھا "تم لوگ باقی ہی نہیں رہو گے جو کسی کو بے ایمانی کے بارے میں معلوم ہو۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے چوہدری۔" شوکت گھبرا گیا تھا۔

"آگے آؤ۔" رائفل بردار نے اپنے ساتھیوں سے کہا "ان کی تلاشی لو۔"

اس کا ایک ساتھی اسلم کی طرف بڑھا اور دوسرا میری طرف آیا تھا۔ دونوں بدمعاش تھے لیکن زیادہ عقل مند نہیں تھے۔ میری طرف آنے والے نے میرے اور رائفل بردار کے درمیان میں حائل ہونے کی حماقت کی اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی طرف کھینچا اور رائفل بردار پر دے مارا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ دونوں زمین پر جا گرے تھے۔ چوہدری رحمت الٰہی کا پہرے دار اپنے شانے سے ننگی رائفل اتار رہا تھا لیکن اس سے پہلے ہی میں نے پستول نکال کر اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے بازو میں لگی تھی

"بس۔" میں نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا "اب کسی نے ذرا سی بھی حرکت کی تو میں سر میں سوراخ کردوں گا۔"

پہرے دار بازو پکڑ کر واویلا کر رہا تھا۔ اسلم نے پھرتی سے اس کی سیون ایم ایم اٹھالی تھی استعمال تو اسے کرنا نہیں آتی تھی لیکن وہ دوسروں کو دھمکا ضرور سکتا تھا۔ رائفل بردار کی رائفل اس سے صرف دو گز دور پڑی تھی لیکن میری دھمکی اور پہرے دار کے واویلے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ساکت رہے۔ میں نے اس کی رائفل بھی اپنے قبضے میں کرلی تھی۔ چوہدری اور اس کے بھارتی مہمانوں سے زیادہ خراب حالت شوکت اور علی احمد کی ہو رہی تھی۔ وہی ہمیں یہاں لائے تھے ہم انہیں چھوڑ بھی دیتے تو چوہدری نہ چھوڑتا۔ رائفل لے کر میں نے پستول جیب میں رکھ لیا تھا۔ یہ بھارتی ساخت جی تو آٹومیٹک تھی جو عام طور سے فوج کو دی جاتی تھی ایک جرائم پیشہ شخص کے پاس اس کی موجودگی حیران کن تھی۔

"اندر چلو۔" میں نے کہا "اندر اور کون ہے؟"

"صرف دو نوکر ہیں۔" چوہدری بولا "ان کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

میں نے اسے دھمکایا "اگر کوئی اور نکلا تو سب سے پہلے تم مارے جاؤ گے۔"

ڈیرا کل تین کمروں پر مشتمل تھا۔ درمیان میں ایک ہال نما کمرا تھا جس میں نصف درجن چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اس پر دو افراد بیٹھے تھے۔ اپنے آقا کو بے بس دیکھ کر وہ بھی اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ باقی دو کمرے ذرا اچھے انداز میں سجے ہوئے تھے اور خالی تھے وہاں واقعی کوئی اور نہیں تھا۔ میرے اشارے پر شوکت نے رسی تلاش کی اور باری باری ان سب کو باندھ دیا۔ چوہدری اور اس کے رائفل بردار بھارتی مہمان نے خاصی مزاحمت کی اور شور مچانے کے ساتھ دھمکیاں بھی دی تھیں مگر انہیں ہاتھ بندھوانے ہی پڑے تھے۔ میں ذرا آرام سے ان لوگوں سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس رائفل نے مجھے چونکا دیا تھا۔ عام اسمگلر اس قسم کے فوجی ہتھیار حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ اسلم کو ان کے سر پر چھوڑ کر میں نے کمروں کی تلاشی لی۔ چوہدری کے تینوں بھارتی مہمان ہال کے مشرقی رخ پر بنے ہوئے کمرے میں ٹھہرے تھے۔ وہاں چارپائیوں کے علاوہ ایک الماری تھی لیکن خالی۔ ایک چارپائی کے نیچے سے مجھے ایک بڑا سا بریف کیس ملا۔ یہ لاک تھا۔ اسے لے کر میں واپس ہال میں آیا۔

"اس میں کیا ہے؟" میں نے رائفل بردار سے پوچھا۔

"اس میں کچھ نہیں ہے۔" اس نے جلدی سے کہا۔

میرے ہاتھ میں بریف کیس دیکھ کر وہ کسی قدر بے چین نظر آنے لگا تھا "میرا مطلب ہے تمہارے کام کی کوئی چیز نہیں ہے۔"

"اچھا۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "اسے کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔ ذرا نمبر تو بتانا۔" بریف کیس نمریکل لاک والا تھا۔

"یہ کسی اور کا ہے اس کا نمبر مجھے نہیں معلوم!"

"کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" میں نے سائلنسر والے پستول کی نال بریف کیس کے تالے پر رکھی۔

"بھگوان کے لیے!" وہ چلا اٹھا تھا "ایسا مت کرنا یہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔"

"چلو اچھا کیا کہ بتا دیا۔" میں نے بریف کیس اٹھا کر اس کے پاس رکھ دیا اور دور سے جا کر اس کا نشانہ لیا۔

"اگر تمہیں نمبر معلوم ہے تو بتا دو۔ ورنہ کیا فائدہ اس کے ساتھ تمہارے ٹکڑے بھی اڑ جائیں گے۔"

"میں نے کہا ناں مجھے نمبر نہیں معلوم۔" اس نے ہذیانی انداز میں کہا۔ میں نے احتیاط سے گولی چلائی جو بریف کیس کے پاس ہی زمین میں جا لگی۔

"معاف کرنا نشانہ اب اتنا اچھا نہیں رہا ہے۔" میں نے دوبارہ پستول سیدھا کیا تھا کہ وہ چلانے لگا۔

"گولی مت چلانا بتاتا ہوں بتاتا ہوں۔"

میں نے شوکت علی کو اشارہ کیا جو ایک کونے میں سہما ہوا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے اور علی احمد کے ہاتھ پیر بندھوانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ ویسے ہی مزاحمت ترک کرچکے تھے "اس کے بتائے ہوئے نمبر ملا کر لاک کھولو اور یہ کام تم بریف کیس کو اس کے سینے پر رکھ کر آسانی سے کر لو گے۔"

اچانک رائفل بردار کے دوسرے ساتھی نے اسے کسی ایسی زبان میں کچھ کہا جو سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ یہ غالباً تامل یا بنگالی تھی۔ جواب میں رائفل بردار نے غصے سے کچھ کہا تھا۔ غالباً دوسرا فرد اسے نمبر بتانے پر لعن طعن کر رہا تھا۔ شوکت نے بریف کیس اس کے سینے پر رکھا۔ وہ رک رک کر نمبر بتانے لگا جسے شوکت ملاتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے اس لیے ایک ایک نمبر کو ملانے میں وہ خاصی دیر لگا رہا تھا۔ بالآخر اس نے دونوں تالے کھول لیے۔ لاک کا نمبر ایک ہی تھا۔ یعنی انیس سینتالیس پندرہ۔ یہ بھارت کا یوم پیدائش بھی بنتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ لوگ اسمگلر نہیں لگ رہے تھے۔ اسمگلر اس طرح کے بریف کیس لے کر نہیں گھومتے۔ شوکت نے بریف کیس کھولا۔ ایک خطرے کے احساس نے مجھے ذرا پیچھے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا لیکن کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ میں نے آگے جا کر دیکھا۔ بریف کیس میں اوپر ایک سیل شدہ خاکی لفافہ تھا۔ اس کے نیچے سے نوٹوں کی گڈیاں جھانک رہی تھیں۔ میں نے لفافہ لے کر اس کی سیل توڑی۔ اندر سے ایک تہ شدہ کاغذ اور ایک ننھی سی ڈبیا نکلی۔ اس میں مائیکرو فلم رکھی جاتی ہے۔ کاغذ پر نقشہ سا بنا تھا۔ جو پاکستان کے بالائی علاقے کا تھا۔ اس پر جا بجا سرخ رنگ کے نشان لگے تھے۔ ممکنہ طور پر یہ فوجی اہمیت کا نقشہ تھا جس کا تعلق وطن کے دفاع سے ہو سکتا تھا۔ مائیکرو فلم کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ یہ بھارت کے جاسوس تھے اور چوہدری پاکستانی غدار تھا جو ان کی مہمان نوازی کر رہا تھا۔ ان کے دل کا چور ان کی صورتوں سے عیاں تھا۔ میں نے نقشہ ان کے سامنے لہرایا "یہ کیا ہے؟"

"م۔ مجھے نہیں معلوم۔" چوہدری رحمت الٰہی نے ہکلا کر کہا اور پھر چیخ اٹھا گولی اس کے گھٹنے پر لگی تھی۔ وہ تڑپنے لگا۔ باقی سب کے چہروں کے رنگ اڑ گئے تھے۔ میں نے پستول کا رخ رائفل بردار کی طرف کیا۔

"اس نقشے میں کیا ہے؟"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری "یہ۔ یہ عام سا نقشہ ہے اس میں کوئی خاص۔"

اس بار میں نے اس کے ٹخنے پر گولی چلائی تھی۔ ان بھارتی جاسوسوں اور پاکستانی غدار کے لیے میرے دل میں رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ وہ کربناک انداز میں چلانے لگا۔ شوکت اور علی احمد کی حالت خراب تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ جب میں نے پستول دوسرے بھارتی کی طرف کیا تو وہ گھگیانے لگا۔

"بھگوان کے لیے مجھے مت مارو۔ میں بتاتا ہوں۔" اس کی آواز لرز رہی تھی "یہ اسلام آباد کے آس پاس پاکستان کی دفاعی تنصیبات کے نقشے ہیں۔"

"اور اس فلم رول میں کیا ہے؟"

"اس میں بھی ان تنصیبات کے اندرونی حصوں کے نقشے ہیں۔"

"اور یہ تمہیں کہاں سے ملے؟"

"چوہدری سے۔" اس نے رحمت الٰہی کی طرف اشارہ کیا تو وہ بلبلانے لگا تھا۔

"جھوٹ۔ بکواس کرتا ہے یہ۔ بھونکتا ہے کتا۔ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"جھوٹ مت بولو۔ اگر یہ بھارت کے جاسوس ہیں تو تم ان کے ساتھی ہو اور ان کے ساتھ ہی کیفرِ کردار تک پہنچو گے۔"

یہ سن کر ان کے چہرے تاریک ہو گئے تھے۔ میں نے شوکت علی کی طرف دیکھا "یہ علاقہ سرحد کے پاس ہے۔ یہاں پر پاک فوج کے مورچے اور چوکیاں ہوں گی؟"

"گاؤں سے دو میل دور فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے۔" علی احمد نے جواب دیا پھر وہ گڑگڑانے لگا "ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں پولیس کے حوالے نہ کرنا۔"

"یہ بعد کی بات ہے اپنی صفائی تم خود پیش کرتے رہنا۔" میں نے رکھائی سے جواب دیا "چلو میرے ساتھ۔"

میں اسلم کو باہر لایا۔ میں نے اسے آٹومیٹک رائفل چلانے کا طریقہ سمجھایا "یہ اب فائر کرنے کے لیے تیار ہے۔ اگر تم کوئی گڑبڑ محسوس کرو تو بے دریغ فائر کر دینا۔ جب تک میں آتا ہوں۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں۔" اس نے تشویش سے کہا۔

"فوج کے ہیڈ کوارٹر تک ان لوگوں کو قانون کے حوالے کرنا ضروری ہے۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہو گیا۔ میں نے علی احمد کو لیا اور اس کی رہنمائی میں روانہ ہو گیا۔ واقعی فوجی ہیڈ کوارٹر وہاں سے بمشکل دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا لیکن درمیان میں نہر کی وجہ سے طویل چکر کاٹ کر جانا پڑا تھا۔ ہیڈ کوارٹر شاید کمپنی کا تھا۔ نصف درجن بیرکس تھیں جن کے گرد خاردار تاروں کی باڑھ تھی۔ گیٹ پر دو سپاہی مستعدی سے پہرا دے رہے تھے۔ میں نے جیپ روکی تو ایک گارڈ قریب آیا۔

"کیا بات ہے جناب؟"

"مجھے تمہارے کسی اعلیٰ افسر سے ملنا ہے۔ ایمرجنسی ہے۔"

"یہاں میجر شاہد ہوتے ہیں۔" اس نے آگاہ کیا "میں انہیں کہلوا دیتا ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

"ناصر عظیم۔" میں نے جواب دیا "لیکن جلدی کریں۔ دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔ معاملہ بھارتی جاسوسوں کا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ الرٹ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور تیزی سے اندر بیرکوں کی طرف چلا گیا۔ مشکل سے پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا تھا "آپ اندر آئیں لیکن جیپ یہیں چھوڑ دیں۔"

میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے مجھے ایک بیرک تک پہنچا دیا۔ وہاں ایک مسلح گارڈ موجود تھا۔ اس نے کہا۔

"آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے تو مجھے دے دیں۔"

میں نے سوچا اور پستول نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔ میجر شاہد ایک نوجوان آدمی تھا۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی اور آنکھوں میں چمک۔ وہ یقیناً ایک اچھا افسر تھا۔ رات کے اس پہر بھی وردی میں تھا "یس مسٹر ناصر عظیم۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "آئی ایم میجر شاہد حفیظ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ اپنے وطن کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا اور اسے مختصر الفاظ میں چوہدری رحمت الٰہی اور بھارتی جاسوسوں کے بارے میں بتایا۔ میجر شاہد صحیح معنوں میں پیشہ ور سپاہی تھا اس نے مجھ سے سوال و جواب میں وقت ضائع کیے بغیر اپنے اردلی کو بلا کر اسے ہدایات دیں۔ اگر میں غلط بیانی کرتا تو اسے اطمینان تھا کہ وہ بعد میں مجھے پکڑ سکتا تھا اور سوال و جواب بعد میں بھی ہو سکتے تھے۔ دس منٹ کے اندر ہم واپس چوہدری رحمت الٰہی کے ڈیرے کی طرف جا رہے تھے۔ میری جیپ آگے تھی۔ عقب میں دو فوجی جیپوں میں میجر شاہد کے ساتھ ایک دستہ تھا۔ ڈیرے پر صورتِ حال اسلم کے قابو میں تھی۔ سوائے ایک بات کے۔ اس نے برسٹ مار کر ایک بھارتی کی ٹانگیں چھلنی کر دی تھیں۔

"اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔" اسلم نے وضاحت کی۔

میجر شاہد نے فوری طور پر معاملے کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اس نے اسلم سے بھی رائفل لے لی۔ اس کے سپاہی زخمیوں کو ایک جیپ میں لے گئے۔ فیلڈ اسپتال نزدیک ہی پڑتا تھا۔ کچھ دیر بعد باقی افراد کو بھی روانہ کر دیا گیا۔ انہوں نے ڈیرے کی تلاشی لے کر ہر شے اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ اس اثنا میں مقامی پولیس بھی آ گئی تھی۔ میجر شاہد نے تھانے دار کو ہدایات دیں کہ ڈیرے کو سیل کر دیا جائے اور بغیر اجازت کے اسے کوئی نہ کھولے۔

"تھینک یو مسٹر ناصر عظیم۔" اس نے کہا "آپ کی خدمت اور حب الوطنی کو میری طرف سے سیلوٹ!"

اس نے سچ مچ سیلوٹ کیا تو میں شرمندہ ہو گیا "نہیں میجر صاحب۔ میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اب تم مجھے اجازت دو۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے اور تھکن بھی ہو رہی ہے۔"

"اس صورت میں تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" اس

نے شائستہ مگر مضبوط لہجے میں کہا "میں کھانا کھلائے بغیر تمہیں نہیں جانے دوں گا۔"

وہ بڑی خوب صورتی سے مجھے گھیر کر اپنے ہیڈ کوارٹر لے گیا تھا۔ اتنا تو میں بھی جانتا تھا کہ وہ مجھے سوال و جواب کے بغیر جانے نہیں دے گا۔ میں مناسب سی کہانی سوچ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے تانبے کے نوادرات ابھی تک جیپ میں تھے اور ابھی تک میجر شاہد ان سے بے خبر تھا لیکن عین ممکن تھا ہیڈ کوارٹر میں جیپ کی تلاشی لی جاتی اور یہ نوادرات بھی سامنے آ جاتے۔ میرے لیے ان کے بارے میں سوال و جواب مشکل ہو جاتے۔

صبح کے چار بجے کا وقت تھا جب ہم نے کھانا کھایا۔ میجر شاہد کا اردلی بلاشبہ اچھا باورچی تھا۔ کھانے کے بعد وہ چائے لے آیا' چائے پیتے ہوئے میجر شاہد نے سرسری سے انداز میں کہا "یہ بدمعاش کیسے تمہارے ہاتھ لگے۔"

میں نے اپنا تعارف ناصر عظیم کی حیثیت سے کرایا تھا۔ غلط بیانی کر کے میں مشکل میں پڑ سکتا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں لاہور کا ایک کاروباری ہوں کچھ عرصے پہلے تک میرا کنسٹرکشن کا بزنس تھا جسے اب میں دوبارہ شروع کر رہا ہوں۔ درمیان میں' میں کچھ معاشرتی اور سماجی خدمت میں مصروف رہا تھا۔ میں نے ایک ٹرسٹ کے لیے کام بھی کیا اور میں اسی کے تحت ایک یتیم خانہ قائم کر رہا تھا۔ میجر یہ سب سن کر متاثر ہوا تھا۔ میں نے بتایا کہ اسلم میرا ڈرائیور ہے اور وہ اپنے ماموں کے گھر آیا تھا۔ اس نے ماموں کے پاس کچھ امانتیں رکھوا رکھی تھیں۔ اس کا باپ پیتل کا کاریگر تھا اور اس کا کام لاجواب تھا لیکن یہاں آتے ہوئے ہمیں قبرستان میں ایک شخص کھدائی کرتا نظر آیا۔ ہم نے اسے کفن چور سمجھ کر پکڑنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ قبر میں وہی تانبے کے برتن دفن کر رہا تھا جو اسلم نے اپنے ماموں کے پاس امانتاً رکھوائے تھے۔ چور نے انکشاف کیا کہ یہ برتن اسلم کے ماموں زاد بھائی شوکت نے چھپائے تھے اور وہ انہیں چوہدری رحمت الٰہی کے ڈیرے پر ٹھہرے کچھ بھارتیوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتا تھا۔ باقی کہانی بلا کم و کاست وہی تھی۔

"تم نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔" میجر شاہد نے تعریفی لہجے میں کہا "تمہیں تو کوئی اعزاز ملنا چاہیے۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نے یہ سب شہرت کے لیے نہیں کیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ مجھے اس معاملے میں قطعی شامل نہ کیا جائے باقی تم جیسے چاہو یہ معاملہ نمٹاؤ۔"

"مگر کیوں؟" میجر شاہد نے سنجیدگی سے کہا "لوگ تو اپنی پبلسٹی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔"

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں چوہدری رحمت الٰہی اور بھارتی ایجنٹوں کی دشمنی مول نہیں لے سکتا۔ یہ تو اتفاقی معاملہ تھا۔ ورنہ میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میری درخواست ہوگی کہ مجھے اس معاملے سے الگ ہی رکھا جائے۔"

اس نے بغور مجھے دیکھا "ناصر عظیم کیا یہ بات عجیب سی نہیں ہے کہ تم اپنے ڈرائیور کے لیے اتنی دور چلے آئے۔"

میں نے گہری سانس لی "نہیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اسلم میرا اچھا ملازم ہے اور مجھے اس کا خیال رہتا ہے۔ اس کے ساتھ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ذرا آؤٹنگ چاہتا تھا۔ کچھ عرصے سے مسلسل مصروف رہ کر میرے اعصاب تھک گئے تھے۔"

میجر شاہد نے اپنی میز کی دراز سے میرا بریٹا نکال کر سامنے رکھا "یہ خاصا قیمتی پسٹل ہے کیا تمہارے پاس اس کا لائسنس ہے۔"

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا "یہ میں نے کب کہا کہ یہ میرا پسٹل ہے۔ اسے میں نے جی تھری رائفل کی طرح انہی سے چھینا تھا۔"

اس نے ایک بار پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا "خوب یعنی تم نے تین مسلح بھارتی جاسوسوں کو نہتے ہونے کے باوجود بے بس کر کے رکھ دیا۔"

"بس میرا داؤ چل گیا تھا۔ میں سیلف ڈیفنس سے واقف ہوں۔ اس سے پہلے وہ سنبھلتے میں ان کے سرغنہ کو قابو کر چکا تھا۔ اس کے بعد سب آسان ہوتا چلا گیا۔"

غالباً یہ بات ہضم کرنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا "ناصر عظیم ایسا تو عام طور سے فلموں میں ہوتا ہے۔"

"دیکھو میجر۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "اگر تمہیں مجھ پر کوئی شبہ ہے تو کھل کر کہو۔ میں جواب دینے سے نہیں گھبراتا۔ باقی حقائق میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ تم چاہو تو میرے بارے میں تصدیق کر سکتے ہو۔"

میجر شاہد کے چہرے پر چمک آ گئی تھی "کس سے؟"

"ایک تو مشہور فلم اسٹار نیلم ہے۔ اس سے میرے جذباتی مراسم ہیں۔ آن بان نظامت بھٹ وہ میرے لیے بڑی بہن اور ماں کی طرح ہے۔ دوسرا مشہور کمال ٹرسٹ اسپتال کا مالک ڈاکٹر کمال ہے۔ میرا بچپن کا دوست ہے۔ تم چاہو تو ان سے بات کر کے اطمینان کر سکتے ہو۔"

"معاف کرنا یار۔" اس نے معذرت کی "مجبوری ہے

ڈیوٹی میں آدمی کو سب کرنا پڑتا ہے۔"

وہ اٹھ کر کہیں چلا گیا۔ غالباً فون کرنے۔ مجھے شدت سے نیند آرہی تھی اور میری خواہش تھی کہ مجھے ایک بستر مل جائے اسلم پہلے ہی میجر شاہد کے اردلی کے پاس سونے کے لیے جا چکا تھا۔ جب میجر شاہد واپس آیا تو میں اونگھ رہا تھا۔ اس بار اس کے تاثرات قطعی مختلف تھے۔ اس نے آتے ہی میرے شانے پر ہاتھ مارا۔

"معاف کرنا یار میں بھول گیا تھا کہ تمہیں نیند آرہی ہے ورنہ پہلے ہی بندوبست کر دیتا۔"

اس نے سونے کے لیے مجھے اپنا کمرا دے دیا اور میں لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ جب میں اٹھا تو سہ پہر بھی ڈھل چکی تھی۔ طویل نیند نے مجھے تازہ دم کر دیا تھا۔ ساتھ ہی سب کھایا پیا بھی ہضم ہو چکا تھا۔ میجر شاہد کا کمرا سادہ سا تھا۔ اس کے بستر کے سرہانے میز پر ایک تصویر لگی تھی۔ تصویر میں میجر شاہد کے ساتھ ایک خوب صورت سی لڑکی سرخ جوڑے میں شرمیلی سی مسکان کے ساتھ موجود تھی۔ وہ اس کی بیوی لگتی تھی۔ میں تصویر دیکھ رہا تھا کہ میجر شاہد اندر آگیا۔

"اٹھ گئے تم۔" اس نے کہا۔

"ہاں، یہ غالباً تمہاری بیوی ہے۔"

"غالباً نہیں یقیناً۔" اس نے تصدیق کی "پہلے تم اٹھ کر غسل کر لو۔ کھانا تیار ہو رہا ہے۔"

بیرک کا غسل خانہ عام سا تھا۔ شاور نہیں تھا بلکہ بالٹی اور مگے سے نہانا پڑا تھا لیکن کنوئیں سے نکلا پانی بے حد فرحت بخش تھا۔ لنچ جو بریک فاسٹ کے وقت کیا گیا تھا۔ اس میں سادہ چاولوں کے ساتھ بھنی ہوئی مرغی تھی کچھ عجیب سا مینیو تھا لیکن کھانا مزے دار تھا۔ اسلم ایک طرف میدان میں جمع سپاہیوں سے گپ شپ کر رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس نے وہی جواب دیے ہوں گے جو میں نے دیے۔ میں نے پہلے ہی اسے سمجھا دیا تھا کہ اسے کیا جواب دینا ہے۔ وہ خوش نظر آرہا تھا۔ کھانے کے بعد میجر شاہد خود کافی بنا کر لایا تھا۔ بقول اس کے اس پورے ہیڈ کوارٹر میں صرف اسے ہی کافی بنانے اور پینے کا فن آتا تھا۔ کم از کم اسے بنانے کا فن ضرور آتا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور فضا میں موجود خنکی سے رچے ہوئے ماحول میں کافی بہت مزہ دے رہی تھی۔

"او کے میجر اگر تمہاری تفتیش مکمل ہو گئی ہے تو اب مجھے اجازت دو۔" میں نے کہا "بائی دی وے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ان لوگوں کا کیا ہوا؟"

"رحمت الٰہی اور تین بھارتیوں کو صبح ہی فوج کی انٹیلی جنس نے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ شوکت علی اور علی احمد کو میں نے مقامی پولیس کے حوالے کر دیا۔ وہ ان کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ ممکن ہے شوکت علی چھوٹ جائے مگر اسمگلروں سے تعلقات کی وجہ سے علی احمد ضرور جیل جائے گا۔"

"گڈ۔" میں نے سکون کا سانس لیا۔

"میں نے چیتل کے وہ برتن دیکھے ہیں۔" میجر شاہد نے کچھ دیر بعد کہا "مجھے وہ نوادرات لگتے ہیں۔"

"وہ نوادرات میں ہی شامل ہیں لیکن بہت قیمتی نہیں ہیں۔ یہ تو ان کی ساخت اور شکل سے ظاہر ہے کہ یہ زیادہ پرانے نہیں ہیں۔ ان کی وجہ سے میرے ڈرائیور کو کچھ رقم مل جائے گی۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ اس معاملے میں میجر مشکوک تھا لیکن ہم نے جو کیا تھا اس کی وجہ سے وہ ہمیں چھوٹ دینے پر مجبور تھا۔ وہ ہمیں رخصت کرنے باہر تک آیا تھا۔ جب وہ مجھ سے بغل گیر ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ میرے کرتے کی جیب میں اس نے کچھ ڈالا ہے۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں خود مجھے بھی اتنی سی دیر میں اس نوجوان سپاہی سے کچھ انسیت ہو گئی تھی۔ اس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اگر وہ زندہ رہا اور فوج میں رہا تو بہت آگے تک جائے گا "وش یو گڈ لک!" اس نے آہستہ سے کہا "تمہیں کسی بھی معاملے میں کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک یہاں مجھے فون کر سکتے ہو۔" اس نے مجھے اپنا فون نمبر لکھوایا۔

میں جیپ میں بیٹھا تو اسلم نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ جب جیپ ہیڈ کوارٹر کے خاردار تاروں میں گھرے گیٹ سے نکل رہی تھی تو میجر شاہد اپنی بیرک کے آگے کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ جب جیپ سڑک پر آئی تو میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اندر سے وہی سائلنسر لگا پستول نکلا۔ جس کی ملکیت سے انکار کرتے ہوئے میں نے اسے بھی ان لوگوں کے سر تھوپ دیا مگر جب میجر شاہد نے ان سے بیانات لیے ہوں گے تو انہوں نے اس سے انکار کر دیا ہوگا۔ میجر پر میرا جھوٹ عیاں ہو گیا تھا لیکن اس نے مجھ سے دوبارہ اس پر کوئی بات نہیں کی تھی بلکہ جاتے جاتے یہ پستول میری جیب میں ڈال کر مجھ پر احسان کیا تھا۔ اسلم نے بڑی ہوشیاری سے اپنا پستول پہلے ہی چھپا کر رکھا تھا اور میجر شاہد کو اس کی بھنک بھی نہیں لگی تھی لیکن .... نہیں وہ جتنا ذہین تھا اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ اس بارے میں جان بھی گیا ہو۔ البتہ اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔

فیروز پور روڈ پر آکر میں نے اسلم سے کہا "تم شاید افسردہ ہو کہ ان نوادرات کا سودا نہیں ہو سکا۔"

"نہیں جناب بلکہ میں خوش ہوں کہ اس ملک کے دشمن اور غدار پکڑے گئے۔" اس نے جواب دیا "البتہ مجھے ماموں کا افسوس ہے۔ وہ شوکت کی وجہ سے پولیس کے چکر میں نہ آجائے۔"

"تم فکر نہ کرو۔" میں نے اسے تسلی دی "میجر شاہد اچھا آدمی ہے وہ خیال رکھے گا کہ اس معاملے میں کسی بے گناہ کو نہ گھسیٹا جائے۔"

رات نو بجے ہم لاہور میں داخل ہوئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں آفتوں کی دنیا سے نکل کر امان کی جگہ میں آگیا ہوں۔ حالانکہ لاہور میرے لیے خطرناک تھا۔ ایک جگہ رک کر میں نے پی سی او سے نیلم کے گھر کال کی، موبائل فون کی بیٹری ڈسچارج ہو گئی تھی۔ فون خالہ بانو نے ریسیو کیا "میں ناصر عظیم بول رہا ہوں۔"

"ناصر، نیلم بیٹی تو شوٹنگ پر گئی ہے۔ رئیس بھی اس کے ساتھ ہے۔"

"اچھا سنئے میں آرہا ہوں، گیٹ کے گارڈز کو ہدایت کر دیں کہ ایک سیاہ جیپ آئے گی۔" میں نے نمبر بتایا "اسے اندر آنے دیں۔"

"میں کہہ دوں گی۔" خالہ بانو خوش ہو گئیں "تم جلدی سے آجاؤ۔"

نیلم ہاؤس کے پاس آکر میں جیپ کے عقبی حصے میں چلا گیا۔ تاکہ اگر کوئی نیلم ہاؤس کی نگرانی کر رہا ہو تو اسے میری صورت نظر نہ آئے۔ نیلم ہاؤس کے گارڈز نے جیپ کا نمبر دیکھ کر گیٹ کھول دیا تھا۔ اندر آکر میں نے اسلم کو وہیں رکنے کا کہا اور اندر چلا آیا۔ خالہ بانو ٹیرس میں انتظار کر رہی تھیں۔

"ناصر میاں، تم تو چھلاوہ ہو گئے ہو آتے ہو اپنی جھلک دکھاتے ہو اور غائب ہو جاتے ہو۔"

"بس خالہ اپنے مقدر میں دھکے لکھے ہیں۔ اس وقت تو میرے ساتھ ایک بندہ بھی ہے۔ اسے کسی سرونٹ کوارٹر میں ٹھہرائیں۔ اب یہ یہیں رہے گا۔ اس کی کوئی ذمے داری بھی لگا دیں۔"

خالہ بانو چلی گئیں۔ میں نے موبائل کو چارج پر لگایا اور پیر سبحان کا نمبر ملا دیا۔ ایک منٹ بعد وہ لائن پر تھا۔

"ناصر عظیم بات کر رہا ہوں پیر صاحب!"

"تم کہاں غائب ہو؟ دلاور شاہ کے قتل کے بعد پولیس تمہاری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"آپ جانتے ہیں اور میں بھی اپنی صفائی پیش کر چکا ہوں۔ دلاور شاہ کے قتل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ سفید ڈاج میں سوار مسلح لوگوں کی فائرنگ سے مارا گیا تھا اور وہ سب میرے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ کیا ان کی شناخت کے بارے میں معلوم ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" سبحان شاہ کے لہجے میں مایوسی تھی "سارے حرام زادے جل کر مر گئے جس کی وجہ سے لاشیں ناقابل شناخت ہو گئی تھیں اور ان کے پاس سے کوئی ایسی چیز بھی نہیں نکلی جس سے ان کی شناخت میں مدد ملتی۔"

"اور کار؟"

"وہ چوری کی تھی اور ملتان سے چوری ہوئی تھی۔"

"اوہ۔" میں نے مایوسی سے کہا "شاہ صاحب میں اب تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ لوگ مجھ پر شاہ عالم ہونے کا شبہ کیوں کر رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ میری شکل اس سے ملتی ہے۔"

"ملتی نہیں تم بالکل اس جیسے ہو۔ میں نے شاہ عالم کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"کیا آپ کو میری آواز اور انداز میں بھی فرق محسوس نہیں ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ وہ خود غرض اور مفاد پرست آدمی تھا جس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ میرے بے شمار دوست ہیں۔"

"شاہ عالم اتنا بڑا بہروپیا تھا کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر سچی بات یہ ہے کہ تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔"

"یعنی آپ کو میری سچائی کا یقین آنے لگا ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا "شاہ صاحب وہ وقت دور نہیں ہے جب میں ثابت کر دوں گا کہ میرا شاہ عالم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"جب کرو گے تب کرو گے۔ ابھی تو تمہیں شاہ عالم ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ خاص طور سے پولیس اور رب نواز کو شدت سے تمہاری تلاش ہے۔"

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" میں نے کہا "آپ نے کچھ نوادرات کا ذکر کیا تھا۔ کیا آپ کے پاس ان کی کوئی لسٹ ہے؟"

"لسٹ بھی ہے بلکہ مکمل کیٹلاگ ہے۔"

"کیا اس کی ایک کاپی مجھے مل سکتی ہے۔"

وہ چونکا "تم کیا کرو گے؟"

"شاہ صاحب میں نے کہا تھا کہ میرے بھی کچھ ذرائع

ہیں۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں لیکن ایک مضبوط کاروباری ضرور ہوں۔ ممکن ہے۔ ان نوادرات کی تلاش میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔"

"تم میری کیا مدد کرسکتے ہو؟" اس کے لہجے میں شک تھا۔

"شاہ صاحب' مجھے آپ کی مدد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے" میں نے گویا صاف گوئی سے کہا۔ "لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کے کام آکر مجھے آپ سے مدد ملے گی جس سے میں شاہ عالم کا ٹھپا خود پر سے صاف کرسکوں گا۔"

"اگر تم واقعی نوادرات کے سلسلے میں میری مدد کرسکو گے تو میں بھی تمہارے لیے کوشش کروں گا" اس نے گول مول انداز میں کہا۔ وہ مجھے دھوکا دے رہا تھا لیکن میں خود بھی اسے دھوکا دے رہا تھا۔

"بس تو آپ اسی کیٹلاگ کی ایک کاپی مجھے بجھوادیں۔"

"کہاں پر' اپنا پتا تو بتاؤ بابا!" اس نے مکاری سے کہا۔

"کیٹلاگ آپ اپنی لاہور والی کوٹھی پر بجھوادیں' وہاں سے میرا آدمی اسے حاصل کرلے گا" میں نے کہا اور اسے کچھ کہنے کی مہلت دیے بغیر موبائل بند کردیا۔ موبائل چارج پر لگا کر میں باہر آیا۔ بانو خالہ کا اسسٹنٹ ایک نوجوان امتیاز تھا۔ وہ مستعد اور کام کے سلسلے میں سنجیدہ رہنے والا شخص تھا جو بھی کام سونپا جاتا' اسے پوری جاں فشانی سے کرتا تھا۔ میں نے اسے بلا کر جیپ سے نوادرات اتارنے کے لیے کہا۔

"احتیاط سے لانا' یہ سب قیمتی سامان ہے" میں نے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں جناب! کسی چیز کو نقصان نہیں ہوگا۔"

"انہیں لیونگ روم میں لے آنا لیکن اس سے پہلے ان کی صفائی وغیرہ کرلینا۔"

لیونگ روم میں بانو خالہ نے چائے مع لوازمات کے پہنچادی تھی مگر ابھی میرا کھانے کا موڈ نہیں ہورہا تھا۔ میں شبنم کے لیے رب نواز سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے رئیس سے رپورٹ لینا ضروری تھا۔ میں نے اس کا موبائل نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن وہ مسلسل بزی جارہا تھا۔ شاید خراب ہوگیا تھا یا آوٹ آف رینج تھا۔ جب تک چائے سے فارغ ہوتا' امتیاز تانبے کے بنے ان نوادرات کو صاف کرکے لے آیا تھا۔ بلکہ اس نے انہیں زیادہ ہی صاف کردیا تھا۔ اب یہ نئے برتنوں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ میں نے امتیاز کی مدد سے انہیں ترتیب سے رکھا۔ مجھے یاد آرہا تھا کہ رب نواز نے لندن جو نوادرات بھیجے تھے' ان میں سے کچھ نمونے بالکل اسی جیسے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ اسلم کے باپ نے ان نوادرات کے دو دو پیس بنائے تھے۔ اگر واقعی ایسا ہی تھا تو میں ان نوادرات کو رب نواز کے گلے کا پھندا بنا سکتا تھا لیکن پہلے اس کی تصدیق ضروری تھی۔ تصدیق کے لیے ہی میں نے پیر سبحان شاہ سے اس کی تیار کی ہوئی کیٹلاگ مانگی تھی۔

رئیس اور نیلم رات دس بجے آئے تھے۔ رئیس آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا "قسم اللہ کی دو دن تیری صورت نہ دیکھوں تو زندگی پریشان لگنے لگتی ہے۔"

"ویران۔۔۔" میں نے تصحیح کی۔

"اب ہاں وہی۔۔۔" رئیس بولا۔

"یہ سب کیا ہے؟" نیلم نے قالین پر سجے نوادرات کا معائنہ کیا۔

میں نے مختصراً اسے ان کے بارے میں بتایا' نیلم بولی "یہ بتاؤ کہ تم نے آرمی کے ساتھ کیا چکر چلایا ہے؟ رات کو کسی میجر شاہد کا فون آیا تھا' وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔ آرام سے سناؤں گا۔ رئیس یہ بتا' تو نے پروفیسر کو کہاں رکھا ہے اور کیا رب نواز سے دوبارہ رابطہ ہوا؟"

"ہاں' ایک بار میں نے فون کیا تھا اور اسے کہا تھا کہ شبنم کو آرام سے رکھے۔ پروفیسر کو میں نے جیرا بلیڈ کے پاس رکھوایا ہے۔"

"کہیں وہ نکل نہ جائے" میں نے پریشان ہوکر کہا "وہ ہاتھ سے نکل گیا تو شبنم کی رہائی خطرے میں پڑجائے گی۔"

"تو جیرا بلیڈ کو نہیں جانتا۔ اس کے قبضے سے پروفیسر کی روح بھی نہیں نکل سکتی۔ احتیاطاً میں نے اسے بتادیا ہے کہ یہ بندہ بھاگ گیا تو بڑی مصیبت آجائے گی۔ وہ بھی مارا جائے گا۔ وہ اب اس کی پوری طرح نگرانی کرے گا۔"

"میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد اس قصے کو نمٹادیا جائے۔"

"صبح کے اخبارات نے بڑا شور مچایا ہے۔ شبنم کے اغوا اور عائشہ کلینک پر ہونے والے حملے کی وجہ سے پولیس محتاط اور سرگرم ہوگئی ہے' اسی لیے رب نواز کی کوٹھی پر چھاپا بھی مارا گیا۔"

"لیکن شبنم وہاں نہیں ملی" میں نے تلخی سے کہا "خود پولیس نے خبردار کردیا ہوگا کہ ملک صاحب ہوشیار! بندی غائب کردو' چھاپا پڑنے والا ہے۔"

"ایسا ہی ہوا۔ چھاپے میں کچھ نہیں ملا۔ اخبارات نے اعلان کیا ہے کہ اگر شبنم کو جلد از جلد بازیاب نہیں کرایا گیا تو وہ حکومت کے خلاف مہم چلائیں گے۔"

"اس سے حکومت کا کیا بگڑے گا۔ رب نواز کو صرف ہم مجبور کرسکتے ہیں۔"

میں نے دوبارہ موبائل لیا۔ وہ چارجر پر لگا تھا' ابھی بیٹری اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ چارجر سے ہٹاکر استعمال کرسکتا۔ میں نے رب نواز کا نمبر ملایا۔ کسی ملازم نے فون اٹھایا تھا "جی' کس سے بات کرنی ہے؟"

"ملک رب نواز سے' اسے کہو شاہ عالم بات کررہا ہے۔"

فوراً ہی رب نواز لائن پر تھا "شاہ عالم' ہاشم رضا کہاں ہے؟"

"شبنم کہاں ہے؟" میں نے الٹا سوال کیا۔

"میں اس کے لیے پریشان ہوں" رب نواز واقعی پریشان لگ رہا تھا۔

"میں بھی شبنم کے لیے پریشان ہوں۔ وہ عورت ہے اسے زیادہ خطرہ ہے۔"

"یقین کرو' وہ بالکل محفوظ ہے۔"

"ہاشم رضا بھی بالکل محفوظ رہے گا۔ جب تک تم شبنم کو انگلی نہیں لگاؤ گے۔ ہم ہاشم رضا کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔"

"سنو' ہم ان کا تبادلہ کرسکتے ہیں" بالآخر رب نواز مطلب کی بات پر آگیا تھا۔

"اسے اتنا آسان مت سمجھو" میں نے کہا "شبنم کے ساتھ تم جو کچھ کرچکے ہو' اب اس سے زیادہ اور کیا کرو گے لیکن ہاشم تمہارے لیے اہم ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟" خاصی دیر بعد اس نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم میرے گرد گھیرا تنگ کرنا بند کردو۔ میرے خلاف مقدمات میں دخل اندازی نہ کرو۔"

"تم نوادرات والا معاملہ بھول رہے ہو۔ اس میں مجھے ساڑھے چار لاکھ پاؤنڈز کا نقصان ہوا ہے اسے کون پورا کرے گا؟"

"تم جانتے ہو کہ یہ سب جمی کا حرامی پن تھا اور وہ اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔ اگر تم اس سے نکلوا سکتے ہو تو نکلوالو۔ میرے ڈیڑھ لاکھ پاؤنڈز بھی نہیں ملے' نقصان میرا بھی ہوا ہے۔"

"لیکن میں تو دونوں طرف سے مارا گیا ہوں" اس نے کہا۔

"دیکھو' پیر سبحان کے ساتھ تم نے جو کیا وہ اس کا اور تمہارا معاملہ ہے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم پیر سبحان کو کہہ دو کہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرے' میں ویسے بھی پاکستان سے جارہا ہوں۔ ایک چھوٹے سے پُرامن ملک میں' میں نے خاصی جائداد اور حیثیت بنالی ہے' اب میں ساری عمر وہیں رہوں گا۔"

"شبنم کو چھوڑ جاؤ گے؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

"مجبوری ہے' میں اسے ساتھ نہیں لے جاسکتا۔ بہرحال میں اس کی ساری عمر کی خدمت کا صلہ دے جاؤں گا" میں نے شاہ عالم کے نقطۂ نظر سے کہا۔ وہ عیاش آدمی شبنم کو صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کررہا تھا۔ "میں اسے ایک اچھا اخبار اسٹیبلش کرکے دے جاؤں گا اور تمہارے لیے بھی بہتر ہوگا کہ اس سے مفاہمت کرکے یہ جھگڑا ختم کرو' پہلے ہی تمہاری سیاسی ساکھ کو نقصان ہورہا ہے۔ رب نواز! دور بدل رہا ہے۔ عوام سیاسی طور پر باشعور ہورہے ہیں۔ آنے والا دور گروپس کا ہوگا۔ انفرادی سیاست کرنے والوں کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی۔ اس وقت کے آنے سے پہلے بے شک ظاہری طور پر سہی لیکن اپنا طرزِ عمل بدل لو۔"

"خیریت۔۔۔ آج بڑے خیرخواہ بنے ہوئے ہو۔"

میں نے سرد آہ بھری "رب نواز' میرے ساتھ گزشتہ عرصے میں جو ہوا ہے' اس کے بعد میرے خیالات میں بھی بڑی تبدیلی آئی ہے۔ میں نے سیاست ترک کردی' کاروبار ختم کردیا۔ اب میں سکون سے اپنی زندگی کو انجوائے کرنا چاہتا ہوں۔ دولت کی میرے پاس کمی نہیں ہے۔ میں یوں غائب ہوجاؤں گا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اپنا نام بھی بدل لوں گا۔"

"اور چہرہ بھی بدل لوگے؟" اس نے طنز کیا۔

"اچھا یاد دلایا" میں ہنسا "ہاں میں مستقل طور پر جانے سے پہلے اپنی پلاسٹک سرجری سے ایک نئے حلیے کو ہمیشہ کے لیے اپنالوں گا۔ یہ چہرہ بھی ہمیشہ کے لیے غائب ہوجائے گا۔"

اسے چند لمحے کے لیے چپ لگ گئی تھی پھر اس نے کہا۔ "تم پروفیسر کو کب چھوڑ رہے ہو؟"

"اس کا انحصار تمہارے طرزِ عمل پر ہے" میں نے جواب دیا "تم جتنی جلدی شبنم کو صحیح سلامت رہا کرو گے' اتنی ہی جلدی ہاشم کو بھی رہائی مل جائے گی۔"

"میں اسے ابھی رہا کرنے کو تیار ہوں" اس نے فوراً کہا۔

"میں پہلے تصدیق کروں گا کہ شبنم پر ذہنی اور جسمانی طور پر کوئی تشدد تو نہیں ہوا ہے پھر میں پروفیسر کو رہا کروں

گا۔"

"تم جہاں کہو میں اسے پہنچا دوں گا۔"

میں نے سوچ کر کہا "تم اسے اس کے اخبار کے دفتر پہنچا دو۔ میں ایک گھنٹے بعد تصدیق کرلوں گا۔"

"اور تم پروفیسر کو کتنی دیر بعد رہا کرو گے؟"

"تم تین چار گھنٹے کا وقت رکھو۔ اتنا وقت تو لگے گا" میں نے جواب دیا۔

میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے حیرت تھی کہ رب نواز زیادہ ہی جھک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ہاشم رضا اس کے لیے کچھ زیادہ ہی اہمیت کا حامل ہو گیا تھا۔ مگر کیوں؟ اس کیوں کا جواب الہام کی طرح میرے ذہن میں آیا تھا۔ رب نواز ہاشم رضا سے کوئی خاص کام لے رہا تھا۔ وہی کام جو وہ کرتا آیا تھا۔ یعنی ایسے تجربات جن میں انسان اور جانور کے مشترکہ ملاپ سے ایک نئی مخلوق پیدا کی جاتی تھی جو انسانی عقل اور جانوروں جیسی طاقت رکھتی تھی۔ لالی اور جبو اس کی بہترین مثال تھے۔ ایسے جانداروں کی تخلیق بلاشبہ ہاشم رضا کا کارنامہ تھا لیکن اتنا ہی قابل نفرت بھی جتنا کہ ایٹم بم کی ایجاد۔ شاید ان دنوں پروفیسر ایسا ہی کوئی کارنامہ انجام دے رہا تھا اور رب نواز کو اس کی اشد ضرورت تھی۔ تب ہی وہ میرے آگے جھکنے اور شبنم کو رہا کرنے پر آمادہ ہوا تھا۔ رب نواز جیسے آدمی سے کچھ بعید نہیں تھا وہ پروفیسر کے کام کو کمائی کا ذریعہ بنا سکتا تھا لالی اور جبو جیسے حیوان بنا کر دنیا کو بیچ سکتا تھا بلکہ وہ ایسا ہی کر رہا ہوگا اور پروفیسر کے کام پر سرمایہ کاری اس نے خود نہیں کی ہوگی۔ ایسے کاموں کے اخراجات کے لیے کتنے ہی جاں نثار لیے گا ہے بکا ہے مل جاتے تھے۔ اسے اتنی رقم خرچ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بین الاقوامی سطح پر انسان اور حیوان کے ملاپ سے پیدا ہونے والی مخلوق کے لیے نہ جانے کہاں کہاں تجربات نہیں ہو رہے ہوں گے۔ مگر سب سے پہلے یہ کام ایک ترقی پذیر ملک کے سائنس داں نے کیا۔ یقیناً سپر آدمی کے خواب دیکھنے والی سپر طاقتیں پروفیسر کو بڑی سے بڑی قیمت دینے کو تیار ہو جائیں گی کیونکہ جن ملکوں میں لالی اور جبو جیسے جانداروں پر مشتمل فوج ہوگی اس کی قوت بھی ظاہر ہے کہ بے پناہ ہو جائے گی۔ بے شک جدید ترین ہتھیار وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے کے لیے مؤثر ہیں لیکن زمین اور انسانوں پر قبضے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے انسانوں کی ہی ضرورت پڑے گی اور اس کام کے لیے ایسے انسان بہترین ہیں جن میں جسمانی خوبیاں تو ہوں لیکن ذہنی اعتبار سے وہ پسماندہ ہوں اور ان کی ذہنی سطح اتنی ہی ہو کہ وہ اپنے آقاؤں کے احکام سمجھ کر ان کی بے خولی تعمیل کر سکیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ رئیس آ گیا "کیا بات ہے پیارے کیا فون چیک کیا ہے؟"

میں چونکا اور جھینپ کر فون کو واپس رکھ دیا۔ وہ ابھی تک چارج پر تھا۔ "معاف کرنا یار! میں سوچ رہا تھا۔"

"نیلم کھانے پر انتظار کر رہی ہے۔ تیرے چکر میں اس نے مجھے بھی نہیں کھانے دیا۔"

میں ہنستے ہوئے اس کے ساتھ ہو لیا۔ کھانا ہنسی مذاق کرتے ہوئے کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد نیلم اپنی اگلے روز کی شوٹنگ کا شیڈول چیک کرنے لگی۔ میں موقع پا کر رئیس کو باہر کھینچ لایا "یار! میں ہاشم رضا سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"اس وقت۔۔۔!" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو سوا بارہ بجا رہی تھی "میرا مطلب ہے نیلم۔۔۔!"

"اب اتنا بھی جورو کا غلام نہ بن" میں نے جھلا کر کہا "وہ ابھی تیری جورو نہیں ہے۔ ہم ایک گھنٹے میں لوٹ آئیں گے۔"

بادلِ ناخواستہ رئیس رضامند ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ہم جیپ میں جائیں گے۔ تاریکی کے باعث مجھے اپنا چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ رئیس کا یار جیرا بلیڈ بھاٹی گیٹ کے پاس ہی رہتا تھا۔ وہاں کی تنگ گلیوں کی وجہ سے جیپ ہمیں باہر ہی چھوڑنی پڑی تھی۔ رئیس نے ایک تنگ و تاریک سے مکان کا بوسیدہ دروازہ بجایا۔

"کون سُور دا پتر اے اس ویلے؟" عقبی طرف سے کسی تنگ مزاج بڈھے نے دریافت کیا۔

"چاچا' چپ کر کے سو جا" رئیس نے بلند آواز سے کہا "جوانی میں تو بھی اسی وقت آیا کرتا تھا۔"

اس پر چاچا نے بلند آواز سے رئیس کے بارے میں کئی ناقابلِ بیان انکشافات کیے اور کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی۔ اسی لمحے دروازہ چرچرا کر کھلا اور اندر سے ایک بھوت نظر آنے والے بڑے میاں نے جھانکا۔

"چاچا۔ جیرا کہاں ہے؟"

"سو رہا ہے" اس نے کھرکھراتی آواز میں کہا۔

"اسے جگا دے!" رئیس اندر داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ باہر سے چھوٹا سا نظر آنے والا یہ مکان اندر سے خاصی کشادہ حویلی ثابت ہوا تھا۔ اس کے وسط میں صحن تھا جس کے چاروں طرف دالانوں کے بعد کمرے تھے۔ پرانے لاہور میں اس قسم کی حویلیاں آج بھی بے شمار ملتی ہیں۔ صحن کے وسط میں پانی کا ایک حوض بھی تھا۔ گرمیوں میں لوگ اس قسم کے دالانوں کے گرد چارپائی بچھا کر سویا کرتے تھے۔ کچھ دیر بعد جیرا بلیڈ آنکھ ملتا اندر سے نمودار ہوا۔ وہ بارعب مونچھوں والا خوش شکل شخص تھا۔ جعلی انسپکٹر بن کر اس نے بے شمار لوگوں کو بے وقوف بنایا تھا۔ وہ اتنا دیدہ دلیر تھا کہ پولیس کے ساتھ بھی ہاتھ کر جاتا تھا۔ مگر ذہین آدمی تھا اس وجہ سے آج تک گرفت میں نہیں آیا تھا۔

"ناصر صاحب!" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ "بڑے دنوں بعد درشن ہوئے۔"

"یہ آج کل دور درشن ہو گیا ہے" رئیس نے کہا "یہ بتا کہ پرندہ خیریت سے ہے؟"

"ہو جی' خیریت کا کیا سوال۔ اس کی مجال نہیں کہ جال کو ہلا بھی سکے۔ دانہ دنکا دے دیا تھا' اب سو رہا ہے۔"

"اسے جگاؤ۔ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

جیرا بلیڈ نے سگریٹ سلگایا۔ ایک رئیس کو دیا۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ ہمیں لے کر دالان کے پار کونے والے کمرے کی طرف گیا۔ جس کے دروازے پر موٹا سا تالا جھول رہا تھا۔ اس نے ہانک لگائی۔ "چاچا بھوت!"

وہ کسی بھوت کی طرح نمودار ہوا تھا۔ اس کی اندر دھنسی آنکھیں اور سفید لمبوترے چہرے سے بھوت کا تاثر ہی ملتا تھا۔ جیرا بلیڈ نے اس کا بالکل درست نام رکھا تھا۔ "جی سرکار!" اس نے کھرکھراتی آواز نکالی۔

"تالا کھولو" جیرا بلیڈ نے حکم دیا۔

اس نے جیب سے چابیوں کا ایک وزنی گچھا نکالا اور اس میں سے چن کر ایک چابی تالے میں داخل کی۔ تالا اور دروازہ کھول کر وہ ایک طرف ہو گیا۔ "اوپر کا خیال رکھنا" اس نے اندر داخل ہونے سے پہلے اسے حکم دیا۔ کمرا بظاہر خالی تھا۔ وہاں سوائے بڑی بڑی قدیم طرز کی الماریوں کے کچھ نہیں تھا۔ نذیر احمد نے ایک الماری کے پیچھے ہاتھ ڈال کر نہ جانے کیا کیا اور پھر الماری کو دھکا دیا تو وہ آرام سے ایک طرف سرکتی چلی گئی۔ اس کے نیچے سے سیڑھیاں نمودار ہوئی تھیں۔ میں اور رئیس اس کے پیچھے نیچے اترے تھے۔ سیڑھیاں تنگ تھیں۔ ان کے اختتام پر جالی دار سمٹنے والی گرل لگی تھی جیسی کہ عام طور سے لفٹوں میں ہوتی ہے۔ جیرے نے اس بار اپنی جیب سے چابی نکال کر گرل میں لگا تالا کھولا۔ میں جالی سے دیکھ رہا تھا' پروفیسر ہاشم رضا ایک چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ گرل سمٹنے کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ سیڑھیوں پر تاریکی تھی لیکن کمرے میں سو واٹ کا بلب جل رہا تھا۔

"میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گا" اس نے دبی آواز میں کہا اور پلٹ کر اوپر چلا گیا تھا۔

غالباً اپنی شناخت چھپانے کے لیے جیرا اب تک اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ ہمارے لیے وہ رب نواز کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ رئیس سے پرانی دوستی کے ناتے وہ اتنا کر رہا تھا۔ اس سے زیادہ کی توقع کرنا صحیح نہیں تھا کیونکہ آخر اسے اس دریا میں رہنا تھا جس کا مگرمچھ رب نواز تھا۔

پروفیسر ہاشم رضا بستر پر بیٹھا چندھیائی ہوئی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔ اس تہ خانے میں سوائے لوہے کی اس چارپائی کے اور کچھ نہیں تھا۔ نذیر احمد نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہاں کوئی ایسی شے نہ رہے جس سے قیدی خود کو یا کسی اور کو نقصان پہنچا سکے۔ ہاشم رضا نے مجھے پہچان لیا "شاہ عالم تم کیا چاہتے ہو؟ اس طرح قید میں رکھ کر تمہیں کیا ملے گا؟ میں کام کرنے والا آدمی ہوں' یوں بیکار رہ کر مر جاؤں گا۔"

"اتنی آسانی سے نہیں مرو گے تم" میں نے آگے بڑھ کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ سے پسٹل اس کے سر سے لگا دیا تھا "البتہ تم چاہو تو میں ایک گولی میں تمہاری مشکل آسان کر سکتا ہوں۔ ویسے بھی تم جیسے شخص کا مر جانا انسانیت کے لیے اچھا ہی ہوگا۔"

میرے لہجے میں سفاکی محسوس کر کے وہ کانپنے لگا تھا۔

"خدا کے لیے۔۔۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

"تم نے انسانوں کی نسل بگاڑی ہے' یہ کیا کم سنگین جرم ہے؟"

"میں نے صرف تجربات کیے ہیں" اس نے ہٹ دھرمی سے کہا۔ خوف کے باوجود وہ یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس کے تجربات اور ان کے نتائج انسانیت سوز ہیں۔

"ہاشم رضا' اگر تمہاری کوئی بہن یا بیٹی ہوتی تو کیا تم ان پر بھی یہ تجربات کر گزرتے؟ جبکہ تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو کہ اس تجربے کا نشانہ بننے والی عورت کے حصے میں صرف موت آتی ہے۔"

اس کی مجرمانہ خاموشی ہی اس کا اعتراف تھی۔ میں نے اچانک اس کے سر پر پستول کی نال ماری تو وہ چیخ اٹھا تھا۔ اس کے سر کی کھال پھٹ گئی تھی اور اس سے خون بہنے لگا تھا۔ وہ بستر پر گر پڑا اور کراہتے ہوئے کہنے لگا "تم مجھ پر تشدد کیوں کر رہے ہو؟"

"پروفیسر! اس ویران مکان میں مجھے زیادہ موقع نہیں ملا تھا۔ اس لیے میں نے تم سے پوچھ کچھ نہیں کی لیکن تم نے خود ہی بہت ساری باتیں چھپا کر اپنے انجام پر مہر ثبت کرلی" میں نے خوف ناک انداز میں کہا۔

"میں نے کوئی بات نہیں چھپائی" اس نے سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"بکومت۔" میں نے اس بار اس کی پسلی پر جوتے کی ایڑی ماری۔ وہ چیخ کر بستر پر تڑپنے لگا تھا۔ وہ ایک علمی شخص تھا اور ساتھ ہی عمر رسیدہ بھی لیکن اس نے اپنے کرتوتوں سے خود کو ہر طرح کی عزت اور ہمدردی سے محروم کرلیا تھا۔ "تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ ان دنوں تم کچھ اور تجربات بھی کررہے ہو جو اپنے آخری مراحل میں ہیں۔"

وہ مارے حیرت کے تڑپنا بھول گیا تھا۔ "تت۔۔ تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"تمہارے آقائے ولی نعمت نے خود بتایا" میں نے دوسری ٹھوکر اس کے بازو پر ماری۔

"رب نواز نے؟" اس نے کراہ کر بازو تھام لیا "میں نہیں مان سکتا۔"

"لیکن ہم منوا سکتے ہیں" میں نے اس بار اس کے منہ پر ایک کک ماری۔ میں نے خیال رکھا تھا کہ اسے نقصان نہ ہو مگر اس کے لیے یہ بھی بہت تھا' وہ ایک بار پھر بستر پر تڑپنے لگا۔

"وہ تمہارے لیے تڑپ رہا ہے" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "کیوں کہ اسے تم سے ابھی بہت سارے کام لینے ہیں لیکن جس دن اس نے تمہارے تجربات کو کیش کرالیا' اسی دن تمہارا وجود اس کے لیے بے مصرف ہوجائے گا اور تم بڑی اچھی طرح جانتے ہو کہ رب نواز بے مصرف چیزوں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔"

اس نے سر اٹھا کر بڑی مشکل سے کہا "تم مجھے اس کے خلاف ورغلا نہیں سکتے۔"

"میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا۔ میرے نزدیک تم دونوں برابر کے مجرم ہو" میں نے ایک بار پھر پاؤں اوپر کیا تو وہ سہم کر گٹھری سا بن گیا تھا۔ اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے تجربات کے بارے میں ایک ایک لفظ بتاؤ۔ ان دنوں تم کتنے نئے تجربات کررہے ہو اور کن بدنصیبوں پر کررہے ہو؟ ملک سے باہر تمہارا کن لوگوں سے رابطہ ہے؟"

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو۔؟" اس نے کہا۔

"یہ تو صرف ایک نمونہ ہے" میں نے اس کی حالت کی طرف اشارہ کیا "ورنہ میرے پاس ایسے طریقے بھی ہیں کہ محاورے کے مطابق پتھر بھی بول جائے۔"

"تم شاید شبنم کو فراموش کررہے ہو' وہ رب نواز کے پاس ہے۔"

میں نے موبائل پر آزاد صاحب کے اخبار کے دفتر کا نمبر ملایا۔ یہ بڑی مصروفیت کا وقت تھا۔ اخبار کی آخری کاپی جارہی تھی۔ پس منظر میں چیخ و پکار سے لگ رہا تھا جیسے قیامت کا ضمیمہ نکل رہا تھا اور شاید اس کے بعد اخبار نہیں چھپے گا۔ بہ مشکل فون آپریٹر میری بات سمجھ سکا۔ اس نے آزاد صاحب سے لائن ملائی۔

"شاہ عالم عرض کررہا ہوں" میں نے چلا کر کہا۔ میں ہاشم رضا کے سامنے ناصر عظیم کا نام استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا' آزاد صاحب بولے۔

"اچھا اچھا۔۔ عالم بالا سے بات کررہے ہو گویا؟"

"شبنم آگئی ہے کیا؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ہاں۔۔ یہاں آئی بھی اور چلی بھی گئی۔ وہ جو شاعر نے کہا ہے۔"

"اسے آپ ڈالیے بھاڑ میں' یہ بتائیں کہ وہ ٹھیک تھی؟"

"میاں' بہ ظاہر تو ٹھیک ہی لگ رہی تھی' باقی ڈاکٹر کا چیک کرنا اور ہی ہوتا ہے۔ اچھا میاں' اجازت دو' اخبار کا معرکہ زوروں پر ہے۔"

آزاد صاحب نے فون بند کردیا۔ میں نے اطمینان کی طویل سانس لی تھی۔ شبنم ٹھیک تھی ورنہ آزاد صاحب مجھ سے نہ چھپاتے۔ میں نے فاتحانہ نظروں سے ہاشم رضا کی طرف دیکھا۔ "شبنم اب رب نواز کے پاس نہیں ہے۔"

اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا تھا "اس نے اسے کیسے رہا کردیا؟"

"شاید اسے تمہاری اتنی پروا نہ ہو جتنا کہ تم خیال کرتے ہو" میں نے کہا "کیا خیال ہے تم میرے سوالوں کے جواب دے رہے ہو یا میں دوسرے طریقے آزماؤں؟"

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا "پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ان دنوں تم مزید کتنے تجربات کررہے ہو؟"

وہ جواب دینے سے پہلے ہچکچایا "تین۔!"

"گویا تم تین عورتوں کو مزید موت کے گھاٹ اتارنے

جارہے ہو؟" میں نے طنز کیا۔

اس نے نفی میں سرہلایا "میں نے ان مشکلات پر قابو پالیا ہے جن کی وجہ سے زچگی کے دوران میں یہ عورتیں ہلاک ہوجاتی تھیں' مجھے یقین ہے وہ زندہ رہیں گی۔"

"تم اب تک کتنے حیوان نما انسان تخلیق کرچکے ہو؟"

"ایک درجن کے قریب" اس نے جواب دیا۔

"ایک درجن!" میں چونکا تھا۔ "جہاں تک میں جانتا ہوں' ان کی تعداد چھ سے زیادہ نہیں ہے؟"

"ان میں سے دو بچپن میں ہی ہلاک ہوگئے تھے۔ دو رب نواز کے پاس ہیں اور باقی دو میں نے ایک غیر ملکی کے حوالے کردیے تھے۔"

"یعنی بیچ دیے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"تم چاہو تو ایسا ہی سمجھ لو۔" اس نے شانے ہلائے۔ اس نے بڑی تیزی سے خود پر قابو پالیا تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کا آدمی تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا۔

"سنو ہاشم رضا' تم ان تجربات کے لیے رقم کہاں سے حاصل کرتے ہو' یقیناً رب نواز تمہارا واحد فنانسر نہیں ہے؟"

"میں کچھ غیر ملکی این جی اوز سے بھی مدد لیتا ہوں۔ ایسا کرنا میری مجبوری ہے۔ تجربات کے لیے سامان اور مشینری بے حد مہنگی ملتی ہے۔"

"تم جو کرتے ہو' یہ جینٹک سائنس میں آتا ہے' پھر تم آثار قدیمہ میں کہاں سے گھسے ہوئے ہو' ایک بالکل ہی مختلف شعبہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اس میں بھی ڈگری لی ہے" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "بیرون ملک بہ حیثیت ماہر آثار قدیمہ میری ایک ساکھ ہے۔ تم اسے ایک کور بھی کہہ سکتے ہو' میری دوسری حیثیت کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہیں۔"

"تم رب نواز کے ان ٹھکانوں کے بارے میں بتاؤ' جو تم نے دیکھے ہوئے ہیں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ تم وہاں گھس بھی نہیں سکتے" اس نے اطمینان سے کہا اور کچھ پتے لکھ دیے جو رئیس نے نوٹ کرلیے تھے۔

"اب ایک آخری سوال' تم جن تین عورتوں پر تجربات کررہے ہو' وہ کہاں ہیں؟"

"وہ تینوں ان ہی میں سے ایک ٹھکانے پر تھیں" اس کا اشارہ اس پرچے کی طرف تھا جس پر پتے لکھے تھے "لیکن مجھے یقین ہے کہ میرے غائب ہوتے ہی رب نواز نے انھیں وہاں سے ہٹالیا ہوگا۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ مگر پھر بھی میں نے اسے خبردار کردینے والے انداز میں کہا "پروفیسر ہاشم رضا ایک بار پھر سوچ لو۔ ابھی تم ہمارے پاس ہو' تمہاری کہی ہوئی ایک بھی بات غلط ثابت ہوئی یا مجھے معلوم ہوا کہ تم نے کچھ چھپایا ہے تو تم مجھ سے رحم کی توقع مت رکھنا۔ میں فوراً تمہیں شوٹ کردوں گا۔ یوں سمجھو کہ میں تم سے شدید نفرت کرتا ہوں اور تمہیں مار ڈالنے کا بہانہ تلاش کررہا ہوں۔ مجھے امید ہے تم مجھے بہانہ نہیں دوگے۔"

"مم۔ میں نے ایک بھی بات غلط نہیں بتائی ہے" اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اسی میں تمہاری عافیت ہے" میں نے کہا اور رئیس کو اوپر کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے اب اسے چھوڑ دینا چاہیے" میں نے اوپر آکر کہا۔

"اتنی آسانی سے" رئیس نے حیرت سے کہا "میرا خیال ہے کہ اس خبیث کو مار کر کہیں گاڑ دینا اچھا ہوگا یہ انسانوں کے لیے خطرہ ہے۔"

"نہیں یار۔ اگر اسے نہ چھوڑا تو رب نواز پھر کمینگی پر اتر آئے گا۔"

"وہ ویسے ہی کمینہ پن دکھا سکتا ہے" رئیس بولا "اس کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ صرف بھڑک جائے۔"

"پھر بھی ہاشم رضا ہمارے لیے بے کار ہے۔"

"مگر یار' اسے ایسے بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔" رئیس نے اصرار کیا "ذرا سوچ' کوئی ترکیب کہ ہم ہاشم رضا کو چھوڑ بھی دیں اور وہ رب نواز کو بھی نہ ملے۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے" میں نے غور کیا۔

"کوئی مشکل نہیں ہے" جبرا بلیڈ یعنی نذیر احمد نے دخل درمعقولات کیا "اگر رب نواز کا کوئی اور دشمن ہے تو اسے درمیان میں لے آؤ۔ اس طرح تمہاری بچت ہوجائے گی۔"

میں نے حیرت سے نذیر احمد کی طرف دیکھا۔ اس نے واقعی پتے کی بات کی تھی۔ میرے ذہن میں فوراً پیر سبحان شاہ کا نام آیا تھا۔ وہ رب نواز کا جانی دشمن ہو رہا تھا۔ اگر ہاشم کو رضا اس کے حوالے کردیا جاتا تو رب نواز ایک بڑے چکر میں پھنس سکتا تھا۔ "واللہ!" میں نے نذیر احمد کی پشت پر ہاتھ مارا۔ وہ گڑبڑا گیا۔ اسے مجھ سے ایسی بے تکلفی کی توقع نہیں تھی "کمال کردیا تم نے۔"

"بس جی! اپنے رئیس بھائی کی صحبت میں سب سیکھا

ہے" اس نے انکساری دکھائی۔

"اپنی بدمعاشیاں میرے کھاتے میں نہ ڈال" رئیس خفا ہوگیا۔

"یار! آئیڈیا برا نہیں ہے" میں نے کہا "میرا خیال ہے پہلے مجھے پیر سبحان شاہ سے بات کرنی چاہیے۔"

ہم مال روڈ تک آئے۔ وہاں ایک ساری رات کھلا رہنے والا پی سی او مل گیا تھا۔ میں نے سبحان شاہ کا نمبر ملوایا۔ اس کے ملازم نے بتایا کہ شاہ صاحب سو رہے ہیں' میں نے کہا "انہیں فوراً جگاؤ' اہم معاملہ ہے۔"

"سرکار معافی دیو۔ ہم شاہ سائیں کو نہیں اٹھا سکتے۔ وہ ناراض ہوگئے تو کھال اتار لیں گے۔"

"دیکھو' تم نے اگر انہیں نہیں جگایا تو ان کا بڑا نقصان ہوگا پھر وہ ضرور تمہاری کھال اتار لیں گے" میں نے اسے خبردار کیا۔ "میں یقین دلاتا ہوں' میرا نام سن کر وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ ان سے کہو کہ شاہ عالم ان سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

ملازم غائب ہوگیا اور میں بے تابی سے انتظار کی گھڑیاں گننے لگا تھا۔ خدا خدا کر کے سبحان شاہ لائن پر آیا۔

"شاہ عالم!" اس نے پوچھا۔

"ہاں شاہ صاحب! میرے پاس آپ کے لیے ایک اہم خبر ہے۔"

"پہلے یہ بتاؤ' تم کہاں ہو؟"

"شاہ صاحب' آپ کو علم ہوگا کہ رب نواز نے کمینگی دکھاتے ہوئے ایک بار پھر شبنم کو اغوا کرلیا تھا۔ جواب میں' میں نے اس کے ایک اہم آدمی کو اٹھالیا۔ وہ شبنم کو چھوڑنے پر مجبور ہوگیا مگر اس نے جو کمینہ پن دکھایا ہے' میں اسے اس کی سزا دینا چاہتا ہوں۔"

"وہ کس طرح؟" اس نے پوچھا۔

"میں رب نواز کے اس اہم آدمی کو آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے آپ رب نواز کے بارے میں اور بھی بہت کچھ جان سکیں گے۔ آپ کے سامنے اس کے کئی اور مکروہ چہرے سامنے آئیں گے۔"

"اگر اسے ہمارے حوالے کردوگے تو رب نواز کو کیا جواب دوگے؟"

"اس کی آپ فکر نہ کریں' اگر آپ رضامند ہیں تو میں اس شخص کو آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یقین کریں' یہ شخص آپ کے لیے ایک تحفہ ہوگا۔ اس کے بدلے رب نواز آپ کے سارے نقصان پورے کرنے کے لیے تیار ہوجائے گا جو اس نے کیے تھے۔"

"تم اس آدمی کو کیسے پہنچاؤ گے؟" اس بار سبحان شاہ کے لہجے میں دلچسپی تھی۔

"میں اس بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ آپ صرف اپنے آدمیوں کو تیار رکھیں۔ ممکن ہے رب نواز کے آدمیوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑے۔"

"اس صورت میں تو سوچنا پڑے گا بابا!"

"سوچنے کا وقت نہیں ہے شاہ صاحب!" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا "میں اس شخص کو زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اگر آپ اسے اپنے قبضے میں نہیں لینا چاہتے تو مجبوراً مجھے اسے رہا کرنا پڑے گا۔"

اس نے کچھ دیر سوچا "اچھا بابا۔ میں ایک گھنٹے بعد تمہیں بتاتا ہوں' تمہارا نمبر کیا ہے؟"

"میں پی سی او سے بات کر رہا ہوں" میں نے جواب دیا "ایک گھنٹے بعد میں خود فون کروں گا۔"

میں نے اس کا جواب سنے بغیر فون بند کردیا۔ پی سی او والے کو ادائیگی کر کے ہم باہر آگئے۔ نزدیک ہی ایک رات بھر کھلے رہنے والے کیفے میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے میں نے رئیس کو اپنی اور سبحان شاہ کی گفتگو سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ہاشم رضا کو رب نواز کے حوالے کرنے کے بجائے اسے سبحان شاہ کے سر منڈھ دینا درست ہوگا۔ اس سے ان دو پرانے حریفوں کے درمیان دشمنی کے کئی نئے باب کھل جائیں گے۔

"رب نواز سیاسی اور دولت کے لحاظ سے کتنا ہی طاقت ور سہی لیکن وہ سبحان شاہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا' وہ ایک مسلمہ گدی نشین پیر ہے' جس کے پاس دونوں کی طاقت سے بڑھ کر اس کے مریدوں کی طاقت ہے۔ یہ فوج اس کے اشارے پر اپنی جان قربان کرسکتی ہے اور کسی کی جان لے سکتی ہے۔ رب نواز کے پاس صرف کرائے کے آدمی ہیں جو وفاداری سے زیادہ اس کے خوف سے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر سبحان شاہ کھل کر اس کے سامنے آگیا تو وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔"

"درست ہے۔ لیکن مکاری اور کمینگی میں رب نواز کہیں آگے ہے" رئیس نے اتفاق کیا۔ "وہ کھل کر سبحان شاہ کا مقابلہ نہیں کرے گا بلکہ چھپ کر اسے نقصان پہنچائے گا۔"

"سبحان شاہ اس کا مقابلہ بھی کرے گا۔"

"اسے دلاور شاہ کی موت کا نقصان ہوا ہے اور تو نے

خود بتایا تھا کہ پولیس شاہ عالم کی تلاش میں اس کی حویلی تک آگئی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رب نواز سیاسی طور پر اس سے کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔" آج رئیس بحث پر آمادہ تھا اور دلیل سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا' اس کی باتوں میں جان تھی۔

"یار' ہمارا مقصد تو انہیں آپس میں کتوں کی طرح لڑانا ہے۔ اب جس کا بھی نقصان ہو' فائدہ ہمارا ہی ہے۔"

"یہ درست ہے لیکن تو خوش فہمی میں مت آ' ممکن ہے سبحان شاہ اور رب نواز آپس میں ملاقات کر کے صلح کرلیں کیونکہ لڑائی ان دونوں کو تباہ کردے گی۔ جس طرح تو سبحان شاہ کو رب نواز کے خلاف بھڑکا رہا ہے' اسی طرح وہ بھی سبحان شاہ کو تیرے خلاف کرسکتا ہے۔"

"شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہو مگر پروفیسر کو سبحان شاہ کے حوالے کرنے کا ایک مقصد اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پروفیسر اپنے تجربات کو کامیاب نہ بنا سکے۔ اگر اسے روک لیا تو یہ بھی ہماری کامیابی ہوگی۔"

"ہمیں اس سے کیا لینا۔" رئیس جھنجلایا "یار' تیری اپنی ہی مشکلات کم نہیں ہیں تو اور چکروں میں ہاتھ ڈال رہا ہے' یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"رئیس' تو سوچ نہیں رہا کہ پروفیسر انسانوں پر کس قسم کے تجربات کر رہا ہے۔ وہ جو مخلوق تیار کر رہا ہے' انسانوں کے لیے وہ کتنی خطرناک ہے۔ رب نواز جیسے فرعونوں کے ہاتھ اس قسم کے ہتھیار نہیں آنے چاہئیں۔"

"یار' اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے" رئیس نے بے زاری سے کہا "اب کیا کرنا ہے' ابھی گھر جا کر نیلم کا سامنا بھی کرنا ہے' وہ سخت غصے میں ہوگی۔"

"ہونے دے یار!" میں ہنسا "عورت کا غصہ ہی کیا' پل میں چڑھتا ہے پل میں اتر جاتا ہے۔ چل اٹھ جا' اب سبحان شاہ کو فون کرلیں' یہ قصہ آج ہی نمٹانا ہے۔"

"لگتا ہے ساری رات تیرے ساتھ خوار ہوتے گزرے گی" رئیس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"بیٹا' مزے کرلے' کچھ عرصے بعد تو ان ہی راتوں کو یاد کر کے ٹھنڈی سانسیں لیا کرے گا۔"

پی سی او والا نوجوان وقت گزاری کے لیے ڈائجسٹ پڑھ رہا تھا۔ ظاہر ہے رات کے اس پہر کم ہی لوگ آتے تھے۔ اس کا زیادہ وقت فارغ گزرتا تھا۔ اس نے خاموشی سے سبحان شاہ کا نمبر ملایا اور کیبن میں مجھے فون اٹھانے کا اشارہ کر کے خود دوبارہ ڈائجسٹ میں گم ہوگیا۔

"شاہ صاحب' آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

"تم نے اس بندے کا کیا نام بتایا تھا۔؟ تم اسے کہاں میرے آدمیوں کے حوالے کروگے؟"

"مال روڈ پر ایک شاپنگ سینٹر ہے" میں نے ایک مشہور شاپنگ سینٹر کا نام لیا۔ "اپنے آدمیوں سے کہیں کہ ایک گھنٹے میں یہاں پہنچ جائیں۔ میں خود سامنے آئے بغیر ہاشم رضا کو چھوڑ دوں گا۔ اگر وہ آپ کے آدمیوں کے ہاتھ نہ آیا تو میری ذمے داری نہیں ہوگی۔ اپنے آدمیوں کو مسلح کر کے بھیجیں۔"

"وہ پہنچ جائیں گے لیکن بابا۔" میں نے اس کی پوری بات سنے بغیر فون رکھ دیا۔ نوجوان نے میرا دیا ہوا دوسرا نمبر ملایا۔ میں نے رب نواز سے بات کرنے کو کہا۔ وہ ایک منٹ بعد ہی لائن پر تھا۔ لگتا تھا کہ ہاشم رضا کی فکر نے اس کی نیند بھی چھین لی تھی۔ "شاہ عالم' میں نے شبنم کو رہا کردیا ہے۔ تم نے معلوم کرلیا ہوگا۔"

"ہاں" میں نے سرد لہجے میں کہا "اور اب میں ہاشم رضا کو رہا نہ کروں یا گولی مار کر اس کا قصہ ہی پاک کردوں تو؟"

یہ سنتے ہی رب نواز اپنی اصل زبان پر اتر آیا تھا۔ اس نے چلا کر کہا "شاہ عالم! تمہیں یہ دھوکا بہت مہنگا پڑے گا۔ میں تم سے تعلق رکھنے والے ایک ایک فرد کو مٹا دوں گا۔"

"مثلاً کون؟" میں نے ہنس کر کہا "سوائے شبنم کے کوئی ایسا فرد نہیں ہے جس سے تم میرا تعلق ثابت کرسکو۔ باقی تمہاری مرضی' جس کے خلاف جو چاہے کرتے رہو بلکہ اب مجھے شبنم کی پروا بھی نہیں ہے۔"

"کیوں؟" اس نے شک زدہ لہجے میں کہا۔

"میں ویسے ہی یہ ملک چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ظاہر ہے' میں ساری عمر تو شبنم کی دیکھ بھال نہیں کرسکتا اور پھر میرا خیال ہے کہ تم شبنم کے خلاف کچھ نہیں کرسکو گے۔ اس کی حیثیت پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہوجائے گی۔"

"کتنی ہی مضبوط ہوجائے' رہے گی تو ایک عورت ہی" رب نواز نے سفلے پن سے کہا "شاہ عالم! اگر تم نے ہاشم رضا کو نہ چھوڑا یا اسے ماردیا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا' تمہارا پیچھا کروں گا چاہے تم جہنم میں کیوں نہ جا چھپو۔"

"جہنم میں جانے کے لیے تمہیں میرا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں ہے' اس کے لیے تمہارے اعمال ہی کافی سے زیادہ ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"شاہ عالم!" رب نواز دہاڑا تھا "میں پاگل ہو رہا ہوں۔"

"ارے نہیں" میں نے سہمنے کی اداکاری کی "مجھے

پاگلوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بہرحال میں مذاق کررہا تھا۔ ہاشم رضا کا کیا میں نے اچار ڈالنا ہے۔ میں اسے پون گھنٹے بعد مال روڈ کے اس شاپنگ سینٹر کے سامنے چھوڑ دوں گا۔" شاپنگ سینٹر کا نام بتاتے ہوئے میں نے بات جاری رکھی۔ "تم اپنے آدمی بھیج کر اسے وہاں سے منگوا سکتے ہو" یہ کہتے ہی میں نے فون بند کردیا۔ پی سی او والے کو سو کا ایک نوٹ دے کر میں بقیہ لیے بغیر واپس مڑا، رئیس جیپ میں تیار بیٹھا تھا۔

"حرکت میں آجا، وقت کم رہ گیا ہے۔ ہمیں ہاشم رضا کو لے کر وہاں پہنچنا ہے۔"

محض دس منٹ میں ہم نے ہاشم رضا کو جبرا بلیڈ کے ٹھکانے سے اٹھایا۔ احتیاطاً اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے جیپ تک لائے۔ رئیس نے جیپ کی نمبر پلیٹیں تبدیل کیں اور ہم مال روڈ کے اس شاپنگ سینٹر کی طرف روانہ ہوگئے۔ جس کا پتا میں نے بیک وقت سبحان شاہ اور رب نواز کو دیا تھا۔ جیپ میں نے شاپنگ سینٹر سے ذرا پہلے روڈ کے دوسری طرف کھڑی کی تھی۔ یہاں تاریکی تھی اور جیپ میں کسی کی موجودگی کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پھر بھی میں نے احتیاطاً سر نیچے کرلیا تھا اور کبھی کبھی سر اٹھا کر باہر کا جائزہ لے لیتا تھا۔ رئیس عقبی نشست پر پروفیسر کو گن پوائنٹ پر لیے بیٹھا تھا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔

ٹھیک تین بجے ایک بڑی کار آکر شاپنگ سینٹر کے سامنے رکی اور اس میں سے کئی سائے نکل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ کار ذرا آگے جا کر رک گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ کون ہوسکتے تھے۔ رب نواز کے گرگے یا سبحان شاہ کے مرید۔ بہرحال وہ مسلح تھے۔ اس کے پانچ منٹ بعد مخالف سمت سے دو جیپیں نمودار ہوئیں اور گھوم کر شاپنگ سینٹر والی روڈ پر آگئیں، جب وہ میری جیپ کے پاس سے گزریں تو مجھے اس میں دلنواز کی جیپ کو پہچاننے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ گویا پہلی پارٹی سبحان شاہ کے آدمیوں کی تھی۔ دونوں جیپیں آکر شاپنگ سینٹر کے سامنے رکیں اور اس میں سے نصف درجن کے قریب افراد نکل کر ادھر ادھر پھیل گئے تھے۔ افراد کے لحاظ سے رب نواز کی پارٹی کو برتری حاصل تھی لیکن سبحان شاہ کے آدمیوں کو یہ فائدہ تھا کہ رب نواز کی پارٹی ان کی موجودگی سے واقف نہیں تھی۔ میرے خیال میں یہ حرکت میں آنے کا بہترین وقت تھا۔ میں پہلے ہی رئیس کو فرار کے راستے کے بارے میں سمجھا چکا تھا۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"رئیس ہوشیار، میں جیسے ہی جیپ روکوں، اسے باہر دھکا دے دینا۔"

"نہیں" ہاشم رضا چلایا "تم لوگ مجھے مار دینا چاہتے ہو۔"

"چپ بے" رئیس نے اسے جھاڑا "تجھے مارنا ہوتا تو یہاں تک لانے کی زحمت کیوں کرتے؟"

میں نے جیپ تیزی سے چلا کر اسے شاپنگ سینٹر کے سامنے روڈ کے دوسری طرف روکا۔ جیپ کی آواز سن کر وہاں موجود افراد میں ہلچل مچی تھی جیسے ہی میں نے جیپ روکی، فضا ایک خوفناک دھماکے سے گونج اٹھی، کسی نے بڑے کیلی بر کا ہتھیار چلایا تھا لیکن نشانہ ہم نہیں تھے، اس کے ساتھ وہاں ایسے فائرنگ شروع ہوگئی جیسے کسی محاذ پر جنگ چھڑ گئی ہو۔ میں نے چلا کر رئیس سے کہا "اسے باہر دھکا دے۔"

میرے کہنے سے پہلے ہی رئیس ہاشم رضا کو باہر دھکا دے چکا تھا جو گھگھیائے ہوئے انداز میں رئیس سے جیپ میں رہنے کی درخواست کررہا تھا۔ باہر جاری گھمسان کی جنگ میں اسے اپنے مارے جانے کا خدشہ تھا۔ مگر رئیس نے اس کے واویلے پر توجہ دیے بغیر اسے باہر دھکا دے دیا۔ میں نے جیپ چلا دی۔ عقبی آئینے میں مجھے ہاشم رضا زمین پر گرتا اٹھتا اور جیپ کے پیچھے دوڑتا نظر آیا تھا۔ میں نے ذرا آگے جا کر جیپ ایک ذیلی سڑک پر موڑ دی۔ اس سے پہلے رب نواز کی پارٹی کی ایک جیپ حرکت میں آچکی تھی۔ وہ ہمارے تعاقب میں آرہی تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ اسے موڑ کاٹ کر اسی طرف آتے ہوئے خاصی دیر لگے گی۔ مگر یہ دیکھ کر میرا اطمینان غارت ہوگیا تھا کہ جیپ درمیان میں گرین بیلٹ پر چڑھ کر اس طرف اتر آئی تھی اور اب تیزی سے ہماری جیپ کے پیچھے آرہی تھی۔

"رئیس ہوشیار!" میں نے چلا کر کہا "رب نواز کے کتے آرہے ہیں۔"

"تو ڈرائیونگ کر۔ ان کو میرے لیے چھوڑ دے" رئیس نے کہا تو میں نے اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر لگا دی، یہ ایک سیدھی روڈ تھی۔ اس پر آگے جا کر بھائی گیٹ کا علاقہ شروع ہوجاتا تھا۔ میں نے ایکسی لریٹر دباؤ ڈالا تو جیپ چیتے کی طرح جست لگا کر بھاگی تھی۔ بلاشبہ یہ ایک برق رفتار گاڑی تھی اور اس کی روڈ گرپ بھی شاندار تھی۔ میں نے عقب سے گولیاں چلنے کی آواز سنی تو جیپ کو لہرانے لگا۔ رئیس نے اپنے پستول سے جواب دینا شروع کردیا لیکن رب نواز کے آدمیوں کے پاس بڑا اسلحہ تھا، ان کی چلائی گولیاں جیپ کے آس پاس سے گزر رہی تھیں جبکہ ان کی جیپ پستول کی رینج

سے باہر تھی۔ ہماری عافیت اسی میں تھی کہ ان سے دور رہیں۔ سیدھی روڈ پر وہ ہمیں پکڑ ہی لیتے یا ان کی چلائی کوئی گولی مجھے، رئیس یا جیپ کے ٹائر کو بھی لگ سکتی تھی۔ میں نے جیپ ایک گلی میں موڑ لی۔ اس علاقے میں وسیع و عریض بنگلے بنے ہوئے تھے۔ جن کے سامنے کشادہ سڑکیں تھیں۔ دوسری جیپ بدستور ہمارے پیچھے تھی۔ اس کا ڈرائیور ماہر تھا اور اس نے اب تک موقع نہیں دیا تھا کہ ہم اس کی نظروں سے اوجھل ہوسکیں۔ ایک سڑک سے گزرتے ہوئے میری نگاہ ایک عمارت کے کھلے کمپاؤنڈ پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ آگے جا کر میں نے جیپ کو بائیں طرف گھمایا، اس کے بعد جو پہلی سڑک آئی اسی پر پھر بائیں طرف گھما دیا اور جب آخری بار جیپ گھومی تو ہم اسی سڑک پر تھے۔

"یہ کیا کررہا ہے؟" رئیس جھلایا "بھاگنے کی فکر کر۔"

"تو دیکھتا رہ" میں نے کہا اور جیپ عمارت کے کمپاؤنڈ میں گھسا دی۔ میں نے روکنے کے لیے پوری قوت سے بریک لگائے۔ جیپ پھسلی اور گھوم کر اس کا رخ کمپاؤنڈ کے گیٹ کی طرف ہوگیا تھا۔ میرے کانوں نے دوسری جیپ کے آنے کی آواز سنی۔ ایک خودکار کے سے انداز میں میرے ذہن نے حساب کتاب کیا۔ میں نے چلا کر رئیس سے کہا "رئیس، نیچے اتر جا۔"

"تو کیا کررہا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بکواس مت کر، نیچے اتر" میں نے دہاڑ کر کہا۔ میرے لہجے میں وحشت محسوس کرکے وہ پچھلا دروازہ کھول کر نیچے کود گیا۔ اس لمحے میں نے ایکسی لریٹر پاؤں کا پورا زور ڈالا تھا۔ جیپ ٹاپ گیئر میں تھی۔ وہ زخم خوردہ درندے کی طرح گیٹ کی طرف لپکی۔ گیٹ کے قریب آتے ہی میں نے دروازہ کھولا اور نیچے لڑھک گیا۔ جیپ خاصی رفتار پکڑ چکی تھی۔ پکے فرش پر بیلن کی طرح لڑھکتے ہوئے میں نے جیپ کو گیٹ سے نکلتے اور پھر رب نواز کی پارٹی والی جیپ کو پوری قوت سے اس سے ٹکراتے دیکھا تھا۔ دھماکا بے حد شدید تھا۔ دونوں جیپیں چشم زدن میں تڑ مڑ کر رہ گئی تھیں۔ جب دوسری جیپ کے ڈرائیور نے ہماری جیپ کو غائب پایا ہوگا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا ہوگا۔ اتنی جلدی کوئی غائب نہیں ہوسکتا تھا۔ اضطراری طور پر اس نے رفتار بڑھائی ہوگی اور اسی لمحے میری جیپ کمپاؤنڈ کے کھلے گیٹ سے نکلی تو اسے بچنے کی مہلت بھی نہیں ملی ہوگی بعد میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ جیپ میں سوار چار میں سے دو موقع پر مرگئے تھے جبکہ دلنواز اور اس کا ساتھی گن مین شدید زخمی ہوئے تھے، بعد میں گن مین بھی ہلاک ہوگیا تھا البتہ ڈاکٹروں نے دلنواز کو بچا لیا تھا۔ بیلن کی طرح لڑھکتے ہوئے میرا سر اچانک کسی شے سے ٹکرایا تھا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔

O*O

"اسے ہوش آرہا ہے" کسی نے خوشی سے چلا کر کہا۔ ہوش میں آنے کے بعد یہ پہلی آواز میں نے سنی تھی۔ غالباً میں کراہ رہا تھا۔ میرے سر میں جیسے روڈ رولر چل رہا تھا اور مجھ میں آنکھ کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔ سر میں ایسا درد تھا جیسے میرا سر پھٹ کر کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہوچکا ہو۔

"ناصر۔۔۔ ناصر، میری آواز سن رہے ہو ناں" اس بار نیلم کی آواز آئی۔ میں نے بہ مشکل آنکھیں کھولیں۔ میرے سامنے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ تھا۔

"میں زندہ ہوں؟" میں نے کراہ کر کہا۔

"اب تک تو ہو۔ بڑے ڈھیٹ آدمی ہو اپن کی طرح" دائیں طرف سے رئیس کے ہنسنے کی آواز آئی۔

"فضول مت بولا کرو" نیلم نے خفگی سے کہا "اب طبیعت کیسی ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا تھا۔

"پیاس لگی ہے۔ پانی پلاؤ" میں نے آہستہ سے کہا۔ نیلم نے لپک کر گلاس اٹھایا، اس میں پانی ڈالا پھر نہایت محبت سے میرا سر اپنے بازوؤں میں لے کر بلند کیا۔ میں اس کے وجود کی نرمی اور گرمی محسوس کررہا تھا۔ کتنا سکون تھا اس کی آغوش میں۔ اس نے گلاس میرے لبوں سے لگایا اور میں گھونٹ گھونٹ کرکے اس کے حیات بخش قطرے حلق سے اتارنے لگا۔ پانی پلا کر اس نے میرا سر نہایت احتیاط سے واپس تکیے پر رکھ دیا تھا۔

"کاش، میں بھی اپنا سر تڑوا کر آیا ہوتا" رئیس نے شرارت سے کہا تو نیلم جھینپ گئی۔

"تجھے سر تڑوانے کی ضرورت نہیں پڑے گی" میں نے مسکرا کر کہا تو نیلم خفا ہوگئی۔

"بس ہوش میں آتے ہی بک بک شروع کردی" وہ کمرے سے چلی گئی۔

میری حالت کسی قدر بہتر ہوگئی۔ میرے سر پر بندھی پٹی ظاہر کررہی تھی کہ مجھے باقاعدہ ڈاکٹر دیکھ چکا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ میں نیلم ہاؤس تک آیا کیسے۔ یہی سوال میں نے رئیس سے کیا تو وہ بولا "ابھی آرام کر۔ مجھے اور بھی کچھ کرنا ہے۔ واپس آکر بتاؤں گا۔" رئیس چلا گیا، وہ پریشان لگ رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ صبح ہو چکی تھی۔ گویا میں تین چار گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ کچھ دیر بعد نیلم ناشتے کی ٹرے اٹھائے چلی آرہی تھی۔ پہلے اس نے گیلے تولیے سے میرا منہ صاف کیا پھر سلیقے سے نیپکن بچھایا اور چمچ سے دودھ ملا دلیہ کھلانے لگی۔ میں نے جھلا کر کہا "میں مریض نہیں ہوں' بس ذرا زخمی ہوا ہوں۔ یہ سب کیا ہے' مجھے پراٹھا' توس اور آملیٹ دو۔"

"فضول باتیں نہیں۔ ڈاکٹر نے یہی کچھ کھلانے کو کہا ہے۔" اس نے دلیہ کھلانا جاری رکھا۔

اس نے زبردستی مجھے پورا پیالہ کھلا دیا۔ اس کے بعد میری کافی کی فرمائش نظر انداز کرکے ایک گلاس دودھ پلا دیا اور آخر میں کچھ گولیاں کھلائیں جن میں اس نے چالاکی سے نیند کی گولیاں بھی شامل کردی تھیں۔ یک لخت میرے اعصاب سکون میں آگئے اور میں غنودگی میں ڈوبتا چلا گیا۔

اگلی بار جاگا تو کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ رات ہو چکی تھی' صبح کیا ناشتا کب کا ہضم ہو چکا تھا اور میرے پیٹ میں محاورے کے مطابق چوہوں کی ریس جاری تھی۔ دواؤں کے اثر سے میرا جسم سُن ہو رہا تھا۔ درد کے بجائے پورے جسم میں ہلکی سی سنسنی محسوس ہو رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھا پھر بستر سے اتر آیا۔ نہ تو چکر آئے اور نہ ہی قدم لڑکھڑائے۔ یعنی چوٹ زیادہ سنگین نہیں تھی۔ میں نے باتھ روم میں جا کر اپنا جائزہ لیا۔ سوائے سر کے کہیں خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ گھٹنے اور کہنیوں پر چند معمولی سی خراشیں تھیں جو زمین پر لڑھکنے کی وجہ سے آئی تھیں' مجھے شدت سے نہانے کی خواہش ہو رہی تھی۔ میں نے ٹب میں نیم گرم پانی بھرا۔ اس میں ڈیٹول اور ایک کولون ملایا۔ پھر اس نیم گرم پانی میں کپڑے اتار کر بیٹھ گیا۔ اس غسل نے مجھے بے حد سکون دیا تھا۔ اس دوران میں' میں سوچتا رہا کہ ہاشم رضا کا کیا ہوا ہوگا۔ وہ کس کے ہتھے چڑھا ہوگا۔ رب نواز کی پارٹی کے' سبحان شاہ کے آدمیوں کے یا پھر ملک الموت کے ہتھے چڑھ گیا ہوگا۔ وہاں جس طرح اندھادھند فائرنگ ہو رہی تھی' ہاشم رضا کا مارا جانا عین ممکن تھا۔ اس صورت میں رب نواز کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا۔ بے شک پروفیسر ہاشم رضا ایک عظیم سائنس داں تھا لیکن وہ اپنی صلاحیتیں منفی معنوں میں استعمال کر رہا تھا۔

"ناصر' اب باہر آجاؤ۔" نیلم نے دروازے پر چلا کر کہا "کھانا تیار ہے۔"

"اُف کیا یاد دلایا۔" میں نے کہا اور جلدی جلدی باہر نکل کر جسم سکھا کر کپڑے پہنے۔ رئیس اور نیلم کھانے کے کمرے میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں پر پلاؤ اور قورمے کی خوشبو بری طرح میرے حواس پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ کھانے کے دوران میں رئیس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکا تھا۔ نیلم مسلسل مجھے تمیز سے کھانے کے لیے کہہ رہی تھی اور میں اس کی ایک نہیں سن رہا تھا۔ پیٹ میں کچھ گیا تو میرے حواس ذرا ٹھکانے آئے تھے۔ کھانے کے بعد میں نے دودھ پینے کا حکم مسترد کردیا اور کافی کا مطالبہ کرتے ہوئے دھمکی دی کہ اگر مجھے کافی نہ ملی تو میں رئیس کو لے کر کسی ریستوران میں چلا جاؤں گا۔"

"اچھا بابا! پیو کافی' اپنی صحت خراب کرو' مجھے کیا" اس نے جل بھن کر کہا تھا۔

"یہ خواتین شرافت کی زبان سمجھتی ہی نہیں ہیں۔" میں نے نیلم کے جانے کے بعد رئیس سے کہا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے اتفاق کیا اور مجھے وہ واقعات سنائے جو میرے بے ہوش ہونے کے بعد پیش آئے تھے۔ دونوں گاڑیاں مکمل طور پر تباہ ہوگئی تھیں اور میں بے ہوش تھا۔ رئیس نے اس موقع پر اپنے حواس بحال رکھے اور اس عمارت کے کمپاؤنڈ میں کھڑی کار میں مجھے ڈال کر وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ مال روڈ کے شاپنگ سینٹر کے سامنے ہونے والے اس ہنگامے میں تین افراد مارے گئے تھے اور تین افراد جیپوں کے تصادم میں ہلاک ہوئے تھے۔ جبکہ رب نواز کا بیٹا دلنواز اسی حادثے میں شدید زخمی ہو کر اسپتال میں پڑا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ رب نواز غصے سے پاگل ہو رہا ہوگا۔ اس وقت میں اس کے ہاتھ آجاتا تو وہ اپنے ہاتھ سے میرا قیمہ کر ڈالتا اچانک مجھے جیپ کا خیال آیا۔

"یار رئیس' ایک گڑبڑ ہوگئی۔ رب نواز جیپ کے نمبر سے پتا چلا لے گا کہ اسے ناصر عظیم نے خریدا تھا۔"

"مجھے پہلے ہی احساس ہوگیا تھا اس لیے میں صبح سویرے جا کر اس کار ڈیلر کو پکا کر آیا ہوں۔ تو نے جس سے جیپ خریدی تھی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ اول تو کار تبدیل کرنے کا ذکر نہ کرے اور دوسرے یہ کہ تیرا حلیہ بھی غلط بتائے۔ میں اسے بھی دھمکی دے آیا ہوں۔ اگر بات خراب ہوئی تو اس کی صورت خراب ہوجائے گی اور اس کے شوروم میں آگ لگا دی جائے گی۔"

"یہ دھمکی تو اسے رب نواز بھی دے سکتا ہے بلکہ رب نواز نے اسے اٹھوا لیا تو اسے حقیقت اگلتے چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے" میں نے اعتراض کیا۔

"میں نے جیپ کی نمبر پلیٹیں بھی بدل دی تھیں۔ چیسس اور انجن نمبر کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح کام بن جائے۔ میں نے جیرا بلیڈ سے کہہ دیا ہے کہ دس بیس ہزار کھلا کر پولیس والوں کی مدد سے ہی جیپ کے یہ نمبر مٹوا دے۔ اگر ایسا ہوگیا تو رب نواز کا باپ بھی جیپ کا پتا نہیں چلا سکتا۔"

"اتنا زیادہ خوش فہمی میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب مجھے فکر لاحق ہوگئی ہے۔ اگر رب نواز ناصر عظیم کے بارے میں جان گیا تو اس سے میرا تم لوگوں سے تعلق بھی چھپا نہیں رہے گا اور وہ چندا' کمال' قمر اور نیلم کے بارے میں بھی جان جائے گا۔"

"یار' ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ رب نواز نے تجھے اس وقت بھی دیکھا تھا جب تو شادو کے ساتھ ہوا کرتا تھا' کیا اسے یاد نہیں رہا کہ تیری صورت شاہ عالم سے کس قدر ملتی ہے۔"

"ممکن ہے اسے یاد نہ رہا ہو' ویسے بھی وہ کرکے بھول جانے والوں میں سے ہے' اسے یاد بھی نہیں ہوگا کہ اس نے دو نوعمر لڑکوں پر کتنا خوف ناک تشدد کیا تھا اور ایک فقیرزادی کو برہنہ کیا تھا۔ مگر ہمیں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تو چندا اور کمال کو خبردار کردے بلکہ اسپتال کی حفاظت کے لیے کسی سیکیورٹی ایجنسی سے گارڈز رکھوا لے۔"

"نیلم پہلے ہی ایسا کر چکی ہے۔ اس کے کسی جاننے والے ریٹائرڈ کرنل کی سیکیورٹی ایجنسی ہے' اس نے سارے بندے چن چن کر رکھے ہیں۔ سنا ہے سابق آرمی کمانڈوز ہیں۔ چار گارڈز نیلم نے اپنے لیے ہائر کیے ہیں اور چار کمال کے اسپتال کے لیے۔ ان میں سے دو چندا' کمال یا قمر کے اسپتال سے باہر جانے کی صورت میں ان کے ساتھ رہا کریں گے۔"

"کیا نیلم عباسی اور رخشی کو بھول گئیں۔"

"نہیں یار' اس نے انہیں بھی کہا تھا لیکن ان دونوں نے انکار کردیا۔ عباسی نے کہا ہے' اسے گارڈز کی ضرورت نہیں ہے اس نے مقامی تھانے میں رپورٹ لکھوا دی ہے کہ اسے رب نواز سے خطرہ ہے اگر اسے کچھ ہوجائے تو رب نواز کو اس کا ذمے دار سمجھا جائے۔"

"کچھ ہونے کے بعد رب نواز کو ذمے دار بنانے سے فائدہ؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"رخشی نے اس سے کہا ہے وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ایک دو دن میں وہ سیکیورٹی گارڈ رکھ لے گی۔" میں نے سرہلایا "دراصل عباسی پیسے کے معاملے میں کمزور ہے اور خوددار بھی ہے' وہ ہم میں سے کسی کی مدد لینا پسند نہیں کرے گا۔ مگر رخشی اسے قابو کرلے گی۔ اس کے پاس دولت بھی ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

رخشی گھر پر ہی تھی "ناصر' کیسے ہو تم؟" اس نے خوشی سے کہا۔

"رخشی' ہم سب خطرے میں ہیں" میں نے اسے خبردار کیا اور پھر سارے حالات سے آگاہ کیا۔ "گزشتہ رات کا واقعہ بھی سنا دیا "ان حالات میں رب نواز کی کیفیت باؤلے کتے کی سی ہو رہی ہوگی؟ تم سب احتیاط کرو اور فوراً سیکیورٹی گارڈز رکھ لو۔ اگر اس سلسلے میں کوئی مسئلہ ہو تو نیلم کا ایک کرنل جان پہچان والا ہے' اس نے سیکیورٹی ایجنسی کھول رکھی ہے اور اس کے پاس اچھے گارڈز ہیں' اس سے بات کرلیتا۔"

"میں عباسی سے بات کروں گی" اس نے ہچکچا کر کہا۔

"دیکھو رخشی' یہ عمل کرنے کا وقت ہے بات کرنے کا نہیں۔ عباسی اس وقت خودداری کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ بے شک خودداری اچھی چیز ہوتی ہے لیکن اس سے زیادہ اہم چیز جان کی حفاظت ہے۔ اگر خدانخواستہ تمہیں یا عباسی کو کوئی نقصان ہوتا ہے تو میں ساری عمر تم لوگوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"یہ بات نہیں ہے" رخشی بولی "دراصل ایک دو دن میں ہم جارہے ہیں۔ پہلے اسلام آباد جائیں گے' وہاں عباسی کے کچھ رشتے دار ہیں' ان سے ملنا ہے پھر مری اور سوات کا ایک چکر بھی لگائیں گے۔ شادی کے بعد ہمیں ہنی مون منانے کا موقع ہی نہیں ملا" وہ شرمیلے انداز میں ہنسی "دس بارہ دن کا چکر ہے۔ اس کے بعد آکر دیکھیں گے۔ بس یہ وجہ تھی عباسی فوری طور پر سیکیورٹی گارڈز نہیں رکھ رہے ہیں۔"

"شکر ہے۔ میرے اوپر سے ایک فکر تو کم ہوگی" میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن جب تک تم لوگ چلے نہیں جاتے محتاط رہنا۔"

"اوکے بابا!" وہ ہنسی "آج شاید میں اور عباسی آئیں تمہاری طرف' یعنی نیلم ہاؤس۔"

فون بند کرکے میں رئیس کی طرف گھوما۔ "تو نے لاکر کا کیا کیا۔ اس کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"میں نے معلوم کرایا تھا لیکن لاکرز والا افسر بیماری کی وجہ سے چھٹی پر ہے۔ وہ واپس آئے گا۔ تب ہی کچھ ہو سکے گا۔" رئیس نے جواب دیا۔

"اس طرح تو بہت دیر ہوجائے گی۔" میں نے مایوسی

سے کہا "سبحان شاہ یا دلاور کے وارثوں کو لاکر پر قبضے کا موقع مل جائے گا۔ یقیناً اس لاکر میں قیمتی اور اہم اشیا رکھی ہوں گی۔"

"بلیک منی!" رئیس بولا "اندھی رشوت کی کمائی۔ احتساب کے ڈر سے اب راشی افسران جائیدادیں بنانے کے بجائے اپنی رقم ڈالرز یا پاؤنڈز میں بدل کر لاکروں میں رکھ رہے ہیں۔ ممکن ہے دلاور شاہ نے بھی ایسا ہی کیا ہو؟"

"یار سبحان شاہ! اسے بات کرنی ہے۔ اس سے معلوم کرنا ہے کہ ہاشم رضا اس کے ہاتھ لگا یا نہیں' آ باہر چل کر اسے فون کرتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" نیلم کمرے میں آئی "خبردار جو گھر سے قدم باہر نکالا۔"

"نیلم یہ کام ضروری ہے۔"

"کوئی ضروری نہیں ہے۔ اس گھر میں بھی دس فون ہیں۔ تم ان سے کیوں نہیں کال کرتے؟"

"اس لیے کہ سبحان شاہ ایک بارسوخ آدمی ہے' اس کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنے گھر بیٹھے معلوم کرلے کہ آنے والی کال کس نمبر سے کی جارہی ہے؟" میں نے اسے سمجھایا "تمہارے گھر کے لیے میں کوئی رسک نہیں لینا چاہتا۔ یہ میری بلکہ ہم سب کی محفوظ پناہ گاہ ہے۔"

"تم باہر جاؤ گے اور پھر کل کی طرح کوئی حرکت کرجاؤ گے۔ تم نے اپنی جان داؤ پر لگا کر ہم سب کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ جانتے ہو رئیس تمہیں جب اٹھا کر لایا تو میں سمجھی کہ خدانخواستہ تم۔۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ "بس میں نے کہہ دیا' تم نہیں جاؤ گے۔"

میں چڑ گیا "مجھے بھی اپنی جان پیاری ہے اور مجھے کوئی شوق نہیں ہے کہ اسے خطرے میں ڈالتا پھروں۔ آخر تم مجھے اتنا غیر ذمے دار کیوں سمجھتی ہو؟ کل یقینی موت ہمارے پیچھے تھی۔ اس سے اپنی اور رئیس کی جان بچانے کے لیے مجھے یہ خطرہ مول لینا پڑا تھا اور میں نیلم ہاؤس میں قید ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس صورت میں باہر کے مسئلے کون نمٹائے گا؟"

"تم بھی تو مسئلے پھیلاتے رہتے ہو" نیلم نے تیز لہجے میں کہا "اور انہیں سمیٹنے کی کوشش نہیں کررہے ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں نے برہمی سے کہا "کیا میں شوقیہ مسائل مول لے رہا ہوں؟"

میرے غصے سے وہ ڈر گئی "میرا یہ مطلب نہیں ہے لیکن دیکھو ناصر! ہم پہلے ہی بہت سارے خطروں میں گھرے ہوئے ہیں' آج موج دین۔۔۔"

"اس کا مسئلہ بعد میں بیان کرنا" رئیس نے جلدی سے اس کی بات کاٹی "ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھنے سے مسائل حل نہیں ہوا کرتے۔"

"مگر۔۔" نیلم نے کہنا چاہا۔

"کوئی اگر مگر نہیں" رئیس دہاڑا اور مجھ سے بولا "چلو ناصر!"

نیلم کا منہ پھول گیا تھا' وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

"الو کے پٹھے! ابھی یہ جاکر روئے گی" میں نے کہا۔

رئیس بھنا گیا "تو بھی یہیں بیٹھ کر رو۔"

"ناراض کیوں ہوتا ہے میرے یار!" میں ہنسا "میں نیلم کو دکھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"دیکھ تو میں بھی نہیں سکتا" اس نے سرد آہ بھری "لیکن یار! عورتوں کی زیادہ ماننے لگو تو یہ سر پر چڑھ جاتی ہیں' اور پھر ناچنے لگتی ہیں۔"

موبائل چارج ہوچکا تھا۔ اسے میں نے ساتھ لے لیا مگر فون مجھے پی سی او سے کرنا تھا۔ اس زمانے میں سی ایل آئی نہیں آئی تھی لیکن موبائل فون پر آنے والی کال کا نمبر آجاتا تھا۔ اس کے باوجود میں نیلم ہاؤس سے سبحان شاہ یا رب نواز کو فون نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان کے لیے عین ممکن تھا کہ یہ آنے والی کال کا پتا چلا لیتے اور اس طرح نیلم ہاؤس ان کی نظروں میں آجاتا۔ بلکہ میری کوشش تھی کہ نیلم کا لیا موبائل بھی کم سے کم استعمال کروں۔ اگرچہ رئیس نے اسے کسی سے مع کنکشن کے خرید لیا تھا۔ لیکن اگر رب نواز یا سبحان شاہ اس شخص تک پہنچ جاتے تو رئیس ان کی نظروں میں آجاتا اور یہ میں نہیں چاہتا تھا۔

راستے میں' میں نے آزاد صاحب کے دفتر فون کیا۔ وہاں حسب معمول میدانِ حشر کا سماں تھا۔ جب میں نے چوتھی بار چلا کر آزاد صاحب سے ملانے کو کہا تو آپریٹر کی سمجھ میں آیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دفتر میں خاصی جگہ ہونے کے باوجود آخر بے چارے فون آپریٹر کو ایک الگ کیبن کیوں مہیا نہیں کیا جاتا تھا۔ جہاں وہ سکون سے کام کرسکے۔ اس طرح چیخ و پکار کے درمیان بیٹھ کر اسے اپنا کام کرنا دشوار ہوجاتا ہوگا۔ خدا خدا کرکے آزاد صاحب لائن پر آئے۔ اس وقت بھی وہ فون لے کر اپنے کسی کاتب کو ڈانٹ رہے تھے' جس نے ایک سیاست داں کے نام میں فاش غلطی کرتے ہوئے اخبار پر حملے کا جواز مہیا کردیا تھا۔

"میاں' اگر کسی نے یہاں حملہ کیا تو تمہیں آگے کردیں گے کہ یہی ہے وہ ناہنجار جس نے ہوتی کو کھوتی بنادیا' یہ سمجھے

بغیر کہ اس سے گدھے کے جذبات پر کیا گزرے گی؟"

میں نے بہ مشکل اپنی ہنسی ضبط کی۔ بالآخر آزاد صاحب کو میرا خیال آگیا "ہاں بھئی کون ہے؟ اس نامعقول وقت۔۔ جب ہم ملک الموت کے ہاتھ بھی نہ آئیں۔"

"سلام عرض کرتا ہوں" میں نے ہنس کر کہا "میں بھی نام بدل جانے والا ایک کیس ہوں۔"

"ارے تم۔۔ میاں' بڑے موقع سے یاد کیا ہے۔ ہمارے اخبار کی ایک تازہ سرخی کے مطابق کل کی مار دھاڑ میں تم بھی ملوث تھے اور گویا مقتول ہوتے ہوتے رہ گئے؟"

"یہ غضب مت کیجیے گا" میں نے گھبرا کر کہا "فوراً خبر سے میرا نام نکال دیجیے۔"

"یہ تو نہیں ہوسکتا صاحب زادے' ہم پورا سچ چھاپتے ہیں اس لیے آج تک یہیں بیٹھے ہیں۔ دوسرے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ یہ پریس ریلیز ہے' ایف آئی آر میں تمہارا نام بھی آیا ہے یعنی شاہ عالم!"

میں سناٹے میں رہ گیا تھا۔ میں جتنا شاہ عالم کے کردار کو لوگوں کے ذہن سے اتارنے کی کوشش کررہا تھا' اتنا ہی یہ نام بار بار لوگوں کے سامنے آرہا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ یہ حرکت رب نواز کی تھی۔ میں نے کہا۔

"آپ پریس ریلیز کے ساتھ خبر اپنی بھی دے سکتے ہیں۔"

"ہاں' یہ تو ہم پہلے ہی کرچکے ہیں بلکہ ہم نے کئی اور اخباری مدیروں سے بات کی ہے اور اسے شبنم والے تنازعے کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔ امید ہے کہ سب اخبارات پریس ریلیز سے ہٹ کر بھی اپنی خبریں دیں گے۔"

"شبنم کہاں ہے؟"

"وہ وہاں ہے جہاں اسے اپنی بھی خبر نہیں ہے" اس بار آزاد صاحب کے لہجے میں تلخی تھی "صاحب زادے' کیا تم اس کا پیچھا چھوڑ نہیں سکتے؟ میں سمجھتا ہوں اس لڑکی نے تمہاری خاطر ضرورت سے زیادہ تکلیفیں اٹھائی ہیں اور ان کا اسے کوئی صلہ نہیں ملے گا۔"

"میں آپ کی بات سمجھتا ہوں آزاد صاحب! میں نے بارہا شبنم کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن۔"

"میاں' جب تک دیوانگی کا سبب سامنے آتا رہے گا' دورے بھی پڑتے رہیں گے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ تم اس کے سامنے آنا چھوڑ دو۔ ابھی تو میں نے اسے ایک خاص جگہ رکھا ہے جہاں محاورے کے مطابق پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "یہ آپ نے اچھا کیا کیونکہ کل رات کے واقعے کے بعد رب نواز پاگل ہورہا ہے اور اس سے کوئی بعید نہیں ہے کہ وہ اوچھی حرکتوں پر اتر آئے' آپ بھی محتاط رہیے گا۔"

"ہم احتیاط کریں تو اخبار کیسے چلائیں گے" وہ ہنسے "اچھا میاں خوش رہو۔ یہاں ابھی بہت سارے کام ہیں۔" یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کردیا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور چونکا۔

"گاڑی کیوں روک دی ہے؟"

"حضور والا ہم پی سی او تک آگئے ہیں۔" رئیس نے طنز کیا "اب سواری نیچے اتاریے۔"

رات کا وقت ہونے کی وجہ سے رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ وہی کل والا پی سی او تھا۔ اگرچہ دوبارہ یہاں آنا حفاظت کے نقطۂ نظر سے درست نہیں تھا لیکن اب آہی گئے تھے تو میں نے سوچا فون کرلیا جائے۔ یہاں سبحان کا نمبر پی سی او والے نوجوان کو بھی یاد ہوگیا تھا اس نے پھرتی سے نمبر ملا کر لائن میرے حوالے کردی۔

"شاہ صاحب آپ کا خادم شاہ عالم عرض کررہا ہوں۔" میں نے سبحان شاہ کے لائن پر آتے ہی کہا۔

"سنو کل تمہاری وجہ سے میرے دو قیمتی آدمی مارے گئے۔"

"شاہ صاحب مجھے افسوس ہے لیکن اس کے بدلے جو آدمی آپ کے پاس آیا ہے اس کی قیمت کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔ رب نواز اس کے بدلے آپ کے سارے نقصان کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہوجائے گا۔"

"مجھے تو یہ عام سا آدمی لگا ہے۔" سبحان شاہ نے بیزاری سے بتایا "احمق پروفیسر دوپہر سے سہا ہوا بیٹھا ہے۔"

"شاہ صاحب آپ نے کچھ عرصے پہلے لاہور میں محیر العقول قسم کے بندر نما بچوں کے حملوں کے بارے میں سنا ہوگا۔"

"ہاں پڑھا تو تھا بابا لیکن اخبار والے اس قسم کی اسٹوریاں چھاپتے رہتے ہیں۔"

"انہوں نے ان آفت بچوں کے بارے میں کم چھاپا تھا۔ اخبار پر حملے کے دوران ایک بچہ ہلاک بھی ہوا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اس کا معائنہ ہوتا اس کی لاش غائب کردی گئی تھی۔"

"یہ سب بتانے کا مقصد بابا؟"

"آپ نے صرف سنا اور اخبار میں پڑھا ہے۔ بل

صرف انہیں دیکھ چکا ہوں بلکہ اس قسم کی مخلوق کے دو نمونے میرے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔" میں نے اسے جبو اور لالی کے بارے میں بھی بتایا۔

"مگر ان سب باتوں کا اس پروفیسر سے کیا تعلق ہے؟" سبحان شاہ جھنجلا گیا تھا۔

"اس مخلوق کا خالق یہی شخص ہاشم رضا ہے۔ اس نے حیوانی اور انسانی جرثومے کے ملاپ سے انہیں بنایا ہے۔" میں نے انکشاف کیا۔ بات سبحان شاہ کی سمجھ میں ذرا دیر سے آئی تھی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟ خالق صرف اللہ کی ذات ہے۔"

"درست مگر اس نے انسان کو بھی کچھ اختیارات اور علوم دے رکھے ہیں۔ پروفیسر ہاشم رضا سائنس کی اس شاخ کا ماہر ہے جسے جینٹک سائنس کہتے ہیں۔ اب تو سائنس داں بغیر نطفے کے بھی ایک عام خلیے سے پورا جاندار بنانے پر قادر ہوگئے ہیں۔ اسے کلوننگ کہتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں لیکن انسان اور حیوان کے ملاپ سے ایک نئی مخلوق۔"

"مگر آپ کو یقین نہیں آرہا تو آپ اس کو بلا کر پوچھ سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رب نواز کے لیے یہ اس قسم کے تین تجربے اور بھی کررہا ہے اس وقت سے وہ اس کے لیے پاگل ہورہا ہے۔"

سبحان شاہ ششدر رہ گیا تھا "شاہ عالم تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟"

"اس میں ایک فیصد شبے کی گنجائش نہیں ہے۔ میں نے پروفیسر کو جہاں سے اغوا کیا تھا۔ وہاں اس کے پاس ایک ایسا ہی بندر نما انسانی بچہ تھا۔ بمشکل چند مہینے کا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اس بچے نے مجھ پر حملہ کیا اور اس کے دانت کے نشان ابھی تک میرے بازو پر ہیں۔ بعد میں جب میں پروفیسر کو پکڑنے کی کوشش کررہا تھا تو اس بچے پر ایک تیزاب نما مائع گر گیا تھا اور وہ ہلاک ہوگیا تھا۔ آپ پروفیسر سے اس کی تصدیق کرسکتے ہیں اور پھر بھی کوئی شک رہ جائے تو رب نواز اس کی تصدیق کرے گا۔ پروفیسر کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنے بیٹے دل نواز کو بھیجا تھا جو میرا پیچھا کرتے ہوئے حادثے میں شدید زخمی ہوکر اسپتال میں پڑا ہے یہ بات پروفیسر کی اہمیت جتانے کے لیے کافی ہے۔"

"اگر ایسی بات ہے تو شاہ عالم تم نے اپنی طرف سے میرا دل صاف کردیا ہے۔ اب میں اس ملک رب نواز کو دیکھ لوں گا۔ اگر تمہیں میری کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے تو بلا جھجک مجھ سے کہو۔"

"سبحان شاہ صاحب' میں جانتا ہوں کہ پولیس پر آپ کا اثر رسوخ دلاور شاہ مرحوم تک محدود نہیں تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ پولیس میری تلاش کے لیے جاری مہم کو ترک کردے یا یہ کم سے کم دھیمی پڑجائے۔ اس سے مجھے آسانی رہے گی۔ میں بتا چکا ہوں کہ میں یہاں سے اپنا کام سمیٹ رہا ہوں۔ ایک آدھ مہینے کے اندر میں ملک سے چلا جاؤں گا۔"

"میں وعدہ نہیں کرتا لیکن میری کوشش ہوگی۔ یہ بتاؤ کہ یہ معاہدہ تو تم رب نواز سے بھی کرسکتے تھے۔ پروفیسر کو اس کے حوالے کرکے اس سے ضمانت حاصل کرلیتے تم جانتے ہو پولیس تو صرف ایک مہرہ ہے اصل میں رب نواز کو تمہاری تلاش ہے۔"

میں ہنسا "شاہ صاحب' میں رب نواز کی ضمانت پر اعتبار نہیں کرسکتا کیونکہ میں اسے مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ مجھ سے کیا وعدہ پورا کرے۔ وہ مجھ سے بے دریغ جھوٹے وعدے کرسکتا ہے لیکن آپ کا معاملہ مختلف ہے آپ سے وعدہ کرکے یا معاہدہ کرکے وہ اتنی آسانی سے نہیں پھر سکتا۔ آپ اسے مجبور کرسکتے ہیں۔ دوسرے میں نے پروفیسر کو صرف جنجم کو رہا کرانے کے لیے اغوا کیا تھا۔ وہ مقصد پورا ہوچکا ہے۔"

اچانک بات کرتے کرتے میری نظر باہر گئی۔ رئیس پاگلوں کی طرح اشارے کررہا تھا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا "اچھا شاہ صاحب آپ سے پھر بات ہوگی۔" میں نے فون بند کردیا اور پی سی او والے نوجوان کو ایک سو کا نوٹ پکڑا دیا۔

میں تیزی سے باہر نکلا تو رئیس نے گاڑی اسٹارٹ کر رکھی تھی۔ اس نے میرے بیٹھتے ہی کار دوڑا دی تھی۔

اس نے برہمی سے کہا "الو کے پٹھے کیا تیری عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے۔ جو فون پر اتنی لمبی بات کررہا تھا۔"

"یار سبحان شاہ لاہور سے باہر ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"وہ خود یہاں نہیں ہے لیکن اس کے گرگے تو موجود ہیں۔" اس نے بھنائے ہوئے انداز میں کہا "میں نے ابھی کار میں گامے ٹیچ کو گزرتے دیکھا ہے۔"

"یہ گامے ٹیچ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے رب نواز کا خاص آدمی سمجھ۔ کل تو نے جو یہاں سے کال کی تھی۔ لگتا ہے رب نواز نے اس کا پتا چلالیا ہے۔ اس کے آدمی پی سی او کی نگرانی کررہے ہیں۔"

"اس حلیے میں وہ مجھے نہیں پہچان سکتے۔" میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے فرنچ کٹ صاف کردی تھی اور مونچھیں بڑھا رہا تھا۔ بالوں پر کیا گیا براؤن کلر اب اتر رہا تھا اور نیچے سے سیاہ رنگ دوبارہ جھلکنا شروع ہوگیا تھا۔ کالے رنگ کے لینس اور جبڑوں میں دبے ربر پیڈز کی وجہ سے میری شخصیت میں مجموعی طور پر اتنی تبدیلی آگئی تھی کہ مجھے شاہ عالم یا ناصر عظیم کے طور پر شناخت کرنا ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہوگیا تھا۔

رئیس مسلسل عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا "مجھے شبہ ہورہا ہے نیلے رنگ کی ٹویوٹا ہمارے تعاقب میں ہے۔"

اس نے کہا تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ ٹویوٹا کئی گاڑیوں کے پیچھے تھی۔ اچانک رئیس نے کار ایک ذیلی سڑک پر گھما دی۔ فوراً ہی میں نے ٹویوٹا کو قطار سے الگ ہوکر اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا۔ مجھے رئیس کا شبہ درست لگنے لگا۔ اس میں آگے دو افراد بیٹھے تھے۔ فاصلے کی وجہ سے ان کی صورتیں صاف نظر نہیں آرہی تھیں۔

"رئیس ہماری کار رفتار میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتی انہیں چکر دینے کی کوشش کر۔" میں نے کہا۔

"اور کیا کررہا ہوں۔" رئیس نے کار ایک اور گلی میں ڈال دی۔ نئے لاہور کے اس علاقے میں ٹاؤن پلاننگ کے اصولوں کے تحت کشادہ اور سیدھی گلیاں بنائی گئی تھیں اور یہ خطرہ نہیں تھا کہ کوئی گلی آگے سے بند ملے گی۔ لہٰذا رئیس پوری بے فکری سے کار کو مسلسل گلیوں میں گھسا رہا تھا مگر ایک جگہ ہم پھنس ہی گئے۔ گلی تو بند نہیں تھی لیکن وہاں شامیانہ لگا کر اور کرسیاں رکھ کر کسی تقریب کی تیاری جاری تھی۔ رئیس ایک لمحے کو بوکھلا گیا تھا لیکن خوش قسمتی سے تقریب اب تک شروع نہیں ہوئی تھی اور کرسیاں خالی تھیں۔ غالباً یہ کوئی جلسہ تھا۔ رئیس نے بے فکری سے کار کرسیوں میں گھسا دی۔ کار کی ٹکر سے کرسیاں اچھل اچھل کر دائیں بائیں گر رہی تھیں کچھ لوگ شور مچاتے ہماری طرف لپکے لیکن اس سے پہلے ہی ہم شامیانے سے نکل چکے تھے اور جب ہم گلی میں مڑ رہے تھے تو میں نے نیلی ٹویوٹا کو شامیانے میں پھنستے دیکھا۔ الٹی پڑی کرسیوں نے راستہ بند کردیا تھا اور رہی سہی کسر لوگوں نے پوری کردی تھی۔

"رئیس وہ پھنس گئے ہیں بھاگ لے۔" میں نے خوشی سے چلا کر کہا۔

رات گیارہ بجے ہم نیلم ہاؤس میں داخل ہوئے تو نیلم بے قراری سے لان میں ہی ٹہل رہی تھی۔ ہمیں صحیح سالم دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا لیکن فوراً ہی اس کی نظر کار کے اگلے حصے پر پڑی "یہ کیا ہوا؟" اس نے تشویش سے کہا۔ "کیا کوئی حادثہ ہوا تھا؟"

"ایک بچے کو بچاتے ہوئے فٹ پاتھ کے ساتھ رکھی کچھ کرسیاں کار کی زد میں آگئی تھیں۔" رئیس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ جس پر میں نے اسے دل ہی دل میں شاباشی دی۔ وہ مستقبل میں کامیاب شوہر بننے جارہا تھا۔

"سچ کہہ رہے ہو ناں؟" اس نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔

"نہیں دراصل رب نواز کے آدمی ہمارے پیچھے پڑگئے تھے۔ ان سے بچتے ہوئے کار کی کئی چیزوں سے ٹکر لگی خوب گولیاں چلیں اور رب نواز کے گرگے جہنم رسید کرکے ہم سیدھے یہیں آرہے ہیں۔ جب تک ایک آدھ ہنگامہ نہ ہو ہمیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔"

"بکواس کرتے ہو۔" نیلم کا لہجہ نرم تھا "ایک منٹ میں کافی کا کہہ کر آتی ہوں۔ آج موسم ذرا خنک ہے۔ یہیں بیٹھ کر کافی پئیں گے۔"

"یار یہ عورت کیا چیز ہے؟" اس کے جانے کے بعد رئیس قہقہہ لگا کر بولا "اس سے جھوٹ بولو تو سچ سمجھتی ہے اور سچ بولو تو اسے جھوٹ قرار دیتی ہے۔"

معاً مجھے اپنے پاس ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا یہ اسلم تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیا "اور کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں ناصر صاحب لیکن۔" وہ کہتے کہتے رک گیا تھا "میں ادھر اکتا گیا ہوں جی۔ کرنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔ بس سارا دن بیٹھے رہو۔ گارڈز مجھے باہر جانے بھی نہیں دیتے۔"

"انہیں میں نے کہہ رکھا ہے تمہارا باہر جانا درست نہیں ہے۔ رب نواز کے کتے پورے شہر میں میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ اگر تم پر نظر پڑگئی تو مفت میں مارے جاؤ گے۔"

"کیا فرق پڑتا ہے جی۔ جہاں میرے سارے گھر والے مارے گئے وہاں میں بھی سہی۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ اس پر قنوطیت کا دورہ پڑا تھا۔

"یہاں آکر میرے پاس بیٹھو۔" میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے آکر ٹک گیا۔ میں نے کہا۔ "دیکھو اسلم تمہاری زندگی اتنی ہی قیمتی ہے جتنی کہ میری۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم اس وقت کس صدمے سے گزر رہے ہو لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ہمت ہار جاؤ۔ ابھی تمہیں رب نواز سے اپنے گھر والوں کا انتقام لینا ہے اور

انتقام لینا آسان نہیں ہوتا اس کے لیے آدمی کو بڑی تیاری کرنا پڑتی ہے۔"

"کیا تیاری کرتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"یہ تم خود سوچو کہ رب نواز سے انتقام لینے کے لیے تمہیں کس قسم کی تیاری کرنی چاہیے؟" میں نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔

"آپ مجھے پستول چلانا سکھا دیں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"صرف پستول چلانے سے کام نہیں چلے گا۔ ابھی تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔ ہمارے ساتھ رہو اور دیکھو کہ ہم رب نواز سے کس طرح نمٹتے ہیں۔ وہ صرف تمہارا ہی نہیں بلکہ ہمارا بھی دشمن ہے کل رات ایک مقابلے میں اس کا بیٹا زخمی ہو کر اسپتال جا پہنچا۔ اس کے تین بندے بھی مارے گئے۔ اس وقت وہ انگاروں پر لوٹ رہا ہوگا۔ یہ ہے ہمارا انتقام کیا سمجھے۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا "رب نواز نے آپ کے ساتھ کیا کیا جی؟"

اسی اثنا میں نیلم ملازمہ کے ساتھ کافی لے کر آگئی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے اسلم کو اختصار سے بتایا کہ رب نواز سے ہماری کیا دشمنی ہے۔ اس نے ہمیں کیا کیا نقصانات پہنچائے ہیں اور جواب میں ہم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اسلم دم بخود سا سنتا رہا۔ اس نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ رب نواز سے ہماری دشمنی کے مقابلے میں اس کی دشمنی کسی قدر ہلکی تھی۔ آخر میں میں نے کہا "دیکھو جب آدمی ہاتھی کا شکار کرنے جاتا ہے تو ایسے ہی منہ اٹھا کر نہیں چلا جاتا بلکہ ساری تیاری کے ساتھ جاتا ہے۔ اس کے پاس ہتھیار ہوتے ہیں اور انہیں چلانے کی تربیت کے ساتھ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی کی کمزوریاں کیا ہیں۔ اسے آسانی سے کس طرح اپنا شکار بنایا جا سکتا ہے۔ رب نواز کو بھی تم ایک طرح کا ہاتھی سمجھو۔ اس سے نمٹنے کے لیے چالاکی لازمی ہے۔ یہ بات یاد رکھو۔ رب نواز کے بے شمار دشمن ہیں اس نے بے شمار لوگوں پر ظلم ڈھائے ہیں اس کے باوجود آزاد پھر رہا ہے۔ اسے کوئی خوف نہیں ہے کیونکہ اس نے اپنی حفاظت کا بندوبست کر رکھا ہے۔"

"یعنی میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" اسلم کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"اتنی مایوسی اچھی نہیں ہوتی۔ اگر تم حقیقت کو تسلیم کر کے رب نواز کے خلاف لڑو گے تو تم کامیاب رہو گے۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ کوئی رائفل لے کر تم رب نواز کے گھر پر چڑھ دوڑو گے اور اسے اس کے خاندان کے ساتھ ختم کر دو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ تم گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہلاک کر دیے جاؤ گے۔"

"پھر۔ آپ بتائیں میں کیا کروں؟" اس نے بے بسی سے کہا "جب مجھے اپنی ماں بہنوں کی لاشیں یاد آتی ہیں تو میری رگوں میں خون کی جگہ آگ دوڑنے لگتی ہے۔"

"ابھی تو تم صبر کرو اور انتظار کرو۔ کبھی نہ کبھی وقت تمہارے ساتھ ہوگا اور تم اس سے انتقام لے سکو گے۔"

"آپ نے ان برتنوں کے بارے میں کیا سوچا؟"

میں نے صاف گوئی سے کہا "اسلم یہ نوادرات میں رب نواز کو پھانسنے کے لیے استعمال کروں گا۔ میں تمہیں اس کی قیمت دے رہا ہوں۔" میں نے جیب سے چیک بک نکال کر اس کے ایک چیک پر سائن کیے اور چیک اس کی طرف بڑھا دیا "اس پر تم جو رقم لکھو مجھے منظور ہوگی۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور سرگوشی نما آواز میں بولا "جو رقم بھی لکھ لوں؟"

میں مسکرایا "مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ تم اس پر اپنی مرضی کی رقم لکھنے کے لیے آزاد ہو۔ کل تک یہ رقم بینک سے آ بھی جائے گی۔"

"لیکن میں رقم کا کیا کروں گا؟" اس نے کہا "جب میں رب نواز سے انتقام بھی نہیں لے سکتا۔"

"انتقام کے لیے وسائل کا ہونا ضروری نہیں ہے لیکن اس سے فائدہ بھی ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ میں نے کہا ناں ایک وقت ایسا آئے گا جب رب نواز تمہارے رحم و کرم پر ہوگا۔ اس وقت تم اس سے انتقام لے سکو گے۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔ اگر تم جانا چاہو تو تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی لیکن اگر تم ہمارے ساتھ رہنا چاہو تو مجھے خوشی ہوگی۔ دیکھو اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا لیکن دو آدمی مل کر بڑی طاقت بن جاتے ہیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے ایک اکیلا اور دو گیارہ تو یہ بالکل درست ہے۔ ہم تو دو سے زیادہ ہیں۔ اس جدوجہد میں میں اکیلا نہیں ہوں بلکہ میرے بہت سارے ساتھی ہیں۔"

"میں۔ میں آپ کو سوچ کر بتاؤں گا۔" اس نے ہچکچا کر کہا۔

"بالکل سوچو اور سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو تاکہ بعد میں پچھتاوا نہ ہو۔" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی "تم آرام سے سوچ سکتے ہو۔"

وہ سلام کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد نیلم نے کہا "یہ شخص مجھے خطرناک لگتا ہے۔"

رئیس نے اس کی تائید کی "ہاں یہ دماغ کے بجائے دل سے سوچتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ یہ جذباتی ہو کر رب نواز تک نہ جا پہنچے اور اپنے ساتھ ہمیں بھی مروا دے۔"

"اس کے ساتھ جو ہوا ہے اس کا جذباتی ہونا فطری امر ہے۔" میں نے کہا "اگر ہمارے پیارے خدانخواستہ ایسی بربریت کا شکار ہوں تو ہمارا ردِعمل بھی یہی ہوگا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ ہمارا اچھا ساتھی بن سکتا ہے۔ اتحاد بڑی قوت ہے۔ میں رب نواز کے مخالفوں کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سبحان شاہ کھل کر نہ سہی لیکن ہمارے ساتھ ہے۔ وہ رب نواز کو بڑا نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

"میرا ایسا خیال نہیں ہے۔ رب نواز کسی طرح سبحان شاہ سے کم نہیں ہے بلکہ لاہور شہر میں وہ اس سے کہیں زیادہ طاقتور ہے اور ہمیں لاہور میں ہی رہنا ہے۔"

"لہٰذا رب نواز کے خلاف کچھ نہ کیا جائے۔" میں نے خفگی سے کہا "اسے کھلا چھوڑ دے کہ وہ جب چاہے جسے چاہے اغوا کر لے جائے اور جب چاہے تمہارے گھر پر حملہ کروا دے۔ مائی ڈیئر نیلم ہمارے یہی رویے رب نواز جیسے لوگوں کو فرعون بنا دیتے ہیں۔ اندر سے یہ ظالم اتنے بودے ہوتے ہیں کہ ایک تنہا شخص ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دے تو یہ لرز جاتے ہیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میں بالکل خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں تب بھی رب نواز اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔"

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" رئیس نے اس بار میری حمایت کی "اس جیسے لوگوں کو نکیل نہ ڈالی جائے تو یہ بے نتھ کا بیل بن جاتے ہیں موج دین کی طرح۔"

میں چونکا "میرا خیال ہے تم لوگ موج دین کے بارے میں مجھ سے کوئی بات چھپا رہے ہو؟"

نیلم اور رئیس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر نیلم بولی "دراصل ہم تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پرسوں موج دین اسٹوڈیو میں آیا تھا اس نے سختی سے شوٹنگ کی ڈیٹس مانگیں۔ اس پر میں نے ایڈوانس کی رقم اس کے منہ پر دے ماری۔"

"اس کا کیا ردِعمل تھا؟"

"اس نے آگے سے بدتمیزی کی اور میری کلائی پکڑ لی۔"

اس پر رئیس کو غصہ آ گیا۔"

"اور یہ رئیس خبیث بن گیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"بالکل پرانا رئیس۔"

"قسم اللہ کی اگر نیلم نے نہ روک رکھا ہوتا تو میں بہت پہلے ہی اس کی ایسی کی تیسی کر چکا ہوتا۔"

نیلم بولی تو اس کی آنکھیں فخر سے چمک رہی تھیں۔ "رئیس نے اس کا وہ ہاتھ توڑ دیا جس سے اس نے میری کلائی پکڑی تھی۔"

میں نے سر تھام لیا "میرے خدا تم لوگوں نے معاملہ خراب کر دیا ہے۔ تم دونوں ہی جانتے ہو کہ موج دین، رب نواز سے زیادہ خطرناک دشمن ہے وہ کھلا بدمعاش ہے جسے حکومت کی حمایت بھی حاصل ہے۔ اگر موج دین اکیلا ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی ہم ساری انتظامیہ سے نہیں لڑ سکتے۔ رئیس تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"تو کیا بے غیرت بن کر دیکھتا رہتا۔ وہ نیلم کے ساتھ کچھ بھی کرتا رہتا۔" رئیس بگڑ کر بولا۔

"یہ پولیس کیس بن سکتا ہے۔"

"کیس نہیں بنے گا کیونکہ موج دین نے بیان دیا ہے کہ وہ پھسل کر گرا تھا اور اس کی کلائی میز کا سرا لگنے سے ٹوٹی ہے۔" نیلم بولی "ورنہ اس کی جگ ہنسائی ہوتی۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب ہمیں ایک اور غضب ناک دشمن سے نمٹنا پڑے گا۔ یہ اچھا نہیں ہوا جبکہ رب نواز پہلے ہی پاگل ہو رہا ہے۔"

"چل یار، جہاں ایک ہے وہاں دوسرا بھی سہی اور مجھے اکیلا مت سمجھ۔ زیرِ زمین دنیا میں یہ بات پھیل چکی ہے کہ موج دین کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا ہے۔ اس کے بعد سے بہت سارے پرانے جاننے والے میرے پاس آ رہے ہیں یا ان کے پیغامات آ رہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہ موج دین کے خلاف میرے ساتھ ہیں۔ ان میں لاہور کا ایک نامی گرامی صنعت کار بھی ہے جس کا بھائی موج دین کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔"

"رئیس اس چکر میں نہ پڑ۔ یہ لوگ تجھے اپنی دشمنی نکالنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔" میں نے اسے خبردار کیا "بعد میں یہ تجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیں گے۔"

"ابھی تو تم ایک اکیلا اور دو گیارہ والی بات کر رہے تھے۔" نیلم نے مجھے یاد دلایا "رب نواز کے خلاف سارے مخالفوں کو جمع کر رہے تھے اور اب رئیس کو الٹی پٹی پڑھا رہے ہو۔"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا تھا۔ واقعی میں اس سارے معاملے کو صرف اپنے مفاد کی عینک سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے

صرف رب نواز کی فکر تھی جو اصل میں میرا دشمن تھا۔ رئیس' نیلم یا میرے کسی ساتھی کی اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔

موج دین' نیلم اور رئیس کا دشمن ہو رہا تھا لیکن مجھ سے اس کی کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ الٹا میں فکر مند تھا کہ وہ میرے پیچھے بھی نہ پڑ جائے۔ شاید اسی وجہ سے میں ان دونوں کو اس سے الجھنے سے منع کر رہا تھا۔ رئیس نے میری صورت پر پھیلی ندامت بھانپ لی تھی۔ اس نے غیر متوقع طور پر میری حمایت کی۔

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں اس وقت جذباتی ہو گیا اور موج دین کا ہاتھ توڑ بیٹھا مگر ہمیں اس سے بات بڑھانے سے گریز کرنا چاہیے۔" اس حمایت پر میں نے اسے شکر گزار نظروں سے دیکھا۔

"وہ کینہ آدمی ہے چھپ کر بھی وار کر سکتا ہے۔" نیلم متفکر تھی۔

"میرا خیال ہے تم دونوں اب لندن روانہ ہو جاؤ۔" میں نے کہا "تمہارا کتنا کام رہ گیا ہے فلموں میں؟"

"بس دو فلمیں ہیں سیٹ پر۔ ان میں بھی تھوڑا بہت کام رہ گیا ہے۔"

"تو لعنت بھیجو اس پر۔" میں نے کہا "تم اور رئیس پہلی فلائٹ سے روانہ ہو جاؤ۔ فلموں والے ڈپلی کیٹس کی مدد سے فلمیں مکمل کرالیں گے اور نہ بھی کرا سکے تو اس سے فرق نہیں پڑے گا۔ جب تک یہاں کے معاملات ٹھنڈے نہیں پڑ جاتے تم واپس مت آؤ۔ بلکہ میرا مشورہ ہے وہیں انگلینڈ میں سیٹل ہونے کی کوشش کرو۔ عینی اور عاقل پہلے ہی وہاں ہیں۔ تم لوگ ساتھ رہو گے تو ان کی تنہائی بھی کم ہو گی۔ ویسے بھی ان دونوں عینی کو کسی عورت کی ضرورت ہو گی۔"

"اس کی منہ بولی ساس ہے ناں؟" رئیس ہنسا۔

"لیکن تم۔" نیلم نے میری طرف دیکھا۔

"میں۔" میں نے گہری سانس لی "میں بھی جلد از جلد وہاں آنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے میں بھی وہیں بس جاؤں اور چندا کو بھی ساتھ لے آؤں۔"

"شبنم کا کیا ہو گا؟" نیلم نے فوراً ہی میرے اور چندا کے ساتھ کو قبول کر لیا تھا۔

"شبنم یہیں رہے گی۔ ویسے بھی آزاد صاحب نے اس سے دور رہنے کا حکم دیا ہے مجھے۔ میرے خیال میں شبنم کی بہتری اس میں ہے کہ میں اس سے دور ہو جاؤں۔ وہ شاہ عالم کو چاہتی ہے اور میں ناصر عظیم ہوں۔"

"دوسرے اگر تو اس کے ساتھ لگا رہا تو تجھ پر سے کبھی شاہ عالم کا ٹھپا نہیں اترے گا۔" رئیس نے کہا "یہ خود غرضی ہی سہی لیکن اب ناصر کی زندگی میں شبنم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔"

"رہے فرید اور رخشی تو ان سے میرا دور رہنا بھی ضروری ہے۔ سب جانتے ہیں کہ رخشی شاہ عالم کی بیوی ہے اور اگر میں ان سے روابط رکھتا ہوں تو یہ بات میرے دشمنوں کو بھی چونکائے گی اور اس سے ان کی زندگی بھی متاثر ہو گی۔"

نیلم بولی "ہم اتنے اچھے دوستوں سے کٹ جائیں گے۔" اس کے لہجے میں مایوسی سی تھی۔

"ہم نہیں۔ صرف میں۔ تم لوگ بدستور ان سے رابطے میں رہو گے۔ میں بھی ان سے بالکل ہی دور نہیں ہوں گا۔ فون پر اور دوسرے طریقوں سے میں ان سے رابطہ رکھوں گا۔ دشمن قمر اور کمال سے واقف نہیں۔ لہٰذا وہ خود ان سے محفوظ رہیں گے۔ چند سال بعد جب یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو ہم واپس آئیں گے اور ان سب سے ملیں گے۔"

"ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔" نیلم یکایک پُرجوش ہو گئی تھی "بلکہ ناصر بھی ہمارے ساتھ ہی جائے گا۔ میں ابھی سیٹ کے لیے اپنے ایجنٹ سے بات کرتی ہوں۔"

"ہاں لیکن میرے لیے نہیں۔ میں کچھ عرصے اور یہاں رہوں گا۔"

"مگر کیوں؟" نیلم نے تیوریاں چڑھائیں "آخر ایسی کون سی ضرورت ہے جو تم یہاں رکنا چاہتے ہو؟"

"مجھے بعض معاملات نمٹانے ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔ میں نے ان کے سامنے تو نہیں کہا لیکن یوں میدان چھوڑ کر جانا مجھے اچھائی کے اوپر برائی کی فتح لگ رہی تھی۔ حق ہمیشہ رہنے کے لیے ہے اور باطل کو جانا ہی ہو گا۔

"میں فارغ ہوتے ہی سیدھا لندن کا رخ کروں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ تمہارا پاسپورٹ بھی بن کر آگیا ہے۔" نیلم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا اور نیل سے ہرگز نہیں کہوں گا کہ وہ مجھے آکر سینگ مارے۔"

"ہرگز نہیں۔" نیلم نے دوبارہ کہا اور واپس بیٹھ گئی۔

"اس صورت میں ہمارا جانا بھی اتنا ضروری نہیں ہے میں اپنی بقیہ فلمیں مکمل کرا کے جاؤں گی۔"

میں نے بے بسی سے رئیس کی طرف دیکھا "یار تو اس کو سمجھا۔ آخر تو اس کا مستقبل کا مجازی خدا ہے۔"

"میں کسی کی نہیں سنوں گی۔" نیلم نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیارے تو نے بے عزتی ہوتے ہوتے خراب کر دی۔" رئیس نے سرد آہ بھری "آخر تو اتنا اصرار کیوں کر رہا ہے۔ تیرے بغیر یہاں کے کون سے معاملات ادھورے ہیں؟"

"اوکے بابا۔" میں نے ہار مانتے ہوئے کہا "تم لوگ سیٹ بک کراؤ۔ میں ذرا رب نواز سے بات کرتا ہوں۔"

میں نے موبائل نکال کر رب نواز کا نمبر ملایا۔ میری آواز سنتے ہی وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا تھا۔ اس نے مجھے ایک ہی سانس میں کئی گالیاں دے ڈالیں "شاہ عالم میں تیری ٹانگیں چیر کے۔ میں تیری بوٹی بوٹی کردوں گا۔ تیری لاش میں کووں کو کھلاؤں گا۔" اس کا سانس جواب دینے لگا۔

"فی الوقت تو تمہیں پانی پینے کے لیے بھی کسی ملازم کی ضرورت ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "اور مجھے اس سے کیا کہ مجھے مارنے کے بعد تم میری لاش سے کیا سلوک کرتے ہو۔"

میں نے اسے کئی جوابی گالیوں سے نوازا۔ شکر ہے نیلم اٹھ کر دور چلی گئی تھی "رب نواز کتے کی اولاد' تو نے اس نطفۂ نا تحقیق کو بھیجا تھا۔ جو اب اسپتال میں پڑا ہے۔ شکر کر کہ اس وقت وہ اپنی قبر میں نہیں پڑا۔ تو نے شاہ عالم کو کھلونا سمجھ رکھا ہے۔ اب میں تجھے بتاؤں گا۔ رب نواز اپنے خاندان والوں کی حفاظت کر لے۔ ایک ایک کرکے میں ان کا یوں شکار کروں گا جیسے جنگل میں شکاری جانوروں کا شکار کھیلتے ہیں۔ میں سب کو ختم کروں گا تیری باری سب سے آخر میں آئے گی۔ تجھے میں زخم دے دے کر ماروں گا۔"

پہلے تو میرے اس لہجے پر رب نواز حیران رہ گیا تھا پھر اس نے اشتعال میں آکر ایک بار پھر گالیوں کا دریا بہا دیا "شاہ عالم تو میرے کسی گھر والے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ میں تجھے دیکھ لوں گا۔"

میں نے فلمی ولن نما قہقہہ لگایا "دل نواز کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ابھی تو وہ مرتے مرتے بچا ہے لیکن ممکن ہے فرشتۂ اجل اسے اسپتال سے آکر لے جائے۔ موت کا تو کوئی بھی بہانہ ہو سکتا ہے۔ اب میں کسی ڈاکٹر کو یا کسی نرس کو ایک لاکھ روپے دوں گا تو تمہارے بیٹے کو خالی انجکشن کیوں نہیں لگائے گا۔ تمہیں معلوم ہے ناں کہ کسی آدمی کی رگوں میں ہوا کا ننھا سا بلبلہ بھی چلا جائے تو اس کی فوری موت ہو جاتی ہے۔ اس موت کا الزام تم کسی کو نہیں دے سکتے۔ سنا ہے دل نواز کی بیوی ماں بننے والی ہے۔ پتا نہیں آنے والے کو باپ کا سایہ نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں۔"

"تم۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔" رب نواز خوف زدہ ہو گیا تھا "تم نے دل نواز کو انگلی بھی لگائی تو۔"

"تو تم توپ چلا دو گے۔" میں ہنسا "لیکن کس پر؟ کیا تمہیں میرا پتا ٹھکانا معلوم ہے؟ میرے کسی رشتے دار کے بارے میں جانتے ہو۔ خیر میرا کوئی ہے ہی نہیں مگر تم اپنے اتنے بڑے خاندان کو لے کر کہاں جاؤ گے؟ تمہارے بیٹے ہیں اور بیٹیاں بھی ہیں۔ شاید تین یا چار بیویوں سے کوئی درجن بھر اولاد تو ہو گی اور اب تو خیر سے تم دادا نانا بھی بن چکے ہو۔ کہتے ہیں سود اصل سے پیارا ہوتا ہے۔ اب کل کو تمہارے نواسے نواسیاں یا پوتے پوتیاں اسکول جانے کے لائق ہوں گے تو تم ان کی بھی حفاظت کرو گے۔ اپنی دشمنی کی آگ سے انہیں بھی بچاؤ۔ نہیں رب نواز تم خدا نہیں ہو۔ تم فرعون بھی نہیں ہو۔ تم ایک معمولی سی حقیر چیز ہو جو خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتی ہے دوسروں کی حفاظت تم کیسے کرو گے۔ بے شک ابھی تم ان کے گرد کرائے کے گوریلوں کی دیوار کھڑی کر دو گے مگر سوال ہے کہ کب تک؟ فرض کرو میں ابھی کچھ کرتا ہی نہیں ہوں۔ خاموشی سے اس ملک سے چلا جاتا ہوں۔ جہاں میں نے اپنے لیے بندوبست کر لیا ہے۔ سال دو سال وہاں عیاشی سے گزار کر میں واپس آتا ہوں تو میرا حلیہ اتنا بدل چکا ہو گا کہ فرشتے بھی مجھے نہیں شناخت کر سکیں گے۔ اس وقت میں اپنی انتقامی کارروائی کا آغاز کروں گا۔ تو کیا تم مجھے روک لو گے۔"

"تم۔ تم ایسا کیوں کرو گے؟" اس نے لکنت زدہ لہجے میں کہا۔

میں نے ایک بے رحم قہقہہ لگایا "یہ سوال تم خود سے کرو کہ رب نواز تم اب تک ایسا کیوں کرتے آئے ہو۔ حیرت ہے اپنے عمل کا جواز تم دوسروں سے طلب کر رہے ہو۔"

"سنو شاہ عالم میری بات سنو۔ ہم میں مفاہمت کا کوئی راستہ نکل سکتا ہے۔ میں ماضی کو فراموش کرنے کو تیار ہوں۔ تم ویسے بھی اس ملک سے جا رہے ہو تو بہتر ہے دشمنی کا یہ باب بند کر کے جاؤ۔"

"دشمنی کا باب مجھے نہیں تم کو بند کرنا ہے۔ رب نواز تم وہ زہریلے سانپ ہو جس کا واحد حل اس کا پھن کچل دینا ہے۔ تمہیں موقع دے کر یہ توقع کرنا حماقت ہے کہ تم ڈسو گے نہیں کیونکہ تم اپنی فطرت سے مجبور ہو اسی طرح میں اپنی حفاظت

کے لیے مجبور ہوں۔ یہ طاقت کا کھیل ہے۔ اگر میں نے تمہیں نہیں مارا تو تم مجھے مار دو گے۔ ابھی تم صلح کی بات کر رہے ہو لیکن میں یا میری کوئی کمزوری تمہارے ہاتھ آگئی تو تم سب کچھ بھول کر فرعون بن جاؤ گے۔"

"میں تمہیں ضمانت دوں گا۔" اس نے جلدی سے کہا "دیکھو شاہ عالم ہم پارٹنر رہے ہیں۔ اگر تم چاہو تو خوشگوار طریقے سے اس دشمنی کو ختم کر سکتے ہیں۔"

"اور اس کا سب سے خوشگوار طریقہ یہ ہے کہ تم کسی طرح مجھ پر قابو پا کر میرا خاتمہ کر دو۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تمہارے اس دشمنی ختم کرنے کے انداز سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ آغاز تم نے کیا لیکن انجام میں کروں گا۔ پروفیسر ہاشم رضا اس کی پہلی قسط ہے مگر میں نے تمہیں ایک اور اطلاع دینے کے لیے زحمت کی ہے۔ ایک زمانے میں میں نے فاتح عالم فورس بنائی تھی جس کا ہر رکن مجھ پر اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔"

رب نواز کا حوصلہ ایک بار پھر جواب دے گیا تھا۔ اس نے ناقابل اشاعت الفاظ میں مجھے بتایا کہ اب مجھ پر کیا نچھاور کیا جائے گا۔ میں نے مزید ایک عدد قہقہہ اور رسید کیا "رب نواز اب میں ایک اور فورس بنا رہا ہوں' رب نواز ہٹاؤ فورس۔ اس کا ہر رکن تمہارے خون کا پیاسا ہوگا اور اس کے لیے مجھے کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔ میں نے صرف ان لوگوں کو جمع کیا ہے جو کبھی تم لوگوں کے ظلم کے شکار ہوئے لیکن اپنی کمزوری کو صبر کا نام دے کر بیٹھ گئے تھے۔ میں انہیں جمع کر رہا ہوں۔ انہیں طاقت دے رہا ہوں۔ تم جانتے ہو آج کے دور میں سب سے بڑی طاقت روپیہ ہے اور اس کی میرے پاس کمی نہیں ہے۔ میں اس سے سب کچھ خرید سکتا ہوں۔ جدید ترین اسلحہ بھی اور اسے چلانے کی تربیت دینے والے۔ بہت جلد یہ فورس اسلحے اور تربیت سے لیس ہو کر میدان میں آئے گی تو تمہارے لیے اس ملک میں کہیں پناہ نہیں ہوگی۔"

"بکو۔ بکواس۔ کرتے ہو تم کتے بھونکتے ہو۔" اس بار رب نواز کی آواز کانپ رہی تھی۔

میں نے قہقہوں کا سلسلہ جاری رکھا "ارے یار ملک تم تو ذرا سی بات سے سہم گئے۔ غالباً تمہاری شلوار گیلی ہو چکی ہے۔ لہٰذا میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ابھی یہ فورس آئی نہیں اور تم خوف زدہ ہو گئے۔ ذرا سوچو رب نواز جب یہ اندھیرے کے تیر اپنی کارروائی شروع کریں گے تو تمہارا کیا حال ہوگا۔"

میں نے فون بند کر دیا۔ رئیس نے میرے شانے پر ہاتھ مارا "دل خوش کر دیا پیارے۔ قسم اللہ کی اس کی شلوار سچ مچ گیلی ہو گئی ہوگی۔ میں جانتا ہوں اندر سے یہ بالکل۔۔۔ ہے۔" رئیس نے رب نواز کو ایک وزنی گالی سے نوازا تھا "لیکن تو نے اتنی دیر بات کر کے ٹھیک نہیں کیا۔ رب نواز نے اپنے فون پر آبزرویشن لگوالی ہوگی۔ اس نے معلوم کر لیا ہوگا کہ فون کس نمبر سے کیا جا رہا ہے۔"

"رب نواز کبھی پتا نہیں لگا سکے گا کیونکہ یہ موبائل تو نے کسی اور سے لیا ہے۔ کیا تو نے اسے اپنا نام پتا بتایا تھا؟"

"نہیں۔ بس ایک ہوٹل میں وہ آدمی بیچ رہا تھا۔ اسے رقم کی ضرورت تھی۔ میرے پاس پیسے تھے لہٰذا میں نے خرید لیا۔ اسے میں نے اپنا نام رئیس احمد خان بتایا تھا لیکن وہ اتنا پریشان تھا کہ اس نے شاید نام سنا بھی نہیں اور پیسے لے کر چلا گیا۔ اس کا بچہ اسپتال میں داخل تھا۔ اسے اس کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "تب رب نواز کا باپ بھی نہیں معلوم کر سکتا کہ موبائل فون میرے پاس کہاں سے آیا البتہ وہ رئیس کے نام سے ضرور چونکے گا۔ رئیس تیرا یہاں سے چلا جانا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔"

"نیلم سیٹ بک کرانے گئی ہے۔ کل ویزا بھی لگوا لے گی۔ بلکہ اس کا ویزا لگا ہوا ہے صرف تیرا اور میرا ویزا لگوانا پڑے گا۔"

میں ہچکچایا "یار' نیلم کے سامنے تو میں نے اقرار کر لیا لیکن تجھ سے میں نہیں چھپا سکتا۔ میرا ابھی جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں عین موقع پر کوئی بہانہ کر دوں گا۔ اب یہ تیرا کام ہے کہ اسے راضی کر کے لے جا۔"

رئیس نے غور سے مجھے دیکھا "تو کیوں رکنے پر اصرار کر رہا ہے۔"

میں نے رئیس کو اپنے احساسات سے آگاہ کیا تو وہ سوچ میں پڑ گیا "میں نے اتنے بڑے جو وعدے کیے ہیں مجھے ان کی لاج بھی نبھانا ہے۔ میں رب نواز کو یونہی نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ بتا کہ تو نے جیرا بلیڈ سے بات کی ہے؟"

"میں نے کہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا ہے۔" رئیس نے جواب دیا "دراصل یار جب سے میں اس دنیا سے نکلا ہوں میں نے محسوس کیا ہے کہ پرانے لوگ اب مجھ سے ویسے گرم جوشی سے نہیں ملتے۔ جیرا بلیڈ بھی مروت میں کام آ رہا ہے لیکن اس قسم کے معاملے میں وہ ٹانگ نہیں اڑانا چاہتا۔ اس

کا سارا کام ہی پولیس کی مدد سے چلتا ہے۔"

"چل یار جیرا بلیڈ نہ سہی۔ میں خود یہ کام کر لوں گا۔ لاہور میں تھانے ہی کتنے ہیں۔ ان میں تلاش کروں گا تو کوئی نہ کوئی سامنے آ ہی جائے گا۔ بس ایک تو ہی ہاتھ آ جائے تو باقی لوگوں کے نام وہ خود بتائے گا۔" یہ کہتے ہوئے میرا لہجہ خود بخود سفاک ہو گیا "انہیں شبنم پر کیے جانے والے ظلم کا حساب دینا پڑے گا۔"

رئیس نے حیرت سے مجھے دیکھا "تو خواہ مخواہ جذباتی ہو رہا ہے۔ یہ پولیس والے صرف مہرے تھے جن کی ڈوری رب نواز ہلا رہا تھا۔ اصل مجرم تو وہ ہے۔ سزا دینی ہے تو اسے دے۔"

"وہ بھی نہیں بچے گا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ سچ مچ اپنے آئیڈیے پر عمل کروں۔ رب نواز کے خلاف ان سب کو جمع کر لوں جن پر کبھی اس نے ظلم کیا تھا۔"

"احمقانہ باتیں مت سوچ!" رئیس جھلا گیا "تو شیخ چلی کے سے منصوبے بنا رہا ہے۔ ہم سب کی بہتری اسی میں ہے کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ جتنی دیر رکیں گے خطرات اتنے ہی بڑھیں گے۔"

"میں جانتا ہوں۔ میں ہاتھ پیر بچا کر کام کروں گا۔" میں نے اسے تسلی دی لیکن رئیس مطمئن نہیں تھا۔ وہ مسلسل مجھ سے کہتا رہا کہ میں بھی ان کے ساتھ چلوں۔ میں نے نیند کے بہانے اس سے جان چھڑائی۔ رات کا ایک بج رہا تھا مگر نیند مجھے بستر پر لیٹ کر بھی نہیں آئی تھی۔ گزشتہ کچھ عرصے سے میرے جو معمولات تھے بھرپور نیند میرے لیے خواب و خیال بن گئی تھی۔ اب تو مسلسل جاگنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ سارا دن جاگنے اور بھرپور مصروفیات کے باوجود رات کو سکون کی نیند میرے نصیب میں نہیں تھی۔ رئیس اور نیلم اپنے کمروں میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔ میں چپکے سے اٹھا اور باہر آ گیا۔ وہاں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن میرے پاس کسی کی چابی نہیں تھی۔ میں پیدل ہی باہر نکل آیا۔ رات کے گارڈز نے میرے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔

خاصی دیر تک پیدل چلنے کے بعد مجھے ایک چوک سے ٹیکسی مل گئی تھی۔ میں نے اسے کمال اسپتال کا پتا بتایا۔ ٹیکسی والا ٹھیٹ لاہوری تھا۔ اس کی زبان اس کی کھٹارا ٹیکسی سے بھی زیادہ تیز چل رہی تھی لیکن جب منزل مقصود پر پہنچ کر میں نے میٹر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رفتار میں اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ سفر کا تاوان ادا کر کے میں اندر گیا۔ اسپتال کے مین گیٹ پر دو گارڈز تھے لیکن یہ کمال نے خود رکھے تھے۔ اصل گارڈز جو کرنل کی ایجنسی کے تھے ان سے مجھے واسطہ اسپتال کے ساتھ بنے کوارٹرز میں پڑا۔ جب کسی نے تاریکی سے مجھے للکارا۔

"ہینڈز اپ' ساکت ہو جاؤ۔"

میں نے رک کر دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔ مجھ پر ٹارچ کی روشنی پڑی پھر کسی نے میری تلاشی لی اور مطمئن ہو کر مجھے ہاتھ نیچے کرنے کو کہا "کون ہو تم اور رات کے اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میرا نام ناصر عظیم ہے۔ اس اسپتال کا مالک کمال احمد میرا دوست ہے۔ وہ میری بہن کا شوہر بھی ہے۔ میں ان سے ملنے آیا ہوں۔"

"ایک منٹ!" اس نے کہا۔ جس نے مجھے ہینڈز اپ کرایا تھا۔ اس نے شاید کوئی واکی ٹاکی نکال کر کمال سے رابطہ کیا "سر۔ میں شمشاد بات کر رہا ہوں۔ ایک شخص خاموشی سے آیا تھا۔ اپنا نام ناصر عظیم بتاتا ہے۔ اچھا آپ خود آ رہے ہیں۔ اوکے سر۔" اس نے واکی ٹاکی آف کر دیا۔ کمال نے اسے میرے بارے میں بتا دیا تھا لیکن اس کی عقابی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بھی مجھ پر سے نہیں ہٹی تھیں۔ وہ پوری طرح مستعد تھا۔ وہ ایک عام گارڈ کی نسبت کہیں زیادہ تربیت یافتہ لگ رہا تھا اس کا دوسرا ساتھی جس نے میری تلاشی لی تھی اب وہاں نہیں تھا۔ شاید وہ پھر سے اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔ مجھے ان کا طریقہ کار پسند آیا تھا۔ وہ سامنے پہرا دینے کے بجائے خاموشی سے تاریکی میں چھپ کر اپنا کام کر رہے تھے اس طرح آنے والے دشمن کے لیے انہیں نشانہ بنانا آسان نہ رہتا۔ چند منٹ کے بعد کمال گاؤن کی ڈوریاں کستا نمودار ہوا۔

"الو کے پٹھے۔ یہ کوئی آنے کا وقت ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں سویا تھا۔"

"بس یار تیری منحوس صورت دیکھنے کو دل چاہا تو گالیاں کھانے چلا آیا۔" میں اسے کھینچ کر اندر لے گیا۔

قمر سو رہی تھی لہٰذا ہم دوسرے کمرے میں آ گئے جو ایک طرح کی نشست گاہ تھی لیکن یہاں فرنیچر معمولی سا تھا۔ کمال بذات خود کروڑ پتی ہونے کے باوجود درویشانہ زندگی گزار رہا تھا لیکن وہ بھول رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایک بیوی تھی جس کے کچھ ارمان تھے۔ کچھ خواہشات تھیں۔ اس کا ایک بچہ تھا جو ابھی سہولتوں اور آسائشوں سے ناآشنا تھا کہ اس کی سب سے بڑی سہولت اور آسائش اس کی ماں کی گود تھی لیکن کل کو وہ بڑا ہوگا تو اسے سب کچھ درکار ہوگا۔ کمال میرے لیے

چائے ناالایا

"یار تیرا گزارا ہو جاتا ہے اتنے سے کوارٹر میں؟" میں نے کہا "ابھی تیرا ایک بچہ ہے کل کو دوسرا بھی ہوگا۔"

"تجھے بھی بہن والا دورہ پڑ گیا۔" اس نے گہری سانس لی "کیا برائی ہے اس کوارٹر میں۔"

"دیکھ کمال پہلے تو میرا یار ہے پھر بہنوئی۔ لہٰذا برا مت ماننا ورنہ جھانپڑ ماروں گا۔ اب سب تیری طرح نہیں سوچتے اور قمر تیری بیوی ہے۔ اپنے لیے اور اپنے بچے کے لیے تجھ سے وہ طلب کرنا اس کا حق ہے جو تو اسے دے سکتا ہے۔ وہ تجھ سے عالی شان کوٹھی نہیں مانگتی ہے۔ مرسیڈیز کار کی خواہش نہیں رکھتی ہے اور نہ ہی گھر میں ہر سہولت چاہتی ہے لیکن وہ جتنا مانگتی ہے تو اسے دے سکتا ہے پھر یوں تنگی ترشی میں رہنے کا کیا فائدہ چند ہزار یا چند لاکھ بچا کر تو کیا تیر مارے گا۔"

"میں نے قمر کو شروع سے واضح کر دیا تھا کہ زندگی گزارنے کے بارے میں میرے کیا نظریات ہیں۔"

"اس وقت اس نے مان لیا۔ لہٰذا تو خوش تھا۔ اب وہ خوش نہیں ہے تو تجھے اس کی پروا نہیں ہے۔ کیا یہی تیری محبت ہے۔ میرے یار دنیا پر اپنے نظریات نہ ٹھونس۔ اگر وہ پیار و محبت سے تیرا ساتھ دیتی ہے تو میں بھی خوش ہوں لیکن اگر وہ تجھ سے اپنا حق مانگتی ہے تو یہ تیرا فرض ہے کہ اسے دے۔ اس نے تیری محبت میں اتنا عرصہ صبر شکر سے کاٹ دیا تو اب اس کا حق بنتا ہے کہ تو اس کی بات مانے۔ محبت میں اور شادی میں یکطرفہ ٹریفک نہیں چلتا۔"

کمال سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں نے پھر کہا "ذرا سوچ ایک مشین بھی مسلسل ایک ہی کام کرے تو گھس جاتی ہے اس کے پرزے جواب دے جاتے ہیں۔ اسے تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے پھر تو اور تیرے بیوی بچے انسان ہیں۔ وہ اگر تھکیں گے تو آرام مانگیں گے۔ زندگی گزارنے کے لیے انہیں آسائشوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ اگر تیری زندگی اور تیرا گھر پریشانی میں ہوگا۔ تو تو کیسے دل جمعی سے اپنا کام کر سکے گا۔"

"یار میں ڈرتا ہوں۔" اس نے اعتراف کرنے کے انداز میں کہا "یہ آسائشیں مجھے میرے مشن سے ہٹا نہ دیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیا تو خود کو اتنا کمزور سمجھتا ہے؟"

"میں کمزور نہیں ہوں لیکن بیوی بچے مل کر آدمی کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس سے وہ کرا لیتے ہیں جو وہ کرنا نہیں چاہتا ہے۔ میں کمزور نہیں ہونا چاہتا۔"

"دیکھ بھائی۔ یہ تیرا گھر ہے تو زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اسے کس طرح چلانا ہے لیکن میں اتنا مشورہ دوں گا کہ گھر اتفاقِ رائے سے چلتے ہیں۔ ورنہ یہ جبر کی ایک قسم بن جاتا ہے۔" میں نے چائے کا خالی کپ رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا "اچھا میں چلتا ہوں۔"

"کیا تو ناراض ہے؟" کمال نے فکرمندی سے کہا "تھوڑی دیر بھی نہیں بیٹھا۔"

میں ہنس دیا "سؤر کے بچے میں ناراض ہوا تو تجھے گالی دے لوں گا۔ ابھی تو میں ذرا چندا سے مل لوں۔"

"اس وقت!" اس نے گھڑی کی طرف دیکھا "وہ سو رہی ہو۔"

"اسے جگا لوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا "آخر میں اتنا اختر شماری کیوں کروں۔"

کمال کے کوارٹر سے نکل کر میں چندا کے کمرے تک آیا۔ دستک کے جواب میں اس کی خمار زدہ آواز آئی۔

"کون ہے؟"

"دیدارِ حسن کا ایک طلبگار۔" میں نے آواز بدل کر کہا۔

"کیا بدتمیزی ہے۔" اس نے بگڑ کر کہا۔

"اگر یہ بدتمیزی ہے تو میں بدتمیز ہوں۔" اس بار میں نے اصل آواز نکالی۔

"ناصر!" وہ لپک کر آئی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا میں اندر آیا۔ وہ سو رہی تھی۔ اس وجہ سے شب خوابی کے دودھیا سفید لباس میں تھی۔ جو اس کے مرمریں پیکر کے تناسب میں اس خوبی سے ڈھل رہا تھا کہ میں سحر زدہ رہ گیا۔ میری نظروں کو محسوس کرکے وہ شرمائی اور اس نے جلدی سے دوپٹہ لے لیا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے پوچھا "خیریت اتنی رات گئے آنے کی وجہ؟"

"بس اچانک تمہیں دیکھنے کو دل چاہا تو چپکے سے نیلم ہاؤس سے نکل آیا۔"

وہ ہنسی "نیلم نے پہرے بٹھا رکھے ہیں۔"

"ہاں وہ میری اماں جان بننے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔" میں نے کہا "بات یہ ہے کہ جب کوئی یتیم اکیلا رہ جائے تو سب اس کے سرپرست بننے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں۔"

وہ ہنسی "تو کیوں ہو اکیلے؟"

"کوئی ایسی ملتی نہیں جو مستقل طور پر اپنا لے....."

"تلاش بھی نہیں کی؟"

"نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "کیونکہ وہ پہلے سے میرے پاس ہے۔"

اس نے اپنے گھنے لمبے بال سمیٹ کر ان کا ڈھیلا سا جوڑا بنایا "ناصر صرف باتوں سے زندگی نہیں گزرتی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی "لیکن حالات فی الوقت مجھے باتوں کی اجازت بھی نہیں دیتے۔ میں ایک نظر تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ دیکھ لیا اب اجازت دو۔"

"کچھ دیر رکو۔ میں تمہارے لیے کافی بناتی ہوں۔" خود میرا دل بھی چاہ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر اور اس غارت گرِ ایماں کے سامنے رہوں۔ کوارٹر میں ایک چھوٹا سا کچن بھی تھا۔ چندا اسی میں فٹ ہو گئی تھی میری اندر کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لہٰذا میں دروازے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پانی چڑھایا اور کافی پھینٹنے لگی۔ کریم کا ڈبا نکالا۔

"چندا۔ تم نے ان زیورات کا کیا کیا جو میں لندن سے لایا تھا، خان جی کی امانت جو ایک چور نے سنبھال کر رکھی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ میں نے اسپتال کے ٹرسٹ میں دے دیے۔"

میں حیران رہ گیا "چندا۔ وہ زیورات تمہارا واحد اثاثہ تھے خان کی وراثت تم پہلے ہی کمال اسپتال کو دے چکی ہو۔ کمال نے یہ زیور لیے کیسے؟" میرے لہجے میں تلخی آگئی۔

"وہ انکار کر رہا تھا۔ میں نے زیور بیچ کر ایک اور طریقے سے اسے ڈونیٹ کر دیے۔ کمال کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔ میں نے سوائے تمہارے کسی کو نہیں بتایا۔"

"پاگل لڑکی۔" میں نے اسے بازوؤں میں لے لیا "کیا تمہیں اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے۔"

وہ نرمی سے میری بانہوں میں سمٹ آئی تھی "میں نے خدا سے ایک ہی چیز مانگی ہے اور مجھے یقین ہے وہ مجھے مل جائے گی اس کے سوا مجھے کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ چیز کیا ہے؟"

اس نے سر اٹھا کر میری آنکھوں میں دیکھا "کیا تم نہیں جانتے؟"

جواب اس کی شفاف آنکھوں میں بے حد واضح تھا "شکریہ میری جان۔" میں نے لب اس کی آنکھوں پر رکھ دیے "اب زیادہ دیر کی بات نہیں ہے۔"

"ناصر مجھے دلاسے مت دو۔ میں صبر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔" وہ میرے بازوؤں سے نکل گئی۔

"چندا میں پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں مجھے صرف کچھ دن دو۔ اس کے بعد میں خود تمہارے پاس آجاؤں گا اور ہم یہاں سے دور چلے جائیں گے۔"

"یہاں سے۔ کہاں؟" وہ چونکی۔

"انگلینڈ' وہاں عینی اور عاقل ہیں۔ نیلم اور رئیس بھی وہیں سیٹل ہونے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کی وجہ سے وہاں ہمیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوگا۔"

"لیکن کمال اور قمر، پھر رخشی اور فرید بھی ہیں۔ یہ لوگ یہیں رہ جائیں گے۔ ہمارے حصے کی دشمنیاں بھگتنے کے لیے۔"

"دشمن اصل میں شاہ عالم کی ذات ہے اور لوگ میری طرف اس سے مشابہت کی وجہ سے متوجہ ہوتے ہیں۔ میں یہاں نہیں ہوں گا تو یہ لوگ بھی محفوظ رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر میں یہاں رہتا ہوں اور ان لوگوں سے ملتا ہوں تو ان کے لیے خطرہ ہے۔"

چندا کسی حد تک میری بات کی قائل نظر آنے لگی "لیکن اپنی سرزمین جہاں میں ساری عمر رہی۔ اسے میں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ خان جی کی مٹی بھی تو یہیں ہے۔ ان کی قبر پر کون جائے گا۔ ان کے لیے فاتحہ خوانی کون کرے گا؟"

میں نے نرمی سے کہا "قبر پر جانا ضروری نہیں ہے۔ ہاں فاتحہ خوانی اور ایصالِ ثواب ہم کہیں سے بھی کر سکتے ہیں۔ سننے والا دنیا میں ہر جگہ موجود ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے۔"

"شبنم تم نے اس کے بارے میں سوچا۔"

"اس کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا اس کی زندگی سے نکل جانا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ اس پر سارے عذاب میری وجہ سے آئے ہیں۔"

"شبنم' تو واضح طور پر شاہ عالم سے منتھی ہے۔ کیا تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد تمہارے دشمن اس سے حساب نہیں چکائیں گے۔ وہ عورت ہے۔ غیر محفوظ ہے۔"

"آزاد صاحب نے اسے فی الوقت کسی ایسی جگہ منتقل کر دیا ہے۔ جہاں دشمن تو کیا میں بھی نہیں جا سکتا۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا ہے کہ جب میں اسے اپنا نہیں سکتا تو بہتر ہے اس کی زندگی سے نکل جاؤں۔"

"گویا وہ بے چاری اکیلی رہ جائے گی۔"

"اتنا خیال ہے اس بے چاری کا تو اسے بھی لے چلتے ہیں۔ بس تمہیں دل میں ذرا گنجائش پیدا کرنا ہوگی۔" میں نے شرارت سے کہا "میرے دل میں تو۔"

"بتاؤں تمہارے دل کو۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا پھر میرے سینے سے لگ گئی "تمہیں معلوم نہیں جب تم رخشی کے شوہر بنے ہوئے تھے تو میں دن رات انگاروں پر ہوتی تھی۔ شبنم کے ساتھ تمہارا نام آیا تو میں ضبط کی کن کن منزلوں سے نہیں گزری۔"

"کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں تھا؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ سچی بات ہے میں اپنی ذات کا اعتبار کھو چکی تھی کسی اور پر کیا اعتبار کرتی۔ میں نے کوشش کی کہ تم سے نفرت کروں لیکن نہ کر سکی۔"

اس کے ریشمی وجود کی ساری حرارت اور نرمی مجھ میں جذب ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے تپش کا احساس ہوا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے الگ کر دیا "چندا ہمیں اتنا قریب نہیں آنا چاہیے۔ رات کی یہ تنہائی ہمیں بہکا سکتی ہے۔"

اس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا "مجھے... مجھے خیال ہی نہیں آیا۔"

"اب میں چلتا ہوں۔ خاصی دیر ہو گئی ہے۔" میں نے کہا "نیلم کو پتا چلا تو وہ ہنگامہ کرے گی۔"

"اتنا ڈرتے ہو اس سے مرد ہو کر۔" چندا مسکرائی۔

"نیلم کے لیے میں مرد نہیں ہوں۔ میں اسے بیک وقت ماں اور بہن کی جگہ پاتا ہوں۔ ان حیثیتوں میں وہ اس قابل ہے کہ میں اس کا احترام کروں۔"

چندا کے کوارٹر سے نکلا تھا کہ سیکیورٹی گارڈ سامنے آگیا۔ اس نے میرے چہرے پر ٹارچ کی روشنی ڈال کر اطمینان کیا اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ باہر خاصی خنکی تھی اور میں کوئی گرم شے پہنے بغیر ہی آگیا تھا۔ سواری کا دور دور تک پتا نہیں تھا لہٰذا میں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر ڈبل مارچ شروع کر دی۔ ایک جگہ کتوں نے میری رفتار کے لیے ایکسی لریٹر کا کام کیا اور ایک جگہ مجھے پولیس سے چھپنا پڑا۔ بالآخر ایک ٹیکسی والے نے جو اپنی ٹیکسی میں ہی سو رہا تھا۔ سو روپے کے عوض مجھے نیلم ہاؤس تک چھوڑنے کی حامی بھر لی۔ جواب صرف دو میل کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے راستے میں دلائل سے ثابت کیا کہ وہ کرائے کے بجائے اپنی نیند حرام کرنے کا ہرجانہ لے رہا تھا جو جائز تھا۔ اتر کر کرایہ دیتے ہوئے میں نے کہا۔

"تم اپنے بچوں کو حرام کھلانا چاہتے ہو۔ شوق سے کھلاؤ لیکن اسے حلال تو نہ قرار دو۔"



اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات بارہویں آخری حصے میں ملاحظہ فرمائیں

